أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

خبردار! بیشک اللہ کے ولیوں پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہونگے۔

زندہ لوگ

خان آصف

بیشک اللہ کے ولیوں پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ (القرآن)

زندہ لوگ

خان آصف

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546, 37668958

بہترین کتابیں۔۔۔۔۔۔

جدید انداز اور معیار کے ساتھ

باہتمام محمد علی قریشی

بار اوّل .... جنوری 2014ء

مطبع .... نیئر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ .... القریش گرافکس

قیمت .... -/650روپے

دُعا

یا اللہ......تمام تعریفیں اور بڑائیاں صرف تیرے ہی لئے ہیں......اور تیرا کوئی شریک نہیں......بے شک ہم ظالموں میں سے ہیں، اور تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے۔

اے دیکھنے والے! تُو دیکھ رہا ہے کہ ہماری صفیں ٹوٹ کر بکھر چکی ہیں......تُو اپنی بے پناہ قدرت سے اِن ٹوٹی ہوئی صفوں کو جوڑ دے......اور انہیں درست فرما دے۔

اے جاننے والے! تُو خوب جانتا ہے کہ ہمارے چہرے تیرے گھر کی طرف ہیں......مگر دل کہیں اور بھٹک رہے ہیں۔ ہمارے پریشان اور وحشت زدہ دلوں سے دشمنوں کا خوف نکال دے کہ تیرے سوا دلوں کو سکون دینے والا کوئی نہیں۔

اے علیم و خبیر! تجھے خبر ہے کہ ہمارے قدم صراطِ مستقیم چھوڑ کر تباہی کے راستے پر اتنی دور جا چکے ہیں کہ اس کے آگے خون کا لامحدود سمندر اور زہریلی ہواؤں کا ہلاکت خیز طوفان ہے...... یہ ناخدا تو سارے سفینے ڈبو چکے ہیں......اب تیرے سوا کشتیٔ اسلام کا کوئی محافظ و نگہبان نہیں......آج ہم تجھ سے تیری اسی رحمتِ خاص کا سوال کرتے ہیں جس کا عظیم الشان مظاہرہ تُو نے اس وقت کیا تھا جب حضرت نوح علیہ السلام نے یہ کہہ کر تجھے پکارا تھا کہ اے رب، میں بہت کمزور ہوں......پس تُو ان سے میرا بدلہ لے......اے سننے والے! آج ہم بھی تجھ سے یہی فریاد کرتے ہیں کہ سفینۂ اسلام کو امن اور عافیت کے ساحل تک پہنچا دے کہ یہ خونریز ہوائیں بھی تیرے حکم کی تابع ہیں اور سمندر کی سرکش موجیں بھی۔

آج ملتِ اسلامیہ سازشوں اور فتنوں کے شعلوں میں گھری ہوئی ہے......ہم اقرار کرتے ہیں کہ یہ آگ ہماری ہی بداعمالی کا نتیجہ ہے۔ مگر اے بے پناہ اور بے مثال رحم و کرم والے! جس طرح تُو نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آتشِ نمرود کو ٹھنڈا کیا تھا، اپنی اسی رحمتِ خاص کے صدقے میں اس آگ کو بھی بجھا دے کہ تیرے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں۔

یا اللہ!......ہم تجھے رحمۃ اللعالمینؐ کا واسطہ دیتے ہیں کہ جن کے صدقے میں تُو نے ہمیں بہترین اُمت بنایا تھا......مگر ہم تیری نافرمانیوں اور تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے وفائیوں کے سبب بدترین اُمت بن کر رہ گئے......ہمیں غربت و افلاس اور ذلت و رسوائی کے ان اندھیرے غاروں سے نکال کہ تیرے سوا کوئی مشکل کشا نہیں......کوئی دستگیر نہیں......

یا اللہ! ہم وقت کی عدالت میں تنہا کھڑے ہیں......ہمارا کوئی وکیل اور ترجمان نہیں......بے شک تُو ہی ہمارا وکیل ہے......ہم نے اپنے نفس اور شیطان کے فریب میں آ کر اس حقیقت کو بھلا دیا تھا......مگر تو ہمیں

راموش نہ کر۔

آج ہم تجھ سے وہی دعا کرتے ہیں جو تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میدانِ بدر میں مانگی تھی..... پنے نام لیواؤں کو بے نام ونشان ہونے سے بچالے کہ تیرے سوا کوئی بچانے والا نہیں....... جس طرح فتح مکہ کے موقع پر اسلام کی فتح ونصرت کے لئے اپنے غیبی لشکر زمین پر اُتارے تھے، ایک بار پھر اپنے اُن ہی بی لشکروں کو ہماری مدد کے لئے بھیج....... ہم تو اس قدر عاجز اور کمزور ہیں کہ غیروں کی مرضی کے بغیر سانس ہی نہیں لے سکتے...... یا قویُ العزیز! ہمیں اس غلامی سے نجات دے...... اور ہمیں ہمارے نفس کے والے نہ کر۔

اے مالکِ ارض وسما!....... ہمارے نامۂ اعمال کی طرف نہ دیکھ کہ وہ تو کالی رات سے بھی زیادہ سیاہ ہے.......بس اپنی شانِ کرم کا اندازہ کر.......اور ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹا کہ تیرے سوا کوئی دینے والا نہیں۔

عالم پناہ! دے ہمیں شیطان سے پناہ
غیروں کی بھیک، وقت کے احسان سے پناہ

یا الٰہُ العٰلمین پناہ!..... یا ارحم الراحمین پناہ۔
یا غیاث المستغثین پناہ۔ بحق اشهد ان لا اله الا الله محمد الرسول الله۔

❋❋❋

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

گنہگار ہیں لیکن اسی گمان میں ہیں
حضورؐ اب بھی غلاموں کے درمیان میں ہیں

نہ ہوتے آپ کی اُمت تو مٹ گئے ہوتے
ہزار فتنے سیاست کے آسمان میں ہیں

ہم اہلِ درد بھی سینے کشادہ رکھتے ہیں
اگرچہ زہر بھرے تیر ہر کمان میں ہیں

یہ چار دن کی کہانی تو کوئی بات نہیں
ہماری فتح کے قصے ہر اِک زبان پہ ہیں

یقین کر لیں کہ بس صبح ہونے والی ہے
وہ اہلِ دل جو اندھیروں کے امتحان میں ہیں

ہر ایک دور میں رسوا ہوئی ہے بولہبی
یہ آج کل کے ابوجہل کس دھیان میں ہیں

❁❁❁

پیش لفظ

قارئین کرام پر اللہ کی سلامتی ہو۔ بے شک تمام تعریفیں اُس خالقِ کائنات کے لئے ہیں۔ خود اللہ ربِ کریم اپنی واحدانیت، اپنی پاکی، اپنی خلاّقی، اپنی رزاقی، اپنی بے مثال رحمت، اپنی لازوال قدرت، اپنی شانِ قہاری و جباری اور اپنے جلال و جبروت کے بارے میں خود ارشاد فرماتا ہے:

''اگر سارے درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندروں کا پانی روشنائی..... پھر تمام فرشتے، جن اور انسان مل کر اللہ کی تعریف لکھنا شروع کریں، تب بھی ربِ کائنات کی تعریف ختم نہ ہو اور تعریف کا حق ادا نہ کیا جا سکے۔''

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اُس کی شانِ کریمانہ بیان کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ خود بھی عظیم ترین ہے اور اس کا دین بھی سب سے عظیم...... اس نے ہر دور میں اپنے ایسے عظیم و جلیل لوگ پیدا کئے جنہوں نے اس کے دینِ کامل کو ہر دور میں زندہ و جاوداں کیا۔ اور یہ تحریر بھی ان ہی محبوبینِ الٰہی کے بارے میں ہے۔

میرے والدِ محترم، خان آصف کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ والد صاحب جو محبت و عقیدت اللہ کے محبوبین سے رکھتے تھے، وہ میرے لئے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی عقیدت و محبت کا اظہار کرنے میں گزارا اور اولیائے کرام کی خدمت میں گلہائے عقیدت پیش کرتے رہے۔ اور یہ انہی اللہ کے پیاروں کی بخشش و عطا ہے کہ آج ان کی تحریروں کو اتنی پذیرائی حاصل ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ افسانوی انداز میں صوفیائے کرام کی سیرت نگاری کا آغاز میرے والدِ محترم نے ہی کیا۔ پہلا مضمون اُن کا ''سب رنگ ڈائجسٹ'' کے ابتدائی شماروں میں ''گمنام مجذوب'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بعد میں آنے والے مصنفین نے اُن ہی کی تقلید کی۔ مگر اُن حضرات نے ایک غضب یہ کیا کہ مسلمان اولیاء کرام کو ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرح طلسمی اور جادوئی کردار بنا کر رکھ دیا۔ یہ اردو زبان اور خصوصاً پاکستان میں بڑا خوف ناک کام ہوا۔ جس نے کم علم مسلمانوں کو عقیدتاً بہت نقصان پہنچایا۔ اور منکرینِ اولیاء کرام کو منہ کھولنے کا موقع مل گیا۔ اور کچھ یہی حال ہمارے الیکٹرانک میڈیا کا بھی ہے جنہوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کیں۔ زیادہ تر ایسے مذہبی پروگرام پیش کئے جنہیں دیکھ کر ''عامتہ المسلمین'' بیدار ہونے کے بجائے گہری نیند سو گئے۔ شاید علامہ اقبال نے اسی موقع کے لئے کہا تھا۔

طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علم کلام

آج بھی ہمارا الیکٹرانک میڈیا کردار سازی کے بجائے ''قوالیوں'' ہی پر زیادہ زور دیتا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت بابا بلھے شاہؒ کے کلام کو جھوم جھوم کر پڑھنا نہ تو عشق کا مزاج ہے اور نہ معراج۔ یہ ہماری

بد قسمتی ہے کہ ہم اولیائے کرام کی مجاہدانہ اور درویشانہ زندگیوں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی اُن کی تعلیمات پر عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ کیسا عجیب عشق ہے......اور یہ کیسے تعظیمی سجدے ہیں جن پر کفر و شرک کی تہمتیں لگتی ہیں۔ خیر اس بحث سے بالاتر زیرِ نظر مضامین والد محترم کا اولیائے کرام کی بارگاہِ اقدس میں ایک حقیر سا نذرانہ ہے۔ ان مضامین میں اُن بزرگانِ دین کے تاریخ ساز واقعات پیش کئے گئے ہیں جنہوں نے طاقت و اقتدار کی نفی کی اور کسی آمرِ وقت کے سامنے خم نہیں ہوئے۔

والد گرامی کا یہ مقبول سلسلہ ''زندہ لوگ'' کے نام سے روزنامہ ایکسپریس میں قسط وار چھپ چکا ہے اور اب یہی ایمان افروز سلسلہ، کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ القریش پبلی کیشنز کے مالک، محمد علی قریشی صاحب بذاتِ خود اولیائے کرام سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خاص کرم اور ان کے تعاون نے ہی اس کارِ خیر کو آسان بنایا۔

اللہ کا اٹل قانون ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑتا ہے۔ اسی قانون کے تحت حق تعالیٰ کے تمام نبیؑ اور رسولؐ بھی حجابِ نور میں تشریف لے گئے۔ مگر یہ نفوسِ قدسیہ آج بھی ہمارے دلوں میں اور ہماری روحوں میں زندہ ہیں۔ اسی طرح اولیائے کرام نے بھی موت کا ذائقہ چکھ لیا۔ مگر ان پر دوسری موت وارد نہیں ہوئی۔ دوسری موت وہ ہے کہ مرنے والے کو بس چند روز تک یاد رکھا گیا اور پھر اسے فراموش کر دیا گیا...... یا زیادہ سے زیادہ سال میں ایک دن اُس کی برسی منا لی گئی۔ دنیا میں بے شمار بادشاہ، صدر اور وزیراعظم آئے۔ مگر آج ان میں سے بیشتر کا نشان تک باقی نہیں۔ کچھ مقبرے ضرور نظر آتے ہیں لیکن وہاں وحشت اور دہشت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس اولیائے کرام کے مزاراتِ اقدس ہر وقت منور رہتے ہیں۔ پھولوں کی خوشبوؤں سے مہکتے رہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں ہر وقت آیاتِ الٰہی اور درود و سلام کی گونج سنائی دیتی ہے۔

صحابہ کرامؓ کے بعد کارِ رسالت و ہدایت جاری رکھنے کی ذمہ داری انہی تابعین کے کاندھوں پر آ پڑی۔ ایسی ذمہ داری جو پہاڑ سے زیادہ بھاری تھی۔ مگر اہلِ ایمان نے بھی پہاڑ کو پہاڑ نہیں سمجھا، اسے پھولوں کا ایک گلدستہ سمجھ کر اُٹھا لیا۔ جس کے نتیجے میں کبھی ان پر تہمتوں کے سلسلے دراز ہوئے، کبھی ان کے ہاتھ قلم ہوئے اور کبھی سر...... وہ زنداں ہو یا مقتل...... جلّاد کے تازیانے ہوں یا پھانسی کا پھندا...... وہ نفوسِ قدسیہ ہر مقام پر ایک ہی صدا دیتے رہے۔

ہمیں ہے حکمِ اذاں ، لا الٰہ الا اللہ

اسماء خان آصف

ترتیب

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

قارئین کرام! علامہ اقبالؒ کی ادبی عظمت اور شاعرانہ مقام سے بحث نہیں۔ مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ جس طرح علامہ نے سیاسیات اور فلسفے کے خشک ترین موضوعات کو شاعری کا دلکش لباس پہنایا ہے اور پتھروں جیسے الفاظ کو ریشم کا سا گداز اور آبشاروں جیسی موسیقیت بخشی ہے، اس کی مثال پوری دنیا کی ادبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس دنیاوی اعزاز سے قطع نظر، اقبال کی روحانی حیثیت یہ ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والے سب سے بڑے دانش مند تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس ''ملّتِ بیمار'' کے لئے ''نسخۂ کیمیا'' کہاں سے لائیں تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم کی بارگاہِ کرم میں فریاد کرنے لگتے تھے ۔

شیرازہ ہوا ملّتِ مرحوم کا ابتر
اب تُو ہی بتا، تیرا مسلمان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

یہ وہی زمانہ تھا کہ جب ملّتِ اسلامیہ شدید اذیت و کرب میں مبتلا اور خوف ناک زبوں حالی کا شکار تھی۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

اور اس وقت کے علماء کا یہ حال تھا کہ ان کے جسموں پر قیمتی قبائیں اور سروں پر ریشمی دستاریں موجود تھیں۔ مگر عقل زنگ آلود اور کردار روح سے خالی تھے۔ بہت سے امامانِ عصر نے آخرت فروخت کر کے دنیا خرید لی تھی۔

خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلمان کا جامہ احرام

نہ کوئی رہنما تھا، نہ کوئی پیشوا۔ اور اگر کوئی تھا بھی تو اس میں رہنمائی اور پیشوائی کی صلاحیت موجود نہیں تھی۔

کوئی کارواں سے چھوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

مسلمانوں کی اس شکستگی اور بے حسی پر علامہ اقبالؒ پورے زور و شور سے ماتم کرتے تھے مگر حالات کے گنبد میں انہیں صرف اپنی ہی چیخ سنائی دیتی تھی۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزہ خونریز ہے ساقی

پھر اسی شدتِ اضطراب میں علامہ اقبال ایک مردِ حق کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے اور صاحبِ قبر کے حوالے سے حق تعالیٰ کے حضور میں یہ درخواست پیش کی ۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

اقبالؒ پر تحقیقی کام کرنے والوں سے انتہائی معذرت کہ علامہ کے مذکورہ بالا شعر پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ بلکہ اسے اقبال کے روحانی کرب کا ایک عام انداز سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ اور ناقدین ادب نے یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ تین سو سال سے ہندوستان کے میخانے کیوں بند ہیں؟ پانچ سو سال سے کیوں نہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علامہ اقبالؒ کا اشارہ کن میخانوں کی طرف تھا؟ اور وہ ساقی سے کس فیض کے عام کرنے کی درخواست کر رہے تھے؟

ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ کی مراد میخانہ ''معرفت'' ہی ہو سکتی ہے۔ مگر اس شعر میں غور طلب بات ''تین سو سال'' کی مخصوص مدت ہے۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جس پر زیادہ غور نہیں کیا گیا۔ علامہ اقبالؒ جس مردِ حق کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے تھے، وہ سلسلہ نقشبندیہ کے عظیم و جلیل بزرگ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ہیں۔ جنہیں صوفیائے کرام کی تاریخ میں ''مجدد الف ثانیؒ'' کے لقب سے شہرتِ دوام حاصل ہے۔ جب علامہ اقبالؒ نے مذکورہ شعر کہا تھا، اس وقت حضرت مجدد الف ثانیؒ کو دنیا سے پردہ کئے ہوئے پورے تین سو سال گزر چکے تھے۔

اب یہاں دوسرا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانیؒ) کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی ہندوستان میں معرفت کے تمام میخانے بند کیوں ہو گئے؟ کیا ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے علاوہ کوئی دوسرا ولی یا عارف موجود نہیں تھا؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ گیارہویں صدی ہجری میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہزاروں عارف اور ہزاروں ولی موجود تھے۔ مگر وہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے مقابلے میں معرفت کے کم درجے پر فائز تھے۔ دوسرے یہ کہ ان صوفیائے کرام میں کوئی ''صاحبِ عزیمت'' بزرگ نہیں تھا۔

تصوف کی اصطلاح میں ''صاحبانِ عزیمت'' ان مردانِ حق یا صوفیائے کرام کو کہا جاتا ہے جنہوں نے تبلیغ دین کے راستے میں طویل اور شدید اذیتیں برداشت کی ہوں۔ کبھی یہ مردانِ حق پابندِ سلاسل کر کے حوالۂ زنداں کئے گئے، کبھی ان پاکباز ہستیوں کو دار پر کھینچا گیا۔ اور کبھی ان برگزیدہ ہستیوں کی لاشوں سے سیاست و اقتدار کے مقتل سجائے گئے۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ بھی ان صاحبِ عزیمت صوفیائے کرام میں نہ صرف شامل ہیں بلکہ بلند مقام بھی رکھتے ہیں۔ آپ نے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے ایجاد کردہ نئے مذہب ''دینِ الٰہی'' کی شدید مخالفت کی۔ جس کی پاداش میں حضرت شیخ کو قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آپ حق گوئی سے باز نہ آئے یہاں تک کہ جلال الدین اکبر کو موت آ گئی۔

پھر اس کا بیٹا شہنشاہ نور الدین جہانگیر پورے جلال و جبروت کے ساتھ تختِ ہندوستان پر نمودار ہوا۔ اس نے حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کی سزا بحال رکھی۔ اور رہائی کے لئے یہ شرط پیش کر دی کہ اگر شیخ ایک بار سرِ دربار جہانگیر کو سجدہ کر لیں گے تو انہیں آزادی کے ساتھ بڑے انعام و اکرام سے بھی نوازا جائے گا۔ مگر حضرت شیخ احمد سرہندیؒ تو ''مجدد'' یعنی دین کی تجدید کرنے اور بدعتوں کے مٹانے والے تھے۔ پھر کیسے ایک آدم زادے کو سجدہ کر لیتے؟ علامہ اقبالؒ نے اپنی ایک اور نظم میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

اس سے پہلے کہ ہم حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کا تفصیلی ذکر کریں، قارئین کی معلومات میں اضافے کے لئے صاحبانِ عزیمت کا بھی مختصر تعارف ضروری ہے جن کی بے پناہ قربانیوں کے باعث مذہب اسلام کو برصغیر پاک و ہند میں فروغ حاصل ہوا۔ اُردو کے صوفی شاعر مرزا مظہر جان جاناں کے بقول ؎

بنا کر دند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(خاک اور خون میں نہا کر جن پاک طینت عاشقوں نے اچھی رسموں کی بنیاد رکھی، اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے)

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بیک وقت ایران و روم (ماضی کی دو سپر پاورز) کو شکست فاش دے کر ثابت کر دیا تھا کہ آئندہ مسلمان ہی دنیا پر حکومت کریں گے۔ اس وقت برصغیر دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ "ہند" اور دوسرا "سندھ" کہلاتا تھا۔ مگر ان دونوں حصوں پر اہلِ ہنود کی ہی حکومت تھی۔ نامور عرب سالار امیر مہلب بن ابی صغرہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے ہندوستان میں داخل ہو کر اہلِ ہنود کے خلاف جہاد کیا۔ اس وقت کابل مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا۔ امیر مہلب بن ابی صغرہ، کابل ہی کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اور شر کے پجاریوں کو بدترین شکست سے دوچار کیا تھا۔ اس جنگ میں اہلِ ہنود کے ہزاروں سپاہی تہہ تیغ ہوئے تھے اور بارہ ہزار عورتیں اور مرد گرفتار کر لئے گئے۔ ان اسیروں میں سے ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کر کے رہائی حاصل کر لی تھی۔ یہ 44 ہجری کا واقعہ ہے۔ اس وقت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے اور نصرت و کامرانی خاندانِ بنو اُمیہ کے قدم چوم رہی تھی۔ پھر تقریباً نصف صدی تک سندھ اور ہند کے محاذوں پر مکمل خاموشی چھائی رہی۔

اس کے بعد اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ حکومت میں عاملِ عراق حجاج بن یوسف نے تین فوجی مہمات تسخیرِ سندھ کے لئے روانہ کیں۔ پہلی مہم کی قیادت عبداللہ بن نبہان کر رہے تھے جو بڑی جانبازی سے لڑتے ہوئے درجۂ شہادت تک پہنچے۔ سندھ کے بعض محققین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کراچی میں کلفٹن پر واقع مزار عبداللہ بن نبہان ہی کا ہے۔ مگر یہ روایت درست نہیں۔ سید عبداللہ شاہ غازیؒ کوئی اور بزرگ ہیں جو سالارِ اسلام عبداللہ بن نبہان کے بہت بعد سندھ تشریف لائے تھے۔ اور آپ کا تعلق بخارا کے خاندانِ سادات سے تھا۔

عبداللہ بن نبہان کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف نے اپنے ایک اور عظیم سالار بدیل بن طہفہ کو سندھ کی ایک فوجی مہم پر روانہ کیا۔ بدیل بن طہفہ نے بھی اپنی شمشیر آبدار کے بڑے جوہر دکھائے۔ مگر بالآخر رسم سرفروشی کا حق ادا کرتے ہوئے "نیرون کوٹ" کے قریب شہید ہوئے۔ "نیرون کوٹ" وہی مقام ہے جہاں آج سندھ کا دوسرا بڑا شہر حیدر آباد واقع ہے۔

عاملِ عراق، حجاج بن یوسف کو بدیل بن طہفہ کی شہادت کا اس قدر صدمہ تھا کہ اس نے جامع مسجد کے مؤذن کو حکم دے دیا تھا کہ ہر اذان کے بعد اسے بدیل بن طہفہ کا نام یاد دلاتا رہے تاکہ اس کے غصے کی آگ مسلسل بھڑکتی رہے۔ اور ایک دن یہی آگ پورے سندھ کو جلا کر خاکستر کر دے۔

پھر 92ھ کے آخر میں حجاج بن یوسف نے اپنے داماد محمد بن قاسم کو سندھ کی مہم پر روانہ کیا۔ اس وقت محمد بن قاسم کی عمر سولہ یا سترہ سال تھی۔ عربی زبان کے ایک شاعر نے محمد بن قاسم کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"وہ اس وقت مردانِ کارزار کی سالاری کر رہا تھا جب اس کی عمر کے لڑکے گلیوں میں کھیل رہے تھے۔"

پھر اس تاریخ ساز نوعمر مسلم سالار نے 10 رمضان المبارک 93ھ کو سندھ پر اسلام کا پرچم لہرا دیا اور برہمن راجہ داہر کا سر کاٹ کر حجاج بن یوسف کے پاس عراق بھیج دیا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نے "کیرج" پر یلغار کر

کے راجپوت حکمراں راجہ داہر کو بھی شکست دے دی۔ مگر عام ہندوؤں کے ساتھ ایسا رحم دلانہ سلوک کیا کہ وہ مسلم سالار کے کردار کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ ''کیرج'' وہی مقام ہے جو موجودہ بھارت کے نقشے میں ''جے پور'' کے نام سے مشہور ہے اور صوبہ راجستھان کا دارالحکومت ہے۔

''کیرج'' کے بعد محمد بن قاسم نے ملتان کے راجپوتوں کو شکست دی اور اسلامی سلطنت کی حدود میں اضافہ کیا۔ مگر اسی دوران خلیفہ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا۔ حجاج بن یوسف، ولید سے ایک سال پہلے یعنی 95ھ میں راہیٔ ملک عدم ہو چکا تھا۔ ولید کے بعد اس کا حقیقی بھائی سلیمان بن عبدالملک منصب خلافت تک پہنچا۔ یہ خاندانِ بنو اُمیہ میں بدترین حکمران تھا، جس نے اسلامی اقتدار کو شدید نقصان پہنچایا اور مسلسل جاری رہنے والی فتوحات کا دروازہ بند کر دیا۔

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک انتہائی تنگ نظر اور منتقم المزاج حکمران تھا۔ اس نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے اسلام کے تین مایہ ناز سالاروں کو قتل کرایا۔ اس کا پہلا نشانہ ''فاتح چین'' قتیبہ بن مسلم تھے اور دوسرا ہدف ''فاتح اُندلس'' (اسپین) موسیٰ بن نصیر۔ اور وہ اب اپنے تیسرے شکار ''فاتح سندھ'' محمد بن قاسم کے تعاقب میں تھا۔

شاید محمد بن قاسم، خلیفہ کے عتاب سے محفوظ رہتے لیکن سلیمان بن عبدالملک سے ایک بڑی سیاسی غلطی یہ ہوئی کہ اس نے یزید بن مہلب کو مشرقی ممالک کا حاکم اعلیٰ بنا دیا۔ یزید بن مہلب اور حجاج بن یوسف کے خاندان میں پرانی دشمنی تھی۔ اس نے صالح بن عبدالرحمٰن کو ''محکمہ خراج'' کا نگران مقرر کر دیا۔ صالح عقیدتاً خارجی تھا اور حجاج بن یوسف کا سخت ترین دشمن۔ اس کے بغض و عناد اور دشمنی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عاملِ عراق، حجاج بن یوسف نے خارجیوں کو بے دریغ قتل کرایا تھا۔ اور اس سیاسی کشمکش میں صالح بن عبدالرحمٰن کا بھائی آدم بھی حجاج کی تیغ جفا کار کا نشانہ بنا تھا۔ حجاج بن یوسف کی دشمنی میں یزید بن مہلب اور صالح بن عبدالرحمٰن ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ نتیجتاً دونوں نے مل کر حجاج کے خاندان کے ایک ایک فرد کو قید میں ڈالنا اور قتل کرنا شروع کر دیا۔ اسی انتقامی عمل کو تیز تر کرنے کے لئے فاتح سندھ محمد بن قاسم کو معزول کر کے یزید بن کبشہ کو سندھ کا عامل (گورنر) مقرر کیا۔

پھر یزید بن کبشہ کے ساتھ یزید بن مہلب کا بھائی معاویہ بن مہلب اس عظیم فاتح کو گرفتار کرنے سندھ روانہ ہوئے۔ اس وقت محمد بن قاسم ملتان میں موجود تھے۔ یزید بن کبشہ نے دیبل (سندھ) پہنچ کر محمد بن قاسم کے نام حکم بھیجا کہ انہیں معزول کر دیا گیا ہے۔ اس لئے بلاتاخیر تن تنہا نئے عامل کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔

یزید بن کبشہ کا حکم سن کر محمد بن قاسم کے مشیروں نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''یہ آپ کے خلاف ایک گہری سازش ہے۔ آپ یزید بن کبشہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیں۔''

''یہ حکم خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کی طرف سے جاری ہوا ہے۔ اور میں اپنے امیر کے فرمان سے کسی بھی حال میں سرتابی نہیں کر سکتا۔'' محمد بن قاسم نے بڑی استقامت کے ساتھ جواب دیا۔

''تو پھر آپ تنہا سندھ نہیں جائیں گے۔'' مشیروں نے کسی جھجک کے بغیر کہا۔ ''پوری فوج آپ کے ہمراہ جائے گی تاکہ اگر یزید بن کبشہ کی نیت میں فتور ہو تو ہماری شمشیریں اپنے سالار کا دفاع کر سکیں۔''

''تم نے نئے عامل کا حکم نامہ نہیں پڑھا کہ میں اکیلا ہی حاضری دوں؟'' محمد بن قاسم کے لہجے میں وہی بے باکی تھی، جس کے لئے وہ خاص شہرت رکھتے تھے۔

''اسی حکم سے تو یزید بن کبشہ کی سازش ظاہر ہوتی ہے۔'' ایک مشیر نے پُرزور لہجے میں کہا۔
''کچھ بھی ہو، مجھے ہر حال میں تنہا ہی جانا ہے۔'' نوعمری کے باوجود محمد بن قاسم نہایت مدبر، ذہین اور عالم و فاضل انسان تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ تنہا حاضری کا کیا مفہوم ہے۔ مگر انہوں نے نظم و نسق بحال رکھنے کے لئے اپنے ہمدرد سپاہیوں کا مشورہ مسترد کر دیا۔
اس وقت پچاس ہزار راجپوت بھی محمد بن قاسم کے ہم نوا تھے۔ ایک راجپوت سردار نے اپنی شمشیر بے نیام کرتے ہوئے کہا۔
''آپ کے اخلاقِ کریمانہ نے ہمارے دل فتح کر لئے ہیں۔ اس لئے ہمارا بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ سندھ جانے کے بجائے ملتان ہی میں قیام کریں۔ اگر نیا عامل ملتان کا رخ کرتا ہے تو ہم اپنے دیوتاؤں کی قسم کھاتے ہیں کہ وہ اس وقت تک آپ پر قابو نہیں پا سکتا جب تک ہماری تلواریں نہ ٹوٹ جائیں اور سر جسموں سے جدا نہ ہو جائیں۔''
یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر محمد بن قاسم، یزید بن کبشہ کا حکم ماننے سے انکار کر دیتے تو وہ بزدل خارجی زندگی بھر محمد بن قاسم جیسے جانباز اور بلند کردار سالار پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں اس عظیم مجاہد پر جس نے مرکز کی آبرو رکھنے اور ملّتِ اسلامیہ کو انتشار سے بچانے کے لئے خود کو قربان کر دیا۔ پھر وہ تن تنہا ہی یہ کہتا ہوا ملتان سے سندھ روانہ ہوا۔
''الوداع میرے دوستو۔ الفراق! میرے غم گسارو!''
پھر جب محمد بن قاسم سندھ پہنچے تو اس علاقے کے نئے عامل (گورنر) یزید بن کبشہ نے انہیں ٹاٹ کے کپڑے پہنا کر اور ایک عام مجرم کی طرح ہتھکڑی اور بیڑی ڈال کر معاویہ بن مہلب کی نگرانی میں عراق روانہ کر دیا۔ جب وہ عظیم فاتح، کشتی میں سوار ہوا تو اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر انتہائی پُرسوز لہجے میں عربی زبان کا یہ مشہور شعر پڑھا۔
(ترجمہ): ''ان لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا۔ اور کیسے جوان کو ضائع کر دیا جو مردِ نبرد آزما تھا اور سرحد کا محافظ تھا۔''
جب محمد بن قاسم عراق پہنچے تو مشرقی علاقوں کے حاکم اعلیٰ، صالح بن عبدالرحمٰن نے انہیں ''واسط'' کے قید خانے میں ڈال دیا جہاں حجاج بن یوسف کے خاندان کے تمام لوگ قید تھے۔ محمد بن قاسم کو دن رات سخت سزائیں دی جاتی تھیں مگر وہ نہایت صبر اور بہادری کے ساتھ ان اذیتوں کو برداشت کرتے تھے۔ نوعمری کے باوجود محمد بن قاسم ایک اچھے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ واسط کے قید خانے میں وہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:
''اگر مجھے واسط میں پابہ زنجیر کر کے ایک قیدی بنا دیا گیا تو اس سے کیا ہوا؟ وہ میں ہی تو ہوں جس نے شہ سواروں کے دل میں اہلِ اسلام کی ہیبت بٹھا دی اور بہت سے حریفوں کو قتل کیا۔''
مرنے سے ایک دن پہلے محمد بن قاسم بار بار ایک ہی جملہ دہراتے تھے۔ ''اے زمانے! تجھ پر افسوس کہ تُو شرفاء کے حق میں بڑا ہی بد دیانت ہے۔''
جب محمد بن قاسم کی وفات کی خبر سندھ پہنچی تو مقامی باشندوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ اور کئی ماہ تک اہلِ سندھ اس عظیم مجاہد کے اخلاقِ کریمانہ کو یاد کر کے اس طرح روتے رہے جیسے ان کا باپ یا کوئی قریبی عزیز مر گیا ہو۔
پھر جب یہی الم ناک خبر کیرج (راجستھان) پہنچی تو راجپوت جیسی سرکش اور بہادر قوم کے لوگ بھی دھاڑیں

مار مار کر رونے لگے۔ اہلِ کیرج نے محمد بن قاسم کا ایک قد آدم مجسمہ بنایا اور شہر کے بڑے چوراہے پر نصب کر دیا۔ پھر برسوں یہ رسم جاری رہی کہ جب محمد بن قاسم کی وفات کا دن آتا تو کیرج کے لوگ مجسمے کے قریب جمع ہوتے۔ ایک شخص بلند آواز میں محمد بن قاسم کے اوصاف بیان کرتا اور وہ لوگ اس شخص کی یاد میں بہت دیر تک آنسو بہاتے جس کا تعلق دوسرے مذہب سے تھا۔ دراصل یہی حقیقی اور عظیم فتح ہے ۔

جو دلوں کو فتح کر لے ، وہی فاتحِ زمانہ

دوسری قوموں کے متعصب اور تنگ نظر مؤرخین جو مسلمانوں پر یہ بہتان لگاتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا ہے، ان کے لئے محمد بن قاسم کی مثال ایک عام مثال ہے۔ ورنہ تاریخ اسلام ایسی ہزاروں عظیم الشان مثالوں سے بھری ہوئی ہے جن میں سے کسی ایک کا بھی جواب پیش نہیں کیا جا سکتا۔

یہ 94ھ کا واقعہ ہے۔ محمد بن قاسم بظاہر صوفی نہیں تھے۔ مگر ان کا کردار صوفیانہ تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلام میں کئی صدیوں کے بعد باقاعدہ خانقاہی نظام قائم ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے جو مجاہد تھا، وہی صوفی بھی تھا۔ درحقیقت صوفی اس مسلمان کو کہتے ہیں جو ظاہر میں احکامِ شرعی کا پابند ہو اور باطن میں پرہیزگار ہو۔ یہی حال ماضی کے مسلمان مجاہدین کا تھا۔ وہ تلواروں کے سائے میں نمازیں ادا کرتے تھے اور روزے رکھ کر کفار سے جنگ کرتے تھے۔ اسلامی حکم کے مطابق مفتوحہ علاقوں کے سبزہ زاروں کو آگ نہیں لگاتے تھے۔ بوڑھوں اور بچوں کو قتل نہیں کرتے تھے اور شکست خوردہ قوم کی خوب صورت دوشیزاؤں کو اپنی ہوس کا نشانہ نہیں بناتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ ان دشمن نوجوانوں کو بھی معاف کر دیا کرتے تھے جو عافیت اور امان طلب کرتے تھے۔ مسلمانوں کی اسی بلند کرداری سے متاثر ہو کر دوسرے مذاہب کے لوگ قطار در قطار حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ اس کے برعکس کچھ مسلمان حکمرانوں نے شرعی قوانین کے بجائے اپنے نفس کے آئین پر عمل کیا۔ مفتوح قوم کے افراد کا بے جا خون بہایا۔ دولت کے انبار سے اپنے خزانے بھرے، شراب کی صراحیوں اور سیم تن رقاصاؤں سے محفلیں آراستہ کیں۔ اور زمانے بھر کی خوب صورت عورتوں سے اپنے حرم سجائے۔ یہ شہنشاہیت اور آمریت کی بدترین مثال تھی۔ ان فرمانرواؤں کے نام مسلمانوں جیسے تھے۔ مگر ان کے اعمال کا تعلق برائے نام بھی اسلام سے نہیں تھا۔ اس قسم کے نام نہاد مسلمان حکمران، مجاہدین کی فہرست سے خارج ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جو مسلمانوں کا امیر ہوتا تھا، وہی ان کی نمازوں کا امام بھی ہوتا تھا اور امام وہی ہوتا ہے جو علم اور زہد و تقویٰ میں دوسرے مسلمانوں سے افضل ہوتا ہے۔ یہ روایت خلافتِ راشدہ تک قائم رہی۔ پھر اسلامی سلطنت کی حدود میں تو مسلسل توسیع ہوتی رہی مگر مسلم حکمرانوں کے کردار اس قدر سمٹ گئے کہ انہیں پہچاننا مشکل ہو گیا۔ بقول علامہ اقبالؒ

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یہی وہ زمانہ ہے جب مسلمان حکمرانوں کی طرف سے تبلیغ اسلام کا کام رک گیا۔ اور اس بارِ گراں کو صوفیائے کرام کے کمزور کاندھوں نے اُٹھالیا۔

برصغیر ہندوستان میں جن پہلے صوفی کو شہرتِ دوام حاصل ہوئی، وہ حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ ہیں جنہیں عام لوگ فرطِ عقیدت میں ''داتا گنج بخش'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ حضرت سید علی ہجویریؒ سلطان محمود غزنوی کے دورِ حکومت میں لاہور تشریف لائے۔ اس وقت پنجاب کا بڑا علاقہ کابل کے زیرِ اقتدار تھا۔ حضرت سید علی

ہجویریؒ کے آنے سے پہلے آپ کے پیر بھائی حضرت شیخ میراں حسین زنجانیؒ لاہور تشریف لا چکے تھے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس روز حضرت سید علی ہجویریؒ لاہور میں داخل ہوئے، اسی دن حضرت شیخ میراں حسین زنجانیؒ کا جنازہ جا رہا تھا۔ یہ 431ھ کا زمانہ تھا۔

حضرت سید علی ہجویریؒ نے لاہور پہنچ کر اپنے رشد و ہدایت کے کام کا آغاز کیا۔ تبلیغ کے دوران آپ کو سخت اذیت و کرب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مقامی لوگ بظاہر اسلام قبول کر چکے تھے مگر ان کی اکثر معاشرتی رسمیں ہندوانہ تھیں۔ کبھی کبھی آپ ان لوگوں سے بیزار ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرنے لگتے تھے۔

''اے میرے معبود! تو نے مجھے کس قوم میں بھیج دیا ہے جو تیرا نام تو لیتے ہیں مگر اپنی کافرانہ رسمیں بدلنے کے لئے تیار نہیں۔'' پھر فریاد کرتے کرتے حضرت سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکالیف کا خیال آ جاتا تو آپ کی بے قرار طبیعت ٹھہر جاتی اور ایک نئے حوصلے کے ساتھ تبلیغِ دین کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے۔

اکثر مؤرخین کا خیال ہے کہ اہلِ لاہور، حضرت سید علی ہجویریؒ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اس لئے وصال کے بعد آپ کو ''داتا گنج بخش'' کہہ کر پکارنے لگے۔ مگر تحقیق کی روشنی میں ایسی ساری روایتیں درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت سید علی ہجویریؒ کی چند کرامات دیکھ کر لوگوں نے آپ کو زندگی ہی میں ''داتا'' کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔ آپ اپنے لئے ''داتا'' کا لقب سن کر سخت ناراض ہوتے تھے اور ڈانٹ کر کہتے:

''میری بات پورے ہوش و حواس کے ساتھ سن لو کہ ''داتا'' تو وہ ہے جو اپنی ذات میں واحد ہے اور ہم سب جس کی عبادت کرتے ہیں۔ جو تمہاری طرح علی ہجویری کو بھی دیتا ہے۔ بس وہی داتا ہے۔''

حضرت سید علی ہجویریؒ کی تبلیغی کوششوں کے نتیجے میں ہزاروں اہلِ ہنود مشرف بہ اسلام ہوئے اور بہت سی کافرانہ رسمیں ان کے گھروں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔ حضرت سید علی ہجویریؒ کا شمار ان با ہوش صوفیا کرام میں ہوتا ہے جن کا ہر عمل قرآن و سنت کے مطابق تھا۔ 465ھ میں یہ آفتابِ معرفت غروب ہو گیا۔ مگر ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود آپ کی روحانیت کا نور اب تک موجود ہے۔ اور حق تعالیٰ جنہیں توفیق دیتا ہے، وہ اس روشنی میں اپنی منزل تلاش کر لیتے ہیں۔

اس کے بعد ایک صدی تک کوئی بڑا صاحبِ عزیمت صوفی برصغیر میں نہیں آیا۔ چھوٹے پیمانے پر تبلیغِ اسلام کا سلسلہ جاری رہا، مگر اس کفرستان کو اس تاریخ ساز بزرگ کا انتظار تھا جو باطل کی اس پوری بساط ہی کو اُلٹ کر رکھ دے۔ آخر یہ اعزاز سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے حصے میں آیا جنہیں پاک و ہند کے عوام ''غریب نوازؒ'' اور ''سلطان الہند'' کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ اگر ہم دنیاوی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اس ''روحانی خلا'' کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کابل کی حکومت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے آپس میں نبرد آزما تھے اور ایک دوسرے کو قتل کر رہے تھے۔ اسی بگڑتی ہوئی سیاسی صورتِ حال میں شہاب الدین غوری نے طالع آزمائی کی کوشش کی۔ اس عظیم سالار نے 572ھ میں ملتان پر حملہ کیا اور آس پاس کے علاقوں کو ''قرامطہ'' کے قبضہ سے نکال لیا۔

قرامطہ ''باطنیوں'' کا ایک خوفناک فرقہ تھا، جس نے اسلام کو شدید نقصان پہنچایا۔ یہ تحریک 890ء میں شروع ہوئی اور پھر زور پکڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ 301ھ میں ابوطاہر ''قرامطہ'' کا قائد اور بادشاہ بن گیا۔ پھر اس نے

ا، مااملیف، لائف، ہجر اور بحرین کے علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ ہندوؤں کی طرح ابو طاہر خدا کا ''اوتار'' ہونے کا مدعی تھا۔ وہ علی الاعلان کہا کرتا تھا۔

''اللہ تعالیٰ کی روح میرے جسم میں حلول کر گئی تھی۔''

ابوطاہر قرمطی اسلام اور اہلِ ایمان کے لئے تاتاریوں سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوا۔ اس وقت خلافتِ بغداد بڑی حد تک کمزور اور بے اثر ہو چکی تھی۔ اس لئے ابوطاہر کو مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اقدامات کرنے کے بہترین مواقع میسر آئے۔ اس نے 311ھ میں بصرہ پر حملہ کیا اور بڑی تباہی مچائی۔

312ھ میں حاجیوں کے ایک قافلے کو بھی لوٹا۔ پھر ابوطاہر قرمطی نے ''کوفہ'' پر لشکر کشی کی اور اسے فتح کر لیا۔ 316ھ میں ''انبار'' فتح کر کے ''رحبہ'' پر بھی قبضہ کر لیا۔ ان تمام جنگوں میں ابوطاہر نے ہزاروں مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا اور ہزاروں کو قیدی بنا لیا۔ پھر وہ سارے مسلمان قیدی بھی قتل کر دیئے گئے۔ ان عام معرکوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ابوطاہر نے شہر ''ہجر'' میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی اور اسے ''دارالہجرہ'' کے نام سے موسوم کیا۔

مسلسل فتوحات نے ابوطاہر قرمطی کو پاگل کر دیا تھا۔ اب اس پر یہ جنون سوار ہوا کہ لوگ خانہ کعبہ کے حج اور طواف کو چھوڑ کر ''دارالہجرہ'' کا حج کریں۔ وہ کچھ دنوں تک اپنے اس شیطانی منصوبے کی تکمیل کے لئے مختلف تدابیر سوچتا رہا۔ آخر 319ھ میں اپنے ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ ابوطاہر قرمطی مکہ معظمہ پہنچا۔ یہ حج کا زمانہ تھا۔ ابوطاہر اور اس کے تمام سپاہی حاجیوں کے لباس میں تھے، اس لئے عام مسلمان ان فتنہ گروں کو پہچان نہ سکے۔ ابوطاہر شمشیرِ بے نیام لئے ''مسجد حرام'' میں داخل ہوا۔ پھر اُس نے خانۂ خدا میں بیٹھ کر شراب پی اور اس کے سپاہیوں نے طواف میں مصروف بے دست و پا مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ان کا سارا مال و اسباب بھی لوٹ لیا۔ اس کے بعد ابوطاہر قرمطی کے سپاہی شہر مکہ میں پھیل گئے اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ صرف حرم شریف میں ایک ہزار سات سو اہلِ ایمان شہید ہوئے۔ باقی شہیدوں کی تعداد معلوم نہیں۔ معتبر مؤرخین کی روایتوں کے مطابق ''چاہِ زم زم'' اور مکہ معظمہ کے دوسرے کنوئیں مسلمانوں کی لاشوں سے پٹ گئے۔ اس کے بعد وہ خبیث، خانہ کعبہ کے قریب آیا اور اس نے اللہ کے گھر کا دروازہ اُکھاڑ دیا۔ پھر وہ شیطان پوری طاقت سے نعرہ زن ہوا۔ (نعوذ باللہ):

''میں ہی اللہ ہوں اور اللہ میں ہی ہو سکتا ہوں۔ میں نے مخلوق کو پیدا کیا اور میں نے ہی انہیں موت کے گھاٹ اُتارا۔''

14 ذی الحج کو ابوطاہر قرمطی نے ''حجرِ اسود'' اُتار کر ''دارالہجرہ'' کی جامع مسجد پر آویزاں کر دیا۔ اُس شیطان کا خیال تھا کہ ''حجرِ اسود'' کی وجہ سے مسلمان مکہ معظمہ جانے کے بجائے ''دارالہجرہ'' آئیں گے اور اس کی بنائی ہوئی جامع مسجد کا طواف کریں گے۔ مگر کسی اہلِ ایمان نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ ''قرامطہ'' کی شرانگیزیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ مکہ معظمہ جانے والے تمام راستے خطرات سے بھرے ہوئے تھے۔ اس لئے دس سال تک مسلمان حج ادا نہ کر سکے۔ پھر ابوطاہر قرمطی نے ہر حاجی پر پانچ دینار ٹیکس لگا دیا اور حج کی اجازت دے دی۔

حجرِ اسود 22 سال تک ابوطاہر کے قبضے میں رہا۔ اس دوران بارہ سال تک مسلمانوں نے ''حجرِ اسود'' کے بغیر حج کے دیگر ارکان ادا کئے۔ 10 محرم 339ھ کو حجرِ اسود دوبارہ خانہ کعبہ میں نصب کیا گیا اس شیطان کو خداوند ذوالجلال نے بڑی عبرت ناک سزا دی اور اسے ساری دنیا کے سامنے ذلیل و رسوا کیا۔ ابوطاہر قرمطی چیچک کے

مرض میں اس طرح مبتلا ہوا کہ اس کا پورا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا۔ چیچک میں اس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی تھی اور پورے چہرے پر اس قدر بدنما داغ پڑ گئے تھے کہ اسے دیکھ کر لوگوں کو گھن آتی تھی۔ آخر ایک دن وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ مگر اُس کی تحریک جاری رہی۔ یہاں تک کہ قرامطہ نے ہندوؤں کی مدد سے ملتان میں ایک مضبوط گڑھ بنا لیا۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے سلطان محمود غزنوی کو اقتدار بخشا تو اُس نے اس فتنہ گر جماعت کی بنیادیں اُکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر لیا۔ سلطان محمود غزنوی، ہندوستان پر بار بار حملے اسی لئے کرتا تھا کہ وہ قرامطیوں کی بیخ کنی کر سکے۔ اور یہی اس مردِ مجاہد کا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ اس نے بڑی حد تک اس ''شیطانی تنظیم'' کا زور توڑ دیا تھا۔ مگر سلطان محمود غزنوی کے بیٹوں میں کوئی اس قابل نہ تھا کہ وہ اپنے باپ کے منصوبوں کو تکمیل تک پہنچائے۔ نتیجتاً سلطان کی وفات کے بعد ''قرامطہ'' دوبارہ ملتان میں جمع ہوئے اور طاقت پکڑ گئے۔

ایک طویل عرصے کے بعد شہاب الدین غوری نے ملتان پر حملہ کر کے قرامطہ کو شدید نقصان پہنچایا۔ پھر شہاب الدین غوری نے پشاور وغیرہ کے علاقے فتح کئے اور 587ھ میں اس نے ''بھٹنڈہ'' کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت یہ قلعہ دہلی اور اجمیر کے راجپوت حکمران پرتھوی راج چوہان کے زیرِ نگیں تھا۔ جب شہاب الدین غوری کابل جانے کے لئے پلٹا تو پھر پرتھوی راج چوہان نے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ غوری کا راستہ روکا۔ جس کے نتیجے میں ''ترائن'' کے مقام پر دونوں فوجوں کے درمیان ایک خوفناک جنگ ہوئی۔ ترائن کا قصبہ دہلی سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ فوج کی کمی اور بے ترتیبی کے سبب اس جنگ میں شہاب الدین غوری کو شکست ہوئی اور وہ شدید زخمی ہو کر گھوڑے سے گرنے والا تھا کہ اس کا بہادر اور وفادار غلام قطب الدین ایبک اپنے آقا کو صحیح و سلامت میدانِ جنگ سے نکال کر لے گیا۔

شہاب الدین غوری ایک نہایت حساس اور غیرت مند سالار تھا۔ اس نے پرتھوی راج چوہان سے اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے زبردست فوجی تیاریاں کیں۔ یہ روایت بہت شہرت رکھتی ہے کہ شہاب الدین غوری نے ایک سال تک وہ لباس بھی تبدیل نہیں کیا جو اس کے خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ جب کبھی اس کے بیوی بچے، عزیز واقارب اور امراء لباس تبدیل کرنے کے لئے کہتے تو وہ ایک ہی جواب دیتا:

''یہ لباس ہی تو ہے جو مجھے دن رات میری شکست کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ انشاء اللہ اب یہ خونیں قبا اس وقت تبدیل ہو گی۔ جب میں پرتھوی راج چوہان سے اپنی شکست کا بدلہ لوں گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر میرا یہ لباس کفن میں تبدیل ہو جائے گا۔''

اسی زمانے میں شہاب الدین غوری نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ کوئی نورانی صورت بزرگ اُسے مخاطب کر کے کہہ رہے تھے۔

''شہاب الدین! دوبارہ ہندوستان پر حملہ کر۔ اب کی بار حق تعالیٰ تجھے عظیم فتح سے ہمکنار کرے گا۔''

شہاب الدین غوری کو خواب کے ذریعے ہندوستان پر دوسرے حملے کی ترغیب دینے والے بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ، شہاب الدین غوری کے حملے سے تقریباً دس ماہ قبل اجمیر تشریف لائے تھے اور دین اسلام کی تبلیغ میں شب و روز مصروف تھے۔

شروع میں اجمیر کے راجہ پرتھوی راج چوہان نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے چند درویش خدمت گاروں کو ان ہندو جوگیوں اور سادھوؤں کی طرح سمجھا جو سخت ریاضتیں کرنے کے لئے جنگل جنگل گھومتے

رہتے ہیں۔ مگر جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اخلاقِ عالیہ سے متاثر ہو کر کچھ ہندو، مسلمان ہو گئے تو پرتھوی راج چوہان اور دوسرے راجپوت سرداروں کو فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں دین اسلام، اجمیر کے ایک ایک گھر میں داخل نہ ہو جائے۔ نتیجتاً پرتھوی راج چوہان نے اپنے سپاہیوں کو حکم دے دیا کہ مسلمان درویشوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں جنگل میں پھینک دی جائیں تاکہ جنگلی درندے اور مُردہ خور پرندے ان کے گوشت سے اپنی بھوک مٹالیں۔

پھر جب یہ شمشیر بکف راجپوت سپاہی، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور آپ کے ساتھیوں کو قتل کرنے کے لئے پہنچے تو ان کے جسم مفلوج ہو گئے۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی یہ کرامت دیکھ کر پورے اجمیر میں شور مچ گیا کہ آنے والا مسلمان درویش بہت بڑا جادوگر ہے۔ جس کے ''طلسم اور سحر'' کا توڑ کوئی بہت بڑا ہندو جادوگر ہی کر سکتا ہے۔ اس وقت پورے ہندوستان میں جوگی جے پال کے ساحرانہ کمالات کا بہت شہرہ تھا۔ توہم پرست ہندو اس جوگی سے بہت ڈرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جوگی جے پال اپنی روحانی طاقت کے ذریعے جسے چاہے ہلاک و برباد کر سکتا ہے۔ حالانکہ جے پال صرف ایک شعبدہ باز تھا جس نے مختلف مواقع پر اپنی شعبدہ بازیوں کے مظاہرے کر کے اہلِ ہندوستان کے دلوں میں خوف بٹھا دیا تھا۔

آخر دہلی اور اجمیر کے راجہ پرتھوی راج چوہان کی درخواست پر جوگی جے پال، مسلمان درویش کو تباہ کرنے کے لئے اجمیر آیا۔ اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے اپنے تمام جادوئی کرتب دکھا ڈالے۔ مگر مردِ مومن کی ایک نگاہِ جلال کو برداشت نہیں کر سکا۔ جوگی جے پال کی عمر بھر کی کافرانہ ریاضتیں اور شعبدہ بازیاں ایک مٹھی بھر خاک کی طرح ہوا میں اُڑ گئیں اور وہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے قدموں میں جھک گیا۔ اس نے ہزاروں دیوتاؤں کی نفی کر کے ''وحدہٗ لاشریک'' کی بندگی کا اقرار کر لیا۔ یہ ایک مردِ مومن کی اس نگاہ کا اثر تھا، جس کے بارے میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث موجود ہے۔

''مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

اسی حدیث پاک کو علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اسی مضمون کو حضرت امیر خسروؒ نے بڑے عجیب شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

چھاپ تلک سب چھین لی رے مو سے نیناں ملائے کے
(تیری ایک نظر نے مجھ سے بت پرستی کی ساری نشانیاں چھین لیں)

حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کا یہ ہندی گیت دراصل ان کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی منقبت ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ نے نظر ملا کر جوگی جے پال کے کفر کی ساری نشانیاں مٹا دی تھیں۔ ہندوستان کے سب سے بڑے جادوگر کے مسلمان ہوتے ہی پرتھوی راج چوہان کی نیندیں حرام ہو گئیں۔

روایت ہے کہ اجمیر کے راجپوت حکمران کی ماں نے مرنے سے پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ کوئی مسلمان درویش اس علاقے میں داخل ہوتا ہے اور اس کے آتے ہی اجنبی سپاہیوں کے گھوڑے، راجپوتوں کی لاشیں روند ڈالتے ہیں۔ ہر طرف خون کا سیلاب ہے جو مکانوں سے گزرتا ہوا تارا گڑھ پہاڑ کی طرف بڑھتا ہے اور پھر اس سیلاب میں پورا قلعہ ڈوب جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ''تارا گڑھ'' پہاڑ اجمیر میں سطحِ زمین سے تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی

پر واقع ہے اور اسی پہاڑ پر پرتھوی راج چوہان کا مضبوط ترین قلعہ تھا جسے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔

پھر جب پرتھوی راج کی بوڑھی ماں نے ہندو گیانیوں (عارفوں) اور نجومیوں کے سامنے اپنا یہ خواب بیان کیا تو سب لوگوں نے بیک زبان ایک ہی بات کہی کہ یہ خواب شاہی خاندان اور ''راجپوتانہ'' کی سرزمین کے لئے نیک شگون نہیں ہے۔ (راجستھان کا پرانا نام ''راجپوتانہ'' تھا)

نجومیوں اور گیانیوں کی اس تعبیر کے بعد راجپوت سمراٹ پرتھوی راج چوہان کی ماں نے بڑے عاجزانہ لہجے میں بیٹے کو یہ نصیحت کی تھی کہ اگر کوئی مسلمان درویش، اجمیر میں داخل ہو تو اس کی مخالفت نہ کی جائے۔ پرتھوی راج چوہان نے مرتی ہوئی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی وصیت پر عمل کرے گا۔ مگر جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر تشریف لائے تو وہ بت پرستی کے جوش اور طاقت کے نشے میں اپنا وعدہ فراموش کر بیٹھا۔

اجمیر و دہلی کے حکمران پرتھوی راج چوہان نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مسلمان درویشوں پر پانی بند کر دیں تاکہ یہ لوگ پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں یا پھر اجمیر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ نتیجتاً راجپوت سپاہیوں نے پورے ''اناساگر'' کو گھیر لیا ''اناساگر'' اس وقت ایک بہت بڑا تالاب تھا جس سے اجمیر کے تمام باشندے اپنی ضرورت کے مطابق پانی حاصل کرتے تھے۔ ''اناساگر'' کے کنارے ہی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا قیام تھا۔ آپ کے خدمت گار درویشوں نے سر چھپانے کے لئے گھاس پھونس کی ایک جھونپڑی بنا دی تھی۔ دراصل یہ جھونپڑی نہیں، برصغیر ہندوستان کی دوسری بڑی اور باقاعدہ خانقاہ تھی جہاں بیٹھ کر سلسلۂ چشتیہ کا مردِ انقلاب، ہندوستان کی سب سے سرکش، جنگجو، شجاع اور بت پرست قوم سے تعلق رکھنے والے راجپوتوں کو خدائے واحد کا پیغام دیا کرتا تھا۔ واضح رہے کہ ہندوستان میں پہلی بڑی خانقاہ لاہور میں تھی جہاں حضرت سید علی ہجویریؒ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے والوں کی تربیت کیا کرتے تھے۔

پھر جب ''اناساگر'' پر راجپوت سپاہیوں کا پہرہ لگ گیا تو حسب عادت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ایک خدمت گار پینے کا پانی لینے کے لئے ''اناساگر'' پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی مسلح سپاہیوں نے نہایت تحقیر آمیز اور مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا:

''آج سے تم لوگوں کا پانی بند کر دیا گیا ہے۔ اگر تمہیں پانی کی ضرورت ہے تو کہیں اور سے لے آؤ۔ مگر آئندہ ''اناساگر'' کا رخ نہ کرنا۔ اور اس غلط فہمی میں بھی نہ رہنا کہ تم رات کے اندھیرے میں یہاں سے چوری چھپے پانی بھر کر لے جاؤ گے۔ جیسے ہی سورج غروب ہوگا، راجپوت سپاہیوں کا دوسرا مسلح دستہ یہاں آجائے گا۔ اور رات بھر پلکیں جھپکائے بغیر ''اناساگر'' کے پانی کی حفاظت کے لئے پہرہ دیتا رہے گا۔ اگر تم میں سے کسی نادان نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو آنکھیں کھول کر شمار کر لو کہ یہاں راجپوت سورماؤں کی تلواریں کتنی ہیں اور تم ''ملیچھوں'' کے سر کتنے ہیں۔''

واضح رہے کہ ہندوؤں میں چار قومیں مشہور ہیں۔ پہلی برہمن جسے بہت زیادہ مقدس اور متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ''برہما یعنی خدا کی اولاد کہتے ہیں۔ دوسرے راجپوت جنہیں ''برہمنوں'' کی حفاظت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر راجپوت ہندوستانی حکمرانوں کی فوج میں شامل ہوتے تھے۔ تیسرے کسان، بنیئے اور بقالی وغیرہ جو کھیتی باڑی اور تجارت وغیرہ کیا کرتے تھے۔ چوتھی قوم ''اچھوت'' کہلاتی ہے۔ اس قوم کے افراد صرف برہمنوں، راجپوتوں اور بنیوں کی مخصوص خدمت کیا کرتے تھے۔ یعنی ان کی غلاظت اور نجاست پھینکنے

کی خدمت..... یہ لوگ کسی مندر میں جا کر پوجا پاٹ (عبادت و ریاضت) کرنے کے لائق نہیں تھے۔ انتہا یہ ہے کہ اچھوتوں کو اعلیٰ نسل کے ہندوؤں کے تالابوں اور کنوؤں سے پانی بھرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اگر کبھی مجبوراً یا غلطی سے کوئی اچھوت ان کنوؤں یا تالابوں سے پانی بھر لیتا تو اسے سرعام سخت سزا دی جاتی۔ اور اس قدر زدوکوب کیا جاتا کہ وہ بے چارہ جبر و تشدد کی تاب نہ لا کر مر جاتا۔ اچھوتوں کے دو نام اور بھی ہیں۔ ایک ''شودر'' اور دوسرا ''ملیچھ'' یعنی ناپاک۔ اسی لئے جب شروع میں مسلمان برصغیر ہندوستان آئے تو اہلِ ہنود انہیں ملچھ کہہ کر پکارتے تھے۔ آج بھی سخت متعصب ہندو، مسلمانوں کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

راجپوت سپاہیوں کی بات سن کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا خدمت گار بدحواس ہو گیا۔ کیونکہ ''اناساگر'' سے فراہمی آب نہ ہونے کے باعث مسلمانوں کو پانی حاصل کرنے کے لئے کئی میل کا دشوار گزار سفر طے کرنا پڑتا۔ پھر بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہاں سے پانی حاصل ہو جاتا۔ اسی صورتِ حال نے حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے خادم پر وحشت طاری کر دی تھی۔

پھر جب اس نے حاضرِ خدمت ہو کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے پورا واقعہ بیان کیا تو آپؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''ان لوگوں سے کہو کہ بس ایک بالٹی پانی بھر لینے دو۔ پھر ہم اناساگر کی طرف نہیں آئیں گے۔''

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے خادم نے واپس جا کر درخواست کے لہجے میں اپنی خواہش ظاہر کی تو مسلح راجپوت سپاہیوں نے قہقہہ لگایا پھر یہ کہہ کر مسلمان درویش کو ''اناساگر'' سے پانی بھرنے کی اجازت دے دی۔

''ایک رات اور پانی پی کر اپنی جانیں بچا لو۔ کل سے تو تمہیں پیاسا مرنا ہی ہے۔''

مسلمان درویش نے راجپوت سپاہیوں کی طنزیہ گفتگو سنی جس میں بڑی صداقت نظر آتی تھی۔ کیونکہ ایک بالٹی پانی تو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے خدمت گار درویشوں کے وضو ہی میں خرچ ہو جاتا۔ الغرض شدید ذہنی کشمکش سے دوچار ہونے کے باوجود مسلمان درویش نے پوری بالٹی پانی سے بھر لی اور حضرت خواجہؒ کی خانقاہ (جھونپڑی) کی طرف بڑھا۔

پھر جیسے ہی مسلمان درویش واپس گیا، راجپوت سپاہیوں پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ حیرت کی زیادتی سے ان کی آنکھیں ایسے پھٹی ہوئی تھیں جیسے وہ کوئی خوف ناک منظر دیکھ رہے ہوں۔ چند لمحوں میں ''اناساگر'' جیسا طویل و عریض تالاب خشک ہو گیا اور اس میں پانی کی جگہ کیچڑ نما دلدل نظر آنے لگی۔ جب راجپوت سپاہیوں کے حیرت و سکوت کی کیفیت زائل ہوئی تو وہ بیک زبان چیخنے لگے۔

''یہ سب اسی جادوگر کا کھیل ہے جس نے جوگی جے پال کو اپنا دھرم (مذہب) بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہم اسے اور اس کے ساتھیوں کو پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر اب ''اناساگر'' کے خشک ہو جانے سے اہلِ اجمیر کی جانوں کے لالے پڑ جائیں گے۔''

پھر اسی وحشت و بدحواسی کے عالم میں تمام راجپوت سپاہی اپنے سمراٹ (شہنشاہ) پرتھوی راج چوہان کے دربار میں حاضر ہوئے اور انتہائی شکستہ لہجے میں ''اناساگر'' کے خشک ہو جانے کا حال بیان کرنے لگے۔

جیسے ہی راجپوت سپاہی خاموش ہوئے، پرتھوی راج چوہان نے غضب ناک لہجے میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے کہ تم بھی اس مسلمان جادوگر کے فریب میں آ گئے ہو۔ ورنہ کون ذی ہوش انسان اس بات کو تسلیم

کرے گا کہ صدیوں سے راجپوتوں کی پیاس بجھانے والا ''انا ساگر'' یکا یک خشک ہو گیا ہے؟''

راجپوت سپاہیوں نے اپنی دیوی دیوتاؤں کی قسمیں کھا کر پرتھوی راج چوہان کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ مگر وہ مسلسل یہی کہتا رہا کہ یہ لوگ منافقت سے کام لیتے ہوئے جھوٹ بول رہے ہیں۔

پرتھوی راج چوہان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ایک سپاہی نے انتہائی جرأت و بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''سمراٹ! آپ کس منافقت کی بات کر رہے ہیں؟ ہم کھرے اور سچے لوگ ہیں۔ جو بات دل میں ہے، وہی زبان پر بھی ہے۔ اور ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہی بیان کر رہے ہیں۔''

آخر ایک دانش مند وزیر نے پرتھوی راج چوہان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''سمراٹ! اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے کہ آپ جن لوگوں پر اعتبار کرتے ہیں، انہیں بھیج کر صورتِ حال کی تحقیق کرائیں۔''

پھر اجمیر و دہلی کے حکمران نے اس وزیر اور چند دوسرے سالاروں کو اس واقعے کی تحقیق کے لئے ''انا ساگر'' کی طرف بھیجا۔ ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے بھی وہی نا قابل یقین منظر تھا۔ ''انا ساگر'' جو ایک بہت بڑی جھیل اور کسی چھوٹے دریا کی طرح تھا اور کچھ دیر پہلے جس کا پانی موجیں مار رہا تھا، اب وہاں کیچڑ اور دلدل کے سوا کچھ نہیں تھا۔

جب ان معتبر لوگوں نے اپنا مشاہدہ بیان کیا تو پرتھوی راج چوہان بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے شدید بے چارگی کے عالم میں اپنے مشیروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آخر اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے؟ نہ ہمارے سپاہی اس مسلمان جادوگر کو قتل کر سکتے ہیں اور نہ اسے یہاں سے جانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔''

''سمراٹ! سب سے پہلے تو ''انا ساگر'' کا مسئلہ ہے۔ اب اجمیر کے باشندے پانی کہاں سے لائیں گے؟ کچھ دیر پہلے ہم لوگ اس مسلمان جادوگر اور اس کے ساتھیوں کو پیاس سے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتے تھے۔ مگر اچانک ہماری چال ہم ہی پر اُلٹ گئی ہے۔ اب تو اہلِ اجمیر کی موت و حیات کا معاملہ ہے۔''

''کچھ بھی ہو، میں اس مسلمان جادوگر سے پانی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ تم آخری بار اسے تنبیہہ کر دو کہ وہ اور اس کے ساتھی خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے جائیں ورنہ میرے گھوڑے ان سب کو روند ڈالیں گے۔'' یہ کہہ کر پرتھوی راج چوہان نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ شاہی خاندان اور اہلِ قلعہ کے لئے دوسرے علاقوں سے پانی حاصل کریں۔

پرتھوی راج چوہان نے حکومت کے وسائل کام میں لاتے ہوئے اپنے خاندان اور سپاہیوں کے لئے دور دراز کے علاقوں سے پانی حاصل کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا اور غریب رعایا کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

صورتِ حال اس قدر عجیب اور پیچیدہ تھی کہ ارا کینِ سلطنت کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر اجمیر کے کچھ دور اندیش امیروں اور فوجی سالاروں نے آپس میں مشورہ کر کے طے کیا کہ اس سلسلے میں براہِ راست مسلمان جادوگر سے بات کی جائے۔ پھر سلطنتِ اجمیر کے معزز افراد پر مشتمل یہ وفد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کرنے لگا۔

''پانی پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس لئے ''اناساگر'' کا پانی بحال کر دیا جائے۔''
عمائدینِ اجمیر کی بات سن کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں فرمایا۔
''کیا یہ بات تمہاری عقل میں آتی ہے کہ کوئی انسان، ہواؤں کی رفتار اور بادلوں کے برسنے کو روک سکتا ہے؟ اور اسی طرح کیا کسی آدم زاد میں اتنی طاقت ہے کہ وہ کسی دریا یا جھیل کو خشک کر سکتا ہے؟''
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اس سوال کے جواب میں ایک راجپوت سردار نے کہ۔
''ہمارے سپاہیوں نے یہی بتایا ہے کہ تمہارے ایک ساتھی نے ''اناساگر'' سے ایک بالٹی بھری اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا پانی خشک ہوگیا۔''
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے مسکراتے ہوئے اس بالٹی کی طرف اشارہ کیا جو آپؒ کی جھونپڑی کے ایک گوشے میں رکھی تھی اور جس کا زیادہ تر پانی مسلمان درویشوں کے استعمال میں آچکا تھا۔
''کیا تمہارا ''اناساگر'' اتنا چھوٹا تھا کہ ایک چھوٹی سی بالٹی میں سما گیا؟'' یکایک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لہجے سے جلالِ روحانی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ ''یہ مجھ عاجز و ناتواں کا کام نہیں، اس خدائے واحدؑ کی بے پناہ طاقت کا ادنیٰ ترین کرشمہ ہے جس کا تم مسلسل انکار کر رہے ہو۔ تم اپنی قوت کا جس قدر استعمال کر سکتے تھے، وہ کر چکے۔ اب اس کی قدرت کے مظاہرے کھلی آنکھوں سے دیکھ لو جو اس پوری کائنات کا مالک ہے۔''
ابھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور عمائدین اجمیر کے درمیان یہ گفتگو جاری تھی کہ ناگہاں جھونپڑی کے باہر بہت سے لوگوں کا شور سنائی دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کچھ لوگ اندر داخل ہو گئے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے رو رو کر عرض کرنے لگے۔
''آخر ہم نے آپ کو کون سی اذیت پہنچائی ہے کہ جس کے بدلے میں ''اناساگر'' کا پانی بند کر کے ہمیں دردناک سزا دی جا رہی ہے؟'' یہ اجمیر کے سادہ لوح اور غریب باشندے تھے جو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے حضور میں فریاد کر رہے تھے۔
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ان لوگوں کو بھی وہی جواب دیا۔
''میں بھی تمہاری طرح ایک کمزور سا انسان ہوں۔ تم ہزاروں دیوی دیوتاؤں پر یقین رکھتے ہو، مگر میں اس خدا پر ایمانِ کامل رکھتا ہوں جو اپنی ذات میں واحد ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں۔ اور یہ کام اسی کا ہے جو صرف ''اناساگر'' کا نہیں، دنیا کے تمام سمندروں اور دریاؤں کا مالک ہے۔ یہ سب اسی کے حکم سے بہتے ہیں اور اسی کے حکم سے خشک ہو جاتے ہیں۔ اسی کو پکارو، وہ تمہارے ''اناساگر'' کو دوبارہ پانی سے بھر دے گا۔''
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بڑے تدبر کے ساتھ اجمیر کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی۔
واضح رہے کہ قرآن کریم میں واضح طور پر تبلیغ کا طریقہ سکھاتے ہوئے کہا گیا ہے:
(ترجمہ) ''لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بلاؤ۔''
جب حضرت موسیٰ علیہ السلام، اللہ تعالیٰ کے حکم پر فرعون کو خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت دینے کے لئے اس کے دربار کی طرف روانہ ہوئے تو آپؑ پر ان الفاظ میں وحی نازل ہوئی:
(ترجمہ) ''نرم لہجہ اختیار کرنا۔ شاید وہ ہدایت پا جائے۔''
جاننے والے جانتے ہیں کہ فرعونِ مصر نے اپنی ذات کو خدا کا شریک نہیں بنایا تھا۔ بلکہ وہ لوگوں کو مخاطب کر کے علی الاعلان کہتا تھا:

''میں نے تمہارے خدا کو قتل کر دیا ہے۔ اور اب اس کی جگہ میں تمہارا رب ہوں۔ انا ربکم الاعلیٰ۔ (میں تمہارا بڑا رب ہوں)''

قرآن حکیم میں فرعون کی اس سرکشی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

(ترجمہ) ''وہ حد سے گزر جانے والا تھا۔''

جو انسان حد سے گزر گیا ہو، اس کے حوالے سے بھی اپنے عظیم و جلیل رسول کو حکم دیا جا رہا ہے کہ فرعون سے گفتگو کرتے وقت نرم لہجہ اختیار کیا جائے۔

اس واقعے کی روشنی میں ہمارے مبلغین کو بھی سمجھ لینا چاہئے کہ تبلیغ کے وقت ان کو کس لب و لہجے کی ضرورت ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اجمیر کے باشندوں کو سمجھانے کے لئے تبلیغ کا وہی معروف اسلامی طریقہ اختیار کیا۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی بات سن کر اجمیر کے باشندوں نے بڑے عاجزانہ لہجے میں جواب دیا۔

''ہم اپنے دیوی دیوتاؤں کو ہزار بار پکار چکے ہیں۔ مگر اناساگر ویسے ہی خالی پڑا ہے۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا:

''اس کائنات کا مالک ایک خدا ہے، ہزاروں دیوتا نہیں۔ جب اس کو پکارو گے تو تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔''

''ہم نہیں جانتے کہ تمہارا ایک خدا کون ہے؟ پھر ہم اسے کیسے پکاریں؟'' اجمیر کے باشندوں نے شدید بے چارگی کے لہجے میں کہا۔

عمائدینِ اجمیر جو ''اناساگر'' کے مسئلے میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے گفتگو کرنے کے لئے حاضر ہوئے تھے، ان کی چوڑی پیشانیوں پر کئی بل پڑ گئے تھے اور ناگواری کے سبب ان کے تانبے جیسے چہرے سرخی مائل ہو گئے تھے۔ راجپوت سرداروں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ ان ہی کے سامنے ان ہی کی قوم کے لوگ ایک مسلمان جادوگر سے ''اناساگر'' کے پانی کی بھیک مانگیں۔ حالانکہ وہ خود بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے درخواست ہی کرنے آئے تھے۔ مگر برسر اقتدار طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے ان کی مونچھوں میں تناؤ تھا اور گردنیں اکڑی ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے اجمیر کے غریب باشندوں کو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے دیکھا تو ایک راجپوت سردار انتہائی غضب ناک لہجے میں چیختے ہوئے بولا۔

''پیاس سے تڑپ تڑپ کے مر جاؤ۔ مگر اپنے دیوی دیوتاؤں کو غیروں کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کرو۔''

اس سے پہلے کہ اجمیر کے وہ غریب باشندے اپنے سرداروں کو کچھ جواب دیتے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے عمائدینِ اجمیر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''یہ مجبور اور بے کس لوگ ایک فقیر کے مہمان ہیں۔ اس وقت آپ حضرات کو یہ حق حاصل نہیں کہ میرے مہمانوں کی تحقیر و تذلیل کریں۔ ہاں! جب یہ لوگ میرے دروازے سے چلے جائیں تو آپ بااختیار ہیں کہ اپنی رعایا کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بات سن کر ایک راجپوت سردار نے نہایت تند و تیز لہجے میں کہا۔

''اب ہم اپنے دھرم (مذہب) میں تمہاری زیادہ مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔''

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے متبسم لہجے میں فرمایا۔

''میں تمہارے دھرم میں کوئی مداخلت نہیں کر رہا ہوں۔ مداخلت تو اسے کہتے ہیں کہ کسی شخص پر زور، طاقت، جبر کر کے اس سے اپنی بات منوانے کی کوشش کیجائے۔ وہ فقیر کسی پر کیا جبر کرے گا جو درختوں کے پتے اور جنگلی پھل کھا کر اپنے روز و شب بسر کرتا ہے۔ جبر تو تم لوگ کر سکتے ہو جن کے پاس ہزاروں لڑا کا سپاہی، گھوڑے، ہاتھی، شمشیریں اور تیر کمان ہیں۔ مگر اہلِ اسلام کو یہ تمام مادی طاقتیں اور جنگی وسائل حاصل ہوں، تب بھی وہ کسی ایک شخص کو اس کا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہی ہمارے اللہ کا حکم ہے جو اپنی ذات میں تنہا ہے۔''

راجپوت سردار ایک بار پھر شدید حیرت سے دوچار ہو گئے اور ان کی حیرت کی وجہ یہ تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ان ہی کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اجمیر میں داخل ہونے سے پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ملتان میں طویل قیام فرمایا تھا۔ اس وقت ملتان، راجپوتوں اور برہمنوں کا گڑھ تھا۔ آپؒ نے اپنے طویل قیام کے دوران ہندو پنڈتوں سے دنیا کی ایک مشکل زبان ''سنسکرت'' سیکھی تھی۔ جو شخص سنسکرت جانتا ہے، اس کے لئے ہندی زبان لکھنا یا بولنا ایک نہایت معمولی سی بات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر کے عمائدینِ سلطنت سے ان ہی کی زبان میں نہایت روانی سے گفتگو کر رہے تھے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے راجپوت سرداروں کی تنبیہہ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اجمیر کے ان باشندوں کی طرف دیکھا جو آپؒ کے آستانے پر فریاد لے کر آئے تھے۔ اور پھر نہایت دل آویز لہجے میں فرمایا۔

''تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ فقیر تمہارے مقابلے میں کہیں زیادہ بے سرو سامان ہے۔ لیکن ہم مسلمانوں کا طریقہ ہے کہ اپنے گھر آئے ہوئے مہمانوں کی خاطر مدارت ضرور کرتے ہیں، چاہے وہ خشک روٹی سے ہو یا خالی پانی سے۔''

یہ کہہ کر حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے اپنے اس خدمت گار کو حکم دیا جو ''اناساگر'' سے ایک بالٹی پانی بھر کر لایا تھا۔ ''ان پیاسے لوگوں کو ان کا پانی واپس کر دو۔''

پیر و مرشد کا حکم سن کر خادم نے پانی کی وہ بالٹی اُٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔ اور پھر وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خانقاہ سے نکل گیا۔

وہ بڑا عجب منظر تھا جب اجمیر کے بہت سے غریب باشندے ایک مسلمان درویش کے پیچھے پیچھے تھے اور یہ دیکھنے کے لئے مضطرب تھے کہ ''اناساگر'' کا کھویا ہوا پانی کس طرح واپس آتا ہے؟ پھر جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خادم نے بالٹی کا پانی تالاب میں ڈالا تو اہلِ اجمیر کی آنکھوں کے سامنے ایک اور ناقابلِ یقین منظر اُبھر آیا۔ چند لمحے قبل جس ''اناساگر'' میں کیچڑ اور دلدل کے سوا کچھ نہ تھا، وہ دوبارہ صاف و شفاف پانی سے لبریز ہو گیا تھا

''اناساگر'' کے خشک ہونے اور پھر پانی سے بھر جانے کے واقعہ نے اجمیر کے عوام میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا اور وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے:

''ہمارے باپ دادا نے صدیوں تک جن دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی، وہ چپ چاپ ''اناساگر'' کو ایک مسلمان کے چھوٹے سے برتن میں سمٹتے دیکھتے رہے اور کچھ نہ کر سکے۔ پھر اسی مسلمان نے ہم پر رحم کھا کر ہمارا پانی واپس کیا۔ اب دونوں میں کون سچا ہے؟ مسلمانوں کا ایک خدا یا ہمارے سینکڑوں دیوی دیوتا؟''

یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک ایسی کرامت تھی جس نے بت پرستوں کے عقائد کی قدیم ترین عمارت میں گہرے شگاف ڈال دیئے تھے اور اس کی بنیادیں لرزنے لگی تھیں۔

''مادہ پرست'' اور ''عقلیت پسند'' لوگ تو خدا کے وجود ہی سے انکار کر دیتے ہیں۔ پھر وہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی اس کرامت کو کس لیے تسلیم کریں گے؟ بس اس تاریخ ساز واقعے کے بارے میں اتنا ہی کہیں گے کہ یہ محض اتفاق تھا یا پھر کوئی حادثہ۔ واضح رہے کہ مفکرین کی یہ جماعت اس کائنات اور اولادِ آدم کی تخلیق کو ''اتفاق اور حادثے'' کا نتیجہ قرار دیتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ سب کچھ خود بخود وجود میں آ گیا ہے۔ ہمیں بھی اس گروہ سے کوئی غرض نہیں۔ وہ اپنے راستے پر اور ہم اپنے راستے پر۔ مگر وہ لوگ جو مسلمان ہونے کے باوجود صوفیائے کرام کی کرامت سے انکار کرتے ہیں، ان کے لئے مذہب کی روشنی میں اس تاریخ ساز واقعے کی عقلی توجیہہ ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے کہ جب کوئی بندہ روح کی گہرائی کے ساتھ ہم پر ایمان لے آتا ہے اور اپنی جانیں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے تو ہم اس کی زبان اور ہاتھ بن جاتے ہیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اس فرمانِ حق کو اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے ۔

ہاتھ ہے اللہ کا ، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں ، کارکشا و کارساز

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ نے بھی اپنے ایک شعر میں بندۂ مومن کی اس روحانی طاقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے ۔

اولیاء را ہست قدرت ازالہ
تیر جستہ باز گرداندز راہ

ترجمہ: ''اولیائے کرام کو اللہ کی طرف سے یہ قدرت بخشی جاتی ہے کہ وہ کمان سے چھوڑے ہوئے تیر کو موڑ کر واپس لا سکتے ہیں۔''

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، مگر ''اناساگر'' کے خشک ہو جانے کا واقعہ ہندوستان کی قدیم ترین کتابوں میں موجود ہے۔ چند سال پہلے یورپ کے کسی ملک میں ایک جھیل جو 63 میل کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی، اسی لمحے دیکھتے دیکھتے خشک ہو گئی تھی۔ اس علاقے کے بیشتر لوگ اسی طویل و عریض جھیل سے اپنی ضرورت کا پانی حاصل کرتے تھے۔ شام کو جب وہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو جھیل کا پانی اس کے کناروں کو چھو رہا تھا۔ مگر جب صبح مقامی باشندے جھیل پر پہنچے تو وہاں کیچڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک رات میں خشک ہو جانے والی اس جھیل کی تصاویر پاکستان کے تمام اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔

اس واقعے سے قطع نظر ''سورۂ ملک'' کی آخری آیت کا بھی کچھ یہی مفہوم ہے:

(ترجمہ) ''تم لوگ جو میٹھا پانی استعمال کرتے ہو، اگر اسے خشک کر دیا جائے تو کیا تم ہمیں اس کام سے روک سکو گے؟''

اس کے برعکس جب ''طوفانِ نوح'' آیا تھا تو خالقِ کائنات کی طرف سے آسمان اور زمین کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے دہانے کھول دیں۔ پھر منکرینِ حق نے دیکھا کہ پورے کرۂ ارض پر پانی ہی پانی تھا اور زمین کی ہر بلندی اس پانی میں غرق ہو گئی تھی۔ اب کوئی منکرینِ حق سے پوچھے کہ آناً فاناً اتنا پانی کہاں سے آ گیا تھا۔ پھر جب حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ''جودی'' پہاڑ پر ٹھہر گئی تو پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانی کا یہ سمندر کہاں غائب ہو گیا؟ ان

جغرافیائی حقائق کی روشنی میں بس ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر شے خالقِ کائنات کے حکم کے تابع ہے۔ اجمیر کا ''اناساگر'' بھی اسی کے حکم سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے کوزے میں سمٹ گیا تھا۔

ایک مسلمان درویش کی اس عظیم الشان کرامت کا فطری ردِعمل تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ پرتھوی راج چوہان اور دوسرے راجپوت سردار ہدایت پا جاتے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خدائے واحد پر ایمان لے آتے۔ مگر ان کی قسمت میں تو ہلاکت خیز گمراہی لکھ دی گئی تھی۔ نتیجتاً راجپوت سمراٹ پرتھوی راج چوہان نے چند بے دست و پا مسلمان درویشوں کے مقابلے میں بھرپور مادی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے چند سرداروں کو اس حکم کے ساتھ دوبارہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پاس بھیجا:

''بس تمہیں تین دن کی مہلت دی جاتی ہے کہ خاموشی کے ساتھ صرف اجمیر ہی سے نہیں، راجپوتانہ (راجستھان) کی حدود سے بھی نکل جاؤ۔ ورنہ تمہیں جبراً نکال دیا جائے گا۔''

جب راجپوت سرداروں نے اپنے فرمانروا کا حکم حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو سنایا تو پہلی بار آپ کے چہرہ مبارک سے رنگِ جلال ظاہر ہوا۔ اور پھر اسی کیفیت میں فرمایا۔

''تُو مجھے یہاں سے کیا نکالے گا۔ میں نے تجھے بحکمِ خدا زندہ حالت میں لشکرِ اسلام کے حوالے کیا۔''

اس واقعہ کے دوسرے دن ہی شہاب الدین غوری کا لشکر ''ترائن'' کے میدان میں آ پہنچا۔ یہ 588ھ کا واقعہ ہے۔ ایک خونریز جنگ کے بعد راجپوتوں کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ ہندوستان کے اہلِ ہنود، پرتھوی راج چوہان کو ''فخرِ راجپوت'' کہا کرتے تھے۔ مگر اس معرکے میں وہ فخرِ راجپوت دریائے ''سرسوتی'' کے کنارے گرفتار ہوا۔ اور پھر اسے زنجیریں پہنا کر شہاب الدین غوری کے سامنے پیش کیا گیا۔

اس عظیم الشان فتح کے بعد شہاب الدین غوری، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوا۔ اس واقعے میں دورِ جدید کے مسلمانوں کے لئے بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ قرآن کریم میں ایک مقام پر اہلِ ایمان کی تالیفِ قلب کے لئے فرمایا گیا ہے:

''اگر مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ صرف اللہ کے توکل پر اجمیر میں داخل ہوئے تھے۔ راجپوتوں کی تمام عسکری طاقت بھی ایک تنہا درویش کو قتل کر سکی اور نہ اسے اس علاقے سے بے دخل کیا جا سکا۔ آج پرتھوی راج چوہان کا ذکر صرف تاریخی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے مادی آثار میں صرف ''تاراگڑھ'' پہاڑ پر واقع قلعے کے کچھ کھنڈر باقی ہیں جس مقام پر یہ ''فخرِ راجپوت'' اپنا دربار آراستہ کیا کرتا تھا، اس جگہ حضرت سید میراں حسینؒ کا مزارِ مبارک ہے جو دوسری جنگ ترائن میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔

آج تک کسی تذکرہ نگار نے اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ برصغیر ہندوستان کے حوالے سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو سب سے مشکل کام سونپا گیا تھا۔ آپؒ نے جس قوم کے سامنے خدائے واحد کا پیغام پیش کیا، وہ ہندوستان کی سب سے جنگجو، شجاع اور سرکش قوم تھی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا انتقال 633ھ میں ہوا۔ جب آپؒ دنیا سے رخصت ہوئے تو اس وقت تک ڈیڑھ لاکھ راجپوت آپؒ کے دستِ حق پرست پر ایمان لا چکے تھے۔ اسلام پر بہتان تراشنے والے بتائیں کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے پاس کتنی تلواریں تھیں اور کتنے سپاہی تھے؟

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ''غریب نواز'' کے علاوہ ''ہند الولی'' اور ''سلطان الہند'' کے القاب سے بھی

یاد کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ''سلطان الہند'' کا لقب آپؒ کے مسلمان عقیدت مندوں کی طرف سے دیا گیا ہوگا۔ مگر گردشِ ایام اور روز و شب کے اُلٹ پھیر میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ واقعتاً حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہی ہندوستان کے حقیقی سلطان ہیں۔ آٹھ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی آپؒ کے اقتدار کو اندیشۂ زوال نہیں۔

حضرت سلطان الہندؒ کے دربارِ عالیہ میں سلطان قطب الدین ایبک، سلطان شمس الدین التمش اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر جیسے باجبروت فرمانروا بھی سرِ نیاز خم کئے ہوئے انتہائی جوشِ عقیدت کے ساتھ حاضر ہو چکے ہیں۔ خیر یہ سب تو دین دار حکمران تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی بارگاہ میں ان لوگوں کا حاضر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حیرت کا مقام تو وہ ہے جب مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر پیادہ پا اور برہنہ سر حضرت سلطان الہندؒ کی خدمت میں ایک عاجز و ناتواں انسان کی حیثیت سے حاضر ہوا تھا۔ قارئین کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ وہی شہنشاہ جلال الدین اکبر ہے کہ جس کے دو بدعقیدہ وزیروں فیضی اور ابوالفضل نے اس جاہل حکمراں کے دل و دماغ پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ اور پھر ان ہی دونوں بھائیوں کے ورغلانے سے اکبر نے ایک نئے مذہب ''دینِ الٰہی'' کی بنیاد رکھی تھی۔ اور اس نئے مذہب میں جلال الدین اکبر کو پیغمبر کا درجہ حاصل تھا۔ بعض محققین کی رائے کے مطابق شہنشاہ اکبر، خدائی کا دعویدار تھا۔ یہ دینِ الٰہی کا موجد اس وقت کسی گداگر کی طرح حضرت سلطان الہندؒ کے دربارِ عالیہ میں حاضر ہوا، جب اس کی کئی اولادیں پیدا ہوتے ہی مر گئیں اور اسے ہندوستان کا تخت وارث سے محروم ہوتا نظر آنے لگا۔ واضح رہے کہ سلسلہ چشتیہ کے ایک اور بزرگ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی ہدایت کے مطابق مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر، حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے روضۂ مبارک پر حاضر ہوا تھا اور دامن پھیلا کر اپنے بیٹے کے لئے دعا کی تھی جس کے نتیجے میں شہنشاہ نور الدین جہانگیر پیدا ہوا جو خود بھی مختلف مواقع پر حضرت سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا رہا۔

جہانگیر کے بیٹے شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں کی عقیدت کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزارِ مبارک کے قریب مسجد شاہجہانی تعمیر کروائی جو آج بھی مغل شہنشاہ کی عقیدت کی ترجمانی کرتی ہے۔

ہندوستان کے سب سے بڑے اور با اثر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو باقاعدگی سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوتے تھے اور ایک ہی مخصوص دعا مانگا کرتے تھے:

''میری کوئی خواہش نہیں۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ میری موت ہندوستان کے وزیر اعظم کی حیثیت سے آئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھارتی عوام انتخابات میں مجھے مسترد کر دیں اور میں ''پردھان منتری بھون'' (وزیر اعظم ہاؤس) سے باہر نکال دیا جاؤں۔''

جواہر لال نہرو نے اپنی طویل سیاست کے دوران سب سے نازک اور گراں وقت دیکھا۔ جب چین کے مقابلے میں ''نیفا'' اور ''لداخ'' کے محاذ پر بھارت کو بدترین شکست ہوئی۔ یہ واقعہ 1962ء میں پیش آیا تھا۔ اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو دو سال تک زندہ رہے اور 1964ء میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس شکست نے بھارتی وزیر اعظم کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ وہ پارلیمنٹ کے اکثر اجلاسوں میں گم سم اور چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے مگر ان کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ پھر جب دنیا سے رخصت ہوئے تو وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی ''ارتھی'' (جنازہ) اس دھوم سے اُٹھی کہ بعد میں مرنے والے کسی ہندوستانی وزیر اعظم کو یہ عزت و تکریم حاصل نہیں ہوئی۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی بیٹی مسز اندرا گاندھی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی حضرت سلطان الہندؒ کے ''چرن

چھونے" (قدم بوسی) کے لئے اکثر حاضر ہوتی تھیں۔ اور اپنے باپ کی طرح یہی دعا مانگتی تھیں کہ ان کی موت بھی بھارت کے "پردھان منتری" (وزیراعظم) کی حیثیت سے واقع ہو۔ اگرچہ مسز اندرا گاندھی کے ایک سکھ گارڈ نے ان کے شکم میں 30 سے زیادہ گولیاں اُتار دی تھیں اور ان کی موت خون رنگ موت تھی لیکن جب "ارتھی" اُٹھی تو ہندوستان کی ایک مقبول وزیراعظم تھیں۔

گزشتہ آٹھ سو سال سے سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی محبوبیت اور مقبولیت کا یہی رنگ ہے جو کسی بھی دور میں دُھندلا نہیں ہوا۔ بڑی عجیب بات ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان کے گوشے گوشے میں مسلسل "مسلم کش" فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ گجرات اور خصوصاً احمد آباد کے بدترین فسادات اس خونیں سیلاب کی تازہ ترین مثال ہیں۔ شدید بے رحمی اور نہایت بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کا خون بہانے والوں پر جب کوئی برا وقت پڑتا ہے اور انہیں اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی صورت نظر نہیں آتی تو یہی قاتل حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے مزارِ مبارک کی سیڑھیوں کو چومتے ہیں، سجدے کرتے ہیں اور بھکاریوں کی طرح حضرت سلطان الہندؒ سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں۔ بزرگانِ دین کی روحانی عظمت کے اظہار کے لئے یہی ایک واقعہ کافی ہے۔

جب حکومت برطانیہ کے اقتدار کا سورج غروب ہو رہا تھا تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے پہلے ایک اور وائسرائے لارڈ کرزن ہندوستان آیا تھا۔ اس کی آمد کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ ہندوستان کی سیاسی فضا کا جائزہ لے سکے۔ پھر لارڈ کرزن نے اپنی طویل رپورٹ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی مقبولیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے پُرجوش الفاظ میں تحریر کیا تھا۔

"میرے اپنے جائزے کے مطابق گزشتہ سات سو سال سے ہندوستان کے لوگوں کے دل و دماغ پر اجمیر میں واقع ایک قبر حکومت کر رہی ہے۔"

❋❋❋

حضرت سیدی مولاؒ

شہاب الدین غوری کی ''فتح اجمیر'' کے بعد اس کے غلام قطب الدین ایبک نے برصغیر کے کئی علاقوں پر طوفانی حملے کئے اور مختلف ہندو راجاؤں کو شکست دے کر دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہندوستان میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم ہوئی جس کا دارالحکومت تاریخی شہر دہلی قرار پایا۔ سلطان قطب الدین ایبک کے بعد اس کا غلام شمس الدین التمش تخت نشین ہوا۔ سلطان شمس الدین التمش، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفۂ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرید بھی تھا۔ مگر التمش کے وارث اور جانشین سخت نا اہل ثابت ہوئے۔ مجبوراً سلطان شمس الدین التمش نے اپنی شجاع، ذہین اور لائق بیٹی رضیہ سلطانہ کو تختِ ہندوستان کا وارث نامزد کیا۔

رضیہ سلطانہ نے کئی سال تک عدل و انصاف اور تدبر کے ساتھ حکومت کی۔ لیکن اوّل و آخر وہ ایک عورت تھی۔ رضیہ سلطانہ کے چھوٹے بھائیوں نے جو حکومتِ ہند کے دعویدار تھے، اپنی بہن کے خلاف سازش کر کے رضیہ سلطانہ کو قتل کرا دیا۔

اس کے بعد ہندوستان میں اسلامی حکومت نے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ آخر سلطان ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا۔ شخصی اعتبار سے ناصر الدین محمود انتہائی خدا ترس اور پرہیز گار انسان تھا۔ یہ ہندوستان کا پہلا مسلمان حکمران تھا جو قرآن کریم کی کتابت کر کے اپنی روزی حاصل کرتا تھا اور سرکاری خزانے سے ایک پائی بھی وصول کرنا حرام سمجھتا تھا۔ اس حوالے سے سلطان ناصر الدین محمود کا یہ مشہور جملہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

''سرکاری خزانہ، بیت المال کی حیثیت رکھتا ہے اور اس پر صرف ہندوستان کی مجبور و مفلس رعایا کا حق ہے۔ میں تو بس خزانے کا محافظ ہوں۔ یہ سارا زر و مال عوام الناس کی امانت ہے۔ میں اس برے وقت سے اپنے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، جب میری نیت میں فتور واقع ہو جائے اور میں بروزِ حشر اپنے اللہ کے سامنے ایک ''خائن'' کی حیثیت سے پیش کیا جاؤں۔''

اسی زہد و تقویٰ کے سبب سلطان ناصر الدین محمود گوشہ نشین ہو کر رہ گیا تھا اور اس نے عنانِ سلطنت اپنے وزیر اعظم غیاث الدین بلبن کو سونپ دی تھی جو اس وقت الغ خان کے نام سے مشہور تھا۔ الغ خان شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت مدبر و ذہین انسان بھی تھا۔ اس نے بڑی ہوش مندی کے ساتھ کئی کامیاب جنگیں لڑیں اور کئی بغاوتوں کو کچلا۔ یہ الغ خان کی سیاسی بصیرت اور انتظامی صلاحیت ہی کا نتیجہ تھا کہ سلطان ناصر الدین محمود کی گوشہ نشینی کے باوجود ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا رقبہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ان صفات کے علاوہ الغ خان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے آقا کا بہت وفادار تھا۔ اگر الغ خان چاہتا تو سلطان ناصر الدین محمود کو زنداں کے حوالے کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کروا دیتا۔ مگر اس نے ایک لمحے کے لئے بھی بغاوت کے بارے میں نہیں سوچا۔

اس وقت ایک اور صاحبِ عزیمت بزرگ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ ''اجودھن'' میں قیام فرما تھے۔ ''اجودھن'' کا موجودہ نام ''پاک پتن'' ہے جو پنجاب کے ایک ضلع ''ساہیوال'' کی ایک تحصیل ہے۔ حضرت بابا فریدؒ، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے محبوب مرید تھے۔ ایک بار جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے

حضرت بابا فریدؒ کو دیکھا تو اپنے خلیفۂ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''قطب! تم اس شاہین کو زیرِ دام لائے ہو جس کا مقامِ معرفت، آسمان کی انتہائی بلندیوں میں ہے۔''

سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کی یہ خاص روایت رہی ہے کہ وہ امراء وقت اور سلاطینِ زمانہ سے ملاقات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ایک بار اپنی وزارتِ عظمٰی کے دور میں الغ خان اپنے پورے لشکر کے ساتھ حضرت بابا فریدؒ کے دیدار کو اجودھن حاضر ہوا تھا۔ ہر سپاہی کی شدید خواہش تھی کہ وہ سلسلۂ چشتیہ کے اس عظیم بزرگ کی زیارت کرے۔ حضرت بابا فریدؒ نے تو ہندوستان کے وزیرِ اعظم سے ملنے ہی سے انکار کر دیا تھا۔ مگر الغ خان کی عاجزانہ درخواست پر آپؒ اس طرح آمادہ ہوئے کہ اپنی خانقاہ کے ایک بلند مقام پر جلوہ افروز ہوئے اور اوڑھنے والی چادر گلی کی طرف لٹکا دی۔ سپاہی قطار در قطار آتے، حضرت بابا فریدؒ کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈالتے اور آپ کی چادر کو بوسہ دیتے ہوئے گزر جاتے۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت بابا فریدؒ کی وہ چادر پُرزے پُرزے ہو گئی تھی۔

پھر جب سلطان ناصر الدین محمود کے انتقال کے بعد ''الغ خان'' سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تو اس نے دوبارہ اپنی پوری فوج کے ساتھ حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضری دی۔

پھر قانونِ قدرت کے مطابق ہندوستانی سیاست کی بساط اُلٹی۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا سب سے نیک۔ شجاع اور ذکی و فہیم بیٹا شہزادہ سلطان محمد، منگول لٹیروں کے ایک حملے میں اس وقت شہید ہو گیا جب وہ ظہر کی نماز ادا کر رہا تھا۔ یہ واقعہ ملتان کی حدود میں پیش آیا تھا۔ اور اسی جنگ میں حضرت امیر خسروؒ منگول قزاقوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔

جب شہزادہ سلطان محمد کی شہادت کی خبر غیاث الدین بلبن کو پہنچی تو وہ شدتِ غم سے کچھ دیر کے لئے بے ہوش ہو گیا۔ اس وقت والیٔ ہندوستان کی عمر 80 سال کے قریب تھی۔ سلطان غیاث الدین بلبن آہنی اعصاب رکھنے والا انسان تھا۔ مگر اس بڑھاپے میں لائق ترین اور جواں سال بیٹے کی ناگہانی موت نے اسے اندر سے ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ سلطان غیاث الدین بلبن، درباریوں کو دکھانے کے لئے بڑے پُر جوش لہجے میں کہا کرتا تھا:

''اللہ کی یہی مرضی تھی۔ اور میں ہر حال میں راضی بہ رضا ہوں۔''

مگر قصرِ شاہی کے مکین یہ راز اچھی طرح جانتے تھے کہ سلطان غیاث الدین بلبن تنہائی میں اپنے محبوب فرزند شہزادہ سلطان محمد کو یاد کر کے زار و قطار روتا تھا اور کہتا تھا۔

''بیٹے! میں تو گوشت پوست کا ایک کمزور بوڑھا ہوں۔ اگر جدائی کا یہ عذاب کسی پتھر پر نازل ہو جاتا تو وہ بھی تکلیف کی شدت سے پگھل کر پانی ہو جاتا یا پھر ٹوٹ کر بکھر جاتا۔''

شہزادہ سلطان محمد کی موت کے بعد فرمانروائے ہند سلطان غیاث الدین بلبن بسترِ علالت پر لیٹا تو پھر اس کا جنازہ ہی اُٹھا۔ بلبن نے مرنے سے پہلے شہزادہ سلطان محمد کے بیٹے شہزادہ کیخسرو کے حق میں وصیت کی تھی کہ آئندہ وہی تختِ ہندوستان کا وارث ہوگا۔ مگر بلبن کے کچھ طاقتور امراء، شہزادہ سلطان محمد سے ناراض تھے اس لئے انہوں نے سازش کر کے شہزادہ کیخسرو کے بجائے غیاث الدین بلبن کے دوسرے پوتے معز الدین کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا جو بغرا خان کا بیٹا تھا۔ کیقباد فطرتاً اوباش شہزادہ تھا۔ بادشاہ بنتے ہی اس نے اپنے گرد ہندوستان کی حسین ترین رقاصاؤں کو جمع کر لیا۔ وہ دن رات ان پری وشوں کے جھرمٹ میں گھرا شراب پیتا رہتا یہاں تک کہ کثرتِ شراب نوشی کے باعث ایک دن معز الدین کیقباد پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو گیا۔ اس

صورتِ حال سے ایک خلجی سردار، جلال الدین خلجی نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے بڑی شاطرانہ چال چلی۔ کیقباد کے باپ بغرا خان نے ترکوں پر بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ جلال الدین خلجی نے ترک زادوں کو انتقام پر اُبھارا۔ پھر ایک رات مقتول ترکوں کے بیٹوں نے معزالدین کیقباد کے کمرے میں گھس کر ہندوستان کے مفلوج حکمران کو اس قدر زدوکوب کیا کہ وہ اپنی جان سے گزر گیا۔ پھر ان ترک زادوں نے لاش کو قالین میں لپیٹ کر دریائے جمنا میں پھینک دیا۔

اب جلال الدین خلجی کے لئے راستہ صاف ہو چکا تھا۔ اس نے ''سلطان'' کا لقب اختیار کیا اور تختِ ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ جلال الدین خلجی بہت نیک سیرت بادشاہ تھا، مگر کسی تجزیہ نگار نے یہ تحریر سن کر کہا کہ وہ اپنے آقا زادے کا قاتل بھی تھا۔ جلال الدین خلجی براہِ راست کیقباد کے قتل میں شریک نہیں تھا مگر درپردہ اُسی کے اشارے پر یہ سازش تیار کی گئی تھی۔

ابھی جلال الدین خلجی کو اقتدار سنبھالے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ ایک اور دردناک واقعہ پیش آیا جس نے اہلِ دل کو خون کے آنسو رُلا دیا اور خلجی خاندان کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

اسی زمانے میں ایک بزرگ، سیدی مولاؒ گزرے ہیں۔ ان کے بارے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ کچھ مؤرخین کہتے ہیں کہ سیدی مولاؒ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے مرید تھے۔ مگر کچھ تذکرہ نویسوں کا کہنا ہے کہ سیدی مولاؒ، حضرت بابا فریدؒ کے دوست تھے۔ بہرحال یہ امر طے شدہ ہے کہ سیدی مولاؒ نے حضرت بابا فریدؒ کی محبت میں کچھ وقت ضرور گزارا ہے۔ ایک دن سیدی مولاؒ نے دہلی جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو حضرت بابا فریدؒ نے اُنہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''میں تمہیں دہلی جانے سے منع نہیں کرتا، مگر واضح رہے کہ دارالحکومت میں امراء کا ہجوم ہے۔ تم اس حکمران طبقے سے مراسم نہ بڑھانا کہ صاحبانِ اقتدار کی قربت درویشی کے لئے ہلاکت ہے۔''

سیدی مولاؒ نے اجودھن (پاک پٹن) سے رخصت ہوتے وقت بڑے پُرزور الفاظ میں وعدہ کیا تھا کہ وہ امرائے وقت سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔

مشہور تاریخ ''طبقاتِ ناصری'' کے مؤلف کے مطابق سیدی مولاؒ کا مزید تعارف یہ ہے کہ آپؒ کا تعلق ''جرکان'' کے علاقے سے تھا۔ آپؒ نے معرفت کی تلاش میں طویل سفر کئے اور مختلف صوفیائے کرام سے فیضِ روحانی حاصل کر کے اپنے وطن واپس لوٹ گئے۔ پھر آخری بار ''اجودھن'' (پاک پٹن) تشریف لائے اور کچھ دن تک حضرت بابا فریدؒ کی صحبتوں سے فیض یاب ہو کر دہلی پہنچے۔ اس وقت یہ تاریخی شہر سلطان جلال الدین خلجی کا دارالحکومت تھا۔ سیدی مولاؒ نے دہلی پہنچ کر مضافاتی علاقے میں زمین خریدی اور اس پر ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی۔ بظاہر سیدی مولاؒ سادہ لباس میں رہا کرتے تھے مگر خانقاہ کی شان و شوکت دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کو تعمیر کرانے والا کوئی بہت مالدار انسان ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان غیاث الدین بلبن کے مصاحبِ خاص ملک الامراء فخر الدین کوتوال کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ شخص اپنی دریا دلی اور سخاوت کے لئے پورے ہندوستان میں شہرت رکھتا تھا۔ ''بلبن عہد'' کے تمام امراء فخر الدین کوتوال کی عنایات و نوازشات کے سہارے اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کے مرتے ہی ان امراء پر قیامت ٹوٹ پڑی اور وہ شدید غربت و بے چارگی کا شکار ہو گئے۔ اسی طرح بارہ ہزار حافظ قرآن جو روزانہ ایک ہزار قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے، بے روزگار ہو کر در در بھٹکنے لگے۔ اور وہ ہزاروں سپاہی جو ملک الامراء فخر الدین

کوتوال کی کفالت میں پُرسکون زندگی گزار رہے تھے، دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔

آخر انقلابِ زمانہ کے ستائے ہوئے ان ہزاروں انسانوں نے سیدی مولاؒ کی خانقاہ میں پناہ لی۔ مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ کی روایت کے مطابق سیدی مولاؒ ان ضرورت مند انسانوں میں روٹی اور کپڑا تقسیم کیا کرتے تھے۔ خانقاہ کے مطبخ (باورچی خانے) میں مزے مزے کے کھانے تیار ہوتے تھے۔ مگر سیدی مولاؒ کی نفس کشی کا یہ عالم تھا کہ چاول کی روٹی کو نمک کے پانی میں بھگو کر کھایا کرتے تھے۔ خدمت کے لئے نہ بیوی تھی اور نہ کوئی لونڈی۔ کبھی کسی شخص سے نذرانہ یا ہدیہ قبول نہیں کیا، پھر بھی جی کھول کر خیرات اور صدقات کیا کرتے تھے۔

مؤرخ محمد قاسم فرشتہ، سیدی مولاؒ کی خانقاہ کے اخراجات کا حال اس طرح بیان کرتا ہے:

''جب آپؒ کی روحانیت کی شہرت عام ہوئی تو شہر کے بڑے بڑے شرفاء اور امراء خانقاہ میں جمع ہونے لگے۔ سیدی مولاؒ کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن میں دو دو، تین تین ہزار اشرفیاں بطور انعام دیا کرتے تھے۔ آپؒ کے دسترخوان کی وسعت کے سامنے بادشاہی دسترخوان بھی کمتر نظر آتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک ایک دن میں ایک ہزار من میدہ، چالیس من شکر، چالیس من گڑ، پانچ سو من گوشت اور کئی من گھی باورچی خانے میں صرف ہوتا تھا۔ سیدی مولاؒ کا یہ عام طریقہ تھا کہ جب کسی شخص کو کچھ دینا ہوتا تو اس سے فرماتے کہ فلاں بورے یا پتھر کے نیچے اتنا سونا اور چاندی موجود ہے، وہ تم لے لو۔ پھر جب وہ شخص اس مخصوص جگہ پہنچتا تو اتنی ہی اشرفیاں اور چاندی کے سکے موجود ہوتے جن کی طرف سیدی مولاؒ نے اشارہ کیا تھا۔ ان سکوں کو دیکھ کر یہی خیال گزرتا تھا کہ جیسے یہ ابھی ابھی ٹکسال سے ڈھل کر آئے ہیں۔ سیدی مولاؒ کی یہ بے پناہ سخاوت دیکھ کر اہلِ دہلی کو یہ گمان گزرنے لگا کہ آپؒ ''کیمیا'' بنانا جانتے ہیں۔

مؤرخ محمد قاسم فرشتہ کے اس بیان سے قطع نظر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سیدی مولاؒ کو ''دستِ غیب'' حاصل تھا۔ تصوف کے حوالے سے ''دستِ غیب'' کی وضاحت دو انداز سے کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ درویش، اہلِ دنیا کا محتاج نہیں رہتا۔ اسے غیب (اللہ) پر یقین کامل ہوتا ہے۔ اس لئے اسے غیب ہی سے سامانِ زیست میسر آتا رہتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ساری چیزیں گھر کے کسی گوشے میں رکھی ہوئی مل جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کسی صاحبِ حیثیت بندے کو اس درویش کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس لمحے اس شخص کی حاجت روائی ہو جاتی ہے جو شب و روز ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔ اس مضمون کو ایک فارسی شاعر نے بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔

خدا خود میر سامان است اربابِ توکل را

(اہلِ توکل کے لئے اللہ تعالیٰ خود سامان فراہم کرتا ہے)

''دستِ غیب'' کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ دنیا کو بظاہر کوئی سبب یا واسطہ نظر نہیں آتا، مگر درویش اپنی مرضی سے دنیا کی ہر مادی چیز حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ بے خبر لوگ اسے ''روحانی تصرف'' کا نام دیتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً یہ روحانی تصرف نہیں۔ جو لوگ ''عملیات'' کے فن سے واقف ہیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر وظیفے کا ایک موکل ہوتا ہے۔ موکل اس روحانی طاقت کو کہتے ہیں جو اس مخصوص عمل یا وظیفے کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ مؤکل انسانی شکل میں بھی ظاہر ہوتے ہیں، مگر وہ ''غیر مرئی'' حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں چھوا یا پکڑا نہیں جا سکتا۔ بس وہ اپنے عامل کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ عامل جو کچھ طلب کرتا ہے، اسے چند لمحوں میں حاضر کر دیتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ایک ایسے ہی عامل سے ملا ہوں اور اس کے موکل سے باتیں بھی کی ہیں۔

میری طرح ہزاروں انسان ٹھٹھہ کے شاہی بازار میں رہنے والے سوما بابا سے واقف ہوں گے۔اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے مگر ان کی ذات سے وابستہ ایسے بہت سے واقعات اب بھی لوگوں کو یاد ہوں گے۔

سیدی مولاؒ کو بھی اسی انداز کا دستِ غیب حاصل تھا۔ مؤکل ان کے تابع تھے۔ اور وہی مؤکل، سیدی مولاؒ کے لئے چاندی کے سکے اور سونے کی اشرفیوں کا انتظام کرتے تھے۔

''تاریخ فرشتہ'' میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ سیدی مولاؒ دوسرے صوفیائے کرام کی طرح نماز باجماعت سے گریزاں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ جمعہ کی نماز بھی اپنی خانقاہ کے حجرے ہی میں ادا کرتے تھے۔ مگر جہاں تک عبادت وریاضت کا تعلق ہے تو اس معاملے میں سیدی مولاؒ انتہائی محنت اور جانفشانی سے کام لیتے تھے۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا، جب سیدی مولاؒ کی روحانی شہرت دہلی کی حدود سے نکل کر دور دور تک پھیل گئی تو ایک دن سلطان جلال الدین خلجی کا بڑا لڑکا اختیار الدین خان خاناں نہایت عقیدت کے ساتھ آپؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا۔ اختیار الدین خان خاناں بہت ذہین، شجاع اور نیک سیرت نوجوان تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے فطری طور پر درویشوں سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ خان خاناں، سیدی مولاؒ کو دیکھتے ہی ان کا معتقدِ خاص بن گیا اور سینکڑوں انسانوں کی موجودگی میں ہندوستان کے ولی عہدِ سلطنت نے باآواز بلند سیدی مولاؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بزرگ محترم! آج سے آپ میرے روحانی باپ ہیں۔ براہِ کرم مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے۔''

اختیار الدین خان خاناں کی یہ عقیدت دیکھ کر سیدی مولاؒ بھی مضطرب ہو گئے اور آپؒ نے بے اختیار کھڑے ہو کر خان خاناں کو گلے لگا لیا۔ پھر حاضرینِ خانقاہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''خوب غور سے سن لو۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے مگر پھر بھی خان خاناں میرا فرزند ہے۔ جس سے یہ ناراض ہے، میں بھی اس سے ناراض ہوں۔ اور جس سے میرا بیٹا خوش ہے، اس سے میں بھی خوش ہوں۔''

اس کے بعد ولی عہدِ سلطنت، اختیار الدین خان خاناں بلا ناغہ خانقاہ میں حاضر ہونے لگا اور گھنٹوں سیدی مولاؒ کے سامنے دست بستہ بیٹھ کر ایک مردِ درویش کا وعظ سنتا رہتا۔

سلطان جلال الدین خلجی کا دوسرا بیٹا ارکلی خان تھا۔ وہ عام شہزادوں کی طرح ایک اوباش نوجوان تھا۔ جب ارکلی خان کو یہ معلوم ہوا کہ سیدی مولاؒ نے اس کے بڑے بھائی اختیار الدین خان خاناں کو منہ بولا بیٹا بنا لیا ہے تو وہ بھی ایک دن خانقاہ میں حاضر ہوا۔ مگر سیدی مولاؒ نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ بعض روایتوں کے مطابق ارکلی خان کو سیدی مولاؒ کا یہ طرزِ عمل شدید ناگوار گزرا۔ اس مغرور شہزادے نے انتہائی تلخ و ناگوار لہجے میں مردِ درویش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ پر میرا احترام فرض تھا کہ میں ہندوستان کا ولی عہدِ سلطنت ہوں۔ مگر آپ نے مجھے اپنی خانقاہ کے ایک معمولی خدمت گار کے برابر بھی نہیں سمجھا؟''

سیدی مولاؒ، ولی عہدِ ہندوستان کے متکبرانہ لہجے اور بگڑے ہوئے چہرے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے۔ آپؒ نے ارکلی خان کو اسی بے باکانہ لہجے میں جواب دیا جو مردِ درویش کی شان ہوتی ہے:

''صاحب زادے! احترام اس کا کیا جاتا ہے جو خود بھی آداب کا پابند ہو اور ''احترام'' کا مفہوم سمجھتا ہو۔ ویسے بھی مجھ فقیر کا شاہوں سے کیا تعلق؟ تمہارا احترام تو وہی کرے گا جو تم سے کوئی غرض رکھتا ہو۔ اور بفضلِ خدا میں ایسی کوئی طلب نہیں رکھتا جسے تم پورا کر سکو۔''

ارکلی خان کوسیدی مولاؒ کا یہ جواب اور بھی ناگوار گزرا اور اس نے بڑے تکبر سے کہا۔
''میرا اور تمہارا یہ رشتہ ہے کہ تم میری زمین پر رہتے ہو۔ اسی رشتے کے تحت تم پر میرا احترام لازم ہے۔''
ارکلی خان کی یہ تندی و تیزی دیکھ کر سیدی مولاؒ مسکرائے اور بے نیازانہ لہجے میں فرمانے لگے۔
''اللہ کی یہ زمین تمہاری ملکیت کب سے ہوگئی؟ تم سے پہلے یہاں سلطان غیاث الدین بلبن اور اس کے بیٹے رہا کرتے تھے۔ انہیں تلاش کرو کہ وہ کہاں چلے گئے؟''
سیدی مولاؒ نے بڑے حکیمانہ انداز میں ارکلی خان کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ ضدی اور سرکش شہزادہ ایک مردِ درویش کی گفتگو میں پوشیدہ نصیحت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔
''کل کا معاملہ کل دیکھا جائے گا۔ آج تو میں ہی اس زمین کا مالک ہوں۔'' ارکلی خان کا لہجہ مزید غضب ناک ہوگیا تھا۔ ''اگر تم میری ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے تو ہندوستان چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔''
یہ کہہ کر ارکلی خان اُٹھا اور سیدی مولاؒ کی خانقاہ سے نکل گیا۔
اسی زمانے میں ایک عیار، فتنہ گر اور فسادی امیر قاضی جلال الدین کاشانی، سیدی مولاؒ کی خانقاہ میں داخل ہوا اور اپنی عقیدت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ سیدی مولاؒ نے قاضی جلال الدین کاشانی کو اس عمل سے روکنے کی کوشش کی مگر وہ با آواز بلند یہی کہتا رہا:
''آپ کے جوتوں سے لپٹی ہوئی خاک بھی میرے لئے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔ آج تک ہندوستان میں بے شمار اولیائے کرام آئے مگر آپ جیسا ''قطب دوراں'' آج تک کوئی نہیں آیا۔''
پھر قاضی جلال الدین کاشانی نے اس قدر چرب زبانی، گرم جوشی اور عیاری کا مظاہرہ کیا کہ سیدی مولاؒ جیسے سادہ لوح انسان اُس کی گفتگو کے فریب میں آگئے اور اس ''شاطرِ زمانہ'' کو اپنا سب سے گہرا دوست سمجھنے لگے۔
آخر سیدی مولاؒ کی قربت حاصل کرنے کے بعد قاضی جلال الدین کاشانی نے اپنے منصوبے کا آغاز کرتے ہوئے ایک دن سیدی مولاؒ سے عرض کیا۔
''شیخ! کیا آپ اس راز سے باخبر ہیں کہ آپ کو یہ بے پناہ روحانی طاقت کس لئے بخشی گئی ہے؟''
سیدی مولاؒ نے انکسار و عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا:
''یہ اللہ کی خاص بخشش و عطا ہے۔ وہ جس پر چاہے مہربان ہو جائے۔ ورنہ میں اس قابل نہیں کہ مجھ پر یہ نظرِ عنایت کی جاتی۔''
''شیخ! آپ پر یہ نظرِ عنایت ایک خاص وجہ سے کی گئی ہے۔'' قاضی جلال الدین کاشانی نے انتہائی پُرجوش لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگیا۔
سیدی مولاؒ نے استفہامیہ نظروں سے قاضی جلال الدین کاشانی کی طرف دیکھا اور بہت آہستہ لہجے میں فرمایا۔ ''میں تو ہزار کوششوں کے باوجود اس وجہ کو تلاش نہ کرسکا۔ اگر تم جانتے ہو تو بیان کرو۔''
قاضی جلال الدین کاشانی کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی خوف کا رنگ طاری کرلیا اور کسی قدر سہمے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔
''میں نے خانقاہ میں داخل ہونے کے بعد ہی اس وجہ کو تلاش کرلیا تھا۔ مگر اتنے دن مجبوراً خاموش رہا۔ کل رات میں نے ایک صدائے غیبی سنی کہ اگر تو نے اپنی ذمہ داری پوری نہ کی تو قیامت کے دن گناہ گار ٹھہرے گا۔ اور اس راز کو چھپانے کے جرم میں تجھے سخت سزا دی جائے گی۔ اگر میں وہ صدائے غیب نہ سنتا تو شاید مرتے دم

تک خاموش ہی رہتا۔ مگر آتشیں دوزخ کے خوف سے آج لب کشائی کر رہا ہوں۔"

قاضی جلال الدین کاشانی کی یہ پُراسرار گفتگو سن کر سیدی مولاؒ شدید حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو گئے تھے اور بہت غور سے اس عیار انسان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

پھر جب قاضی جلال الدین کاشانی نے پوری طرح فضا سازگار بنالی تو اپنی زبان کو جنبش دی۔

"حق تعالیٰ نے آپ کو یہ بے پناہ روحانی طاقت اس لئے عطا کی ہے کہ اس کے بندوں کو دنیا کے عذاب سے نجات دلائیں۔"

قاضی جلال الدین کاشانی کی یہ بات سن کر سیدی مولاؒ نے جواباً فرمایا۔

"مجھ فقیر و ناتواں سے جو کچھ بن پڑتا ہے، میں اس سے غافل نہیں ہوں۔ اپنی خانقاہ میں آنے والوں کا حتی المقدور خیال رکھتا ہوں۔"

"یہ تو دہلی کے چند لوگ ہیں جو آپ کی خانقاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں، مگر ان کروڑوں انسانوں کا کیا ہوگا جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں رہتے ہیں؟" قاضی جلال الدین کاشانی نے بڑی عیاری کے ساتھ سوال کیا۔

"یہ فقیر ان کے لئے بھی دن رات دعائیں کرتا رہتا ہے۔" سیدی مولاؒ نے ایک بار پھر بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

"شیخ! دعاؤں کا وقت گزر چکا۔ اب ان مظلوم لوگوں کو آپ کی دوا کی ضرورت ہے۔" آخر قاضی جلال الدین کاشانی نے بڑی ہوشیاری سے اپنے منصوبے کی وضاحت شروع کی۔ "یہ حکومت دراصل اللہ تعالیٰ کی نیابت ہے۔ اسے ظالموں کی قید سے آزاد کرائیں۔"

سیدی مولاؒ نے حیرت سے قاضی جلال الدین کاشانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آپ سے بہتر اس مقولے کو کون سمجھ سکتا ہے کہ "الحکم للہ والملک للہ" (اللہ ہی کا حکم ہے اور اللہ ہی کا ملک ہے) کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان کی حکومت فاسقوں اور فاجروں کے ہاتھوں میں ہے؟ مخلوقِ خدا ان جابروں کے ظلم و ستم سے چیخ رہی ہے۔ اور کوئی ان مجبوروں کی فریاد سننے والا نہیں ہے۔ اگر آپ نے بھی ان مظلوموں کی چیخیں نہیں سنیں تو یاد رکھیے کہ حشر میں یہ سب کے سب آپ کے دامن گیر ہوں گے۔ اور حق تعالیٰ بھی آپ سے یہی سوال کرے گا کہ جب ہم نے اپنی مخلوق کو تمہارے دروازے پر بھیجا تھا تو تم نے انہیں خالی ہاتھ کیوں لوٹایا؟" یہ کہتے کہتے وہ عیارِ زمانہ شخص رونے لگا۔

قاضی جلال الدین کاشانی کی یہ حالت دیکھ کر سیدی مولاؒ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور پھر آپؒ نے انتہائی شکستہ لہجے میں اس مکار شخص سے پوچھا۔

"آخر ان ظالم و جابر اور فاسق و فاجر حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ درویشِ بے سروساماں تو دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔"

"آپ کا کام بس اتنا ہے کہ ہندوستان کی بادشاہت قبول فرما لیں۔" آخر قاضی جلال الدین کاشانی نے اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتے ہوئے کہا۔ "باقی کام اپنے غلاموں پر چھوڑ دیجئے۔"

قاضی جلال الدین کاشانی کی بات سن کر سیدی مولاؒ کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر جب تھوڑی دیر بعد یہ کیفیت زائل ہوئی تو آپؒ نے کھلے لفظوں میں انکار کرتے ہوئے کہا۔

"درویشی اور اقتدار میں اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ زمین اور آسمان کے درمیان۔"

''درویشی کے تقاضے کیا ہیں، یہ آپ جانیں۔'' قاضی جلال الدین کاشانی نے ایک اور چال چلتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ جب تک ہندوستان کے تخت پر کوئی باکردار انسان نہیں بیٹھے گا، اس وقت تک مظلوم رعایا کے آفات و مصائب کا خاتمہ نہیں ہو گا۔ اور میری نظر میں آپ سے زیادہ نیک انسان کوئی دوسرا نہیں ہے۔ بے شک! حکومت کی ذمہ داریاں بہت سخت ہوتی ہیں مگر ایک درویش سے زیادہ ''خدمتِ خلق'' کا مفہوم کون سمجھ سکتا ہے؟'' یہ کہہ کر قاضی جلال الدین کاشانی، خانقاہ سے چلا گیا اور سیدی مولاؒ کے لئے ایک ایسا سوال چھوڑ گیا، جس کا جواب دینا آسان نہیں تھا۔

قاضی جلال الدین کاشانی سے اس ملاقات کے بعد سیدی مولاؒ کی نیندیں اُڑ گئیں۔ آپؒ کئی دن تک شدید ذہنی کشمکش کا شکار رہے۔ ہر بار آپؒ کے دل سے یہی صدا اُبھرتی تھی کہ درویشی اور حکومت میں کوئی نسبت نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی سیدی مولاؒ کی سماعت میں قاضی جلال الدین کاشانی کی آواز بھی گونجنے لگتی:

''شیخ! آپ قیامت کے دن حق تعالیٰ کے اس سوال کا کیا جواب دیں گے کہ تمہارے سامنے ہماری مخلوق پر ظلم ہوتا رہا اور تم خاموش بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ حالانکہ ہم نے تمہیں ظالم کا ہاتھ روکنے کی طاقت بخشی تھی۔ پھر تم اس طاقت کو کیوں استعمال نہ کر سکے؟''

سیدی مولاؒ کے سامنے یہ سوال اتنی بار اُبھرا کہ آپؒ بشری تقاضوں سے مجبور ہو کر نفس کے فریب میں آ گئے اور پھر ہندوستان کی بادشاہت قبول کرنے پر اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔

قاضی جلال الدین کاشانی کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں سیدی مولاؒ سے عرض کیا۔ ''شیخ! آپ ابھی سے اپنی حکومت کے منصب داروں کے نام تجویز فرما دیں۔ تاکہ انقلاب کے بعد ہر شخص اپنا منصب سنبھال لے اور انتظامی امور میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہو۔'' وہ فتنہ گر اور دنیا کا مکار ترین انسان ایک درویش خدا مست کے گرد فریب کاریوں کا جال پھیلا رہا تھا اور سیدی مولاؒ جیسے سادہ لوح انسان لحظہ بہ لحظہ سیاست اور سازش کے پھندوں میں اُلجھتے جا رہے تھے۔

''میرے نزدیک تو تم ہی سب سے زیادہ معتبر اور ہوش مند انسان ہو۔'' سیدی مولاؒ نے قاضی جلال الدین کاشانی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اس لئے سب سے پہلے تم خود ہی اپنا عہدہ اور منصب تجویز کر لو۔''

یہ سنتے ہی قاضی جلال الدین بہت زیادہ جذباتی ہو گیا اور اپنی بات میں زیادہ وزن پیدا کرنے کے لئے خدا کی قسم کھا کر کہنے لگا۔

''میرے لئے یہی اعزاز بہت ہے کہ میں شیخ کا ادنیٰ ترین خدمت گار ہوں۔ آخر بادشاہ کو جوتے پہنانے کے لئے بھی تو ایک خادم کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں آپ کا کفش بردار (جوتے اٹھانے والا) بنوں گا۔ بس یہی میرا عہدہ ہے اور یہی میرا منصب۔''

اب سیدی مولاؒ کو یقین آ چکا تھا کہ قاضی جلال الدین کاشانی ان کا مخلص ترین دوست ہے۔ آپؒ نے اسی فریب کار انسان کے مشوروں سے اپنے مریدوں میں نئی حکومت کے مختلف عہدے تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ پھر سلطان جلال الدین خلجی کا تختہ اُلٹنے کے لئے طریقہ کار پر بحث ہونے لگی۔ آخر طویل غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ سیدی مولاؒ کے دو بڑے مرید برنجین کوتوال اور نتھائی پہلوان کسی نہ کسی طرح سلطان کی سواری کے نزدیک پہنچ کر جلال الدین خلجی کا کام تمام کر دیں گے۔ ان دونوں مریدوں پر سیدی مولاؒ کے بے شمار احسانات تھے۔ نتیجتاً برنجین کوتوال اور نتھائی پہلوان، ہاتھ باندھ کر سیدی مولاؒ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور انتہائی پُرجوش لہجے میں

بولے۔

''اپنے شیخ پر ہزار جانیں قربان۔'' دونوں کے چہرے عقیدت اور مسرت کے جذبات سے دمک رہے تھے۔

سلطان جلال الدین خلجی کا دستور تھا کہ وہ جمعہ کے دن نماز کے بعد کھلی گاڑی میں بیٹھ کر دہلی کی خاص شاہراہوں سے گزرتا تھا تاکہ رعایا اپنے بادشاہ کا دیدار کر سکے۔ بعض روایتوں کے مطابق سلطان کی سواری کے اس طرح سرعام گزرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جو مظلوم و مجبور شہری درباری پابندیوں کی وجہ سے اپنی فریاد لے کر حاکمِ وقت تک نہ پہنچ سکتے ہوں، وہ راستے میں کھڑے ہو جائیں اور اپنی شکایات بیان کریں تاکہ سلطان ان کے مسائل حل کر سکے۔ رعایا کے احوال سے باخبر رہنے کا یہ ایک اچھا طریقہ تھا جس سے سلطان جلال الدین خلجی کی نیک نیتی کا اظہار ہوتا تھا۔ قاضی جلال الدین کاشانی جیسے فتنہ گر انسان نے بادشاہ کی اسی رحم دلانہ عادت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور برنجین کوتوال اور نتھائی پہلوان کو اپنے منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں کو سلطان خوب پہچانتا ہے۔ اس لئے تمہیں جلال الدین خلجی تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا وار چوک جائے اور محافظ سپاہیوں کی وجہ سے تم فرمانروائے ہندوستان کو قتل نہ کر سکو۔ اگر سلطان معمولی زخم کھانے کے بعد بچ گیا تو پھر ہم سب پر قیامت ٹوٹ پڑے گی اور پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔''

قاضی جلال الدین کاشانی کی بات سن کر برنجین کوتوال اور نتھائی پہلوان پریشان نظر آنے لگے۔ محافظ دستے کی موجودگی میں سلطان جلال الدین خلجی کو قتل کرنا آسان نہیں تھا۔

آخر دونوں کی اس کشمکش کو دور کرنے کے لئے قاضی جلال الدین کاشانی نے اپنی عبا کی جیب سے دو خنجر نکال کر برنجین کوتوال اور نتھائی پہلوان کے سامنے رکھ دیئے۔ پھر بڑے فاتحانہ انداز میں بولا۔

''یہ دونوں زہر میں بجھے ہوئے خنجر ہیں۔ اور زہر بھی ایسا کہ دنیا کے سارے طبیب اور حکیم مل کر بھی اس کا ''تریاق'' دریافت نہیں کر سکتے۔ تم دونوں کا بس اتنا کام ہے کہ کسی طرح سلطان کے جسم پر ایک زخم لگا دو۔ پھر وہ اپنے محل تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

قاضی جلال الدین کاشانی کی بات سن کر دونوں کے پریشان چہروں پر سکون و اطمینان کا گہرا رنگ اُبھر آیا جیسے واقعتاً وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوں اور انہوں نے والیٔ ہند سلطان جلال الدین خلجی کو قتل کر دیا ہو۔

ابھی قاضی جلال الدین کاشانی کا منصوبہ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا کہ سیدی مولاً کے ایک مرید نے بڑے انعام و اکرام کے لالچ میں سلطان جلال الدین خلجی کو اس سازش سے باخبر کر دیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شخص حقیقتاً سلطان کا جاسوس ہو اور حالات سے باخبر رہنے کے لئے جان بوجھ کر سیدی مولاً کے مریدوں میں شامل ہوا ہو۔

الغرض اس اطلاع پر سلطان جلال الدین خلجی نے سیدی مولاً، قاضی جلال الدین کاشانی، برنجین کوتوال، نتھائی پہلوان اور دوسرے خاص خاص مریدوں کو اپنے حضور میں طلب کر لیا اور ملزمان سے اس مذکورہ سازش کے بارے میں دریافت کیا۔

سیدی مولاً اور ان کے تمام ساتھیوں نے ایسے کسی واقعے کے وجود سے صاف صاف انکار کر دیا۔ سلطان جلال الدین خلجی نے اس سلسلے میں بڑی ذہانت کے ساتھ مختلف سوالات کئے مگر تمام لوگوں کے ہونٹوں پر حرف انکار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ قاضی جلال الدین کاشانی نے اپنی جان بچانے کے لئے بڑے زور و شور کے ساتھ والیٔ ہندوستان کے سامنے اعلان کیا:

"حق تعالیٰ کی قسم! سرزمینِ ہند پر آپ کے بے شمار نمک خوار بستے ہیں۔ مگر مجھ سے بڑا وفادار کوئی نہیں۔"
سلطان جلال الدین خلجی نے آخری حربے کے طور پر اپنے جاسوس گواہ کو پیش کیا تو قاضی جلال الدین کاشانی نے انتہائی پُر جوش لہجے میں کہا۔
"خالقِ کائنات کی قسم! ہم سب لوگ جس قدر سچے ہیں، اسی قدر یہ شخص جھوٹا ہے۔ بلکہ میری نظر میں دنیا کا سب سے بڑا دروغ گو انسان۔ سلطانِ معظم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اتنا بڑا الزام ثابت کرنے کے لئے ایک گواہ کافی نہیں ہوتا۔"
قاضی جلال الدین کاشانی جیسے شاطر اور چرب زبان شخص کی اس دلیل نے فرمانروائے ہند کو لاجواب کر دیا تھا۔ ابھی سلطان جلال الدین خلجی گہری سوچ میں گم تھا کہ قاضی کاشانی نے ایک اور چال چلتے ہوئے کہا۔
"شاید سلطان ذی وقار کو اس بات کی خبر نہیں کہ ولی عہدِ سلطنت اختیار الدین خان خاناں بھی روزانہ سیدی مولاؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ آپ اپنے فرزندِ ارجمند کو اس عدالت میں طلب فرمائیں اور ان سے معاملے کی حقیقت دریافت کریں۔ اگر ولی عہدِ سلطنت ہمارے خلاف گواہی دے دیں گے تو ہم لوگ کسی حجت کے بغیر اپنا گناہ تسلیم کر لیں گے۔"
اب سلطان جلال الدین خلجی نے اپنے بڑے بیٹے خان خاناں کو خلوت میں طلب کر کے سیدی مولاؒ کے متعلق پوچھا تو ولی عہدِ سلطنت نے انتہائی پُر جوش اور عقیدت مندانہ لہجے میں باپ کو جواب دیتے ہوئے کہا۔
"سیدی مولاؒ اقلیمِ معرفت و روحانی کے شہنشاہ ہیں۔ انہیں اس فانی اور بے وفا تاج و تخت کی کیا ضرورت ہے جس پر کل معزالدین کیقباد متمکن تھا، آج آپ جلوہ افروز ہیں اور کل کوئی دوسرا بیٹھا ہوگا۔ قدرت نے جو تاج سیدی مولاؒ کے سر پر سجایا ہے، اس کی آب و تاب کبھی ماند نہیں ہوگی۔ آپ کے سامنے تو یہ لوگ اپنی جانوں کے خوف سے سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ مگر سیدی مولاؒ کی بارگاہ میں ان کے دل عقیدت سے خم رہتے ہیں۔"
اختیار الدین خان خاناں بڑے کیف و جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔
سلطان جلال الدین خلجی نے یہ کہہ کر اپنے بیٹے کی بات کو مسترد کر دیا۔
"تم اس درویش کی عقیدت میں اندھے ہو گئے ہو اور ایک نابینا شخص دنیا کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو نہیں دیکھ سکتا۔"
خان خاناں کی اس گواہی کے بعد سلطان جلال الدین خلجی نے سیدی مولاؒ، قاضی جلال الدین کاشانی، برنجین کوتوال اور نتھائی پہلوان کو قید خانے میں ڈال دیا۔ فرمانروائے ہندوستان ان لوگوں کے جوابات سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ سیدی مولاؒ کی بے پناہ مقبولیت، روز بروز بڑھتی ہوئی شہرت اور ان کے آستانے پر خلقِ خدا کے ہجوم نے سلطان جلال الدین خلجی کے لئے وسوسے، اندیشے اور خطرات پیدا کر دیئے تھے۔ وہ کئی دن تک اس نازک مسئلے پر غور کرتا رہا۔ آخر والیٔ ہند نے اپنے اطمینانِ قلب کے لئے ایک راستہ تلاش کیا۔
سلطان جلال الدین خلجی کے حکم پر "بہادر پور" کے جنگل میں آگ روشن کی گئی۔ پھر جب اس آگ کے شعلے پوری شدت کے ساتھ بھڑکنے لگے تو سیدی مولاؒ، قاضی جلال الدین کاشانی، برنجین کوتوال اور نتھائی پہلوان کو سلطان کے سامنے لایا گیا۔ والیٔ ہندوستان نے انہیں دیکھتے ہوئے بارعب لہجے میں کہا۔
"اب یہ آگ ہی تمہارے جرم یا بے گناہی کا فیصلہ کرے گی۔ تم چاروں کو ننگے پاؤں اس آگ کے درمیان سے گزرنا ہوگا۔ اگر سچے ہو تو جلنے سے محفوظ رہو گے۔ ورنہ یہ آگ تمہیں جلا کر راکھ کر دے گی۔"

یہ سنتے ہی سیدی مولاؒ، قاضی جلال الدین کاشانی، برنجین کوتوال اور نتھائی پہلوان نے با آواز بلند کلمہ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر وہ چاروں آگ میں کودنا ہی چاہتے تھے کہ مؤرخ قاسم فرشتہ کے بقول سلطان جلال الدین خلجی کو ان چاروں پر رحم آ گیا اور والئ ہندوستان نے ہاتھ کے اشارے سے اُنہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس کے بعد سلطان جلال الدین خلجی نے دہلی کے بڑے بڑے علماء اور فقہاء سے مشورہ کیا۔

تمام علماء نے بیک زبان ایک ہی فتویٰ دیا۔

''کسی شے کو جلا ڈالنا آگ کی فطرت میں شامل ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ جھوٹا ہو یا سچا، اگر آگ میں کودے گا تو یہ بھڑکتے ہوئے شعلے اسے جلا ڈالیں گے۔ معاذ اللہ! سیدی مولاؒ اور ان کے ساتھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں ہیں کہ آگ گلزار بن جائے گی۔ اسی لئے اس قسم کے معاملات کا فیصلہ آگ کے ذریعے کرنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔''

علمائے وقت کا فتویٰ سن کر سلطان جلال الدین خلجی اپنے ارادے سے باز آ گیا اور اس نے آگ بجھانے کا حکم دے دیا۔

اس کے بعد والئ ہندوستان نے قاضی جلال الدین کاشانی کو بدایوں کا قاضی مقرر کر کے فوری طور پر دہلی سے چلے جانے کا حکم دیا۔ یہ فتنہ گر قاضی، سیدی مولاؒ کی روحانیت کی آڑ میں ہندوستان کا بادشاہ بننا چاہتا تھا مگر قبل از وقت سازش کا راز فاش ہو جانے کے باعث اس کا منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

جلال الدین کاشانی کو اس کا بے حد افسوس تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسے اپنی جان بچ جانے کی بھی خوشی تھی۔

قاضی جلال الدین کاشانی کے علاوہ جو دوسرے امراء سیدی مولاؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا کرتے تھے، انہیں ہندوستان بدر کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ حکم سلطانی بھی سنا دیا گیا کہ اگر ان لوگوں نے دوبارہ ہندوستان کی سرزمین کا رخ کیا تو وہ بے دریغ قتل کر دیئے جائیں گے۔

ان تمام امراء سے فارغ ہونے کے بعد سلطان جلال الدین خلجی نے دونوں کوتوالوں برنجین اور نتھائی پہلوان کو اپنے سامنے قتل کرا دیا۔ اور پھر شدید نفرت و غضب کے عالم میں اپنے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''ان دونوں نمک حراموں کی بے گور و کفن لاشوں کو اسی طرح پڑا رہنے دو تاکہ جنگل میں بسنے والے گدھ، چیل و کوے ان کے غلیظ گوشت سے اپنی بھوک مٹا لیں۔''

اس کے بعد سلطان جلال الدین خلجی، سیدی مولاؒ کو ساتھ لے کر اپنے محل کی طرف لوٹا۔ پھر خود ایک جھروکے میں بیٹھا اور تمام امراء قلعے کے طویل و عریض میدان میں قطار در قطار کھڑے ہو گئے۔ جھروکے میں سلطان کا چھوٹا بیٹا ارکلی خان بھی باپ کے برابر بیٹھا تھا اور سیدی مولاؒ کی بے چارگی پر مسکرا رہا تھا۔ پھر فرمانروائے ہندوستان نے سیدی مولاؒ کو حکم دیا کہ وہ جھروکے کے نیچے آئیں اور بادشاہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جائیں۔

سیدی مولاؒ باوقار انداز میں چلتے ہوئے جھروکے کے قریب آئے اور عام انداز میں کھڑے ہو گئے۔ جب سلطان جلال الدین خلجی نے آپؒ کو ہاتھ باندھنے کا حکم دیا تو سیدی مولاؒ نے پُرجلال لہجے میں فرمایا۔

''میں اللہ کے سوا کسی انسان کے آگے ہاتھ باندھتا ہوں اور نہ سر جھکاتا ہوں۔''

ایک درویشِ خدا مست کا یہ بے باکانہ انداز دیکھ کر والئ ہند سخت برہم ہوا۔ پھر اس نے مسلسل کئی سوالات کئے۔ سیدی مولاؒ نے سلطان جلال الدین خلجی کے ہر سوال کا جواب نہایت جرأت کے ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

''میرے نزدیک اس تاج و تخت کی کوئی حیثیت نہیں۔ جس انسان کا انجام تختۂ مرگ ہو، وہ تختِ شاہی پر بیٹھ کر

خود کو نئی نئی بلاؤں اور مصیبتوں میں کیوں گرفتار کرے گا؟ میں تیرے اقتدار کا دشمن نہیں۔ وہ کوئی اور لوگ ہیں جو تجھے اقتدار سے محروم دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"تاریخ فرشتہ" کی روایت کے مطابق سیدی مولاؒ پر حکومتِ وقت کے خلاف سازش کا الزام ثابت نہ ہو سکا، مگر سلطان جلال الدین خلجی ایک درویش کی روز بروز بڑھتی ہوئی مقبولیت سے نہ صرف ہراساں تھا بلکہ سیدی مولاؒ کے وجود کو اپنے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ نتیجتاً فرمانروائے ہندوستان نے ایک نئی چال چلی۔ کچھ دن پہلے شیخ ابوبکر طوسی حیدری، دہلی آیا تھا جو خود کو قلندر کہتا تھا اور اس کے ساتھ ملنگوں کی ایک جماعت بھی تھی۔ جب سیدی مولاؒ پر بغاوت کا مقدمہ چلا تو سلطان جلال الدین خلجی نے شیخ ابوبکر طوسی اور اس کے ساتھی درویشوں کو بھی طلب کیا تھا۔ اس وقت قلندروں اور ملنگوں کی وہ جماعت بھی جھروکے کے نیچے موجود تھی۔ ان لوگوں میں سنجری نام کا ایک درویش تھا جس پر سلطان جلال الدین خلجی کے بے شمار احسانات تھے۔

والیٔ ہندوستان نے درویشوں کی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"تم لوگ دیکھ رہے ہو کہ اس درویش، سیدی مولاؒ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور میرے ملک میں فساد پھیلانے کے کیسے کیسے منصوبے تیار کئے ہیں۔ آج میں تمہیں منصف بناتا ہوں۔ تم جو مناسب سمجھو، فیصلہ کرو۔ یہاں تک کہ مجھے پوری طرح اطمینان حاصل ہو جائے۔"

جیسے ہی سلطان جلال الدین خلجی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، ملنگ سنجری اپنی جگہ سے اُٹھا اور حقِ نمک ادا کرنے کے لئے سیدی مولاؒ پر کسی شکاری کی طرح جھپٹا۔ پھر اس نے اُسترے اور سُوئے سے سیدی مولاؒ کے جسم پر کئی گھاؤ لگائے جن سے خون بہنے لگا اور چند لمحوں میں اس درویش کا پیرہن خون سے رنگین ہو گیا۔ سیدی مولاؒ نے کسی خوف کے بغیر ملنگ سنجری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے جلد از جلد میری اصلی قیام گاہ (قبرستان) تک پہنچا دو۔"

یہ کہہ کر سیدی مولاؒ نے اپنا زاویہ تبدیل کیا اور سلطان جلال الدین خلجی کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"مجھ اپنے مرنے کا کوئی غم نہیں ہے۔ کیونکہ موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔ مگر میں تمہیں آخری بار نصیحت کرتا ہوں کہ میرے خون سے درگزر کرو۔ اگر میں قتل ہو گیا تو میرا لہو ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہے گا۔ تم پر اور تمہاری اولادوں پر ایسا عذاب ٹوٹے گا، جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

مؤرخ قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ سلطان جلال الدین خلجی حقیقتاً سیدی مولاؒ کو قتل کرانا نہیں چاہتا تھا مگر قدرت کی طرف سے "جرجان" کے اس درویش کی سانسوں کا شمار ختم ہو چکا تھا۔ جلال الدین خلجی کے چھوٹے بیٹے ارکلی خان نے فیل بان کو ہاتھ کا اشارہ کیا۔ فیل بان نے فوراً ہی اپنا مست ہاتھی، سیدی مولاؒ پر چھوڑ دیا۔ اس وحشی جانور نے دیکھتے ہی دیکھتے سیدی مولاؒ کو روند ڈالا۔

"تاریخ فیروز شاہی" کا مؤلف اور مشہور مؤرخ علامہ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:

"میں اُس روز دہلی میں موجود تھا۔ سیدی مولاؒ کے قتل ہوتے ہی ایک خوفناک سیاہ آندھی اُٹھی اور سارا شہر گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔ یہ اندھیرا اس قدر مہیب تھا کہ کسی شخص کو کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس آندھی کے بعد دہلی اور سوالک میں ایسا زبردست قحط پڑا کہ اس کی تاب نہ لاتے ہوئے ہندوؤں کی ایک بڑی جماعت نے دریائے جمنا میں کود کر خودکشی کر لی۔

سیدی مولاؒ کے قتل کے بعد ہی سلطان جلال الدین خلجی کے زوال کے آثار نمایاں ہونا شروع ہو گئے۔

اُسی روز سلطان کا محبوب اور لائق ترین بیٹا اختیار الدین خان خاناں بیمار پڑ گیا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے مایہ ناز طبیب بلائے گئے، مگر شہزادے کی بیماری میں افاقہ ہونے کے بجائے مرض روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ پھر ایک دن اختیار الدین خان خاناں نے سیدی مولاؒ کو خواب میں دیکھا۔ آپؒ نہایت محبت آمیز لہجے میں ولی عہدِ ہندوستان کو مخاطب کر کے فرمار ہے تھے۔

''میرے پیارے بیٹے! یہ دنیا تم جیسے نیک سیرت نوجوانوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اس لئے تم جلد ہی میرے پاس آ جاؤ گے۔''

اختیار الدین خان خاناں نے اپنا یہ خواب سلطان جلال الدین خلجی سے بیان کیا تو وہ زار و قطار رونے لگا۔ اب اُسے سیدی مولاؒ کے قتل پر شدید ندامت تھی۔ مگر توبہ کا وقت گزر چکا تھا۔ کچھ دن بعد ہی خان خاناں کا انتقال ہو گیا اور تمام دہلی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

پھر جب آہستہ آہستہ بیٹے کی موت کا غم کچھ کم ہوا تو سلطان جلال الدین خلجی کو ایک اور عذاب نے گھیر لیا۔ علاؤالدین خلجی اس کا حقیقی بھتیجا اور سگا داماد تھا۔ مگر اقتدار کی ہوس نے تمام رشتوں کو پامال کر ڈالا۔ علاؤالدین خلجی نے اپنے چچا اور خسر کے خلاف بڑی منظم اور کامیاب بغاوت کی۔ سلطان جلال الدین خلجی، موت کو سامنے پا کر اپنے تمام رشتے اور محبتیں یاد دلاتا رہا۔ مگر علاؤالدین خلجی کے ہونٹوں پر اُبھری ہوئی فتنہ گر مسکراہٹ تیز تر ہوتی چلی گئی اور اُس نے شدید طنزیہ لہجے میں والیٔ ہندوستان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے نادان چچا! یہ دنیا اسی کا نام ہے۔ اور دنیا اسی طرح حاصل کی جاتی ہے۔ ویسے بھی اب آپ بوڑھے ہو چکے ہیں اور اس قدر ضعیف و ناتواں کاندھے حکومتِ ہندوستان کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے۔'' یہ کہہ کر علاؤالدین خلجی نے اپنے مسلح سپاہیوں کی طرف دیکھا۔

پھر بیک وقت کئی شمشیریں بے نیام ہوئیں اور چند لمحوں میں فرمانروائے ہندوستان کا سر اُس کے تن سے جدا ہو کر کشتی میں گر پڑا۔ یہ خوں رنگ واقعہ اس وقت پیش آیا، جب سلطان جلال الدین ایک کشتی میں سوار ہو کر دریائے جمنا کے کنارے اپنے بھتیجے اور داماد علاؤالدین خلجی سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد آسمان کی آنکھ نے بڑا ہی عبرت ناک منظر دیکھا۔ علاؤالدین خلجی کے سپاہی سلطان جلال الدین خلجی کا کٹا ہوا سر نیزے پر بلند کئے ہوئے دہلی کے گلی کوچوں سے گزر رہے تھے اور سرکاری نقیب پورے زور و شور کے ساتھ یہ صدائیں لگا رہے تھے۔

''یہ اس شخص کی سزا ہے جو اس بے وفا دنیا پر عاشق تھا۔''

❀❀❀

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ

علاؤالدین خلجی کے تختِ ہندوستان تک پہنچتے پہنچتے سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت نظام الدین اولیاءؒ شہرتِ محبوبیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام کے حلقوں سے لے کر عوام کی صفوں تک میں آپؒ کو محبوب الٰہی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی تفصیلی سوانح لکھنے کی گنجائش نہیں۔ بس ہم انہی واقعات کا ذکر کریں گے جن کا تعلق ''سلاطینِ ہند'' اور شاہانِ وقت سے ہے۔

دراصل ہمارا بنیادی موضوع ہی یہ ہے کہ برصغیر ہندوستان میں دو چار مسلمان حکمرانوں کو چھوڑ کر کسی بادشاہ نے اسلام کی کوئی خدمت نہیں کی۔ بلکہ اکثر فرمانرواؤں کے جابرانہ اور سفاکانہ نظام نے اسلام کو بہت بدنام کیا۔ تاریخ کا یہی وہ نازک موڑ ہے، جب متعصب عیسائی مؤرخوں نے دنیا کے سب سے زیادہ ''امن پسند'' مذہب پر یہ تہمت لگائی کہ اسلام شمشیر کے زور پر پھیلا ہے۔ اگر صاحبانِ عزیمت صوفیائے کرام انتہائی آزمائش کے مواقع پر اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالتے تو ''دینِ حنیف'' کی ترقی رک جاتی اور آج برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ کروڑ نہ ہوتی۔ اس موقع پر ہمیں خلیفہ ثانی امیرالمومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یاد آتے ہیں۔ آپؓ کا طریقہ کار تھا کہ ایک سال میں دو تین بار تمام مملکتِ اسلامیہ کے عاملین (گورنرز) کا اجلاس طلب فرماتے اور انہیں اس طرح مخاطب کرتے۔

''تمہیں جو کچھ عزت و وقار اور جاہ و جلال حاصل ہے، وہ سب اسلام کا صدقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر بچے کو اس کی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا کیا ہے۔ اس لئے کسی عامل کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس آزاد بچے کو غلام بنائے۔''

دیگر انتظامی مشورے دینے کے بعد اجلاس کے آخر میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عاملین کو سخت تنبیہ کے لہجے میں مخاطب کرتے۔

''خبردار! تم اللہ کے بندوں پر اتنی سختی نہ کرنا کہ وہ کفر کی طرف لوٹ جائیں۔''

ایک یہودی مصنف نے ''دنیا کے سو بڑے انسان'' کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جو عالمگیر شہرت کی حامل ہے۔ اس کتاب کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ کن تاریخ ساز لوگوں نے انسانیت کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ مذکورہ کتاب میں سرفہرست پیغمبرِ اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم پاک ہے۔ ایک منتظم یا حکمران کی حیثیت سے مصنف نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو قیامت تک کے لئے سب سے بڑا ایڈمنسٹریٹر قرار دیا ہے۔ اس عظیم ایڈمنسٹریٹر کا یہ قول مبارک ہے کہ زیادہ مظالم انسان کو اس کے عقیدے اور مذہب سے بھی برگشتہ کر دیتے ہیں۔ زمین اور ملک سے بغاوت کرنا تو بہت چھوٹی بات ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اسی فرمان کے مطابق برصغیر ہندوستان کے ظالم اور بدکردار مسلمان حکمرانوں کی وجہ سے اہلِ ایمان، اسلام سے تو باغی نہیں ہوئے مگر وہ کروڑوں اہلِ ہنود جو اپنے بزرگوں کا قدیم مذہب چھوڑ کر اسلام کے حلقے میں داخل ہونا چاہتے تھے، ان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ یہ صوفیائے کرام ہی تھے جن کے حُسنِ عمل اور شہد سے زیادہ میٹھی زبانوں نے کفار کے دل فتح کر لئے۔ اور ان لوگوں نے اپنے

ماتھوں سے ''چھاپ تلک'' (مذہبی نشان) کھرچ ڈالے اور زُنار (مقدس دھاگے) توڑ کر پھینک دیئے۔

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے اپنے خلیفۂ اکبر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو ''اجودھن'' (پاک پتن) سے رخصت کرتے وقت وہی نصیحت کی تھی جو کچھ عرصہ پہلے سیدی مولاؒ کو کی جا چکی تھی۔ ''درویشوں کے لئے بادشاہوں اور اہلِ ثروت کی قربت ہلاکت و بربادی کا باعث ہوتی ہے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے پیر و مرشد کی اس نصیحت کو آخری سانس تک فراموش نہیں کیا اور سلاطینِ وقت سے اس طرح دُور رہے جیسے کوئی شخص بھڑکتی ہوئی آگ سے دامن بچاتا ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ اس وقت دہلی میں موجود تھے، جب ارکلی خان کے مست ہاتھی نے سیدی مولاؒ کو روند ڈالا تھا۔ اس الم ناک واقعے کی خبر سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؒ نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا تھا:

''کاش! سیدی مولاؒ میرے پیر و مرشد (حضرت بابا فریدؒ) کی نصیحت کو یاد رکھتے۔

بعض روایتوں کے مطابق قتل سے پہلے سیدی مولاؒ کو بھی حضرت بابا فریدؒ کی نصیحت یاد آئی تھی، مگر اس پر عمل کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ الغرض علاؤالدین خلجی نے تخت نشین ہوتے ہی پہلی چال یہ چلی کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے محبوب مرید حضرت امیر خسروؒ کو اپنا مصاحب خاص بنالیا۔ علاؤالدین خلجی نہایت ذہین اور مدبر حکمران تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پورا دہلی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی عقیدت و محبت کا اسیر ہے اور حضرت محبوب الٰہی اپنے تمام مریدوں میں حضرت امیر خسروؒ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نہایت سختی کے ساتھ اپنے پیر و مرشد کے حکم پر عمل پیرا تھے۔ کسی امیر کے یہاں جانا تو بہت بڑی بات ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ تو یہ بھی پسند نہیں فرماتے تھے کہ کوئی صاحبِ اقتدار آپؒ کی خانقاہ میں داخل ہو۔ علاؤالدین خلجی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزاج سے بخوبی واقف تھا، اس لئے فرمانروائے ہند نے بڑی ہوشیاری سے حضرت امیر خسروؒ کو اس بات کے لئے آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے پیر و مرشد سے سلطان کی ملاقات کرا دیں گے۔

پھر جب ایک دن حضرت امیر خسروؒ نے پیر و مرشد سے اس واقعے اور اپنے وعدے کا ذکر کیا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے کسی قدر ناگوار لہجے میں فرمایا۔

''خسرو! کیا تم میرے مزاج سے واقف نہیں ہو؟''

حضرت امیر خسروؒ جیسے جانباز عاشق کے لئے پیر و مرشد کا یہ اشارہ کافی تھا۔ بے تابانہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے قدموں میں لپٹ کر گریہ وزاری کرنے لگے۔

''سیدی! بس اس بار اپنے غلام کو معاف فرما دیں۔ آئندہ کبھی ایسی کوتاہی سرزد نہیں ہوگی۔''

واضح رہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہِ جلال میں حضرت امیر خسروؒ کو یہ خاص رعایت حاصل تھی کہ آپؒ کسی بھی وقت پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہو سکتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا معمول تھا کہ جب نمازِ عشاء کے بعد آپ اپنے حجرہ مبارک میں تشریف لے جاتے تو پھر کوئی بھی مرید آپ کی اجازت کے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ واحد مرید تھے جو اس شرط سے مستثنیٰ تھے۔ آپ جب چاہتے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔

اس تنبیہہ کے بعد حضرت امیر خسروؒ نے سلطان علاؤالدین خلجی سے صاف صاف کہہ دیا۔

''مجھے اپنی اس عہد شکنی پر ندامت ہے۔ میں پیر و مرشد سے آپ کی ملاقات نہیں کرا سکتا۔''

اپنے درباری شاعر اور مصاحبِ خاص حضرت امیر خسروؒ کی بات سن کر سلطان علاؤالدین خلجی کے چہرے پر شاہانہ غرور کا رنگ اُبھر آیا اور اس نے سخت تنبیہہ آمیز لہجے میں کہا۔

''خسرو! میں اس ملک کا حاکم اعلیٰ ہوں اور تم فرمانِ سلطانی کے تابع ہو۔''

حضرت امیر خسروؒ علاؤالدین خلجی کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کا مفہوم خوب سمجھتے تھے، اس لئے آپ نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیتے ہوئے کہا۔

''سلطان کی نافرمانی کی کم سے کم سزا یہ ہوسکتی ہے کہ خادم اس منصبِ خاص کا اہل نہیں ہے۔ اس لئے اسے چاہئے کہ فوراً شہنشاہ کی خدمت میں اپنا استعفیٰ پیش کردے۔''

حضرت امیر خسروؒ کے اس جواب سے فرمانروائے ہندوستان مطمئن نہ ہوسکا بلکہ اس کے ماتھے پر اُبھری ہوئی شکنیں مزید گہری ہوگئیں۔

''خسرو! تمہارے استعفیٰ سے بگڑی ہوئی بات نہیں بنے گی۔ اب تم خود ہی اپنے طور پر اندازہ کرلو کہ اس نافرمانی کی زیادہ سے زیادہ سزا کیا ہوسکتی ہے؟''

سلطان علاؤالدین خلجی کی گفتگو کا مفہوم مکمل طور پر واضح ہو چکا تھا۔ مگر حضرت امیر خسروؒ کے پائے استقامت میں ذرا بھی لرزش نہیں آئی۔ آپؒ نے آدابِ سلطانی کا لحاظ رکھتے ہوئے نرم مگر بے باکانہ لہجے میں جواب دیا۔

''اس نافرمانی کی سزا کئی رنگ میں ظاہر ہوسکتی ہے۔ میری جائیداد اور املاک ضبط کر کے مجھے ہندوستان بدر کیا جاسکتا ہے۔ میں اپنی نافرمانی کی ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔''

حضرت امیر خسروؒ کے تیور دیکھ کر سلطان علاؤالدین خلجی کا لہجہ مزید سخت ہوگیا۔ ''خسرو! شاعرانہ تخیل اور زندگی کے حقائق میں بڑا فرق ہوتا ہے۔''

حضرت امیر خسروؒ نے اسی بے نیازانہ انداز میں فرمایا۔

''میری شاعری، ادب اور موسیقی، سب ثانوی چیزیں ہیں۔ میں اوّل و آخر محبوبِ الٰہیؒ کا غلام ہوں اور اس غلامی کو بچانے کے لئے صرف جاہ و منصب ہی نہیں، اپنی زندگی بھی قربان کرسکتا ہوں۔''

یہ کہہ کر فارسی کا مایہ ناز شاعر، جرأت مند سالار اور ستار کے علاوہ ہندوستانی موسیقی میں کئی رگوں کا موجد چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگیا اور پھر مختصر سے سکوت کے بعد انتہائی باوقار لہجے میں دوبارہ والیٔ ہند سے مخاطب ہوا۔

''سلطان ناخوش ہوں گے تو زیادہ سے زیادہ میری دنیا خراب ہو جائے گی جو چند روزہ ہے۔ لیکن اگر پیر و مرشد ناراض ہو گئے تو آخرت خراب ہو جائے گی جو کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے۔''

حضرت امیر خسروؒ کا جواب سن کر سلطان علاؤالدین خلجی مزید کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر شہنشاہیت کا بھرم رکھنے کے لئے منہ پھیر لیا اور ہاتھ کے اشارے سے حضرت امیر خسروؒ کو کمرے سے چلے جانے کا حکم دیا۔

قارئین کی معلومات کے لئے ہم مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ کے الفاظ بھی دہراتے چلیں۔ وہ لکھتا ہے کہ حضرت امیر خسروؒ کے بعد ایسا جامع الصفات انسان اور نابغہ روزگار شخص خاکِ ہندوستان سے دوبارہ نہیں اُٹھا۔ عظیم صوفی، عظیم شاعر و ادیب، عظیم سپہ سالار اور عظیم موسیقار۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد سلطان علاؤالدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے نام مختصر خط تحریر کیا۔

''اگر یہ ملاقات رضامندی اور خوشی سے نہیں ہوسکتی تو جان لیں کہ فرمانروائے ہندوستان معذور نہیں ہے کہ وہ ہماری خانقاہ میں داخل نہ ہوسکے۔''

یہ ایک مبہم اشارہ تھا کہ سلطان علاؤالدین خلجی، حضرت محبوب الٰہیؒ کی مرضی کے بغیر بھی اپنے ارادے پر عمل کر سکتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حاکمِ وقت کا خط پڑھا اور پھر جواب میں جو کچھ لکھا، وہ صوفیائے کرام کی طویل تاریخ کے چند روشن ابواب سے ایک سنہری ورق ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے سلطان علاؤالدین خلجی کو تحریر فرمایا:

''والیٔ ہندوستان کو بھی یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ اس فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ اگر سلطان ایک دروازے سے داخل ہوگا تو فقیر دوسرے دروازے سے نکل جائے گا۔ اور اگر درویش کو زیادہ تنگ کیا گیا تو وہ ہندوستان کی حدود سے ہی نکل جائے گا۔ کیونکہ اللہ کی زمین تنگ نہیں ہے۔''

غالباً اسی دن سے فارسی زبان کا یہ محاورہ مشہور ہوا۔

ملک خدا تنگ نیست

پائے گدا لنگ نیست

(خدا کی زمین تنگ نہیں ہے اور فقیر چلنے پھرنے سے معذور نہیں ہے)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا خط پڑھ کر سلطان علاؤالدین خلجی جیسے باجبروت حکمراں پر کچھ دیر کے لئے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ آج تک اس نے کسی درویش کی بے نیازی کا یہ انداز نہیں دیکھا تھا۔ پھر جب فرمانروائے ہندوستان کی یہ کیفیت زائل ہوئی تو اس نے حضرت امیر خسروؒ کو خلوت میں طلب کیا اور آپؒ کے سامنے حضرت محبوب الٰہیؒ کا نامہ مبارک رکھ دیا اور سوالیہ نظروں سے اپنے مصاحبِ خاص کی طرف دیکھنے لگا۔

حضرت امیر خسروؒ نے پیر و مرشد کی تحریر دیکھی تو آپؒ کے چہرے پر عقیدت کا خاص رنگ اُبھر آیا۔ پھر آپؒ نے جوشِ مسرت و اضطراب میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مکتوبِ گرامی کو تین بار بوسہ دیا اور اپنی آنکھوں سے لگایا۔ پھر ایک ایک لفظ کو بغور پڑھا اور والیٔ ہندوستان سے مخاطب ہو کر بولے۔

''واللہ! میرے پیر و مرشد ایسے ہی ہیں۔ وہ حق تعالیٰ کے سوا کسی مادی طاقت کے سامنے خم نہیں ہوتے۔ اگر سلطانِ معظم نے زیادہ پریشان کیا تو میرے مخدوم ہندوستان چھوڑ کر کسی اور مقام پر تشریف لے جائیں گے۔ میں یہ بات اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ حضرت محبوب الٰہیؒ میرے پیر و مرشد ہیں۔ خدانخواستہ مخدوم یہ ملک چھوڑ کر چلے گئے تو اہلیانِ ہند کے لئے وہ بہت منحوس اور سیاہ ترین دن ہوگا۔ بے چارے جاہل عوام تو عدم آگہی اور بے خبری کا شکار ہیں، مگر جو عالم اور باخبر ہیں، انہیں بھی اس حقیقت کی خبر نہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی سے کتنی برکتیں اور سعادتیں وابستہ ہیں۔''

''خسرو! میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ حضرت شیخ، ہندوستان چھوڑ کر نہ جائیں۔'' سلطان علاؤالدین خلجی نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ اب اُس کے طرزِ گفتگو سے شاہانہ رعونت رخصت ہو چکی تھی۔ ''اب تم ہی اپنے پیر و مرشد کو روک سکتے ہو۔ میں تو حضرت شیخ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہونا چاہتا تھا کہ اپنی سلامتی اور اقتدار کی ترقی کے لئے دعا کرا سکوں۔''

پھر جب حضرت امیر خسروؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سامنے علاؤالدین خلجی کی خواہش کا اظہار کیا آپؒ نے فرمایا۔

''جب تک تمہارا سلطان اپنے وعدے پر قائم رہے گا، یہ فقیر بھی اسے اپنی دعاؤں میں یاد رکھے گا۔ اور جس روز اس نے عہد شکنی کی، اسی دن وہ خود بخود میرے حلقہ دُعا سے دُور ہو جائے گا۔''

وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا رہا۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے 20 سال تک حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دعاؤں کے زیر اثر نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ سلطان کی فوجی فتوحات میں راجستھان کے مشہور قلعے ''چتوڑ'' کی تسخیر ہے۔ یہ قلعہ اپنی مضبوطی کے باعث ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ سلطان علاؤالدین خلجی ہندوستان کا پہلا مسلم حکمران ہے جس نے سخت ناسازگار موسم کے باوجود مسلسل آٹھ ماہ تک ''چتوڑ'' کا محاصرہ جاری رکھا اور پھر اس قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

سلطان علاؤالدین خلجی نے پوری زندگی میں 84 چھوٹی بڑی جنگیں لڑیں۔ ان تمام خونیں معرکوں میں بعض جنگیں تو اس قدر ہولناک تھیں کہ ان میں فرمانروائے ہندوستان کی شکست صاف نظر آتی تھی، مگر حیرت انگیز طور پر علاؤالدین خلجی کی فوج نے فتح حاصل کی اور یہ ناقابل یقین کامیابی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دعاؤں کا نتیجہ تھی۔ یہاں تفصیلات کی گنجائش نہیں ورنہ قارئین ان واقعات کو پڑھ کر حیرت زدہ رہ جاتے جن سے حضرت محبوب الٰہیؒ کے روحانی تصرف کا اظہار ہوتا ہے۔ تمام معتبر مؤرخین کی روایتوں کے مطابق جس قدر فتوحات سلطان علاؤالدین خلجی کے حصے میں آئیں، وہ ہندوستان کے کسی دوسرے حکمران کو نصیب نہیں ہوئیں۔ پورے ہندوستان میں کہیں دس بیگھہ زمین بھی ایسی نہ رہی جہاں علاؤالدین خلجی کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری نہ ہوا۔ اس کے علاوہ یہ روایت بہت شہرت رکھتی ہے کہ علاؤالدین خلجی کا خزانہ سلطان محمود غزنوی کے خزانے سے بھی بڑھ کر تھا۔ مختصر یہ کہ اس کی عسکری قوت کی کوئی انتہا نہ تھی اور نہ مال و دولت کا کوئی شمار۔ ان ہی دونوں چیزوں نے سلطان علاؤالدین خلجی کو آخری عمر میں نہایت مغرور و متکبر بنا دیا تھا۔ پہلے اس کے تمام انتظامی شعبوں میں ماہرین جمع تھے اور وہ ہر مشکل مسئلے میں ان سے مشورے کیا کرتا تھا اور اب یہ صورتِ حال تھی کہ والئ ہندوستان نے اپنے تمام مشیروں کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اب تھا تو بس ملک کافور۔

ملک کافور کا مختصر سا تعارف یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک نہایت حسین و جمیل ہندو لڑکا تھا۔ اہلِ ہنود کے مشہور علاقے گجرات پر حملے کے وقت یہ ہندو زادہ، فرمانروائے ہند کے ہاتھ آیا تھا۔ سلطان علاؤالدین خلجی اسے دیکھتے ہی دل و جان سے اس پر عاشق ہو گیا۔ پھر سلطان نے اس کا نام بدل کر ''ملک کافور'' رکھ دیا۔ یہ ہندو زادہ انتہائی خوبصورت ہونے کے ساتھ بہت ذہین بھی تھا۔ ملک کافور نے سلطان علاؤالدین خلجی کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''ناز و غمزہ داد'' کا وہ مظاہرہ کیا کہ سلطان علاؤالدین خلجی جیسا سنگ دل حکمراں بھی موم کی طرح پگھل گیا اور ایک ہندو زادہ، سلطان کے دل و دماغ پر کسی آسیب یا بلا کی طرح مسلط ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ دن بھی آ گیا کہ سلطنت خلجی کے بڑے بڑے قابل امراء بھی صرف ملک کافور کے رحم و کرم کے محتاج ہو کر رہ گئے۔ ملک کافور جس امیر سے خوش ہوتا، وہی اپنے عہدہ و منصب پر برقرار رہتا اور جس سے ناراض ہوتا، اسے علاؤالدین خلجی ذلیل کر کے قصرِ سلطان سے نکال دیتا۔

سلطان کی حسین ترین بیگمات مہینوں شوہر کی صورت دیکھنے کو ترستی رہتیں اور اس ہندو زادے ملک کافور کے مرنے کی دعائیں مانگتی رہتیں۔ مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' میں ملک کافور کو ''حرام زادے'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ مگر ہم ملک کافور کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے۔ سارا قصور تو سلطان علاؤالدین خلجی کا تھا کہ وہ اس ''فعلِ قبیح'' میں مبتلا تھا، جس کے باعث حضرت لوط علیہ السلام کی امت پر خوفناک عذاب نازل ہوا تھا اور پوری قوم صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی تھی۔

ملک کافور اوّل و آخر ہندو تھا۔ اس نے سلطان علاؤالدین خلجی سے اپنی قوم کی شکست کا بھیانک انتقام لیا۔

قربتِ خاص کے سبب ملک کافور نے اتنی ہوشیاری سے سلطان علاؤالدین خلجی کو زہر دے کر مار ڈالا کہ والئ ہند کے قتل سے اس کا دامن صاف رہا۔

سلطان علاؤالدین خلجی کے چار بیٹے تھے۔ ان سب میں سب سے بڑا خضر خان تھا جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ خضر خان سے چھوٹا شادی خان، پھر قطب الدین مبارک شاہ خلجی اور سب سے چھوٹا شہاب الدین عمر۔ باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر سات سال تھی۔ ملک کافور نے سلطان علاؤالدین خلجی سے اس وقت وصیت تحریر کرائی تھی، جب والئ ہندوستان شراب کے نشے میں بدمست تھا اور اسے یہ تمیز نہیں تھی کہ وہ سرکاری دستاویز پر کیا لکھ رہا ہے۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے اپنی وصیت میں مندرجہ ذیل عبارت تحریر کی تھی۔

''میں اپنے تینوں بیٹوں خضر خان، شادی خان اور قطب الدین مبارک شاہ سے ان کی نافرمانیوں کے سبب سخت ناراض ہوں۔ اس لئے انہیں حوالۂ زنداں کر دیا جائے۔ میرا سب سے چھوٹا بیٹا شہاب الدین عمر ہی تختِ ہندوستان کا حقیقی وارث ہے۔ جب تک وہ جوانی اور ہوش کی منزل کو نہیں پہنچ جاتا، اس وقت تک ملک کافور، شہاب الدین عمر کی نیابت کرے گا۔''

یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ملک کافور کو ''ملک نائب'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ملک کافور نے شہاب الدین عمر کو تاجِ شاہی پہنایا اور خضر خان، شادی خان اور قطب الدین مبارک شاہ کو گرفتار کر کے آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ خضر خان اور شادی خان سے تھا۔ اس لئے ملک کافور نے کسی تاخیر کے بغیر دونوں شہزادوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر انہیں اندھا کر دیا۔ تاکہ وہ زندہ بچ جانے کی صورت میں بھی حکومت کرنے کے قابل نہ رہیں۔ دراصل ملک کافور کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ پہلے تینوں بڑے شہزادوں سے نجات حاصل کر لے، پھر سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد کسی مناسب موقع پر شہاب الدین عمر کو بھی قتل کرا دے اور ہندوستان کا خودمختار بادشاہ بن جائے۔ خضر خان اور شادی خان کے بعد قطب الدین مبارک شاہ خلجی، ملک کافور کا دوسرا ہدف تھا۔

مگر ابھی وہ قطب الدین خلجی کو قتل کرا نہیں پایا تھا کہ وقت کا خنجر خود اس کی گردن پر چل گیا۔ خواجہ سراؤں کے سردار مبشر اور بشیر آدھی رات کے وقت ملک کافور کی خواب گاہ میں گھس گئے اور اسے نیند کی حالت میں قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ سلطان علاؤالدین خلجی کی موت کے 35 دن بعد پیش آیا۔ اس طرح شہاب الدین عمر کی آڑ میں ایک مخنث (ہیجڑے) نے ہندوستان پر ایک مہینہ اور پانچ دن حکومت کی۔

ملک کافور کے قتل ہوتے ہی سلطان علاؤالدین خلجی کا تیسرا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ خلجی قید خانے سے باہر آیا اور اپنے کم سن بھائی شہاب الدین عمر کا نائب بن گیا۔ پھر دو ماہ بعد امرائے سلطنت کے مشورے سے قطب الدین خلجی نے شہاب الدین عمر کو معزول کر دیا اور خود ہندوستان کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھا۔ اگرچہ سات سالہ شہاب الدین عمر اپنے بڑے بھائی کے لئے کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا مگر ہوسِ اقتدار اپنے راستے میں کسی مقابل کے امکان کو بھی گوارا نہیں کرتی۔ ظالمانہ سیاست کے اسی اصول کے مطابق قطب الدین خلجی نے معصوم شہاب الدین عمر کی آنکھوں میں لوہے کی دہکتی ہوئی سلائیاں پھروا دیں اور چھوٹے بھائی کو اندھا کر کے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔

اپنے باپ سلطان علاؤالدین خلجی کی طرح قطب الدین خلجی بھی ایک ہندو لڑکے کی محبت میں گرفتار تھا۔ یہ

خوب صورت ترین لڑکا "مالوہ" کی فتح کے موقع پر سلطان علاؤالدین خلجی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔
قطب الدین نے ہندو زادے کو مسلمان کر کے اس کا نام خسرو خان رکھا اور پھر اسے اپنا محبوب بنا لیا۔ خسرو خان کو قطب الدین خلجی کے دربار میں وہی حیثیت حاصل تھی جیسی ملک کافور کو سلطان علاؤالدین خلجی کے حضور میں۔

سلاطینِ دہلی کے زمانے میں یہ ایک مخصوص رسم تھی کہ ہر مہینے نیا چاند دیکھ کر مقامی علماء، قاضی اور صوفی، بادشاہ کے سلام کے لئے قصرِ شاہی میں جمع ہوتے تھے اور حاکمِ وقت کی بلند اقبالی اور درازیٔ عمر کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ اس کے جواب میں بادشاہ علماء اور صوفیا کی خدمت میں قیمتی تحائف پیش کرتا تھا۔ محبوب الٰہی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کسی بادشاہ کے سلام کے لئے قصرِ سلطانی میں کبھی داخل نہیں ہوئے۔ دہلی کے درباری اور دنیا دار علماء، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بے پناہ مقبولیت اور محبوبیت سے بہت زیادہ حسد رکھتے تھے۔ سلطان علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت میں تو علماء کی اس جماعت کا بس نہیں چلا مگر قطب الدین خلجی جیسے بدکار اور عاقبت نا اندیش انسان کے تخت نشین ہوتے ہی دنیا پرست علماء کی سازش کامیاب ہوگئی۔

ایک بار پھر جب نئے چاند کی مبارکباد دینے اور سلام کرنے کے لئے علماء کا یہ گروہ قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایک عالم نے اپنے شر انگیز منصوبے پر عمل کرتے ہوئے فرمانروائے ہند سے کہا۔
"حضورِ والا! ہندوستان کے تمام باشندے آپ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ایک شخص......" اس فتنہ پرور عالم نے قصداً اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔
سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے چونک کر اس عالم کی طرف دیکھا اور پھر نہایت تند و تیز لہجے میں سوال کیا۔
"کون ہے وہ گستاخ و بے ادب شخص جو ہماری ہی مملکت میں رہتا ہے اور ہمارے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتا؟"
اس دنیا دار عالم نے فتنہ و شر کی چنگاری رکھ دی تھی اور اب وہ جھوٹ اور بہتان کی ہوا سے اس چنگاری کو شعلہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "سلطانِ معظم! وہ شیخ نظام الدین اولیاءؒ ہیں جنہیں اپنی درویشی پر بڑا غرور ہے۔ اسی لئے وہ آپ کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ خود کو ہندوستان کا بے تاج بادشاہ کہتے ہیں۔"
سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی خود بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شہرت و مقبولیت سے بے خبر نہیں تھا، اس لئے فرمانروائے ہند نے اس عالم سے وضاحت طلب کی۔ "کیا تم اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش کر سکتے ہو؟"
اُس ریا کار عالم نے برجستہ جواب دیتے ہوئے کہا۔
"اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ تمام علمائے دہلی، حضورِ والا کو نئے چاند کی مبارکباد دینے کے لئے یہاں موجود ہیں۔ آپ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرمالیں کہ ان بزرگ حضرات میں شیخ نظام الدین کسی کا نام ہے؟"
یہ سن کر قطب الدین مبارک شاہ خلجی چونکا اور اس کے چہرے پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔
اسی عالم نے قطب الدین خلجی کی ناگواری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان کے اوباش اور احمق حکمران کے منتشر ذہن پر ایک اور ضرب لگائی۔
"شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے حاضر نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حضور نے ان کے معتقد خضر خان کو

قتل کرا دیا ہے۔ شیخ علی الاعلان کہتے ہیں کہ میں ایک قاتل کے دربار میں جانا پسند نہیں کرتا۔"

اس دنیا دار عالم کی یہ تدبیر بہت زیادہ کارگر ثابت ہوئی۔ دراصل لائق اور بڑا بیٹا ہونے کے سبب خضر خان ہی سلطان علاؤالدین خلجی کا صحیح جانشین تھا۔ بعض مؤرخین کے مطابق خضر خان، حضرت نظام الدین کا معتقد ہی نہیں، مرید بھی تھا۔ ملک کافور نے اپنی چالبازیوں سے خضر خان کو علاؤالدین خلجی کی نظروں سے گرا کر شہاب الدین عمر کو تختِ ہندوستان کا وارث قرار دلایا۔ پھر علاؤالدین خلجی کے مرتے ہی اس نے خضر خان اور شادی خان کو اندھا کرا کے قید خانے میں ڈال دیا تھا۔

قطب الدین خلجی نے اپنے اندھے بھائیوں کو اقتدار کے لئے خطرہ سمجھتے ہوئے شہاب الدین عمر کے ساتھ خضر خان اور شادی خان کو بھی قتل کرا دیا تھا۔

درباری علماء نے اس واقعہ کو بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا۔ نتیجتاً قطب الدین خلجی غضب ناک ہو گیا اور اس نے فوری طور پر فرمان جاری کر دیا:

"اس فقیر نظام الدین سے کہو کہ وہ اگلے ماہ کی پہلی تاریخ کو دوسرے علماء اور مشائخ کی طرح سلطان کی سلامی کے لئے حاضر ہو ورنہ اس حکم عدولی کی سزا بھگتنے کے لئے تیار رہے۔" قطب الدین خلجی کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز تھا۔

حکم سلطانی سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی محبوبیت سے حسد رکھنے والی علماء کی جماعت میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ برسوں سے سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ کو دربارِ سلطانی میں خم دیکھنے کے منتظر تھے۔ آج ان دنیا دار علماء کا منصوبہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔

پر دوسرے دن سلطان کے اہلکار حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں پہنچے اور با آواز بلند قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا فرمان پڑھ کر سنایا۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفۂ اکبر حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ اور حضرت امیر خسرو بھی موجود تھے۔ پھر جب سلطانی اہلکار، خانقاہ سے چلے گئے تو حضرت امیر خسرو نے انتہائی پریشان لہجے میں عرض کیا۔

"سیدی! قطب الدین خلجی بہت تند خو اور کینہ پرور انسان ہے۔" دراصل حضرت امیر خسرو کا اشارہ اس طرف تھا کہ قطب الدین مبارک شاہ خلجی اپنے سینے میں شدید انتقامی جذبہ رکھتا ہے اور اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے وہ اپنے تین بھائیوں کو قتل کرا چکا ہے۔

اپنے مرید خاص کی بات سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم اُبھر آیا اور آپؒ نے اسی قلندرانہ شان کے ساتھ فرمایا۔

"خسرو! تمہارا مرشد نظام الدین اور تمہارا سلطان قطب الدین اپنے اپنے اعمال کے جواب دہ ہیں۔ یہ قدرت کا فیصلہ ہے کہ ایک انسان، دوسرے انسان کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔"

حضرت امیر خسروؒ پیرومرید کا ارشادِ گرامی سن کر بظاہر مطمئن ہو گئے مگر اندر سے بہت خوف زدہ تھے۔

پھر نئے مہینے کا چاند نظر آیا۔ تمام علماء اور مشائخ حسبِ دستور بادشاہ کے سلام کے لئے جمع ہوئے۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر وہاں حضرت محبوب الٰہیؒ موجود نہیں تھے۔

"کیا تم نے اس فقیر نظام الدین کو ہمارا حکم پہنچا دیا تھا؟" سلطان قطب الدین خلجی نے اپنے ان خدمت گاروں سے پوچھا جو اس کی مسندِ زرنگار کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

ایک خدمت گار نے نصف قد تک خم ہوتے ہوئے عرض کیا۔
''سلطانِ معظم کے فرمانِ مبارک کا ایک ایک حرف پڑھ کر سنا دیا گیا تھا۔''
''پھر نظام الدین ہمارے سلام کے لئے حاضر کیوں نہیں ہوا؟'' فرمانروائے ہندوستان کا لہجہ غضب ناک بھی تھا اور تحقیر آمیز بھی۔ ابھی کمرے میں والیٔ ہند کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ وہ دنیا دار عالم اپنی نشست پر کھڑا ہوا جس نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلاف یہ سازش تیار کی تھی۔
''میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ شیخ نظام الدین، فرمانِ شاہی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس لئے آج بھی وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔''
پھر جیسے ہی اس عالم کی بات ختم ہوئی، سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی شدید حالتِ غضب میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے خدمت گاروں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔
''اسی وقت جاؤ اور نظام الدین کو ہمارے حضور میں پیش کرو۔ اگر وہ خوشی سے آئے تو خاموشی کے ساتھ لے آؤ ورنہ اسے زنجیریں پہنا کر عام راستوں سے گزارتے ہوئے ''قصرِ ہزار ستون'' تک لاؤ اور ساتھ ساتھ پورے زور و شور سے یہ اعلان بھی کرتے رہو کہ یہ شخص سلطان کا نافرمان اور حکومتِ وقت کا باغی ہے۔''
یہ کہہ کر سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کمرے سے نکل گیا۔
''قصرِ ہزار ستون'' ایک وسیع و عریض محل تھا جس کی عمارت ایک ہزار ستونوں کی بنیاد پر تعمیر ہوئی تھی۔
اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ غیاث پور میں مقیم تھے جو دہلی کا نواحی علاقہ ہے۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے سبب سلطان کے مسلح خدمت گار گھوڑوں پر سوار ہو کر غیاث پور کی طرف روانہ ہو گئے۔
حضرت محبوب الٰہیؒ کی گرفتاری کا حکم دے کر سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی اپنے خصوصی ''عشرت کدے'' میں چلا گیا۔ وہاں اس نے جی بھر کے شراب پی اور اپنے محبوب خسرو خان کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگا۔
مسلح سپاہی سخت ذہنی کشمکش اور اذیت میں مبتلا تھے۔ وہ حکم سلطانی سے مجبور ہو کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ تک تو آ گئے تھے مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اندر داخل ہو سکیں۔ اس ذہنی کشمکش کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جو سپاہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو گرفتار کرنے آئے تھے، وہ خود بھی دل سے آپؒ کی روحانی عظمت کے قائل تھے۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد ایک سپاہی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔
''تم لوگ یہیں دروازے پر ٹھہرو۔ میں حضرت شیخ سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ کچھ دیر کے لئے ہمارے ساتھ قصرِ شاہی تشریف لے چلیں تاکہ حکم سلطانی کی بھی تعمیل ہو جائے اور ہماری جانیں بھی محفوظ رہیں۔''
یہ کہہ کر وہ سپاہی خانقاہ کے اندر داخل ہوا۔ خانقاہ کے تمام انتظامات کے نگران حضرت خواجہ اقبالؒ تھے۔ خواجہ اقبالؒ کو حضرت محبوب الٰہیؒ کا خادمِ خاص ہونے کا اعزاز و شرف حاصل تھا۔ سلطان مبارک شاہ خلجی کے سپاہی نے خانقاہ کے اندر داخل ہو کر خواجہ اقبالؒ سے دریافت کیا۔
''حضرت شیخ اس وقت کہاں ہیں؟''
خواجہ اقبالؒ نے کسی قدر حیرت سے اس مسلح سپاہی کو دیکھا اور فرمایا۔
''پیر و مرشد خانقاہ کی چھت پر تشریف فرما ہیں اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہیں۔''
مسلح سپاہی نے پورا واقعہ سنانے کے بعد خواجہ اقبالؒ سے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

''آپ حضرت شیخ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیں اور ان سے گزارش کریں کہ کچھ دیر کے لئے قصرِ ہزار ستون تشریف لے چلیں۔ اس طرح سلطان کا غصہ دور ہو جائے گا اور حضرت شیخ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا۔''

حکمِ سلطانی کا یہ انداز دیکھ کر خواجہ اقبال بہت زیادہ پریشان ہوئے مگر پھر بھی آپ نے اس سپاہی سے صاف صاف کہہ دیا۔

''میں اس گستاخی اور بے ادبی کا مرتکب نہیں ہو سکتا کہ پیر و مرشد کی عبادت میں خلل ڈالوں۔ تم خود ہی اوپر جا کر حضرت شیخ کو باخبر کر دو۔''

سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا وہ سپاہی سہمے ہوئے انداز میں خانقاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر پہنچا۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور آپ نہایت پُرجلال لہجے میں بار بار فارسی زبان کا یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

اے رو بہک چرانہ نشتی بجائے خویش
باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

(اے لومڑی کے بچے! تُو اپنی جگہ سکون سے کیوں نہیں بیٹھا؟ تُو نے شیر کے پنجے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنی سزا دیکھی)

سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا سپاہی خاموشی کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو ٹہلتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر جب حضرت محبوب الٰہیؒ ٹھہرے تو اس نے دست بستہ آگے بڑھ کر اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے عرض کیا۔

''شیخ! ہمارے دلوں میں آپ کے لئے بے حد عقیدت و احترام ہے مگر ہم حکمِ سلطانی سے مجبور ہیں۔ براہِ کرم کچھ دیر کے لئے قصرِ ہزار ستون تشریف لے چلیں ورنہ سلطانِ معظم ہمیں قتل کرا دیں گے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس سپاہی کی بات سنی پھر انتہائی پُرجلال لہجے میں فرمایا۔

''واپس جا کر ذرا اپنے سلطان کی خبر تو لو کہ وہ کس حال میں ہے؟''

حضرت محبوب الٰہیؒ کی بات سن کر سپاہی پر عجیب سی ہیبت طاری ہو گئی اور وہ تیز قدموں کے ساتھ خانقاہ کی چھت سے نیچے اُتر آیا۔ پھر جب وہ دوسرے سپاہیوں کے ہمراہ ''قصرِ ہزار ستون'' پہنچا تو وہاں ایک ناقابلِ یقین ہنگامہ برپا تھا۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا کٹا ہوا خون آلود سر محل کے صحن میں پڑا ہوا تھا اور ہر طرف ایسی ہلچل مچی ہوئی تھی کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہے اور اس سے بچنے کے لئے تمام مکین اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔

اس خون رنگ واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ اپنے سپاہیوں کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی گرفتاری کا حکم دے کر سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی اپنے عشرت کدۂ خاص میں چلا گیا اور خسرو خان کے ہاتھ سے شراب پینے لگا۔ پھر جب فرمانروائے ہندوستان کثرتِ شراب نوشی سے مدہوش ہو گیا تو خسرو خان کے معتمد سپاہی عشرت کدے میں داخل ہو گئے اور ان کی چمکتی ہوئی شمشیروں نے چند لمحوں میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا سر کاٹ کر محل کے وسیع و عریض صحن میں پھینک دیا تاکہ قلعے میں شدید خوف و ہراس پھیل جائے۔

خسرو خان نے بغاوت اور سلطان قطب الدین خلجی کے قتل کا منصوبہ بہت پہلے تیار کیا تھا۔ اب اسے اتفاق کہا جائے یا قدرت کی کرشمہ سازی کہ یہ خونیں واردات اس وقت واقع ہوئی جب سلطان قطب الدین مبارک شاہ

خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں انتہائی گستاخی کی تھی اور آپؒ کی گرفتاری کا حکم جاری کیا تھا۔

اکثر مؤرخین نے خسرو خان کی قومیت کے بارے میں بس اتنا ہی تحریر کیا ہے کہ وہ گجرات کی کسی نیچ قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ ''مالوہ'' کی جنگ کے دوران وہ ایک قیدی کی حیثیت سے شاہی محل میں پیش کیا گیا۔ غیر معمولی حسین ہونے کی وجہ سے سلطان علاؤالدین خلجی نے اُسے ''قصرِ ہزار ستون'' کے خدمت گاروں میں شامل کرلیا تھا۔

پھر وہ قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی اوباش فطرت کے سبب اس کا محبوب بنا اور ایک دن موقع پا کر اپنے عاشق سلطان کو قتل کر کے تختِ ہندوستان پر بیٹھ گیا۔

ہمارے نزدیک خسرو خان عقیدتاً ہندو تھا۔ اس نے مصلحتِ وقت کے پیش نظر اسلام قبول کرلیا تھا مگر اس کے دل و دماغ کافر تھے اور آخری سانس تک کافر ہی رہے۔

ہماری اس تحقیق کا حاصل وہ چند تاریخی واقعات ہیں، جو خسرو خان کے مذہبی عقیدے کو ظاہر کرتے ہیں۔ مبارک شاہ خلجی اس کی محبت میں اس قدر اندھا ہوگیا تھا کہ والئ ہند کو کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ خسرو خان نے سلطان قطب الدین خلجی کی اجازت سے گجرات کے 20 ہزار ہندو خانہ بدوشوں کو بڑے انعام و اکرام کا لالچ دے کر سلطانی فوج میں بھرتی کیا۔ انہیں دن رات سخت فوجی تربیت دی گئی اور بہترین اسلحے سے لیس کر دیا گیا۔

اس کے علاوہ خسرو خان نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے ہندو بدمعاش دہلی میں جمع کئے اور انہیں بھی عسکری تربیت دی گئی۔ اس طرح خسرو خان کے ہندو سپاہیوں کی تعداد 50 ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ تمام فوجی خسرو خان کے لئے جان دینے پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے اور اس کے دو بنیادی اسباب تھے۔

پہلا یہ کہ خسرو خان ان سپاہیوں پر بے دریغ دولت خرچ کرتا تھا جس کے نتیجے میں خانہ بدوش ہندوؤں کے خاندان امیرانہ زندگی بسر کررہے تھے۔

دوسرا یہ کہ خسرو خان نے انہیں یقین دلایا تھا کہ سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے قتل کے بعد وہ آہستہ آہستہ ''ہندو راج'' قائم کردے گا۔

اس کے علاوہ خسرو خان نے ایک اور شاطرانہ چال یہ چلی تھی کہ دہلی کے دو بڑے بدمعاشوں قمرہ قمار اور یوسف صوفی کو بھی بڑے بڑے عہدوں کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بالآخر خسرو خان کی منصوبہ بندی کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی عبرت ناک موت سے دوچار ہوا۔

سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے قتل کے دوسرے دن خسرو خان تختِ ہندوستان پر بیٹھا اور سلطان ناصرالدین کا لقب اختیار کیا۔ سلطنتِ خلجی کے بڑے بڑے امراء کو اپنے سامنے دست بستہ کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ ان معزز ترین امراء میں عین الملک اور ملک جونا بھی شامل تھے۔

سلطان علاؤالدین خلجی اور قطب الدین خلجی کے تمام معتمد امراء کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور ان کے خاندان کی تمام خواتین گجرات کے ہندوؤں کے حوالے کردی گئیں۔

اس مفسدانہ اور خوں ریز کارروائی کے بعد خسرو نے اپنے بھائی کو ''خانِ خاناں'' کا خطاب دے کر ہندوستان کا وزیر اعظم بنا دیا اور سلطان علاؤالدین خلجی کی بیٹی اس کے حوالے کردی۔

اس کے بعد خسرو خان نے جو اب سلطان ناصرالدین بن چکا تھا، سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی ایک بیوی کو اپنے حرم میں داخل کرلیا۔ پھر سلطان علاؤالدین خلجی اور سلطان قطب الدین خلجی کی دوسری بیویوں،

بیٹیوں اور خاندان کی دوسری عورتوں کو اپنے فوجی سرداروں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں بیشتر گجرات کے ہندو تھے اور کچھ دہلی کے مسلمان بدمعاش۔

ان تمام تاریخی واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ خسرو خان اوّل و آخر بدترین ہندو ہی تھا جس نے مسلمانوں کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔

مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ تحریر کرتا ہے:

''خسرو خان کے دورِ حکومت میں مذہب اسلام کی بہت بری حالت تھی۔ غیر مسلموں کے حوصلے اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ وہ قرآن پاک سے وہی کام لیتے تھے جو بیٹھنے کے لئے کرسی یا مونڈھے سے لیا جاتا ہے۔ (معاذ اللہ)''

یہ خسرو خان کے ہندو ہونے کی آخری دلیل ہے۔ مسلمان کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، وہ کتابِ الٰہی کی یہ بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتا۔

مختصر یہ کہ اس ذلیل فطرت ہندوزادے کا دورِ حکومت تقریباً پانچ ماہ تھا۔ آخر سلطان علاؤالدین خلجی کے ایک شجاع اور ذہین سالار غازی ملک نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس فتنہ گر کی تخریب کاریوں سے نجات دلائی۔ غازی ملک اس وقت لاہور اور دیپالپور کا حاکم تھا۔ غازی ملک نے خسرو خان کی بدکار فوج کو شکست فاش دی اور اس نمک حرام کو قتل کر کے اس کی لاش چوراہے پر لٹکا دی۔

غازی ملک نے خسرو خان کے بھائی خان خاناں کا بھی یہی حشر کیا۔ پھر ان تمام فتنہ گروں کا مکمل قلع قمع کر کے ''دربارِ سلطانی'' میں حاضر ہوا جہاں دیگر معزز امراء بھی موجود تھے۔ غازی ملک نے ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے باآواز بلند کہا۔

''میں بھی آپ حضرات کی طرح ایک امیر ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے تمام نمک حراموں سے اپنے آقا کے خون کا انتقام لے لیا ہے۔ اب اگر ہمارے آقاؤں کی نسل سے کوئی فرد موجود ہو تو آپ لوگ کسی تکلف کے بغیر اسے تختِ شاہی پر بٹھا دیں۔ ہم سب دل و جان سے اس کی اطاعت و فرمانبرداری کریں گے۔ اور اگر بدقسمتی سے ''علائی'' خاندان بالکل تباہ و برباد ہو چکا ہو اور اس سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد اس دنیا میں باقی نہ رہا ہو تو آپ حضرات آزاد ہیں، جسے بھی چاہیں اپنا باشاہ منتخب کر لیں۔ میں قبل از وقت ہی اس نومنتخب بادشاہ کی حمایت و اطاعت کا حلف اٹھاتا ہوں۔''

غازی ملک کی مخلصانہ اور اثر انگیز تقریر سن کر بیشتر امراء کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور پھر ان سب لوگوں نے بیک زبان کہا۔

''سلطان علاؤالدین خلجی کا خاندان مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔ اب اس خاندان میں ایسا کوئی قابل ذکر مرد موجود نہیں جسے تختِ شاہی پر بٹھا کر یہ اہم ترین ذمہ داری اس کے سپرد کی جا سکے...... تم نے پہلے بھی کئی بار بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے ہندوستانی باشندوں پر احسانات کئے ہیں اور اب تمہارا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ تم نے ہمارے بادشاہ کے قاتلوں سے بدلہ لے لیا ہے۔ اس لئے ہماری نظر میں تم سے زیادہ بادشاہت کا حق دار کوئی نہیں ہے۔''

امراء کی بات سن کر غازی ملک اپنی نشست پر خاموش بیٹھا رہا اور اس نے اپنے چہرہ سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

آخر تمام امراء اپنی اپنی نشستوں سے اُٹھے اور غازی ملک کا ہاتھ پکڑ کر اُسے تختِ شاہی پر بٹھا دیا۔ پھر سب امراء اور فوجی سرداروں نے اپنے نئے بادشاہ کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔

بڑا عجیب اور عبرت ناک منظر تھا۔

ایک فوجی سالار کسی سازش کے بغیر ''سلطان'' کے منصبِ اعلیٰ تک پہنچا اور مضبوط ترین خلجی سلطنت دو ہندو لڑکوں کی وجہ سے بے نام ونشاں ہو کر رہ گئی۔

سپہ سالار غازی ملک نے خسرو خان کو قتل کرنے کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کیا اور ہندوستان پر کامیابی کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ کسی مستند تاریخ سے ''تغلق خاندان'' کے حسب ونسب کا پتہ نہیں چلتا۔ اس سلسلے میں بس اتنی ہی تحقیق ہو سکی ہے کہ غیاث الدین تغلق کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی نژاد غلام تھا۔ دراصل ''تغلق'' ترکی زبان کے لفظ ''قتلغ'' سے نکلا ہے جو ہندوستان میں کثرتِ استعمال سے بگڑتے بگڑتے ''تغلق'' بن گیا۔ بہرکیف غیاث الدین تغلق ہی کی وجہ سے اس خاندان نے تاریخِ ہندوستان میں نمایاں جگہ حاصل کی۔

مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ اس ہندو زادے خسرو خان کی ریشہ دوانیوں نے ہندوستان کی سیاست اور معیشت تباہ کر دی تھی۔ سلطان غیاث الدین تغلق ذہین فوجی سالار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین منتظم بھی تھا۔ نتیجتاً اس نے بہت جلد اس بگڑی ہوئی صورتِ حال پر قابو پالیا اور ہندوستان نئی ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو گیا۔

تاریخ فرشتہ کی روایت کے مطابق سلطان غیاث الدین تغلق نہایت خدا ترس، نیک و پرہیزگار انسان تھا۔ مذہبی قوانین کی پابندی کو اپنا فرض سمجھتا تھا اور پانچوں وقت کی نماز با جماعت ادا کرتا تھا۔ تغلق اس قدر احسان شناس تھا کہ اپنے مرحوم آقا سلطان علاؤ الدین خلجی کے پس ماندگان کی خدمت کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے ہندوستان کے تخت پر بیٹھتے ہی ان لوگوں کو سخت سزائیں دی تھیں جنہوں نے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی بیوہ کا نکاح عدت کی مدت ختم ہونے سے پہلے خسرو خان کے ساتھ کر دیا تھا۔

مؤرخ قاسم فرشتہ کے بقول سلطان غیاث الدین تغلق میں عقل وفراست، سنجیدگی اور بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ دیوانِ عام میں بیٹھ کر رعایا کے حالات سنتا اور غریب لوگوں کی معاشی بدحالی دور کرنے کے لئے دن رات کوشاں رہتا۔ سلطان غیاث الدین تغلق عام بادشاہوں کی طرح تخت نشینی اور اقتدار کی نمائش کا قائل نہیں تھا بلکہ اپنے آپ کو رعایا کا ایک ادنیٰ خادم سمجھتا تھا۔

فرشتہ نے اپنی تاریخ میں سلطان غیاث الدین تغلق کے بے شمار اوصاف ومحاسن بیان کرنے کے بعد یہ بھی تحریر کیا ہے کہ وہ عہدوں کی تقسیم کے سلسلے میں قرابت داری اور سفارش کے بجائے امیدوار کی لیاقت اور استعداد کو ترجیح دیا کرتا تھا۔ مزید یہ کہ علماء، مشائخ اور امرائے سلطنت کو انعام واکرام سے نوازتا اور خلعت شاہانہ سے سرفراز کرتا۔ گوشہ نشیں فقیروں اور درویشوں کی نہ صرف فکر رکھتا تھا بلکہ ان کے حالات معلوم کرتا اور انہیں ہر طرح کا آرام پہنچاتا۔ یہ ہے سلطان غیاث الدین تغلق کی سیرت وکردار کی وہ تصویر جو مشہور اور معتبر مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے کھینچی ہے۔ اگر ہم ان روایتوں کے آئینے میں سلطان غیاث الدین تغلق کے خدوخال دیکھنے کی کوشش کریں تو وہ پہلی نظر میں ایک ''فرشتہ صفت'' حکمراں نظر آئے گا۔ پھر یہ ''درویش دوست'' فرماں روا اپنے وقت کے سب سے بڑے درویش محبوب الٰہی، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا دشمن کیوں ہو گیا؟

اس واقعے کی تفصیل جاننے کے لئے ہم تاریخ ہندوستان کے کچھ اوراق اُلٹتے ہیں اور ان حقائق کو تلاش

کرتے ہیں جن کی وجہ سے یہ انتہائی ناخوشگوار اور عبرت ناک سانحہ پیش آیا۔

جب سلطان غیاث الدین تغلق نے اس ہندو زادے خسرو خان اور اس کے ہم نواؤں کو قتل کرنے کے بعد ہندوستان کا اقتدار سنبھالا تو شاہی خزانہ تقریباً خالی تھا۔ بدکردار خسرو خان نے اپنے پانچ ماہ کے مختصر ترین دور میں بے دریغ ملکی دولت لٹائی تھی اور بڑی بڑی جاگیریں ہندوؤں کے نام کر دی تھیں۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے وہ ساری دولت اور جاگیریں ان نمک حراموں سے چھین لیں۔ فرمانروائے ہندوستان ان ہنگامی امور سے فارغ ہوا تو سلطانی کارندوں نے اس کے سامنے ایک اور فہرست پیش کی جس میں ان لوگوں کے نام درج تھے جنہیں عطیاتِ سلطانی سے نوازا گیا تھا۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے بہت غور سے اس فہرست کو پڑھا اور پھر شدید حیرت کے لہجے میں اپنے کارندے سے مخاطب ہوا۔

''غالباً یہ تو دہلی کے درویشوں اور صوفیوں کے نام ہیں۔''

''خسرو خان نے ان حضرات کو بھی کثیر رقمیں دی تھیں۔'' سلطانی کارندے نے وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا۔ ''خسرو خان نے یہ فہرست خود تیار کی تھی۔ ہر درویش کے نام کے آگے دی جانے والی رقم درج ہے۔''

دراصل واقعہ یہ تھا کہ جب خسرو خان اپنے آقا سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کو قتل کر کے اقتدار پر قابض ہوا تو دہلی کے باشندوں کے دلوں میں اس کے لئے شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ خسرو خان اس راز سے بخوبی واقف تھا کہ دہلی کی رعایا گوشہ نشیں درویشوں اور صوفیوں کی محبت کے زیر اثر تھی۔ عیار خسرو خاں نے اس عوامی نفرت کو کم کرنے کے لئے ایک نئی چال چلی کہ دہلی کے تمام مشہور علماء اور صوفیا کی خدمت میں بڑی بڑی رقمیں بطور ہدیہ و نذر پیش کیں اور اپنے نقیبوں کے ذریعے شہر کے گلی کوچوں میں یہ بات مشہور کرا دی کہ ہندوستان کا نیا بادشاہ ''درویش دوست'' حکمران ہے۔ یہ فریب کار خسرو خاں کی دہری چال تھی۔ ایک طرف وہ اولیائے کرام کی عقیدت کے سہارے عوام کی محبت حاصل کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف اُس کی کوشش تھی کہ وہ اسلام کا نام لے کر اپنے اصلی مذہب پر پردہ ڈال سکے۔

سلطان غیاث الدین تغلق بہت دیر تک اس دستاویز کو دیکھتا رہا اور پھر فرمانروائے ہندوستان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ ادا ہوئے۔

''بے شک یہ درویش و صوفی حضرات حکومتِ وقت کی توجہ و امداد کے مستحق ہیں۔ مگر اس قدر بھی نہیں کہ ایک ایک درویش کو پانچ پانچ لاکھ ''تنکے'' دے دیئے جائیں۔ اس مردود خسرو خان نے کس بے رحمی کے ساتھ شاہی خزانہ لٹایا ہے؟''

''تنکے'' اُس زمانے کے سکے کو کہتے ہیں جسے آج کل کے ''روپے'' کے برابر تصور کیا جا سکتا ہے۔

پھر سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے کارندے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم اسی وقت فرمانِ شاہی جاری کرو کہ یہ تمام حضرات دربارِ سلطانی میں حاضر ہو کر اس رقم کا حساب پیش کریں۔''

سلطان غیاث الدین تغلق کے حکم کے مطابق دہلی کے تین مشہور بزرگوں حضرت سید علاؤالدین جنوریؒ، حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے خلیفہ حضرت شیخ وحید الدین اور حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانیؒ (شیخ رکن عالمؒ) کے خلیفہ حضرت شیخ عثمان سیاحؒ دربارِ سلطانی میں پہنچے اور خسرو خاں کی دی ہوئی تمام رقم واپس کر دی۔

ان تینوں بزرگوں کے نام کے آگے پانچ پانچ لاکھ تنکے درج تھے۔ پھر جب دہلی کے یہ تینوں مشہور درویش واپس چلے گئے تو سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے اس خصوصی کارندے سے پوچھا۔

''شیخ نظام الدین اولیاءؒ کیوں نہیں آئے؟''

''حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ ایک مردِ آزاد ہیں اور وہ دربارِ شاہی میں آنا پسند نہیں فرماتے۔'' سلطانی کارندے کے لہجے سے حضرت محبوب الٰہیؒ کے لئے ایک خاص جذبۂ عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

اپنے کارندے کا جواب سن کر سلطان غیاث الدین تغلق کے چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا رنگ اُبھر آیا۔

''جب شیخ نظام الدین اولیاءؒ دربارِ سلطانی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تو کیا وہ کسی اور ملک میں رہتے ہیں؟''

''میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' سلطانی کارندے نے عرض کیا۔ ''مرحوم و مغفور سلطان علاؤالدین اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے بھی بہت کوششیں کیں مگر حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ ایک بار بھی دربارِ سلطانی میں تشریف نہیں لائے۔ بلکہ اپنی خانقاہ میں بھی ان دونوں فرمانرواؤں سے ملاقات نہیں کی۔''

''کیا شیخ نظام الدینؒ اس قدر آزاد ہیں کہ اپنے حاکموں کو بھی التفات کے قابل نہیں سمجھتے؟'' سلطان غیاث الدین تغلق کے چہرے پر اُبھرنے والی ناگواری کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ ''خود کو اتنا بڑا درویش اور عالم کہتے ہیں اور اس کھلے ہوئے قرآنی حکم کا مفہوم نہیں سمجھتے کہ اللہ اور رسول ﷺ اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو۔''

سلطانی کارندے نے فرمانروائے ہند کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد والئ ہندوستان دوبارہ اپنے خصوصی کارندے سے مخاطب ہوا۔

''شیخ نظام الدینؒ خواہ کتنے ہی بڑے مردِ آزاد ہوں اور دربارِ سلطانی سے کتنی ہی لاتعلقی کا اظہار کریں مگر یہ دستاویز ثابت کرتی ہے کہ انہوں نے پانچ لاکھ تنکے (روپے) وصول کئے ہیں۔ انہیں ایک بار تو دربار میں آ کر اس سرکاری رقم کا پورا پورا حساب دینا ہی ہو گا۔''

سلطانی کارندے نے نظر اٹھا کر فرمانروائے ہند کی طرف دیکھا اور بہت آہستہ لہجے میں عرض کیا۔

''سلطانِ معظم جو حکم فرمائیں۔''

''تم اسی وقت جاؤ اور شیخ نظام الدینؒ سے پانچ لاکھ تنکے لے کر شاہی خزانے میں جمع کرا دو۔'' یہ حکم جاری کر کے سلطان غیاث الدین تغلق دربار سے چلا گیا۔

پھر جب حکم سلطانی کی تعمیل میں وہ خصوصی کارندہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ پہنچا تو حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف تھے۔ سلطانی کارندے نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو حضرت نظام الدینؒ کے خادم خاص حضرت خواجہ اقبالؒ نے فرمایا:

''پیر و مرشد اس وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول ہیں۔ جب فارغ ہو جائیں گے تو تمہیں شرف باریابی حاصل ہو سکے گا۔''

سلطانی کارندہ خاموشی و ادب کے ساتھ خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ آخر اسے بہت دیر بعد حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت ملی۔ وہ نہایت ادب و احترام کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حجرۂ خاص میں داخل ہوا اور سلام کرنے کے بعد پورا واقعہ حضرت شیخ کے گوش گزار کر دیا۔

''میں کس چیز کا حساب پیش کروں؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے انتہائی پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ ''وہ ساری رقم بیت المال کا حصہ تھی، جسے میں نے اس کے حق داروں میں تقسیم کر دیا۔ اگر اس میں سے ایک ''تنکہ''

بھی میری ذات پر خرچ ہوتا تو میں یقیناً سلطان کو حساب پیش کر دیتا۔"
یہ سن کر سلطان غیاث الدین تغلق کا خصوصی کارندہ آگے بڑھا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دست بوسی سے سرفراز ہو کر اُلٹے قدموں واپس چلا گیا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی تمام گفتگو حرف بہ حرف والیٔ ہندوستان کے سامنے دہرا دی۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے بڑی حیرت سے حضرت محبوب الٰہیؒ کا جواب سنا اور پھر اپنے خصوصی کارندے سے پوچھا۔

"کہیں تو نے یہ بات اپنی طرف سے تو نہیں کہہ دی؟" فرمانروائے ہندوستان کا لہجہ کسی قدر تلخ تھا۔

"میں حکم سلطانی کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" خصوصی کارندے نے نہایت عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ یہ تیری خوش عقیدگی بول رہی ہے۔" سلطان غیاث الدین تغلق کے لہجے سے جلالِ شاہی جھلک رہا تھا۔ "تو پہلے شیخ نظام الدینؒ کی شان میں بہت قصیدے پڑھ چکا ہے۔ کہیں یہ تیری ذہنی اختراع تو نہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بھوکا اور ضرورت مند درویش کھڑے کھڑے پانچ لاکھ تنکے کی کثیر رقم دوسروں پر لٹا دے؟ میرے لئے تیرا بیان ناقابلِ فہم بھی ہے اور ناقابلِ یقین بھی۔ آخر دہلی میں دوسرے درویش بھی تو ہیں۔ ان لوگوں نے خسرو خان کی دی ہوئی رقم کس لئے محفوظ رکھی؟ اور شاہی مطالبے کے فوری بعد کیوں واپس لٹا دی؟"

"سلطانِ ذی حشم! میں دوسرے درویشوں کے بارے میں تو نہیں جانتا کہ ان کا مزاج کیا ہے۔ مگر حضرت محبوب الٰہی کی ذاتِ گرامی سے ضرور واقف ہوں۔ آپ کا اندازِ سخاوت اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ نمک حرام خسرو خان کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔ خود علاؤالدین خلجی مرحوم و مغفور بارہا اس سے بھی کہیں بڑی رقمیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی نذر کیا کرتے تھے اور حضرت شیخ اسی طرح اپنے اندازِ کریمانہ کی روایت برقرار رکھتے ہوئے سلطانی عطیے کا ایک ایک "تنکہ" دہلی کی بیواؤں، یتیموں، محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔

خزانے کے شعبے سے تعلق رکھنے والے اس خصوصی کارندے کی بات سن کر سلطان غیاث الدین تغلق خاموش ہو گیا اور پھر اس نے اپنے معتمد جاسوسوں کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے معمولاتِ زندگی کی تحقیقات کرائیں۔ پھر اس پر یہ راز فاش ہوا کہ دہلی کا یہ گوشہ نشین درویش ممنوعہ ایام کے سوا، سال بھر روزے رکھتا ہے۔ نمک کے پانی سے افطار کرتا ہے۔ رات کے کھانے اور سحری میں ایک ایک جو کی روٹی استعمال کرتا ہے۔ جاسوسوں کی اس تحقیق کی روشنی میں فرمانروائے ہندوستان کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اندازِ قلندری پر تو اعتبار آ گیا مگر اسے حضرت محبوب الٰہیؒ کی یہ شانِ بے نیازی پسند نہیں آئی۔ غیاث الدین تغلق کا خیال تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دربارِ سلطانی میں حاضر نہ ہو کر والیٔ ہندوستان کی نافرمانی اور توہین کی ہے۔ حالات کا یہی وہ موڑ ہے جہاں پہنچ کر سلطان غیاث الدین تغلق ایک کم ظرف انسان بن گیا اور اس کے دل میں حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ جیسے "درویش خدا مست" کی طرف سے ایک ایسی گرہ پڑ گئی جو آخری سانس تک نہ کھل سکی۔ انسانی نفسیات کے اس نازک ترین مسئلے کو علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں بڑی مؤثر دلیل دے کر حل کیا ہے ؎

بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے براہیمی نظر پیدا
ہوس سینوں میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

ہم گزشتہ سطور میں مؤرخ قاسم فرشتہ کا بیان پیش کر چکے ہیں کہ سلطان غیاث الدین تغلق نہ صرف درویش دوست حکمران تھا بلکہ خود کو رعایا کا ایک ادنیٰ خادم کہتا تھا اگر مؤرخ فرشتہ کے اس بیان کو درست سمجھ لیا جائے تو اپنے معتبر جاسوسوں کی فراہم کردہ اطلاعات سن کر سلطان غیاث الدین تغلق کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بلند کرداری کا قائل ہو جانا چاہئے تھا اور اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے اسے بہ نفس نفیس حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہونا چاہئے تھا۔ سلطان علاؤالدین خلجی ایک شرابی اور بدکار حکمران تھا۔ کبھی کبھی ''عیدین'' اور جمعہ کی نمازیں ادا کر لیا کرتا تھا، مگر پھر بھی اسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے اس قدر عقیدت تھی کہ وہ زندگی بھر حضرت محبوب الٰہیؒ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے ترستا رہا۔

اس کے برعکس مؤرخین کے بیان کے مطابق سلطان غیاث الدین تغلق ایک بلند کردار حکمران تھا۔ اس نے زندگی بھر شراب نہیں پی اور پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ادا کیا کرتا تھا۔ ایسے بلند کردار انسان کو تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے زیادہ عقیدت کا اظہار کرنا چاہئے تھا اور اس عقیدت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ وہ خود حضرت محبوب الٰہیؒ کے دیدار کو حاضر ہوتا۔ اگرچہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنی عادات کے مطابق فرمانروائے ہندوستان سے ملنے سے انکار کر دیتے، مگر سلطان غیاث الدین تغلق کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار تو کرنا چاہئے تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عقیدت اور ملاقات کی خواہش کا اظہار تو درکنار، اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اس ادائے بے نیازی کو اپنی ذاتی توہین سے تعبیر کیا۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤرخین نے سلطان غیاث الدین تغلق کے کردار کی جو تصویر کشی کی ہے، وہ اس پر پورا نہیں اُترتا۔

ہمارے تجزیے کے مطابق والئ ہندوستان کے دو چہرے تھے۔ وہ دربار میں رعایا کا خادم نظر آتا تھا اور تنہائی میں ایک خود پسند بادشاہ۔ غیاث الدین تغلق ایک فوجی دستے کی سالاری کے عام منصب سے اٹھ کر ''سلطانی'' کے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ انسانی تقدیروں کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ طاقت واقتدار کے اس نشے کو برداشت کرتے ہوئے اپنے ہوش برقرار رکھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی طرح غیاث الدین تغلق بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اس محبوبیت اور شانِ خودداری سے حسد کرنے لگا۔ قطب الدین مبارک شاہ خلجی ایک احمق اور نوجوان فرمانروا تھا اس لئے جوشِ جذبات میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی گرفتاری کا حکم دے بیٹھا تھا۔ مگر غیاث الدین تغلق ایک عمر رسیدہ، تجربہ کار، ذہین اور زمانے کی گرمی وسردی سے آشنا انسان تھا۔ اس لئے اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے انکار کو وقتی طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ مگر درپردہ وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

آخر دنیا پرست اور حاسد علماء کی ایک جماعت نے سلطان غیاث الدین تغلق کو یہ موقع فراہم کر دیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف ایک محضر نامہ تیار کیا گیا جس پر سینکڑوں علمائے دہلی کے دستخط موجود تھے۔

اس محضر نامے کا مضمون درج ذیل تھا:

''ایک درویش جس کا نام محمد نظام الدین بدایونی ہے، اسے سماع سننے کے علاوہ دنیا میں کوئی کام نہیں ہے۔ وہ اور اس کے مرید ''سماع'' کے دوران مست و بے خود ہو کر رقص کرتے ہیں۔ اگر اس رسم کو نہ روکا گیا تو ایک دن یہ ''بدعت'' عام ہو جائے گی اور پورا اسلامی معاشرہ گمراہی کا شکار ہو جائے گا۔ اس لئے اہلِ ایمان کی بھلائی کی خاطر فوراً سماع پر پابندی لگائی جائے۔''

سلطان غیاث الدین تغلق کو اسی دن کا انتظار تھا۔ اس نے فوری طور پر حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلاف یہ حکم

جاری کر دیا کہ "یہ مذہب اور شریعت کا انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ اس لئے شیخ نظام الدین محمد بدایونی کو لازم ہے کہ وہ بلا تاخیر دربارِ سلطانی میں حاضر ہو کر "سماع" کے حق میں دلائل پیش کر کے مقتدر علمائے ہندوستان کو مطمئن کریں۔ ورنہ "رسمِ سماع" پر بالجبر سرکاری پابندی عائد کر دی جائے گی۔" واضح رہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ہندوستان کے تاریخی شہر "بدایوں" میں پیدا ہوئے تھے۔

بالآخر حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے دو ممتاز مریدوں مولانا فخر الدین رازیؒ اور مولانا کمال الدین ساماتیؒ کے ہمراہ دربارِ سلطانی تشریف لے گئے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مولانا فخر الدین رازیؒ وہ ممتاز عالم تھے کہ بڑے بڑے صاحبانِ علم کی گردنیں ان کے آگے خم رہتی تھیں۔ اور خود مولانا فخر الدین رازیؒ کا یہ حال تھا کہ اپنی دستارِ فضیلت حضرت نظام الدین اولیاء کے قدموں میں رکھ دی تھی اور تمام عمر حضرت محبوب الٰہیؒ کی غلامی پر نازاں رہے۔

پھر جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار میں تشریف لائے تو معتبر روایتوں کے مطابق اس وقت 653 علماء "سماع" کے موضوع پر بحث کرنے کے لئے موجود تھے۔ ان علماء میں قاضی شہر جلال الدین دلوالجی اور شیخ فرزادہ جام پیش پیش تھے۔ قاضی جلال الدین دلوالجی انتہائی چرب زبان شخص تھا۔ اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی مقبولیت سے بے پناہ حسد رکھتا تھا۔ شیخ فرزادہ جام مشہور بزرگ احمد جام کے فرزند تھے مگر دنیاداری کے فریب میں مبتلا ہو کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شدید مخالفت پر اُتر آئے تھے۔

مختصر یہ کہ قاضی جلال الدین دلوالجی نے بڑے تند و تیز اور گستاخانہ لہجے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی پر اعتراضات اور طنز کی بارش شروع کر دی۔ پھر جب قاضیٔ شہر خاموش ہوا تو شیخ فرزادہ جام نے "سماع" کے خلاف اپنے دلائل کا آغاز کیا۔ مگر یہ سارے اعتراضات "سماع" پر کم اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی شخصیت پر زیادہ تھے۔ ان دونوں کے بعد دوسرے علماء نے بھی بڑے پُرجوش انداز میں "سماع" کے خلاف مذہبی حوالے پیش کئے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "سماع" ہر حال میں حرام ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ مخالف علماء کی جذباتی تقریریں سنیں۔ پھر آپ نے "سماع" کے موضوع پر نہایت مدلل اور مؤثر تقریر کی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا:

"سماع ایک موزوں صورت ہے۔ اس لئے اپنی فطرت میں حرام نہیں۔ سماع سے قلب میں ایک خاص تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ تحریک یادِ الٰہی کے لئے ہے تو "مستحب" ہے اور اگر فساد کی طرف مائل ہے تو حرام ہے۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے نزدیک "فساد" سے مراد لذتِ نفس کا حصول ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء نے سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار میں "سماع" کے لئے پانچ شرائط بیان کیں جن پر آپ خود نہایت سختی کے ساتھ عمل کیا کرتے تھے۔ پہلی شرط یہ کہ محفل میں جو کلام پیش کیا جائے وہ قطعاً عارفانہ (حمد و نعت پر مشتمل) ہو۔ یا پھر انسانی جذبات کو اعلیٰ اخلاق پر اُبھارنے والا ہو۔ دوسری شرط یہ کہ کلام سنانے والا خود بھی پرہیزگار ہو، فاسق و فاجر نہ ہو، پختہ عمر رکھتا ہو۔ اور کوئی لڑکا سماع کے حلقے میں شامل نہ ہو۔ تیسری شرط یہ کہ سماع سنتے وقت انسان کی نیت درست ہو۔ اگر وہ اپنے سینے میں عشقِ خداوندی کا گداز پیدا کرنے کے لئے سماع سن رہا ہے تو جائز ہے۔ اور اگر سماع کا مقصد حصولِ تفریح و نشاط ہے تو سامع کا یہ فعل قطعاً حرام ہے۔ چوتھی شرط یہ کہ محفل سماع میں آلاتِ موسیقی یعنی چنگ و رباب اور دوسرے مزامیر (سازوں) سے مکمل طور پر اجتناب کیا جائے۔ اور پانچویں شرط یہ ہے کہ مجلس سماع میں خواتین کی شرکت تو درکنار، اس مقام پر عورتوں کا سایہ

بھی نہیں پڑنا چاہئے۔"

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دلائل سن کر حاضرین دربار پر سکتہ سا طاری تھا۔ اور خود سلطان غیاث الدین تغلق شدید حیرت کے عالم میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی طرف مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ والئ ہندستان نے پہلی بار حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو دیکھا تھا۔ اس پر ایک مردِ درویش کے جلالِ روحانی کی ایسی ہیبت طاری تھی کہ فرمانروائے ہندوستان کی نظریں بار بار جھک جاتی تھیں۔ مزید یہ کہ سلطان تغلق نے پہلی بار حضرت محبوب الٰہیؒ کی تقریر سنی تھی جس کے آگے تمام علماء کی تقریریں اس طرح ماند پڑ گئی تھیں جیسے چودھویں رات کے چاند کی موجودگی میں آسمان پر نظر آنے والے روشن ستارے بھی بجھ کر رہ جاتے ہیں۔ قاضیٔ شہر جلال الدین دلوالجی جو اپنی کینہ پروری کے سبب بھرے دربار میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر "جاہل درویش" ہونے کی تہمت لگا رہا تھا، اسے اندازہ نہیں تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کس شان کے عالم ہیں۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کا مرید ہونے سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلی میں مقیم تھے اور قاضیٔ شہر بننے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ اس وقت حضرت محبوب الٰہیؒ کی عمر مبارک بیس سال تھی۔ آپ مختلف علمی مجالس میں شریک ہوتے تھے اور علمائے دہلی سے مذہبی موضوعات پر مناظرے کرتے تھے۔ تمام معتبر تاریخیں گواہ ہیں کہ ان مناظروں میں کوئی عالم، حضرت نظام الدین اولیاء پر سبقت نہ لے جا سکا۔ یہاں تک کہ آپ پورے دہلی میں "بحاث شکن" اور "محافل شکن" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ یعنی مناظروں اور محفلوں کا توڑنے والا۔

اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ دربارِ سلطانی سے تشریف لے جانے لگے تو قاضیٔ شہر جلال الدین دلوالجی نے آدابِ مجلس کو نظر انداز کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"شیخ نظام الدین! اس بار تو تم اپنی زبان درازی کی وجہ سے بچ گئے مگر میں ایک نہ ایک دن تمہاری جاری کردہ اس بدعت کی سزا دے کر ہی رہوں گا۔"

جواب میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "سزا تو وہ دے سکتا ہے جو سزا دینے کے قابل ہو۔" یہ کہہ کر حضرت محبوب الٰہیؒ تشریف لے گئے۔

آپ کے جانے کے بعد مخالف علماء نے سلطان غیاث الدین تغلق کو بہت مجبور کیا کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی محفلِ سماع پر قانونی پابندی عائد کر دے، مگر والئ ہندوستان نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

"تم سب لوگ مل کر بھی اس مناظرے میں شیخ نظام الدین کو شکست نہ دے سکے۔ جس روز بھی انہیں لاجواب کر دو گے، میں اسی دن "سماع" کو ممنوع قرار دے دوں گا۔"

یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بڑی کامیابی تھی کہ آپ کے سامنے مخالف علماء عاجز اور گونگے ہو کر رہ گئے تھے۔ ابھی اس واقعے کو کچھ دن ہی گزرے تھے کہ سلطان غیاث الدین تغلق قاضیٔ شہر جلال الدین دلوالجی سے سخت ناراض ہو گیا اور اس شخص کو "قضا" کے عہدے سے برطرف کر دیا جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔

جب قاضی جلال الدین دلوالجی اپنے عہدے سے معزول ہوا تو دربار میں موجود تمام علماء اور امراء کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے وہ الفاظ یاد آئے جو آپ نے دربارِ سلطانی سے رخصت ہوتے وقت قاضی جلال الدین دلوالجی کو مخاطب کر کے ادا کئے تھے۔

"سزا تو وہ دے سکتا ہے جو سزا دینے کے لائق ہو۔"

مختصر یہ کہ قاضی جلال الدین، حضرت محبوب الٰہیؒ کو سزا دینے کی تمنا اپنے دل میں لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گیا۔

دنیا پرست علماء کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا جس کے باعث ان کے سینوں میں چھپی ہوئی بغض و حسد کی چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اور پھر مذہب کا لبادہ اوڑھے ہوئے کینہ پرور لوگوں کی جماعت نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف ایک اور منصوبہ ترتیب دیا۔ یہ سازش کم و بیش ایسی ہی تھی جو چند سال پہلے حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے دوست سیدی مولاؒ کے خلاف تیار کی گئی تھی۔ اس سازش کا ذکر گزشتہ اوراق میں تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ جب دنیا پرست علماء ''سماع'' کے حوالے سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو شکست نہ دے سکے تو پھر ان علماء نے سلطان غیاث الدین تغلق کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔

''سلطانِ معظم نے اپنی آنکھوں سے شیخ نظام الدین کی سرکشی بھی دیکھ لی۔ اور دہلی کی رعایا میں ان کی مقبولیت بھی۔ حالات کے یہ دونوں پہلو آپ کی سلطنت کے لئے مستقبل قریب میں بہت بڑا خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔''

سلطان غیاث الدین تغلق نے شدید حیرت کے ساتھ درباری علماء کی طرف دیکھا اور ان سے دریافت کیا۔

''شیخ نظام الدین کی طرف سے میری سلطنت کو کس طرح خطرہ درپیش ہو سکتا ہے؟''

فرمانروائے ہندوستان کا سوال سن کر علماء کی جماعت نے پوری شدت کے ساتھ حضرت محبوب الٰہیؒ کے خلاف زہر اُگلنا شروع کر دیا۔

''آپ کے بڑے بڑے امراء بھی اپنے چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے ہیں۔ بظاہر وہ آپ کے انتہائی مطیع و فرماں بردار نظر آتے ہیں مگر ان کے دل شیخ نظام الدین بدایونی کے ساتھ ہیں۔''

درباری علماء کی بات سن کر سلطان غیاث الدین تغلق کے چہرہ پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔

دنیا پرست علماء کے اس گروہ نے اپنی چال کو کامیاب ہوتا دیکھ کر والئ ہندوستان کے منتشر ذہن پر ایک اور بھرپور ضرب لگائی۔

''امرائے سلطنت کی شیخ نظام الدین سے قربت اتنی خطرناک نہیں جتنی فوجی سرداروں کی رغبت۔ آپ کے بیشتر سالار اور لشکر کے زیادہ تر سپاہی شیخ نظام الدین سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ اگر غیاث پور کا یہ گوشہ نشیں درویش ایک ہلکا سا اشارہ کر دے تو اسی وقت آپ کے خلاف کامیاب بغاوت ہو سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں شیخ نظام الدین کسی مناسب موقع کی جستجو میں ہیں۔'' واضح رہے کہ اس وقت حضرت محبوب الٰہیؒ ''غیاث پور'' میں مقیم تھے جو دہلی کا ایک مضافاتی علاقہ تھا۔

درباری علماء کی گفتگو سن کر سلطان غیاث الدین تغلق پریشان نظر آنے لگا۔ اس کے دل و دماغ ان لوگوں کی گرفت میں آ چکے تھے جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے انتہائی پرخاش رکھتے تھے۔

''تمہارے نزدیک غیاث پور کے درویش سے نجات حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے کہ میں اس خطرے سے بھی محفوظ ہو جاؤں اور رعایا کی نظروں میں میرا دامن بھی داغ دار نہ ہو۔''

''اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ فوری طور پر شیخ نظام الدین کو ہندوستان بدر کر دیں۔'' حاسد علماء کی اس جماعت کو اپنی منزل قریب نظر آ رہی تھی، اس لئے انہوں نے والئ ہند کو یہ مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ ممکن نہ ہو تو انہیں ہندوستان کے کسی بعید ترین گوشے یا ویران علاقے میں جانے پر مجبور کر دیں تاکہ دارالحکومت ان کے

فتنہ وشر سے محفوظ رہ سکے۔"

اگر چہ سلطان غیاث الدین تغلق اپنی فہم و فراست کے لئے کافی شہرت رکھتا تھا، لیکن وہ دنیا پرست علماء کی شاطرانہ چالوں سے نہ بچ سکا اور ایک مفروضہ سازش کو حقیقت سمجھ بیٹھا اور خود غرض علماء کے دامِ فریب میں آ گیا۔ جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف یہ سازش تیار کی جا رہی تھی، عین اسی وقت سلطانی جاسوسوں نے غیاث الدین تغلق کو خبر دیتے ہوئے کہا۔

"لکھنوتی کا حاکم سرکار والا کے خلاف بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہے۔"

"بنگال" کا قدیم نام لکھنوتی تھا اور یہاں کا حاکم سلطان غیاث الدین بلبن کا ایک رشتہ دار ناصر الدین تھا۔ غیاث الدین تغلق نے فوری طور پر اس بغاوت کو کچلنے کے لئے اپنی فوج کو یلغار کرنے کا حکم دے دیا۔ مگر دہلی چھوڑنے سے پہلے اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو ایک قہر نامہ تحریر کیا جس کی عبارت درج ذیل ہے:

"نظام الدین! اب تمہارا وجود میرے لئے نا قابل برداشت ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ کسی تاخیر کے بغیر میری مملکت کی حدود سے نکل جاؤ۔ میں دشمنوں کی سرکوبی کے لئے لکھنوتی (بنگال) جا رہا ہوں۔ میری یہ جنگی مہم دو ماہ میں ختم ہو جائے گی۔ میں تمہیں بس اتنی ہی مہلت دے سکتا ہوں کہ جیسے ہی میرے قدم "تغلق آباد" کی زمین کو چھوئیں، میرے خدمت گار مجھے بتائیں کہ شیخ نظام الدین اپنے فاقہ مست درویشوں کو لے کر بہت دُور چلے گئے ہیں۔ جو لوگ مجھے جانتے ہیں، انہیں خوب اندازہ ہے کہ میں اپنے احکام کی تعمیل کے سلسلے میں کس قدر سخت گیر ہوں۔ میرے کسی حکم کو کسی بھی حال میں ٹالا نہیں جا سکتا۔ اگر میرے "تغلق آباد" پہنچنے تک تم نے اور تمہارے خدمت گار مریدوں نے یہ علاقہ خالی نہیں کیا تو میں تم سب کو اس نافرمانی کی ایسی سخت سزا دوں گا کہ جسے اہلِ دنیا سالہا سال تک یاد رکھیں گے اور اس کی مثالیں دیا کریں گے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سلطان غیاث الدین نے اقتدار سنبھالتے ہی "دہلی" یا "دلی" کا پرانا نام بدل کر "تغلق آباد" رکھ دیا تھا۔ جو مؤرخین سلطان غیاث الدین کو رعایا کا ادنیٰ حاکم کہتے ہیں، انہیں شاید یہ اندازہ نہیں رہا کہ اس کے دل میں کس قدر شوقِ نمائش موجود تھا کہ اس نے "دارالحکومت" کو بھی اپنے نام سے منسوب کر دیا تھا۔

بہر حال سلطان غیاث الدین تغلق کے اس قہر نامے کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خادمِ خاص نے پیر و مرشد کے سامنے اور دوسرے مریدوں کی موجودگی میں با آواز بلند پڑھا۔ جیسے ہی فرمانروائے ہندوستان کے حکم نامے کا آخری لفظ ختم ہوا، حضرت خواجہ اقبالؒ کے ساتھ حضرت محبوب الٰہیؒ کے دوسرے خدمت گار بھی بدحواس و پریشان نظر آنے لگے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اپنے مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"آخر یہ کون سی عجیب بات ہے جس نے تمہیں شدید اذیت و کرب میں مبتلا کر رکھا ہے اور تمہارے چہروں کی رونقیں چھین لی ہیں؟ تم تو جانتے ہو کہ ماضی میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ حکمران اپنی روش نہیں بدلیں گے اور یہ بندۂ عاجز بھی اپنی عادت ترک نہیں کرے گا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کو اپنا کام کرنے دو اور بقول اس کے، مجھے اپنے درویشوں کے ساتھ مست و بے خود ہو کر رقص کرنے دو۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ کا اندازِ بے نیازی وہی تھا جس کا مظاہرہ آپ نے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی تنبیہہ کے جواب میں کیا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے محبوب مرید حضرت میر خسروؒ، سلطان غیاث الدین تغلق کے دربار سے وابستہ تھے۔ پیر و مرشد کی بات سن کر آپ نے دست بستہ عرض کیا۔

''سیدی! وہ ایک سخت گیر حکمران ہے۔ اس کی ذات ہمارے لئے بہت ضرر رساں ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ سلطان واپس آئے، ہمیں کوئی مناسب قدم اٹھالینا چاہئے۔'' شدتِ جذبات سے حضرت امیر خسروؒ کی آواز لرز رہی تھی اور اس سے کسی قدر خوف بھی نمایاں تھا۔

صوفی، شاعر، ادیب اور موسیقار ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت امیر خسروؒ ایک شمشیر زن اور بہادر سپاہی بھی تھے۔ آپ کا یہ خوف اپنی ذات کے لئے ہرگز نہیں تھا۔ حضرت امیر خسروؒ صرف پیر و مرشد کی اذیت کے خیال سے بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے محبوب مرید کی پیش کردہ تجویز سن کر فرمایا۔

''تم یہ کہنا چاہتے ہو خسرو! کہ ہم ''غیاث پور'' چھوڑ کر ہندوستان کے کسی دور دراز علاقے میں چلے جائیں یا پھر حکم سلطانی کے مطابق اس کی حدودِ سلطنت ہی سے نکل جائیں؟'' حضرت محبوب الٰہیؒ کے لہجے سے درویشانہ بے نیازی کے ساتھ جلالِ روحانی بھی جھلک رہا تھا۔ ''تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم نے سلطان علاؤالدین خلجی کے دورِ حکومت میں سوچا تھا کہ ہندوستان کی سکونت ترک کر کے اللہ کی وسیع و عریض زمین کے کسی گمنام گوشے کو اپنی اقامت گاہ بنا لیں، مگر علاؤالدین خلجی تو دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اور پھر یہ کہ اس نے دوبارہ ضد بھی نہیں کی، اس لئے ہم نے بھی ''غیاث پور'' چھوڑنے کا ارادہ تبدیل کر دیا تھا۔

حضرت امیر خسروؒ، سلطان غیاث الدین تغلق کی فطرت سے واقف تھے کہ جب اس کے دل میں کسی شخص کی طرف سے گرہ پڑ جاتی تو پھر کسی صورت اس کا دل صاف نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے ایک بار پھر آپ نے پوری شدت کے ساتھ شیخ کے حضور میں یہ درخواست پیش کی کہ سلطان کی فتنہ گری سے بچنے کے لئے کوئی مناسب تدبیر اختیار کر لی جائے۔

''اب اس کی ایک ہی تدبیر ہے۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ پھر ایک خدمت گار کو اپنا قلم دوات لانے کا حکم دیا۔ تمام مرید اور خدام شدید حیرت و سکوت کے عالم میں پیر و مرشد کے متغیر چہرے کو دیکھ رہے تھے اور اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے کہ وہ کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟

پھر جب خدمت گار نے قلم دوات لا کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سامنے رکھ دیا تو آپ نے اپنے خادمِ خاص حضرت خواجہ اقبالؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''غیاث الدین تغلق کا حکم نامہ مجھے دو۔''

حضرت خواجہ اقبالؒ اپنی نشست سے اُٹھے اور بڑے ادب کے ساتھ سلطان کا حکم نامہ پیر و مرشد کی خدمت میں پیش کر دیا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے دستِ مبارک سے سلطان غیاث الدین تغلق کے حکم نامے کی پیشانی پر یہ مختصر ترین عبارت تحریر کر دی۔

''ہنوز دلّی دُور است۔'' (ابھی دلّی بہت دُور ہے)

یہ لکھ کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنا جواب سلطانی قاصد کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ کے فرمان پر اور خصوصاً حکم سلطانی سے اوپر جواب تحریر کرنا سخت گستاخی و بے ادبی کے مترادف تھا۔ مؤرخین کے بقول سلطان غیاث الدین تغلق کے فرمان کے سلسلے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے دو جرم سرزد ہوئے تھے۔ پہلا یہ کہ آپ نے

فرمانروائے ہندوستان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان کی تحریر کے اوپر اپنی عبارت درج کر دی تھی۔

پھر جب سلطانی قاصد "غیاث پور" کے درویش کا جواب لے کر غیاث الدین تغلق کی خدمت میں حاضر ہوا تو والیٔ ہند کچھ دیر تک سکتے کی کیفیت سے دوچار رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نمک کے پانی سے جو کی روٹی کھانے والا فقیر ایک "آمرِ وقت" کے حکم کو اس طرح بھی ٹھکرا سکتا ہے۔ پھر جب حیرت و سکوت کی یہ کیفیت زائل ہوئی تو اس نے انتہائی غضب ناک لہجے میں اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شیخ نظام الدین اب میرے قہر سے نہیں بچ سکیں گے۔ میں انہیں عنقریب بتاؤں گا کہ دہلی مجھ سے دور نہیں، ہمیشہ میرے قدموں کے نیچے رہتی ہے۔"

اہلِ دربار کے سامنے غرورِ شاہی کا مظاہرہ کرنے کے بعد دوسرے دن سلطان غیاث الدین تغلق یلغار کرتا ہوا لکھنوتی کی طرف بڑھا۔ جاسوسوں کی اطلاعات غلط تھیں۔ لکھنوتی (بنگال) کے حاکم ناصرالدین نے والیٔ ہندوستان کی خدمت میں قیمتی تحائف پیش کئے اور سلطان کی اطاعت و وفاداری پر قائم رہنے کا حلف اٹھایا۔ لکھنوتی سے غیاث الدین تغلق ان علاقوں کی طرف بڑھا جن پر ابھی تک اہلِ ہنود قابض تھے۔ سلطان کے لشکر کی آمد کی خبر سن کر تمام چھوٹے بڑے راجہ اپنی ریاستوں کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ غیاث الدین تغلق نے ان سب کے خزانوں پر قبضہ کر لیا اور سیم و زر کے انبار لے کر فتوحات کے نشے سے سرشار، دارالحکومت کی طرف بڑھا۔ مؤرخ قاسم فرشتہ کے بقول جب ولی عہدِ سلطنت شہزادہ محمد تغلق نے باپ کی آمد کی خبر سنی تو وہ دہلی کی حدود سے باہر نکلا اور اس نے انوکھے انداز سے سلطان کا استقبال کرنے کے لئے افغان پور کے قریب ایک نیا محل تعمیر کرایا۔ اس محل کی خصوصیت یہ تھی کہ اسے تین دن کے مختصر ترین عرصے میں بنایا گیا تھا۔ شہزادہ محمد تغلق کی خواہش تھی کہ اس کا باپ اسی نوتعمیر شدہ محل میں رات گزارے اور اس وقت جب کہ فرمانروائے ہندوستان کی آمد کی خوشی میں ہر طرف آئینہ بندی ہو جائے اور طرح طرح کے سامانِ نشاط فراہم کر دیئے جائیں، تب فاتح سلطان مثالی شان و شوکت کے ساتھ شہر میں داخل ہو۔

پھر جب غیاث الدین تغلق افغان پور کے نزدیک پہنچا اور اس نے اپنے بیٹے سے نئی عمارت بنوانے کا سبب پوچھا تو ولی عہد سلطنت شہزادہ محمد تغلق نے باپ کے سامنے انتہائی پُرجوش لہجے میں اپنے احساسات و جذبات بیان کر دیئے۔ سلطان غیاث الدین تغلق بیٹے کی اس گفتگو اور گرم جوش محبت کے مظاہرے سے بہت خوش ہوا اور اپنے فرزندِ اکبر کا دل رکھنے کے لئے والیٔ ہند نے محل میں شب بسری کا ارادہ کر لیا۔

مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ جب رات آئی تو سلطان غیاث الدین تغلق نے کھانا طلب کیا۔ شہزادہ محمد تغلق بھی اپنے امراء کے ساتھ کھانے میں شریک تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی ولی عہدِ سلطنت اپنے مصاحبوں کے ہمراہ محل سے باہر نکل آیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق اور اس کے امراء نے ابھی ہاتھ بھی نہیں دھوئے تھے کہ شہزادے کے باہر آتے ہی محل کی چھت گر گئی اور فرمانروائے ہندوستان اپنے پانچ چھ مصاحبوں کے ساتھ ملبے میں دب کر ہلاک ہو گیا۔

بعض مؤرخین نے اس الم ناک واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شہزادہ محمد تغلق کا بنوایا ہوا کوشک (محل) صرف تین دن کی مختصر ترین مدت میں تعمیر ہوا تھا۔ محل کی بنیادیں ابھی گیلی تھیں کہ ولی عہدِ سلطنت نے فیل بانوں کو حکم دیا کہ وہ ہاتھیوں کا ایک دستہ محل کی چھت پر لائیں تاکہ یہ قوی ہیکل جانور اپنے فاتح سلطان کو

سلامی پیش کر سکیں۔ نتیجتاً ہاتھیوں کے بھاری قدموں کی دھمک سے کوشک کی بنیادیں ہل گئیں اور ''تین روزہ محل'' زمین بوس ہو گیا۔

بعض مؤرخین نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ شہزادہ محمد تغلق نے والیٔ ہندوستان کے خلاف سازش کی تھی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ولی عہدِ سلطنت نے اپنے باپ کو پراسرار طریقے سے قتل کرنے کے لئے تین دن کے مختصر عرصے میں یہ محل تعمیر کرایا تھا۔ فن کے اعتبار سے یہ نو ساختہ عمارت بالکل ناقص تھی اور اس میں سلطان غیاث الدین تغلق جیسی اہم شخصیت کے ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

قاسم فرشتہ مؤرخین کی اس جماعت سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''جو لوگ ولی عہدِ سلطنت شہزادہ محمد تغلق کو سلطان کی موت کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ شہزادہ خود باپ کے ساتھ دسترخوان پر موجود تھا۔ پھر اس میں یہ کرامت کہاں سے آ گئی کہ اس کے باہر آتے ہی چھت گر پڑی اور بادشاہ کی موت واقع ہو گئی۔''

دوسرے مشہور مؤرخ صدر جہاں گجراتی نے اپنی تاریخ میں کچھ اور ہی انکشاف کیا ہے۔ گجراتی کے بقول ولی عہدِ ہندوستان نے یہ محل جادو کے زور سے بنوایا تھا۔ اگر اس محل میں طلسمی اثرات شامل نہ ہوتے تو شہزادہ محمد تغلق کے باہر آتے ہی محل کیوں منہدم ہو جاتا؟

بعد میں آنے والے مؤرخین نے صدر جہاں گجراتی کی اس روایت کو عقل و ہوش سے بعید تر قرار دیا ہے۔

ایک اور مؤرخ حاجی محمد قندھاری کا بیان ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق ابھی کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ ہی دھو رہا تھا کہ آسمان سے بجلی گری اور محل کی چھت کو توڑتی ہوئی بادشاہ کے سر پر آ رہی۔ ممتاز مؤرخ ضیاء الدین برنی نے بھی آسمانی بجلی گرنے کا ذکر کیا ہے۔ اگر یہ روایت درست ہوتی تو پھر کہیں نہ کہیں یہ حوالہ بھی ضرور ملتا کہ مرنے کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کی لاش مسخ ہو گئی تھی۔ ایسے بے شمار مناظر لوگوں کی نظروں کے سامنے سے گزرے ہیں کہ آسمانی بجلی جس شے پر گرتی ہے، اسے جلا کر کوئلہ کر دیتی ہے۔

ہم نے پوری تحقیق کے ساتھ تمام معتبر حوالے جمع کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ فرمانروائے ہندوستان، غیاث الدین تغلق کی موت کے ظاہری اور مادی اسباب کا سراغ مل سکے۔ اب ہم ایک اور تاریخی روایت پیش کریں گے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تنہا بھی ہے اور منفرد بھی۔ یہ روایت تاریخ ''مبارک شاہی'' سے اخذ کی گئی ہے، جس کا مصنف یحییٰ بن احمد سرہندی ہے۔ یحییٰ سرہندی لکھتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کا سبب شیخ الاقطاب حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دل آزاری تھی۔ حضرت شیخ نے سلطان کی روانگی کے وقت فرمایا تھا کہ ابھی تجھ سے دِلّی بہت دُور ہے۔ پھر جب غیاث الدین تغلق ایک فاتح کی حیثیت سے دہلی کے قریب پہنچا تو اس نے استقبال کرنے والے لوگوں سے انتہائی فخریہ انداز میں کہا۔

''میں دشمن کے سینے پر پاؤں رکھ کر بخیر و عافیت واپس آ گیا۔''

پھر جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو سلطان کی آمد کی خبر دی گئی تو آپ نے دوبارہ فرمایا:

''ہنوز دِلّی دُور است۔''

اس کے بعد محل کے گرنے اور سلطان کے ہلاک ہونے کا واقعہ پیش آیا۔ جب سلطان غیاث الدین تغلق کی روح نے اس کے جسم کا ساتھ چھوڑا تو وہ دہلی سے چار پانچ میل دُور تھا۔

سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کے سلسلے میں اب تک جس قدر تفصیلات پیش کی گئیں، وہ مختلف تاریخ

نویسوں کا تجربہ تھا۔ تمام مؤرخین فرمانروائے ہندوستان کی مرگِ ناگہانی کو یا تو اتفاقی حادثہ سمجھتے ہیں یا پھر اسے شہزادہ محمد تغلق کی سازش قرار دیتے ہیں۔ صرف مؤرخ یحیٰی سرہندی سلطان غیاث الدین تغلق کی موت کے پس منظر میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دل آزاری کا ذکر کرتا ہے۔ ہم گزشتہ سطور میں بیان کر چکے ہیں کہ والیٔ ہندوستان حضرت محبوب الٰہیؒ کو دہلی چھوڑنے اور حکم سلطانی کی عدم تعمیل کے نتیجے میں دردناک سزا کی دھمکی دے کر لکھنوتی (بنگال) چلا گیا تھا۔ اس سفر میں حضرت امیر خسروؒ سلطان کے ہمراہ نہیں تھے۔ ورنہ عام طور پر آپ ہر فرمانروا کے ساتھ سفر و حضر میں موجود رہتے تھے۔ جب غیاث الدین تغلق لکھنوتی کی طرف کوچ کر گیا تو حضرت امیر خسروؒ نے پیر و مرشد کے حضور میں عرض کیا:

''سیدی! سلطان اپنے ناپسندیدہ افراد کو کبھی معاف نہیں کرتا۔''

''خسرو! اس کے معاف کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے جواباً فرمایا۔ ''کیا وہ اس زمین کا مالک ہے کہ جس سے چاہے قیام کا حق چھین لے اور جسے چاہے سکونت کی اجازت دیدے۔ ہم کسی بادشاہ کے نہیں، اللہ کے کرایہ دار ہیں۔ جب وہ حکم دے گا تو ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر مکان چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ سلطان غیاث الدین تغلق خود ہماری طرح ایک کرایہ دار ہے۔ دنیا کی ''سرائے'' پر اسے اس سے زیادہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ خاموشی سے رات گزار کر چلا جائے۔''

حضرت امیر خسروؒ پیر و مرشد کے ادب کے باعث خاموش ہو گئے، لیکن آپ کے چہرے سے شدید اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ چند روز بعد حضرت امیر خسروؒ نے دوبارہ پیر و مرشد کی بارگاہ میں عرض کیا۔

''سیدی! میں نے روانگی کے وقت سلطان کے چہرے پر بڑے سفاکانہ جذبات کا عکس دیکھا تھا۔ یہ خادم نہیں چاہتا کہ اس کے مخدوم کو ذرا بھی اذیت پہنچے۔'' حضرت امیر خسروؒ کے ایک ایک لفظ سے پیر و مرشد کے لئے بے پناہ محبت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''خسرو! تم نے ابھی تک اس واقعے کو فراموش نہیں کیا ہے؟'' اپنے مرید خاص کی بے چینی دیکھ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے تبسم فرمایا۔

''سیدی! یہ کوئی عام واقعہ نہیں ہے کہ غلام اسے فراموش کر دے۔'' حضرت امیر خسروؒ کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

''نہیں خسرو! تم اپنے ذہن کو غبار آلود اور دل کو پریشان نہ کرو۔'' حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے مرید کی تالیفِ قلب کے لئے فرمایا۔ ''ہنوز دِلّی دُور است۔'' (ابھی دِلّی دُور ہے)..... حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی زبانِ مبارک سے وہی الفاظ ادا فرمائے جو آپ نے سلطان غیاث الدین تغلق کے حکم نامے کی پیشانی پر تحریر کئے تھے۔

وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا رہا، یہاں تک کہ سلطان غیاث الدین تغلق مختلف فتوحات حاصل کرنے کے بعد دہلی کے مضافاتی علاقے ''افغان پور'' پہنچ چکا تھا۔ بس ایک رات کی بات تھی، صبح ہوتے ہی وہ قصرِ سلطانی میں داخل ہو جاتا اور پھر وہ اپنے حکم کی عدم تعمیل پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا، یہ سوچ کر حضرت محبوب الٰہیؒ کے تمام مریدوں اور خدمت گاروں کے چہروں سے شدید اذیت، خوف اور دہشت کا رنگ نمایاں تھا۔ یکایک حضرت امیر خسروؒ اپنی نشست سے اُٹھے اور پیر و مرشد کے قدموں سے لپٹ گئے۔

''سیدی! یہ غلام فرمودۂ شیخ پر لب کشائی کی جرأت نہیں رکھتا، مگر اب دِلّی زیادہ دُور نہیں ہے۔'' حضرت امیر خسروؒ زار و قطار رو رہے تھے۔ ''جب تک آپ تغلق کا کوئی انتظام نہیں فرمائیں گے، اس وقت تک یہ خادم نہ دامن

چھوڑے گا اور نہ قدموں سے جدا ہوگا۔"

خانقاہ کے در و دیوار پر ایک اذیت ناک سکوت طاری تھا اور تمام خدام کے چہرے اس طرح زرد تھے جیسے وہ فرشتۂ اجل کے قدموں کی آہٹ سن رہے ہوں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ خاموش تھے مگر چہرہ مبارک سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہوں۔ پھر آپ نے اپنے مرید خاص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"خسرو! میرے پاؤں تو چھوڑ دو۔ تم ایسے نہیں مانو گے۔"

پیر و مرشد کا حکم سن کر امیر خسروؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے قدم مبارک چھوڑ دیئے اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ آپ کی آنکھوں سے اب بھی آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔

"تم یقیناً نہیں مانو گے۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دوبارہ حضرت امیر خسروؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "مگر تم بھی کیا کر سکتے ہو؟ لوحِ محفوظ پر یہی رقم ہو چکا ہے۔"

تمام مرید اور خدمت گار سکتے کے سے عالم میں پیر و مرشد کی گفتگو سن رہے تھے۔ پھر حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے خادمِ خاص خواجہ اقبالؒ کو ایک "تربوز" لانے کا حکم دیا۔ جب خواجہ اقبالؒ، پیر و مرشد کے حکم کے مطابق تربوز لے آئے تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

"اسے ایک خوان میں رکھ کر سرخ کپڑے سے ڈھانپ دو۔"

جب خوان تیار ہو گیا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے امیر خسروؒ کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔

"اسے سید احمد بہار کے پاس لے جاؤ۔ میرا سلام پیش کرنے کے بعد عرض کرنا کہ یہ خوان نظام الدین نے آپ کے ملاحظے کے لئے بھیجا ہے۔"

تمام مریدین اور خدام بڑی حیرت سے پیر و مرشد کے اس عمل کو دیکھ رہے تھے۔

"کچھ اور عرض کروں؟" حضرت امیر خسروؒ نے پیر و مرشد سے دریافت کیا۔

"بس اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ سید خود سمجھ لیں گے۔" حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا اور اُٹھ کر حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے۔

سید احمد بہارؒ ایک عجیب و غریب بزرگ گزرے ہیں۔ گردشِ ماہ و سال نے ان کے حالاتِ زندگی پر گہرا پردہ ڈال دیا ہے۔ اس لئے پتہ نہیں چلتا کہ سید کہاں سے آئے تھے اور ان کا عارفانہ مقام کیا ہے؟ پھر بھی سید احمد بہارؒ کے منصبِ ولایت کو سمجھنے کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔

سید احمد بہارؒ زندگی بھر ایک عجیب کام کرتے رہے۔ مضافاتِ دہلی کے تمام رہنے والے جانتے تھے کہ سید احمد بہارؒ نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے مٹی تیار کرتے تھے اور پھر دن بھر اسی مٹی سے ایک دیوار بناتے رہتے تھے۔ مغرب کی اذان تک سید کا یہ عمل جاری رہتا اور پھر جیسے ہی نماز کا وقت آتا، سید اس دیوار کو ڈھا دیتے۔ پھر صبح ہوتے ہی اس مٹی کو دوبارہ گوندھ کے دیوار اُٹھانا شروع کر دیتے۔ برسوں سے سید احمد بہارؒ کا یہی معمول تھا۔ اب اللہ تعالیٰ ہی اس رمز کو جانتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟

مشہور روایت ہے کہ جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے مایہ ناز مرید حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو خلافت عطا کر رہے تھے، اس وقت حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے خدام کو کھیر پکانے کا حکم دیا۔ پھر جب کھیر تیار ہو گئی تو حضرت نظام الدینؒ نے اپنے دونوں مریدانِ خاص حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ اور حضرت امیر خسروؒ سے

فرمایا۔

''یہ کھیر سید احمد بہارؒ کی خدمت میں لے جاؤ۔''

حضرت چراغ دہلیؒ اور حضرت امیر خسروؒ اس مرد بزرگ کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سید احمد بہارؒ کے ہاتھ مٹی سے آلودہ ہیں اور وہ پورے انہماک کے ساتھ دیوار بنانے میں مصروف ہیں۔ حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ اور حضرت امیر خسروؒ نے کمال ادب سے سلام کیا اور کھیر سے بھرا ہوا طباق سید احمد بہارؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

سید احمد بہارؒ نے انتہائی شفقت آمیز نظروں سے حضرت سید نظام الدین اولیاءؒ کے دونوں مریدوں کی طرف دیکھا اور پھر بڑے والہانہ انداز میں پوچھا۔

''محبوب الٰہیؒ کیسے ہیں؟''

حضرت امیر خسروؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خیر و عافیت بیان کی۔ مگر آپؒ بڑی حیرت سے سید احمد بہارؒ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خسروؒ کی ذہنی کشمکش جاری تھی کہ سید احمد بہارؒ نے اپنے آلودہ ہاتھ کھیر میں ڈال دیئے اور کچھ دیر تک اپنے ہاتھوں کو گردش دیتے رہے جیسے وہ کھیر اور مٹی کی آمیزش کر رہے ہوں۔ پھر جب کھیر کا رنگ تبدیل ہو گیا تو سید احمد بہارؒ نے حضرت امیر خسروؒ سے فرمایا۔

''اسے کھا لو۔''

اس واقعے کے پس منظر میں یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے اپنی نفاستِ طبع کی وجہ سے اس خاک آلود کھیر کو قبول نہیں کیا، تاہم سید احمد بہارؒ کی بزرگی کا خیال کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''میں خانقاہ واپس جا کر اسے اطمینان سے کھا لوں گا۔''

سید احمد بہارؒ نے ایک نظر امیر خسروؒ کی طرف دیکھا۔ اسی وقت حضرت سید نصیرالدین چراغ دہلیؒ ایک قدم آگے بڑھے اور نہایت مؤدبانہ لہجے میں عرض کیا۔

''اگر سید اجازت دیں تو یہ خادم......''

ابھی حضرت چراغ دہلیؒ کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ سید احمد بہارؒ نے بڑے کیف و جذب کے لہجے میں فرمایا:

''ہاں! اسے کھا لو۔ یہ تمہارے ہی لئے ہے۔''

سید نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے وہ کھیر اس قدر ذوق و شوق سے کھائی کہ جیسے وہ دنیا کی سب سے قیمتی اور لذیذ غذا ہو۔ چونکہ کھیر زیادہ تھی، اس لئے حضرت چراغ دہلیؒ نے نصف کھیر طباق میں چھوڑ دی۔

''نصیرالدین! باقی کھیر بھی کھا لو۔'' سید احمد بہارؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''یہ سب تمہارا ہی حصہ ہے۔ اب اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔''

حضرت سید نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے سید احمد بہارؒ کے حکم کے مطابق باقی کھیر بھی کھا لی۔ پھر جب آپؒ نے واپس آ کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو یہ قصہ سنایا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے انتہائی پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

''نصیرالدین! آج سید نے بھی تمہاری خلافت کی تصدیق کر دی۔ وہ مٹی نہیں، اکسیر تھی جسے کھا کر تم سونا بن گئے ہو۔''

بعض کم نظر صوفیاء کا کہنا ہے کہ اگر وہ خاک آلودہ کھیر حضرت امیر خسروؒ کھا لیتے تو پھر آپ ہی حضرت محبوب

الٰہیؒ کے خلیفۂ اکبر ہوتے۔ ہمارے نزدیک یہ قیاس آرائی درست نہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفۂ اکبر تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ ہی ہوتے، مگر حضرت محبوب الٰہیؒ چاہتے تھے کہ امیر خسروؒ بھی اس سعادت سے محروم نہ رہیں اور اس مٹی کا ذائقہ چکھ لیں جو اپنی تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر تھی۔

اور آج حضرت محبوب الٰہیؒ نے امیر خسروؒ کو سید احمد بہارؒ کے پاس خوان دے کر بھیجا تھا۔ امیر خسروؒ شام کے قریب اس جگہ پہنچے تھے۔ سید احمد بہارؒ حسبِ معمول دیوار اُٹھانے میں مصروف تھے۔ امیر خسروؒ کو دیکھتے ہی آپؒ نے اپنا کام روک دیا اور بڑے والہانہ لہجے میں پوچھا۔

''خسرو! تمہارے شیخ کیسے ہیں؟''

حضرت امیر خسروؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خیر و عافیت بیان کی اور چند قدم آگے بڑھ کر سرخ کپڑے سے ڈھکا ہوا خوان سید احمد بہارؒ کے سامنے رکھ دیا اور نہایت مؤدبانہ لہجے میں عرض کیا۔

''پیر و مرشد نے یہ خوان آپ کے ملاحظے کے لئے بھیجا ہے۔''

سید احمد بہارؒ نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس سرخ پوش خوان کی طرف دیکھا۔ پھر آپؒ کے چہرے پر وحشت و پریشانی کا رنگ نظر آنے لگا۔ حضرت امیر خسروؒ بہت غور سے سید احمد بہارؒ کی اس کیفیت کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ آخر کچھ دیر بعد سید کی طبیعت معمول پر آ گئی۔ پھر آپؒ نے ایک عجیب سے لہجے میں حضرت امیر خسروؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''تمہارے شیخ بھی خوب ہیں۔ جب کسی کو تاج پہناتے ہیں تو اپنے ہاتھ سے پہناتے ہیں۔ اور جب جنازہ اُٹھانے کا وقت آتا ہے تو ہم سے کہتے ہیں کہ اسے کاندھا دے دو۔ مگر کیا کریں؟ ان کا حکم تو ماننا ہی پڑے گا کہ وہ محبوبِ الٰہی ہیں۔''

اس کے بعد سید احمد بہارؒ نے مغرب کی نماز ادا کی۔ حضرت امیر خسروؒ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ سید احمد بہارؒ مغرب کی نماز سے پہلے اپنی اٹھائی ہوئی دیوار کو ڈھایا کرتے تھے۔ مگر آج خلافِ معمول سید نے اس دیوار کو برقرار رہنے دیا۔

نماز ادا کرنے کے بعد سید احمد بہارؒ مسجد میں بیٹھے بہت دیر تک زیر لب کچھ پڑھتے رہے۔ اس دوران حضرت امیر خسروؒ پورے ادب و احترام کے ساتھ سید احمد بہارؒ کے سامنے دست بستہ کھڑے رہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا بھیجا ہوا خوان سید کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ نے چراغ کی روشنی میں سید احمد بہارؒ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اگرچہ برسوں سے جلتی دھوپ میں دیوار بناتے بناتے سید احمد بہارؒ کا رنگ جھلس کر رہ گیا تھا لیکن جب غیظ و جلال کی کیفیت طاری ہوئی تو سید کا سیاہی مائل چہرہ تانبے کی طرح دمکنے لگا۔ پھر آپؒ نے خوان پر پڑا ہوا سرخ کپڑا ہٹا دیا اور تربوز اُٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر سید احمد بہارؒ تیزی کے ساتھ مسجد سے باہر نکلے اور اپنی بنائی ہوئی دیوار کے قریب پہنچے۔ حضرت امیر خسروؒ بھی شدید حیرت و سکوت کے عالم میں ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

سید احمد بہارؒ کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور آپؒ نے پوری طاقت سے حضرت محبوب الٰہیؒ کا بھیجا ہوا تربوز اس دیوار پر مار دیا۔ حضرت امیر خسروؒ نے سید احمد بہارؒ کی پُر جلال آواز سنی۔ یہ عمل کرتے وقت آپؒ نے انتہائی غضب کے عالم میں کہا تھا۔

''برسرِ تغلق۔'' (تغلق کے سر پر)

کہنے والے کہتے ہیں کہ عین اسی وقت شہزادہ محمد تغلق کے تعمیر کردہ محل کی چھت سلطان غیاث الدین تغلق کے سر پر گر پڑی اور وہ اس کے ملبے میں دب کر ہلاک ہوگیا۔

جب فرمانروائے ہندوستان کی میت قبرستان کی طرف جا رہی تھی تو امرائے سلطنت اور دہلی کے باشندوں کی سماعتوں میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والے یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

''ہنوز دِلی دُور است۔''

سلطان غیاث الدین تغلق 725ھ میں دنیا سے رخصت ہوا۔ سات صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی جب کوئی شخص کسی مشکل کام کا ذکر کرتا ہے تو اسے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یعنی ''ابھی دِلی دُور ہے۔'' حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ قول اُردو اور فارسی زبانوں میں ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

ہم نے اپنی معلومات کی حد تک نظام الدین اولیاءؒ اور سلطان غیاث الدین تغلق کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کے سلسلے میں تمام معتبر روایات جمع کر دی ہیں۔ مگر ایک روایت ایسی بھی ہے جس کا ذکر صرف قاسم فرشتہ نے کیا ہے۔ مگر تاریخی تجزیہ نگاروں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ مؤرخ قاسم فرشتہ لکھتا ہے:

''ایک دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ کے احاطے میں عام لنگر تھا۔ اس متبرک کھانے میں شریک ہونے والوں کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے لنگر میں مفلس و نادار شہری بھی شریک ہوتے تھے اور امرائے دہلی بھی۔ اس روز شہزادہ محمد تغلق جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا بے حد معتقد تھا، آپ کے حجرۂ مبارک میں فرش پر بیٹھا ہوا بڑے ذوق و شوق کے ساتھ لنگر کا کھانا کھا رہا تھا۔ شہزادے کے ساتھ اس کے مصاحبینِ خاص بھی تھے۔ پھر جب ولی عہدِ ہندوستان کھانا کھا کر جانے لگا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

''ایک بادشاہ جاتا ہے اور دوسرا بادشاہ آتا ہے۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والے یہ الفاظ شہزادہ محمد تغلق کے مصاحبینِ خاص نے بھی سنے اور اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لئے۔ پھر جب یہ لوگ چلے گئے تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے خدمت گار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''خانقاہ کے دروازے پر ایک شخص کھڑا ہے جو شریف باطن ہے اور شکل وصورت سے بھی شرافت و نیکی کی تصویر نظر آتا ہے۔ اسے میرے پاس لے آؤ۔''

دراصل واقعہ یہ تھا کہ ''سلطنت بہمنی'' کا بانی سلطان علاؤالدین حسن گانگو بہمنی، حکومت کا خواہاں تھا اور بہت دنوں سے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر جب وہ ہر طرح ناکام ہوگیا تو ایک سوالی کی حیثیت سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوا۔ جس وقت شہزادہ محمد تغلق، حضرت محبوب الٰہیؒ کے حجرۂ مبارک میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا تو حسن گانگو بہمنی خانقاہ کے دروازے پر کھڑا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ ''اگر میری قسمت میں شیخ کا دیدار لکھا ہے تو شیخ خود ہی مجھے یاد کریں گے۔ ورنہ میں واپس چلا جاؤں گا۔''

تھوڑی دیر بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا خدمت گار خانقاہ کے دروازے پر آیا اور اس مطلوبہ شخص کو تلاش کرنے لگا۔ وہاں حسن گانگو کے سوا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ مگر حسن گانگو اپنے بوسیدہ لباس کی وجہ سے ایک بھکاری نظر آتا تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے خادم نے واپس جا کر حضرت شیخ سے عرض کیا۔

''سیدی! دروازے پر تو ایک پریشان حال شخص کھڑا ہے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم اُبھر آیا۔

''ہاں! وہی شخص ہے جو بظاہر فقیر معلوم ہو رہا ہے لیکن در حقیقت وہ ارضِ دکن کا تاجدار ہے۔''

خدمت گار دوبارہ خانقاہ کے دروازے پر گیا اور اس پریشان حال شخص کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

''اندر چلو۔ تمہیں حضرت شیخ نے یاد فرمایا ہے۔''

پھر جب حسن گانگو بہمنی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''شیخ! یہ آپ کا حُسنِ کرم ہے کہ مجھ جیسے بھکاری کو شرفِ باریابی بخشا۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے بڑی محبت سے حسن گانگو کو اپنے قریب بٹھایا اور اس کی مزاج پرسی کی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی یہ شفقت و مہربانی دیکھ کر حسن گانگو کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں مزید تیزی آ گئی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

''ایک سلطان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائے۔''

حسن گانگو نے بڑی حیرت سے حضرت شیخ کے الفاظ سنے۔ اس وقت لنگر کا کھانا ختم ہو چکا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خادم سے اپنے افطار کی روٹی منگوائی اور دستِ مبارک سے نوالہ بنا کر حسن گانگو کو دیا۔ پھر نہایت جذب و کیف کے لہجے میں فرمایا۔

''یہ دکن کی حکمرانی کا تاج ہے جو تمہیں شدید کشمکش اور محنت کے بعد حاصل ہو گا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی یہ پیش گوئی بائیس سال بعد پوری ہوئی۔ 747ھ میں حسن گانگو کے سر پر دکن کی سلطنت کا تاج رکھا گیا اور وہ ہندوستان میں ''بہمنی'' حکومت کا بانی قرار پایا۔

یہ ہے اس واقعے کی تفصیل جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے عام لنگر کے دن شہزادہ محمد تغلق کے رخصت ہونے کے وقت باآواز بلند فرمایا تھا۔

''ایک بادشاہ جا رہا ہے اور دوسرا بادشاہ آنے والا ہے۔''

جانے والے بادشاہ سے محبوب الٰہیؒ کی مراد شہزادہ محمد تغلق تھا۔ اور آنے والا بادشاہ حسن گانگو بہمنی تھا۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا کشفِ روحانی تھا کہ آپؒ نے آنے والے وقت کے آئینے میں دو بادشاہوں کے خدوخال دیکھ لئے تھے۔ مگر شہزادہ محمد تغلق کے مصاحبینِ خاص نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے الفاظ کا غلط مفہوم اخذ کیا اور خوشامدی امراء نے انتہائی رنگ آمیزی کے ساتھ سلطان غیاث الدین تغلق کے گوش گزار کر دیا کہ شیخ نظام الدینؒ نے شہزادے کو بادشاہِ ہند بننے کی نوید سنائی ہے۔ اقتدار بڑی خوفناک شے ہے۔ اکثر حکمران کارِ سلطنت میں اپنی اولاد کی شرکت بھی گوارا نہیں کرتے۔ اگر حضرت محبوب الٰہیؒ نے شہزادہ محمد تغلق کو فرمانروائے ہندوستان بننے کی خوشخبری سنائی تھی تو آخر اس میں کیا قباحت تھی؟ سلطان غیاث الدین تغلق کے بعد اصولی طور پر اس کے بیٹے محمد تغلق ہی کو بادشاہ بننا تھا۔ یہ خبر سن کر سلطان غیاث الدین تغلق کو خوشی کا اظہار کرنا چاہئے تھا کہ اس کا اقتدار کسی غیر کے ہاتھوں میں نہیں جائے گا۔ مگر حرص و ہوس نے اسے نئے انداز سے ورغلایا اور وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے فرمودات کو اپنے خلاف سازش سمجھنے لگا۔

تغلق کا خیال تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ، شہزادے کو فرمانروائے ہندوستان کے خلاف بغاوت پر اُکسا رہے ہیں۔ پھر اسی بدگمانی نے سلطان غیاث الدین تغلق کو اس ذاتِ گرامی کا دشمن بنا دیا جس کا وجود مسعود ہندوستان کے بیمار باشندوں کے لئے ''مسیحا'' کا درجہ رکھتا تھا۔ آخر اسی بغض و حسد نے سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی

کی طرح سلطان غیاث الدین تغلق کو بھی اس کے عبرت ناک انجام تک پہنچا دیا۔
حضرت محبوب الٰہیؒ نے مخالفوں کے اسی ہجوم میں زندگی بسر کی۔ کبھی آپؒ ''تارکِ سنت'' کہلائے اور کبھی ''بدعتی''۔ کبھی آپؒ کے شب و روز پر دین سے بے خبری کا الزام عائد کیا گیا اور کبھی قرآن سنت سے عدم آگہی کی تہمت تراشی گئی۔ ''مفتیانِ وقت' اور ''قاضیانِ عصر'' کے اشاروں پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلاف ان لوگوں نے ہنگامہ آرائی کی، جنہیں مسلمان کہنا بھی اسلام کی توہین ہے۔ وہ کون سا ناشائستہ اور غیر مہذب لفظ تھا جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے لئے استعمال نہیں کیا گیا۔ دہلی کے اوباش لوگ برسر مجلس چلے آتے تھے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو ان بے ہودہ کلمات کے ساتھ مخاطب کرتے تھے جن کا استعمال کسی کافر کے لئے بھی جائز نہیں۔
حضرت محبوب الٰہیؒ ان تمام دشنام طرازیوں کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے۔ اور جب وہ لوگ اپنی خباثتِ نفسی کا مظاہرہ کر کے چلے جاتے تو آپؒ دستِ دعا بلند کر کے فرماتے:
''اے اللہ! ان بے خبر لوگوں کو نظام الدین کے حق میں نہ پکڑنا۔ میں نے انہیں معاف کر دیا۔ تُو بھی اپنی شانِ عفو و درگزر سے کام لے اور ان پر رحم فرما۔''
حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دعاؤں ہی کا نتیجہ تھا کہ شہر دہلی بڑے بڑے عذابوں سے محفوظ رہا۔ اگر حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے مخالفین اور شر پسندوں کو معاف نہ فرماتے تو اللہ کے ایک ولی کو پہنچائی جانے والی یہ اذیتیں ممکن ہے کہ بہت خوفناک شکل اختیار کر لیتیں۔ اگر قارئین تاریخ اسلام کا جائزہ لیں تو ایسی بہت سی مثالیں سامنے آئیں گی کہ جب اولیاءؒ کا مذاق اُڑانے والوں کی پوری پوری بستیاں تباہ کر دی گئیں۔ اور آسمان سے ایسا قہر نازل ہوا، جو دردناک بھی تھا اور باعثِ عبرت بھی۔
حضرت نظام الدین اولیاءؒ بھی اپنی زندگی کی اسی کڑی آزمائش سے گزرے اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت کو زندہ رکھنے کے لئے آپؒ نے ہمیشہ معافی اور درگذر سے کام لیا۔ یہی حضرت محبوب الٰہیؒ کی سب سے بڑی کرامت تھی۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔
پھر وقتِ معلوم آپہنچا اور ''کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْت '' کے آسمانی حکم کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی سانسوں کا شمار بھی ختم ہو گیا۔ سلطان محمد تغلق آپؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ اس لئے فرمانروائے ہند نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے علاج میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ تمام ہندوستان سے بہترین طبیب جمع کئے۔ سارے ''نسخہ ہائے شفا'' آزمائے گئے۔ مگر حضرت محبوب الٰہیؒ یہی فرماتے رہے۔ ''دوست کو دوست کا وعدہ یاد ہے اور وہ پورا ہو کر رہے گا۔''
سلطان محمد تغلق نے بہت عاجزانہ لہجے میں دوا پینے کی درخواست کی مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے مسکراتے ہوئے والیٔ ہندوستان کو جواب دیا۔ ''عشق رادار و بجز دیدار نیست'' (عشق کے مریضوں کے لئے دیدارِ دوست کے سوا کوئی دوا نہیں ہے) ہندوستان کی ہر تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنی بیماری کے دوران میں ایک بار بھی دوا استعمال نہیں کی۔
حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح (شیخ رکن عالمؒ) کئی سال سے دہلی میں قیام فرما تھے۔ آپؒ حضرت محبوب الٰہی کی عیادت کو تشریف لائے اور نہایت پُرسوز لہجے میں کہنے لگے۔
''شیخ! ابھی ہم لوگوں کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اپنی صحت کے بارے میں دعا فرمائیں گے تو حق تعالیٰ اسے رد نہیں کریں گے۔''

حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح کی یہ محبت آمیز التجا سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ آبدیدہ ہو گئے اور رقت آمیز لہجے میں فرمانے لگے۔

''شیخ! آج میں نے اپنے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرما رہے تھے کہ نظام! ہمیں تمہاری ملاقات کا بہت اشتیاق ہے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بات سن کر حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح اور دوسرے حاضرین رونے لگے۔ اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا وقت قریب آ چکا ہے۔ جس شخص سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ملاقات کے خواہاں ہوں، وہ زندگی کو موت پر کیسے ترجیح دے سکتا تھا۔ یہ تو حضرت محبوب الٰہی کا شرفِ خاص تھا کہ خود آقا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے غلام کو یاد فرمایا تھا۔ اسی حکم کو سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے دنیا سے اپنا دل اُٹھا لیا تھا۔ اور آخرت کے تصور میں مکمل طور پر غرق رہنے لگے تھے۔

''سیر الاولیاء'' کی ایک روایت کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی وفات سے چالیس دن پہلے کھانا ترک کر دیا تھا اور ہر وقت روتے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن ایک مرید رضی مبارک نے مچھلی کا شوربہ پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔

''سیدی! کمزوری بہت ہو گئی ہے۔ اس لئے یہ ہلکی غذا استعمال فرما لیجئے۔'' رضی مبارک کے ساتھ دوسرے مریدوں نے بھی یہی التجا کی۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے جواباً فرمایا۔

''جو سرورِ کونین ﷺ کی آرزو رکھتا ہو، وہ دنیاوی کھانا کیسے کھا سکتا ہے؟''

پھر حضرت محبوب الٰہیؒ کی یہ کیفیت ہوئی کہ دن میں کئی بار بے ہوش ہوتے اور پھر ہوش میں آ جاتے۔ بار بار زبان مبارک سے یہ مخصوص الفاظ ادا فرماتے۔ ''آج جمعہ ہے اور دوست کو دوست کا وعدہ یاد ہے۔''

اس کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے مریدوں اور خدمت گاروں سے ایک ہی سوال پوچھتے۔

''کیا نماز کا وقت ہو گیا ہے؟ اور کیا میں نے نماز ادا کر لی ہے؟''

مریدین اور خدام عرض کرتے کہ آپ نماز ادا کر چکے ہیں۔ جواب میں حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے۔ ''میں دوبارہ نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔'' پھر آپؒ ہر نماز کو دو مرتبہ ادا کرتے۔ اس طرح چند روز جب تک آپؒ اس دنیا میں رہے، انہی باتوں کو بار بار دہراتے تھے کہ آج جمعہ ہے اور میں نے نماز ادا کر لی ہے یا نہیں؟

یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جذب و استغراق کا زمانہ تھا۔ اس عالم میں انسان کو اپنی ذات کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ جو دنیا پرست علماء، صوفیائے کرام پر ''بے عملی'' کی تہمت لگاتے ہیں، وہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے اس واقعے کو بغور ملاحظہ کریں۔ ارشاداتِ نبوی ﷺ کے مطابق نماز دین کی اساس بھی ہے اور مومن کی معراج بھی۔

اگرچہ آخری ایام میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا حافظہ ظاہری طور پر آپؒ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ مگر آپؒ اس بے خودی کی کیفیت میں بھی نماز کو نہیں بھولے تھے۔

اُردو کے مشہور شاعر جگر مراد آبادی کا ایک شعر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اس کیفیت کی صحیح ترجمانی اور بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

پاؤں اُٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف
اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

بعض روایتوں کے مطابق کبھی کبھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ یہ بھی فرماتے تھے۔ ''می رویم و می رویم و می رویم۔'' (ہم جارہے ہیں، ہم جارہے ہیں، ہم جارہے ہیں)

واضح رہے کہ آخری دنوں میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پیرو مرشد حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی بھی یہی کیفیت ہوگئی تھی۔ دونوں بزرگوں کی یہ حیرت انگیز مماثلت اس بات کا بھی واضح ثبوت ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ اپنے پیرو مرشد سے کس قدر محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

ایک دن اسی حالت میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے تمام مریدوں، قرابت داروں اور خدمت گاروں کو، جو دہلی میں موجود تھے، اپنے حجرہ مبارک میں طلب کیا۔ پھر سب کی موجودگی میں اپنے خادمِ خاص حضرت خواجہ اقبالؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''تم سب لوگ اس بات کے گواہ رہنا کہ اگر اقبال نے خانقاہ میں کوئی جنس بھی باقی رہنے دی تو کل قیامت کے دن یہ حق تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔''

پیرو مرشد کی بات سن کر حضرت خواجہ اقبالؒ رونے لگے۔ پھر شدتِ غم کے سبب لرزتی ہوئی آواز میں عرض کیا۔

''سیدی! یہ آپ کا ادنیٰ غلام، خانقاہ میں کچھ بھی باقی نہیں رہنے دے گا۔ یہاں جس قدر اشیاء موجود ہیں، ان سب کو آپ کے نام پر صدقہ کردے گا۔''

پھر حضرت خواجہ اقبالؒ نے ایسا ہی کیا۔ خانقاہ میں جس قدر سامان تھا، ضرورت مندوں میں تقسیم کردیا۔ سوائے اس اناج کے ذخیرے کے، جو درویشوں کی چند روز کی خوراک تھا۔

اس کے بعد ''سیر الاولیاء'' کے مصنف سید امیر خوردؒ کے چچا، سید حسینؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو اطلاع دیتے ہوئے عرض کیا۔ ''سیدی! خواجہ اقبالؒ نے اناج کے سوا خانقاہ میں جو کچھ موجود تھا، سب غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کردیا۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسی وقت خواجہ اقبالؒ کو طلب کیا اور شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم نے اس مردار ریت کو کس لئے باقی رکھ چھوڑا ہے؟'' حضرت محبوب الٰہیؒ کا اشارہ اناج کے ذخیرے کی طرف تھا۔

خواجہ اقبالؒ نے کانپتے ہوئے لہجے میں عرض کیا۔

''سیدی! اناج کے سوا خانقاہ میں کوئی شے بھی موجود نہیں ہے۔ اور اناج کا یہ ذخیرہ بھی اس لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ اس سے چند ہزار بھوکے اپنے شکم کی آگ بجھا سکیں۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسی ناگوار لہجے میں دوبارہ خواجہ اقبالؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''مخلوقِ خدا کو بلاؤ۔''

پیرو مرشد کا عجیب حکم تھا۔ نہ کوئی اس حکم کا مفہوم سمجھ سکتا تھا، نہ کسی میں اتنی جرأت تھی کہ کوئی مرید یا خدمت گار، حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے اس حکم کی وجہ دریافت کرسکے۔

پھر تھوڑی ہی دیر میں خانقاہ کے صحن اور دروازے پر دہلی کے ہزاروں غریب و مسکین باشندے جمع ہوگئے۔

پھر جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو یہ اطلاع دی گئی کہ مخلوقِ خدا جمع ہوگئی ہے تو آپؒ نے اپنے خدمت گاروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''ان لوگوں سے کہو کہ انبار خانوں کے دروازے توڑ دیں۔ جس قدر اناج موجود ہے، بے خوف ہوکر لے جائیں اور وہاں جھاڑو دے دیں۔''

دہلی کے مفلس و نادار باشندوں نے اپنے غم خوار مسیحا کا حکم سنا۔ سب کے سب سر جھکائے کھڑے رہے۔ بہتے ہوئے آنسو اُن کے بے قرار جذبوں کا اظہار کر رہے تھے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے نحیف آواز میں دوبارہ فرمایا۔

''وقت بہت کم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آنکھ بند ہونے سے پہلے اپنے سینے کے اس بوجھ کو کم کر دوں۔''

دہلی کے مسکینوں اور محتاجوں نے دوبارہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا حکم سنا اور انبار خانوں سے تمام اناج اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو لے گئے۔ اس کے بعد خدام نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا۔

''سیدی! آپ کے بعد ہم فقیروں کا کیا ہوگا؟''

جواباً حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

''تم لوگ پریشان کیوں ہوتے ہو؟ کیا تمہیں اپنے دینے والے کی رزاقی پر یقین نہیں۔''

تمام خدمت گاروں نے شرمساری کی حالت میں سر جھکا دیئے۔ ''اس کے سوا کون دینے والا ہے؟''

حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا۔ ''تم لوگ نذر و نیاز کے طور پر میرے روضے سے اس قدر پاؤ گے کہ وہ تمہارے لئے کافی ہوگا۔''

واضح رہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں ہندوستان بھر کے امراء اپنی نذریں پیش کرتے تھے۔ آپؒ کا لنگر خانہ تمام صوفیائے پاک و ہند کے لنگر خانوں سے بڑا تھا۔ معتبر روایات کے مطابق آپؒ کے یہاں جو کھانا پکتا تھا، اس میں تقریباً دو من نمک استعمال ہوتا تھا۔ صبح و شام ہزاروں فاقہ کش انسان آپؒ کے آستانے سے عزت مندانہ طور پر اپنی بھوک مٹاتے تھے۔ خانقاہ کے تمام انبار خانے خالی کرانے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے کپڑوں کا صندوق طلب کیا۔ یہ اس مردِ درویش کا کل اسباب تھا، جس نے نصف صدی تک ہندوستانی عوام کے دلوں پر حکومت کی۔ جس کی بارگاہِ جلال میں سلاطینِ وقت حاضر ہونے کے لئے برقرار رہتے تھے، آج اقلیم معرفت کا وہی تاجدار اپنا خزانہ لٹا رہا تھا۔ اور یہ خزانہ چند دستاروں، نمازوں کے مصلّوں اور معمولی کپڑے کی عباؤں پر مشتمل تھا۔

تمام مریدوں اور خدمت گاروں کی نظریں حضرت محبوب الٰہیؒ کے دستِ کرم پر مرکوز تھیں اور وہ سب کے سب اس بات کے منتظر تھے کہ بارگاہِ شیخ سے کس کو کیا عطا ہوتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنی ایک دستار، پیرہنِ خاص اور مصلےٰ، حضرت مولانا برہان الدین غریبؒ کو عطا کیا اور انہیں ارضِ دکن کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔ ایک دستار، پیرہنِ خاص اور مصلےٰ حضرت شیخ کمال الدین یعقوبؒ کو عطا کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ ہندوستان کے صوبے گجرات جا کر سلسلۂ چشتیہ کے کارِ تبلیغ کو جاری رکھیں۔ اسی طرح ایک پیرہن، دستار اور مصلےٰ، مولانا شمس الدین یحیٰیؒ کو عطا کیا۔ حضرت امیر خسروؒ اس وقت موجود نہیں تھے۔ وہ کسی ضروری سرکاری کام سے بنگال گئے ہوئے تھے۔

الغرض اس صندوق میں جو کچھ موجود تھا، سب تقسیم کر دیا گیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفۂ اکبر حضرت سید نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ بھی حاضر تھے مگر حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہِ کرم سے آپ کو کوئی چیز عطا نہیں ہوئی۔ پیر و مرشد کے اس طرزِ عمل پر حاضرین کو سخت حیرت ہوئی۔ پھر جب خانقاہ کے بعض خدام نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے اس واقعے کا ذکر کیا تو آپ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

''حضرت شیخ بہتر جانتے ہیں کہ کون کس چیز کا اہل ہے۔'' اپنی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا کرتے وقت

حضرت سید نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ کے چہرے پر شکایت کے بجائے سرشاری کا رنگ جھلک رہا تھا۔
پھر سہ شنبہ کے روز نمازِ عصر کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت سید نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ کو تمام مریدین کے سامنے طلب کیا اور خرقہ، عصا، مصلیٰ، تسبیح، لکڑی کا پیالہ اور سلسلۂ چشتیہ کے دیگر تبرکات جو حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ سے عطا ہوئے تھے، وہ سب حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ کو عطا کرتے ہوئے فرمایا۔
''محمود! تمہیں شہر دہلی میں رہ کر لوگوں کے ظلم و ستم برداشت کرنے چاہئیں کہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔''
حضرت محبوب الٰہیؒ کے ایک مرید مہندر ہردیو نے اپنے روزنامچے میں آپؒ کے آخری لمحات کے بارے میں تحریر کیا ہے:
''ساری رات حضرت کی یہی حالت رہی کہ کچھ دیر کے لئے ہوش آتا تھا اور پھر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ ہوش کی حالت میں حضرت اپنی زبانِ مبارک سے کچھ فرماتے بھی تھے مگر ناتوانی کے سبب آواز اتنی مدھم تھی کہ الفاظ سمجھ میں نہیں آتے تھے اس طرح ہم خدمت گاروں نے پوری رات جاگ کر گزار دی یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔ ہم لوگ نماز ادا کرنے کے لئے چلے گئے۔ مگر خواجہ سید محمد امامؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ کے پاس ہی ٹھہر گئے۔ پھر جب ہم نمازِ فجر ادا کر کے واپس آئے تو خواجہ سید محمد امامؒ سے معلوم ہوا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے کئی بار بستر پر لیٹے لیٹے نمازِ فجر ادا کی ہے۔
اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ پر غشی طاری تھی۔ یکایک آپؒ ہوش میں آئے اور انتہائی ضعف و ناتوانی کے باوجود بلند آواز میں فرمایا۔
''حضرت شیخ العالم (حضرت بابا فریدؒ) تشریف لائے ہیں۔ مجھے تعظیم کے لئے اُٹھاؤ۔''
حضرت محبوب الٰہیؒ کا حکم سن کر سب لوگ آگے بڑھے تاکہ آپؒ کو سہارا دے کر اٹھایا جا سکے۔ مگر اچانک حضرت پر سکوت طاری ہو گیا اور سانس کی حرکت بھی بند ہو گئی۔ اس وقت ہم سب جان گئے کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔ حالانکہ چاشت کا وقت تھا اور سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یہ چہار شنبہ کا دن تھا۔ ربیع الآخر کی اٹھارہ تاریخ تھی اور 725ھ کا سال تھا، جب آفتابِ چشتیہ غروب ہوا اور سرزمین ہند پر غموں کا گہرا اندھیرا پھیل گیا۔''
حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی وصیت کے مطابق حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح (شیخ رکن عالمؒ) نے آپؒ کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر نماز کے بعد حاضرین نے دیکھا کہ حضرت شیخ رکن الدینؒ ایک گوشے میں کھڑے رو رہے تھے۔ شدتِ غم سے آپؒ کا چہرہ نڈھال تھا۔ دوسرے درویشوں نے صبر کی تلقین کی تو حضرت شیخ رکن الدینؒ نے فرمایا۔
''سلطان المشائخؒ کا ہم سے بچھڑنا ایسا صدمہ نہیں جسے گردشِ ماہ و سال دُھندلا کر سکے۔ مفارقت کا یہ داغ تو بے شمار سینوں میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ میں تو شیخ کی اس محبت کو یاد کر کے روتا ہوں کہ مجھے آخری وقت میں فراموش نہیں کیا۔ دنیا سے جاتے جاتے بھی اپنے اس نیاز مند کو سعادتِ عظیم سے سرفراز کر گئے۔ ہائے! کیسا مردِ سخی تھا کہ کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا تھا۔ اب اس کے بعد اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملے گی۔'' یہ کہتے کہتے حضرت شیخ رکن الدینؒ کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں اور بھی تیزی آ گئی۔
حضرت محبوب الٰہیؒ کے کچھ خدمت گاروں نے حضرت رکن الدین ابوالفتح سے دریافت کیا۔
''شیخ! وہ کیا سعادت تھی؟''

جواب میں حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ نے فرمایا۔
''میں گزشتہ چار سال سے ملتان جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر حضرت محبوب الٰہیؒ یہی فرماتے تھے کہ ابھی کیا جلدی ہے۔ کچھ دن بعد چلے جانا۔ میں ادب و احترام کے سبب زیادہ اصرار نہیں کر سکتا تھا مگر اتنا ضرور سوچتا تھا کہ میرے قیامِ دہلی پر اس قدر زور کیوں دیا جا رہا ہے۔ اس دوران مجھے کوئی غیر معمولی بات بھی نظر نہیں آئی۔ لیکن آج اندازہ ہوا کہ روکنے کا سبب کیا تھا۔ شیخ نے مجھے اپنی نمازِ جنازہ کی امامت سے تو مشرف کر دیا مگر یہ نہیں سوچا کہ ان کے بغیر ہمارے دلوں پر کیا گزرے گی۔'' حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ بہت دیر تک جنازے کے قریب کھڑے روتے رہے۔

پھر جب حضرت محبوب الٰہیؒ کا جنازہ اُٹھا تو فرمانروائے ہندوستان، محمد تغلق نے بھی آپؒ کی میت کو کاندھا دیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سلطان محمد تغلق کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور شدتِ غم سے اس کا سرخ و سفید چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ معتبر روایات کے مطابق وہ اپنے باپ سلطان غیاث الدین تغلق کے جنازے پر بھی اتنا نہیں رویا تھا۔

پھر آفتابِ چشتیہ کو قبر میں اُتار دیا گیا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مخالفین علماء کی جماعت نے یہی سمجھا کہ یہ سورج ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ مگر سات صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ساری دنیا دیکھ رہی ہے کہ اس خورشیدِ معرفت کی روشنی تاحدِ نظر پھیلی ہوئی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(اسے ہرگز موت نہیں آتی جس کا دل عشق کی تاثیر سے زندہ ہو گیا۔ غور سے دیکھ کہ دنیا کے دفتر پر ہمارے زندہ جاوید ہونے کی مہر ثبت ہے)

اب ہم حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ایسی کرامات کا ذکر کریں گے جن کا تعلق حکیم الامت، شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کی ذات سے ہے۔ پہلے واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کے بڑے بھائی شیخ عطا، ایک بار کچھ ایسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے کہ ہزار دنیاوی کوششوں کے باوجود وہ آفت ٹل نہیں سکتی تھی۔ بالآخر علامہ اقبالؒ نے ایک طویل نظم لکھی اور اسے دہلی جانے والے شخص کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

''جب تم حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہو تو میری یہ درخواست آپؒ کے قدموں میں رکھ دینا۔''

اس شخص نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دی اور علامہ اقبالؒ کی ہدایت کے مطابق وہ نظم حضرت محبوب الٰہیؒ کے قدموں میں رکھ دی۔ پھر حق تعالیٰ کی قدرت سے وہ مصیبت اس طرح ٹل گئی کہ شیخ عطا کے عزیز و اقارب اور احباب حیرت زدہ رہ گئے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ نظم ان کے کلیات (مجموعۂ کلام) میں شامل نہیں ہے۔ مگر مشہور محقق اعجاز الحق قدوسی مرحوم نے اپنے ایک مقالے میں ''اقبال اور ان کے محبوب صوفیا'' کے عنوان سے وہ نظم شائع کی ہے۔ ہم اپنے قارئین کی معلومات کے لئے اس نظم کے دو خاص اشعار پیش کر رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ہند کا داتا ہے تُو ، تیرا بڑا دربار ہے
کچھ عطا مجھ کو بھی ہو ، دربارِ گوہربار سے

علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں "عطا" کا لفظ بڑی ذہانت سے استعمال کیا ہے۔ آپؒ کے بڑے بھائی کا نام بھی شیخ عطا تھا۔ اس نظم کا آخری شعر یہ ہے۔

محوِ اظہارِ تمنائے دل ناکام ہوں!!
لاج رکھ لینا، ترے اقبال کا ہم نام ہوں

واضح رہے کہ حضرت خواجہ اقبالؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خادمِ خاص تھے۔ علامہ اقبالؒ نے نام کی مماثلت سے ان ہی خواجہ اقبالؒ کا حوالہ اور واسطہ دیا ہے۔

اب ہم شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی زندگی کے ایک اہم ترین واقعہ کا ذکر کریں گے جو سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت کسی مسلمان کے ذہن میں پاکستان کا تصور بھی نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ دوسرے کروڑوں مسلمانوں کی طرح ہندوستانی شہری تھے۔ مگر چونکہ علامہ اقبال فطری طور پر ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے، اس لئے اپنے وطن ہندوستان سے بھی بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ اس کا واضح ثبوت علامہ اقبالؒ کا تحریر کردہ "ترانۂ ہندی" ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی، دل ہو جہاں ہمارا
پربت ہو سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

"ترانۂ ہندی" کے ایک ایک شعر سے اپنے وطن ہندوستان کے لئے جس عقیدت اور محبت کا اظہار ہوتا ہے، دورِ جدید کا کٹر سے کٹر اور انتہا پسند ہندو بھی اس طرح اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے باوجود علامہ اقبالؒ کا "ترانۂ ہندی" بھارتی ہندوؤں میں بے پناہ مقبولیت رکھتا ہے۔ ہندو طالب علم اپنے کالجوں اور سکولوں کی تقریبات میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ علامہ اقبالؒ کا یہ ترانہ پڑھتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ بھارت کی سرکاری تقریبات اور سیاسی جلسوں میں بھی علامہ اقبالؒ کے "ترانۂ ہندی" کی بازگشت پورے زور و شور کے ساتھ سنی جا سکتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس سادگی اور محبت و عقیدت کے ساتھ علامہ اقبال نے اپنی حب الوطنی کا اظہار کیا ہے، بڑے سے بڑا ہندو شاعر بھی اس شدت اور بے ساختگی کے ساتھ ہندوستانی عوام کے سامنے اپنے جذبات پیش نہیں کر سکا۔

اب ہم علامہ اقبالؒ کی ایک اور مختصر نظم کا ذکر کریں گے جس کا عنوان ہے "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اس نظم میں بھی علامہ اقبالؒ کی حب الوطنی کا وہی انداز ہے۔ بلکہ ہمارے خیال میں یہ جذبہ کچھ اور بھی شدت اختیار کر

گیا ہے، جس نے انہیں ''ہندوستانیت'' کے دوسرے حقائق فراموش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجئے ۔

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

پھر علامہ اقبالؒ کے جذبات کی شدت کچھ اور بڑھ جاتی ہے اور علامہ اقبالؒ ہندوستان کے ساتھ ہندوستانیوں کی عظمت کے ترانے گاتے گاتے مبالغے کی آخری حد کو چھونے لگتے ہیں۔ اسی نظم کے آخری بند کو بہت غور وفکر کے ساتھ ملاحظہ کیجئے۔

بندے کلیمؑ جس کے ، پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبیؑ کا ٹھہرا آ کے جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

ان تمام مثالوں سے قطع نظر علامہ اقبالؒ کے پہلے مجموعۂ کلام ''بانگِ درا'' کا آغاز ہی ان کی مشہور نظم ''ہمالہ'' سے ہوتا ہے۔ اس نظم کے شاعرانہ محاسن اور کمالات یہ ہیں کہ پہاڑ جیسے خشک اور غیر دلکش موضوع پر اس سے زیادہ خوبصورت اشعار دوبارہ تحریر نہیں کیے جا سکتے۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

اسی سلسلے کی ایک اور نظم ''نیا شوالہ'' ہے جس میں علامہ اقبالؒ کھل کر اپنے نظریات کا اعلان کرتے ہیں ۔

سچ کہہ دوں اے برہمن ، گر تُو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تُو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کر میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا ، چھوڑے تیرے فسانے

پھر علامہ اقبالؒ ایک نئے مسلک اور نئے مذہب کا تصور پیش کرتے ہیں۔

آ ، غیریت کے پردے ایک بار پھر اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں ، نقشِ دُوئی مٹا دیں
سُونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ ، اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہوا اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اُس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو ''مے'' پیت کی پلا دیں
شکتی بھی، شانتی بھی، بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

علامہ اقبالؒ کی اس نظم میں ہندی زبان کے کئی ''ٹھیٹھ'' الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قارئین کے لئے ان کی وضاحت ضروری ہے۔ ''تیرتھ'' مقامِ مقدس کو کہتے ہیں۔ ''بھگت'' پجاری یا بندے کو کہتے ہیں۔ ''پریت'' محبت ہے اور ''مکتی'' نجات۔ ابتدا میں علامہ اقبالؒ اسی ''نظریۂ انسانیت'' پر یقین رکھتے تھے جس کا موجودہ دور میں بڑے زور وشور کے ساتھ پروپیگنڈا کیا جارہا ہے۔ ''امنِ عالم'' کے نعرے لگائے جاتے ہیں اور سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لئے ملک ملک اور شہر شہر انسانوں کے مقتل سجائے جارہے ہیں۔ اور یہ سب کچھ ''انسان دوستی'' کے نام پر ہورہا ہے۔ اس سیاسی بحث سے قطع نظر ہندوستان کی مٹی کے ہر ذرّے کو دیوتا سمجھنے والا اور ''نیا شوالہ'' بنا کر مکتی اور پریت کے گیت گانے والا اقبال اچانک اتنے بڑے ذہنی انقلاب سے کس طرح دوچار ہوگیا کہ جو کبھی ہمالہ پہاڑ کو اپنا سنتری کہتا تھا، وہ کعبۃ اللہ کو اپنا ''پاسبان ونگہبان'' کہنے لگا۔

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اُس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

جو شاعر چند سال پہلے علی الاعلان کہتا تھا کہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا..... وہ ''ترانہ ملی'' لکھ کر انتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ نیا اعلان کرتا ہے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

جب طارق بن زیاد نے اُندلس (اسپین) کے ساحل پر اُتر کر اپنی ساری کشتیاں جلانے کا حکم دیا تھا تو اس عظیم مسلم مجاہد کے سپاہیوں نے اپنے جانباز سالار سے سوال کیا تھا۔

''اگر ہمیں اس جنگ میں شکست ہوگئی تو پھر ہم کشتیوں کے بغیر اپنے وطن کیسے واپس جائیں گے؟''

اپنے سپاہیوں کے اس سوال کے جواب میں طارق بن زیاد نے کہا تھا۔

''ہر مُلک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست۔'' (ہر ملک ہمارا ہے، اس لئے کہ ہمارے اللہ کا ملک ہے)

علامہ اقبالؒ نے اپنے فارسی اشعار میں پورے واقعے کو بیان کیا ہے۔ انسانی نفسیات کا یہی وہ موڑ ہے کہ شاعرِ مشرق اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے۔ کیونکہ قدرتی اصول کے مطابق ہر شے کسی نہ کسی وقت اپنی اصل یا بنیاد کی طرف لوٹتی ہے۔ علامہ اقبالؒ بھی فطرت کے اسی اصول کے زیراثر اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے اور پورے زور و شور کے ساتھ یہ اعلان کیا۔

نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

علامہ اقبالؒ کے آباؤ اجداد کشمیری برہمن تھے۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں آپؒ کے دادا اسلام لائے اور مستقل طور پر سیالکوٹ میں منتقل ہو گئے۔ بہت ممکن ہے کہ اپنی نوجوانی میں علامہ اقبالؒ باپ دادا کی

''ہندوستانیت'' سے متاثر رہے ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ہی علامہ کے استادِ خاص مولوی سیّد میر حسن کی صحبت بھی آہستہ آہستہ اثر کر رہی تھی جو اپنے وقت کے عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا، جب علامہ اقبالؒ اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ جانے والے تھے۔ لیکن انگلستان روانہ ہونے سے پہلے علامہ اقبالؒ دہلی تشریف لے گئے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہوئے۔ اس واقعہ کی تفصیل بڑی پُرسوز اور روح پرور ہے۔ مگر اہلِ دل اس ہنگامہ خیز مادہ پرستی کے دور میں بھی اس واقعے پر غور کریں تو وہ یقیناً روحانیت اور معرفت کی نئی حقیقتوں سے آشنا ہوں گے۔

ہم گزشتہ سطور میں عرض کر چکے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی سے ایک خاص عقیدت تھی۔ اگر چہ سیالکوٹ سے بہت قریب لاہور، پاک پتن اور ملتان جیسے شہر تھے۔ ان تمام تاریخی مقامات پر حضرت سیّد علی ہجویریؒ (داتا گنج بخشؒ)، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اور حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانیؒ جیسے عظیم صوفی بزرگ آرام فرما ہیں۔ مگر علامہ اقبالؒ طویل سفر طے کر کے دہلی پہنچے۔ اس وقت اُردو کے مشہور ادیب خواجہ حسن نظامی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزارِ مبارک کے مجاور یا سجادہ نشین تھے۔ واضح رہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے شادی نہیں کی تھی۔ اس لئے ''نظامی'' خاندان کے تمام افراد حضرت محبوب الٰہیؒ کی ہمشیرہ محترمہ کی اولاد میں سے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا تعلق بھی انہی بزرگوں کی اولاد سے تھا۔ مزید یہ کہ خواجہ حسن نظامی اور علامہ اقبالؒ کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم بھی تھے۔ دہلی پہنچنے کے بعد علامہ اقبالؒ نے خواجہ حسن نظامی سے درخواست کے لہجے میں عرض کیا۔

''خواجہ! میں کچھ دیر حضرت محبوب الٰہیؒ کے ساتھ تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ تم کوئی ایسا انتظام کر دو کہ میری حاضری کے دوران کوئی شخص مزارِ مبارک کے اندر داخل نہ ہو سکے۔ میں مکمل خلوت چاہتا ہوں۔''

اس زمانے میں علامہ اقبالؒ کی ظاہری وضع قطع انگریزوں جیسی تھی۔ آپؒ کوٹ پتلون پہننے کے ساتھ ٹائی بھی استعمال کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی یہ درخواست سن کر خواجہ حسن نظامیؒ مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔

''اقبال! آخر تم جیسے مغرب زدہ جوان پر کیا افتاد آن پڑی ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی بارگاہ میں اس قدر اہتمام کے ساتھ حاضری دینا چاہتے ہو؟'' واضح رہے کہ ایک زمانے میں خواجہ حسن نظامیؒ اور علامہ اقبالؒ کے درمیان بڑی نوک جھونک اور شاعرانہ چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔

جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا۔

''خواجہ! میں نے ایک نظم لکھی ہے جو میں حضرت محبوب الٰہیؒ کو سنانا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے وقت علامہ اقبالؒ کے چہرے سے انتہائی عقیدت کا رنگ جھلک رہا تھا۔

اس وقت خواجہ حسن نظامیؒ کے علاوہ علامہ اقبالؒ کے دوسرے دوست بھی موجود تھے۔ ان سب نے اصرار کیا کہ وہ نظم پہلے انہیں سنائی جائے۔ مگر علامہ اقبالؒ نے یہ کہہ کر نظم سنانے سے انکار کر دیا۔

''جس شہنشاہِ معرفت کے لئے یہ چند اشعار لکھے گئے ہیں، پہلے اس کی خدمت میں تو پیش کر دوں۔ پھر آپ حضرات کی سماعتوں کی نذر کروں گا۔''

اس کے بعد خواجہ حسن نظامیؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے روضۂ مبارک کا دروازہ کھولا۔ علامہ اقبالؒ نہایت ادب و احترام کے ساتھ سر جھکائے ہوئے مزار مبارک کے اندر داخل ہو گئے۔ خواجہ حسن نظامیؒ نے باہر سے دروازہ بند کر دیا اور روضہ مبارک کے منتظمین کو تاکید کر دی کہ جب تک اقبال باہر نہ آ جائیں، اس وقت تک

زائرین حاضری کے لئے اندر داخل نہ ہوں۔

علامہ اقبالؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے قدموں میں کھڑے ہو کر اپنی مشہور نظم ''التجائے مسافر'' پڑھی۔ جس کے چند اشعار نذرِ قارئین کئے جاتے ہیں۔ تاکہ علامہ اقبالؒ کی اس حاضری اور نظم کی اہمیت واضح ہو سکے۔

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تیری ، فیض عام ہے تیرا

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا خاندانی نام سیّد محمد تھا۔ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے محمد ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ چونکہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا اسمِ گرامی بھی سیّد محمد تھا، اسی لئے علامہ اقبالؒ نے شاعرانہ نکتہ آفرینی کا سہارا لے کر فرشتوں کا ذکر کیا۔

ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت ''نظام'' ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی
بڑی ہے شان ، بڑا احترام ہے تیرا
اگر سیاہ دلم ، داغِ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم ، گلِ بہارِ توام

قارئین! ''التجائے مسافر'' کا یہ فارسی شعر خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔ اگر میں سیاہ دل یعنی بدقسمت ہوں تو تیری ہی لالہ زار کا داغ ہوں۔ اور اگر میری پیشانی کشادہ ہے یعنی میں خوش نصیب ہوں تو تیرے ہی چمن کا پھول ہوں۔ اس شعر کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ میں ہر حال اور ہر رنگ میں تیرا ہی ہوں۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی تعریف بیان کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ اپنی حاضری کا مقصد بیان کرتے ہیں۔

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحان مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تیری دُعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

یہ دعا مانگنے کے بعد علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

میری نظر سے ''بانگِ درا'' کا وہ نسخہ گزرا ہے جس میں یہ شعر بھی موجود تھا۔

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جن کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

مگر علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد شائع ہونے والے مجموعۂ کلام میں ان کا یہ شعر شامل نہیں۔ ''کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال۔'' بہرحال یہ نامکمل دعا آج بھی موجود ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق علامہ اقبالؒ تقریباً

ایک گھنٹہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں تنہا حاضر رہے۔ پھر جب باہر آئے تو چہرے سے لگتا تھا کہ علامہ اس حاضری کے دوران میں روتے رہے ہیں۔ پھر جب خواجہ حسن نظامیؒ اور دوسرے دوستوں کی شدید فرمائش پر شاعرِ مشرق نے اپنی نظم ''التجائے مسافر'' پڑھی تو حاضرینِ مجلس کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

ہم نے علامہ اقبالؒ کی نوجوانی کا کلام اور نظریات تفصیلات کے لئے اس لئے پیش کئے کہ قارئین، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اس کرامت کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ ''التجائے مسافر'' کے ایک ایک لفظ کو بغور پڑھیں اور مشاہدہ کریں کہ انگلستان کے قیام کے دوران اُن کے خیالات میں کیسا عظیم انقلاب آیا کہ وہ حکیم الامت کے منصبِ عظیم تک پہنچے۔ علامہ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے قدموں میں کھڑے ہو کر جو دعا مانگی وہ حرف بہ حرف پوری ہوئی یا نہیں؟ اہلِ نظر خود اندازہ کریں۔ ہم ایک بار پھر انہیں وہ شعر یاد دلاتے ہیں جو علامہ اقبالؒ نے اپنے بڑے بھائی شیخ عطا کے حوالے سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

محوِ اظہارِ تمنائے دلِ ناکام ہوں
لاج رکھ لینا، ترے اقبال کا ہم نام ہوں

اہلِ دنیا نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے واسطے سے اقبال کی کیسی لاج رکھی۔ کچھ لوگ اسے مبالغہ آرائی کہیں گے اور کچھ میری خوش عقیدگی قرار دیں گے۔ پھر بھی میں یہ بات کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا کہ قیامِ پاکستان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حق تعالیٰ، علامہ اقبال کو سرفراز کرنا چاہتا تھا۔ شاعرِ مشرق کے مزار پر لاکھوں انسانوں کی حاضری، ختمِ قرآن اور دعائے مغفرت کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ، وہ خصوصی انعام ہے جو شاعرِ رسالت حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت سحری شیرازیؒ، حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ اور حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے بعد علامہ اقبالؒ ہی کو میسر آیا۔ رہے دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے شاعر کو ادبی مباحثوں کے علاوہ کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ اگر یاد بھی کرتا ہے تو دعا کے لئے ہاتھ نہیں اُٹھاتا۔ علامہ اقبالؒ، حضرت مولانا رومؒ کو اپنا روحانی مرشد سمجھتے تھے۔ مگر یہ فیضِ روحانی، حضرت محبوب الٰہیؒ کے آستانہ عالیہ سے جاری ہوا تھا کہ اقبال خود بھی محبوب ہو گئے۔

❁❁❁

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا شمار اُن صوفیائے کرام میں ہوتا ہے جو خود تو بظاہر خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھے رہے مگر ان کے روحانی تصرف نے پورے انسانی معاشرے کو ایک عظیم انقلاب سے دوچار کر دیا۔ مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی، حضرت محبوب الٰہیؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''آپ کی ذاتِ گرامی نے ظلمت کدوں کو روشن کیا۔ ہزاروں انسانوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور دین و دنیا کی کامرانیاں حاصل کیں۔ آپ کے اخلاقِ عالیہ نے لوگوں کی وہ بری عادتیں بدل ڈالیں جن میں وہ عرصۂ دراز سے مبتلا تھے۔ یہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی درویشی ہی کا صدقہ تھا کہ لوگوں کے معاملات میں سچائی پیدا ہو گئی اور خیانت کا ارتکاب کرنے والے امانت کا مفہوم سمجھنے لگے۔ احکامِ شریعت پر سختی سے عمل ہونے لگا۔ تقریباً ایک صدی کی مطلق العنان حکومت نے عام رعایا کو بے راہ رو بنا دیا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے وجودِ مسعود سے اسلامی شعائر کو سربلندی نصیب ہوئی۔ اور سلطان علاؤالدین خلجی جیسے دنیا پرست حکمران نے شراب پر پابندی عائد کر دی اور عوامی سطح پر فسق و فجور اور بدعت کو روک دیا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے بیعت کا عام دروازہ کھول دیا تھا۔ آپؒ گناہ گاروں سے توبہ کراتے، انہیں خرقہ پہناتے اور اپنے مریدوں میں شامل کر لیتے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی نسبت کی وجہ سے لوگ شرم محسوس کرتے اور گناہوں سے دور رہتے۔ اسی وجہ سے عبادت کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ ہو گیا تھا۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، نوجوان، غلام اور نوکر سب نماز ادا کرتے تھے۔ دہلی کے آسودہ حال لوگوں نے شہر سے غیاث پور تک تفریحی مقامات پر چبوترے بنوا دیئے تھے اور ان پر سائے کے لئے بانس کے سائبان ڈال دیئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کنوئیں کھدوائے گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی مٹی کے لوٹوں اور گھڑوں کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ اس قسم کے ہر سائبان میں چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں اور ہر چبوترے پر دو چوکیدار مقرر تھے تاکہ لوگوں کو وضو کرانے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔ ایسے تمام چبوتروں اور سائبانوں میں نفل پڑھنے والے نمازیوں کا ہجوم دیکھا جاتا تھا۔ عام لوگوں میں ارتکاب جرم کے واقعات بہت ہی کم ہو گئے تھے۔ اکثر بندگانِ خدا جن کی نمازیں جمعے اور عیدین تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں، وہ لوگ چاشت، اشراق اور تہجد کی نمازیں ادا کرنے لگے تھے۔ کوئی محلہ ایسا نہیں تھا کہ جہاں مہینے میں ایک یا دو بار صالحین کا اجتماع اور صوفیوں کی محفلِ سماع منعقد نہ ہوتی ہو۔ لوگ بڑے بڑے گناہوں کو کفر سمجھتے تھے اور حتی المقدور ان سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ شراب اور سیاہ کاری کے تمام اڈے بند کئے جا چکے تھے اور عام لوگ عیش پرستی سے تائب ہو کر سادگی کی زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ کم تولنے کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ تصوف اور احکامِ شریعت کی کتابوں سے لوگوں کی رغبت زیادہ ہو گئی تھی۔"

یہ ہے مولوی ضیاء الدین برنی کا تجزیہ کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے فیضِ روحانی نے بگڑے ہوئے اسلامی معاشرے کو بڑی حد تک "صراطِ مستقیم" پر گامزن کر دیا تھا۔ اگر لوگوں سے بشری تقاضے کے مطابق گناہ سرزد بھی ہو جاتا تھا تو وہ فوراً ہی توبہ کی طرف مائل ہوتے۔ ورنہ اس سے پہلے یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی معصیت کاری پر شرمندہ ہونے کے بجائے فخر کیا کرتے تھے۔

مؤرخ ضیاء الدین برنی ہی کے بقول حضرت نظام الدین اولیاء کی دعاؤں کی برکت سے تاتاریوں کی یورشیں ختم ہو گئیں۔ منگولوں نے جب بھی ہندوستان کا رخ کیا تو وہ کسی ظاہری وجہ کے بغیر خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے یا پھر انہیں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

اب ہم تاریخ کی روشنی میں ان حالات کا جائزہ لیں گے جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی وفات کے بعد ظہور پذیر ہوئے۔ جن کے باعث دارالحکومت دہلی تباہ ہو کر رہ گیا اور ہندوستان پر روز کوئی نہ کوئی آفت نازل ہونے لگی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنی حیاتِ مبارک ہی میں ان مصائب کی پیش گوئی کر دی تھی۔ اس واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت محبوب الٰہیؒ کو "سماع" کے سلسلے میں علمائے دہلی سے مناظرہ کرنے کے لئے دربارِ سلطانی میں بلایا گیا تھا اور آپؒ نے "سماع" کو جائز ثابت کرنے کے لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ پیش کی تھی تو مخالف علماء نے بڑے زور و شور کے ساتھ کہا تھا۔

"یہاں فقہ پر عمل ہوتا ہے۔ تم اپنے دفاع میں کسی امام کا قول پیش کرو۔" علمائے دربار کا اشارہ حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی طرف تھا۔

علمائے دہلی کا مطالبہ سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے چہرۂ مبارک پر سخت اذیت و کرب کا رنگ اُبھرا تھا۔ پھر آپؒ نے انتہائی غم زدہ لہجے میں فرمایا تھا۔

"میں قولِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش کرتا ہوں۔ اور آپ حضرات مجھ سے کسی فقیہہ یا امام کے قول کا مطالبہ کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر حضرت محبوب الٰہیؒ اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے اور دربارِ سلطانی سے تشریف

لے گئے۔

اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہمراہ آپ کے مرید خاص مولانا فخر الدین رازیؒ بھی تھے۔ دربارِ سلطانی سے نکلنے کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''مولانا! یہاں کے عالم، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قولِ مقدس پر کسی امام کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ کیسی دردناک صورتِ حال ہے؟ میری آنکھیں اس شہر کو تباہ ہوتے دیکھ رہی ہیں۔''

جیسے ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی آنکھیں بند ہوئیں، دہلی کے در و بام سے سکون و عافیت کے سائے بھی رخصت ہو گئے۔ اچانک سلطان محمد تغلق نے ایک عجیب وغریب فیصلہ کیا۔ اس نے دہلی کو چھوڑ کر ''دیوگیر'' کو اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ ''دیوگیر'' دکن کا علاقہ تھا۔ سلطان محمد تغلق نے اس کا نام بدل کر دولت آباد رکھ دیا۔ اگر سلطان محمد تغلق صرف دارالسلطنت کی تبدیلی پر اکتفا کرتا تو دہلی جیسا تاریخی شہر ویران نہ ہوتا۔ مگر سلطان محمد تغلق نے ایک انوکھا اور ظالمانہ حکم جاری کیا۔

''دہلی کے تمام شہری مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان اور بچے دہلی چھوڑ کر دولت آباد چلے جائیں۔ جو غریب سفر کا خرچ برداشت کرنے کے قابل نہ ہوں انہیں شاہی خزانے سے رقم فراہم کی جائے۔''

انجام کار دہلی جیسا خوب صورت اور بارونق شہر ویرانی کا عجیب منظر پیش کرنے لگا۔ یہاں کے قدیم باشندے اپنے گھروں کو چھوڑتے وقت در و دیوار سے لپٹ کر رو رہے تھے اور سلطان محمد تغلق کے شوقِ حکمرانی کو عجیب سی لذت حاصل ہو رہی تھی۔ واضح رہے کہ تخت نشینی کے وقت محمد تغلق نے اپنا لقب ''عادل شاہ'' اختیار کیا تھا۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ وہ خود کو ''عادل شاہ'' کہتا تھا اور مخلوقِ خدا پر نئے نئے انداز سے ستم ڈھاتا تھا۔ مؤرخ قاسم فرشتہ نے سلطان محمد تغلق کے بارے میں لکھا ہے کہ شاید ہی کسی بادشاہ کا اعمال نامہ اس قدر سیاہ ہو جتنا کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے بیٹے اور جانشین کا تھا۔ اسے شکار کا بے حد شوق تھا مگر وہ جنگلی جانوروں کے بجائے ہزاروں انسانوں کے خون سے اپنے تیروں اور خنجروں کی پیاس بجھاتا تھا۔ پھر مقتولین کے سر کاٹ کر بلند مقامات پر لٹکا دیتا تھا تاکہ رعایا ہمیشہ اس کی طاقت سے ڈری سہمی رہے اور اس کے دلوں پر بادشاہ کی ہیبت طاری ہو جائے۔ ایک بار وہ قنوج پہنچا اور حدودِ قنوج سے لے کر مہوبہ تک قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اور بے گناہوں کا خون پانی کی طرح بہایا۔ اس لئے اکثر مؤرخین نے اسے ''خونی شاہ'' کے لقب سے بھی یاد کیا ہے۔

سلطان محمد تغلق کی سفاکی کا یہ مظاہرہ صرف عوام تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ بڑے بڑے اولیائے کرام بھی اُس کی ایذا رسانیوں کا شکار رہے۔ مشہور سیاح ابنِ بطوطہ کی ایک روایت کے مطابق سلطان محمد تغلق، خوں ریزی کو ایک دلچسپ کھیل اور لذت انگیز تفریح سمجھتا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا تھا جب اس کے سامنے کسی کو قتل نہ کیا جاتا ہو۔ ''منتخب التواریخ'' کے مؤلف مُلّا عبدالقادر بدایونی نے تحریر کیا ہے کہ سلطان محمد تغلق نے اپنا نام عادل شاہ رکھا تھا مگر اسے انسانوں کو سزائیں دینے میں عجیب لطف و سکون حاصل ہوتا تھا۔ اس کی عدالت میں چار مفتی (قاضی) علیحدہ علیحدہ مقرر تھے۔ جب کوئی شامت کا مارا کسی جرم میں پکڑا ہوا آتا تو سلطان محمد تغلق پہلے ہی سے اسے سزا دینے کا فیصلہ کر لیتا۔ پھر دنیا کو دکھانے کے لئے قاضیوں سے بحث کرتا۔ اس نے مفتیوں کو یہ تاکید بھی کر رکھی تھی کہ تم لوگ سچ بولنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرنا۔ اگر کوئی شخص ناحق مارا گیا تو اس کا عذاب تمہاری گردنوں پر ہوگا۔

پھر تمام قاضیوں اور مفتیوں سے طویل جرح اور بحث کر کے انہیں قائل کرتا۔ اس کے بعد مجرم کو قتل کرا دیتا۔ خواہ وہ آدھی رات کا وقت ہی کیوں نہ ہوتا۔ سلطان محمد تغلق کی طبیعت ہی ایسی تھی کہ وہ صبح ہونے کا انتظار نہیں کر

سکتا تھا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ کسی مجرم کے معاملے میں قاضیٔ عدالت، سلطان کو قائل کر دیتا کہ مذکورہ شخص مجرم نہیں ہے تو بادشاہ اس مقدمے کو دوسرے وقت کے لئے ملتوی کر دیتا۔ پھر تنہائی میں مفتیوں کے دلائل کا توڑ سوچتا۔ پھر اگر دوسری بار بھی ناکام ہو جاتا تو چار و ناچار ملزم کو رہائی بخش دیتا۔ اب اللہ ہی جانتا ہے کہ سلطان محمد تغلق کسی نفسیاتی خلل کا شکار تھا یا اذیت پسندی اُس کی فطرت میں شامل تھی۔ ایک طرف وہ نمازیں پڑھتا، روزے رکھتا، بزرگانِ دین سے عقیدت کا اظہار کرتا اور دوسری طرف اولیائے کرام کو ہولناک اذیتیں دینے سے بھی باز نہیں آتا۔ مختلف تاریخی روایتوں کی روشنی میں سلطان محمد تغلق کی شخصیت ایک عجیب ''مجموعۂ اضداد'' نظر آتی ہے۔

مشہور عالم سیاح اور مؤرخ ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے:

''ایک بار سلطان محمد تغلق غصے میں بھرا ہوا، پیادہ پا قاضی کمال الدین صدر جہاں کی عدالت میں چلا گیا۔ فرمانروائے ہندوستان کو اس حالت میں دیکھ کر قاضی صاحب اور دوسرے کارکنانِ عدالت سہم سے گئے۔ مفتی کمال الدین صدر جہاں کو بادشاہ کے احترام میں اپنی کرسی سے کھڑا ہونا پڑا۔ اس مقدمے کے سلسلے میں ملزم اور اس سے متعلقہ افراد بھی خوف زدہ ہو گئے۔

''سلطانِ معظم! خدانخواستہ آپ کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے؟'' قاضی کمال الدین نے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔

''مفتی صاحب! آپ طبیعت کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ یہ سوال کیجئے کہ مجھ پر کیا قیامت ٹوٹی ہے۔'' سلطان محمد تغلق کا لہجہ غضب ناک تھا اور آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں بھری ہوئی تھیں۔

''سلطانِ ذی شان! میں یہی تو عرض کر رہا ہوں۔'' والئ ہندوستان کا یہ رنگ دیکھ کر قاضی کمال الدین کچھ اور گھبرا گئے تھے۔

''شیخ زادہ جامی نے مجھے یعنی عادل شاہ محمد تغلق کو ظالم کہا ہے۔ اسے عدالت میں طلب کرو تا کہ وہ میرا ظلم ثابت کرے۔'' فرمانروائے ہند کا لہجہ تند و تیز بھی تھا اور ایک بزرگ مذہبی شخص کے حوالے سے گستاخانہ بھی۔ ''اگر شیخ زادہ میرا ظلم ثابت نہ کر سکے تو اس پر شرعی حد (سزا) جاری کرو۔'' یہ کہہ کر سلطان محمد تغلق اسی عالمِ طیش میں عدالت سے نکل کر چلا گیا اور قاضی کمال الدین صدر جہاں نے سکون کی سانس لی۔ تھوڑی دیر کے لئے انہیں یہ خیال گزر رہا تھا کہ کہیں وہ خود ہی بادشاہ کے قہر و عتاب کا ہدف نہ بن جائیں۔

شیخ شہاب الدین احمد جامؒ کا تعلق خراسان سے تھا۔ پھر آپؒ ترکِ وطن کر کے دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔ اس وقت حضرت شیخ احمد جامؒ کا شمار ہندوستان کے بڑے صوفیاء میں ہوتا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ دوسرے صوفیاء کی طرح سلطان محمد عادل شاہ تغلق نے حضرت شیخ احمد جامؒ کو بھی اپنے دربار میں طلب کیا تھا۔ اس دعوتِ شاہی کے جواب میں حضرت شیخ جامؒ نے سرکاری نمائندے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

''اپنے سلطان سے کہہ دینا کہ میں ایسے ظالم حکمران کی خدمت ہرگز نہیں کروں گا۔''

سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی اور سلطان غیاث الدین تغلق حضرت شیخ احمد جامؒ کے بہت معتقد تھے۔ شروع میں سلطان محمد عادل شاہ تغلق اور حضرت شیخ احمد جامؒ کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ کوئی نہیں جانتا کہ حضرت شیخ احمد جامؒ کی طبیعت میں اچانک یہ تبدیلی کیسے آئی اور آپؒ کی زبانِ مبارک سے بادشاہِ ہند کے لئے یہ سخت الفاظ کیوں ادا ہوئے۔

الغرض سلطان محمد تغلق مدعی کی حیثیت سے عدالت میں داخل ہوا اور حضرت شیخ احمد جامؒ کو ایک ملزم کی حیثیت

سے حاضر ہونا پڑا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سلطان محمد تغلق اپنی نشست سے اٹھا اور نہایت تند و تیز لہجے میں قاضی کمال الدین صدر جہاں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مفتی صاحب! اس شیخ زادے سے کہیں کہ یہ سر عدالت میرا ظلم ثابت کرے۔'' یہ کہہ کر سلطان محمد تغلق دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

حضرت شیخ احمد جامؒ فرمانروائے ہندوستان کے تیور دیکھ کر اپنے انجام سے باخبر ہو چکے تھے۔ مگر وادیٔ مرگ سے گزرتے ہوئے نہ آپ کے قدم کانپے اور نہ زبان لڑکھڑائی۔

''بادشاہِ ہند کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے بے سبب دہلی جیسے خوب صورت شہر کو اُجاڑ دیا۔ اللہ کے ہزاروں بندے ''دولت آباد'' میں پڑے ہوئے اپنے گھروں کو یاد کر کے آنسو بہا رہے ہیں۔ یہ سلطان کا پہلا ظلم ہے۔'' حضرت شیخ احمد جامؒ نے انتہائی پُر جلال لہجے میں فرمایا اور کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔

عدالت کے در و بام پر گہرا سکوت طاری تھا۔ یہاں تک کہ حاضرین کو اپنے دلوں کی دھڑکنیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ حضرت شیخ احمد جامؒ کی جراُتِ گفتار پر حیرت زدہ تھے۔ سلطان محمد تغلق جیسے ''خونی بادشاہ'' نے لوگوں سے اُن کی قوتِ گویائی تک چھین لی تھی۔ آج بہت دن بعد دہلی کے باشندوں نے پہلی آواز سنی تھی جس سے سلطان کی قدرت و طاقت کی نفی کا اظہار ہو رہا تھا۔

مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد حضرت شیخ احمد جامؒ دوبارہ سلطان محمد تغلق سے براہِ راست مخاطب ہوئے۔

''تم جس کسی کو حق یا ناحق سزا دیتے ہو، اس کے اہل و عیال اور خاندان والوں کو بھی جلاّدوں کے حوالے کر دیتے ہو۔ یہ کس مذہب اور قانون میں جائز ہے؟ بے شک! میں نے تمہیں سرکاری کارندے کے سامنے ظالم کہا اور آج قاضیٔ عدالت کے روبرو اپنے وہی الفاظ دہرا رہا ہوں کہ تم ظالم ہو۔''

سلطان محمد تغلق، حضرت شیخ احمد جامؒ کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ خود ہی مدعی تھا، خود ہی عدالت اور خود ہی منصف۔ غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا عدالت سے اُٹھ کر چلا گیا اور جاتے وقت اُس آمرِ مطلق نے ایک حق گو اور پاکباز صوفی کے خلاف اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''اس شیخ زادے کو حوالۂ زنداں کر دو۔''

اور پھر حضرت شیخ احمد جام خراسانیؒ کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قید خانے کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں ڈال دیا گیا۔ سلطان محمد تغلق نے اپنی ''انا'' کو تسکین دینے کے لئے صرف شیخ زادہ کی قید و بند پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ عوام کے سامنے اپنی ''شانِ جبروت'' کا مظاہرہ کرنے کے لئے نہایت ظالمانہ بلکہ وحشیانہ روش اختیار کی۔ فرمانروائے ہندوستان نے ایک ''قدِ آدم'' پنجرہ تیار کرایا۔ پھر اس میں شیخ زادہ احمد جامؒ کو بند کر کے اپنے ساتھ دولت آباد لے گیا۔ وہ بڑا ہی دردناک منظر تھا کہ جب ایک عظیم صوفی بزرگ آہنی پنجرے میں قید تھا۔ پنجرہ ہاتھی پر رکھا ہوا تھا۔ اور دہلی سے لے کر دولت آباد تک کے تمام عوام تماشائی تھے۔

سلطان محمد تغلق کچھ دن تک سرکاری کاموں میں مصروف رہا۔ اس دوران حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ پنجرے ہی میں قید رہے۔ صبح و شام سرکاری کارندے آپؒ کے پاس بہترین کھانا پہنچا دیا کرتے تھے۔ مگر آپؒ یہ کہہ کر سلطان محمد تغلق کا بھیجا ہوا شاہی کھانا لوٹا دیا کرتے تھے۔

''میں روزے سے ہوں۔ اور اگر میرا روزہ نہ ہوتا، تب بھی یہ حرام کی غذا ہرگز استعمال نہیں کرتا۔ مجھے ان تمام کھانوں سے انسان کے خون کی بُو آتی ہے۔ بس میرے لئے یہ پانی چھوڑ جاؤ کہ اس پر کوئی بادشاہ یا انسان اپنی

ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ''پانی'' رازقِ عالم کی بخشش عام ہے۔''

پھر حضرت شیخ زادہ جامؒ پانی سے روزہ افطار کر لیتے اور کچھ کھائے بغیر دوسرے دن بھی روزہ رکھ لیتے۔ حضرت شیخؒ کی سخت عبادت و ریاضت کے بارے میں کئی روایتیں مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت شیخ زادہ جامؒ چودہ چودہ دن تک مسلسل روزے رکھتے تھے اور افطار و سحری کے وقت صرف پانی استعمال کرتے تھے۔ آپؒ نے فرمانروائے ہندوستان کی قید میں بھی ایک دن کھانا نہیں کھایا۔

پھر جب سلطان محمد تغلق ''دولت آباد'' سے دہلی روانہ ہوا تو وہی صورتِ حال تھی کہ حضرت شیخ زادہ جامؒ کا پنجرہ ایک ہاتھی پر رکھا ہوا تھا اور بے خبر عوام بڑی حیرت کے ساتھ یہ دلچسپ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ہمیں شیخ زادہ جامؒ کے حوالے سے جبر و ستم کے پس منظر میں ایک اور مشہور تاریخی واقعہ یاد آ جاتا ہے۔

یہ عباسی خلیفہ منصور کا دورِ حکومت تھا۔ جب اُس کے چچا زاد بھائی جعفر بن سلیمان نے عظیم و جلیل محدث و فقیہہ کا منہ کالا کر کے اُنہیں ایک خچر پر بٹھا دیا تھا اور خلافت کے کارندے حضرت امام مالک بن انسؒ کو مدینے کے اطراف میں گھمار ہے تھے۔ چہرہ کالا ہونے کی وجہ سے مدینہ منورہ کے باشندے خچر پر سوار شخص کو پہچاننے سے قاصر تھے۔ مگر حضرت امام مالکؒ نے شہرِ رسولؐ کے رہنے والوں کی یہ مشکل خود ہی دُور کر دی۔ آپ مدینے کی جس شاہراہ یا گلی سے گزرتے، با آوازِ بلند فرماتے۔

''جو مجھے جانتے ہیں سو جانتے ہیں۔ اور جو نہیں جانتے، وہ جان لیں کہ میں مالک بن انس ہوں اور تم سب کے سامنے کہتا ہوں کہ جبری طلاق، طلاق نہیں ہے۔''

یہاں اس تاریخ ساز واقعہ کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ بس قارئین اتنا سمجھ لیں کہ حضرت امام مالک بن انسؒ نے عباسی خلیفہ کی مرضی کے خلاف یہ فتویٰ دیا تھا، جس کی پاداش میں امامِ مدینہ کو اِس ذلت آمیز سزا سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ حضرت امام مالکؒ جدھر سے بھی گزرتے، خلیفہ کے کارندے آپ کے چہرۂ مبارک پر غلاظت پھینکتے اور اس قدر تشدد کرتے کہ آپ کے دونوں ہاتھ کاندھوں سے اُتر گئے۔ مگر حضرت امام مالکؒ کے صبر و استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اب ہم اصل واقعے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب سلطان محمد تغلق دولت آباد سے دہلی پہنچا تو ''دارالقضا'' کے سامنے ٹھہر گیا۔ ''دارالقضا'' کو ہم موجودہ زمانے کی ''سپریم کورٹ'' کہہ سکتے ہیں۔ پھر سلطان محمد تغلق نے پنجرہ کھولنے کا حکم دیا۔ حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ پوری استقامت کے ساتھ باہر آئے۔ اگرچہ حضرت شیخ کو اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا لیکن آپؒ کے چہرۂ مبارک پر خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس تک نہیں تھا بلکہ ہونٹوں پر ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ علامہ اقبالؒ نے اسی کیفیت کو اپنے ایک فارسی شعر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

نشانِ مردِ مومن باز گویم
چو مرگ آمد تبسم برلبِ اوست

(میں ایک بار پھر مردِ مومن کی نشانی بتا رہا ہوں کہ جب موت آتی ہے تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے)

جب شیخ زادہ احمد جامؒ پنجرے سے باہر آئے تو آپ کے ہونٹوں پر بھی وہی تبسم موجود تھا۔ سلطان محمد تغلق نے فوراً ہی جلاّد کو حکم دیا کہ اس نافرمان کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

پھر جب جلاّد شمشیرِ بے نیام لے کر شیخ زادہ احمد جامؒ کی طرف بڑھا تو آپ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے

روکا اور سلطان محمد تغلق کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''موت ہر ذی روح کا مقدر ہے۔ آج میں اس دارِ فانی سے رخصت ہو رہا ہوں، کل تجھے بھی تمام جاہ و حشمت چھوڑ کر اسی قبرستان کی طرف جانا ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ تیری موت کس طرح واقع ہوگی۔ خود مجھے اپنے بارے میں بھی نہیں معلوم تھا کہ میری زندگی کا اختتام کس طرح ہوگا۔ میں نے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے اللہ کی پناہ مانگی تھی۔ خالقِ کائنات کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے اپنے بندے کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا۔ کل تجھے اپنا جبر و ستم یاد نہیں رہے گا۔ اور میرے عزیز و اقارب بھی مجھے فراموش کر دیں گے۔ لیکن گردشِ روز و شب ہمیشہ اس منظر کو یاد رکھے گی کہ مجھے دارالقضا (عدالتِ عالیہ) کے سامنے قتل کیا گیا۔'' اتنا کہہ کر حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ نے جلاّد کو مخاطب کیا۔ ''میرا کام ختم ہوا۔ اب تم اپنے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرو۔''

جلاّد کی شمشیر اور حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ کا کلمۂ شہادت ایک ساتھ بلند ہوئے۔ پھر ''دارالقضا'' کے دروازے پر ایک مردِ حق کا لاغر و نحیف جسم کچھ دیر تک تڑپنے کے بعد قیامت تک کے لئے ساکت و خاموش ہو گیا۔ مگر سات سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس کے خون کے ایک ایک قطرے سے ایک ہی آواز آرہی ہے۔ اور اہلِ دل اس آواز کو اس وقت تک سنتے رہیں گے، جب تک حشر برپا نہیں ہو جاتا ؎

کشتگانِ خنجر تسلیم را !
ہر زماں از غیب جان دیگر است

(جو لوگ تسلیم و رضا کے خنجر سے قتل کئے گئے ہیں، انہیں ہر زمانے میں غیب سے نئی زندگی عطا کی جاتی ہے)

حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ کی شہادت کوئی عام سا واقعہ نہیں تھا کہ دہلی کے باشندے اسے اتنی آسانی سے فراموش کر دیتے۔ بہت سی آنکھیں حضرت شیخ احمد جامؒ کے غم میں نم ہوئیں۔ مگر رونے والوں کے ہونٹوں سے شورِ فغاں بلند نہ ہو سکا کہ وہ سب کے سب سلطان محمد تغلق کے نظامِ جبر سے سہمے ہوئے تھے۔ دہلی کے تمام صوفیائے کرام نے شیخ زادہ احمد جامؒ کے عزیزوں سے تعزیت کی اور اپنی اپنی مجلسوں میں کھل کر حضرت شیخؒ کی شجاعت و استقامت کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پورے دہلی کی فضا سوگوار تھی مگر دنیا پرست علماء کے ایک گروہ نے سلطان محمد تغلق کی خوشنودی اور تقربِ حاصل کرنے کے لئے فرمانروائے ہندوستان کے فیصلے کو عین عدل و انصاف کے مطابق قرار دیا اور حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ ان دنیا پرست علماء کے نزدیک حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ حکومتِ وقت کے باغی تھے۔

اور باغی کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ قرآن کریم میں ایک جماعت کے افراد کے متعلق یہ حکم موجود ہے کہ جو آیاتِ الٰہی ان کی مرضی اور خواہش کی عکاسی کرتی ہیں، وہ انہیں خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ اور جو آیاتِ قرآنی انہیں ناگوار گزرتی ہیں، انہیں ترک کر دیتے ہیں یا ان کا مفہوم بدل ڈالتے ہیں۔ ہم بڑی آسانی سے قرآن کریم کے اس دعوے کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ دنیا میں قرآن کریم کی بے شمار تفسیریں موجود ہیں۔ جو لوگ حق تعالیٰ سے نہیں ڈرتے، وہ آیاتِ الٰہی سے اپنے مطلب کا مفہوم نکال لیتے ہیں۔ حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ کے قتل کو بھی جائز قرار دیتے ہوئے دنیا دار اور مفاد پرست علماء نے اسی آیت مقدسہ کا سہارا لیا تھا۔ ''اللہ اور رسولؐ اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو۔'' ان علماء کے نزدیک سلطان محمد تغلق ''صاحبِ امر'' تھا، اس لئے اس کی اطاعت نہ کرنے پر شیخ جام واجب القتل تھے۔

بہر حال حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ کی شہادت کے بعد سلطان محمد تغلق دہلی کے دوسرے اولیائے کرام کو بھی اپنے

سامنے دست بستہ کھڑا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ اب کی بار اس کا ہدف حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ایک خلیفہ اور ہندوستان کے بہت بڑے عالم حضرت مولانا فخر الدین زرادیؒ تھے۔ مولانا کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپؒ مذہبی علوم میں اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ایک مرید مولانا کمال الدین سامانیؒ اور مولانا فخر الدین رازیؒ نہ صرف ہم مکتب تھے بلکہ بچپن سے گہرے دوست بھی تھے۔ ان دونوں رشتوں کے باوجود دونوں بزرگوں میں شدید نظریاتی اختلافات تھے۔ مولانا فخر الدین رازیؒ اکثر مولانا کمال الدین سامانیؒ کو طعنہ دیا کرتے تھے:

''کیا تم نے اس دن کے لئے علم حاصل کیا تھا کہ اسے بے عمل اور کم علم صوفیوں کی خانقاہ میں لے جا کر برباد کر دو؟'' مولانا فخر الدین رازیؒ کی یہ گفتگو مبہم اشاروں میں ہوتی تھی۔

آخر ایک دن مولانا کمال الدین سامانیؒ سے اپنے دوست کی یہ طنزیہ باتیں برداشت نہ ہوسکیں تو آپؒ نے مولانا فخر الدین رازیؒ سے سوال کیا۔ ''تمہاری بے عمل اور کم علم صوفیوں سے کیا مراد ہے؟''

''خرقہ پہن کر ایک گوشے میں بیٹھ جانے والے یہ درویش جاہل اور مفت خور ہوتے ہیں۔ اپنے جھوٹ کو کرامت سے منسوب کرتے ہیں تاکہ کم فہم و نادان لوگ جوشِ عقیدت میں ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیں اور قیمتی نذر پیش کریں جن کے سہارے یہ صوفی حضرات عیش و عشرت کی زندگی گزار سکیں۔'' اب کی بار مولانا فخر الدین رازیؒ نے کسی رعایت سے کام نہیں لیا تھا اور صوفیاء کی ذات کو کھل کر تنقید و ملامت کا ہدف بنایا تھا۔

بچپن کی دوستی کے باعث مولانا کمال الدین سامانیؒ مولانا فخر الدین رازیؒ کی طنز و تضحیک آمیز باتوں کو ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے۔ مگر آج اپنے دوست کے لہجے کی یہ درشتی دیکھ کر بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئے اور کسی قدر تیز آواز میں بولے۔

''مولانا! آپ کے علم کی وسعت اپنی جگہ مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ انسان جوشِ جذبات میں ہیرے اور پتھر کو یکساں قرار دے دے۔''

''تمہارے نزدیک ان صوفیاء میں ہیرا کون ہے اور پتھر کون؟'' مولانا فخر الدین رازیؒ نے سوال کیا۔ مگر آپ کا لہجہ بدستور مذاق اُڑانے والا تھا۔

''کبھی تم نے میرے پیر و مرشد سے ملاقات کی ہے؟'' مولانا کمال الدین سامانیؒ کے لہجے سے محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے لئے انتہائی عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ تمہارے پیر و مرشد بھی دوسرے صوفیاء سے مختلف نہیں ہوں گے۔'' مولانا فخر الدین رازیؒ کے لہجے میں وہی طنز پوشیدہ تھا۔

''شنیدہ کہ بود مانند دیدہ؟'' (سنی ہوئی بات دیکھی ہوئی بات کے برابر کب ہوسکتی ہے؟) مولانا کمال الدین سامانیؒ نے جواباً فرمایا۔

''تم ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ سے مل کر تو دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہ پھر درویشوں کے بارے میں تمہاری متشدد رائے تبدیل ہو جائے گی۔''

مولانا فخر الدین رازیؒ مذہبی معاملات میں انتہائی شدت پسند تھے۔ اپنے دوست مولانا کمال الدین سامانیؒ کی بات کو بھی بڑی سختی اور بے رحمی کے ساتھ جھٹلاتے ہوئے بولے۔

''کمال الدین! آخر تم بھی ناکارہ انسانوں کے اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔ اسی لئے پورے زور و شور کے

ساتھ ان لوگوں کی وکالت کر رہے ہو۔ مگر مجھ پر تمہاری کسی بات کا اثر نہیں ہو گا۔ میں نے پوری تحقیق اور مکمل مشاہدے کے بعد صوفیوں اور درویشوں کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے۔ اب اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ میرے نزدیک تو تمہارے پیر و مرشد بھی ملاقات کے قابل نہیں ہیں۔"

مولانا فخرالدین رازیؒ کی اس تلخ گفتاری اور گستاخانہ کلمات نے مولانا کمال الدین سامانیؒ کے جذبات میں ایک ہیجان سا برپا کر دیا۔ مگر اس مردِ جانباز نے صرف دوستی کی خاطر بے مثال ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اگر مولانا فخرالدین رازیؒ کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو مولانا کمال الدین سامانیؒ اس سے قطع تعلق کر چکے ہوتے۔

"آخر ایک بار ملنے میں کیا قباحت ہے؟"

"کمال الدین! مجھ سے نادانی کی باتیں نہ کیا کرو۔ ورنہ مجھے تمہارے علم پر بھی شک ہونے لگے گا۔" مولانا فخرالدین رازیؒ کے لہجے کی شدت کا وہی عالم تھا۔ "میں جتنا وقت تمہارے پیر و مرشد سے ملاقات میں ضائع کروں گا، اتنی دیر میں تو کسی بڑی کتاب کا ایک باب پڑھ کر اپنے علم میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔"

مولانا کمال الدین سامانیؒ نے بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ اپنے دوست کے غیظ و غضب کا سامنا کیا اور کئی دن تک ایک ہی بات پر اصرار کرتے رہے کہ ایک ملاقات میں کیا حرج ہے؟ مگر جب مولانا فخرالدین رازیؒ کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہوئے تو مولانا کمال الدین سامانیؒ نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"مولانا! میں تمہیں اپنی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ تم میری خاطر بس ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ کے پاس چلے چلو۔"

بالآخر مولانا فخرالدین رازیؒ نے اپنے دوست مولانا کمال الدین سامانیؒ سے پیچھا چھڑانے کے لئے بڑی بے دلی کے ساتھ کہا۔

"میں صرف تمہاری دل جوئی کی خاطر شیخ نظام الدین کی خانقاہ تک جانے کے لئے تیار ہوں۔ ورنہ اللہ علیم و خبیر ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ اس کام میں میری نیت اور ارادے کو کوئی دخل نہیں۔"

مولانا فخرالدین رازیؒ کا جواب سن کر مولانا کمال الدین سامانیؒ نے انتہائی خوش دلی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلیں مولانا! یہ آپ کا میری ذات پر احسانِ عظیم ہی سہی۔ اور میں آپ کے اس احسان کو زندگی بھر فراموش نہیں کروں گا۔"

پھر دہلی کے باشندوں نے اس شخص کو حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں داخل ہوتے دیکھا جس نے بارہا بڑی بڑی محفلوں میں صوفیاء کو جاہل اور درویشوں کو مفت کی روٹی کھانے والے انسان کہہ کر مذاق اُڑایا تھا۔ جب یہ دونوں عالم حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ کسی خاص موضوع پر تقریر فرما رہے تھے۔ حاضرین مجلس اس طرح باادب بیٹھے تھے کہ بڑے سے بڑے بادشاہ کے دربار میں بھی موجود لوگوں کی نشست کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ مولانا کمال الدین سامانیؒ بھی مجلس میں اس طرح بیٹھے کہ دوزانو تھے اور ان کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ مولانا فخرالدین زرادیؒ چونکہ دل سے صوفیاء کی عظمت کے قائل نہیں تھے، اس لئے وہ مجلس میں بے تکلفانہ اور بے نیازانہ بیٹھے اور بے دلی کے ساتھ حاضرین کو دیکھتے رہے۔

جب تقریر ختم ہوئی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایک نظر مولانا فخرالدین زرادیؒ کی طرف دیکھا، مگر زبان مبارک سے کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔

پھر جب دیگر حاضرین مجلس کی طرح مولانا فخر الدین زرادیؒ خانقاہ سے رخصت ہوئے تو راستے میں مولانا کمال الدین سامانیؒ نے ان سے پوچھا۔

''کہئے مولانا! اب آپ کا درویشوں کے جہل کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

مولانا فخر الدین زرادیؒ نے اپنے دوست کی بات سنی، مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے چہرے پر عجیب سا رنگ نمایاں تھا۔ وہ ہوش میں تھے مگر گم سے نظر آ رہے تھے۔ مولانا کمال الدین سامانیؒ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔

مولانا فخر الدین زرادیؒ پر کئی دن تک یہی کیفیت طاری رہی۔ اس دوران مولانا نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی ترک کر دیا تھا اور روز و شب کے دیگر معمولات بھی چھوڑ دیئے تھے۔ بس مسجد میں جا کر نماز باجماعت ادا کرتے اور خاموشی سے گھر چلے آتے۔ دوست احباب خاموشی کی وجہ دریافت کرتے تو ناسازیٔ طبع کا بہانہ کر کے انہیں ٹال دیتے۔

آخر کئی دن بعد مولانا فخر الدین رازیؒ کے سکوت کی یہ کیفیت زائل ہوئی اور بے اختیار ان کے قدم اپنے دوست مولانا کمال الدین سامانیؒ کے گھر کی طرف اُٹھنے لگے۔ رات کا وقت تھا۔ مولانا فخر الدین زرادیؒ نے کئی بار دستک دے ڈالی۔ مولانا کمال الدینؒ باہر نکلے تو مولانا فخر الدین زرادیؒ کو اپنے سامنے کھڑا ہوا پایا۔ گھبرا کر پوچھا۔ ''مولانا! سب خیریت تو ہے؟''

''کمال الدین! تم مجھے اسی وقت اپنے شیخ کے پاس لے چلو۔'' مولانا فخر الدین زرادیؒ کے لہجے سے شدید اضطراب جھلک رہا تھا۔

مولانا کمال الدین سامانیؒ نے کسی قدر حیرت کے ساتھ کہا۔ ''مولانا! اب تو رات ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ کل کسی وقت چلیں گے۔''

''میں صبح ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا۔'' یکایک مولانا فخر الدین زرادیؒ کا لہجہ بہت زیادہ پُر جوش ہو گیا تھا۔ ''اسی وقت میرے ساتھ چلو۔''

مجبوراً کمال الدین سامانیؒ اپنے دوست کو لے کر غیاث پور کی طرف روانہ ہو گئے۔ پھر جب دہلی کے یہ دونوں نامور علماء حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مجلسِ روحانی میں داخل ہوئے تو حضرت محبوب الٰہیؒ کچھ لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ جیسے ہی آپؒ کی نظر مولانا فخر الدین زرادیؒ پر پڑی تو نہایت محبت آمیز لہجے میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''مولانا! آپ کیسے ہیں؟''

ابھی مجلس کی فضا میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ مولانا فخر الدین زرادیؒ بڑے والہانہ انداز میں آگے بڑھے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگے۔

''شیخ! آپ ہی کا غلام ہوں۔ اب اہلِ دنیا کے سامنے مجھے اپنی غلامی کی سند عطا کر دیجئے۔'' مولانا فخر الدین زرادیؒ اتنی اونچی آواز میں بول رہے تھے کہ ان کی آواز محفل میں موجود ہر شخص سن سکتا تھا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا دستِ مہربان مولانا فخر الدین زرادیؒ کے سر پر سایہ فگن ہو گیا اور اہلِ مجلس نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی پُرسوز اور شیریں آواز سنی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرما رہے تھے۔ ''مولانا! آپ تو پہلے دن ہی سے ہمارے تھے۔ کسی غیر کے کب تھے؟ انشاء اللہ آخری سانس تک ہمارے ہی رہو گے۔ اور حشر میں بھی

ہمارے ہی کہلاؤ گے۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ کی یہ محبت دیکھ کر مولانا فخرالدین زرادیؒ اس قدر روئے کہ ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی اور پورا دامن بھیگ گیا۔

پھر وہ منظر بھی بڑا عجیب تھا کہ جب دہلی کے باشندوں نے مولانا فخرالدین زرادیؒ کا منڈھا ہوا سر دیکھ کر کہا:

"مولانا! ایک رات میں کیا ہوگیا؟ آپ نے یہ کیسا حلیہ بنالیا ہے؟"

جب بھی مولانا فخرالدین زرادیؒ کا کوئی شناسا یہ سوال کرتا تو آپؒ نہایت جذب و کیف اور سرشاری کے عالم میں ایک ہی جواب دیتے۔ "میں نے اپنے علم کا وہ لبادہ اُتار دیا اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی غلامی کا لباس پہن لیا۔ اب یہی میری قبائے ناز ہے اور یہی میرا کفن۔"

یہ تھا حضرت مولانا فخرالدین زرادیؒ کی شخصیت کا مختصر سا خاکہ۔ سید امیر خوردؒ نے اپنی مشہور تصنیف "سیرالاولیاء" میں اس واقعہ کی کچھ تفصیلات پیش کی ہیں۔ جب تمام علمائے دہلی نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سماع کے خلاف ایک محضر نامے پر دستخط کر دیئے تھے اور جس کے جواب میں سلطان غیاث الدین تغلق نے یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس مجلسِ مناظرہ میں شریک ہو کر سماع کے حق میں دلائل پیش کریں۔ اور اگر حضرت محبوب الٰہیؒ سماع کو جائز ثابت کرنے میں ناکام رہے تو حکومت کی طرف سے محافلِ سماع پر پابندی عائد کر دی جائے گی

پھر جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ دربارِ سلطانی میں تشریف لے گئے تو اس وقت مولانا فخرالدین زرادیؒ اور مولانا کمال الدین سامانیؒ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ مناظرہ شروع ہونے سے پہلے مولانا فخرالدین زرادیؒ نے علمائے دہلی کو مخاطب کرتے ہوئے باآواز بلند فرمایا۔

"آپ حضرات، دونوں میں سے کوئی بھی پہلو اختیار کریں۔ میرے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر آپ "سماع" کو حلال ثابت کریں گے تو میں اسے بفضل خدا حرام ثابت کر دوں گا۔ اور اگر آپ سماع کو حرام قرار دیتے ہیں تو میں اسے حلال ثابت کر کے چھوڑوں گا۔" یہ دعویٰ مولانا فخرالدین زرادیؒ کی جلالت علمی پر ایک کھلی دلیل تھا جسے علمائے دہلی جھٹلانے سے قاصر تھے۔

ہمیں اس واقعے کے تناظر میں تاریخ اسلام کا ایک اور ناقابل فراموش واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک بار امامِ اعظم حضرت ابوحنیفہؒ، حضرت امام مالک بن انسؒ کی مجلس میں موجود تھے اور مسجد نبوی میں دو عظیم و جلیل اماموں کے درمیان فقہ کے کسی خاص مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی دوران حضرت امام مالک بن انسؒ کے کچھ شاگرد بھی ادب کے ساتھ آ کر بیٹھ گئے اور یہ علمی بحث سنتے رہے۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ امام مالکؒ کے دو شاگرد حضرت ابوحنیفہؒ سے صورتاً آشنا نہیں تھے۔ پھر جب گفتگو ختم ہوگئی اور حضرت امام اعظمؒ واپس تشریف لے گئے تو حضرت امام مالک بن انسؒ نے اپنے شاگردوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ صاحب جو ابھی اُٹھ کر گئے ہیں، کیا تم لوگ انہیں پہچانتے ہو؟"

تمام شاگردوں نے نفی میں جواب دیا تو حضرت امام مالک بن انسؒ نے نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں فرمایا۔ "یہ ابوحنیفہ کوفی تھے۔" پھر حضرت امام مالک بن انسؒ نے مسجد نبوی کے ایک ستون کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر ابوحنیفہ پتھر کے اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں تو دنیا میں کوئی ان کی بات جھٹلانے والا نہیں۔"

اپنی وسعت علمی اور نظر کی گہرائی کے باعث حضرت مولانا فخرالدین رازیؒ بھی اپنے زمانے کے حضرت

ابوحنیفہؒ تھے۔ مولانا کی یہ خاصیت تھی کہ بحث کے دوران کسی قسم کی نرمی اور مصلحت سے کام نہیں لیتے تھے۔ چاہے ان کے مقابل "علامہ زماں" ہی کیوں نہ ہوتا۔ جب تک کہ اپنے حریف کو دلائل سے عاجز نہ کر دیتے، اس وقت تک خاموش نہ ہوتے۔

سلطان محمد تغلق کے خوشامدی مصاحبوں اور حاشیہ برداروں نے فرمانروائے ہندوستان کے سامنے مولانا فخرالدین رازیؒ کی اس بے نیازی کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ شیخ زادہ احمد جامؒ کے قتل کے بعد سلطان محمد تغلق، حضرت مولانا فخرالدین رازیؒ کی طرف متوجہ ہوا۔ والیٔ ہند مولانا فخرالدین رازیؒ کو اپنی خدمت میں طلب کرنے کا بہانہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ قسمت نے اسے ایک خاص موقع فراہم کر دیا تھا۔ منگولوں کی شورشیں تو سلطان غیاث الدین بلبن اور سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانے میں بھی جاری تھیں مگر قاسم فرشتہ اور دیگر مؤرخین کی روایتوں کے مطابق حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے فیضِ روحانی اور دعاؤں کے اثر سے یہ تاتاری فتنہ ٹل جایا کرتا تھا اور مملکتِ ہندوستان کسی خاص جانی یا مالی نقصان سے محفوظ رہتی۔ سلطان محمد تغلق کے دورِ حکومت میں بھی اس فتنے نے پوری شدت کے ساتھ سر اٹھایا۔ نتیجتاً فرمانروائے ہندوستان نے ایک حکم جاری کیا کہ دہلی کے نواحی علاقے میں بہت بڑا خیمہ نصب کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی کسی بلند مقام پر ایک منبر بھی رکھا جائے تا کہ سلطان محمد تغلق حاضرین سے خطاب کر سکے۔ پھر جب یہ طویل و عریض خیمہ تیار ہو گیا تو سلطان محمد تغلق نے دوسرا حکم جاری کیا کہ تمام شرفائے دہلی اور علمائے شہر بھی اس خیمے میں حاضر ہو جائیں۔ فرمانروائے ہندوستان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اس منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کرے اور مسلمانوں کو منگولوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دے سکے۔ اس کے ساتھ ہی علمائے وقت کی بھی حمایت حاصل کرے کہ فوج اور رعایا کے دل و دماغ پر اس جماعت کے گہرے اثرات ہوتے ہیں۔

اپنی منصوبہ بندی کے بعد سلطان محمد تغلق نے دہلی کے تین بڑے صوفیائے کرام حضرت شاہ نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ، حضرت مولانا شمس الدین یحییٰؒ، اور حضرت مولانا فخرالدین رازیؒ کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ واضح رہے کہ یہ تینوں بزرگ محبوب الٰہیؒ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلفاء تھے۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت ان صوفیاء کے حلقۂ عقیدت میں داخل تھی۔

اس وقت شیخ قطب الدین دبیر، سلطان محمد تغلق کے مصاحبانِ خاص میں شامل تھے۔ شیخ قطب الدین دبیر، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے اور حضرت مولانا فخرالدین زرادیؒ کے شاگرد۔ چونکہ شیخ دبیر فرمانروائے ہندوستان کی تند مزاجی سے واقف تھے، اس لئے آپؒ نے سوچا کہ اپنے استاد کو سلطان محمد تغلق سے تنہائی میں ملا دیں۔ شیخ دبیر کی یہ احتیاط اس لئے تھی کہ اگر بادشاہ اپنی عادت کے مطابق حضرت مولانا فخرالدین زرادیؒ کی شان میں کوئی گستاخی کر بیٹھے تو دوسرے لوگ تماشائی نہ ہوں۔ یہی سوچ کر شیخ قطب الدین دبیر ایک دن پہلے ہی حضرت مولانا فخرالدین زرادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور استادِ گرامی سے قصرِ سلطانی چلنے کے لئے درخواست کرنے لگے۔

حضرت مولانا فخرالدین زرادیؒ نے حسبِ عادت اپنا وہی مخصوص جملہ دہرایا، جسے آپؒ اکثر محفلوں میں اپنی زبانِ مبارک سے ادا کرتے تھے۔

"میں اپنے سر کو اس مرد کی سرائے میں لڑھکتا ہوا پاتا ہوں۔"

سر کے لڑھکنے سے مراد کٹا ہوا سر ہے۔ اور "سرائے" کا مفہوم ہے "قصرِ سلطانی"۔ جب کوئی شخص حضرت

مولانا فخرالدین زرادیؒ سے اس قول کی تشریح چاہتا تو آپؒ انتہائی بے باکانہ لہجے میں فرماتے۔

''میں سلطان محمد تغلق کے ساتھ نرمی سے پیش نہیں آؤں گا۔ اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

بالآخر حضرت مولانا فخرالدین زرادیؒ اپنے جلالِ روحانی کے ساتھ سلطان محمد تغلق کے اس مخصوص کمرے میں پہنچے جہاں دہلی کے دوسرے علماء اور صوفیاء بھی موجود تھے اور جن کے لئے ہندوستان کے بادشاہ نے انتہائی پُرتکلف ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید اور سلطان محمد تغلق کے مصاحب خاص شیخ قطب الدین دبیر نے تیزی سے آگے بڑھ کر کسی نوکر کی طرح اپنے استادِ گرامی مولانا فخرالدین زرادیؒ کے جوتے اٹھالئے اور بغل میں دبا کر کھڑے ہو گئے۔ والیٔ ہندوستان کو شیخ قطب الدین دبیر کا یہ طرزِ عمل شدید ناگوار گزرا، مگر اس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ پھر وہ کسی قدر سخت لہجے میں مولانا فخرالدین زرادیؒ سے مخاطب ہوا۔

''آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ منگولوں کی فتنہ انگیزیوں نے مجھے اس قدر پریشان کر رکھا ہے کہ میں سکون اور یکسوئی کے ساتھ ملک کا نظم و نسق نہیں چلا سکتا۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ آلِ چنگیز خان (منگولوں) کی طاقت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکوں تا کہ ہندوستان کی رعایا خوش حال زندگی بسر کر سکے۔ کیا آپ اس کام میں میری مدد کریں گے؟''

حضرت مولانا فخرالدین زرادیؒ نے نہایت باوقار لہجے میں فرمایا۔

''انشاء اللہ تعالیٰ۔'' (اگر اللہ نے چاہا)

مولانا فخرالدین زرادیؒ کا جواب سن کر سلطان محمد تغلق نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ''انشاء اللہ تعالیٰ تو شک کا کلمہ ہے۔ آپ نے یقیناً کا لفظ کیوں نہیں استعمال کیا؟'' سلطان محمد تغلق بڑی عیاری کے ساتھ مولانا فخرالدین زرادیؒ کے گرد لفظوں کا حصار کھینچ رہا تھا تا کہ ایک مردِ حق کو اس کی بے باکی اور سچائی کی سزا دے سکے۔ مگر حضرت مولانا فخرالدین زرادیؒ، والیٔ ہندوستان کے فریب میں نہیں آئے۔ اور آپؒ نے اپنی روایتی جرأتِ اظہار کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''مستقبل کے لئے یہی کلمہ استعمال ہوتا ہے اور اگر بالفرض جاننا بھی ہے تو ایک مسلمان کی حیثیت سے اسے ہر حال میں اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے کہ وہی ذاتِ پاک ہر شے پر غالب و قادر ہے۔''

حضرت فخرالدین زرادیؒ نے اپنی دلیل سے سلطان محمد تغلق کو عاجز کر دیا تھا۔ اس لئے فرمانروائے ہندوستان زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکا مگر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

پھر والیٔ ہند کے حکم پر مہمانوں کی ضیافت اور خاطر مدارت کے لئے دستر خوان بچھایا گیا۔ سلطان محمد تغلق، حضرت مولانا فخرالدین زرادیؒ کے ساتھ ہی بیٹھا اور ایک ہی رکابی (پلیٹ) میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ کے ساتھ کھانا کھانے لگا۔ مولانا فخرالدین زرادیؒ جبراً کھانا کھا رہے تھے مگر آپ کے چہرۂ مبارک سے شدید ناگواری کا رنگ نمایاں تھا۔ سلطان نے بھی آپؒ کی اس کیفیت کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کر لیا مگر زبان سے کچھ نہیں بولا۔ آپؒ بچی ہوئی ہڈیوں سے گوشت لے کر کھا لیتے، مگر اس طرح کہ جیسے آپؒ دنیا کا سب سے ناپسندیدہ اور مکروہ فعل انجام دے رہے ہوں۔

کھانا ختم ہونے کے بعد تمام مہمان صوفیاء اور علماء کی خدمت میں سوتی مگر قیمتی کپڑے اور اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں پیش کی گئیں۔ جب حضرت فخرالدین زرادیؒ کی باری آئی تو شیخ قطب الدین دبیر نے آگے بڑھ کر وہ کپڑے اور تھیلی اٹھالی جیسے کہ آتے ہوئے ان کی جوتی اٹھائی تھی۔ دراصل شیخ قطب الدین کو معلوم تھا کہ حضرت

زرادیؒ، سلطان کے تحائف قبول نہیں کریں گے اور آپؒ کے اس عمل کو بادشاہ کی توہین قرار دیا جائے گا۔ اس لئے انہوں نے یہ جرأت مندانہ اور کسی قدر باغیانہ قدم اٹھایا تھا۔

جب حضرت مولانا فخر الدین زرادیؒ قصرِ سلطانی سے واپس تشریف لے گئے تو سلطان محمد تغلق آپے سے باہر ہو گیا اور انتہائی غضب کے عالم میں شیخ قطب الدین دبیر کو گالیاں بکنے لگا۔

''اے دھوکے باز اور مکار! تُو نے یہ کیا حرکت کی؟ پہلے جب فخر الدین یہاں آیا تو تُو نے میری نظروں کے سامنے اس کے جوتے اٹھائے اور اپنی بغل میں دبا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر تُو نے فخر الدین کے حصے کا کپڑا اور اشرفیوں کی تھیلی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اس طرح تُو نے فخر الدین کو میری تلوار سے نجات دلائی۔ احمق و نادان! آخر تُو نے اس کی بلا اپنے سر کیوں لے لی؟''

سلطان محمد تغلق کے بگڑے ہوئے تیور بتا رہے تھے کہ چند لمحوں بعد اس کی شمشیر نیام سے باہر آئے گی اور پھر شیخ دبیر کے خون سے اپنی پیاس بجھا کر نیام میں واپس چلی جائے گی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا یہ مرید چار قدم کے فاصلے پر اپنی موت کو کھڑا دیکھ رہا تھا، مگر اس کے چہرے پر نہ خوف و ہراس کا ہلکا سا عکس اُبھرا، نہ جسم میں لرزش پیدا ہوئی اور نہ زبان لڑکھڑائی۔ شیخ دبیر نے شجاعت و استقامت سے لبریز لہجے میں فرمانروائے ہندوستان کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''سلطانِ معظم کو معلوم ہونا چاہئے کہ مولانا فخر الدین زرادیؒ میرے استادِ گرامی بھی ہیں اور میرے مخدوم حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفۂ خاص بھی۔ مجھے لازم تو یہ تھا کہ میں تعظیماً ان کے جوتے سر پر رکھتا، مگر میں نے اسی پر اکتفا کیا کہ استادِ گرامی کے جوتے بغل میں دبائے کھڑا رہا۔ رہا کپڑے اور اشرفیوں کی تھیلی کا معاملہ تو ان چیزوں کی حیثیت ہی کیا ہے؟''

شیخ قطب الدین دبیر کی جرأتِ گفتار کا یہ مظاہرہ دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ہندوستان کا یہ خونیں شہنشاہ سکتے میں آ گیا اور پھر شدید غصے کی حالت میں یہ کہتا ہوا چلا گیا۔

''یہ کفر آمیز اعتقادات چھوڑ دے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں تجھے بھی کسی دن قتل کرا دوں۔''

سلطان محمد تغلق اور اس کے بڑے بڑے امراء اچھی طرح جانتے تھے کہ شیخ قطب الدین دبیر قصرِ سلطانی کی رنگین فضاؤں میں رہتے ہوئے بھی باکردار ہیں۔ بعض امراء دربار میں حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں گستاخانہ کلمات ادا کرتے تھے، مگر شیخ قطب الدین دبیر بے خوف ہو کر سلطان محمد تغلق کی موجودگی میں ان بدکار امراء کو انتہائی سخت جواب دیا کرتے تھے۔ ''یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہو گی کہ اگر میں سلطان المشائخ (حضرت نظام الدین اولیاءؒ) کی محبت میں مارا جاؤں، درجۂ شہادت پاؤں، ان کی خدمت میں جلد از جلد پہنچوں۔ اور مجھے تمہاری بے توقیری سے نجات حاصل ہو۔''

اس واقعہ کے بعد جب بھی سلطان محمد تغلق کی محفل میں حضرت مولانا فخر الدین زرادیؒ کا ذکر ہوتا تو وہ ہر بار کفِ افسوس ملتا اور بڑے حسرت زدہ لہجے میں کہتا۔

''اس بدبخت قطب الدین دبیر نے مولانا فخر الدین کو میری شمشیرِ خوں آشام سے بچا لیا۔'' حالانکہ سب سے بڑا بدنصیب تو خود سلطان محمد تغلق تھا کہ جس کی گردن پر حضرت شیخ زادہ احمد جامؒ جیسے بزرگ کا خونِ ناحق تھا۔ مزید یہ کہ اس کا نامۂ اعمال ایسے ہزاروں واقعات سے بھرا ہوا تھا، جن میں اللہ کے برگزیدہ بندوں کی توہین اور اذیت رسانیاں سرفہرست تھیں۔

پھر دوسرے اکابرینِ دہلی کی طرح حضرت مولانا فخر الدین زرادیؒ کو بھی اپنا شہر چھوڑ کر دیو گیر (دولت آباد) جانا پڑا۔ ہم گزشتہ مضامین میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یکایک سلطان محمد تغلق کے سر میں یہ سودا سمایا تھا کہ وہ دہلی کو اُجاڑ کر ارضِ دکن میں "دولت آباد" کے نام سے دارالحکومت تعمیر کرے۔ جب مولانا فخر الدین زرادیؒ دہلی سے رخصت ہونے لگے تو آپؒ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور نہایت رقت آمیز لہجے میں فرما رہے تھے۔

"اے شہرِ دہلی! تُو اس لئے عظیم ہے کہ تیری خاک میں میرے پیر و مرشد، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور دوسرے بزرگ آسودۂ خواب ہیں۔ دیکھنے والا دیکھ رہا ہے کہ میں خوشی سے نہیں، شدید حالتِ جبر میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ الوداع، میرے بزرگوں کی یادگارو! آسمانِ معرفت کے ہمیشہ چمکنے والے ستارو!"

واضح رہے کہ دہلی کا ایک مضافاتی علاقہ "مہرولی" ہے۔ جہاں سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ اور حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے پیر و مرشد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مزارِ مبارک بھی ہے۔ مولانا فخر الدین زرادیؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

ایک روایت کے مطابق دہلی چھوڑنے سے پہلے مولانا فخر الدین زرادیؒ اپنے پیر و مرشد حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی قبر سے لپٹ کر اتنا روئے کہ بے حال ہو گئے۔

نئے دارالحکومت "دیو گیر" (دولت آباد) آنے سے پہلے حضرت مولانا فخر الدین زرادیؒ حج بیت اللہ کی سعادتِ عظیم سے شرف یاب ہونا چاہتے تھے۔ مگر سلطان محمد تغلق نے آپؒ کو اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ مولانا فخر الدین زرادیؒ اپنے ارادے کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔ دولت آباد پہنچنے کے بعد مولانا فخر الدین زرادیؒ نے ایک دن تنہائی میں قاضی کمال الدین صدر جہاں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں حج بیت اللہ کا فرض ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ جانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ مجھے کوئی مناسب مشورہ دیجئے۔"

قاضی کمال الدین صدر جہاں تمام قاضیوں کے سربراہ تھے۔ موجودہ زمانے کے مطابق انہیں چیف جسٹس بھی کہا جا سکتا ہے۔ قاضی کمال الدین صدر جہاں اگرچہ ایک نیک انسان تھے لیکن عدالتی نظام کے حوالے سے فرمانروائے ہندوستان کے ہاتھوں کا کھلونا تھے۔ کسی مقدمے کا فیصلہ دیتے وقت ان کا ذہن آزاد ہوتا تھا اور نہ قلم۔ اگر کسی مقدمے کا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہوتا تو قاضی کمال الدین صدر جہاں، سلطان محمد تغلق کی طرف دیکھتے۔ پھر جو والئ ہند کی مرضی ہوتی، اسی کے مطابق فیصلہ کرتے۔ مولانا فخر الدین زرادیؒ کی بات سن کر قاضی کمال الدین صدر جہاں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ پھر سلسلۂ چشتیہ کے اس عظیم بزرگ کو مشورہ دیتے ہوئے بولے۔

"سلطانِ معظم کا منصوبہ یہ ہے کہ صرف دہلی ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے بڑے بڑے امراء، شرفاء اور علماء دولت آباد ہی میں مقیم رہیں۔ تاکہ یہ نو آباد شہر، تاریخِ ہندوستان میں ایک روشن مثال بن کر رہ جائے۔ اس لئے والئ ہندوستان آپ کو دولت آباد سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اور اگر آپ سلطان کی اجازت کے بغیر مکہ معظمہ جیسے دُور دراز شہر چلے گئے تو یہ آپ کے حق میں بہت ہی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگا۔" اگرچہ قاضی کمال الدین صدر جہاں، سلطان محمد تغلق کے مقرب خاص تھے لیکن مولانا فخر الدین زرادیؒ کی عظمت و احترام کے پیشِ نظر ایوانِ سیاست کا یہ نازک راز بھی فاش کر دیا۔ "سلطان نے اس دعوتِ خاص کو اب تک فراموش نہیں کیا ہے۔ وہ اب بھی آپ کو ایذا پہنچانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے۔"

قاضی کمال الدین صدر جہاں سے گفتگو کرنے کے بعد حضرت مولانا فخر الدین زرادیؒ کو بڑی فکر اور پشیمانی لاحق ہوئی کہ آپ نے اپنے دل کی بات اس شخص کے سامنے بیان کر دی جو سلطان محمد تغلق کے بہت زیادہ قریب تھا۔

پھر مولانا فخر الدین زرادیؒ نے اس واقعہ کا ذکر سید نور الدین مبارکؒ سے کیا جو آپ کے دوست بھی تھے اور پیر بھائی بھی۔ مولانا فخر الدین زرادیؒ کی بات سن کر سید نور الدین مبارکؒ نے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔

''مولانا! یہ اللہ اور آپ کے عشق کا معاملہ تھا۔ آپ نے غیر شخص پر اس راز کو فاش کر کے بہت بڑی غلطی کی۔ یہ آپ کا حُسنِ ظن تھا کہ قاضی کمال الدین صدر جہاں پر بھروسہ کیا۔ بظاہر قاضی صاحب بھی نیک نیت نظر آتے ہیں، مگر صورتِ حال اس قدر نازک ہے کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ فی الحال میرا یہی مشورہ ہے کہ اگر دوبارہ آپ کی ملاقات قاضی صدر جہاں سے ہو تو اس واقعے کا ذکر نہ کریں۔ پھر جب قاضی صاحب کے ذہن سے یہ بات نکل جائے گی تو کوئی تدبیر سوچیں گے۔''

سید نور الدین مبارکؒ کے مشورے کے مطابق مولانا فخر الدین زرادیؒ نے بظاہر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ مگر آپؒ نصف شب کے سناٹے میں ایک ہی دعا کرتے تھے:

''اے اللہ! اے میرے مشکل کشا! تُو ہر شے پر قادر ہے، جسے چاہے برقرار رکھے اور جسے چاہے نیست و نابود کر دے۔ تیرا یہ بندۂ عاجز فخر الدین ای روز تیرے ہی بنائے ہوئے قانون کے مطابق فنا ہو جائے گا۔ کوئی نہیں جانتا کہ فرشتۂ اجل جس حالت میں اس کی سانسیں غصب کرے گا۔ مگر میں تیرے گھر کی زیارت کئے بغیر دنیا سے جانا نہیں چاہتا۔ بے شک! میں بہت کمزور و ناتواں ہوں مگر تیری ذات پاک قوی العزیز ہے۔ میری بے کسی اور مجبوری کی لاج رکھ۔''

اس دوران مولانا فخر الدین زرادیؒ جبراً سلطان محمد تغلق کے دربار میں حاضر ہوتے رہے۔ دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ مولانا دربار میں موجود ہیں، مگر ان کے چہرے پر شدید ناگواری کا رنگ نمایاں ہے۔ فرمانروائے ہندوستان بھی بار بار مولانا فخر الدین زرادیؒ کی طرف دیکھتا تھا اور ان کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

آخر کچھ دن بعد حق تعالیٰ نے آپؒ کے لئے ایک عجیب موقع فراہم کر دیا۔ مولانا فخر الدین زرادیؒ کا بھتیجا قصبہ ''بیتھون'' میں رہتا تھا۔ اس نے اپنے چچا کو شادی کا دعوت نامہ بھیجا۔ مولانا فخر الدین زرادیؒ نے وہ دعوت نامہ قاضی کمال الدین صدر جہاں کے سامنے رکھ دیا اور شادی میں شرکت کے لئے قصبہ ''بیتھون'' جانے کی اجازت چاہی۔ قاضی صدر جہاں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس شرط کے ساتھ ''بیتھون'' جانے کی اجازت دے دی۔

''مولانا! آپ شادی کی تقریب ختم ہوتے ہی فوراً دولت آباد کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ میں کچھ دن تک کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے سلطان کو مطمئن کر دوں گا۔ لیکن اگر آپ نے وہاں زیادہ عرصہ قیام کیا تو میں صورتِ حال پر قابو پانے میں ناکام ہو جاؤں گا۔'' قاضی کمال الدین صدر جہاں نے در پردہ اس طرف اشارہ کر دیا تھا کہ دولت آباد تاخیر سے پہنچنے کی صورت میں انہیں سلطان محمد تغلق کے انتہائی قہر و غضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

حضرت مولانا فخر الدین زرادیؒ نے قاضی صدر جہاں کی اس تنبیہ کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اُٹھ کر چلے آئے۔ اس وقت مولانا فخر الدین زرادیؒ کی کیفیت کچھ ایسی تھی جس کی ترجمانی مرزا غالب نے اپنے اس شعر میں کی ہے ۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
ہم نے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے

دوسرے دن مولانا فخرالدین زرادیؒ رات کے وقت اپنے دوست سید نورالدین مبارک کے مکان پر تشریف لائے اوران سے فرمانے لگے۔ ''سید! بھتیجے کی شادی میں شرکت تو ایک بہانہ ہے۔''

''مولانا! پھر آپ کے کیا ارادے ہیں؟'' سید نورالدین مبارکؒ نے گھبرا کر پوچھا۔

''میرے نزدیک بس یہی ایک صورت تھی کہ اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کر سکوں۔'' مولانا فخرالدین زرادیؒ کے لہجے اور چہرے سے گہرا اطمینان جھلک رہا تھا۔

سید نورالدین مبارکؒ، مولانا فخرالدین زرادیؒ سے شدید محبت کرتے تھے۔ اس لئے آپؒ کا فیصلہ سن کر بہت زیادہ مضطرب نظر آنے لگے۔ ''مولانا! حج بیت اللہ کا سفر تو بہت طویل ہے۔ پھر آپ قاضی صدر جہاں کے سامنے تاخیر سے پہنچنے کا کیا عذر پیش کریں گے؟''

''میں نے قاضی کمال الدین سے واپس آنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں انشاء اللہ اپنے وعدے کی تکمیل کروں گا اور صاف صاف بتا دوں گا کہ شادی میں شرکت کرنے کے بعد مکہ معظمہ چلا گیا تھا۔'' مولانا فخرالدین زرادیؒ نے بڑی صاف گوئی سے جواب دیا۔

سید نورالدین مبارکؒ اچھی طرح جانتے تھے کہ مولانا فخرالدین زرادیؒ کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ ایک بار جو کہہ دیتے ہیں، ہر حال میں اس پر عمل کرتے ہیں۔ سید نورالدین مبارکؒ مولانا فخرالدین زرادیؒ کو حج بیت اللہ کے ارادے سے تو باز نہیں رکھ سکتے تھے مگر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور ان کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

''مولانا! آپ پیر و مرشد کی خاص نشانی ہیں اور ہم اس نشانی کو اتنی جلد کھونا نہیں چاہتے۔''

مولانا فخرالدین زرادیؒ اپنے دوست کے اس مبہم اشارے کو سمجھ گئے اور انتہائی جذب و کیف کے عالم میں فرمانے لگے۔

''سید! جب بے نشان ہونا ہی ہے تو ان گناہ گار آنکھوں سے اپنے خالق کی نشانی کیوں نہ دیکھ لوں۔ اگر میرے جسم کو خون سے غسل دے دیا گیا تو اس میں حسرت و غم کا کون سا پہلو ہے؟ مجھ سے پہلے نہ جانے کتنے اہل ایمان لہو سے نہائے ہیں۔ بس میرے لئے اتنی دعا کرو کہ ایک نظر بیت اللہ اور پھر اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اقدس کو دیکھ لوں۔ اس کے بعد جو گزرنا ہے، گزر جائے۔''

پھر حضرت مولانا فخرالدین زرادی ''بیتھون'' پہنچ کر اپنے بھتیجے کی شادی میں شریک ہوئے۔ اور دوسرے دن ہی ''بیتھون'' سے ''کوکن'' (بمبئی کا پرانا نام) روانہ ہو گئے۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے مولانا نے اپنے ان دوستوں کے نام ایک خط تحریر کیا جنہیں سلطان محمد تغلق جبراً دہلی سے دولت آباد لے گیا تھا۔ اس خط میں مولانا نے ایک فارسی شعر تحریر کیا تھا، جس کا ترجمہ یہ ہے:

''یہ خط کیا ہے، بس میرے سینے کا غم ہے۔ اے ہوا! تو اسے اڑا کر لے جا اور میرے غم گساروں تک پہنچا دے۔''

مختصر یہ کہ مولانا فخرالدین زرادیؒ نے حج ادا کیا اور پھر بغداد تشریف لے گئے۔ جب علمائے بغداد نے مولانا فخرالدین زرادیؒ کی آمد کی خبر سنی تو بڑے والہانہ انداز میں آپؒ کا استقبال کیا۔ پھر جتنے دن بھی مولانا فخرالدین

زرادیؒ کا قیام بغداد میں رہا، آپؒ نے مقامی علماء سے علم حدیث پر کئی مناظرے کئے۔ اور ان تمام مناظروں میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید خاص سب سے زیادہ نمایاں رہے۔

اگر مولانا فخر الدین زرادیؒ چاہتے تو بغداد میں سکون و عافیت اور عزت و احترام کے ساتھ اپنی باقی زندگی گزار سکتے تھے۔ مگر آپؒ نے قاضی کمال الدین صدر جہاں سے واپس آنے کا وعدہ کیا تھا، سو اس عہد کو پورا کرنے کے لئے ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے۔ مولانا جس جہاز میں سوار تھے، وہ شاہی سامان سے بھرا ہوا تھا۔ وزن زیادہ ہونے کے باعث جہاز غرقابی کے قریب پہنچ گیا تو ملّاح (جہاز ران) مولانا فخر الدین زرادیؒ کے پاس آئے اور عرض کرنے لگے۔

''اگر آپ اجازت دیں تو ہم کچھ سامان سمندر میں ڈال دیں تاکہ جہاز ہلکا ہو جائے اور اس طرح اس کے محفوظ رہنے کی کوئی صورت نکل آئے۔''

حضرت مولانا فخر الدین زرادیؒ نے جہاز رانوں کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

''مجھے دوسروں کے مال پر کیا حق ہے کہ میں اسے پانی میں پھینکنے کی اجازت دوں؟'' یہ کہہ کر مولانا فخر الدین زرادیؒ نے اپنا مصلےٰ بچھایا اور قبلہ رخ ہو کر نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر کچھ دیر بعد جہاز غرق ہو گیا اور مولانا فخر الدین زرادیؒ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

مولانا فخر الدین زرادیؒ کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفۂ اکبر اور سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت سید نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ سلطان محمد تغلق کا نشانۂ ستم بنے۔

❀❀❀

حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ

حضرت نصیرالدین محمودؒ کا تعلق خاندانِ سادات سے تھا۔ کسی تذکرہ نگار نے آپؒ کے سالِ پیدائش کا ذکر نہیں کیا۔ اکثر کتابوں میں تحریر ہے کہ آپؒ کے مورثِ اعلیٰ سید یحییٰؒ خراسان سے ترکِ سکونت کر کے لاہور میں آباد ہو گئے تھے۔ تحقیق کی روشنی میں یہ روایت درست نہیں۔ سید نصیرالدین محمودؒ کے دادا کا نام سید عبداللطیفؒ تھا، جو خراسان سے ہجرت کر کے لاہور میں قیام پذیر ہوئے تھے اور پھر یہیں آپؒ کے صاحبزادے سید یحییٰؒ پیدا ہوئے تھے۔ پھر سید یحییٰؒ لاہور سے اودھ تشریف لے گئے تھے۔ یہیں حضرت سید نصیرالدین محمودؒ کی ولادت ہوئی۔ اودھ ہندوستان کا ایک قدیم ترین مہذب علاقہ تھا جس میں موجودہ بھارت کا مشہور شہر ''لکھنؤ'' بھی شامل تھا جو اُردو شاعری اور تمدنی شائستگی کے حوالے سے خصوصی شہرت کا حامل تھا۔

بعض تذکرہ نگاروں نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ حضرت سید نصیرالدین محمودؒ ''اجودھیا'' میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ وہی ''اجودھیا'' ہے جو ''بابری مسجد'' کے انہدام کے حوالے سے ''بین الاقوامی ہنگامہ خیز شہر'' بن کر رہ گیا ہے۔ ہندوؤں کا دعویٰ ہے کہ یہیں ان کے مشہور اوتار (دیوتا) رام چندر جی پیدا ہوئے تھے، اسی لئے ''اجودھیا'' کو ''رام بھومی'' (رام کی سرزمینِ پیدائش) بھی کہا جاتا ہے۔ اہلِ ہنود کا یہ کہنا بھی ہے کہ جس مقامِ خاص پر رام چندر جی پیدا ہوئے تھے، مسلمانوں نے اسے مسمار کر کے مُغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر کے عہدِ سلطنت میں ''بابری مسجد'' تعمیر کی تھی۔ نتیجتاً انتہا پسند ہندوؤں کے بقول بابری مسجد کو ڈھا کر مسلمانوں سے انتقام بھی لے لیا اور اپنے بھگوان رام چندر جی کے پوتر استھان (مقامِ مقدس) کو پاک صاف بھی کر دیا۔ اس بحث سے قطع نظر ''اجودھیا'' بھی اودھ کا علاقہ تھا اور یہیں سلسلۂ چشتیہ کے جانباز بزرگ حضرت سید نصیرالدین محمودؒ پیدا ہوئے تھے۔

حضرت سید نصیرالدین محمودؒ کے والد محترم کا انتقال اس وقت ہوا جب آپؒ کی عمر مبارک 9 سال تھی۔ یہ قدرت کا بڑا عجیب راز ہے کہ اکثر بڑے صوفیائے کرام اور تاریخ ساز اولیاء کو بچپن ہی میں یتیمی کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ مثلاً حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ، غوثِ اعظم حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت مخدوم علاؤ الدین صابر کلیریؒ، محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے صوفیائے عظام بچپن ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اس روایت کا کوئی نہ کوئی تعلق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس سے بھی ہو۔ کیونکہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی پیدائش سے پہلے ہی یتیم ہو گئے تھے۔ کہنے والوں نے اس وقت کہا تھا کہ اس معاشرے میں اس یتیم بچے کی کیا حیثیت ہوگی؟ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس یتیم بچے نے پوری انسانیت کی تاریخ ہی بدل ڈالی۔ شاید اسی مشیتِ الٰہی کے تحت بڑے بڑے صوفیائے کرام کو آزمائش کی اس منزل سے گزارا جاتا ہے اور یہ بھی بڑی عجیب یکسانیت ہے کہ یتیم ہو جانے والے اولیائے کرام کی مائیں اپنے وقت میں بڑی بڑی عابدہ اور زاہدہ گزری ہیں۔

حضرت سید نصیرالدین محمودؒ کی والدہ محترمہ بھی بہت نیک خاتون تھیں۔ آپؒ نے اپنے بیٹے کو کسی لمحے بھی باپ

کی کمی کا احساس تک نہیں ہونے دیا اور شب و روز کی ایک ایک ساعت فرزند کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دی۔ حضرت سید نصیرالدین محمودؒ نے فقہاء کی مشہور کتاب ''بزودی'' مشہورِ عالم قاضی محی الدین کاشانی سے پڑھی۔ ''سیر العارفین'' کی روایت کے مطابق آپؒ نے مولانا عبدالکریم شیروانی سے ''بزودی'' کے مطالب و مفاہیم سمجھے۔ مولانا عبدالکریم شیروانی کو اپنے وقت میں (علامۂ زماں) تصور کیا جاتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت سید نصیرالدین محمودؒ نے ایک اور بہت بڑے عالم، مولانا افتخار الدین محمد گیلانی سے تمام مذہبی علوم حاصل کئے۔

تحصیل علم کے بعد حضرت سید نصیرالدین محمودؒ نے صحرا نوردی اختیار کی۔ اس وقت آپؒ کی عمر پچیس سال تھی۔ حضرت سید نصیرالدین محمودؒ ایک درویش کے ساتھ مسلسل آٹھ سال تک مختلف جنگلوں اور علاقوں میں گھومتے رہے۔ اس دوران آپؒ پابندی سے نمازیں ادا کرتے اور روزے رکھتے۔ ''سنبھالو'' ایک درخت کا نام ہے جو کثرت کے ساتھ جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ قدرتی طور پر اس کے پتوں میں غذائیت پائی جاتی ہے۔ حضرت سید نصیرالدین محمودؒ ''سنبھالو'' کے پتوں سے روزہ افطار کرتے۔ اس طرح حضرت نصیرالدینؒ کو مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے، علماء و مشائخ سے ملتے ہوئے دس سال اور گزر گئے۔ اب آپؒ کی عمر مبارک 43 سال ہو چکی تھی۔ حضرت نصیرالدین محمودؒ کی یہ صحرا نوردی صرف سکونِ دل کی تلاش میں تھی اور ہزار کوششوں کے باوجود بھی آپؒ کو اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں آپؒ نے کئی صوفیائے کرام سے بھی ملاقاتیں کیں مگر حضرت سید نصیرالدین محمودؒ ان بزرگوں کی خانقاہوں سے بھی غیر مطمئن ہی اُٹھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان بزرگوں کی روحانی صلاحیتوں میں کوئی کمی نہیں تھی۔ جس طرح ایک انسان کی روزی اور موت ایک مخصوص مقام پر مقرر ہوتی ہے، اسی طرح روحانیت میں بھی کسی شخص کا حصہ کسی مخصوص بزرگ کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے۔

اُس زمانے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنی روحانی عظمت کے حوالے سے ہندوستان گیر شہرت رکھتے تھے۔ آخر حضرت سید نصیرالدین محمودؒ نے بھی دہلی کا رخ کیا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ کے دروازے پر پہنچ کر ایک درخت کے سائے میں کھڑے ہو گئے اور دل ہی دل میں کہنے لگے۔

''اگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ واقعی کشفِ باطن رکھتے ہیں تو خود ہی میری طرف متوجہ ہوں گے۔''

حضرت سید نصیرالدین محمودؒ ابھی اپنے ان ہی خیالات میں گم تھے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ خانقاہ کی چھت سے اُتر کے نیچے تشریف لا رہے تھے۔ آپؒ کی نظر سید نصیرالدین محمودؒ پر پڑی جو بہت دیر سے درخت کے سائے میں کھڑے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے چند لمحوں تک انہیں دیکھا اور اپنے حجرۂ مبارک میں چلے گئے۔ پھر اپنے ایک خدمت گار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''وہ صاحب جو درخت کے نیچے کھڑے ہیں، انہیں میرے پاس لے آؤ۔''

حضرت محبوب الٰہیؒ کے خادم کی بات سن کر حضرت سید نصیرالدین محمودؒ کو شدید حیرت ہوئی اور آپؒ کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی قوتِ کشف پر اعتبار آ گیا۔

جب سید نصیرالدین محمودؒ حجرۂ مبارک میں حاضر ہوئے تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''صحرا نوردی تو بہت ہو چکی، کیا اسی طرح جنگل گھوم کر اپنی عمرِ عزیز گزار دیں گے؟ اب یہ بتائیں کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی یہ قوتِ کشف اور اخلاقِ کریمانہ دیکھ کر حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کو خود پر قابو نہیں رہا اور آپؒ بے اختیار بول اُٹھے۔

''میرا مقصدِ حیات اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں حق تعالیٰ کی عبادت کروں اور بزرگوں کی جوتیاں اُٹھاؤں۔''

حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کا جواب سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ فرمایا۔

''طلب سچی ہے۔ اب تمہیں سکون مل جائے گا۔''

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرمالیا۔

حضرت محبوب الٰہی کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنے کے بعد حضرت سید نصیر الدین محمودؒ نے شدید ریاضت و عبادت کی جس کے نتیجے میں آپؒ کو سلسلۂ چشتیہ کی خلافتِ کبریٰ حاصل ہوئی۔ اگرچہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اور بھی خلفاء تھے لیکن خلیفۂ اکبر ہونے کا شرف آپؒ ہی کو حاصل ہے۔ اور حضرت سید نصیر الدین محمودؒ سراپا عشق تھے۔ آپؒ کو اپنے پیر و مرشد، حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بے پناہ محبت تھی۔

ایک بار حضرت مخدوم بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے سلسلے سے تعلق رکھنے والے کچھ درویش حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی زیارت کے لئے ملتان سے دہلی آئے اور کئی دن تک حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی خانقاہ میں مقیم رہے۔ ایک رات سردی کے موسم میں وہ درویش اپنا گرم لباس چھوڑ کر دریائے جمنا کے کنارے وضو کرنے کے لئے گئے پھر جب وہ درویش وضو کر کے جماعت خانے واپس آئے تو ایک درویش کا لباس غائب تھا۔ اس درویش نے جماعت خانے میں ٹھہرے ہوئے دوسرے لوگوں سے اپنے لباس کے بارے میں پوچھا۔ سب لوگوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو ملتان سے آیا ہوا درویش شور مچانے لگا۔

''ہمارے ملتان میں تو ایسا نہیں ہوتا...... یہ کیسا انتظام ہے؟ کیا یہاں چور بھی بستے ہیں؟''

وہ درویش بدزبانی کے ساتھ شور بھی مچا رہا تھا۔ اس کی چیخیں سن کر حضرت سید نصیر الدین محمودؒ اپنے حجرے سے نکل آئے اور اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔

''اس جماعت خانے میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے آنے والے لوگ ٹھہرتے ہیں۔ ان میں کچھ غریب و محتاج بھی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی ضرورت مند سردی سے بچنے کے لئے تمہارا گرم لباس لے گیا ہو۔ ایک درویش کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس بے صبری کا مظاہرہ کرے۔ درویشی تو نام ہی خدمتِ خلق کا ہے۔ تمہیں اپنے لباس کی چوری پر شور مچانے کے بجائے خوش ہونا چاہئے تھا کہ تمہارے گرم کپڑے کسی مجبور کے کام آئے۔''

حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کی عارفانہ نصیحت کا اس درویش پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ شور کرنے لگا۔ اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔ پیر و مرشد کی عبادت میں خلل پڑنے کے خیال سے حضرت سید نصیر الدین محمودؒ نے اپنا نیا گرم لبادہ اُتار کر اس ملتانی درویش کے حوالے کر دیا اور کسی قدر سخت لہجے میں تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''بس اب خاموش ہو جاؤ۔''

دوسرے دن نمازِ فجر کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت نصیر الدین محمودؒ کو اپنے حجرۂ مبارک میں طلب فرمایا۔ جب آپؒ وہاں داخل ہوئے تو وہاں حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے دوسرے خلفاء پہلے سے موجود تھے۔ حضرت شیخ نے حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کو قریب بٹھایا اور اپنا دستِ مبارک ان کے کاندھے پر رکھ دیا پھر نہایت پُرسوز اور محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''سید نصیر الدین! تم نے اس شخص کو درویشی کا مفہوم خوب سمجھایا۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔''
اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنا پیرہن خاص حضرت نصیر الدین محمودؒ کو پہناتے ہوئے فرمایا۔
''یہ تمہاری محبت کا صلہ ہے۔''
مرشد کے احترام اور محبت کی ایک اور عجیب مثال تاریخِ ہندوستان میں نظر آتی ہے جس کا تعلق حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے دوسرے محبوب مرید حضرت امیر خسروؒ سے ہے۔
مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ کا بیان ہے کہ ''حضرت امیر خسروؒ نے شاہی ملازمت کے باوجود چالیس سال تک مسلسل روزے رکھے۔ بے شک! یہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی اعلیٰ مثال ہے۔ مگر خسروؒ اپنے جس وصفِ خاص کے ذریعے پورے برصغیر میں پہچانے جاتے ہیں، وہ ان کا سوزِ عشق ہے۔ اسی سوزِ عشق نے پیر و مرشد کے احترام کے سلسلے میں انہیں انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا تھا۔ ایک بار ایک مفلوک الحال شخص، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہوا۔ محبوبِ الٰہیؒ نے اس کی آمد کا سبب دریافت کیا تو وہ رقت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔
''حضرت! میں ایک مفلس اور نادار انسان ہوں۔ اپنی زندگی تو کسی نہ کسی طرح بسر کر دی مگر جوان لڑکیوں کے بوجھ سے اب یہ ناتواں کاندھے جھکے جاتے ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک لڑکی کی شادی کے وسائل بھی نہیں رکھتا۔ آپ کی غریب نوازی کے بہت قصے سنے ہیں، اس لئے آج حضورِ شیخ اپنا فسانۂ غم سنانے چلا آیا ہوں۔''
حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ایک غریب باپ کی رودادِ الم سنی تو آپؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر آپؒ نے فوراً ہی اس کی دلجوئی کے لئے فرمایا۔
''تم اپنے اللہ کی رحمت پر یقین رکھو اور شام تک میرے پاس بیٹھو۔ آج لوگ جس قدر بھی نذریں پیش کریں گے، میں وہ سب کی سب تمہاری نذر کر دوں گا۔''
محبوبِ الٰہیؒ کی محبت آمیز گفتگو اور اخلاقِ کریمانہ سے وہ شخص بہت متاثر ہوا اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے قریب ہی دست بستہ بیٹھ گیا۔
محبوبِ الٰہیؒ کا درس جاری رہا۔ بے شمار آئے مگر کسی نے کوئی نذر پیش نہیں کی۔ یہ ایک حیرت ناک بات تھی۔ خانقاہ کے خادموں کو آج تک کوئی ایسا دن یاد نہیں تھا جس روز حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے عقیدت مندوں نے بے شمار تحائف بطورِ نذر پیش نہ کئے ہوں مختصر یہ کہ دوپہر سے رات ہو گئی مگر حضورِ شیخ میں کسی نے کوئی نذر نہیں گزاری۔ آخر محبوبِ الٰہیؒ نے اس شخص سے فرمایا۔
''اب تم آرام کرو..... آج تمہاری قسمت میں ایک سفید تنکہ (چاندی کا سکہ) بھی نہیں تھا۔''
حضرت شیخ کا حکم سن کر وہ مہمان اُٹھا اور خانقاہ کے ایک گوشے میں جا کر سو گیا۔ پھر دوسرے دن بھی یہی صورتِ حال پیش آئی اب وہ غریب و نادار انسان مایوسیوں کے اندھیروں میں گم ہونے لگا تھا۔ تیسرے دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔
''آج مجھے یقین ہے کہ اللہ تمہارے لئے کوئی نہ کوئی سبیل پیدا کر دے گا۔''
ضرورت مند مہمان سر جھکائے بیٹھا سوچتا رہا۔ ''یہ کیسے بے تاج بادشاہ ہیں کہ جن کے پاس حاجت مندوں کو دینے کے لئے ایک درہم بھی نہیں ہے۔'' آنے والے کے دل میں وسوسے اور اندیشے پیدا ہو چلے تھے۔

اتفاق سے تیسرے دن بھی کوئی عقیدت مند نذر لے کر نہیں آیا۔ رات کے وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اس شخص سے فرمایا۔

''مہمان! میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں کہ میزبانی کا حق ادا نہ کر سکا۔ اب تم کب تک ٹھہرو گے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے وسیلے سے تمہاری قسمت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تم قبول کرو تو میری ذاتی ملکیت میں یہ شکستہ جوتے ہیں۔''

وہ شخص تین دن کے طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد تھک چکا تھا، اس لئے ناگوار لہجے میں بولا۔

''اگر میرے مقدر میں کچھ نہیں ہے تو پھر مجھے جوتے ہی عنایت کر دیجئے۔''

اگر چہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس کے طنز کو سمجھ گئے تھے لیکن پھر بھی آپؒ نے صوفیاء کے روایتی انکسار کا مظاہرہ کیا اور اپنے نعلین دُور دراز سے آنے والے مہمان کی نذر کر دیئے۔

چوتھے دن صبح وہ شخص حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جوتوں کو کپڑے میں لپیٹ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس طویل سفر میں جو راہگیر بھی اس سے پوچھتا کہ کہاں سے آ رہے ہو؟ تو وہ نہایت تلخی کے ساتھ جواب دیتا۔

''دہلی کے بادشاہ نظام الدین اولیاءؒ کے دربار سے آ رہا ہوں، مجھے انعام میں یہ جوتے ملے ہیں۔''

عام لوگ ان رموز کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ اس شخص کی باتیں سنتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اس طرح کبھی پیدل اور کبھی سواری پر سفر کرتے کرتے کئی دن گزر گئے۔ اس شخص کا معمول تھا کہ دن میں اپنا سفر جاری رکھتا اور رات کو کسی سرائے میں آرام کرتا۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ وہ شخص کسی سرائے میں محوِ خواب تھا۔ اسی دن علاؤالدین خلجی کو ایک جنگی مہم میں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔ امیر خسروؒ بھی بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ نصرت و کامیابی کے اس جشن کو دوبالا کرنے کے لئے حضرت امیر خسروؒ نے علاؤالدین خلجی کی شان میں ایک طویل قصیدہ کہا تھا جس سے متاثر ہو کر فرمانروائے ہند نے دو لاکھ تنکوں کے گراں قدر انعام سے نوازا تھا۔ دشمن کی سرکوبی کرنے کے بعد علاؤالدین خلجی دہلی کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔ حضرت امیر خسروؒ بھی سلطان کے ساتھ تھے اور کئی خچر اس انعام کی رقم کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ شاہی لشکر تیز رفتاری کے ساتھ گزرتا رہا۔ اچانک ایک سرائے کے قریب پہنچ کر خسروؒ نے اپنا گھوڑا روک لیا اور بلند آواز میں فرمانے لگے۔

''بوئے شیخ می آید۔'' (مجھے اپنے شیخ کی بُو آ رہی ہے)

خسروؒ کے دوسرے ساتھی آپؒ کا یہ جملہ سن کر حیران رہ گئے۔

''بوئے شیخ می آید۔''

حضرت امیر خسروؒ نے دوبارہ فرمایا۔ اب آپؒ کے لہجے سے شدید بے قراری کا اظہار ہو رہا تھا۔ تمام فوجی سردار اور لشکری جو امیر خسروؒ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، پریشان نظر آنے لگے۔

''حضرت! ہم ابھی دہلی سے بہت دُور ہیں۔'' ایک فوجی سردار نے جو امیر خسروؒ کا بہت احترام کرتا تھا، مؤدب لہجے میں کہا۔ ''بوئے شیخ کو محسوس کرنے کا یہ کیا مقام ہے؟ محبوبِ الٰہی تو ہم سے بہت فاصلے پر ہیں۔'' فوجی سردار نے اپنے فہم و ادراک کے مطابق امیر خسروؒ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر امیر اپنے ہوش میں نہیں تھے۔ آپؒ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو گئے اور گھبرا کر گھوڑے کی پشت سے نیچے اُتر آئے۔

"بُوئے شیخ می آید۔" خسروؒ کی زبان سے بس یہی الفاظ بار بار ادا ہو رہے تھے۔
"امیر! یہ کیسے ممکن ہے؟" دوسرے فوجی سردار نے آہستہ سے کہا۔
"تمہیں کیا خبر کہ بُوئے شیخ کیا ہے؟" حضرت امیر خسروؒ کی وارفتگی شوق نا قابلِ بیان تھی۔ "اگر بُوئے شیخ اس طرف نہیں آئی تو خسروؒ کی مشام جاں کیوں معطر ہو گئی ہے؟"
"کیا تمہیں اپنے گرد یہ خوشبو محسوس ہو رہی ہے؟" ایک اور فوجی سردار نے امیر خسروؒ کی حالتِ اضطراب سے متاثر ہو کر پوچھا۔
"نہیں۔" امیر خسروؒ نے فرمایا۔ پھر سرائے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر سے آنے والی ہوا میں میرے شیخ کی خوشبو بھی شامل ہے۔" یہ کہہ کر حضرت امیر خسرو سرائے کی طرف بڑھے۔ جب دوسرے فوجی سرداروں اور لشکریوں نے امیر کو بڑھتے دیکھا تو وہ خود بھی پیچھے پیچھے چل دیئے۔ یہ آغازِ شب کی بات تھی۔ سرائے میں ٹھہرنے والے بیشتر مسافر سو چکے تھے مگر سرائے کا مالک جاگ رہا تھا۔ وہ سپاہیوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔
"دروازہ کھولو۔" ایک فوجی سردار نے حکم دیا۔
سرائے کا دروازہ کھلا تو حضرت امیر خسروؒ کی بے تابی کچھ اور بڑھ گئی۔ آپؒ دیوانہ وار سرائے کے اندر چلے گئے۔ چند لمحوں تک امیرؒ پر عجیب سی کیفیت طاری رہی، پھر آپؒ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔
"اس گوشے سے میرے شیخ کے جسم کی خوشبو پھوٹ رہی ہے۔"
یہ کہہ کر حضرت امیر خسروؒ بے اختیار ہو گئے اور آپؒ نے آگے بڑھ کر سونے والوں کو جھنجوڑ ڈالا۔ نیند میں ڈوبا ہوا شخص اچانک بیدار ہوا، اپنے سامنے فوجی سرداروں کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا۔
ابھی کچھ کہنے کے لئے اس کے ہونٹ لرز ہی رہے تھے کہ حضرت امیر خسروؒ بہت نرم اور شیریں لہجے میں بولے۔ "بھائی! مجھے معاف کرنا کہ میں نے تمہاری نیند میں خلل ڈالا۔ میں اپنے دل سے مجبور تھا۔"
خسروؒ کا یہ عاجزانہ طرزِ گفتگو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"کیا تمہارا تعلق سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ہے؟" حضرت امیر خسروؒ کا اضطراب لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔
"ہاں! میرے پاس دہلی کے بادشاہ کا دیا ہوا ایک عظیم تحفہ ہے۔" مسافر کی سمجھ میں ساری صورتحال آ چکی تھی، اس لئے وہ قدرے ناگوار اور تمسخر آمیز لہجے میں بول رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی لڑکیوں کی شادی اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے مدد طلبی کا تمام واقعہ سنا دیا۔ اس کے بعد شدید طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔ "دہلی کے شاہ نے میری مشکل کشائی کے لئے اپنے جوتے دیئے ہیں۔"
یہ کہہ کر مسافر نے قریب رکھی ہوئی کپڑوں کی اس گٹھڑی کو کھول دیا جس میں محبوبِ الٰہیؒ کے نعلین بندھے ہوئے تھے۔
پیر و مرشد کے جوتے دیکھتے ہی حضرت امیر خسروؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؒ نے فوجی سرداروں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔
"میں نہ کہتا تھا کہ اس مقام سے مجھے اپنے شیخ کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ تو وہ خوشبو ہے جسے میں ہزاروں خوشبوؤں کے ہجوم میں محسوس کر لوں گا۔"

اتنا کہہ کر امیر خسروؒ اس مسافر سے گویا ہوئے۔

''کیا تم یہ نعلین مبارک میرے ہاتھوں فروخت کرنا پسند کرو گے؟''

عجیب سوال تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو مسافر کے ہوش وحواس ہی جاتے رہے۔ اس کے ذہن کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی ان شکستہ جوتوں کا بھی خریدار ہوسکتا ہے۔ وہ بدستور اپنے خیالات میں گم تھا کہ حضرت امیر خسروؒ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ امیرؒ اُس غریب الوطن مسافر سے پوچھ رہے تھے:

''تم ان جوتوں کی کیا قیمت لو گے؟''

حضرت امیر خسروؒ کے دوبارہ دریافت کرنے پر وہ شخص تصورات کی دنیا سے نکل آیا تھا۔

''میرے ساتھ ایک مذاق وہ تھا کہ میں نے اپنی ضرورت بیان کی تو نعلین میرے سپرد کر دیئے گئے۔ اور دوسرا مذاق یہ ہے کہ تم مجھ سے ان جوتوں کی قیمت پوچھ رہے ہو۔ کیا یہ بھی اذیت رسانی کا کوئی طریقہ ہے؟'' مسافر نہایت دل گرفتہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''اگر میرے افلاس کا علاج نہیں کر سکتے تو کم سے کم ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجھے کوئی آزار بھی نہ پہنچاؤ۔''

''معاذ اللہ! انسان تو کجا، میں کسی جانور کو بھی اذیت پہنچانے کا تصور نہیں کر سکتا۔'' حضرت امیر خسروؒ کا لہجہ مزید عاجزانہ ہو گیا تھا۔ ''اے شخص! میں پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ تُو یہ نعلین میرے ہاتھ فروخت کر دے۔''

حضرت امیر خسروؒ کے لہجے کی متانت دیکھ کر مسافر کو بھی کسی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ اس کا مخاطب مذاق نہیں کر رہا ہے۔ تاہم اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''پھر تم ہی بتاؤ، کیا قیمت دو گے؟''

''میرے پاس اس وقت صرف دو لاکھ تنکے ہیں۔'' حضرت امیر خسروؒ کے لہجے سے کچھ ایسے تاثرات ظاہر ہو رہے تھے، جیسے آپؒ کو اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہو۔ ''اگر میں اس سے زیادہ کی استطاعت رکھتا تو وہ بھی تمہاری نذر کر دیتا۔ فی الوقت یہی قبول کر کے مجھ پر احسانِ عظیم کر دو۔'' حضرت امیر خسروؒ نہایت وارفتگی کے عالم میں بول رہے تھے۔ مگر وہ شخص ذہنی طور پر اتنا منتشر ہو چکا تھا کہ کچھ دیر کے لئے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو چکی تھی۔

پھر بڑی مشکل سے امیر خسروؒ نے اسے یقین دلایا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس میں جھوٹ یا دل لگی کا شائبہ تک نہیں اور جب مسافر کو حضرت امیر خسروؒ کی باتوں پر اعتبار آ گیا تو اس نے سوال کیا۔

''وہ دولت کہاں ہے؟ اور تم کب اسے میرے حوالے کرو گے؟'' مسافر کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ حیرت واستعجاب میں ڈوبا ہوا تھا۔

''سب کچھ یہیں موجود ہے۔'' حضرت امیر خسروؒ نے اسے جواباً فرمایا۔ ''دولت سے لدے ہوئے خچر باہر کھڑے ہیں، وہ بھی تمہاری ملکیت ہیں۔''

مسافر بدحواسی کے عالم میں اُٹھا اور سرائے سے باہر آ کر اس نے وہی ناقابلِ یقین منظر دیکھا جس طرف حضرت امیر خسروؒ نے اشارہ کیا تھا۔

''میں دولت کے اس انبار کو کس طرح اپنے گھر تک لے جاؤں گا؟'' فرطِ حیرت ومسرت سے مسافر کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔ ''راستے کے قزاق مجھے اپنی منزل تک کیسے پہنچنے دیں گے؟''

''دو سپاہی تمہارے ساتھ کر دیئے جائیں گے۔'' حضرت امیر خسروؒ نے اس شخص کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس سلسلے میں ذرا بھی فکر مند نہیں ہونا چاہیئے۔ بس تم وہ نعلین میرے حوالے کر دو اور گھر پہنچ کر اپنی لڑکیوں کی شادی کے انتظامات کرو۔ اللہ عجیب عجیب انداز سے اپنے بندوں کی دستگیری کرتا ہے۔''

اب وہ شخص نہایت مسرور و مطمئن نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جوتے حضرت امیر خسروؒ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''جب تم دہلی پہنچو تو شاہ کو میرا سلام عرض کر دینا کہ غلام بہت شرمندہ ہے۔ ضرورت اور مجبوری نے اس کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ ہم جیسے گدا اُن کی بخشش کے انداز کو نہیں سمجھ سکتے۔'' یہ کہہ کر وہ شخص رونے لگا۔

''تم شیخ کی بارگاہ میں میرے لئے معافی بھی طلب کرنا۔ شدتِ جذبات میں مجھے اپنی زبان پر قابو نہیں رہا تھا۔ میں نے راستے بھر شاہ کی عنایات کا مذاق اُڑایا ہے۔''

اللہ جنہیں دل کی شہنشاہی عطا کرتا ہے، وہ ان معمولی باتوں پر توجہ نہیں کرتے۔'' حضرت امیر خسروؒ نے مسافر کی دلجوئی کے لئے تسکین آمیز کلمات ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے شیخ کے اخلاقِ کریمانہ کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔''

یہ کہہ کر امیر خسروؒ نے دستار کھولی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے نعلین اس میں لپیٹے اور دستار کو دوبارہ اپنے سر پر باندھ لیا۔ پھر اسی حالت میں دہلی پہنچ کر پیر و مرشد کے روبرو حاضر ہوئے۔

حضرت امیر خسروؒ کو دیکھتے ہی محبوبِ الٰہیؒ نے فرمایا۔

''خسروؒ! ہمارے لئے کیا لائے ہو؟''

''ایک غلام اپنے شاہ کو کیا نذر پیش کر سکتا ہے؟'' یہ کہتے کہتے امیر خسروؒ آبدیدہ ہو گئے۔

''آخر بادشاہ کے ہمراہ دہلی سے باہر گئے تھے، تمہیں کچھ نہ کچھ تو لانا چاہیئے تھا۔'' اگرچہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنے کشف کے ذریعے سب کچھ جانتے تھے لیکن دوسرے مریدوں کے سامنے حضرت امیر خسروؒ کی بے مثال محبت کا ثبوت پیش کرنے کے لئے اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہے تھے۔

''شاہا! تیرے ہی قدموں کی نشانی اپنے سر پر سجا کر لایا ہوں۔'' امیر خسروؒ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو کچھ اور تیز ہو گئے تھے۔

''وہ نشانی کتنے میں خریدی؟'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے متبسم ہو کر فرمایا۔

''دو لاکھ تنکے میں۔'' حضرت امیر خسروؒ نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔ (مغل شہزادے داراشکوہ نے اپنی مشہور تصنیف ''سفینۃ الاولیاء'' میں پانچ لاکھ روپے کی رقم تحریر کی ہے)

''خسروؒ! بسیار ارزاں خریدی۔ (بہت سستے داموں خرید لی)'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے جاں نثار مرید کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

''آقا! غلام عاجز تھا۔ اگر با اختیار ہوتا تو حکومتِ ہند دے کر بھی اپنے شیخ کی اس نشانی کو خرید لیتا۔''

حضرت امیر خسروؒ کی گردن جھکی ہوئی تھی اور پوری خانقاہ پر سناٹا طاری تھا۔ حاضرینِ مجلس سر بگریباں تھے کہ یہ کیسا عشق ہے، یہ کیسی ارادت ہے؟

اسی سوزِ عشق کے باعث حضرت نظام الدین اولیاءؒ برسرِ مجلس فرمایا کرتے تھے۔

''خسروؒ! میں سب سے تنگ آجاتا ہوں، یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی۔ مگر تجھ سے نہیں۔''

پیر و مرشد کی زندگی میں احترامِ شیخ کا یہ حال تھا اور جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ دنیا سے رخصت ہوئے تو امیر خسروؒ کے دل پر قیامت گزر گئی۔ اس وقت آپؒ شہنشاہ کے ساتھ بنگال میں تھے۔ جیسے ہی امیر خسروؒ کو یہ اندوہناک خبر ملی، آپؒ نے شاہی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ گریبان چاک کیا اور زار و قطار روتے ہوئے دہلی پہنچے۔ سیاہ ماتمی لباس پہنا اور جب نظر محبوبِ الٰہیؒ کی قبرِ مبارک پر پڑی تو دیوانوں کی طرح چیخ کر کہا۔

''کیسی عجیب بات ہے کہ آفتاب زیرِ خاک سو گیا اور خسرو زندہ ہے۔'' یہ کہہ کر پیر و مرشد کی قبر سے سر ٹکرانے لگے۔ یہاں تک کہ سر سے خون جاری ہو گیا اور پھر امیر خسروؒ بے ہوش ہو گئے۔ چھ ماہ تک یہی کیفیت رہی۔ نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ لباس کا۔ دن رات روتے رہتے تھے۔ اکثر نصف شب کو گریہ و زاری کرتے کہ سننے والوں کو ترس آنے لگتا۔ ایک دن محبوبِ الٰہیؒ کی قبرِ مبارک سے لپٹ کر با آوازِ بلند یہ دوہا پڑھا:

گوری سوئے سیج پر ، مکھ پر ڈارے کیس!
چل خسرو گھر اپنے ، سانجھ بھئی چوندیس

پھر ایک ایسی آہِ سرد کھینچی کہ لوگ گھبرا گئے۔ خانقاہ کے منتظمین گھبرا گئے۔ دیکھا تو خسروؒ کا سر قبر پر رکھا ہوا تھا اور روح پرواز کر چکی تھی۔

''اگر ہم تاریخِ عالم کا مطالعہ کریں تو پوری دنیا میں محبت کی ایسی چند مثالیں ہی مل سکیں گی۔ یہ امیر خسروؒ کی ناقابلِ بیان محبت ہی تھی، جس کے سبب حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے وصال کے وقت فرمایا تھا:

''اگر کوئی میری قبر پر آنا چاہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ پہلے خسروؒ کے مزار پر حاضری دے۔''

سات سو سال سے یہی رسم جاری ہے کہ بزرگانِ دین سے لے کر عوام تک جو بھی فاتحہ خوانی کے لئے جاتا ہے، وہ پہلے حضرت امیر خسروؒ کی قبر پر جاتا ہے اور پھر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بارگاہِ جلال میں نذرِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

مشہور مؤرخ قاسم فرشتہ، حضرت امیر خسروؒ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''خاکِ ہند نے خسروؒ جیسا انسان آج تک نہیں دیکھا۔''

اور یہ ہمہ صفت انسان بھی حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے غلاموں میں شامل تھا۔

پھر حضرت امیر خسروؒ کا یہی اندازِ غلامی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو اس قدر پسند آیا کہ اکثر دوسرے مریدوں کی موجودگی میں فرمایا کرتے تھے:

''خسروؒ! میں کبھی کبھی اپنے آپ سے بیزار ہو جاتا ہوں مگر تجھ سے کسی بھی حالت میں بیزار نہیں ہوتا۔''

مریدوں اور خدمت گاروں نے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ نصف شب کے سناٹے میں کبھی کبھی ان الفاظ میں دعا کیا کرتے تھے:

''اے اللہ! مجھے اس سوز کے صدقے میں بخش دے جو خسروؒ کے سینے میں پوشیدہ ہے۔''

ہم حضرت امیر خسروؒ کے عشقِ جہاں سوز کی مثال مندرجہ بالا سطور میں پیش کر چکے ہیں، اسی سوز نے حضرت امیر خسروؒ کو پیر و مرشد کی نظر میں ایک منفرد مقام عطا کر رکھا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا معمول تھا کہ جب آپؒ نمازِ عشاء کے بعد اپنے خصوصی اوراد و وظائف کے لئے حجرۂ مبارک میں تشریف لے جاتے تو پھر کسی خادم یا مرید کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ خود کسی کو طلب نہ کریں۔ مگر حضرت

امیر خسروؒ کو اجازت تھی کہ وہ کسی بھی وقت پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہو سکتے تھے۔ اسی وجہ سے اگر کسی مرید کو کسی معاملے میں یہ شک ہو جاتا کہ پیر و مرشد اس کی بات نہیں مانیں گے تو وہ حضرت امیر خسروؒ سے سفارش کراتا تھا۔ ایک واقعہ کے سوا حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت امیر خسروؒ کی سفارش کو نہیں ٹالا۔ اس تاریخ ساز واقعے کا ذکر ہم اپنے گزشتہ مضامین میں کر چکے ہیں، جب علاؤ الدین خلجی نے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے حضرت امیر خسروؒ کی سفارش کا سہارا لیا تھا۔ بس اسی ایک موقع پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ناگوار لہجے میں فرمایا تھا۔

"خسرو! ہم سے بے جا ضد نہ کیا کرو۔"

حالانکہ سید نصیر الدین محمودؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفۂ اکبر تھے مگر ایک دن آپؒ کو بھی حضرت امیر خسروؒ کی سفارش کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ حضرت سید نصیر الدین محمودؒ، پیر و مرشد سے اجازت لے کر اپنی بڑی بہن سے ملنے کے لئے اودھ تشریف لے جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کے روحانی کمالات کی شہرت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ اس لئے اودھ کے قیام کے دوران آپؒ کی بہن کے مکان پر ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا تھا۔ حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کی ذاتِ گرامی سے بے اختیار کرامات ظاہر ہو جاتی تھیں اور آپؒ کی دعاؤں سے اکثر بگڑے ہوئے کام بن جاتے تھے۔ اس لئے آپؒ کی آمد کی خبر سن کر خلقتِ خدا اُمڈ آتی تھی۔ مگر حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کسی قسم کی نمود و نمائش کو پسند نہیں فرماتے تھے اور نہ آپؒ کی یہ عادت تھی کہ کسی حاجت مند کو خالی ہاتھ لوٹا دیتے۔ آخر اس کشمکش کا ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا کہ حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کو یکسوئی کے ساتھ ذکرِ الٰہی کی فرصت نہ ملتی اور اپنی طبیعت پر ایک اذیت ناک بوجھ محسوس کرنے لگتے آپؒ نے کئی بار سوچا کہ مخلوقِ خدا سے دامن چھڑا کر کسی جنگل میں چلے جائیں اور دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہو کر اپنے خالق کو یاد کریں۔ مگر ہر بار آپؒ کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ حکم یاد آ جاتا۔

"اے سید زادے! انسانوں کے ہجوم سے گھبرا کر جنگل کی طرف نہ بھاگ۔ اللہ تجھے ویرانوں اور بیابانوں میں نہیں، اپنی مخلوق کے اژدھام میں نظر آئے گا۔"

علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو، خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

پھر یوں ہوتا کہ حضرت نصیر الدین محمودؒ کو پیر و مرشد کا قولِ مبارک یاد آ جاتا اور آپؒ ترکِ دنیا کا ارادہ ترک کر دیتے۔ مگر طبیعت کی گرانی کسی طرح دُور نہ ہوتی۔ آخر ایک دن آپؒ نے حضرت امیر خسروؒ سے کہا۔

"پیر و مرشد کی بارگاہ میں میری سفارش کرو کہ مخلوقِ خدا کے ہجوم سے بچنے کے لئے مجھے کسی صحرا میں عبادت کی اجازت دی جائے۔"

حضرت امیر خسروؒ نے آپؒ کی اس خواہش کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حضور پیش کر دیا۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے جواباً امیر خسروؒ سے فرمایا۔

"نصیر الدین محمودؒ سے کہو کہ اسے آدم زادوں کے ہجوم میں رہ کر اہلِ دنیا کی جفائیں برداشت کرنی ہوں گی۔ یہی روشنی ہے اور اسی میں فقیر کی نجات ہے۔"

اس کے بعد نظام الدین اولیاءؒ نے سید نصیر الدین محمودؒ کو خلوت میں طلب فرما کر خدمتِ خلق کی اس طرح

تشریح کی کہ پھر کبھی آپؒ کے دل میں صحرا نشینی کا جذبہ بیدار نہیں ہوا۔

حضرت نصیرالدین محمودؒ کے زہد و تقویٰ کا یہ حال تھا کہ آپؒ پیرانِ چشت کی مقبول رسم ''سماع'' سے کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ بعض کم نظر حضرات نے آپؒ کی اس روش کو بنیاد بنا کر مشائخ چشت پر شدید اعتراضات کئے ہیں مگر ان کا یہ عمل درست نہیں ہے۔ یہاں تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں مگر پھر بھی ''سماع'' کے لئے اتنا عرض ہے کہ چند صوفیائے کرام نے آئندہ خرابی کے پیش نظر ''سماع'' سے گریز اختیار کیا اور کچھ درویشوں نے انتہائی احتیاط اور سخت قوانین کے ساتھ ''سماع'' سنا۔ حضرت نصیرالدین محمودؒ بھی ان ہی بزرگوں میں سے تھے جو ''سماع'' کی مجلسوں سے دُور دُور رہتے تھے۔ ایک روز کسی صاحبِ سلسلہ دوست کے یہاں مجلسِ سماع منعقد ہوئی۔ حضرت نصیرالدین محمودؒ بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ پھر جیسے ہی مزامیر (سازوں) کے ساتھ سماع شروع ہوا، آپؒ محفل سے اُٹھ کر جانے لگے۔ اس پر آپؒ کے کچھ دوستوں نے بیٹھ جانے کا اصرار کیا مگر حضرت نصیرالدین محمودؒ یہ جواب دیتے ہوئے رخصت ہونے لگے۔

''میں یہاں ہرگز نہیں ٹھہروں گا۔ تم لوگوں کا یہ عمل سنتِ رسول ﷺ کے خلاف ہے۔''

واضح رہے کہ حضرت نصیرالدین محمودؒ ''سماع'' سے رغبت رکھتے تھے مگر آپ کی محفل میں سازوں کے استعمال کی اجازت نہیں تھی۔

دوستوں نے بڑی حیرت کے ساتھ کہا۔

''کیا بزرگوں کی رسم ترک کر دی ہے اور ''سماع'' سے منکر ہو گئے ہیں؟''

حضرت نصیرالدین محمودؒ چند لمحوں کے لئے خاموش کھڑے رہے، پھر فرمایا۔

''یہ کوئی دلیل نہیں کہ اگر بزرگ بعض مکروہات میں گرفتار ہو جائیں تو آنے والی نسلیں بھی ان کی رسم کو زندہ رکھیں۔ مجھے تو کتاب و سنت سے دلیل چاہئے۔'' یہ کہہ کر حضرت نصیرالدین محمودؒ اس محفلِ سماع سے باہر تشریف لے گئے۔

یہ ایک بڑا واقعہ تھا جسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بعض ہوش مند مریدوں نے نظر انداز کر دیا۔ مگر کچھ مرید جو حضرت نصیرالدین محمودؒ کی روحانی عظمتوں سے حسد رکھتے تھے، اس نازک موقع پر خاموش نہ رہ سکے اور دوسرے دن ہی ایک شخص نے برسرِ مجلس حضرت محبوب الٰہیؒ کے حضور صاف صاف عرض کر دیا۔

''سیدی! نصیرالدین نے بارگاہِ چشتیہ سے فیض حاصل کیا اور اب وہ پیروانِ چشت کی رسمِ سماع سے انکار کر رہے ہیں۔''

مرید کو یقین تھا کہ نصیرالدین محمودؒ کی اس روش کے بارے میں سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ برہم ہو جائیں گے لیکن اس وقت تمام اہلِ خانقاہ حیران رہ گئے جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے کسی ناگواری کے بغیر ایک خاص تاثر کے ساتھ فرمایا۔

''بے شک! نصیرالدین محمودؒ کا تقویٰ بہت بڑھا ہوا ہے۔''

عام خیال یہی تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، امیر خسروؒ کو خلافتِ کبریٰ سے سرفراز کریں گے مگر یہ محض قیاس آرائی تھی۔ ذاتی محبت دیگر شے ہے اور امانت کی منتقلی امرِ دیگر۔ سلسلۂ چشتیہ کی امانت اس کے حقیقی وارث ہی کو منتقل کی جا سکتی تھی اور وہ حقیقی وارث، حضرت سید نصیرالدین محمودؒ کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ (واضح رہے کہ ہر بزرگ کے کئی خلفاء بیک وقت تعلیماتِ روحانی کے فروغ میں مشغول رہتے ہیں مگر خلافتِ کبریٰ کا حق دار صرف ایک ہی

مرید ہوتا ہے)

اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی تربیتِ خاص نے سید نصیر الدین محمودؒ کے سینے میں معرفت کی جو آگ روشن کی تھی، اس آگ کے شعلوں کو کثرتِ ریاضت نے اتنی ہوا دی کہ آتشِ عشق میں دنیا پرستی کا جذبہ خاک ہو کر رہ گیا۔

چنانچہ محبوبِ الٰہیؒ کے وصال کے بعد آپؒ "چراغِ دہلی" کے خطاب سے نوازے گئے۔ حضرت مخدوم سید جلال الدین جہانیاں جہاں گشتؒ فرماتے ہیں:

"ایک روز مکہ معظمہ میں حضرت شیخ عبداللہ یافعیؒ نے ہزاروں لوگوں کے درمیان با آواز بلند کہا۔

"دہلی کے تمام شیخ رخصت ہوئے اب صرف شیخ نصیر الدین محمودؒ باقی رہ گئے ہیں جو دہلی کے چراغ ہیں۔"

اس کے بعد آپؒ اسی لقب سے مشہور ہوئے۔ یہاں تک کہ بیشتر عقیدت مندوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپؒ کا اسمِ گرامی سید نصیر الدینؒ ہے۔ وہ بھارت کے ہندو ہوں یا مسلمان، تمام لوگ آپؒ کو "چراغِ دہلی" کے نام سے جانتے ہیں۔ جدید ہندوستان میں آپؒ کے مزار کے اطراف کے سارے علاقے کو "چراغِ دہلی" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

تنگ نظر اور ظاہر پرست لوگ جو درویشی کی قبا پہنے ہوئے تھے، حضرت نصیر الدین محمودؒ کی ہر دل عزیزی سے حسد کرنے لگے۔ ایک بار حضرت چراغِ دہلیؒ کو ایک ایسے شعر پر وجد آ گیا، جس میں خدا سے اس کے قہر و غضب کا شکوہ کیا گیا تھا۔ مولانا مغیث اپنے عہد کے مشہور شاعر تھے، انہوں نے ایک رسالہ تحریر کیا اور حضرت چراغ دہلیؒ کی مجلسوں کی تفصیلات رقم کرتے ہوئے لکھا کہ نصیر الدین محمودؒ کو ایک ایسے شعر پر وجد آیا ہے جس میں خداوند تعالیٰ کے جور و ستم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایسے اشعار سننے والوں پر کفر لازم آتا ہے۔ غرض مولانا مغیث نے اسی قسم کے کچھ اور واقعات قلم بند کر کے وہ رسالہ مولانا معین الدین عمرانی کے پاس بھیج دیا۔ مولانا عمرانی، حضرت نصیر الدین محمودؒ کے عقیدت مند تھے اور آپؒ کے روحانی کمالات کو دل سے تسلیم کرتے تھے۔ مولانا عمرانی نے وہ رسالہ کسی شخص کے ذریعے حضرت چراغِ دہلیؒ کی خدمت میں ارسال کر دیا۔ حضرت نصیر الدین محمودؒ نے اس رسالے کا مطالعہ کیا اور پھر مولانا عمرانی کو طلب فرما کر دستارِ خلافت عطا کی اور مولانا مغیث کی لکھی ہوئی کتاب واپس کر دی۔

دوسرے روز پھر مجلسِ سماع آراستہ تھی۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو اس رباعی پر وجد آ گیا۔

(ترجمہ) "کل رات میں ایک آتش پرست کے ڈھول کی آواز پر بے باک ہو گیا اور اس قدر بلند ہوا کہ آسمانوں تک پہنچ گیا۔ پھر یہ ہوا کہ ایک ساغرِ شراب کے بدلے میں نے سو بار اپنی توجہ کے عمامے کو سر سے اُتار کر زمین پر مار دیا۔"

ان اشعار میں اتنا گداز تھا کہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ بے قرار ہو گئے اور اسی اضطراب کے عالم میں آپؒ خانقاہ کی چھت پر تشریف لے گئے۔ پھر اپنے ایک خادمِ خاص کے ذریعے مولانا مغیث کو بلا کر فرمایا۔

"مولانا! اپنے رسالے میں ان اشعار کے متعلق بھی لکھئے اور ساری دنیا کو بتایئے کہ ان کے ساتھ کفر اور جہل پوشیدہ ہے۔"

مولانا مغیث نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے ہیبت و جلال سے خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد حضرت چراغِ دہلیؒ نے اپنے خادمِ خاص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''مولانا کو خانقاہ کے باہر کر دو کہ پھر کبھی یہاں تشریف نہ لائیں۔''

مولانا مغیث سر جھکائے چلے گئے اور تین چار دن بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ مولانا مغیث ایک تندرست اور توانا انسان تھے اور خانقاہِ شیخ میں حاضری سے پہلے بظاہر انہیں کوئی مرض لاحق نہیں تھا۔

واضح رہے کہ حضرت شیخ نصیرالدین محمودؒ سماع سنتے تھے۔ مگر قاضی عبدالمقتدر تھانیسری کے بقول آپؒ کی محفل میں کسی بھی قسم کے ساز کا گزر نہیں تھا۔ مزامیر کی آمیزش کے بغیر آپؒ کو عارفانہ کلام سے رغبت تھی۔ قاضی عبدالمقتدر کہتے ہیں کہ ایک روز یہ شعر سن کر حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

نظر دردیدہا ناقص فسادے ست
وگرنہ یار ما از کس نہاں نیست

(ناقص آنکھوں کی بینائی فساد برپا کر دیتی ہے ورنہ میرا دوست تو کسی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں ہے)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے تمام خلفاء اور مرید حضرت چراغِ دہلیؒ کی ذاتِ گرامی پر فخر کرتے تھے۔ ''سیّد العارفین'' کے مصنف حامد بن فضل اللہ جمالی ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں کہ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ نے اپنے شیخ کی اتباع میں تمام عمر شادی نہیں کی اور آپؒ اپنے روحانی کمالات کے اعتبار سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مانند تھے

ایک دن حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے دوسرے خلیفہ مولانا برہان الدین غریبؒ کو ایک ٹوپی عنایت فرمائی۔ کچھ عرصے بعد مولانا کی غفلت سے وہ عطیہ، شیخ سے کہیں گم ہو گیا۔ برہان الدین غریبؒ اس واقعے سے بہت پریشان تھے۔

اتفاقاً مولانا کے مکان پر حضرت نصیرالدین محمودؒ بھی تشریف لے گئے تھے اور نمازِ عصر میں مشغول تھے۔ مولانا برہان الدین غریبؒ جب چراغ دہلیؒ کے کمرے میں پہنچے تو اس وقت آپؒ پر حالتِ استغراق طاری تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضرت نصیرالدین محمودؒ نے اپنے بھائی کی اس افسردہ حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مولانا! یہ آزردگی کیوں؟ آخر وہ کون سا غم ہے جس نے آپ کو شکستہ بنا دیا ہے؟''

حضرت برہان الدین غریبؒ نے ٹوپی کے کھو جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

''سیّد! میں اپنی کوتاہی پر روتا ہوں۔ اگر پیر و مرشد مجھ سے دریافت کریں گے کہ تُو نے ہمارا عطیہ کہاں گم کر دیا تو میں کیا جواب دوں گا؟ میں اس وقت سے ڈرتا ہوں، وہ مجھ عاجز و ناکارہ کے لئے بڑا جاں گداز وقت ہو گا۔''

حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ نے کچھ دیر تک غور کرنے کے بعد فرمایا۔

''مولانا! آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ حضرت شیخ آپ کو اس سے بہتر تبرک عطا کریں گے اور وہ گم شدہ ٹوپی بھی مل جائے گی۔''

مولانا برہان الدین غریبؒ بہت خوش ہوئے اور اس لمحے کا انتظار کرنے لگے جب حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ عملی شکل اختیار کر لیں گے۔ پھر دوسرے دن ہی مولانا کی تمنا بر آئی۔ جیسے ہی برہان الدین غریبؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؒ نے پیر و مرشد کے چہرے پر کسی ناگواری کا عکس نہیں دیکھا۔ یہ بات مولانا کے لئے باعث اطمینان تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مجلسِ درس جاری رہی۔ یہاں تک کہ جب یہ محفلِ عرفان اپنے اختتام کو پہنچی تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنا وہ خاص

مصلّٰی مولانا برہان الدین غریبؒ کو عطا فرمایا، جس پر حضرت شیخ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ مولانا سرشاری کے عالم میں اپنے گھر واپس آئے۔ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کے الفاظ ایک زندہ حقیقت کی شکل اختیار کر چکے تھے، مگر اس وقت برہان الدین غریبؒ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب آپؒ نے نماز پڑھنے کے لئے مصلّٰی بچھایا تو اس میں وہ گم شدہ ٹوپی بھی موجود تھی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے تمام مریدوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مستقبل قریب میں حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ ہی حضرت محبوب الٰہیؒ کے وارثِ اوّل قرار پائیں گے۔

سیّد امیر خوردؒ کے بقول، حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ فرماتے تھے کہ ابتدائی زمانے میں ایک بار میرا نفس مزاحمت کرنے لگا۔ جس سے میں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے شیطانی حربے سے نجات پانے کے لئے لیموں کا پانی اس قدر پیا کہ ہلاکت کے قریب ہو گیا۔ اُس وقت میرے دل میں ایک ہی خیال آتا تھا کہ نفس کے مزاحم ہونے سے بہتر مر جانا ہے۔

اس مختصر سے واقعے میں اہلِ دنیا کے لئے بظاہر کوئی غیر معمولی بات نہیں مگر اہلِ دل خوب جانتے ہیں کہ نفس کی سرکشی پر قابو پانا ہی سب سے بڑی ریاضت ہے۔ اُردو کے ایک مشہور شاعر ابراہیم ذوق کے بقول۔

نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا ، نفسِ امارہ کو گر مارا

اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے انتہائی لطیف اور اثر انگیز پیرائے میں ظاہر کیا ہے ۔

جو میں سر بہ سجدہ کبھی ہوا تو حرم سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا ، تجھے کیا ملے گا نماز میں

حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ بھی انسانی نفس کی سرکشی سے پوری طرح باخبر تھے اور آپؒ نے اس پر قابو پانے کے لئے انتہائی اقدام کیا تھا۔ ایسا اقدام جو اہلِ اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ دراصل یہی وہ مجاہدہ تھا جس نے حضرت نصیرالدین محمودؒ کو اولیائے ہند میں بلند مقام تک پہنچا دیا تھا۔

سیّد امیر خوردؒ کی بیان کردہ دوسری روایت کے مطابق حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بار میں نے مجاہدے کی انتہا پر پہنچنے کے لئے دس روز تک کچھ نہیں کھایا۔ پھر جب یہ خبر سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ تک پہنچی تو آپؒ نے مجھے طلب کیا اور خواجہ اقبالؒ کو حکم دیا کہ ایک بڑی روٹی لائی جائے۔ خواجہ اقبالؒ بڑی سی روٹی کے ساتھ حلوہ لے کر آئے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''نصیرالدین محمودؒ! اسے کھا لو۔''

پیر و مرشد کے الفاظ سن کر میں حیران ہوا اور حضورِ شیخ میں عرض کرنے لگا۔ ''سیّدی! میں یہ پوری روٹی کس طرح کھاؤں گا؟ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ شاید میں اسے چند روز میں ختم کر سکوں۔''

اس واقعہ سے اہلِ نظر کو اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ شکم پروری سے کتنے دُور تھے۔

سیّد امیر خوردؒ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت نصیرالدین محمود چراغ دہلیؒ کی مجلس سے وہی خوشبو آیا کرتی تھی جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس سے آتی تھی۔

سیّد امیر خوردؒ کا یہ بیان ایک ہی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ، حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی روحانی تصویر بن گئے تھے اور آپ کی شخصیت کے آئینے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جمالِ ذات کا عکس واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا اور یہی ایک مرید کی اطاعت و فرماں برداری کا ثبوت ہے کہ

وہ مرشد کی صفات کا نقشِ ثانی بن کر رہ جائے۔

سیّد امیر خوردؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں اپنے بھائیوں سیّد عمادالدین، امیر صالحؒ اور سیّد نورالدین مبارکؒ کے ساتھ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کی خدمت میں جا رہا تھا۔ جاڑوں کا زمانہ تھا۔ راستے میں میرے ایک بھائی نے کہا کہ اگر حضرت چراغِ دہلیؒ صاحبِ کرامت ہیں تو ہمارے سامنے شیرینی پیش کریں گے جب ہم حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس بادشاہِ دین کی قدم بوسی سے شرف یاب ہوئے تو حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ نے اپنے ایک خادم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے لئے شربت لاؤ۔ شربت کے پیالے ہم سب کو دیئے جا چکے تو ہمارے دل میں خیال گزرا کہ یہ تو پینے کی چیز ہے۔ اور ہم نے کھانے کی چیز کی خواہش کی تھی۔ ابھی ہم یہ بات سوچ ہی رہے تھے کہ حضرت چراغِ دہلیؒ نے اپنے خادم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''کوئی دوسری مٹھائی لاؤ۔''

ہم نے گھبرا کے عرض کیا۔ ''ابھی تو شربت پیا ہے۔ وہ بھی تو شیرینی میں شامل ہے۔''

حضرت نصیرالدین محمودؒ نے جواباً فرمایا۔ ''نہیں، دونوں میں فرق ہے۔ وہ پینے کی چیز ہے اور یہ کھانے کی چیز ہے۔''

حضرت چراغِ دہلیؒ کا جواب سن کر ہم تینوں بھائی حیران رہ گئے۔ اس واقعہ کے بعد ہمیں پھر کبھی حضرت سید نصیرالدین محمودؒ کی روشن ضمیری پر شک نہیں ہوا۔ حالانکہ ان کی ذاتِ اظہارِ کشف و کرامات سے بالاتر تھی۔

سیّد امیر خوردؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خواجہ عزیز الدین کی زبانی روایت سنی۔ خواجہ موصوف، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے رشتے دار تھے۔ آپؒ ایک دن حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کی خدمت میں حاضر تھے کہ چراغِ دہلیؒ نے اپنے خادم کو طلب کر کے اسے کاغذ اور قلم دوات لانے کو کہا۔ پھر جب وہ خدمت گار مطلوبہ چیزیں لے آیا تو حضرت شیخؒ نے کاغذ پر کچھ تحریر کیا اور حضرت خواجہ عزیز الدینؒ کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا۔

''جب تم حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے روضۂ مبارک پر جاؤ تو اس کاغذ کو پیر و مرشد کے قدموں میں رکھ دینا۔''

حضرت خواجہ عزیز الدینؒ کہتے ہیں کہ جب حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ نے وہ کاغذ میرے ہاتھ میں دیا تو میں نے سوچا کہ مجلس سے اُٹھ کر اس تحریر کو پڑھوں گا کہ آخر حضرت چراغِ دہلیؒ نے کیا لکھا ہے۔ پھر میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کے حکم کے مطابق کاغذ کو محبوبِ الٰہیؒ کے قدموں میں رکھوں گا، اس کے بعد پڑھوں گا۔ یہ سوچ کر خواجہ عزیز الدینؒ مجلس سے اُٹھ گئے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے روضۂ مبارک میں داخل ہوئے اور حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے قدموں میں اس کاغذ کو رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد بے چین ہو کر کاغذ کھولا تو اس پر کسی حرف کا عکس بھی باقی نہیں تھا۔ خواجہ عزیز الدینؒ سخت حیران ہوئے۔ یہ واقعہ سناتے ہوئے وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کو لکھتے دیکھا تھا مگر جب کاغذ کھول کر دیکھا گیا تو کاغذ پر سیاہی کا نشان تک نہ تھا۔ خواجہ عزیز الدینؒ اس بات کی توجیہہ پیش نہ کر سکے۔

سیّد امیر خوردؒ اپنی کتاب ''سیر الاولیاء'' میں اس واقعہ کی تفصیلات قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب خدا کا کوئی دوست چاہتا ہے کہ وہ ان حالات کو جو اسرارِ الٰہی ہوتے ہیں، اپنے دوسرے دوست کی خدمت میں پیش کرے تو وہ دوست بھی نہیں چاہتا کہ ان اسرارِ الٰہی سے کوئی دوسرا واقف ہو یہی صورتِ حال خواجہ عزیز الدینؒ کے ساتھ پیش آئی تھی۔ اور حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کی تحریر کا راز جاننا چاہتے تھے۔ مگر خدا کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اس

کے دو دوستوں کا راز کسی تیسرے شخص پر فاش ہو نتیجتاً وہ حروف مٹا دیئے گئے جو کاغذ پر تحریر کئے گئے تھے۔

خواجہ خیر الدین کافورؒ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے خوش عقیدہ مریدوں میں سے تھے اور درویشوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ خواجہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب میں نے عزیزوں کی خدمت کے لئے کمر ہمت باندھی تو یہ طے کر لیا کہ اس کام میں ہمہ وقت مستعد رہنے کے لئے اپنی کمر سے پٹکا (رومال) باندھوں گا جیسا کہ مخدوم نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر جب میں اس ارادے سے حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قدم بوسی کے بعد ایک گوشے میں بیٹھ گیا تو مجھے اسی رومال کا خیال آنے لگا۔ اسی دوران حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے اپنے خادم سے فرمایا۔

''جو رومال زین الدین نے مجھے نذر کیا ہے، وہ لے کر آؤ۔'' (زین الدینؒ، حضرت چراغِ دہلیؒ کے حقیقی بھانجے تھے)

خادم رومال لے کر آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کشیدہ کاری کیا ہوا ہے حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے رومال مجھے دے دیا۔ اظہار کے بغیر میری خواہش کی تکمیل ہو چکی تھی۔ اسی روز سے میں آج تک رومال کو اپنے ہاتھ پر باندھتا ہوں۔

ان ہی خواجہ عزیز الدین کافورؒ سے روایت ہے کہ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے ایک مرید خواجہ قوام الدینؒ تھے جو کسی وجہ سے حکومت کے معتوب قرار پائے تھے۔ جرمانہ عائد کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں ملازمت سے برطرف بھی کر دیا گیا تھا۔ اپنی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے خواجہ قوام الدین فرماتے تھے کہ میں ان دنوں بڑی مصیبت میں گرفتار تھا۔ وہ عزیز، جن سے مجھے بہت محبت تھی، اس کڑے وقت میں گریزاں نظر آتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ جب میں ان سے گفتگو کرتا تو وہ جواب دینے کے بجائے میری طرف سے منہ پھیر لیتے اقتصادی حالات سے پریشان ہو کر میں نے ضروریاتِ زندگی کا سامان بازار میں بیچنا شروع کر دیا۔ مگر خریداروں کا یہ عالم تھا کہ کوئی میری جانب رُخ بھی نہ کرتا تھا۔ پھر میں اس کشاکش سے گھبرا کر حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہوا۔ میرا خیال تھا کہ میں حضرت شیخ سے اس گردشِ وقت کا ذکر کروں گا تاکہ آپ کی دعاؤں کے طفیل مجھے اذیت و کرب کی اس زندگی سے نجات مل سکے۔

آخر میں منتشر ذہن اور بے قرار دل کے ساتھ حضرت چراغِ دہلیؒ کے روبرو حاضر ہوا اور اس مردِ خدا کے سامنے باادب ہو کر بیٹھ گیا جس کی دعاؤں سے بے شمار حاجت مندوں کو فراغت و آسودگی میسر آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے سامنے عرضِ حال کرتا، آپؒ نے خود ہی میری جانب توجہ فرمائی اور فارسی کی یہ رباعی پڑھی جو میری موجودہ کیفیات کے عین مطابق تھی۔

''جس قدر دنیا تیرا مقدر تھی، وہ تجھے مل چکی..... اس پر قناعت کر اور شور و غل سے اپنی زبان کو محفوظ رکھ۔ اگر تجھے اس وقت کم رزق مل رہا ہے تو مطمئن ہو جا کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہے۔ جو چیزیں کھائی نہیں جاتیں، ان کا فروخت نہ کرنا ہی اچھا ہے..... اور جو لوگ تجھ سے بات نہیں کرتے تو ان کی خاموشی تیرے حق میں گفتگو سے کہیں بہتر ہے۔''

خواجہ قوام الدینؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے ارشادات سن کر حیران رہ گیا۔ آپؒ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والا ہر لفظ میرے حالات کا عکاس تھا۔ حضرت شیخ نے مجھے اس طرح صبر و ضبط کی تلقین فرمائی کہ اہلِ مجلس کو خبر تک نہ ہوئی اور میں اپنے تھکے ہوئے جسم میں توانائی کی ایک نئی لہر محسوس کرنے لگا۔

سیّد امیر خوردؒ اپنی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب میرا لڑکا سیّد محمود، شکمِ مادر میں تھا، اُس وقت میری بیوی نے نیت کی تھی کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام شیخ نصیر الدین محمودؒ سے رکھواؤں گی اور آپؒ کے استعمال شدہ کپڑوں سے اس بچے کا پیرہن بنا کر اسے پہناؤں گی۔ اور پھر اسے شیخ کے قدموں میں ڈالوں گی تا کہ خداوند ذوالجلال اُس پر اپنی برکتیں نازل فرمائے۔

الغرض جب سیّد محمود کی ولادت قریب آئی تو میں حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ اس وقت قیلولہ فرما رہے تھے۔ جب بیدار ہوئے تو حضرت شیخ کو میری آمد کی اطلاع دی گئی۔ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے مجھے اپنے حجرۂ مبارک میں طلب فرمایا اور حسبِ سابق میری تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے۔ (واضح رہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے نسبتِ خاص کے سبب حضرت چراغ دہلیؒ، سیّد امیر خوردؒ کا بہت احترام کرتے تھے۔ اور اُن کی یہ تعظیم پیر و مرشد کے حوالے سے تھی) پھر جب میں چراغِ دہلیؒ کے روبرو دست بستہ ہو کر بیٹھ گیا تو آپؒ نے فرمایا۔

''سیّد! تمہارے کتنے فرزند ہیں؟''

میں یہ سوال سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر قدم بوسی کی مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے کچھ دیر بعد مجھ سے وہی سوال کیا۔ ''سیّد! تمہارے کتنے بیٹے ہیں؟''

میں نے عرض کیا۔ ''شیخ! آج میں اسی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔'' اس کے بعد میں نے سارا واقعہ تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔ ''میرے فرزند بہت چھوٹی عمر میں وفات پا جاتے ہیں۔ اسی لئے میری شریکِ حیات نے نذر مانی ہے۔'' میں نے نذر کی وضاحت نہیں کی۔

حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ بہت انہماک اور محبت سے میری باتیں سنتے رہے۔ پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''تم تھوڑی دیر بیٹھو تا کہ میں زوال کے بعد کی نماز ادا کر لوں۔''

میں باہر آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے مجھے دوبارہ حجرۂ مبارک میں طلب فرمایا۔ میں نے دیکھا کہ آپ ایک مصلّے پر بیٹھے ہوئے ہیں اور دوسرا مصلّٰی آپؒ کے زانوئے مبارک پر رکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ چند گز کپڑا بھی موجود تھا۔

حضرت شیخ نے اپنے دستِ مبارک سے مجھے مصلّٰی عنایت فرماتے ہوئے کہا۔ ''اسے رکھ لو...... یہ تمہارے کام آئے گا۔'' پھر وہ کپڑا میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ ''اس سے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا پیرہن بنانا۔''

حضرت شیخ کے اس ارشادِ گرامی سے مجھے شدید حیرت ہوئی۔ ابھی تک میری کوئی اولاد، عالمِ ظاہری میں موجود نہیں تھی اور حضرت چراغِ دہلیؒ سب سے چھوٹے فرزند کی بات کر رہے تھے۔ میں نے خاموشی سے وہ کپڑا لے لیا اور حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے رُخِ تابناک کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے عرض کیا۔

''شیخ! آپ ہی بچے کا نام تجویز فرمائیے۔''

حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تمہارا خاندانی نام کیا ہے؟''

میں نے جواباً عرض کیا۔ ''سیّد محمد ہے۔''

حضرت چراغِ دہلیؒ نے دوبارہ فرمایا۔ ''تمہارے چھوٹے بھائیوں کے نام کیا ہیں؟''

میں نے عرض کیا۔ ''سیّد لقمان اور سیّد داؤد۔''

حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے سکوت اختیار کیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آپ کچھ سوچ رہے ہوں۔ الغرض ایک مختصر سے وقفۂ سکوت کے بعد حضرت شیخ نے فرمایا۔

''آنے والے بچے کا نام محمود رکھو۔ خدا اس پر اپنی رحمتیں نازل کرے گا۔''

جیسے ہی حضرت چراغِ دہلیؒ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ تائید غیبی کے سبب ہو رہا ہے۔

میں نے اور میری بیوی نے جو کچھ دل میں سوچا تھا، حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے اسی کے مطابق میرے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ بعد میں خادم سے معلوم ہوا کہ آپؒ نے میرے بچے کے پیرہن کے لئے جو کپڑا عنایت کیا تھا، وہ حضرت شیخ کی دستار سے لیا گیا تھا۔

یہ مردِ روشن ضمیر بھی جس نے اپنے نورِ معرفت سے بے شمار دلوں کی کثافت دُور کی، دُنیا پرستوں کی سازشوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ زمانے کی قدیم روایات کے مطابق اہلِ اقتدار ایک بوریا نشین فقیر کی عظمت اور محبوبیت سے حسد کرنے لگے۔ جس طرح حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی آمرانِ وقت کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی، اسی طرح حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ بھی اہلِ حسد کی شرارتوں کا ہدف بنے۔ آپؒ کی مقبولیت کا وہی انداز تھا کہ دہلی کے بے تاج بادشاہ کہلاتے تھے۔ سلطان محمد تغلق، حضرت شیخ کی اس ہر دلعزیزی کو برداشت نہ کر سکا اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی طرح خواہش کرنے لگا کہ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ اور دیگر اولیائے کرام بھی دنیا داروں کی طرح اس کے دربار میں حاضر ہوں۔ یہ ایک خیالِ خام تھا جو سلطان محمد تغلق کے ذہن میں پرورش پاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اس آرزو کی تکمیل کے لئے بہت زیادہ بے چین نظر آنے لگا۔

اسی دوران سلطان محمد تغلق کے درباری امراء، عمر سمرقندی اور علی قندھاری نے فرمانروائے ہند کو ورغلایا اور حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کی طرف سے اس کی خفگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آخر ایک دن سلطان محمد تغلق نے نہایت عیاری کے ساتھ ایک منصوبہ ترتیب دیا جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کی دل آزاری کی جائے اور ان کے زہد و تقویٰ کو داغ دار بنا دیا جائے۔

غرض اپنے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سلطان نے حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کی دعوت کا نام کھانا سونے کے برتنوں میں رکھوایا۔ محمد تغلق کی تراشی ہوئی سازش یہ تھی کہ اگر حضرت شیخ نے ان برتنوں میں کھانا کھایا تو شریعت کی آڑ لے کر آپؒ کی گرفت کرے گا۔ کیونکہ سونے کے برتنوں میں کھانا اسلامی شریعت کے مطابق جائز نہیں۔ اور اگر سیّد نصیر الدین محمودؒ نے اس طرح کھانے سے انکار کر دیا تو ان پر سلطان کی توہین کا الزام عائد کر کے سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

آخر سیّد نصیر الدین محمودؒ اس طرح قصرِ شاہی میں داخل ہوئے کہ قدم قدم پر آپؒ کے خلاف سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ اس ناسازگار وقت میں خداوندِ ذوالجلال نے حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کی دستگیری فرمائی اور الہام کے ذریعے آپؒ کو ایک آمر کی سازشوں سے باخبر فرمایا۔ پھر جب کھانا شروع ہوا تو حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے سونے کے برتنوں میں تھوڑا سا کھانا نکال کر ہتھیلی پر رکھا اور تناول کر لیا۔

سلطان محمد تغلق اور دوسرے سازشی امراء کے لئے یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ اُن کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا اور وہ سرِ دربار بہت زیادہ شرمندہ نظر آ رہے تھے۔

مؤرخ قاسم فرشتہ نے اپنی یادگار تصنیف ''تذکرہ مشائخ کرام'' میں ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ سلطان محمد تغلق اپنے بے پناہ ظلم و تشدد کے سبب ''خونی'' مشہور تھا۔ اس نے درویشوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک ظالم و جابر آقا اپنے غلاموں سے کرتا ہے۔ اس نے بہت سے درویشوں کو شاہی خدمت پر مامور کر رکھا تھا۔ کسی درویش کو یہ خدمت سونپی گئی تھی کہ وہ پان بنا کر کھلائے، کسی فقیر کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ سلطان کو پانی پلائے اور کسی بزرگ کو یہ کام سونپا گیا تھا کہ وہ فرمانروائے ہند کے دستار باندھے۔ غرض کہ درویشوں کی اس جماعت کے لئے وہی کام منتخب کئے گئے تھے جو دوسرے خدمت گار انجام دیتے تھے۔ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کو پوشاک پہنانے کی زحمت دی گئی تھی۔ دوسرے درویشوں نے انتہائی جبر کے عالم میں سلطان محمد تغلق کی خدمت گزاری کے اس منصب کو قبول کر لیا تھا۔ پھر جب شاہی ملازموں نے حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ سے کہا تو آپؒ نے اس تحقیر آمیز ذمے داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

سلطان محمد تغلق جیسے کینہ پرور اور خود پرست حکمران کے لئے ایک درویش کا انکار قیامت سے کم نہ تھا۔ جیسے ہی اس کے خدام نے حضرت نصیرالدین محمودؒ کے بارے میں یہ خبر دی کہ آپ اطاعت شاہی سے گریزاں ہیں تو وہ چراغ پا ہو گیا اور اس نے انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں چراغِ دہلیؒ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ غالباً یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا، جب سلطان محمد تغلق، سندھ کی بغاوت کو کچلنے کے لئے ٹھٹھہ پہنچا تھا۔ اسی سفر میں حضرت سید نصیرالدین محمودؒ بھی فرمانروائے ہند کے ہمراہ تھے اور اسی دوران اس نے آپ کو پوشاک پہنانے کی خدمت پر مامور کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر جب ایک مردِ خدا پرست نے ایک آمر کے حکم کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تو اقتدار کی تمام تر رعونت بیدار ہو گئی اور سلطان محمد تغلق نے اس شخص کی گرفتاری کا حکم دے دیا جو روحانی نسب کے اعتبار سے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا وارث و جانشین تھا۔

زنداں میں حضرت سید نصیرالدین محمودؒ کو سخت ایذائیں دی گئیں مگر آپؒ نے سلطان سے کوئی رعایت طلب نہیں کی۔ بس بار بار یہی فرماتے رہے:

''درویشی ایک شہنشاہ کے سوا کسی شہنشاہ کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس سے کہہ دو کہ زنداں کے اندھیرے بڑھا دے اور فقیر کے لاغر جسم پر دنیا کے سارے تشدد عام کر دے۔''

سلطان محمد تغلق نے ایک درویش کے بے نیازانہ لہجے کی گونج سنی اور تشدد میں مزید اضافہ کر دیا۔ حضرت سید نصیرالدین محمودؒ نے شاہ کے نئے مظالم کا بھی ایک شاداب مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا۔

ایک روایت کے مطابق اسی دوران قید خانے کی تاریک فضا میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا جس نے صورتِ حال کو یکسر بدل ڈالا۔ حضرت چراغِ دہلیؒ کو محسوس ہوا، جیسے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا پیکرِ نورانی آپؒ کی نظروں کے سامنے ہے اور محبوب الٰہیؒ فرما رہے ہیں۔ ''نصیرالدین! راہِ عشق میں رسوائی سے ڈرتا ہے؟ یہ تو اہلِ معرفت کا لباس ہے۔ اس لباس کو دریدہ نہ کر، زنداں کے اندھیروں سے نکل اور مخلوقِ خدا کے ہجوم میں آ کہ تیری وجہ سے بے شمار بندگانِ خدا کو نجات ملے گی۔'' اس کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ کا نورانی پیکر، حضرت چراغِ دہلیؒ کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

بعض روایات کے مطابق یہ ایک خواب تھا جس میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے خلیفۂ اکبر کو ہدایت کی تھی۔ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ بہت دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں بیٹھے رہے۔ پھر جب سلطان محمد تغلق کا خدمت گار آیا تو حضرت سید نصیرالدین محمودؒ نے اس سے کہہ دیا کہ آپ بادشاہ کا حکم ماننے کے لئے تیار ہیں۔

یہ خیال بڑی عجیب خبر تھی۔ جس نے سنی، حیران رہ گیا۔ سلطان محمد تغلق کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ اس کے خیال میں ایک درویش نے سلطانی جاہ و جلال کے سامنے اپنی گردن خم کر دی تھی۔

حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کے اقرار کو سلطان محمد تغلق نے اپنی بہت بڑی فتح سے تعبیر کیا تھا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد وہ کچھ اور بھی متکبر نظر آنے لگا تھا۔

حضرت سید نصیر الدین محمودؒ نے پہلی بار نہایت خوش اسلوبی سے سلطان کو لباس پہنایا۔ اس وقت سلطان محمد تغلق کے ہونٹوں پر بڑی استہزائیہ مسکراہٹ تھی اور اپنی جابرانہ ادا کے ساتھ ایک درویش کی مجبوریوں کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ مگر اُسے آسمانوں کے فیصلوں کی خبر نہ تھی۔

سید نصیر الدین محمودؒ نے جس روز ایک آمر کے حکم کی تکمیل کی، اسی دن سلطان محمد تغلق بیمار پڑ گیا۔ اور پھر اپنے ریشمی بستر پر اس طرح دراز ہوا کہ دوبارہ نہ اُٹھ سکا۔ شاہی طبیبوں نے بہترین دوائیں تجویز کیں لیکن فرشتۂ اجل کے دراز ہاتھوں نے اُس کی داستانِ حیات پر سیاہی پھیر دی اور دفترِ زندگی کے ایک ایک ورق کو ہوا میں اُڑا دیا۔ مصنوعی اور عارضی اقتدار کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اب وہ تختِ شاہی کے بجائے تختِ مرگ پر لیٹا ہوا تھا اور قبر کے لامحدود اندھیرے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جنہیں خدا نے ذوقِ سماعت بخشا ہے، ان کے کان اس صدائے غیب کو سن رہے تھے۔

''کیا تُو اپنے رب کے پاس لوٹ کر نہیں آئے گا؟''

جب سلطان محمد تغلق کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا، اس وقت حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کو حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا یہ ارشادِ گرامی یاد آیا۔

''مخلوقِ خدا کے ہجوم میں آ کہ تیری وجہ سے بے شمار بندگان کو نجات ملے گی۔''

خدا کی بستی ایک ظالم و جابر شہنشاہ کے وجود سے پاک ہوئی تو حضرت سید نصیر الدین محمودؒ نے اپنے خالق کا شکر ادا کیا اور سلطان تغلق کی موت پر افسوس کرتے ہوئے فرمایا۔

''جاہل و نادان تھا کہ اپنی حقیقت کو نہ پہچانا۔''

پھر یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی، اکثر لوگوں نے بے اختیار کہا کہ سلطان محمد تغلق کی موت حضرت چراغ دہلیؒ کی دل آزاریوں کے سبب ہوئی ہے۔ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے لوگوں کے اس تبصرے کو ناپسندیدہ قرار دیا اور انتہائی سخت لہجے میں فرمایا۔

''حیات و موت، خدا کا اٹل قانون ہے۔ اس میں کسی کی دل آزاری سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ سلطان محمد تغلق کو موت آنی تھی، سو آ گئی۔ بہت ممکن ہے کہ خدا نے ظلم و تشدد کے سبب اس کی عمر کم کر دی ہو۔ مگر یہ فریبِ نگاہ ہے کہ نصیر الدین کی دل آزاری کے باعث سلطان کی موت واقع ہو گئی۔ خبردار! کسی گمراہی میں مبتلا نہ ہونا۔''

اپنی ذات کے اسی محاسبے نے حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کو سیدھے راستے سے بھٹکنے نہیں دیا۔ آپؒ ایک ایک قدم پر اپنے نفس کی گرفت کرتے اور بار بار فرماتے۔

''اے دنیا! میں تیرے فریب میں نہیں آؤں گا۔ اے زمانے! میرے لئے دامِ ہوس نہ پھیلا کہ میں تیرا اسیر نہیں ہو سکتا۔''

تاریخی حقائق کی روشنی میں حکومت کے لئے ایک باغی سردار طغی نے سلطان محمد تغلق کو بہت پریشان کیا تھا۔ اس کی سرکوبی کے لئے فرمانروائے ہند گونڈل پہنچا اور اسی مقام پر بیمار پڑ گیا۔ سلطان کو تیز بخار آیا جس نے

طوالت اختیار کی۔ مجبوراً محمد تغلق کو کچھ عرصے کے لئے گونڈل میں قیام کرنا پڑا۔ یہیں اس نے بعض علماء، مشائخ اور امرائے سلطنت کو ان کے اہل و عیال کے ساتھ اپنی خدمت میں طلب کیا۔ اس سفر میں حضرت نصیرالدین محمودؒ بھی دوسرے لوگوں کے ہمراہ تھے۔

آخر جب سلطان کے مرض میں کچھ افاقہ ہوا تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ ٹھٹھہ کی طرف بڑھا۔ محمد تغلق نے دیپالپور، ملتان، اوچ اور سیوستان سے کشتیاں منگوائیں اور گونڈل ہوتا ہوا دریا کے کنارے پہنچا۔

یہیں اس نے خیمے نصب کئے۔ اسی دوران امیر فرغن نے سلطان کی مدد کے لئے پانچ ہزار مغل سپاہیوں کا لشکر بھیجا۔ محمد تغلق نے خوش ہو کر اپنے امراء اور سپاہیوں پر الطاف و کرم کی بارش کی۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کے چند معتبر اور وفادار لوگوں کو سومرہ کے پاس بھیجا۔ یہ وہی شخص تھا، جس نے طغی کو پناہ دی تھی۔

ابھی سلطان نے پینتیس کوس کا فاصلہ طے کیا تھا کہ عاشورہ کا دن آ گیا۔ بادشاہ کا معمول تھا کہ وہ ہر سال اس تاریخ کو روزہ رکھتا تھا۔ کمزوری اور نقاہت کے باوجود محمد تغلق نے روزہ رکھنے کی رسم ترک نہیں کی۔ افطار سے پہلے اس نے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ تازہ مچھلی تیار کی جائے۔

شاہی طبیب بھی اس بات سے بے خبر تھے کہ ایسی فضا میں بادشاہ کے لئے مچھلی کھانا انتہائی مضر ہے۔ جب افطار کا وقت آیا تو سلطان محمد تغلق نے خوب سیر ہو کر مچھلی کھائی۔ بدقسمتی سے یہ دریائی غذا اُسے راس نہ آئی۔ مچھلی کھانے کے کچھ دیر بعد ہی بخار کا پرانا مرض پھر لوٹ آیا۔ محمد تغلق نے وہ رات بڑی بے چینی میں بسر کی۔ بخار کی شدت سے اس کا جسم جل رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی سلطان نے دوبارہ سفر کا آغاز کیا۔ اس موقع پر شاہی طبیب بہت زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے ڈرتے ڈرتے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ اس حالت میں یہ سفر انتہائی خطرناک شکل اختیار کر سکتا ہے۔ مگر سلطان محمد تغلق نے اپنی ضدی اور سرکش طبیعت کی وجہ سے شاہی طبیبوں کی رائے کو جھٹلا دیا۔ یہ اس کا مزاج تھا کہ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا تھا تو پوری مستعدی اور گرم جوشی کے ساتھ اس پر قائم رہتا تھا۔ شاید عام حالات میں سلطان اپنے مشیروں کی بات مان لیتا مگر اس وقت سیاسی فضا سازگار نہیں تھی۔ وہ جلد از جلد باغی سردار طغی کی شورشوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسی باعث محمد تغلق نے اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ کشتی میں سوار ہو کر منزلیں طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب ٹھٹھہ چودہ کوس کے فاصلے پر رہ گیا تو سلطان کی ہمت جواب دے گئی۔ بخار سے اس کا پورا جسم تپنے لگا تھا اور چہرے سے وحشت نمایاں ہو چلی تھی۔ مجبوراً سلطان ٹھہر گیا۔ شاہی طبیبوں نے بہت کوشش کی لیکن بخار کی شدت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور پھر 21 محرم 752ء کو غیاث الدین تغلق کا وارث انتہائی نامرادی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

جب سلطان محمد تغلق کی میت کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا، اس وقت کچھ لوگوں نے حضرت سید نصیرالدین محمودؒ سے عرض کی۔

''شیخ! یہ بادشاہ آپ کو اس قدر تکلیفیں کیوں دیا کرتا تھا؟''

جواب میں حضرت چراغِ دہلیؒ نے فرمایا۔

''میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک معاملہ تھا اور اسی معاملے کی بنیاد پر محمد تغلق دنیا سے اٹھا لیا گیا۔''

سلطان محمد تغلق کی موت کے بعد فیروز شاہ تغلق سریر آرائے سلطنت ہوا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ فیروز شاہ، سلطان محمد تغلق کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ مرحوم سلطان کا آخری سانس تک وفادار رہا۔ بیماری کے زمانے میں فیروز

شاہ نے محمد تغلق کی اس قدر تیمارداری کی کہ فرمانروائے ہند اُس کا گرویدہ ہو گیا اور اس نے علالت کے دوران ہی فیروز شاہ کی جانشینی کا اعلان کر دیا۔ محمد تغلق کی وفات کے فوراً بعد ہی فوج میں انتشار پھیل گیا۔ کچھ سیاسی مسائل محمد تغلق کی زندگی ہی میں اُلجھ گئے تھے، اس لئے فیروز شاہ کے اقتدار کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس موقع پر حضرت سید نصیرالدین محمودؒ نے اسے ایک خط تحریر فرمایا۔

''آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ اللہ کے بندوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ ان کے آرام وسکون کے لئے بہتر اسباب مہیا کئے جائیں گے اور ہمیشہ عدل وانصاف سے کام لیا جائے گا۔ اگر آپ دنیا پرست بادشاہوں کی طرح اپنے فرائض انجام نہ دے سکے تو میں آسمان سے دوسرا فرمانروا طلب کر لوں گا۔''

یہ بڑا عجیب خط تھا جو ایک درویشِ بے سروسامان کی طرف سے ہندوستان کے بااختیار شہنشاہ کو تحریر کیا گیا تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کچھ دیر تک سناٹے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ آج اس پر یہ حقیقت ظاہر ہو گئی تھی کہ اس کا اقتدارِ ظاہری ان لوگوں پر اثر انداز نہیں ہوتا جو اپنی جانیں خدا کی بارگاہ میں فروخت کر چکے ہیں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق ایک درویش کی تحریر کی اس حرارت کو برداشت نہ کر سکا اور اس کے اقتدار کا بت آہستہ آہستہ پگھلنے لگا۔ یہاں تک کہ طاقت وجبروت کا سخت پتھر، پانی میں تبدیل ہو گیا۔

پھر اس نے حضرت چراغِ دہلیؒ کو بڑے عاجزانہ لہجے میں ایک خط تحریر کیا۔

''میں آپ کے حکم پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کروں گا۔ آپ میرے حق میں دعا فرمائیں کہ میں اپنی زندگی کے اس امتحان سے بہ عافیت گزر جاؤں۔''

حضرت سید نصیرالدین محمودؒ نے سلطان فیروز شاہ تغلق کے خط کا کوئی تحریری جواب نہیں یا بلکہ اُنتالیس خرمے روانہ کئے اور ہدایت دی کہ انہیں ایک ہی وقت میں کھا لے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے حضرت سید نصیرالدین محمودؒ کے اس عطیے کو تمام امراء کی موجودگی میں اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر حضرت چراغِ دہلیؒ کی ہدایت کے مطابق تمام خرمے کھا لئے۔ تاریخِ ہند گواہ ہے کہ سلطان فیروز شاہ تغلق نے اُنتالیس سال چند ماہ تک نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ حضرت سید نصیرالدین محمودؒ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والے چند مبہم الفاظ اور اشارات نے عالمِ اسباب میں اس طرح عملی شکل اختیار کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ یہ فراستِ مومن کی ایک روشن دلیل ہے۔ خدا اپنے ایک گوشہ نشین بندے کو چشم تصور سے صدیوں کے سینے میں چھپے ہوئے وہ اسرار دکھا دیتا ہے جنہیں سائنس کے طاقت ور آلات بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اہلِ دنیا اور اہلِ ایمان کے بیچ ایک نمایاں فرق ہے اگر ہم اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

اس کے بعد سلطان فیروز شاہ ٹھٹھہ سے روانہ ہو کر ملتان میں داخل ہوا۔ جہاں کچھ سیاسی مسائل کو حل کرنے کے بعد سلطان اجودھن (پاک پتن) روانہ ہوا۔ وہ دہلی پہنچنے سے پہلے حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہونا چاہتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق، آفتابِ چشتیہ کی ضیاء باریوں سے فیض یاب ہوا اور اس نے حضرت بابا فریدؒ کے قدموں میں دست بستہ کھڑے ہو کر اپنی سلامتی کے لئے دعائیں مانگیں۔

پھر وہ اجودھن سے روانہ ہو کر قصبہ سرستی میں مقیم ہوا۔ یہ جگہ شہر دہلی سے تقریباً بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ سلطان کی آمد کی خبر سن کر اس قصبے کے تمام صراف اور بقال جمع ہوئے اور انہوں نے کئی لاکھ تنکے بطور اطاعت گزاری فیروز شاہ کی خدمت میں پیش کئے۔ بگڑے ہوئے سیاسی حالات کی اصلاح ہوتی جا رہی تھی اور سلطان فیروز شاہ کا اقتدار مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔

اس موقع پر حضرت سید نصیر الدین محمودؒ نے سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
''ٹھٹھہ سے لے کر اس مقام تک دعا گو نے خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں سلطان کی عافیت کے لئے دعا کی اور اس ذاتِ کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمام لوگ خیریت کے ساتھ پہنچ گئے۔ اب ملک کا باقی حصہ حضرت شیخ قطب الدین منورؒ کی ولایت میں داخل ہے۔ سلطان جو کچھ مناسب سمجھیں، حضرت شیخ کو تحریر کر دیں۔''

حضرت قطب الدین منورؒ، حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کے پوتے تھے۔ آپؒ کا شمار حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلفائے کبار میں ہوتا ہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے فوراً ہی حضرت شیخ قطب الدین منورؒ کو خط لکھا اور اس بات کی وضاحت پیش کر دی کہ حضرت سید نصیر الدین محمودؒ نے اب مجھے آپ کے حوالے کیا ہے۔

حضرت شیخ قطب الدین منورؒ نے جواباً تحریر فرمایا۔
''یہ حضرت سید نصیر الدین محمودؒ کی بے مثال محبت ہے کہ انہوں نے سلطان کو مجھ ضعیف کے حوالے کر دیا۔ اب میں اپنے اللہ کے فضل و کرم پر یقین رکھتا ہوں کہ دہلی بھی مکمل طور پر آپ کے قبضے میں آ جائے گی۔''

حضرت سید نصیر الدین محمودؒ نے حضرت قطب الدین منورؒ کے بارے میں یہ بات اس لئے کہی تھی کہ سلطان فیروز شاہ تغلق اور دوسرے اہلِ دربار کو حضرت شیخ کے مقامِ روحانی سے آگاہی حاصل ہو جائے اور جاہ و حشم کے مالک اس راز کو سمجھ لیں کہ خدا نے ایک گوشہ نشیں بزرگ کی دعاؤں میں کس قدر تاثیر پیدا فرمائی ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہئے کہ ان دونوں بزرگوں میں انتہائی محبت اور یگانگت تھی اور وہ ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے۔

سلطان فیروز شاہ، حضرت قطب الدین منورؒ کا خط پڑھ کر نہایت مسرور و مطمئن ہوا اور شیخ کی بشارت کے ظہور پذیر ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جب فیروز شاہ تغلق کو دہلی پر بھی مکمل غلبہ حاصل ہو گیا تو اسے یقین آ گیا کہ وہ مردانِ جلیل کی دعاؤں کے زیر اثر ہے۔

حضرت سیّد نصیر الدین چراغِ دہلیؒ کا یہ معمول تھا کہ آپؒ نمازِ عصر سے فارغ ہونے کے بعد اپنے حجرۂ خاص کے اندر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اس موقع پر خادموں کو حکم تھا کہ اگر کوئی شخص آپ سے ملاقات کے لئے آئے تو اسے ایک تنکہ (سکّہ) دے کر رخصت کر دو۔ اگر نہ مانے تو اسے دو تنکوں سے پچاس تنکوں تک دے کر لوٹا دو۔ اگر پھر بھی نہ مانے تو اسے آپؒ کے پاس بھیج دیا جائے۔ ایک روز ایک ملنگ، حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ سے ملنے کے لئے آیا۔ خادموں نے بہت کوشش کی کہ اسے کچھ دے کر رخصت کر دیا جائے، مگر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوا اور چیخ چیخ کر کہتا رہا۔

''میں شیخ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ان کے پاس جانے دو۔''

خدمت گار اُس کی تیز آواز سے ڈر گئے۔ حضرت نصیر الدین محمودؒ کا بھی یہی حکم تھا کہ جب کوئی ملاقات زیادہ اصرار کرے تو اسے حجرۂ خاص میں بھیج دیا جائے۔ یقیناً اس کی ضرورت بہت شدید ہو گی۔ خانقاہ کے خدام نے اسی خیال کے پیشِ نظر ملنگ کو اندر جانے دیا۔

اس وقت حضرت چراغِ دہلیؒ اپنے کسی وِرد میں مشغول تھے۔ ملنگ وحشیانہ انداز میں زمین پر پاؤں مارتا ہوا اندر داخل ہوا تو حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے انہماک میں خلل پڑ گیا۔ آپؒ نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک پریشان حال شخص سامنے کھڑا تھا اور پاگلوں کی طرح کہہ رہا تھا۔

''شیخ! میری جھولی بھی بھر دے۔''

حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ نے اُسے اشارے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ کچھ دیر صبر کر لے۔ جیسے ہی وِرد ختم ہو گا تو اپنے ہاتھ سے اسے مطلوبہ چیز فراہم کر دیں گے۔

ملنگ نے حضرت چراغِ دہلیؒ کے اشارے کو سمجھنے کے بجائے اپنے تہ بند سے ایک چھری نکالی اور حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کے جسم پر پے در پے کئی وار کئے۔ اگرچہ چھری کے زخم بہت کاری تھے۔ لیکن چراغِ دہلیؒ اس تشدد کے دوران ایک بار بھی نہیں چیخے۔ نہایت صبر و سکون سے زخم کھاتے رہے۔ یہاں تک کہ ملنگ کو اپنے کام کے مکمل ہو جانے کا یقین ہو گیا اور وہ حجرے کا دروازہ کھول کر باہر کی جانب بھاگا۔

خدمت گاروں نے اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر کو حیرت سے دیکھا اور ملنگ نے بھاگنے کی کوشش کی تو کسی سنگین خطرے کا احساس کرتے ہوئے خانقاہ کے منتظمین اور دیگر عقیدت مندوں نے خنجر بکف ملنگ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں کچھ دوسرے لوگ بھی زخمی ہوئے۔ مگر آخرکار انہوں نے اس پاگل شخص پر قابو پا لیا۔ پھر وہ بدبخت اور شقی القلب شخص، حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کے روبرو لایا گیا۔

خانقاہ کے خدام نے دیکھا کہ حضرت چراغِ دہلیؒ اپنے خون میں نہائے ہوئے حجرے کے فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔

ایک خدمت گار نے رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔

''سیّدی! یہ دنیا کا سفاک ترین انسان آپ کی عدالت میں حاضر ہے۔ اسے عبرت ناک سزا دیجئے کہ ہمارے بہتے ہوئے آنسو تھم جائیں اور مضطرب دلوں کو قرار آ جائے۔'' خانقاہ کا ایک ایک فرد شدید انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

''اسے چھوڑ دو۔'' بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باوجود حضرت سیّد نصیرالدینؒ کی آواز میں نقاہت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ آپ پورے جلال و جبروت کے ساتھ اپنے خدمت گاروں سے مخاطب تھے۔ ''اس کا کوئی قصور نہیں۔ مشیتِ الٰہی یہی تھی کہ نصیرالدین اپنے خون میں نہا جائے۔ اسے جانے دو۔''

تمام خدمت گار حکمِ شیخ سن کر حیران تھے۔

پھر آپؒ نے فرمایا۔

''اسے پچاس اشرفیاں اور ایک تیز رفتار گھوڑا دے کر خانقاہ سے رخصت کر دو۔''

سنگ دل ملنگ کی جنونی کیفیت گزر چکی تھی۔ اب اسے احساسِ جرم ہوا تو شدتِ خوف سے کانپنے لگا۔ پھر حضرت چراغِ دہلیؒ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔

حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ نے جواباً فرمایا۔

''یہ معافی مانگنے کا وقت نہیں۔ اپنی جان بچانے کی کوشش کر۔ اس سے پہلے کہ میرے زخمی ہونے کی خبر عام ہو جائے اور پھر تُو دہلی کی حدود سے باہر نہ جا سکے۔ یہاں تک کہ میرا کوئی عقیدت مند، جذبات سے مغلوب ہو کر تجھے ہلاک کر ڈالے۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر رخصت ہو جا کہ میں نے تجھے معاف کیا۔''

پھر وہ ملنگ گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔ خانقاہ میں موجود تمام عقیدت مندوں کی عجیب حالت تھی۔ غصے کو برداشت کرتے کرتے اُن کے دل سلگ اُٹھے تھے اور چہرے دھواں ہو گئے تھے۔ وہ اس بے راہ رو ستم گر کو بدترین سزا دینا چاہتے تھے۔ مگر حکمِ شیخ سے مجبور تھے۔ ملنگ کے جانے کے بعد خدام فوری طور پر حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کے علاج کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور پھر جب آپؒ صحت یاب ہو گئے تو ایک دن کچھ مریدوں نے

شیخ کے اس حُسنِ سلوک کی شکایت کی۔ جواب میں حضرت چراغِ دہلیؒ نے فرمایا۔
''کیا عجب ہے کہ اس شخص کو کبھی میرے کسی عمل سے کوئی تکلیف پہنچی ہو اور پھر اس نے میرے خلاف انتقامی کارروائی کی ہو۔''

مریدوں نے عرض کیا۔
''آپ تو سراپا محبت ہیں۔ ہم نے اپنی پوری زندگی میں ان گناہ گار آنکھوں سے یہ منظر نہیں دیکھا کہ آپ نے اپنے کسی دشمن کی بھی دل آزاری کی ہو۔'' مریدوں کی شکایت میں ناقابلِ بیان کرب شامل تھا۔
حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے اپنے جاں نثار مریدوں کو مطمئن کرنے کے لئے فرمایا۔
''اگر ایسا نہیں ہے، تب بھی میں اسے سزا نہیں دے سکتا تھا کہ میرا یہ عمل، پیر و مرشد کی وصیت کے خلاف ہوتا۔''

غرض کہ تسلیم و رضا کی ان عجیب و غریب منزلوں سے گزر کر اس واقعے کے تین سال بعد حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے عالمِ خاکی کو خیر باد کہا۔ 18 رمضان المبارک 757ھ کو آپؒ کا انتقال ہوا۔ وصال کے وقت آپؒ کی عمر بیاسی سال تھی۔ انتقال سے پہلے آپؒ نے اپنے حقیقی بھانجے شیخ رکن الدین کو طلب کر کے فرمایا۔
''خواجگانِ چشت کی نعمتوں میں سے جس کا جتنا نصیب تھا، وہ میں نے اپنے مریدوں کو دے دیا۔ تمہیں چاہئے کہ جب میرا جسم قبر میں اُتار دیا جائے تو حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا عطا کردہ خرقہ میرے سینے پر رکھ دینا۔ لکڑی کا کاسہ سر کے قریب اور تسبیح انگشتِ شہادت کے نیچے رکھ دینا۔''
اس کے بعد حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ نے اللہ کی وحدانیت اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت پر گواہی دی اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔
شیخ رکن الدین نے وصیت کے مطابق پیرانِ چشت کے تمام تبرکات قبر میں رکھ دیئے۔ دہلی کا چراغ بظاہر خاک کے حصار میں روپوش ہو چکا تھا۔ مگر اس کی ضیاء بار یاں پورے ہندوستان پر محیط تھیں۔ حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے کردار کی روشنی اتنی تیز تھی کہ اہلِ دل اس روشنی میں اپنی اپنی منزل تلاش کر رہے تھے۔ خاکی جسم کو موت آ گئی، مگر چراغِ دہلیؒ نے تمام عمر جس پیغام کی تبلیغ کی تھی، وہ پیغامِ سرمدی تھا۔ اور اسے فنا کے ہاتھ چھو بھی نہیں سکتے تھے۔

اس موقع پر حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے خلیفۂ اکبر سیّد محمود گیسو درازؒ بہت اُداس تھے۔ اُن کی اُداسی کا سبب یہ تھا کہ حضرت چراغِ دہلیؒ نے وصال سے پہلے خواجگانِ چشت کا خرقہ، سیّد محمد گیسو درازؒ کو مرحمت نہیں فرمایا تھا۔ ن کا خیال تھا کہ وہ حضرت چراغِ دہلیؒ کے خلیفۂ اکبر ہیں اور پیرانِ چشت کے اس تبرک کا پورا استحقاق رکھتے ہیں۔ مگر جب حضرت نصیر الدین محمودؒ نے بظاہر اس طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی اور خواجگانِ چشت کی تمام نشانیاں یر و مرشد کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئیں تو سیّد محمد گیسو درازؒ شدتِ غم سے وارفتہ ہو گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپؒ بہت زیادہ مضطرب بلکہ کسی حد تک وحشت زدہ نظر آ رہے تھے۔
سوئم کی فاتحہ کے بعد سیّد محمد گیسو درازؒ پیر و مرشد کی قبر پر حاضر ہوئے اور اس طرح ایصالِ ثواب کیا کہ آپؒ زار قطار رو رہے تھے۔
پھر اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ ''میں دہلی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''
لوگوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''سیّد! کہاں جا رہے ہو؟''

''میں کچھ نہیں جانتا کہ تقدیر مجھے کہاں لے جائے۔'' سیّد گیسودرازؒ نے انتہائی افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا شہنشاہِ معرفت کا دربار چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟'' پوچھنے والے نے پوچھا۔

''غلام کہیں بھی رہے لیکن اس کی گردن سے شہنشاہ کا طوقِ غلامی نہیں اُتارا جا سکتا۔'' سیّد گیسودرازؒ نے جواب دیا۔

پھر کسی نے اعتراضاً کہا۔ ''سیّد! تمہیں خرقہ خلعت حاصل نہیں ہو سکا۔ کیا تم نے اسی دن کے لئے حضرت شیخ نصیرالدین محمودؒ کی غلامی اختیار کی تھی؟'' کہنے والے نے سیّد محمد گیسودرازؒ کی رگِ احساس پر طنز کا نشتر چلایا تو آپؒ کا چہرہ شدتِ کرب سے متغیر ہو گیا۔

سیّد گیسودراز کچھ دیر تک خاموش رہے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپؒ کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں۔ پھر یکایک گیسودرازؒ اپنی جگہ سے اُٹھے اور خانقاہ کے اس گوشے میں چلے گئے جہاں حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کو غسل دیا گیا تھا۔

حضرت چراغِ دہلیؒ کے تمام مرید اور خدمت گار، سیّد گیسودرازؒ کے اس عمل پر حیران تھے۔ اہلِ نظر نے بڑے تعجب سے یہ منظر دیکھا کہ سیّد گیسودرازؒ اس چارپائی کے قریب دست بستہ کھڑے تھے، جس پر حضرت نصیرالدین محمودؒ کا جنازہ رکھا گیا تھا۔

اہلِ خانقاہ نہیں جانتے تھے کہ سیّد گیسودرازؒ کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اور ان کے ذہن میں اس وقت کون سا خیال گردش کر رہا ہے؟ ناگہاں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سیّد گیسودرازؒ خم ہوئے اور چارپائی کے تمام بان نکال لئے۔ اس جھلنگے کو اپنے گلے میں ڈال کر باآواز بلند کہا۔

''یہی عطیۂ شیخ ہے۔ اور یہی میرا خرقہ ہے۔''

اس کے بعد سیّد گیسودرازؒ دہلی کی حدود سے نکل کر دکن کی جانب روانہ ہو گئے مشہور روایت ہے کہ راستے میں لوگوں نے آپؒ کا والہانہ استقبال کیا۔ جسے بھی خبر ہو جاتی کہ سیّد محمد گیسودرازؒ اس راستے سے گزر رہے ہیں، وہ سارے کام چھوڑ کر نیاز مندانہ طور پر راہ میں کھڑا ہو جاتا۔ آپؒ کی پیشوائی کے لئے بعض امراء بھی حاضر ہوئے۔ عام عقیدت مندوں کے ساتھ علمائے ظاہر کی ایک جماعت بھی سیّد گیسودرازؒ کے جذب و کشف کا تماشا دیکھنے کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئی۔ بانوں کا جھلنگ بدستور آپؒ کے گلے میں موجود تھا۔ بعض علماء نے سیّد گیسودرازؒ سے استہزاء کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تمہاری گردن میں کیا ہے؟''

''شہنشاہ کا طوقِ غلامی، میرا خرقہ۔'' سیّد گیسودرازؒ نے اس قدر افتخار کے لہجے میں کہا جیسے آپؒ کو ساری کائنات کی نعمتیں میسر آ گئی ہوں۔

''خرقہ ایسا ہوتا ہے؟'' کسی دوسرے عالم نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ سیّد کا خرقہ ایسا ہی ہوتا ہے۔'' علمائے ظاہر کے اعتراضات کے بعد گیسودرازؒ کی عقیدت کچھ اور نمایاں ہو گئی۔

''اس جھلنگے میں میرے شیخ کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔''

یہ کہہ کر سیّد گیسودرازؒ نے ایک بان نکالا اور اس شخص کے گلے میں ڈال دیا جو ایک دنیادار انسان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس شخص کی حالت بدل گئی۔ ایک فاسق و فاجر کی حالت میں ایسا تغیر رونما ہوا کہ اہلِ دنیا حیران رہ گئے۔

کثافتیں مٹ گئیں۔ اور اس کے قلبِ سیاہ پر روشنی کے دروازے کھل گئے۔ تمام معتبر تذکرہ نویس اس امر پر گواہی دیتے ہیں کہ سیّد گیسو درازؒ نے اس جھلنگے کے بانوں کا ایک ٹکڑا بھی جس شخص پر ڈال دیا، وہ درجۂ ولایت تک پہنچ گیا۔

اس تاریخ ساز واقعہ میں اہلِ نظر کے لئے دو راز پوشیدہ ہیں۔ ایک مرید کا حُسنِ عقیدت اور دوسرا مرشد کا روحانی غلبہ و اثر۔ خرقہ (لباس) بھی شیخ کے جسم کو مس کرتا ہے اور پلنگ کے بستر یا بانوں میں بھی شیخ کے جسمانی اثرات منتقل ہوتے ہیں۔

سیّد گیسو درازؒ براہِ راست مرشد کا پیرہن حاصل نہ کر سکے تو پھر اس پلنگ کے بانوں ہی پر قناعت کر لی جسے آخری بار پیر و مرشد کے جسم کو چھونے کا شرف حاصل تھا۔ یہ رشتوں کی گہرائی اور تعلق کی استواری کا سوال ہے۔ خرقۂ خلافت نہ مل سکا تو شیخ کی آخری نشانی کو اس طرح سر پر سجا لیا کہ تاجِ شاہی بھی بے حقیقت نظر آنے لگا۔ یقین کی یہی کیفیت انسان کو منزل تک پہنچاتی ہے اور عشق کا یہی جذبہ خاک کو اکسیر بنا جاتا ہے۔ سیّد گیسو درازؒ نے زندگی کے اس راز کو سمجھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؒ نسبتِ شیخ کی تمام تر سعادتوں سے فیض یاب ہوئے۔

سیّد گیسو درازؒ نے ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ جب میں دوسری بار دہلی آیا اور شبِ جمعہ میں حضرت شیخ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوا تو میں نے خواب میں پیر و مرشد کو دیکھا اور بصد اضطراب عرض کیا۔

''سیّدی! آپ کے اکثر خلفاء صاحبِ مقامات و کرامات ہیں مگر آپ نے کسی کو بھی خرقۂ خلافت عطا نہیں کیا۔

جواب میں حضرت شیخ نے فرمایا۔

''یہ سچ ہے کہ میرے بعض خلفاء روحانیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچے ہیں مگر اس وقت ان میں تعصب کا تھوڑا سا اثر باقی تھا۔ اسی وجہ سے میں نے خرقۂ شیخ (محبوبِ الٰہیؒ) اپنے کسی مرید کو نہیں دیا۔ خرقۂ شیخ میرے پاس ایک نازک ترین امانت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے مرشد کا خرقہ اس شخص کو دوں جس کے دل میں ذرا سا بھی غبار موجود ہو۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے امانت کا تحفظ کیا اور بعض مریدوں کو اپنا ذاتی خرقہ دے دیا۔ انشاء اللہ اسی خرقے کی برکت سے پیرانِ چشت کا سلسلہ جاری رہے گا۔''

سیّد محمد گیسو درازؒ فرماتے ہیں کہ اس خواب کے بعد میری آنکھ کھلی تو میں نے ایسی تجلّیات کا ظہور دیکھا جو اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھیں۔ میں فوراً ہی سجدۂ شکر بجا لایا اور حضرت نصیرالدین محمودؒ کے تصرفِ روحانی پر حیران رہ گیا۔

حضرت چراغِ دہلیؒ کا اندازِ تبلیغ بڑا عجیب تھا۔ آپؒ اپنے ہر مرید کی قوتِ نفس کا گہرا مشاہدہ کرتے اور جو زندگی کے جس شعبے کے لئے موزوں ہوتا، اس کو اسی دائرے میں رکھ کر روحانی تربیت فرماتے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کا وزیر، خان جہاں بھی حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کا مرید تھا۔ خان جہاں اپنے نسب کے اعتبار سے تلنگی ہندو تھا۔ اور اس کا خاندانی نام ''کنوکے'' تھا۔ وہ سلطان محمد تغلق کے دربار میں حاضر ہو کر اسلام لایا تھا اور سلطان نے اس کا اسلامی نام ''مقبولِ عام'' تجویز کیا۔ پھر یہی شخص ترقی کرتے کرتے نائب وزیر سلطنت کے عہدے پر پہنچ گیا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت میں اس کے فطری جوہر مزید آشکار ہوئے اور وہ آسانی کے ساتھ وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو گیا اور ''خان جہاں'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ خان جہاں طبعاً ایک شریف النفس انسان تھا۔ مادی عروج حاصل کرنے کے بعد اپنی روحانی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا اور ایک دن اس نے بڑے عجز و انکسار کے ساتھ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کی خانقاہ میں حاضری دی۔

''شیخ! مجھے بھی اپنی غلامی سے شرف یاب کیجئے۔''
وزیراعظم خان جہاں نے ایک مردِ بوریا نشیں کے سامنے اپنا خالی دامن پھیلاتے ہوئے کہا۔
''حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ نے خان جہاں کے جذبۂ شوق کی آزمائش کرتے ہوئے فرمایا۔
''دربارِ سلطانی اور نظام خانقاہی میں بڑا فرق ہے۔ کیا تم اس راستے کی صعوبتوں کے متحمل ہو سکو گے؟''
چراغِ دہلیؒ نے آرام و آسائش میں ڈوبے ہوئے وزیر سے سوال کیا۔
''شیخ! میں سب کچھ سوچ کر اس آستانے پر حاضر ہوا ہوں۔'' خان جہاں نے اپنی نیازمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا

حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ نے اسے اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔ پھر جب خان جہاں نے عبادت و ریاضت کے بارے میں پوچھا تو چراغِ دہلیؒ نے فرمایا۔

''نماز پڑھو اور حاجت مندوں کی مشکل کشائی کرو۔ تم ایک اسلامی مملکت کے وزیر ہو۔ عدل و انصاف اور صلۂ رحمی سے کام لو۔ بس یہی تمہاری عبادت ہے۔''
خان جہاں نے اوراد و وظائف کے متعلق دریافت کیا تو حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ نے فرمایا۔
''تم ہمیشہ باوضو رہا کرو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔''

خان جہاں ہمہ وقت وضو کی حالت میں رہتا اور اس قدر احتیاط کرتا کہ اگر دربار میں مسندِ وزارت پر وضو کی ضرورت پیش آتی تو سارے کام چھوڑ دیتا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر دوبارہ وضو کرتا۔ رات کو سوتے وقت اپنے پلنگ کے قریب ایک طشت اور آفتابہ رکھوا لیتا۔ پھر جیسے ہی آنکھ کھلتی، فوراً اُٹھ کر وضو کرتا۔ یہ حضرت چراغِ دہلیؒ ہی کی دعاؤں کا اثر تھا کہ خان جہاں مرنے کے بعد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے قریب دفن ہوا۔

اہلِ دل کی بات تو دیگر ہے، دنیا دار مؤرخ بھی علی الاعلان کہتے ہیں کہ خان جہاں کی خدا ترسی اور عدل گستری، حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کے فیضِ صحبت کا نتیجہ تھی۔

اگرچہ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ ذاتی طور پر کشف و کرامات کے قائل نہیں تھے۔ اور اس ذیل میں آپؒ اپنے مریدوں کو بھی سختی سے منع فرماتے تھے کہ اس کا تعاقب نہ کرو۔ لیکن آپؒ کی ذات سے بے شمار کرامات کا اظہار ہوا۔ واضح رہے کہ اس میں حضرت چراغِ دہلیؒ کی کوششوں کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا تو زمین پر بسنے والے تمام جان دار اور نباتات اس کی حرارت اور روشنی کو محسوس کرتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ایک نابینا شخص بھی پکار اُٹھتا ہے۔

''خورشیدِ ضیاء بار اُفقِ مشرق پر نمودار ہو گیا اور ہر طرف اُجالا پھیل گیا۔''
یہاں کرامت کے موضوع پر تفصیلات کی گنجائش نہیں۔ فی الحال حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کی وہ کرامت زیرِ بحث ہے، جسے دیکھ کر اہلِ ہنود پر بھی لرزہ طاری تھا۔

اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ جس زمانے میں جواہر سنگھ جاٹ نے دہلی کو لوٹا اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا، اس وقت ''چراغِ دہلی'' کے حصار میں ایک برہمن رہتا تھا۔ ہنگاموں نے طول کھینچا تو برہمن کو اپنے اہلِ خانہ کی ہلاکت و بربادی کا خیال آیا کہ کہیں یہ علاقہ بھی جواہر سنگھ کی لوٹ مار کی زد میں نہ آ جائے۔ اس اندیشے نے برہمن کا آرام و سکون چھین لیا۔ کئی بار اس نے اس علاقے سے فرار ہو کر کسی محفوظ مقام پر پناہ ڈھونڈنے کے بارے میں سوچا مگر مجبوروں اور بے کسوں کے لئے کوئی بھی جائے امان نہیں تھی۔ اسی دوران جواہر سنگھ کے سفاک

کارندے حصار "چراغِ دہلیؒ" کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ برہمن بدحواس ہوگیا اور اسی وحشت کے عالم میں اُس نے غسل کیا۔ نئے کپڑے پہن کر لرزتے قدموں کے ساتھ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوا اور اپنی مذہبی رسم کے مطابق برہمن نے پانی کا ایک لوٹا بھرا اور گیندے کے پھول حضرت چراغِ دہلیؒ کی قبر پر چڑھائے۔

پھر وہ رقت آمیز لہجے میں فریاد کرنے لگا۔

"سرکار! میں ایک برہمن ہوں، بتوں کو پوجنے والا برہمن۔ ایک گناہ گار انسان جو اس پاک مقام پر آنے کا حق نہیں رکھتا۔ دنیا والوں کی نظر میں میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں مگر حضور جانتے ہیں کہ دوسروں کی طرح میں بھی آپ کی رعایا میں شامل ہوں۔ آپ صرف مسلمانوں کے نہیں، ہم بت پرستوں کے بھی شہنشاہ ہیں۔ اس لئے اس غلام کی بھی نذر قبول کیجئے جس کے گلے میں زنار ہے اور ماتھے پر قشقہ کھنچا ہوا ہے۔" برہمن کی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ "سرکار! آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں آپ کی دہلی پر کیا قیامت نازل ہو رہی ہے۔ ہم جو آپ کے پڑوسی ہیں، آپ کی رعایا ہیں، اس ہنگامہ دار و گیر میں کوئی وسیلہ نہیں رکھتے اگر آپ نے اپنے غلام کی حالت زار پر کوئی توجہ نہیں کی تو یہ بے دست و پا غلام صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے جائیں گے۔" یہ کہہ کر برہمن خاموش ہوگیا مگر اُس کے آنسو بہتے رہے۔

مزارِ مبارک کے مجاور اور دوسرے خدمت گار اس برہمن کی گریہ و زاری سنتے رہے۔ برہمن کا اضطراب حد سے بڑھا تو وہ حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کی قبر سے سر ٹکرانے لگا۔

"حضور! آپ کے سوا ہمارا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ ہم نے جن دنیاوی سہاروں پر اعتبار کیا، وہ ہمیں گردابِ بلا میں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ہمارا سفینۂ حیات ڈوبنے والا ہے۔ اپنے کھیون ہار سے نہ کہیں تو کس سے کہیں؟"

یہ برہمن سینکڑوں بتوں کا پجاری تھا مگر جب اس طوفان میں کوئی بت اُس کی دستگیری نہ کر سکا تو وہ اپنی عادت کے مطابق حضرت چراغِ دہلیؒ کی بارگاہِ جلال میں خم ہوگیا اور اسی لہجے میں پکارنے لگا جو ہندو مذہب کے پجاریوں نے اسے سکھایا تھا۔

الغرض اپنی عرض داشت پیش کرنے کے بعد وہ برہمن اپنے گھر لوٹ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ سارا دن اسی کشمکش میں گزر گیا۔ جب رات کو سویا تو اس نے خواب میں حضرت سیّد نصیرالدین محمودؒ کو دیکھا۔ چراغِ دہلیؒ نہایت مشفقانہ لہجے میں فرما رہے تھے۔

"تم لوگ اپنے اپنے مکانوں کے دروازے بند کرلو اور اطمینان سے بیٹھے رہو۔ وہ لٹیرے ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ اور اگر آئے بھی تو اندھے ہو جائیں گے۔ خدا بڑا کارساز ہے۔ وہی تمہارا دستگیر ہے اور وہی مشکل کشا ہے۔"

برہمن کی آنکھ کھلی تو وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے اہلِ خانہ اور دوسرے لوگوں کو یہ نوید جانفزا سنائی تو بظاہر سب کے سب مطمئن نظر آنے لگے۔ مگر یہ بات ان کے ذہنوں سے بالاتر تھی کہ قزاق بینائی سے کس طرح محروم ہو جائیں گے؟ غرض اسی امید و بیم کی حالت میں دن گزرتے رہے۔

جواہر سنگھ جاٹ کے آدمی روزانہ "حصارِ چراغِ دہلیؒ" کا رخ کرتے مگر جب بستی کے قریب پہنچتے تو یہ علاقہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ تمام قزاق بہت پریشان تھے۔ وہ پوری تیاریوں کے ساتھ چراغِ دہلیؒ کی بستی پر حملہ آور ہوتے مگر اپنے خونی ارادوں میں ناکام رہتے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ان لٹیروں کو دُور سے چراغِ دہلی کا

علاقہ صاف نظر آتا تھا، لیکن نزدیک آنے کے بعد وہ لوگ بھٹک کر کسی اور طرف نکل جاتے۔
آخر ایک دن مجبور ہو کر جواہر سنگھ جاٹ نے مقامی باشندوں سے دریافت کیا۔ ''چراغِ دہلی کس طرف ہے؟''
لوگ قزاقوں کے سرغنہ کا یہ سوال سن کر حیران رہ گئے۔ ''وہ سامنے چراغِ دہلی نظر آ رہا ہے۔'' بیک وقت کئی آوازیں بلند ہوئیں۔
صحیح طور پر نشاندہی ہو جانے کے بعد جاٹوں نے پورے زور و شور کے ساتھ بستی پر حملے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ وہ بستی کے لوگوں سے اپنی گزشتہ ناکامیوں کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ مگر جیسے ہی وہ بستی کے قریب پہنچے، ان پر ایک بار پھر وہی کیفیت طاری ہوگئی۔ بستی کا ایک ایک مکان اُن کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔
جواہر سنگھ پر ہیبت سی طاری ہوگئی۔ اس نے دوسری مرتبہ مقامی لوگوں سے رجوع کرتے ہوئے کہا۔
''ہماری تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ چراغِ دہلی کی بستی دُور سے صاف نظر آتی ہے مگر جب ہم لوگ قریب پہنچتے ہیں تو بستی کے تمام آثار اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جیسے اس زمین پر کبھی کوئی مکان تعمیر ہی نہ ہوا ہو۔ ہم اپنے آپ کو ایک کھلے میدان میں کھڑا ہوا پاتے ہیں۔ آخر یہ کیا راز ہے؟'' جواہر سنگھ جاٹ نے پوچھا۔ ''کیا اس علاقے میں کوئی خاص بات ہے؟''
''ہاں۔'' ایک بوڑھے شخص نے جواب میں کہا۔ ''اس علاقے میں حضرت سیّد نصیر الدین محمود چراغِ دہلیؒ کا مزار ہے۔ یہ بستی ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔ تمام بستی والے اپنے آپ کو چراغِ دہلیؒ کی رعایا سمجھتے ہیں اور خود چراغِ دہلیؒ بھی اپنی رعایا پر ہمیشہ مہربان رہتے ہیں۔''
یہ سن کر جواہر سنگھ جاٹ پسینے میں نہا گیا۔ اس سے بڑا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ وہ ایک جہاں دیدہ انسان تھا۔ اپنے جرم کا احساس کر کے لرز گیا۔ بہت دیر تک سکوت کے عالم میں کھڑا رہا، پھر کانپتے ہوئے لہجے میں پکار کر کہنے لگا۔
''شہنشاہ! میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بے ادبی پر بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ یہ شہنشاہ کا علاقہ ہے ورنہ ایک غلام کبھی اس گستاخی کا مرتکب نہ ہوتا۔ میں اور میرے شریک کار اس سے معافی کے خواست گار ہیں۔ غلاموں کو اجازت دیجیے کہ وہ شہنشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر سکیں۔''
جیسے ہی جواہر سنگھ جاٹ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، چراغِ دہلی کی پوری بستی اس طرح روشن ہو گئی جیسے تمام قزاقوں کی آنکھوں پر پڑا ہوا سیاہ پردہ ہٹا دیا گیا ہو۔ جواہر سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے سر عقیدت سے خم ہو گئے اور پھر سنگدل جاٹوں کا یہ قافلہ غسل سے فارغ ہونے کے بعد پھولوں کی چادر لے کر حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوا۔
کچھ اسی قسم کا واقعہ برطانوی دورِ حکومت میں بھی پیش آیا تھا جس سے حضرت سیّد نصیر الدین محمود چراغِ دہلیؒ کی روحانی برکتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کیا تو مسلمانانِ شہر کی زندگی وبال ہوئی اور ان پر آفات و مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ بدنام زمانہ فرنگی افسر مٹکاف کو جہاں بھی کوئی مسلمان نظر آ جاتا، اسے گرفتار کر کے قید خانے کی تنہائیوں کے حوالے کر دیا جاتا۔ اس طرح چند ہی روز میں پورا شہر ویران ہو گیا اور تمام جیل خانے مسلمانوں سے بھر گئے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے دیہاتی بھی انگریزوں کے تشدد کا نشانہ بنے۔ مسلمانوں کی یہ حالتِ زار دیکھ کر آستانۂ عالیہ کے خدمت گاروں اور دوسرے بستی والوں نے اسی برہمن کی اولاد سے کہا۔

''ایک بار پہلے بھی اس علاقے پر یورش ہوئی تھی اور اس وقت تیرے دادا نے حضرت شیخ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر لوگوں کی سلامتی کی دعائیں مانگی تھیں۔ ہماری درخواست ہے کہ تُو بھی اپنے دادا کی طرح مزارِ مبارک پر حاضری دے اور بستی والوں کے لئے عافیت طلب کر۔''

برہمن زادہ کچھ دیر تک حیرت و سکوت کے عالم میں ان لوگوں کو دیکھتا رہا، پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہنے لگا۔

''میں مذہبی اعتبار سے ایک ہندو ہوں۔ مجھے اس در سے کوئی نسبت نہیں۔ آپ حضرات مسلمان ہیں اور یہ ایک مسلمان شہنشاہ کا دربار ہے۔ مجھے معاف کریں کہ میں اپنے آپ میں اتنی جرأت نہیں پاتا۔''

آستانۂ شیخ کے خدمت گاروں نے اسے سمجھایا۔

''دربارِ شاہ میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں۔ بے شک! تجھے اس در سے کوئی نسبت نہیں مگر تیرا دادا، حضرت شیخ کا بڑا عقیدت مند تھا۔ تُو بھی اسی عقیدت کا حوالہ پیش کر۔ تیری وجہ سے ہم سب کو نجات مل جائے گی۔''

خدام کی گفتگو سن کر برہمن زادے کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ بڑے عاجزانہ لہجے میں کہنے لگا۔

''میں نہیں جانتا کہ میرے دادا، شاہ کے دربار میں کس طرح حاضر ہوئے تھے۔ میں تو شاہ کے ادنیٰ ترین غلاموں کے برابر بھی نہیں۔ پہلے مجھے حاضری کے آداب سکھا دو۔''

جن لوگوں نے آنجہانی برہمن کو حضرت سیّد نصیر الدین محمودؒ کے مزار پر حاضر ہوتے دیکھا تھا، انہوں نے برہمن زادے کے سامنے پوری کیفیت بیان کر دی۔

لڑکا ایک ایک بات کو غور سے سنتا رہا۔ پھر وہ اُٹھا، اس نے غسل کیا اور ایک لوٹے میں پانی بھر کر حضرت چراغِ دہلیؒ کے آستانے پر حاضر ہوا۔ تمام لوگوں نے دیکھا کہ برہمن زادہ بڑے رقت آمیز لہجے میں عرض کر رہا تھا۔

''سرکار! میں یہاں آنے کے قابل نہیں تھا۔ مگر آپ کی بستی والوں نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں گناہ گار، ناپاک اس لائق کہاں کہ شہنشاہ کے روبرو اپنے ہونٹوں کو جنبش بھی دے سکوں۔ لیکن بستی والے کہتے ہیں کہ میں ان کی عافیت کے لئے دعا مانگوں۔ حضور! میرا دامن پھیلا ہوا ہے اور میں آپ کے کرم کی بھیک مانگتا ہوں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ میرے دادا کو آپ سے بڑی نسبت تھی۔ آج میں بھی اسی نسبت کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹائیے کہ لوگوں کو میری ذات سے بڑی خوش گمانیاں ہیں۔''

برہمن زادے کی فریاد میں اس قدر تاثیر تھی کہ مزارِ مبارک کے احاطے میں موجود تمام لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئیں اور بہت دیر تک فضا میں گریہ و زاری کی صدائیں گونجتی رہیں۔ پھر وہ برہمن زادہ خاموشی کے ساتھ اپنے گھر چلا گیا۔ دادا کی طرح اس نے بھی خواب کی حالت میں سیّد نصیر الدین محمودؒ کو دیکھا، آپؒ فرما رہے تھے۔

''اگر تجھے ہم سے نسبت ہے تو پھر مایوس کیوں ہوتا ہے؟ بستی والوں سے کہہ دے کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں، انہیں باہر نکالو اور جو باہر ہیں، انہیں اندر نہ آنے دو۔ خدا نے چاہا تو سب لوگ دشمن کے شر سے محفوظ رہیں گے۔''

برہمن زادے نے نیند سے بیدار ہو کر بستی والوں کے سامنے اپنا خواب بیان کیا اور پھر تمام اہلِ شہر نے دیکھ لیا کہ ''حصارِ چراغِ دہلیؒ'' سے ایک شخص بھی گرفتار نہ ہو سکا۔ انگریز مٹکاف نے بہت چاہا کہ وہ اس علاقے کے

باشندوں کو بھی اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنائے مگر ہر بار اس پر ایک نامعلوم سی دہشت طاری ہو جاتی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا ارادہ ہی بدل ڈالا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

(جو لوگ تسلیم و رضا کے خنجر سے قتل ہوتے ہیں، انہیں ہر زمانے میں غیب سے ایک نئی زندگی ملتی ہے)

❁❁❁

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ

یہ آٹھویں صدی ہجری کا واقعہ ہے۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ایک درویش، مکہ معظمہ سے ہندوستان تشریف لائے اور ضلع بھکر میں قیام پذیر ہوئے۔ درویش کی آمد کی خبر ملی تو عقیدت مندوں کا ہجوم اس مردِ خدا کے گرد سمٹ آیا۔ درویش اُنہیں دعائیں دے کر رخصت کرتا رہا کہ وہ ایک مستجاب الدعوات انسان تھا۔ اس کی دعاؤں میں بڑی تاثیر تھی۔ وہ اندھیروں کی بستی میں اُجالوں کا سفیر تھا اور عقیدت مند اُسے روحانی مسیحا کہہ کر پکارتے تھے۔

پھر جب عام لوگ خانقاہ سے اُٹھ کر چلے گئے تو چند خدمت گاروں نے دست بستہ عرض کیا۔

''سیّدی! اب کی بار آپ کا بیرونِ ملک قیام کچھ زیادہ طویل ہو گیا تھا۔''

''ہاں! اس مرتبہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے بہت نوازا۔'' درویش کے چہرے پر عجیب سی سرشاری کے آثار روشن تھے۔ اس نے اپنے مقرب بندوں کا دیدار کرایا۔ اس بار کچھ ایسی سعادتیں حاصل ہوئیں کہ یہ فقیر اپنی خوش بختی پر ہمیشہ نازاں رہے گا۔ ابھی واپسی کا ارادہ نہیں تھا مگر تمہاری محبت مجھے یہاں کھینچ لائی۔''

''ہم گناہ گار تو آپ کی محبت کے زیر سایہ ہی زندہ ہیں۔'' خدمت گاروں نے عرض کیا۔ ''آپ کی محبت کے بغیر گزرنے والا ہر لمحہ ایک بارِ گراں محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہم زندگی کے صحرا میں تنہا کھڑے ہیں اور کوئی ہمارا پُرسانِ حال نہیں۔''

''تم لوگ مطمئن رہو۔'' درویش نے اپنے خدمت گاروں کی تالیف قلب کے لئے فرمایا۔ ''میں تمہارے درمیان رہوں یا نہ رہوں مگر اللہ تمہیں میری دعاؤں کے سائے میں ضرور رکھے گا۔''

''اگر آپ یہاں موجود ہوتے تو شاید وہ فتنہ سر نہ اُٹھاتا۔'' ایک خدمت گار نے افسردہ لہجے میں عرض کیا۔

''کیسا فتنہ؟'' درویش نے چونک کر اپنے خادم سے دریافت کیا۔

''الور کے پاس ایک پہاڑ کے غار میں ایک درویش رہتا ہے۔'' خدمت گار نے عرض کیا۔ ''اُس درویش کا دعویٰ ہے کہ اللہ نے اس پر نماز معاف کر دی ہے۔''

''اللہ نے اس پر نماز معاف کر دی ہے؟'' درویش کے چہرے پر اذیت و کرب کا رنگ اُبھر آیا۔ ''یہ تو کھلی گمراہی ہے۔''

''کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس پر آسمان سے کھانا اُترتا ہے۔'' خدمت گار نے عرض کیا۔ ''اب صورتِ حال یہ ہے کہ غار کے قریب ہزاروں لوگ جمع رہتے ہیں اور اس درویش سے ملاقات کو اپنے لئے بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔''

درویش غور و فکر میں ڈوب گیا۔

''اگر اس فتنے کو ختم نہیں کیا گیا تو ذلالت و گمراہی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔'' خدمت گار نے عرض کیا۔ ''پھر حق تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ یہ طوفان کہاں جا کر ٹھہرے گا۔''

''ہر طوفان اُترنے کے لئے ہے۔'' درویش نے انتہائی پُرجلال لہجے میں کہا۔ ''بفضلِ خدا یہ طوفان بھی اُتر جائے گا اور لوگ اس کی ہلاکتوں سے محفوظ رہیں گے۔''

اگرچہ طویل سفر کے باعث درویش کے چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں تھے لیکن وہ اسی وقت الور روانہ ہونے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

خدمت گاروں نے بیک زبان عرض کیا۔

''سیّدی! کچھ دن آرام فرمالیں۔ پھر اس طرف توجہ فرمایئے گا۔''

''جب یہ جانگداز خبر سن لی تو پھر کہاں کا آرام؟'' درویش نے نہایت پُرسوز لہجے میں کہا۔ ''ایک گمراہ شخص سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اُمتیوں کو ایذا پہنچا رہا ہے، ان کے عقائد پر شب خون مار رہا ہے اور میں چین سے بیٹھا رہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟'' اور پھر وہ درویش اسی وقت الور کی جانب روانہ ہو گیا۔

غار کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا شخص مسلسل دعوے کر رہا تھا کہ اس پر نماز معاف کر دی گئی ہے اور اس کی ضیافت کے لئے آسمان سے کھانا اُترتا ہے۔ غیب سے کھانا برآمد ہونے کا منظر مقامی لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لئے درویش کی روحانی طاقتوں کا تاثر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے عوام اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر خواص بھی اپنے دلوں میں عقیدت کے جذبات لئے ہوئے الور کے غار کی طرف بڑھنے لگے۔

آخر بھکر کا درویش اس غار کے قریب پہنچا۔ وہاں عقیدت مندوں کا ہجوم تھا اور اس ہجوم میں امراء بھی شامل تھے۔ آنے والے درویش سے ایک زمانہ آشنا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ درویش نے لوگوں کے ہجوم کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ سیدھا اس شخص کے پاس پہنچا جو نئی روحانیت کا دعویدار تھا۔

''تم کیسے مسلمان ہو؟'' گوشہ نشین شخص نے آنے والے درویش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سلام کی رسم بھی ترک کر چکے ہو۔''

''میں نے آدابِ شریعت کو فراموش نہیں کیا ہے مگر تجھ جیسے شخص کو سلام کرنا میرے نزدیک جائز نہیں۔'' درویش کے لہجے سے جلالِ روحانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''تم نے باہر کیا دیکھا؟'' گوشہ نشین شخص نے کہا۔ ''مخلوقِ خدا کا ہجوم میرے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے چین ہے اور تمہارے نزدیک مجھے سلام کرنا تک جائز نہیں؟''

''میں بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟'' درویش نے گوشہ نشین شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشادِ مقدس ہے کہ مومن اور کافر کے درمیان نماز ہی کا فرق ہے۔''

گوشہ نشین شخص کے پاس کچھ عقیدت مند بھی موجود تھے جو درویش کی باتیں بہت غور سے سن رہے تھے۔

''تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میرا یہ عمل خود میرے ارادے یا خواہش کا تابع نہیں ہے۔'' گوشہ نشین شخص نے اپنی گفتگو میں تاثر پیدا کرنے کے لئے باآواز بلند کہا۔ ''میرے پاس جبریل علیہ السلام آتے ہیں، جنت سے کھانا لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمہارے لئے نماز معاف کر دی گئی ہے اور تمہیں اللہ کے مقرب بندوں میں شامل کر لیا گیا ہے۔''

گوشہ نشین شخص کے الفاظ کی گونج ابھی باقی تھی کہ غار کے سناٹے میں درویش کی پُرجلال آواز اُبھری۔

''اے شخص! تُو کیا ہذیان بک رہا ہے؟ جب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے نماز معاف نہیں کی گئی

تو پھر تجھ جیسے جاہل اور گمراہ کی کیا حیثیت ہے؟ تیرے پاس جبریلؑ نہیں، شیطان آتا ہے جس نے تجھے گمراہی کی آخری منزل تک پہنچا دیا ہے۔ جبریل امین تو وحی لانے والے فرشتے ہیں جو پیغمبروں کے سوا کسی کے پاس تشریف نہیں لاتے۔ اور رہا تیرا کھانا جو تیرے بقول آسمان سے اُترتا ہے، وہ بھی سراسر غلط ہے۔"

گوشہ نشین شخص اپنی بات پر قائم رہا۔ "مگر وہ کھانا تو نہایت نفیس ولذیذ ہوتا ہے۔ میں نے آج تک دنیا کی کسی غذا میں ایسا ذائقہ محسوس نہیں کیا۔ مجھے تمہاری بات کا اعتبار نہیں۔ وہ جبریلؑ ہی ہیں جو آسمان سے میرے لئے کھانا لاتے ہیں۔"

درویش نے اتمام حجت کے طور پر کہا۔ "اب اگر وہ فرشتہ تیرے پاس آئے تو لاحول پڑھنا۔ پھر تجھ پر یہ راز فاش ہو جائے گا کہ آنے والا کون ہے؟" یہ کہہ کر درویش اپنے کسی عقیدت مند کے مکان پر تشریف لے گئے۔

الور میں ایک شور سا برپا تھا۔ لوگ بڑی بے چینی سے اس بات کے منتظر تھے کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرے دن وہ درویش پھر اس غار میں پہنچے۔ جبریل امینؑ سے ہم کلام ہونے والا شخص انہیں دیکھتے ہی قدموں میں گر پڑا اور گریہ وزاری کرنے لگا۔

"شیخ! مجھے اس ہلاکت سے بچا لیجئے۔ میں تو کہیں کا نہ رہا۔ میری عاقبت برباد ہوگئی۔"

درویش نے اُس شخص کو اٹھایا اور پورا واقعہ دریافت کیا۔

"حسبِ دستور وہ فرشتہ کھانا لے کر آیا۔" گوشہ نشین زار و قطار رو رہا تھا۔ "میں نے آپ کے کہنے کے مطابق لاحول پڑھی تو وہ فرشتہ غائب ہو گیا۔ میں کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا کہ وہ دوبارہ نمودار ہو اور میں اس سے کچھ سوالات کر سکوں۔ مگر جب وہ بہت دیر تک اپنی اصلی شکل میں ظاہر نہیں ہوا تو میں نے بھوک سے بے تاب ہو کر اس کا لایا ہوا کھانا اٹھا لیا۔ وہ لذیذ غذا میرے ہاتھ میں آتے ہی غلاظت کا ڈھیر بن گئی جس سے میرا جسم اور کپڑے ناپاک ہو گئے۔ بس اسی وقت سے میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اس عذاب سے نجات دلایئے۔"

"اگر اللہ کو تیری ہدایت منظور نہ ہوتی تو یہ فقیر کبھی اس طرف کا رخ نہ کرتا۔" درویش نے اس گوشہ نشین شخص کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "غنیمت ہے کہ ابھی تجھ پر توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ سچے دل سے اپنے خالق کی طرف رجوع کر۔ اگر خلوصِ نیت شامل ہو تو دنیا کا کوئی ایسا گناہ نہیں جو معاف نہ ہو سکے۔ حق تعالیٰ تیرے اندازوں سے بھی زیادہ غفور الرحیم ہیں۔"

اس کے بعد درویش نے اس گوشہ نشین شخص سے توبہ کرائی اور تلقین کی کہ جس قدر نمازیں فوت ہو چکی ہیں، ان کو قضا کے طور پر ادا کیا جائے۔

الور کے ان باشندوں نے بھی درویش کے دستِ حق پرست پر توبہ کی جو اپنی بے خبری کے سبب اس گوشہ نشین شخص کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو گئے تھے۔

اللہ نے جس مردِ کامل کے ذریعے اس فتنے کو ختم کیا، وہ مشہور بزرگ حضرت سید جلال الدین بخاری المعروف مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ تھے۔

❀❀❀

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا خاندانی نام سیّد جلال الدین بخاری تھا۔ آپؒ صحیح النسب سیّد تھے اور آپؒ

کا سلسلہ براہِ راست سیّدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ سیّد جلال الدین بخاری 14 شعبان المعظم 707ھ کو بمقام اوچ (ضلع بہاولپور، پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ مغل شہزادہ داراشکوہ نے اپنی مشہور تصنیف ''سفینۃ الاولیاء'' میں یکم شعبان کو آپؒ کی تاریخ ولادت قرار دیا ہے۔ مخدوم جہانیاںؒ کا خاندان کئی پشتوں سے تصوف اور روحانیت کی دنیا میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔ آپؒ کے دادا، سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ہجرت میں گزرا۔ علمائے ظاہر ہمیشہ اور ہر جگہ صوفیاء کے درپے ایذا رہے ہیں۔ اسی قدیم رسم کے مطابق سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ پر بھی عراق کی سرزمین تنگ ہوگئی۔ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ علمائے عراق، حضرت شیخ بخاریؒ کے عقائد کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نتیجتاً ان سے کہا گیا کہ وہ عراق کی حدود کو چھوڑ کر کسی اور مقام پر چلے جائیں۔

''جب اسلام ایک کافر کے وجود کو برداشت کرسکتا ہے تو پھر میرے لئے یہ سنگ دلانہ روش کیوں؟'' حضرت سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ نے علمائے عراق سے سوال کیا۔ ''میں تو پھر بھی مسلمان ہوں، خدائے واحد کا پرستار اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُمتی!''

''اگر تم ہمارے نظریات کو تسلیم نہیں کرسکتے تو پھر اس سرزمین پر تمہارے لئے کوئی گنجائش نہیں۔'' علمائے عراق نے اسلامی رواداری کو ترک کرتے ہوئے اپنے دل و دماغ کے دروازے بند کرلئے۔ ''تمہیں ہر حال میں یہاں سے جانا ہوگا اور تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔''

حضرت سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ نے علمائے عراق کی مزاجی کیفیت کو سمجھ لیا تھا۔ اب مصالحت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ نتیجتاً آپؒ ترکِ وطن پر مجبور ہوگئے۔ کچھ مورخین نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اگر سیّد جلال الدین بخاریؒ، عراق کو خیرباد نہ کہتے تو شاید آپؒ کو مالی اور جسمانی نقصان پہنچ جاتا۔ غرض جبر کی اسی فضا میں حضرت شیخ بخاریؒ اپنے وطن کی حدود سے نکل کر بخارا پہنچے۔ عراق کی سرزمین کو الوداع کہتے وقت آپؒ بہت جذباتی ہوگئے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ترکِ وطن کرتے ہوئے حضرت سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

حضرت شیخؒ کا خیال تھا کہ وہ علوم وفنون کی سرزمین ''بخارا'' کی کشادہ آغوش میں سما جائیں گے۔ مگر ان کی اس خواہش کی تکمیل نہ ہوسکی۔ ''مردانیوں'' نے حضرت سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ کو اس قدر تنگ کیا کہ آپؒ تھوڑے ہی عرصے میں اس شہر سے بیزار ہوگئے۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ حضرت شیخؒ نے بخارا کو خیرباد کہا اور کابل تشریف لے آئے۔

چند ماہ سکون سے گزرے۔ مگر جب علمائے کابل کو معلوم ہوا کہ یہاں عراق سے آیا ہوا ایک صوفی گوشہ نشین ہے تو بعض اہلِ علم نے حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ سے ملاقات کی۔ پھر یہ رسم و راہ بڑھتی چلی گئی۔ حضرت شیخؒ بھی علمائے کابل کی مجلسوں میں شریک ہونے لگے۔ آپؒ کا خیال تھا کہ سرزمینِ کابل آپؒ کے لئے عافیت گاہ ثابت ہوگی۔ لیکن جیسے ہی مقامی لوگوں کو آپؒ کے نظریات کا علم ہوا تو پیشانیاں شکنوں سے بھر گئیں اور چہروں پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوگئے۔ آخر ایک روز علماء کی ایک جماعت نے حضرت بخاریؒ کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

''یا تو اہلِ کابل کے سامنے اپنے نظریات سے تائب ہوجاؤ یا پھر خاموشی کے ساتھ یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ۔''

حضرت جلال الدین سرخ بخاریؒ اپنے نظریات ترک کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ مجبوراً آپؒ کو کابل بھی چھوڑنا پڑا۔ افغانوں کی سرزمین چھوڑنے سے پہلے آپؒ بہت پریشان نظر آرہے تھے۔ سفر درپیش تھا اور منزل نامعلوم! آخر ایک دن جلال الدین بخاریؒ نے صدائے غیب سنی۔

''سیّد! ہندوستان کی طرف چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں سکون مل جائے گا۔''

حضرت بخاریؒ نے اس صدائے غیب کو اپنا رہنما سمجھا اور ہندوستان تشریف لے آئے۔ پھر مستقل طور پر اُوچ (ضلع بہاولپور) میں مقیم ہو گئے۔ حضرت سیّد جلال الدین سرخ بخاریؒ سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم بزرگ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے مرید ہوئے اور آپؒ نے روحانیت کی بہت سی منزلیں طے کیں۔ حضرت بخاریؒ نے بھکر کے رئیس بدرالدین کی صاحب زادی سے عقد کیا اور پھر اس پاکباز خاتون کے بطن سے تین فرزند پیدا ہوئے۔ سید احمد کبیرؒ، سید بہاؤ الدینؒ اور سید محمدؒ۔

سید احمد کبیرؒ کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت مخدوم جہانیاںؒ اور دوسرے حضرت صدرالدین راجو قتالؒ۔

❀❀❀

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے ابتدائی تعلیم حضرت شیخ جمال محدثؒ اور اوچ کے قاضی حضرت علامہ بہاؤ الدین سے حاصل کی۔

جب حضرت مخدوم جہانیاںؒ سات سال کے ہوئے تو والد محترم آپ کو لے کر حضرت شیخ جمال الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے۔ حضرت شیخ جمال خنداںؒ کی خانقاہ میں عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ حضرت شیخؒ کسی موضوع پر تقریر فرما رہے تھے۔ حالانکہ اس وقت حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کا دورِ طفلی تھا مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ انتہائی نوعمری میں بھی آپؒ پورے انہماک کے ساتھ حضرت شیخ جمال خنداںؒ کی تقریر سن رہے تھے۔ پھر جب درس ختم ہوا تو خانقاہ کے دستور کے مطابق حاضرین میں کھجوریں تقسیم کی گئیں۔ حضرت شیخ کے خدمت گاروں نے ایک سات سالہ بچہ کو بھی تبرک دیا۔ پھر جب دوسرے لوگ خانقاہ سے چلے گئے تو حضرت شیخ جمال خنداںؒ نے مخدوم جہانیاںؒ کی طرف دیکھا۔ آپؒ اس وقت کھجوروں کی گٹھلیاں کھا رہے تھے۔ حضرت شیخؒ، سیّد احمد کبیرؒ سے گفتگو کرنے لگے۔ پھر جب مخدوم جہانیاںؒ، خانقاہ کا تبرک کھا چکے تو حضرت شیخ جمال خنداںؒ نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''صاحب زادے! تم نے کھجوروں کے ساتھ گٹھلیاں بھی کھالیں؟ آخر ایسا کیوں کیا؟''

خانقاہ میں موجود تمام بزرگ، سات سالہ بچے کے جواب کے منتظر تھے۔

پھر جب مخدوم جہانیاںؒ نے حضرت شیخ جمال خنداںؒ کے سوال کا جواب دیا تو حاضرینِ مجلس حیران رہ گئے۔

''مجھے یہ کھجوریں آپ کے دستِ مبارک سے عطا ہوئی تھیں۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ اس تبرک کی گٹھلیاں زمین پر پھینک دوں۔'' حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے نہایت ادب سے عرض کیا۔

ایک طفلِ ہفت سالہ کا جواب سن کر خانقاہ میں موجود بزرگوں کو تعجب ہوا۔ اور حضرت شیخ جمال خنداںؒ کے ہونٹوں پر تبسم اُبھر آیا۔ پھر حضرت شیخؒ نے مخدوم جہانیاںؒ کو اپنے قریب بلایا اور سر پر ہاتھ رکھ کر انتہائی جذب و شوق کے عالم میں فرمایا۔

''تمہاری ذات سے درویشی کو فروغ حاصل ہوگا اور تم اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔''

اس واقعہ سے اہلِ نظر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کون ہیں اور مستقبل میں آپؒ کا روحانی مقام

کیا ہوگا۔

پھر جب حضرت قاضی بہاؤ الدین کا انتقال ہو گیا تو حضرت مخدوم جہانیاںؒ ملتان تشریف لے آئے اور اپنے والد محترم کے پیر و مرشد حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ کی خانقاہ میں قیام پذیر ہوئے۔ حضرت شیخ رکن الدینؒ، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے تھے۔ آپؒ مخدوم جہانیاںؒ کے ساتھ نہایت شفقت و مہربانی سے پیش آئے اور اپنے حقیقی بھانجے مولانا موسیٰ کو ہدایت کی کہ وہ مخدوم جہانیاںؒ کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھیں۔ مولانا موسیٰؒ کے علاوہ ایک اور عالم دین مولانا مجد الدینؒ نے بھی مخدوم جہانیاںؒ کو اہم مذہبی کتابوں کی تعلیم دی۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپؒ علم کی بے پناہ طلب رکھتے تھے۔ پھر یہی طلب آپؒ کو بیرونِ ہندوستان لے گئی۔ اہلِ نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج سے سات سو سال پہلے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا کس قدر دشوار تھا۔ مگر یہ علم کی پیاس ہی تھی جو حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو ہر وقت بے قرار رکھتی تھی اور اسی تشنہ لبی کو دُور کرنے کے لئے آپؒ نے بے شمار صعوبتیں برداشت کیں۔ ہزاروں میل پیدل سفر طے کیا۔ کبھی خاردار جنگلوں میں اور کبھی تپتے صحراؤں میں، پاؤں آبلوں سے بھر جاتے تھے اور موسم کی سختیاں آپؒ کے چہرۂ مبارک کو جھلسا دیتی تھیں۔ مگر حصولِ علم کی خاطر ایک طالب علم کا یہ سفر جاری رہا۔

❁❁❁

معتبر روایت ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے مختلف اساتذہ سے قرآن مجید کی ساتوں قرأتیں سیکھیں۔ پھر آپؒ مکہ معظمہ میں حاضر ہوئے۔ اللہ کے گھر کی زیارت کی، طواف کیا اور حج کے تمام ارکان ادا کئے۔ اس سعادتِ عظیم سے شرف یاب ہونے کے بعد حضرت مخدوم جہانیاںؒ، شیخ مکہ حضرت عبداللہ یافعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بہت دن تک اس مردِ جلیل کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے اور حدیث و فقہ کی اہم ترین کتابوں کا درس لیا۔

پھر آپؒ مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ خاکِ مدینہ کو سر پر سجایا اور آنکھوں میں لگایا۔ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس طرح حاضری دی کہ اشکوں کے دریا بہہ گئے۔ پھر شیخ مدینہ، عبداللہ مطریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مردِ کامل سے ''صحاح ستہ'' پڑھی۔ حضرت شیخ عبداللہ مطریؒ، آپؒ پر بے پناہ شفقت فرماتے تھے۔ ایک بار حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اپنی مجلسِ درس میں حضرت شیخ عبداللہ مطریؒ کی محبتوں کا ذکر کیا تو آپؒ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے فرمایا۔

''میں حضرت شیخ عبداللہؒ کی نوازشات کا کیا بیان کروں۔ وہ رحمت اللعالمین سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہرِ مقدس میں رہتے تھے۔ اس لئے طالبانِ علم کے لئے خود بھی رحمت بن گئے تھے۔ حضرت شیخؒ تہجد کے وقت میرے حجرے میں اس طرح تشریف لاتے کہ آپؒ کے ایک ہاتھ میں چراغ ہوتا اور دوسرے ہاتھ میں کھانا۔ حضرت شیخؒ کا یہ عمل دیکھ کر مجھے بڑی ندامت ہوتی تھی۔''

یہ حضرت شیخ عبداللہ مطریؒ کی بے پناہ شفقت و محبت ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک بار حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو مسجدِ نبوی امامت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے جس نسخے کے ذریعے ''عوارف'' کا درس لیا تھا، وہ نسخہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مطالعے میں رہ چکا تھا۔ (عوارف المعارف حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے جسے تصوف کی کتابوں میں ایک منفرد مقام حاصل ہے) جب شیخ عبداللہ مطریؒ کی وفات کا وقت قریب آیا تو

انہوں نے وہ نسخہ شیخِ مکہ حضرت عبداللہ یافعیؒ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیج دیا کہ اگر سید جلال الدین بخاریؒ (مخدوم جہانیاںؒ) مکہ معظمہ حاضر ہوں تو انہیں دے دیا جائے۔ چنانچہ شیخِ مدینہ کی خواہش کے احترام میں حضرت عبداللہ یافعیؒ نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے عوارف کا وہ نسخہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو بھجوا دیا۔

جب حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے وہ نسخہ دیکھا تو لانے والے شخص سے پوچھا۔ ''میرے استاد، شیخ عبداللہ مطریؒ کیسے ہیں؟''

بتانے والے نے بتایا۔ ''حضرت شیخ تو دنیا سے رخصت ہو چکے۔''

استادِ گرامی کے وصال کی خبر سن کر حضرت مخدوم جہانیاںؒ زار و قطار رونے لگے۔ پھر جب دل کی حالت کچھ سنبھلی تو آپؒ نے اپنے مہمان سے کہا۔ ''تم نہیں جانتے کہ دنیا سے کون شخص اُٹھ گیا؟ وہ میرے استاد بھی تھے اور محسن و غم خوار بھی۔ ایک بار میں نے حضرت شیخ سے عرض کیا تھا کہ مجھے عوارف کے اس نسخۂ خاص کو دیکھنے کی بہت خواہش ہے۔ جواب میں استادِ گرامی نے فرمایا تھا۔ ''کچھ انتظار کر لو۔ انشاء اللہ یہ نسخہ بہت جلد تم تک پہنچ جائے گا۔'' پھر روز و شب کے ہنگاموں میں میرے ذہن سے بھی یہ بات نکل گئی۔ مگر استادِ گرامی کی محبت کا شکریہ کیسے ادا کروں کہ آپؒ نے بیماری کی سختیوں میں بھی میری اس خواہش کو یاد رکھا۔ خدا حضرت شیخ کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان پر بے مثال رحمتوں کا نزول فرمائے۔''

پھر کچھ دن بعد حضرت مخدوم جہانیاںؒ عراق پہنچ کر حضرت شیخ شرف الدین محمد شاہ تستریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ شرف الدین محمودؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے۔ آپؒ نے ان ہی سے ''عوارف'' کا درس لیا۔

حضرت سیّد علاء الدین علی بن سعد حسینیؒ کا بیان ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ ایک سو اٹھاسی علوم میں کامل مہارت رکھتے تھے۔

حضرت شیخ عبدالحق محمد شاہ دہلویؒ کا بیان ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو چودہ خانوادوں میں خلافت حاصل تھی۔ آپؒ نے بے شمار بزرگوں سے فیضِ روحانی حاصل کیا۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے تمام اسلامی ممالک کی سیر و سیاحت کی۔ اسی وجہ سے آپؒ کو ''جہاں گشت'' بھی کہاں جاتا ہے۔ اسی دوران حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے 36 بار حج کی سعادت حاصل کی۔

❀❀❀

علوم ظاہری حاصل کرنے کے بعد حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ سے بیعت کی اور سلسلۂ ''سہروردیہ'' میں شامل ہو گئے۔

ایک بار چاند رات کو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، حضرت شیخ الاسلام حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے مزارِ مبارک میں مصروفِ عبادت تھے۔ اچانک آپؒ کو یاد آیا کہ کل صبح عید ہے۔ اس خیال کے آتے ہی حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''سرکار! کل مسلمانوں کی عید کا دن ہے۔ سب ایک دوسرے کو ''عیدی'' دیں گے۔ چونکہ میں سرکار کے غلاموں میں شامل ہوں، اس لئے ''مخدوم'' سے اپنی عیدی مانگتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے روضۂ مبارک سے آواز آئی۔

''سید جلال الدین بخاری! تم ''مخدوم جہانیاں'' ہو اور یہی تمہاری عیدی ہے۔''

آپؒ نے بڑی حیرت سے صدائے غیبی سنی۔ پھر آپؒ پر ناقابلِ بیان مسرت و سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ بہت دیر تک حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کرتے رہے۔

نصف شب کے قریب آپؒ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے روضۂ مبارک سے باہر آئے اور حضرت شیخ صدر الدین عارفؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ عارفؒ، حضرت شیخ زکریا ملتانیؒ کے صاحب زادے تھے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کچھ دیر تک مصروفِ عبادت رہے اور پھر آپ نے وہی سوال دہرایا۔

''سرکار! میں آپ کے غلاموں میں ہوں۔ اس لئے مخدومؒ سے اپنی عیدی مانگتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے روضۂ مبارک سے آواز آئی۔ ''تمہاری عیدی وہی ہے جو میرے حضرت بابا نے تمہیں عطا کی ہے۔''

صدائے غیب سن کر حضرت مخدوم جہانیاںؒ پر ایک بار پھر وہی سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔

دوسرے دن عید تھی۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اپنے پیر و مرشد حضرت رکن الدین ابوالفتحؒ کے سلام کو حاضر ہوئے۔ اپنے دل ہی میں طے کر لیا تھا کہ حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی عیدی طلب کریں گے۔ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ نے بڑی محبت سے آپؒ کو گلے لگایا۔ اس سے پہلے کہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ عیدی کا سوال کریں، حضرت شیخ نے بڑے والہانہ انداز میں فرمایا۔

''سیّد! تمہاری عیدی وہی ہے جو حضرت بابا (شیخ صدر الدین عارفؒ) اور میرے دادا (حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ) نے تمہیں دی ہے۔ اب تم مخدوم جہانیاںؒ ہو۔''

یہ سنتے ہی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ پیر و مرشد کے دامن سے لپٹ گئے۔ پھر نہایت رقت آمیز لہجے میں عرض کرنے لگے۔ ''میں کیسا خوش نصیب ہوں کہ تینوں آسمانوں سے مجھے ایک ہی چیز عطا ہوئی۔''

پھر جب آپؒ عیدی لے کر حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ کی خانقاہ سے باہر آئے تو ملتان کے گلی کوچوں میں عجیب سا شور برپا تھا۔ جو شخص بھی آپؒ کو دیکھتا، احترام میں سر جھکا دیتا۔ لوگ آپؒ کو گزرتا ہوا دیکھتے تو بے اختیار پکار اُٹھتے۔ ''وہ حضرت قطب الدین عالم جہانیاںؒ تشریف لا رہے ہیں۔''

❀❀❀

مشہور صوفی سیاح حامد بن فضل اللہ جمالیؒ ''سیر العارفین'' میں تحریر کرتے ہیں:

''میں نے اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ سماء الدینؒ سے سنا ہے کہ ایک بار حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ اپنے آستانے کی دہلیز سے باہر آرہے تھے۔ آستانے کا زینہ کسی قدر نیچا تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے پیر و مرشد کو باہر آتے ہوئے دیکھا تو فوراً زمین پر لیٹ گئے تاکہ حضرت شیخؒ آپ کے سینے پر پاؤں رکھ کر گزر جائیں اور انہیں کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی یہ عقیدت دیکھی تو اپنی انگشت شہادت ہونٹوں میں دبا لی اور بے اختیار ہو کر فرمایا۔

''سیّد جلال الدین! اب اور کیا چاہتے ہو؟ تم ولایت و معرفت کے جس درجے پر پہنچ چکے ہو، اس سے زیادہ انسان کے بس میں نہیں تھا۔ بس اب اُٹھ جاؤ! تم نے خدمتِ شیخ کا حق ادا کر دیا۔''

پیر و مرشد کا حکم سن کر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کھڑے ہو گئے۔

حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ نے اپنے مرید کی چادر کو بوسہ دیا اور پھر بہت دیر مخدوم جہانیاںؒ کو اپنے سینے

سے لگائے رہے۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ فرماتے ہیں۔ "پیرومرشد کی اس کرم نوازی نے میرے دل و دماغ کو مزید روشن کر دیا اور مجھ پر معرفت کے مقامات کا انکشاف ہوا۔"

❀❀❀

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سات سال تک مکہ معظمہ میں مقیم رہے اور حضرت شیخ عبداللہ یافعیؒ کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ ایک دن حضرت شیخ عبداللہ یافعیؒ نے بیت اللہ شریف میں با آواز بلند فرمایا۔

"اگرچہ دہلی کے تمام بڑے بزرگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن ان سب کے روحانی اثرات حضرت سیّد محمودؒ کی ذاتِ گرامی میں موجود ہیں۔ وہ اس زمانے میں شہر دہلی کے چراغ ہیں اور انہی کے دم سے مشائخ کے آداب و اطوار روشن ہیں۔"

حضرت شیخ عبداللہ یافعیؒ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سن کر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے دل میں نیت کر لی۔ "اگر بحکمِ خدا اس سفر سے واپس لوٹا تو سب سے پہلے دہلی حاضر ہو کر حضرت سید نصیرالدین چراغِ دہلیؒ کے دیدار کی سعادت حاصل کروں گا۔"

پھر جب حضرت مخدوم جہانیاںؒ ہندوستان واپس تشریف لائے تو حضرتِ سید نصیرالدین چراغ دہلیؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مجلسِ عرفان طالبانِ شوق سے بھری ہوئی تھی۔ حضرت چراغِ دہلیؒ نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو گلے سے لگایا اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"آؤ سیّد! تمہارا ہی انتظار تھا۔"

یہ سن کر حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو یقین آ گیا کہ حضرت شیخ عبداللہ یافعیؒ نے سچ فرمایا تھا۔

پھر جب مجلسِ درس خالی ہو گئی تو حضرت نصیرالدین چراغِ دہلیؒ نے اپنے مہمان کی تواضع کی اور اسی دوران فرمایا۔ "سیّد! تمہیں حضرت شیخ عبداللہ یافعیؒ کے ذریعے اس فقیر سے حُسنِ ظن پیدا ہوا؟"

حضرت مخدوم جہانیاںؒ سرِ تسلیم پہلے ہی خم کر چکے تھے، اب چراغِ دہلیؒ کے حضور آپؒ کا دل بھی جھک گیا۔ انتہائی پُرسوز لہجے میں فرمانے لگے۔

"حضرت عبداللہ یافعیؒ پر اللہ کی رحمت ہو کہ شیخ نے مجھے آپ کی زیارت سے مشرف کرایا۔"

"اب اور کیا چاہتے ہو سیّد؟" حضرت سیّد نصیرالدین محمود چراغِ دہلیؒ نے فرمایا۔

"آپ کی غلامی کی طلب رکھتا ہوں۔" حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔

"مخدوم جہانیاں ہو کر غلامی کی بات کرتے ہو؟" حضرت چراغِ دہلی کے ہونٹوں پر جاں نواز تبسم اُبھر آیا۔

"اگر میں مخدوم جہانیاں ہوں تو آپ جیسے بزرگوں کی غلامی کے سبب ہوں۔" انکسار کا عجیب مظاہرہ تھا۔

"سید! تمہیں اب کسی اور نسبت کی ضرورت نہیں۔" حضرت چراغِ دہلیؒ نے فرمایا۔

"پیاسا ہوں تو دریائے معرفت کے کنارے پہنچا ہوں۔" حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں عرض کیا۔ "ضرورت مند ہوں تو آستانۂ کرم پر ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوں۔"

آخر حضرت سیّد نصیرالدین محمود چراغِ دہلیؒ مجبور ہو گئے اور آپؒ نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل فرما لیا۔ اگرچہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ بنیادی طور پر سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگ ہیں لیکن سلسلۂ چشتیہ میں

بھی آپؒ کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ تمام معتبر حوالوں سے ثابت ہے کہ حضرت چراغِ دہلیؒ نے آپؒ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا تھا۔

❀❀❀

سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت ہونے کے باوجود حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، سلسلۂ عالیہ قادریہ سے بھی بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ''اخبار الاخیار'' کی روایت کے مطابق ایک دن حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے برسرِ مجلس حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا یہ قولِ مبارک دہرایا۔

''خوشخبری ہو ان لوگوں کو جنہوں نے مجھے دیکھا اور میرے دیکھنے والوں کو دیکھا۔ اور میرے دیکھنے والوں کے دیکھنے والوں کو دیکھا۔''

پھر نہایت جذب کے عالم میں فرمایا۔

''بے شک! آپ قطبِ عالم ہیں اور سچے ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ حق تعالیٰ حضرت شیخؒ کے اس قول کے مطابق مجھ پر بھی رحمت فرمائیں گے۔''

پھر حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اپنی رویت کے سلسلے کو ایک واسطے سے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تک پہنچایا۔ آپؒ نے شیخ شرف الدین محمود شاہ تستریؒ سے ''عوارف المعارف'' کا درس لیا۔ شیخ شرف الدین محمودؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ تھے۔ عوارف کا درس لینے کے بعد حضرت مخدوم جہانیاںؒ فرمایا کرتے تھے۔

''میں نے شیخ شرف الدین محمودؒ کو دیکھا ہے۔ انہوں نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کو دیکھا ہے۔ اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے حضرت غوث الاعظم شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کو دیکھا ہے۔''

اسی جوشِ عقیدت نے حضرت مخدوم جہانیاں کو معرفت کا سمندر بنا دیا تھا۔ آپؒ نے بے شمار بزرگوں سے فیضِ روحانی حاصل کیا اور پھر ''مخدوم جہانیاں'' کے منصبِ عظیم پر فائز ہوئے۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے دستِ حق پرست پر بہت سے ہندو ایمان لائے اور کفر کے اندھیروں سے نکل کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئے۔

حضرت قطب عالمؒ اور حضرت شاہ عالمؒ کے مزارات احمد آباد (گجرات، ہندوستان) میں مرجع خاص و عام ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے ذریعے ہندوستان کے تاریک ترین گوشوں میں اسلام کی روشنی پھیلی۔ حضرت قطب عالمؒ اور حضرت شاہ عالمؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے پوتے اور پڑپوتے تھے۔

مغربی پنجاب (پاکستان) میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی تبلیغی کوششوں سے متاثر ہو کر ہندوؤں کے جو قبیلے ایمان لائے، ان کی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے۔ ان میں راجپوتوں کا مشہور قبیلہ ''کھرل'' بھی شامل ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ جب بھی اوچ شریف سے دہلی تشریف لاتے تو بہت سے اہلِ ہنود آپؒ کے دیدار کے لئے حاضر ہوتے۔ پھر جیسے ہی ان کی نظر ایک مردِ مومن کے چہرے پر پڑتی، وہ اپنے آبائی مذہب کو فراموش کر دیتے۔ ماتھوں سے قشقے کا نشان کھرچ دیتے اور گلے میں پڑا ہوا زُنار (جنیو) توڑ کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتے۔ پنجاب کا مشہور قبیلہ ''نون'' بھی حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے ہاتھ پر ایمان لایا تھا۔

❀❀❀

سلطان محمد تغلق بھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے آپؒ کو ''شیخ

الاسلام" کا معزز ترین عہدہ دیا اور چالیس خانقاہیں آپؒ کے تصرف میں دے دیں۔ مگر حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اس عنایتِ خسروانہ کو قبول نہیں کیا اور آپؒ دہلی چھوڑ کر حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ شاید یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب سلطان محمد تغلق اپنے دل میں صوفیوں اور درویشوں کے لئے نرم گوشہ رکھتا تھا۔ بعد میں اس کے عقائد تبدیل ہو گئے تھے اور پھر وہ نئے فکری انقلاب کے زیرِ اثر درویشوں کی دل آزاری کر کے لذت حاصل کیا کرتا تھا۔

سلطان محمد تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق تخت نشین ہوا۔ اگرچہ فیروز شاہ تغلق، شیخ علاء الدین اجودھنیؒ کا مرید تھا لیکن حضرت مخدومِ جہانیاں جہاں گشتؒ سے غیر معمولی عقیدت رکھتا تھا۔ جب آپؒ اوچ سے دہلی تشریف لائے اور فیروز آباد کے قریب پہنچے تو فرمانروائے ہندوستان بہ نفسِ نفیس استقبال کے لئے حاضر ہوتا اور بڑے عزت و احترام کے ساتھ حضرت شیخؒ کو ان کی قیام گاہ تک پہنچاتا۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ جب تک دہلی میں قیام فرماتے، سلطان فیروز شاہ تغلق دوسرے تیسرے روز پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا۔ بہت دیر تک درویش اور ایک مطلق العنان حکمران میں محبت آمیز گفتگو جاری رہتی۔ دیکھنے والے بڑی حیرت سے دیکھتے کہ ایک مردِ بوریا نشین کی مجلس میں درویشی و سلطانی کا فرق مٹ گیا ہے۔

اہلِ شہر کو یہ بات معلوم تھی کہ سلطان فیروز شاہ تغلق، حضرت مخدوم جہانیاںؒ سے ملاقات کے لئے آپؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوتا ہے۔ نتیجتاً آپؒ کے گرد حاجت مندوں کی ایک بھیڑ لگ جاتی اور لوگ اپنی اپنی ضرورتیں بیان کرتے۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ اپنے ایک خدمت گار سے فرماتے کہ تمام لوگوں کی عرضداشتیں قلم بند کر لی جائیں۔

پھر جب سلطان فیروز شاہ تغلق حاضرِ خدمت ہوتا تو حضرت مخدوم جہانیاںؒ وہ ساری درخواستیں والیٔ ہند کے سامنے رکھ کر فرماتے۔

"یہ آپ کی رعایا کا احوال ہے جو ان کاغذات پر درج ہے۔ دہلی کے لوگ سمجھتے ہیں کہ شہنشاہ کو اس فقیر سے عقیدت مندانہ نسبت ہے۔ میں نے حاجت مندوں کی درخواستیں وصول کر لی ہیں، اب آپ جو مناسب سمجھیں، حکم صادر کر دیں۔"

سلطان فیروز شاہ تغلق ایک ایک درخواست کو غور سے پڑھتا اور سائل کی ضرورت کے مطابق حکم جاری کر دیتا۔

781ھ میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ دہلی تشریف لائے تو سلطان فیروز شاہ تغلق، سومانہ کی مہم پر دارالحکومت سے باہر گیا ہوا تھا۔ فرمانروائے ہند سے ملاقات کرنے کے لئے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو دہلی میں دس ماہ تک قیام کرنا پڑا۔ پھر جب سلطان فیروز شاہ تغلق ایک فاتح کی حیثیت سے واپس لوٹا اور اسے معلوم ہوا کہ مخدومؒ اس کا انتظار کر رہے ہیں تو وہ قصرِ سلطانی جانے کے بجائے خانقاہ میں حاضر ہوا۔

"مخدوم! آپ نے اس قدر زحمتِ انتظار برداشت کی؟" سلطان فیروز شاہ تغلق نے نہایت معذرت خواہانہ لہجہ میں عرض کیا۔

"زحمت کیسی؟" حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ہونٹوں پر تبسم ابھر آیا۔ "تم اپنے کاموں میں مصروف رہے اور یہ فقیر اپنا فریضہ انجام دیتا رہا۔"

پھر کچھ دیر بعد حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے بادشاہِ ہند سے پوچھا۔ "سلطان کا یہ جنگی سفر کیسا رہا؟"

"اللہ کے فضل سے دشمن سرنگوں ہو گئے اور آپ کے خادم کا پرچم بلند رہا۔" سلطان فیروز شاہ نے نہایت

عقیدت وانکسار کے ساتھ عرض کیا۔
"اللہ تمہارا پرچم بلند ہی رکھے گا۔" حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے فرمایا۔ "مالکِ حقیقی نے چاہا تو دنیا سے ناکام ونامراد نہیں جاؤ گے۔"

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے 799ھ میں وفات پائی۔ اس وقت فرمانرائے ہند کی عمر 90 سال تھی۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے چالیس سال تک انتہائی کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ وہ آخری سانس تک ایک عظیم الشان سلطنت کا حکمران تھا۔ معتبر روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بزرگوں کی دعاؤں کے زیرِ سایہ تھا۔ حضرت سیّد نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے ساتھ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی دعائیں بھی اس کے شاملِ حال تھیں۔

ایک بار سلطان فیروز شاہ تغلق حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا تو آپؒ اشراق کی نماز پڑھ رہے تھے۔ جب تک مخدومؒ نماز میں مشغول رہے، سلطان ادب کے ساتھ کھڑا رہا۔ پھر جب حضرت مخدوم جہانیاںؒ نماز سے فارغ ہوئے تو آپؒ نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ سلطان سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔

"میں فرمانروائے ہند کا ممنون ہوں کہ اتنے قیمتی وقت میں سے چند لمحے اس فقیر کو بھی دے دیئے۔" حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے فیروز شاہ تغلق کی آمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ تو میری سعادت ہے کہ میں نے مخدومؒ کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کیں۔" سلطان فیروز شاہ تغلق نے جواباً عرض کیا۔

پھر جب فرمانروائے ہند واپس جانے لگا تو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اُسے رخصت کرنے کے لئے زینے سے اُترنے لگے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے آپؒ کا ہاتھ پکڑ کر روکا اور نیازمندانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "مخدومؒ کو یہ زیب نہیں دیتا۔"

"کیوں؟" حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے فرمایا۔ "جب تم مجھ سے ملنے یہاں آسکتے ہو تو پھر تمہاری تعظیم تو واجب ہے۔"

"یہ مخدومؒ کا کرم ہے۔" سلطان فیروز شاہ تغلق نے کسی تکلف کے بغیر عرض کیا۔ "مگر حقیقتاً مخدومؒ ہی واجب التعظیم ہیں۔"

واضح رہے کہ سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگ، شاہانِ وقت سے ربط وضبط رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر درویش، حکمرانوں سے دُور رہیں گے تو برسرِ اقتدار طبقہ بھی مذہب سے دُور ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ گمراہیاں سلطان کا احاطہ کرلیں گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ امراء سے تعلق قائم کیا جائے اور ان کے قریب رہ کر اصلاح کی کوششیں کی جائیں۔ شاہانِ وقت کے ساتھ تعاون کا نظریہ سب سے پہلے حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے پیش کیا تھا۔ دراصل یہ آگ اور پانی کا میل تھا۔ اگر پانی کی مقدار اور طاقت کم ہو تو آگ اسے بھی بھاپ بنا کر اُڑا دیتی ہے۔ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ ولیٔ کامل تھے۔ اسی لئے کانٹوں بھرے راستے سے بحفاظت گزر گئے۔ آپؒ کے صاحبزادے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ اور پوتے حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ بھی بڑی احتیاط سے دامن بچا کر چلے۔ سلاطینِ ہند سے دونوں بزرگوں کے تعلقات اس طرح قائم رہے کہ ان کی روحانیت پر کوئی حرف نہیں آیا۔ مگر یہ ایک کارِ دشوار تھا۔ بعد میں آنے والے درویش روحانی اعتبار سے اتنے قوی اور سریع الاثر نہیں تھے کہ امراء کو اپنے آستانوں پر خم رکھتے۔ درویشی اور سلطانی کے درمیان توازن برقرار نہ

ہ سکا۔ کہاں وہ زمانہ کہ بادشاہ ایک درویش کے دیدار کے لئے گھنٹوں خانقاہ کے دروازے پر کھڑا رہتا تھا...... ور کہاں یہ صورتِ حال کہ درویش خود کسی امیر کی زیارت کے طلب گار رہتے تھے۔ مختصر یہ کہ سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگوں نے حکمرانوں کے ساتھ تعاون کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ ایک ہی صدی کے اندر اپنے حقیقی نقش و نگار کھو بیٹھا۔ ان بزرگوں کے جانشینوں نے محتاط روش کو برقرار نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ درویشی مرضیٔ شاہ کی پابند ہو کر رہ گئی۔

اس کے برعکس سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ، سلاطینِ زمانہ اور امرائے وقت سے میل جول کو درویش کے لئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ اور حضرت سید محمد گیسودرازؒ کی مثالیں تاریخ کے اوراق میں آج بھی محفوظ ہیں۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ شاہانِ وقت سے گہرے مراسم رکھتے تھے مگر آپؒ نے درویشی کو امراء کی کاسہ لیسی سے محفوظ رکھا۔ آپؒ نے قدم قدم پر درویشی کا بھرم رکھا اور آخری سانس تک باوقار زندگی بسر کی۔ بے شک آپ سینکڑوں بار دربارِ سلطانی میں تشریف لے گئے مگر دیکھنے والوں نے بادشاہِ وقت کو بھی آپؒ کے دروازے پر کھڑے دیکھا۔ یہی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا کمال ہے کہ آپؒ نے درویشی اور سلطانی میں توازن برقرار رکھا۔ آپؒ ایک مردِ آزاد تھے، اس لئے دولت و اقتدار سے محفوظ رہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ پابندِ شریعت بھی تھے اور عاملِ سنت بھی۔ آپؒ اکثر اپنی تقریروں میں فرمایا کرتے تھے۔

''حقیقت شریعت ہے اور جب تک کوئی شخص شریعت کو پورے یقین اور مضبوطی سے نہیں پکڑے گا، حقیقت تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

ایک موقع پر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے ارشاد فرمایا۔

''جو انسان اس دنیا میں شریعت سے عاری ہے، وہ طریقت اور حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا۔''

ایک اور موقع پر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے درویشی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

''جو شخص شیخ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن شریعت سے واقف نہ ہو، وہ شیخ نہیں جاہل ہے۔ کوئی صالح آدمی اس وقت تک ولی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اسے شریعت، حقیقت اور طریقت کا علم حاصل نہ ہو۔''

ایک بار حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اتباعِ سنت کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ آپؒ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''سالک کو چاہئے کہ وہ سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرے۔ بس ایک اسی ذریعے سے اسے حق تعالیٰ کا تقرب حاصل ہو گا۔ بعض بدعتی لوگ، بدعت کو قربِ حق کا ذریعہ جانتے ہیں اور اپنے جسموں پر لوہا اور تانبا پہنتے ہیں۔ داڑھی ترشواتے ہیں جیسا کہ قلندروں کا شیوہ ہے لیکن اس سے تقرب حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ دوری کی علامت ہے اور کھلی گمراہی ہے۔''

ایک بار اوچ میں ایک گمنام شخص آیا اور ایک مکان میں گوشہ نشین ہو کر دن رات عبادت کرنے لگا۔ کچھ دنوں تک مقامی باشندوں نے اسے شدید ریاضت کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ وہ علی الاعلان کہا کرتا تھا۔

"لوگو! میری باتیں غور سے سنو۔ میں ولی اللہ ہوں اور صرف تمہاری فلاح و بہبود کے لئے آیا ہوں۔ تمہیں جو کچھ مانگنا ہے، مجھ سے مانگ لو۔"

لوگوں نے بڑی حیرت سے اس کی باتیں سنیں۔ پھر کچھ حاجت مند آگے بڑھے اور انہوں نے اس شخص کے سامنے اپنی اپنی ضرورتیں بیان کیں۔

وہ شخص کچھ دیر تک مراقبے کی حالت میں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔ حاضرین اس کے ادب و احترام میں اس طرح ساکت تھے جیسے وہ انسان نہ ہوں، پتھر کے مجسمے ہوں۔ کچھ دیر بعد اس شخص نے آنکھیں کھولیں اور حاضرین کو گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ لوگوں نے اس حالت کو درویشی کا رنگِ جلال سمجھا۔

"سنو اے غمزدہ لوگو! سنو۔ میں نے تمہاری ضرورتیں حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیں۔ مجھے جواب دیا گیا کہ میرے پاس آنے والے سب لوگ بامراد ہوں گے۔"

پھر اس شخص نے ایک حاجت مند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تجھے اولادِ نرینہ کی خواہش ہے۔ تیری یہ مراد بہت جلد پوری ہوگی۔ میں تجھے سب لوگوں کے سامنے ایک خوب صورت فرزند کی بشارت دیتا ہوں۔ جب وہ لڑکا اس دنیا میں سانس لینے لگے تو اسے میرے پاس لے کر آنا تاکہ میں نومولود کو اپنی دعاؤں سے سرفراز کروں۔"

پھر وہ شخص ایک دوسرے سائل سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تیرا گمشدہ بیٹا بہت جلد تجھ سے آملے گا۔ پھر تیرا بے قرار دل سکون پا جائے گا اور کشمکشِ انتظار سے جلتی ہوئی تیری آنکھیں ٹھنڈک حاصل کریں گی۔"

اس طرح اس شخص نے کئی ضرورت مندوں کے سوالوں کے جواب دیئے اور انہیں کھلے الفاظ میں بامراد ہونے کی خوشخبری سنائی۔

کچھ دن بعد اوچ میں ہر طرف ایک شور سا برپا ہو گیا۔ جن لوگوں نے اس شخص سے اپنے حق میں دعاؤں کی درخواست کی تھی، ان سب کی دلی مرادیں بر آئیں۔ پھر یہ بات مشہور ہو گئی کہ وہ ایک "مستجاب الدعوات" بزرگ ہیں، جن کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ حقیقت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ دنیا ضرورت مندوں سے بھری ہوئی ہے۔ جب ایک شخص نے اپنی حاجت روائی کا قصہ بیان کیا تو سینکڑوں انسان اپنی اپنی جھولیاں پھیلائے ہوئے اس شخص کے دروازے پر کھڑے نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ بعض امراء بھی اس کے معتقد ہو گئے اور وہ شخص دیکھتے ہی دیکھتے ایک با اثر روحانی شخصیت بن گیا۔

اس وقت حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ دہلی میں قیام فرما تھے پھر جب آپؒ اپنے وطن تشریف لائے تو عقیدت مندوں نے عرض کیا۔

"مخدوم! کچھ دنوں سے یہاں ایک ولی اللہ کا قیام ہے اور ہر طرف ان ہی کی کرامتوں کا شور ہے۔"

"تم لوگوں نے ان کے دیدار کی سعادت حاصل کی؟" حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے اپنے عقیدت مندوں سے پوچھا۔

عقیدت مندوں نے اثبات میں جواب دیا جسے سن کر حضرت مخدومؒ کے دل میں ان بزرگ سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔

پھر ایک دن حضرت مخدوم جہانیاںؒ بھی اس شخص کی مجلس میں تشریف لے گئے، جس کی روحانیت کے چرچے عام تھے۔ مقامی باشندوں نے آپؒ کو مکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے مگر وہ شخص اپنی نشست پر بیٹھا رہا۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اس کے اس طرزِ عمل پر کوئی توجہ نہیں دی اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔

اس شخص نے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی طرف دیکھا اور پھر نہایت فخریہ انداز میں کہنے لگا۔

''سیّد! ابھی حق تعالیٰ میرے پاس سے اُٹھ کر گیا ہے۔''

حضرت مخدوم جہانیاںؒ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک مسلمان اس قسم کی گفتگو کر سکتا ہے۔

''تم نے جو کچھ کہا، میرے کانوں نے وہی سنا، یا پھر میری سماعت میں فرق آ گیا ہے؟'' حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اتمامِ حجت کے طور پر فرمایا کہ کسی قسم کا شبہ باقی نہ رہے۔

''نہیں سید! میں نے جو کچھ کہا، تم نے ٹھیک ٹھیک سنا۔'' اس شخص کے لہجے کی رعونت کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔ ''حق تعالیٰ ابھی میرے پاس سے اُٹھ کر گیا ہے۔''

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ فطرتاً نہایت شیریں کلام تھے اور زبردست قوتِ برداشت رکھتے تھے۔ مگر اس شخص کی گفتگو سن کر سخت برہم ہوئے اور آپؒ کا چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا۔

''تُو اپنے ہوش میں ہے؟''

''سیّد! تم نے میرے اندر بے ہوشی کی کون سی علامت دیکھی؟'' وہ شخص کچھ اور مغرور نظر آنے لگا تھا۔

''اگر تُو ہوش میں ہے تو پھر کفر بک رہا ہے۔'' حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا لہجہ شرربار تھا۔

''سیّد! میں وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔'' وہ شخص مسلسل اپنی بات پر اصرار کر رہا تھا۔

''تُو کافر ہو گیا ہے۔'' حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے غضب ناک لہجے میں فرمایا۔ ''تجھ پر لازم ہے کہ تُو پھر سے کلمۂ شہادت پڑھ اور اپنے ایمان کی تجدید کر۔''

''مجھے تجدیدِ ایمان کی کیا ضرورت ہے؟'' اس شخص کے تکبر میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ''تمہارے ہی شہر کے ہزاروں انسان میرے ایمان پر گواہی دیتے ہیں۔''

''وہ لوگ تو بے خبر ہیں۔ ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ تیرا قلب کتنا سیاہ ہے اور تیری روح میں کس قدر کثافت بھری ہوئی ہے۔'' حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے انتہائی طیش کے عالم میں فرمایا۔ ''معاذ اللہ! اگر سارا عالم بھی گواہی دینے لگے، تب بھی تیرے کفر میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔''

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے بہت کوشش کی مگر وہ شخص اپنے گناہِ عظیم سے تائب نہیں ہوا اور آخری وقت تک یہی کہتا رہا۔ ''حق تعالیٰ روزانہ میرے پاس آتا ہے۔''

آخر مجبور ہو کر حضرت مخدوم جہانیاںؒ اُس کی مجلس سے اُٹھ گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ آپؒ کے چہرۂ مبارک پر شدید اذیت و کرب کے آثار نمایاں تھے۔ پھر حضرت مخدومؒ اسی حالت میں قاضیٔ شہر کے پاس تشریف لے گئے۔

''آپ کو کچھ خبر ہے کہ اس شہر میں کیا ہو رہا ہے؟'' حضرت مخدوم جہانیاں نے انتہائی ناخوشگوار لہجے میں قاضیٔ شہر سے سوال کیا۔

''کیا ہوا مخدوم؟'' قاضیٔ شہر نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا کسی انسان کو قتل کر دیا گیا یا کسی کا مال و متاع لوٹ

لیا گیا؟"

"اس سے بھی سنگین واقعہ رونما ہو گیا اور آپ کو خبر تک نہ ہو سکی۔" حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے فرمایا۔ "ایک شخص مسلمانوں کے عقائد کو قتل کرنے کی فکر میں ہے اور آپ گہری نیند سو رہے ہیں۔"

قاضیٔ شہر نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے فرمایا۔ "مجھے آپ کی بے خبری پر افسوس ہے۔ اتنی بڑی قزاقی ہو رہی ہے اور آپ حیران ہو کر پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا؟ فلاں شخص جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے پاس آتا ہے، اسے اپنی عدالت میں طلب کیجئے۔ اگر وہ تائب ہو جائے تو اسے معاف کر دیجئے ورنہ حدِ شرعی جاری کر کے اسے قتل کرا دیجئے۔"

قاضیٔ شہر نے بھی اس شخص کی کرامتوں کے بہت سے افسانے سنے تھے، اس لئے مخدومؒ سے کہنے لگا۔ "یہاں کے لوگ تو اسے ایک پارسا انسان سمجھتے ہیں۔"

"میں اس پر تہمت نہیں لگا رہا ہوں۔" حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے فرمایا۔ "انصاف کے تمام تقاضے پورے کیجئے اور اسے صفائی کا موقع دیجئے۔"

قاضیٔ شہر جانتا تھا کہ اس شخص کے عقیدت مندوں کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ اس لئے مخدومؒ کو ٹالنے کے لئے کہنے لگا۔

"سیّد! آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں تحقیق کے بعد اس شخص کے مقدمے کا فیصلہ سنا دوں گا۔ اگر وہ مجرم پایا گیا تو اسے سزا سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ مطمئن ہو کر اپنے گھر تشریف لے آئے۔

پھر کچھ دن بعد آپؒ نے اپنے خدمت گاروں سے پوچھا۔ "اُس جھوٹے ولی کا کیا حال ہے؟ اس میں کوئی تبدیلی آئی یا نہیں؟"

"سیّدی! اُس کے دروازے پر عقیدت مندوں کا تو وہی ہجوم ہے۔" خدمت گاروں نے عرض کیا۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو قاضیٔ شہر کی اس بے حسی سے بہت دکھ پہنچا۔ آپؒ نے فوراً حاکمِ اوچ کے نام ایک خط تحریر فرمایا۔

"مجھے یہ جان کر شدید اذیت پہنچی ہے کہ آپ نے اس فقیر کی درخواست کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اگرچہ وہ درخواست میرے کسی ذاتی کام کے لئے نہیں تھی۔ اور یہ مسئلہ کسی دنیاوی خواہش سے وابستہ نہیں تھا۔ یہ تو محض ایک دینی خدمت تھی، جسے کسی تاخیر کے بغیر تکمیل تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر میں نے معتبر آدمیوں کی زبانی سنا ہے کہ وہ نام نہاد ولی اللہ ابھی تک اسی زور و شور سے اپنی گمراہ کن روحانیت کے دعوے کر رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ نے اس نازک ترین معاملے میں اس قدر پس و پیش سے کیوں کام لیا؟ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ اس سلسلے میں جانبداری سے کام لے رہے ہیں اور خود بھی اس شخص کے روحانی دعوؤں سے متاثر نظر آ رہے ہیں یا پھر اپنے دل و دماغ پر اس کے عقیدت مندوں کا دباؤ محسوس کر رہے ہیں۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو، میری نظر میں آپ نے مجرمانہ غفلت سے کام لیا۔ آپ کو دی ہوئی مہلت کا وقت تو گزر چکا لیکن آخری تنبیہہ کے طور پر یہ فقیر ایک بار پھر عرض کر رہا ہے کہ اس شخص کو فوری طور پر اپنی عدالت میں طلب کیجئے۔ اگر وہ اپنے گناہ سے تائب ہو جاتا ہے تو اسے معاف کر دیجئے ورنہ حدِ شرعی جاری کر کے اس کے قتل کا اعلان کیجئے تاکہ دوسرے گمراہوں کو اس واقعے سے عبرت حاصل ہو۔"

اپنے مکتوب کے آخر میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے تحریر کیا۔
''اگر اس بار بھی آپ نے میری درخواست پر توجہ نہیں دی تو پھر یہ فقیر، سلطان فیروز شاہ تغلق سے رجوع کرے گا۔''

قاضئ شہر نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا خط پڑھا تو پریشان نظر آنے لگا۔ واقعہ یہی تھا کہ اوچ اور گردونواح کے بڑے بڑے لوگ اس شخص کے حلقۂ عقیدت میں شامل تھے۔ اس لئے قاضئ شہر اس کے خلاف کارروائی کرنے سے گھبراتا تھا۔ مگر جب حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اس مقدمے کو سلطان فیروز شاہ تغلق کی عدالت میں پیش کرنے کی بات کہی تو قاضئ شہر کو اپنے عہدہ و منصب کی فکر لاحق ہو گئی۔ قاضئ شہر اس راز سے واقف تھا کہ فرمانروائے ہندوستان، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتا ہے۔ اگر آپؒ نے سلطان سے اس کی غیر ذمہ داری کی شکایت کر دی تو پھر وہ اس عہدے پر برقرار نہ رہ سکے گا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر قاضئ شہر نے اس نام نہاد ولی سے خفیہ طور پر رابطہ قائم کیا اور صاف صاف کہہ دیا۔

''میں اب تک تمہیں مخدوم جہانیاںؒ کے عتاب سے بچاتا رہا مگر وہ دن زیادہ دور نہیں کہ تم پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا۔ مخدومؒ شمشیرِ برہنہ بنے ہوئے ہیں اور وہ تمہارا مقدمہ، سلطانِ معظم کی عدالت تک لے جانا چاہتے ہیں۔ والئ ہندوستان، فیروز شاہ تغلق، مخدومؒ کے زیرِ اثر ہے۔ اس لئے وہاں تمہاری کوئی منطق کام نہیں آئے گی۔ بھلائی اسی میں ہے کہ راتوں رات یہاں سے چلے جاؤ۔ میں نے تمہارے لئے شہر کے تمام دروازے کھلے چھوڑ دیئے ہیں۔''

بعض روایتوں میں درج ہے کہ قاضئ شہر نے اپنے ایک رازدار کے ذریعے اس شخص تک یہ پیغام پہنچایا تھا۔ اور بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حاکمِ اوچ خود اس نام نہاد ولی کی خانقاہ میں پہنچا تھا اور رات کے اندھیرے میں اس سے فرار ہو جانے کے لئے کہا تھا۔

پھر وہ شخص شب کی تاریکی میں اپنے چند خدمت گاروں کے ساتھ اوچ کی حدود سے نکل کر کسی گمنام مقام کی طرف چلا گیا۔

ابھی حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، سلطان فیروز شاہ تغلق سے رابطہ قائم کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک خدمت گار نے عرض کیا۔

''سیدی! وہ شخص غائب ہے اور اس کی خانقاہ ویران پڑی ہے۔ عقیدت مند، دروازے کے سامنے کھڑے ہیں مگر دروازے میں تالا پڑا ہوا ہے۔''

''وہ شخص چلا گیا؟'' حضرت مخدوم جہانیاںؒ اپنے خادم کی اطلاع پر حیران رہ گئے۔

پھر حضرت مخدومؒ، قاضئ شہر کے پاس تشریف لے گئے۔

''میرے آدمیوں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ وہ شخص رات کے اندھیرے میں کہیں غائب ہو گیا ہے۔''

''مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔'' قاضئ شہر نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو آپ کی خواہش کے مطابق اسے اپنی عدالت میں طلب کرنے والا تھا۔''

''یہ صرف آپ کی خواہش نہیں تھی بلکہ ہر صحیح العقیدہ مسلمان کا مطالبہ تھا۔'' حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے افسردہ لہجے میں فرمایا۔ ''مجھے تو آپ سے اس بات کی شکایت ہے کہ اس قدر سنگین معاملے میں اتنی سستی اور تاخیر سے کیوں کام لیا گیا؟''

"اب اس قصے کو چھوڑیئے مخدوم صاحب!" قاضیٔ شہر نے سرسری لہجے میں کہا جیسے اس کے نزدیک اس واقعے کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ "سرزمینِ اوچ اُس کے وجود سے خالی ہوگئی۔ اور آپ یہی تو چاہتے تھے۔"

"اب وہ اپنے پراگندہ اور گمراہ کن عقائد سے کسی دوسری زمین پر بسنے والوں کو متاثر کرے گا۔" یکایک حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا لہجہ انتہائی ناخوشگوار ہوگیا تھا۔ "اسے ہر حال میں اپنے عقائد سے تائب ہونا تھا۔ یا پھر شریعت کی تلوار سے قتل ہو جانا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے گا، اللہ کے سادہ دل بندوں کو گمراہ کرتا رہے گا۔ اور اس کا عذاب کسی حد تک تمہاری گردن پر بھی ہوگا۔" یہ کہہ کر حضرت مخدوم جہانیاںؒ واپس تشریف لے آئے۔

پھر ایک دن کسی عقیدت مند نے آپؒ سے برسرِ مجلس دریافت کیا۔ "سیّدی! ہرچند کہ وہ شخص گمراہ تھا مگر پھر بھی اُس کی ذات سے کرامات کا ظہور ہوتا تھا۔"

"یہ کرامت نہیں تھی۔" حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے جواباً فرمایا۔ "اللہ کے یہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ اب یہ اتفاق تھا کہ لوگوں کے کام ان کی مرضی کے مطابق ہو گئے اور ان بے خبروں نے اپنی حاجت روائی کو اس شخص کی کرامت سے منسوب کر دیا۔ تم لوگ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ ہندوستان میں بے شمار بت پرست موجود ہیں جو دن رات پتھر کے مجسّموں سے دلی مرادیں مانگتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ ان کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں اور وہ بے جان دیوتاؤں کو اپنا مشکل کشا سمجھنے لگتے ہیں۔ اب کیا ہم ان واقعات کو پتھر کے مجسّموں کی کرامات سے تعبیر کریں گے؟ ہرگز نہیں! کارسازِ حقیقی صرف اللہ ہے اور وہی تمام مخلوقات کا مشکل کشا ہے۔ جس نے اس راز کو پالیا، ہدایت پا گیا۔ اور جو شیطان کے بنائے ہوئے طلسم میں اُلجھ گیا، ہلاک ہوگیا۔ وہ شیطان تھا جو اس گمراہ شخص کے پاس آتا تھا۔ اور شیطان ہی کے ورغلانے پر وہ شخص ہذیان بکا کرتا تھا کہ حق تعالیٰ اس کے پاس آتا ہے۔"

❀❀❀

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ ہر حال میں سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ آپؒ پانچ وقت کی نماز کے علاوہ تہجد، اشراق، چاشت، تراویح اور نفل اس قدر پڑھتے جتنے کہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ادا فرماتے تھے۔ زیادہ تر وہی اوراد و وظائف پڑھتے جن کا حدیثوں میں ذکر آیا ہے۔ عبادت میں ساری ساری رات نہ جاگتے بلکہ کچھ دیر سو بھی جاتے۔ اگر کوئی شخص شب بیداری کے بارے میں سوال کرتا تو حضرت مخدوم جہانیاںؒ فرماتے۔

"جو شخص عبادت میں رات بھر جاگتا رہا، اس نے ترکِ سنت کیا۔ کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانِ مقدس تو یہ ہے کہ میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔"

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے بلکہ دوسروں کو بھی شریکِ طعام کرتے۔ ایسے مواقع پر حضرت مخدومؒ حاضرین کو مخاطب کر کے فرماتے۔ "حدیث شریف میں ہے کہ وہ شخص ملعون ہے جو تنہا کھانا کھاتا ہے، اپنے غلام کو مارتا ہے اور بخل کرتا ہے۔"

آپؒ کھانا کھا کر دو رکعت نفل ادا کرتے، پھر فرماتے۔ "جو شخص شکر طعام کے طور پر دوگانہ ادا نہیں کرتا اور سو رہتا ہے، اس کا دل سیاہ اور سخت ہو جاتا ہے۔"

ایک بار سلطان فیروز شاہ تغلق نے آپؒ کی خدمت میں چونتیس جوڑے بھیجے۔ حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ نے سلطانی کارندے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"سلطان کی اس نوازش کا بہت بہت شکریہ لیکن اگر یہ لباس شریعت کے مطابق نہیں ہوا تو میں اسے ہرگز استعمال نہیں کروں گا۔"

ایک موقع پر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے فرمایا۔ "ریشم اور سونا مسلمان مردوں پر حرام اور عورتوں کے لئے حلال کیا گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمانِ مقدس ہے کہ جس کا کپڑا باریک ہوا، اس کا دین باریک ہوا۔"

ایک بار ایک مرید نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو جوتوں کا ایک جوڑا پیش کیا۔ آپؒ نے اسے قبول کرتے ہوئے فرمایا۔ "نعلین پہننا سنت ہے۔ میں نے مدینہ منورہ میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعلین مبارک کو دیکھا تھا، انہیں اپنی آنکھوں سے لگایا تھا اور سر پر رکھا تھا۔"

جب بھی کوئی عقیدت مند تحفہ پیش کرتا تو آپؒ کسی نہ کسی صورت میں اس کا بدلہ ضرور دیتے۔ پھر فرماتے۔ "حدیث پاک میں ہے کہ جو شخص تمہارے لئے ہدیہ لائے، تم اس کا بدلہ ضرور دو۔ اگر بدلہ دینے پر قادر نہیں ہو تو اس کے لئے دعائے خیر کرو۔ یہاں تک کہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہاری دعا اس شخص کے ہدیہ کا بدلہ ہو گئی ہے۔"

مختصر یہ کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ معمولی باتوں میں بھی اتباعِ سنت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی تھا، جس نے آزمائش کے ہر مرحلے میں آپؒ کو ثابت قدم رکھا۔

سلطان محمد تغلق کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت مخدوم جہاں گشتؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ سلطان نے آپؒ کو شیخ الاسلام کا عہدہ دینے کے بعد چالیس خانقاہیں آپؒ کے تصرف میں دے دیں۔ حضرت مخدومؒ کو اس بات کی خبر ملی تو آپؒ "شیخ الاسلام" کی کرسی پر جلوہ افروز ہونے کے بجائے حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ پھر اس وقت واپس آئے جب سلطان محمد تغلق دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

ایک موقع پر حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

"جب سلطان محمد تغلق نے مجھے شیخ الاسلام مقرر کیا اور میرے انتظام میں چالیس خانقاہیں دیں تو اسی روز میرے پیر و مرشد حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ خواب میں تشریف لائے اور مجھے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"سید جلال الدین! تم اسی وقت حج کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ ورنہ غرق ہو جاؤ گے۔"

میری آنکھ کھلی تو مجھ پر ایک دہشت سی طاری تھی۔ اگرچہ پیر و مرشد نے واضح طور پر مجھے تنبیہ کی تھی لیکن پھر بھی میں نے خانقاہِ عالیہ کے امام سے رجوع کیا اور اپنا خواب بے کم و کاست بیان کر دیا۔

امام صاحب نے میرا خواب سنا، کچھ دیر تک غور کرتے رہے، پھر مجھ سے پوچھا۔

"سید! کیا ان دنوں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے؟"

"اس کے سوا کچھ نہیں کہ سلطان محمد تغلق مجھے شیخ الاسلام بنانا چاہتا ہے۔" میں نے عرض کیا۔ "اور اس نے چالیس خانقاہیں میرے تصرف میں دینے کے لئے احکام جاری کر دیئے ہیں۔"

میری بات سن کر امام صاحب نے کسی تامل کے بغیر فرمایا۔

"حضرت شیخ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ فوراً سفر کے انتظامات کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تاخیر کے سبب کسی اُلجھن میں پڑ جاؤ۔"

میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر والد محترم سے اجازت لینے کے لئے ملتان سے اوچ روانہ ہو گیا۔ پھر میں والد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا بیان کیا۔

"جب حضرت شیخ نے تلقین فرمائی ہے تو پھر تمہارے لئے ہندوستان چھوڑ دینا ہی مناسب ہے۔" والد محترم نے فرمایا۔

"مگر میرے پاس سفر خرچ کے لئے ایک پائی بھی نہیں ہے۔" میں نے اپنی مجبوری بیان کی۔

"پریشان نہ ہو۔" والد محترم نے مجھے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "جب حضرت شیخ نے بذریعہ خواب حکم دیا ہے تو حق تعالیٰ عالمِ ظاہر میں بھی کوئی نہ کوئی سبب پیدا فرما دیں گے۔ انتظار کرو اور دیکھو کہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔"

میں شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھا مگر اللہ تبارک تعالیٰ نے اس طرح میری مدد فرمائی کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اوچ کا رہنے والا ایک آسودہ حال شخص حج کے لئے جا رہا تھا مگر عین موقع پر اس کے اہلِ خانہ کسی اُلجھن میں پڑ گئے۔ نتیجتاً اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ پھر وہ شخص میرے پاس آیا اور نیازمندانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"سیّد! اگر تم حج کو جانا چاہو تو چلے جاؤ۔"

"میں بیت اللہ کی زیارت کرنا چاہتا ہوں مگر میرے پاس سامانِ سفر نہیں ہے۔" میں نے اس شخص سے صاف صاف کہہ دیا۔

"میں یہی درخواست لے کر تو حاضر ہوا ہوں کہ اگر آپ راضی ہوں تو سامانِ سفر کا بندوبست کر دیا جائے۔"

میں نے اپنی رضامندی ظاہر کی تو اس شخص نے اپنا تمام سفر خرچ میرے حوالے کر دیا اور اس کے ساتھ ہی نذر کے طور پر ایک گھوڑا بھی پیش کیا۔

میں حق تعالیٰ کی دستگیری پر حیران بھی تھا اور ممنون بھی۔ میں نے اس شخص کا شکریہ ادا کیا۔

"سیّد! میرے لئے دعا کرنا۔" وہ شخص یہ کہہ کر چلا گیا۔

اوچ میں ایک بزرگ مولانا نظام الدین تھے۔ انہیں دق کا مرض لاحق تھا۔ میں نے وہ گھوڑا اُنہیں دے دیا اور پیدل ہی حج کے لئے روانہ ہو گیا۔ ابھی میں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ باری تعالیٰ نے مزید دستگیری فرمائی اور میرے لئے نئی سواری کا بندوبست کر دیا۔

"اگر میں سلطان محمد تغلق کی دی ہوئی خانقاہوں کو چھوڑ کر حج کے لئے نہ چلا جاتا تو مغرور ہو جاتا اور کیچڑ میں پڑا رہتا۔"

مؤرخین نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے سلطان محمد تغلق کی جس عقیدت کا ذکر کیا ہے، وہ دراصل ایک سیاسی چال تھی۔ تمام معتبر روایتوں سے ثابت ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے وصال کے بعد ہی درویشوں اور صوفیوں سے سلطان محمد تغلق کی عقیدت ختم ہو گئی تھی۔ وہ دوسرے درویشوں کی طرح حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کو بھی اپنا دست نگر اور فرمانبردار دیکھنا چاہتا تھا۔ پہلے اس نے حضرت مخدومؒ کو شیخ الاسلام کے عہدے کی رشوت دی اور پھر آپؒ کے لئے چالیس خانقاہیں وقف کر دیں۔ یہ محض ایک سیاسی منصوبہ تھا جس کے ذریعے سلطان محمد تغلق، حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو اپنا مطیع بنانا چاہتا تھا۔ جب فرمانروائے ہندوستان نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے پیر و مرشد حضرت سید نصیر الدین چراغ دہلیؒ کو معاف نہیں کیا تو پھر وہ آپؒ کو دنیا داری کے کاموں میں آلودہ کئے بغیر کیسے چھوڑ دیتا۔ حضرت مخدومؒ یقیناً اس سیاسی چال کی زد میں آ جاتے مگر حق تعالیٰ نے بروقت آپؒ کو خبردار کیا اور اس فتنے سے بچا لیا۔

❀❀❀

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ حُسنِ اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ آپؒ کے اخلاقِ عالیہ سے دوست، دشمن سب ہی متاثر ہوتے تھے۔

فیاضی کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ اور دوسرے معتقدین کی طرف سے جو تحائف آتے، انہیں قبول فرما لیتے اور ان میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ ایسے مواقع پر آپؒ فرمایا کرتے تھے۔

''اگر کہیں سے بھی کوئی فتوح آتی ہے تو میں اسے اس لئے قبول کر لیتا ہوں کہ شیخِ مکہ حضرت عبداللہ یافعیؒ اور شیخِ مدینہ حضرت عبداللہ مطریؒ اور دوسرے بزرگوں نے اس سلسلے میں یہی فرمایا ہے کہ فتح کو اس لئے قبول کرو کہ دوسروں تک پہنچاؤ اور کچھ اپنی ضرورت کے لئے بھی رکھو۔''

جب حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ مکہ معظمہ سے شیراز تشریف لے گئے تو ایران کے بادشاہ نے سونے اور چاندی کے سکوں سے طشت بھر کے آپؒ کی خدمت میں پیش کئے۔ حضرت مخدومؒ نے وہ تمام قیمتی سکے اپنے ان ساتھیوں میں تقسیم کر دیئے جو مقروض تھے۔ اسی شہر میں آپؒ کا ایک شاگرد بھی رہتا تھا۔ اس نے مخدومؒ کی خدمت میں کئی ہزار دینار پیش کئے۔ آپؒ نے وہ ساری رقم ان دوستوں میں تقسیم کر دی جنہیں اپنی لڑکیوں کی شادی کرنی تھی۔

ایک بار سیّد شمس الدین مسعود عراقی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ ''سیدی! میرا آج کا وظیفہ نہیں ملا۔''

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے اپنے خادمِ خاص کو بلا کر فرمایا۔ ''اگر کہیں سے کوئی فتوح آئی ہو تو سیّد مسعود کو دے دو۔''

''آج کسی نے کوئی نذر پیش نہیں کی ہے۔'' خادم نے عرض کیا۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے فرمایا۔ ''بنیئے سے قرض لے کر ان کا وظیفہ دے دو۔''

سیّد مسعود عراقی نے عرض کیا۔ ''کافر سے قرض لینا مکروہ ہے۔''

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے فرمایا۔ ''ضرورت کے وقت مسلمان اور کافر دونوں سے قرض لینا درست ہے۔''

ایک بار ایک سیّد صاحب آئے اور انہوں نے کسی شخص کے کفن کے لئے کپڑا مانگا۔ اتفاق سے اس وقت نہ کپڑا تھا اور نہ رقم۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے اپنے خادم سے فرمایا۔ ''جاڑے کا موسم ختم ہو چکا ہے، اس لئے لحاف میں سے رُوئی نکال لو اور کپڑا سیّد صاحب کو دے دو۔ پھر رُوئی کو فروخت کر کے اس کی قیمت رکھ لو تا کہ وہ کسی درویش کے کام آسکے۔''

یہ حکم دے کر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نماز میں مشغول ہو گئے۔

حضرت مخدومؒ کی طبیعت میں بے حد انکسار اور خاکساری کا رنگ شامل تھا۔ ایک بار کسی مرید نے آپؒ کو خط لکھا اور حضرت شیخؒ کو ان القاب سے یاد کیا۔

''قطب عالم..... شیخ الشیوخ..... سیّد السادات۔''

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے ان تمام القاب کو با آواز بلند پڑھا اور حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس فقیر کو سیّد السادات نہیں، گدائے عالم کہو۔''

بعض مریدین جوشِ عقیدت میں قدم چومنا چاہتے مگر آپؒ اُنہیں سختی سے روک دیتے۔ بعض عقیدت مند سجدۂ

تعظیم ادا کرنا چاہتے تو آپؒ تنبیہہ فرماتے۔
"اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ چاہے وہ کسی انداز کا سجدہ ہو۔"

❀❀❀

"خدمتِ خلق" حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا شیوۂ خاص تھا۔ فرض عبادت کے بعد آپؒ اللہ کے بندوں کی خدمت کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے تھے۔

حضرت شیخ سماء الدینؒ سے روایت ہے کہ خان جہاں تلنگی، سلطان فیروز شاہ تغلق کا وزیر تھا اور اسے حضرت مخدوم جہانیاںؒ سے برائے نام بھی عقیدت نہیں تھی بلکہ وہ برسرِ عام آپؒ کو برا بھلا کہتا تھا۔ ایک بار خان جہاں نے ایک محرر کے لڑکے کو جیل بھی دیا اور وہ اس پر بہت سختی کیا کرتا تھا۔ لڑکے کے باپ نے انتہائی کوشش کی کہ کسی طرح اس کا بیٹا اس مصیبت سے نجات پا جائے مگر خان جہاں نے ہر سفارش کو ٹھکرا دیا۔ پھر کسی شخص نے غمزدہ باپ سے کہا کہ اگر وہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کرے تو اس کا بیٹا قید سے رہا ہو جائے گا۔

اتفاق سے ان دنوں حضرت مخدومؒ دہلی میں تشریف فرما تھے۔ مجبور باپ، حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔

"میری دوڑ دھوپ تو رائیگاں گئی لیکن اگر آپ اپنے کسی آدمی کے ذریعے خان جہاں سے سفارش کر دیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی بات نہیں ٹالے گا۔"

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے محرر کی درخواست سنی اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "کسی آدمی سے کیا کہلوائیں؟ چلو ہم خود ہی خان جہاں کے پاس چلتے ہیں۔"

حضرت شیخ کی یہ تواضع اور محبت دیکھ کر محرر حیران رہ گیا۔

اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت مخدومؒ، خان جہاں کے مکان پر تشریف لے گئے اور اس کے ملازم سے کہا۔

"وزیرِ مملکت سے کہو کہ سید جلال الدین ایک محرر کے بیٹے کی سفارش لے کر آیا ہے۔"

ملازم نے حضرت مخدومؒ کا پیغام پہنچایا تو خان جہاں برہم ہو گیا۔

"سید مخدوم جہانیاںؒ سے کہو کہ میں ان کی سفارش ہرگز قبول نہیں کروں گا۔"

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے خان جہاں کا جواب سنا اور خاموشی سے واپس تشریف لے گئے۔

"شیخ! اب کیا ہوگا؟" محرر سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔

"تم کیوں غمزدہ ہوتے ہو؟ کل پھر آئیں گے۔" حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے محرر کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

"انشاء اللہ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

حضرت مخدومؒ دوسرے دن محرر کے ساتھ وزیرِ مملکت کے مکان پر تشریف لے گئے اور ان ہی الفاظ میں اپنا پیغام خان جہاں تک پہنچایا۔

خان جہاں نے اپنا وہی جواب دہرایا اور مزید یہ بھی کہا۔ "سید سے کہو کہ میں اُن کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوں۔"

حضرت مخدومؒ نے خان جہاں کا جواب سنا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "وہ ہماری صورت دیکھے یا نہ دیکھے، مگر

ہم تو اسی طرح آتے رہیں گے۔"

امرائے دہلی کو اس واقعہ کی خبر ملی تو حضرت مخدومؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔

"سیّدی! آپ کیوں بار بار زحمت کرتے ہیں؟ خان جہاں کی کیا حیثیت ہے؟ آپ سلطانِ معظم کو حکم دیجئے۔"

امراء کی باتیں سن کر حضرت مخدوم جہانیاںؒ فرماتے۔"اس معمولی سے کام کے لئے سلطان کا قیمتی وقت کیوں برباد کروں؟"

روایت ہے کہ اس لڑکے کی سفارش کے لئے حضرت مخدومؒ، خان جہاں کے دروازے پر اُنیس (19) مرتبہ تشریف لے گئے اور وزیر مملکت نے ہر بار آپؒ کے ساتھ وہی تحقیر آمیز سلوک کیا۔

پھر جب بیسویں مرتبہ حضرت مخدومؒ نے محرر کے لڑکے کی سفارش کی تو خان جہاں نے اپنے ملازم کے ذریعے انتہائی گستاخانہ جواب دیا۔

"سیّد! تم میں ذرا بھی غیرت نہیں ہے۔ اتنی بار انکار کر چکا ہوں مگر تم پھر بھی ایک مجرم کی سفارش کے لئے میرے دروازے پر چلے آتے ہو۔"

حضرت مخدومؒ نے خان جہاں کا جواب سنا اور حسبِ عادت مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"اے عزیز! میں جتنی بار تمہارے دروازے پر آتا ہوں، مجھے اس کا ثواب ملتا ہے مگر مظلوم کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس بے گناہ لڑکے کو تمہارے ہاتھ سے رہائی دلواؤں تاکہ تم بھی اس ثواب میں شریک ہو جاؤ۔"

خان جہاں نے حضرت مخدومؒ کے یہ الفاظ سنے تو بے اختیار ہو گیا۔ اپنا سر ننگا کیا، گلے میں ایک رسّی باندھی اور مکان سے باہر آ کر حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے قدموں میں گر پڑا۔ اپنی گستاخی اور بدسلوکی کی معافی مانگی اور حضرت مخدومؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔ پھر محرر کے لڑکے کو آزاد کر کے ایک قیمتی خلعت اور گھوڑا انعام کے طور پر اسے دیا۔ اس کے بعد خان جہاں نے حضرت مخدومؒ کی خدمت میں بہت سے تحائف پیش کئے مگر حضرت شیخؒ نے وہ سارے تحائف اس لڑکے کو دے دیئے اور خان جہاں کو دعائیں دے کر اپنے گھر تشریف لے آئے۔

یہ واقعہ اپنی جگہ درست ہے مگر اس کا تعلق وزیر خان جہاں سے نہیں تھا۔ تاریخ کا علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ خان جہاں تلنگی، حضرت سیّد نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا مرید تھا اور وہ نہایت عدل و انصاف کے ساتھ سرکاری امور انجام دیتا تھا۔ وہ کوئی دوسرا وزیر تھا جس نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے معاملے میں یہ نازیبا سلوک روا رکھا تھا۔ پھر ایک درویش کا یہ عجز و انکسار دیکھ کر اقتدار کا وہ پتھر بھی پگھل گیا تھا۔

❀❀❀

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی ذاتِ گرامی سے بے شمار کرامات کا ظہور ہوا۔ آپؒ کی ایک کرامت تاریخ ساز حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اس وقت حضرت مخدومؒ درمیان میں نہ ہوتے تو ہزاروں بندگانِ خدا، خاک و خون میں نہا جاتے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق نے تخت نشین ہوتے ہی ٹھٹھہ پر پہلا حملہ کیا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے وزیر، خان جہاں سے تنہائی میں کہا۔

''افسوس ہے کہ جہاں پناہ محمد شاہ تغلق کے دل میں ایک ہی تمنا باقی رہی کہ وہ ٹھٹھہ کو فتح نہ کر سکے۔ عین وفات کے وقت جہاں پناہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر میں اس بیماری سے بچ گیا تو ٹھٹھہ کو فتح کر کے چھوڑوں گا اور اگر مر گیا تو یہی ایک تمنا دل میں لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ جہاں پناہ کی آخری خواہش پوری کروں۔''

وزیر خان جہاں نے کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد عرض کیا۔

''حضور نے جو ارادہ فرمایا ہے، وہ نیک ہے اور ویسے بھی دنیا کے بادشاہ نئے نئے علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔''

سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنے وزیر سے مشورے کے بعد حکم دیا کہ ٹھٹھہ پر حملے کے لئے فوج تیار کی جائے۔ پھر جب جنگ کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو سلطان ایک لشکرِ جرار کے ساتھ ٹھٹھہ کی طرف بڑھا۔ اس وقت جام بابینہ، ٹھٹھہ کا حکمراں تھا۔ اس نے فیروز شاہ تغلق کے حملے کی خبر سن کر ایک بڑا لشکر تیار کیا اور ٹھٹھہ کی اس آبادی کے قریب جو دریائے سندھ کے کنارے تھی، جنگ کے لئے مورچے بنا لئے۔ اس عرصے میں سلطان فیروز شاہ تغلق بھی ٹھٹھہ پہنچ گیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان زبردست جنگ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ فرمانروائے ہندوستان، جام بابینہ کے لشکر پر غلبہ حاصل کر لیتا، سلطان کے لشکر میں جانوروں کی بیماری پھیل گئی۔ یہ وبا اس قدر شدید تھی کہ بیشتر سواروں کے گھوڑے اور بوجھ اٹھانے والے دوسرے جانور مر گئے۔ اسی کے ساتھ قحط بھی پھیل گیا اور غلے کی قیمت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ جام بابینہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فیروز شاہ تغلق کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سلطان نے حالات ناسازگار دیکھے تو اس حملے کو آئندہ پر ملتوی کر کے اپنے لشکر کے ساتھ گجرات روانہ ہو گیا۔

پھر تقریباً بارہ سال بعد سلطان فیروز شاہ تغلق نے ٹھٹھہ پر دوبارہ حملہ کیا۔ اس وقت بھی جام بابینہ سندھ کا حکمران تھا۔ جام بابینہ کے جاسوسوں نے اسے خبر دی کہ اس بار سلطان فیروز شاہ تغلق کے تیور نہایت خوف ناک ہیں اور وہ بہت بڑے حملے کے ارادے سے سندھ کی طرف آ رہا ہے۔ جام بابینہ نے یہ اطلاع پاتے ہی دریائے سندھ کے پل اور گھاٹ کو توڑ دیا۔ پھر اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کھیتیاں پک چکی تھیں اور فصلیں کٹنے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے لشکر نے دریائے سندھ کے کنارے خیمے ڈال دیئے اور وہیں لڑائی کے لئے مورچے تیار کر لئے۔

مقامی فوج نے قلعے سے نکل کر اور جان پر کھیل کر جنگ کا آغاز کیا۔ مقامی سپاہی بڑے جارحانہ انداز میں سلطانی لشکر پر حملے کر رہے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے لڑائی کا رنگ دیکھ کر ایک برق رفتار قاصد اپنے وزیر، خان جہاں کے پاس دہلی روانہ کیا۔ پھر تھوڑے ہی دن بعد ایک تازہ دم لشکر، سلطان کی فوجوں سے آملا۔

اس بار اہلِ سندھ کی قسمت نے یاوری نہیں کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب غلّہ کٹ کر کسانوں کے گھروں تک پہنچنے نہیں پایا تھا۔ سلطان کے سپاہیوں نے کھیتوں ہی میں تمام اناج پر قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے سندھ میں ایسا قحط پڑا کہ مقامی باشندوں کی جان کے لالے پڑ گئے۔ دوسرے یہ کہ دہلی سے ایک بڑا لشکر سلطان کی مدد کو ٹھٹھہ پہنچ چکا تھا۔ جام بابینہ نے میدانِ کارزار کا نیا رنگ دیکھا تو اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ سندھ کے حکمران کو اپنی شکست صاف نظر آ رہی تھی۔ جب تمام ظاہری تدبیریں ناکام ہو گئیں اور تمام مادی راستے بند ہو گئے تو جام بابینہ نے اپنے ایک رازدار قاصد کو خط دے کر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں بھیجا۔ جام بابینہ نے بڑے عاجزانہ لہجے میں تحریر کیا تھا۔

''سیّدی! اس وقت سرزمینِ سندھ آفات ومصائب کے نرغے میں ہے۔ اگر حضور نے توجہ نہ فرمائی تو ہزاروں انسان دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل بن جائیں گے۔ حضرت شیخ سے التجا ہے کہ فیروز شاہ تغلق اور میرے درمیان صلح کرا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ سلطان، مخدومؒ کی بات کسی بھی حال میں نہیں ٹالے گا۔''

جام بابینہ کا خط پڑھ کر حضرت مخدوم جہانیاںؒ فوری طور پر ٹھٹھہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ پھر جب آپؒ سلطانی لشکر میں داخل ہوئے تو ہر طرف ایک شور سا برپا ہو گیا۔ سلطان کے تمام سپاہی جوشِ عقیدت میں مخدومؒ کے آگے جھکے جا رہے تھے۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''انشاء اللہ! تمہیں عنقریب شاندار فتح حاصل ہو گی۔''

پھر جب سلطان فیروز شاہ تغلق کو حضرت مخدومؒ کی آمد کی خبر ملی تو وہ بڑے والہانہ انداز میں اپنے خیمے سے باہر نکلا اور فوج کی پچھلی صفوں میں پہنچ کر حضرت مخدومؒ کا استقبال کیا۔

''سیّدی! یہ میری خوش بختی ہے کہ اس مشکل مرحلے پر آپ تشریف لے آئے۔'' سلطان فیروز شاہ تغلق نے خیمے میں پہنچ کر عرض کیا۔

''سلطان کو معلوم ہے کہ ٹھٹھہ اب تک کیوں فتح نہیں ہو سکا؟'' حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے فرمایا۔

''سیّدی بہتر جانتے ہیں۔'' فرمانروائے ہند نے حیران ہو کر عرض کیا۔

''ٹھٹھہ میں ایک پارسا عورت موجود تھی اور یہ شہر اسی کی دعاؤں کے سائے میں تھا۔'' حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے یہ عجیب انکشاف کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں تمہاری فتح کے لئے بارگاہِ خداوندی میں بہت دعائیں کرتا تھا مگر وہ پاک دامن خاتون درمیان میں حائل ہو جاتی تھی۔''

سلطان فیروز شاہ حیرت و استعجاب کے عالم میں حضرت مخدومؒ کے ارشادات سن رہا تھا۔

''آخر وہ خاتون بھی تو اپنے اللہ کی پرستار تھی۔ پھر حق تعالیٰ اس کی بات کیوں نہ رکھتا؟'' حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے نہایت جذب کے عالم میں فرمایا۔

''سیّدی! کیا اس بار بھی میری ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی؟'' سلطان فیروز شاہ تغلق نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''ٹھٹھہ کی مہم میں مجھے بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔''

''تین دن ہوئے کہ اس محترم خاتون نے جنت کی راہ لی۔ اب انشاء اللہ ٹھٹھہ بہت جلد فتح ہو جائے گا۔'' حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے فرمایا۔ ''قدرت عنقریب تمہارے سارے نقصانات کا ازالہ کر دے گی۔''

جب ٹھٹھہ کے حکمران، جام بابینہ کو خبر ملی کہ حضرت مخدومؒ، سلطانی لشکر میں موجود ہیں تو اس نے ایک بار پھر درخواست کی کہ اہلِ شہر کو اس عذاب سے نجات دلائی جائے۔

آخر حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی سفارش پر جام بابینہ کو معاف کر دیا گیا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق، جام بابینہ کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا اور پھر اسے دوبارہ سندھ کا حاکم بنا کر دارالحکومت سے روانہ کیا۔

یہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا فیضِ روحانی تھا کہ ہزاروں انسان موت کی خوراک بننے سے محفوظ رہے۔''

ایک بار حضرت مخدوم جہانیاںؒ جامع مسجد اوچ میں تشریف فرما تھے۔ حاکم شہر سومرہ کو خبر ہوئی تو وہ بھی آپؒ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا۔ اس وقت مخدومؒ کے گرد درویشوں اور ضرورت مندوں کا ایک ہجوم تھا۔ سومرہ کو یہ

بات ناگوار گزری۔ اس نے اقتدار کے نشے میں تمام لوگوں کو مسجد سے باہر نکال دیا۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ خاموشی سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ جب مسجد آپؒ کے عقیدت مندوں سے خالی ہو گئی تو حاکم شہر قریب آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی آمد کا مقصد بیان کرتا، حضرت مخدومؒ نے شدید غیظ و غضب کے عالم میں اسے مخاطب کر کے فرمایا۔

''سومرہ! کیا تُو دیوانہ ہو گیا ہے کہ درویشوں کو تنگ کرتا ہے؟''

جیسے ہی آپؒ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، حاکم اوچ سومرہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس نے گریبان چاک کر ڈالا اور پاگلوں کی طرح چیختا ہوا مسجد سے نکل گیا۔ بڑا عبرت خیز اور دردناک منظر تھا۔ کل تک جس شخص کی ایک جنبشِ نظر سے لوگوں کی قسمت کے فیصلے ہوا کرتے تھے، آج وہ ایک تماشا بن کر رہ گیا تھا۔ جب سومرہ کے باپ پر یہ راز فاش ہوا کہ ان کا بیٹا، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی دل آزاری کے سبب دیوانگی کی منزل تک پہنچا ہے تو اس نے اپنے مجنوں فرزند سے کہا۔

''جس کی بارگاہ سے دیوانے، فہم و خرد کی دولت حاصل کرتے ہیں، تُو اس کے کوچے سے وحشت سمیٹ لایا۔ تیری بدبختی پر کس طرح ماتم کروں؟'' باپ کی آواز سن کر سومرہ ٹھہر گیا۔ ''اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ مخدوم جہانیاںؒ سے جا کر معافی مانگ لے۔''

باپ سمجھ رہا تھا، بیٹا دیوانگی کی آخری حد تک نہیں پہنچا ہے۔ شاید اس کی بات مان کر دوبارہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور اس طرح یہ دردناک عذاب ٹل جائے مگر سومرہ کا دماغ مکمل طور پر اُلٹ چکا تھا۔ اس نے باپ کی نصیحت سن کر ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اب وہ ناقابل علاج تھا۔

بوڑھے باپ پر ہر لمحہ قیامت سی نازل ہو رہی تھی۔ آخر اس نے شہر کے کچھ لوگوں سے مشورہ کیا۔ ہر شخص نے جواب میں ایک ہی بات کہی کہ اگر کسی طرح سومرہ کو مخدوم جہانیاںؒ کے حضور لے جا کر ان سے التجا کی جائے تو وہ اپنی اعلیٰ ظرفی کے باعث اس گستاخی کو معاف کر سکتے ہیں اور پھر اس بگڑی ہوئی صورتِ حال کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ غم زدہ باپ نے لوگوں کا مشورہ قبول کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا کہ سومرہ کو حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی خدمت میں کس طرح لے جایا جائے؟ آخر ایک ہی ترکیب ذہن میں آئی کہ اس پاگل حاکم کو زنجیریں پہنا دی جائیں۔ یہ ایک تکلیف دہ اور مشکل مرحلہ تھا مگر کچھ افراد نے مل کر یہ کارِ دشوار بھی انجام دے دیا۔ سومرہ کو پکڑ کر پابندِ سلاسل کر دیا گیا اور پھر اسے کھینچتے ہوئے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے سامنے لے جایا گیا۔

''کیا اس کے اقتدار کا نشہ اب تک نہیں اُترا؟'' حضرت مخدومؒ نے سومرہ کو دیکھتے ہی پُر جلال لہجے میں فرمایا۔

شکستہ دل باپ آگے بڑھا اور اس نے حضرت مخدومؒ کے روبرو گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔

''میرے گستاخ و نادان بیٹے کا اقتدار خاک میں مل چکا۔ اب تو محض آپ کی نظرِ کرم کا طلب گار ہے۔ اگر آپ نے مجھ بوڑھے کی نہیں سنی تو یہ بدنصیب ہمیشہ وحشت کے ہولناک اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا اور اس کی بے قرار ماں اور پریشان حال بیوی بچے زندہ درگور ہو جائیں گے۔'' سومرہ کے باپ کا شورِ فغاں اس قدر اثر انگیز تھا کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے چہرۂ مبارک پر بھی اُداسی کا رنگ اُبھر آیا۔ پھر آپؒ نے حاکمِ اوچ کے باپ سے فرمایا۔

''سومرہ کو غسل دے کر نئے کپڑے پہناؤ اور حضرت جمال الدین خنداںؒ کے مزارِ مبارک پر لے جاؤ۔ اس

کے بعد میرے پاس لاؤ۔ پھر یہ فقیر اپنے اللہ سے تمہارے بیٹے کے لئے عافیت طلب کرے گا۔" (مشہور بزرگ جمال الدین خنداںؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے استادِ محترم تھے۔ آپؒ نے بچپن میں ان سے تعلیم حاصل کی تھی)

حضرت مخدومؒ کی ہدایت پر حاکم اوچ کو حضرت شیخ جمال خنداںؒ کے مزارِ مبارک پر لے جایا گیا۔ سومرہ بار بار زنجیریں تڑوانے کی کوشش کرتا تھا مگر شہر کے کئی تنومند جوانوں نے اس پر قابو حاصل کر لیا تھا۔ آخر کار اسے دوبارہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضرت جمال الدین خنداںؒ کے مزارِ مبارک پر جانے کے بعد سومرہ کی سرکشی تو ختم ہوگئی تھی مگر ذہن کی وہی حالت تھی۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے ایک نظر سومرہ کی طرف دیکھا پھر اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھا دیئے۔

"اے خدائے کریم! میں نے سومرہ کی گستاخیوں کو معاف کر دیا۔ تُو بھی اسے معاف فرما کر اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لے۔" ابھی فضاؤں میں اس دعا کی بازگشت باقی تھی کہ سومرہ کے گمشدہ حواس لوٹ آئے اور اپنے گرد و پیش کی تمام چیزوں کو پہچاننے لگا۔ پھر جیسے ہی اس نے حضرت مخدوم جہاں گشتؒ کی طرف دیکھا، بے اختیار آگے بڑھا اور مخدومؒ کے قدموں پر گر پڑا۔ حضرت مخدومؒ نے ازراہِ کرم اسے تسلی دی اور فرمایا۔

"آئندہ درویشوں ہی کی نہیں، کسی بھی انسان کی دل آزاری سے گریز کرنا۔ جو لوگ اقتدار میں آنے کے بعد انکسار کا مظاہرہ کرتے ہیں، اللہ انہیں محترم بنا دیتا ہے۔" اس کے بعد سومرہ کی ذہنی کیفیت یکسر بدل گئی اور اس نے مخلوقِ خدا کی خدمت کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیا۔

❀❀❀

ایک بار حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ دہلی میں مقیم تھے۔ اس سال برسات کے موسم میں گرم ہوائیں چلنے لگیں۔ دُور دُور تک ابر کا نشان نہیں تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، تیز گرمی سے دریا خشک ہوتے جا رہے تھے۔ کسانوں کی زمینیں بنجر نظر آنے لگیں اور جانور پیاس سے مرنے لگے۔ جب انسانی آبادیوں کے گہرے کنویں بھی خشک ہونے لگے تو لوگ سخت پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ دہلی کے ایک ایک کوچے میں یہ چرچے عام تھے کہ اگر سات آٹھ دن میں بارش نہیں ہوئی تو پورا شہر پیاس کی شدت سے تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ بڑی سنگین صورتِ حال تھی۔ اسی دوران کسی مردِ باخبر نے اہلِ شہر سے کہا۔

"یہ سب تمہاری بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ اپنے رب کے حضور توبہ و استغفار کرو۔ پھر تمہارے سروں سے یہ عذاب ٹل جائے گا۔"

یہ آواز سنتے ہی دہلی کے باشندوں کا رخ خانۂ خدا کی طرف ہو گیا۔ تشنگی کے خوف سے لرزتے ہوئے انسان قطار در قطار مسجدوں کی جانب رواں تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دہلی کی تمام مسجدیں بھر گئیں۔ آفت زدہ لوگ رو رو کر دعائیں کرنے لگے۔ شورِ گریہ سے فضائیں گونجنے لگیں۔ مگر ابرِ سیاہ نظر نہیں آیا کہ لوگ امیدوں کے سہارے ہی کچھ دن گزار لیتے۔ اہلِ شہر کے اُٹھے ہوئے ہاتھ شل ہو گئے تھے اور زبانیں اللہ کو پکارتے پکارتے تھک گئی تھیں۔ مایوسیوں نے اُنہیں اس طرح گھیر لیا تھا کہ زندگی کی ایک کرن بھی اس گھور اندھیرے میں نہیں اُبھر رہی تھی۔ جن کی نظروں میں زیادہ گہرائی تھی، اُنہیں دہلی کے در و بام پر موت کے متحرک سائے نظر آنے لگے تھے۔

پھر ایک دن ایک مردِ قلندر، نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہوا انسانی آبادی سے گزرا۔

"اب عالمِ نزع میں اللہ کو پکار رہے ہو۔ اس وقت تم لوگوں نے کس کی بندگی اختیار کر لی تھی، جب تمہارے

جسموں میں توانائیاں موجود تھیں، تمہارے موسم خوشگوار تھے اور تمہارے دریاؤں سے پانی اُبل رہا تھا، اُس وقت تم نے ناشکر گزاریوں کو اپنا مذہب بنا لیا تھا؟ احسان فراموشی کی راہ اختیار کر لی تھی؟ اب اگر اللہ بھی تمہیں بھول گیا ہے تو تمہارے ہونٹوں پر شکوۂ مسلسل کیوں ہے؟ گریہ وزاری کیوں کرتے ہو؟ چیخو!...... پوری طاقت سے چیخو۔ مگر تمہاری آوازیں آسمانوں تک نہیں پہنچیں گی۔ وہ آوازیں اور ہوتی ہیں جو فلک کے دل سے گزرتی ہوئی بابِ قبولیت تک پہنچ جاتی ہیں۔ ایسے نافرمانوں کی صدائیں تو زمین سے ایک گز بھی بلند نہیں ہوتیں۔ خوب اشک ریزی کرو۔ آنسوؤں سے تمہارے دامن تو بھیگ جائیں گے مگر آسمان سے بارش کا کوئی قطرہ نہیں برسے گا۔ تمہیں ٹھکرا دیا گیا ہے۔ تم راندۂ درگاہ ہو اور ایسے لوگوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔'' قلندر اپنی شرر فشاں تقریر کے بعد شہر سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن شکستہ و افسردہ انسانوں کی بھیڑ نے اسے روک لیا۔ لوگ دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔

''قلندر!..... تُو سچ کہتا ہے۔ بے شک! ہم راندۂ درگاہ ہیں۔ ہم نے اسبابِ کیف و نشاط کی کثرت میں اپنے خالق کو فراموش کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی ہم اس کے بندے تو ہیں۔ ہمارا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ہم لاکھ ناشکرے سہی، لیکن اس زمین پر کوئی تو اس کا شکر گزار بندہ ہوگا۔ سننے والا اس کی تو سنے گا۔ قلندر! تجھے تیرے خدا کی قسم! ہمیں اس شخص کا پتہ دے جس کی دعائیں قبول بارگاہِ حق ہیں۔''

قلندر کے پیروں میں کون زنجیر ڈال سکتا تھا؟ مگر لوگوں کے شورِ ماتم نے اُس کے دل کو پگھلا کر رکھ دیا تھا اور بڑھتے ہوئے قدموں کو اسیر کر لیا تھا۔ وہ رک گیا۔ کچھ دیر تک آسمان کی طرف منہ اٹھائے دیکھتا رہا، پھر خود کلامی کے انداز میں بولتا رہا۔

''یہ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ تیرے سوا ان کا مالک کون ہے۔ اگر تُو بھی نہیں سنے گا تو ان کی فریادوں کے لئے زمین و آسمان میں کون سی پناہ گاہ ہے؟'' اتنا کہہ کر وہ بے قرار ہجوم سے مخاطب ہوا۔ ''تم ملتان کے فقیر کی خانقاہ میں جاؤ کہ اس وقت وہی ہندوستان کا شہنشاہ ہے۔ اللہ اس کی بہت سنتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گئے تو تمہارے تالاب، کنوئیں اور دریا پانی سے بھر جائیں گے۔''

''قلندر! ملتان تو یہاں سے بہت دُور ہے۔'' لوگوں نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''وہاں تک پہنچتے پہنچتے تو ہم مر جائیں گے۔ جب تک اس فقیر کو ہمارے حال کی خبر ہوگی، کیا شہر دہلی قبرستان نہیں بن جائے گا؟''

''نہیں۔ تمہیں ملتان تک سفر کرنا نہیں پڑے گا۔'' اب قلندر کی آتشِ غضب بجھ گئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر ایک مہربان تبسم اُبھر آیا تھا۔ وہ تمہارے قریب ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے اسے ملتان سے دہلی بھیج دیا ہے۔ وہ ہم سب کا مخدوم ہے۔ جہانیاں جہاں گشتؒ۔ اُس کے دروازے پر صدائیں دو۔ اللہ تمہاری مشکل کشائی کرے گا۔'' یہ کہہ کر قلندر آگے بڑھ گیا۔ مگر چند قدم جا کر اچانک پلٹ آیا۔ ''ایک بات یاد رکھو!'' قلندر دوبارہ انسانی ہجوم سے مخاطب تھا۔ ''وہ مسلسل انکار کرے گا۔ اپنے عجز و انکسار کے بہانے تراشے گا۔ مگر تم اس کا کوئی عذر قبول نہ کرنا۔ آنسو بہاتے ہی رہنا۔ گریہ وزاری کرتے ہی رہنا۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے لئے دعا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔'' قلندر نے ایک اور راز ظاہر کر دیا تھا۔ پھر اس نے حسبِ عادت اپنا نعرۂ مستانہ بلند کیا اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لوگ قلندر کی ہدایت کے مطابق حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خانقاہ کے باہر جمع ہوئے اور پھر شکستہ جانوں نے چیختے چیختے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس وقت حضرت مخدومؒ مصروفِ عبادت تھے مگر انسانی شور نے آپؒ کی یکسوئی میں خلل ڈال دیا۔ حضرت مخدومؒ نے اپنے خدام کی طرف دیکھا تو آپؒ کو بتایا گیا کہ دہلی کے

باشندوں کا ایک ہجوم ہے جو اس سال بارش نہ ہونے کے سبب مضطرب ہو کر آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوا۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے انسانی شور سننے کی کوشش کی۔ بے قرار مجمع، دل کے زور سے چیخ رہا تھا۔

''سیّدی! غلام تیرے آستانے پر کھڑے ہیں۔ گناہ گاروں کو اپنی دید سے شرف یاب کر۔ اے معرفت کے سلطان! اپنی خانقاہ سے نکل کر دیکھ کہ تیری رعایا کس قدر پیاسی ہے؟ آسمانوں کے دہانے بند ہو گئے ہیں اور خشکی نے زمینوں میں شگاف ڈال دیئے ہیں۔ بے شمار جاندار لقمۂ اجل بن چکے ہیں اور اب انسان اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ بے شک ہم سیاہ کار ہیں۔ مگر تیرے ہوتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ ہم ناکام و نامراد لوٹ جائیں گے۔''

ایک عجیب سا شور برپا تھا۔ آخر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اپنے حجرۂ خاص سے نکل کر خانقاہ کے دروازے پر تشریف لائے۔ آپؒ کا عارفانہ جلال دیکھ کر چیختے ہوئے لوگ فوراً خاموش ہو گئے۔ پھر آپؒ بہت آہستہ لہجے میں انسانی ہجوم سے مخاطب ہوئے۔

''تم اتنے بے قرار کیوں ہو؟ کیا تمہارا شور و شغب، لوحِ محفوظ کے فیصلوں کو بدل ڈالے گا؟'' اگرچہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی آواز بہت مدھم تھی، لیکن ایک ایک لفظ دلوں میں اُتر جانے والا تھا۔ لوگوں کی روح پر لرزہ طاری ہونے لگا ''جواب دو کہ تم نے اللہ کو چھوڑ کر کس کی پرستش اختیار کر لی ہے؟'' حضرت مخدومؒ کا بڑا عجیب سوال تھا۔ ہجوم کے چہروں پر شدید ندامت کے آثار اُبھرے اور پھر گردنیں جھک گئیں۔

چند لمحوں کے لئے فضا پر مکمل سکوت چھا گیا تھا۔ پھر مجمع میں سے ایک نحیف سی آواز اُبھری۔ بظاہر یہ ایک طاقتور شخص تھا لیکن مخدومؒ کے جلال نے اس کے لہجے کی تمام حرارت چھین لی تھی۔

''سیّدی! اگر کچھ دن اور بارش نہ ہوئی تو بے شمار انسان موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ آپ دعا کیجئے کہ ہمارے سروں پر سے عذاب ٹل جائے۔'' کہنے کو اُس نے اپنا مدعا بیان کر دیا تھا لیکن اس طرح کہ اُس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''تم اتنے یقین سے میرے پاس آئے ہو کہ جیسے معاذ اللہ میں بارش کا منتظم ہوں۔'' حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے قدرے ناگوار لہجے میں فرمایا۔ ''تم نے خوش گمانیوں کی انتہا کر دی اور اللہ کے نظام کو شہنشاہِ ہند کے نظام سے بھی زیادہ کمزور سمجھ لیا۔ مجھے تمہارے خیالات کی پراگندگی پر بے حد افسوس ہے۔ اپنے گھروں کو واپس جاؤ اور براہِ راست اللہ کو پکارو۔ وہ اپنے سب بندوں کی یکساں سنتا ہے۔ بڑے سے بڑا بزرگ بھی اس کے حضور سفارش کی جرأت نہیں کر سکتا۔ تم اسے دل کی گہرائیوں سے پکارو۔ پھر تمہارے کھیت سرسبز و شاداب اور دریا جل تھل ہو جائیں گے۔''

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی باتیں بہت ہمت شکن تھیں۔ انسانی ہجوم کو صاف محسوس ہو رہا تھا کہ آپؒ کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں۔ مخدومؒ کے اس طرزِ عمل سے ہجوم پر شدید مایوسی طاری ہونے لگی۔ پھر اچانک کچھ لوگوں کو قلندر کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مخدومؒ انکار کر دیں گے مگر تم لوگ ان کے دامن کو نہ چھوڑنا۔ گریہ و زاری کرتے ہی رہنا۔ پھر تمہارا کام ہو جائے گا۔ اس خیال کے آتے ہی ایک بار پھر لوگوں نے رونا شروع کر دیا۔

''سیّدی! ہم بہت گناہ گار ہیں۔ اللہ ہماری نہیں سنتا۔ آپ ہی دستِ دعا اُٹھا دیجئے کہ آسمانوں کے دہانے کھل جائیں اور ہماری پیاسی زمینیں سیراب ہو جائیں۔'' لوگوں کی آوازیں بڑی جانگداز تھیں۔

''تمہاری طرح میں بھی ایک گناہ گار بندہ ہوں۔'' حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے پہلو تہی کرتے ہوئے جواباً فرمایا۔ ''جب دونوں گناہ گار ہیں تو پھر اللہ کے یہاں کوئی تخصیص نہیں۔ وہ کسی کی بھی سن سکتا ہے اور کسی کو بھی درِقبولیت سے ناکام لوٹا سکتا ہے۔''

''آپ کتنے ہی انکسار سے کام لیں مگر ہم اس آستانے سے اُٹھ کر جانے والے نہیں۔'' ہجوم کی آوازیں اچانک پُرشور ہوگئی تھیں۔ ''اگر تشنہ لبی کے عالم میں موت ہمارا مقدر ہو چکی ہے تو پھر ہم آپ کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر جانا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہمارے دلوں میں کوئی احساسِ محرومی نہیں ہوگا۔ ہم پوری طمانیتِ قلب کے ساتھ یہ سوچ کر دنیا سے گزر جائیں گے کہ عالمِ نزع میں ہمارے سامنے مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ موجود تھے۔'' لوگوں کے جذبے پوری سچائی کے ساتھ اُبھر آئے تھے اور خواہشیں انتہائی عقیدت کے رنگ میں ظاہر ہوگئی تھیں۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر آپؒ نے دوبارہ پوری شدت کے ساتھ اپنا دامن بچانا چاہا مگر انسانی ہجوم حرفِ انکار سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ تمام لوگ اپنی جگہ یہ طے کر چکے تھے کہ اگر بارش نہ ہوئی تو سب کے سب درِمخدومؒ پر جان دے دیں گے مگر ناکام واپس نہیں جائیں گے۔

بالآخر وہ مردِ بزرگ مجبور سا ہو گیا۔ حضرت مخدومؒ سے انسانوں کی یہ بے چارگی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ جب ہجوم کی پُرشور آوازیں زیادہ بلند ہونے لگیں تو حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ نے ہاتھ کے اشارے سے چیختے ہوئے مجمع کو خاموش کرنے کی کوشش کی۔ بس آپؒ کے اشارے کی دیر تھی، لوگوں کے ہونٹوں پر مُہرِ سکوت لگ گئی۔ فضا پُرسکون ہو جانے کے بعد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ دوبارہ پریشان حال انسانوں سے مخاطب ہوئے۔ ''اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ فقیر کو اتنا پریشان نہ کرو کہ وہ زندگی سے تنگ آ جائے۔ تم ضد کرتے ہو تو میں اپنے رب سے تمہارے لئے بارشِ کرم کا سوال کروں گا۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ آسمان سے بھی میرے سوال کا جواب آ جائے۔ میری دعا کی ایک ہی شرط ہوگی کہ تم بھی اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرو۔ ہم سب مل کر اس کے کرم کی بھیک مانگیں گے۔ تم بھی اس کے در کے بھکاری ہو اور میں بھی اسی کے کوچۂ بخشش و عطا کا ایک ادنیٰ گداگر ہوں۔ کون جانے کہ وہ کس کی سن لے؟ اس کی بے نیازی کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ بس اب جاؤ اور اس کی رحمت سے اس قدر مایوس نہ ہو کہ تم پر کفر کا الزام عائد ہو جائے۔'' یہ کہہ کر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ خانقاہ کے اندر تشریف لے گئے اور سینکڑوں انسانوں کا ہجوم اپنے گھروں کی طرف لوٹ گیا۔

لوگوں کے جاتے ہی حضرت مخدومؒ نے اپنے حجرے کا دروازہ بند کر لیا اور کسی خادم کو بھی یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کس عالم میں ہیں اور باشندگانِ دہلی کے لئے کیا دعا مانگ رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک خانقاہ کے مکینوں نے بجلی کے کڑکنے کی خوفناک آواز سنی۔ ایک لمحے کے لئے آسمان پر اُجالا پھیل گیا اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ہر طرف سے گہرے سیاہ بادل اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ حضرت مخدومؒ کی خانقاہ سے واپس جانے والے ابھی گھروں تک بھی نہیں پہنچے ہوں گے کہ سیاہ بادلوں نے برسنا شروع کر دیا۔ اللہ نے اپنے اس بندے کی دعا سن لی تھی، جو اس کی محبت میں دنیا کی ہر آسائش اور اقتدار کو ٹھکرا چکا تھا۔

بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ پیاسے کھیت، خشک تالاب اور خالی دریا اس طرح بھر گئے تھے کہ پانی ان کے کناروں سے باہر نکل آیا تھا۔ لوگ بہت خوش تھے مگر ان کی یہ خوشی اس وقت معدوم ہونے لگی جب بارش اسی زور وشور کے ساتھ تیسرے دن بھی جاری رہی۔ لوگوں کے ذہن ایک بار پھر انتشار کا شکار ہو گئے تھے۔ اب اُن کے دلوں میں یہ اندیشے پیدا ہو رہے تھے کہ اگر اسی رفتار کے ساتھ بارش ہوتی رہی تو دہلی کے گرد و نواح میں سیلاب آ

جائے گا اور پھر کثرتِ آب سے سارا شہر غرق ہو جائے گا۔''

صورتِ حال لحظہ بہ لحظہ خوف ناک ہوتی جا رہی تھی۔ باہم مشورے ہوتے رہے۔ پھر ایک طویل غور و فکر کے بعد یہی طے ہوا کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے دوبارہ رجوع کیا جائے۔ پہلے ایک مردِ بزرگ سے بارش ہونے کی دعا کرائی گئی تھی، اب لوگ سوچ رہے تھے کہ حضرت مخدومؒ سے بارش رک جانے کی التجا کی جائے۔ آخر بے شمار لوگ گھروں سے نکل آئے۔ تیز بارش سے ان کے بدن بھیگ رہے تھے اور گلی کوچوں میں اتنا پانی بھر گیا تھا کہ مخدوم جہاں گشتؒ کی خانقاہ کی طرف جانے والے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ مگر جب سروں پر قیامت نازل ہو تو انسان اپنے دفاع کے لئے ہر بندش کو عبور کر جاتا ہے۔ سیلاب میں گھرے ہوئے دہلی کے باشندے بھی ہزاروں دشواریوں کے باوجود حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی بارگاہِ جلال تک پہنچ گئے۔

ایک بار پھر خانقاہ کے باہر شورِ ماتم برپا تھا۔ لوگ تمام آداب سے بے نیاز ہو کر دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔

''یہ بارش ہمارے لئے تباہی کا سبب بنتی جا رہی ہے۔ اب دعا کرو کہ آسمان کے دہانے بند ہو جائیں ورنہ ہم پر زندگی کے دروازے بند ہو جائیں گے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ خانقاہ کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ آپؒ کے چہرۂ مبارک سے ناگواری کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ بارش کے پانی میں بھیگ جانے والے انسانوں کے جسم کانپ رہے تھے اور ان کی آوازوں میں اس قدر لرزش تھی کہ زبان سے الفاظ بھی صحیح طور پر ادا نہیں ہو رہے تھے۔ حضرت مخدومؒ نے کانپتے ہوئے لوگوں کے ہجوم پر ایک نظر ڈالی اور پُر جلال لہجے میں فرمایا۔

''تم اللہ کے کیسے ناشکر گزار بندے ہو کہ جب آسمان سے پانی رک جاتا ہے تو سینہ کوبی کرتے کرتے اپنے گریبان پھاڑ لیتے ہو۔ اور جب خدا تمہارے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے ابرِ کرم کو برسنے کا حکم دیتا ہے تو تم کثرتِ آب کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتے ہو۔ تمہیں ایک حالت پر قرار کیوں نہیں آتا؟ تم اللہ کی مرضی کو اپنی خواہشات کا پابند بنانا کیوں چاہتے ہو؟ جب زمین و آسمان کے مالک سے پانی طلب کیا تھا تو پھر بارشِ کرم کی دعا کیوں نہیں مانگی تھی؟'' حضرت مخدومؒ کے جلالِ معرفت نے ہجوم کے دلوں پر مزید لرزہ طاری کر دیا۔

''سیّدی! ہم بہت گناہ گار و خود غرض ہیں۔ ہمیں اپنے مقاصد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہماری التجا ہے کہ آپ اہلِ شہر کے لئے آسمانوں سے عافیت طلب کریں۔'' انسانی ہجوم، حضرت مخدومؒ کو برہم دیکھ کر زار و قطار رونے لگا تھا۔ فریاد کی لے بہت جانگداز تھی اور فغاں کا آہنگ بڑا جاں سوز تھا۔ مخدومؒ کو ایک بار پھر بے قرار ہجوم پر ترس آ گیا۔

''تم لوگ مجھے ایک گوشے میں چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔'' حضرت مخدوم جہاں گشتؒ کے لہجے سے جلالِ معرفت نمایاں تھا مگر آپؒ دلی طور پر ضرورت مندوں کے ہجوم سے ناراض تھے۔ ''تمہیں کس نے فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ میری دعا سے پانی برسنا شروع ہو جائے گا اور پھر میری ہی التجا سے بارش بند ہو جائے گی؟ تم اللہ کے نظام کو سمجھتے کیوں نہیں؟ اس کے یہاں ہر شے کا وقت مقرر ہے۔ بارش اسی کے حکم سے جاری ہوئی تھی اور اسی کی مرضی سے بند ہو جائے گی۔ تم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔ میں تمہاری سلامتی کے لئے دعا کروں گا۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا کہ میری دعا درِ قبولیت تک پہنچ جائے گی یا زمین و آسمان کے درمیان ہی سے واپس آ جائے گی۔''

یہ کہہ کر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ خانقاہ کے اندر تشریف لے آئے اور انسانی ہجوم، مطمئن چہروں کے ساتھ اپنی اپنی قیام گاہ کی طرف جانے لگا۔ یہ اطمینان اس لئے تھا کہ ہر شخص حضرت مخدومؒ کی طبیعت سے واقف

تھا۔ آپؒ بظاہر سخت نظر آتے تھے لیکن آپؒ کے دل میں بہت گداز تھا۔ مخلوقِ خدا کی بے چینی سن کر راتوں کو سو بھی نہیں سکتے تھے۔ اس وقت تک اپنے رب کے حضور دعائیں مانگتے رہتے تھے جب تک پریشان حال بندوں کو سکون نہیں مل جاتا تھا۔ اس وقت بھی یہی صورتِ حال درپیش تھی۔ بظاہر مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اہلِ شہر سے خفا نظر آ رہے تھے مگر درپردہ آپؒ کی یہ کیفیت تھی کہ جب تمام لوگ چلے گئے تو آپؒ خالقِ ارض و سما کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور باشندگانِ دہلی کے لئے شدید رقت آمیز لہجے میں دعائیں کرنے لگے۔

پھر لوگ اس وقت حیران رہ گئے، جب بارش کا زور ٹوٹنے لگا اور آہستہ آہستہ پانی برسنا بالکل بند ہو گیا۔ یہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی اس قدر مشہور کرامت ہے کہ لاکھوں انسان اس کے چشم دید گواہ تھے۔ یہ کوئی دیو مالائی فسانہ نہیں کہ چند عقیدت مندوں نے ایک بزرگ کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا ہے۔ اس واقعہ کی ایک تاریخی حقیقت ہے جسے مشہور و معتبر مؤرخ، محمد قاسم نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''تاریخ فرشتہ'' میں تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔

❁❁❁

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی زندگی کا ایک لرزہ خیز واقعہ بھی ہے جسے پڑھ کر پتھر بھی نم ہو جاتے ہیں۔ ایک بار آپؒ نمازِ چاشت میں مشغول تھے۔ اتفاق سے آپؒ کا چھوٹا لڑکا جس کی عمر چار سال تھی، مصلّے کے نزدیک کھیل رہا تھا۔ بچے کے بار بار آنے جانے کی وجہ سے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کو نماز میں یکسوئی حاصل نہ ہو سکی۔ بچہ کھیلتے کھیلتے کبھی کبھی مصلّے پر بھی چلا جاتا تھا، جس کے باعث آپؒ کو سجدہ کرنے میں دشواری پیش آتی تھی اور اس طرح خیالات منتشر ہو جاتے تھے۔ عام طور پر یہ بات معمولات میں شامل تھی کہ حضرت مخدومؒ کے نزدیک کوئی نہ کوئی خادم موجود رہتا تھا مگر اس وقت نہ کوئی خدمت گار تھا اور نہ اہلِ خانہ میں سے کوئی شخص۔ نتیجتاً بچہ آزادی کے ساتھ اپنے کھیل میں مصروف تھا اور حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کی نماز میں خلل واقع ہو رہا تھا۔ غرض آپؒ نے کسی نہ کسی طرح نماز ختم کی اور اپنے بڑے صاحبزادے، سیّد شمس الدین کو پکارا۔ سیّد شمس الدین، والد گرامی کی آواز سن کر دوڑتے ہوئے آئے اور دست بستہ مخدومؒ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

''اپنے بھائی کو لے جاؤ۔'' حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے سیّد شمس الدین کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

جب سیّد شمس اپنے بھائی کو اٹھا کر والدہ محترمہ کے پاس لے جانے لگے تو آپؒ نے سیّد شمس سے دوبارہ فرمایا۔

''اللہ تم لوگوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے مگر مجھے اس بچے کا زندہ رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ کیونکہ عین نماز میں میری طبیعت اس کی طرف مائل تھی۔''

سیّد شمس، بھائی کو لے کر اندر چلے گئے اور والدہ کو سارا واقعہ سنا دیا۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی شریکِ حیات بھی ایک عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔ بیٹے کی زبانی یہ خبر سنی تو سکتے میں آ گئیں مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

اور پھر وہی ہوا۔ ظہر کے وقت حضرت مخدومؒ کے چھوٹے لڑکے کو بخار آ گیا۔ پھر بخار نے سرسامی کیفیت اختیار کر لی۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کو خبر کی گئی۔ آپؒ اندر تشریف لائے۔ سب سے چھوٹے فرزند کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا۔ بچہ بے ہوش تھا۔ حضرت مخدومؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؒ نے بڑے صبر و استقامت کے ساتھ فرمایا۔

''فرزند! مشیتِ الٰہی میں کسی کو دخل نہیں۔ اللہ ہمیں اتنی ہمت دے کہ ہم راضی بہ رضا ہو جائیں۔'' یہ کہہ کر

آپؒ دوبارہ حجرے میں چلے گئے۔ اہلِ خاندان نے بچے کی تیمارداری کی، بہترین طبیبوں کو دکھایا۔ مگر وہ جو لکھ دیا گیا تھا، اسے حذف کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بالآخر رات کے پچھلے پہر مخدومؒ کے چھوٹے بیٹے نے عالمِ خاک و باد کو الوداع کہا۔ جب حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کو اس المناک سانحے کی اطلاع دی گئی تو آپؒ نے عجیب انداز میں فرمایا۔

''ہر شے اپنے اللہ کی طرف رجوع کرنے والی ہے۔ یقیناً ہمارے دل سوگوار اور چہرے اُداس ہیں مگر پھر بھی اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں۔''

جو لوگ بزرگانِ دین کی گوشہ نشینی کو اپنے اعتراضات کا ہدف بناتے ہیں، انہیں اس واقعہ پر غور کرنا چاہئے کہ مردانِ خدا، آزمائش کے کیسے کیسے مراحل سے گزارے جاتے ہیں۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب آپؒ کسی دُور دراز علاقے میں جانا چاہتے تھے تو کرۂ خاک کا طول و عرض کم کر دیا جاتا تھا اور زمین کی طنابیں کھینچ دی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مخدوم جہانیاںؒ صبح کے وقت ملتان میں نظر آتے تھے اور سہ پہر کو دہلی میں جلوہ افروز ہوتے تھے۔ مخالفین نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس راز سے پردہ ہٹ جائے مگر یہ کس طرح ممکن تھا؟ اللہ نے اپنے کرمِ بے پایاں سے حضرت مخدومؒ کو یہ صفتِ خاص بخشی تھی اور آپؒ اسی لئے جہاں گشتؒ کہلاتے تھے۔ مشہور بزرگ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے آپؒ کی روحانی عظمت کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے۔

''حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے ظاہر ہونے والی کرامات کا شمار ممکن نہیں۔ آپؒ کو قدرت نے اس قدر روحانی قوتیں بخشی تھیں کہ اولیائے متاخرین میں سے کسی کو حاصل نہیں۔''

مشہور چشتی بزرگ، حضرت شیخ علاؤالدین علاالحقؒ بنگال میں قیام پذیر تھے۔ جب آپؒ کا آخری وقت آیا تو تمام مریدوں، خدمت گاروں اور عزیز داروں کو جمع کر کے فرمانے لگے۔

''میں بہت جلد دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ جب میری روح عالمِ بالا کی طرف پرواز کر جائے تو میرے جنازے کو کفن سے آراستہ کر کے میدان میں رکھ دینا۔'' ایک عجیب پُراسرار سی وصیت تھی۔

خدام کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ پھر ایک خدمت گار نے بڑے ادب سے پوچھا۔

''آپ نے نمازِ جنازہ پڑھانے کے لئے کسی کو حکم نہیں دیا۔''

''اللہ وہ رسم بھی کسی نہ کسی سے ادا کرا دے گا۔'' حضرت علاؤالدین چشتیؒ نے بے نیازی کے ساتھ فرمایا۔

''شیخ محترم! اس سلسلے میں بھی ہماری رہنمائی کر دیجئے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ کسی غلطی کے مرتکب ہو جائیں اور اس شخص کو نمازِ جنازہ کی امامت کے لئے کھڑا کر دیں، جسے آپ پسند نہ فرماتے ہوں۔'' دوسرے مرید نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ہاں! پسند تو بس ایک ہی شخص ہے۔'' اس بار حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ کے ہونٹوں پر ایک دلنواز تبسم اُبھر آیا تھا۔ ''وہی میری نمازِ جنازہ پڑھائے گا۔''

''وہ پسندیدہ ہستی کون ہے؟'' ایک مرید نے ادب و احترام کے ساتھ سر جھکا کر پوچھا۔

''میرا محبوب، مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، وہی میری نمازِ جنازہ پڑھائے گا اور وہی مجھے اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کر دے گا۔'' حضرت علاؤالدین چشتیؒ نے بالآخر انکشاف کر دیا تھا۔

شیخ کی زبان سے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا نام سن کر خانقاہ میں سناٹا چھا گیا۔ تمام مرید اور خدمت

گار، سر بگریباں تھے اور ان کے چہروں پر ایک سوالیہ نشان اُبھر آیا تھا۔

''حضرت مخدومؒ تو بنگال سے بہت دُور ملتان میں مقیم ہیں۔ پھر وہ آپ کی آخری رسم ادا کرنے کے لئے یہاں کیسے تشریف لائیں گے؟'' ایک مرید نے اپنے خدشات کا اظہار تو کر دیا تھا مگر اس طرح کہ اس کی زبان سے لکنت نمایاں تھی۔

''یہ سوچنا تمہارا کام نہیں کہ مخدومؒ یہاں تک کس طرح پہنچیں گے؟'' اب کی بار حضرت علاؤالدین چشتیؒ کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری شامل تھی۔ ''جس نے انہیں مخدوم بنایا ہے، وہی ان کی سواری کا بھی انتظام کرے گا۔''

اس وضاحت کے بعد بھی خدمت گاروں کے ذہن میں پیدا ہونے والے اندیشے ختم نہیں ہوئے تھے۔ اگرچہ مریدوں کے یہ استفسارات، گستاخی کے زمرے میں آتے تھے لیکن پھر بھی ایک خادم اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکا۔

''شیخ محترم! بالفرض اگر مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کسی مجبوری کے سبب تشریف نہیں لا سکے تو اس صورت میں غلاموں کے لئے کیا حکم ہے؟''

''مخدوم کیوں نہیں آئیں گے؟'' حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ نے اس طرح فرمایا جیسے آپؒ کی زبان اور آنکھوں سے محبت کا آبشار جاری ہو۔ آج حاضرین کو پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ ایک بزرگ کتنی عقیدت سے دوسرے بزرگ کا نام لیتا ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کون ہیں؟ حضرت علاؤالدین چشتیؒ نے خدام کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر خود ہی فرمانے لگے۔ ''مخدوم تو وہ ہیں جو اپنے اللہ سے عہد کر چکے ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نگاہِ مردِ مومن میں عہد کی کیا قیمت ہوتی ہے؟ وہ آئیں گے، انہیں اپنا عہد پورا کرنے کے لئے آنا ہی ہوگا۔ بالفرض اگر قدرت کی ڈالی ہوئی زنجیر نے ان کے قدموں کو آگے بڑھنے سے روک دیا تو پھر میرے جنازے کو یوں ہی زمین پر پڑا رہنے دینا۔ اللہ جو کچھ کرے گا، بہتر کرے گا۔'' یہ کہہ کر حضرت علاؤالدین چشتیؒ نے خدام کی طرف سے منہ موڑ لیا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ شیخ اب اس سلسلے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتے۔

پھر وقتِ معلوم آیا اور حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مریدوں پر رنج و الم کا ایک کوہِ گراں ٹوٹ پڑا۔ شیخ کی کھلی وصیت کے باوجود مریدوں اور خدمت گاروں کو اس بات کی بھی فکر لاحق تھی کہ آخر تدفین کس طرح ہوگی؟ مخدوم جہانیاںؒ ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے پنجاب سے بنگال کس طرح پہنچیں گے؟ ذہنوں میں ایک عجیب سا شور برپا تھا اور ہوش و خرد منتشر ہو چکے تھے۔ مگر فرمانِ شیخ آخر فرمانِ شیخ تھا۔ حضرت علاؤالدین چشتیؒ کو غسل دے دیا گیا اور پھر کفن پہنانے کے بعد میت ایک وسیع و عریض میدان میں رکھ دی گئی۔

ایک تو حضرت علاؤالدینؒ کے ہزاروں عقیدت مند، دوسرے وہ لوگ جو مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کو نمازِ جنازہ پڑھاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ غرض کثرتِ ہجوم سے پورا میدان بھر گیا۔ یہ خبر پہلے ہی شہر میں گرم ہو چکی تھی کہ پنجاب کے ایک بزرگ، حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ کی نمازِ جنازہ پڑھائیں گے۔ نتیجتاً اہلِ دل حضرات بھی عام عقیدت مند بھی میدان کی طرف رواں دواں تھے اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب ایک کشادہ مقام بے شمار انسانوں کی موجودگی کے سبب تنگ نظر آنے لگا۔

ذہنوں میں ہیجان برپا تھا، دل فکر و اضطراب سے لبریز تھے اور ہر آنکھ اس مردِ خدا کو دیکھنے کے لئے بے چین

تھی جو ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بنگال پہنچنے والا تھا۔ انسانی عقل عاجز تھی اور بیشتر افراد نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ مختصر ترین وقت میں اس قدر طویل فاصلے طے کئے جا سکتے ہیں۔ اتنے بڑے ہجوم میں بس چند اہلِ معرفت اس راز سے باخبر تھے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا اور جب ہزاروں کا مجمع مکمل طور پر مایوسی کا شکار ہو گیا تو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ میدان کے ایک گوشے میں نظر آئے۔ آپؒ کا روشن و پُرجلال چہرہ دیکھتے ہی لوگوں کو یقین آ گیا کہ یہ وہی بزرگ ہو سکتے ہیں، جن کے بارے میں حضرت علاؤالدین چشتیؒ نے وصیت فرمائی تھی۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ تیز قدموں سے جنازے کے قریب تشریف لائے اور انسانوں کو نماز کی صف بندی کے لئے حکم دیا۔ پھر ہزاروں انسانوں نے ایک مردِ خدا کی نمازِ جنازہ اس طرح پڑھی کہ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دامن آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

نماز کے بعد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے حضرت علاؤالدین کے چہرے سے کفن ہٹایا۔ چند لمحوں تک اس رُخِ تابناک کو دیکھتے رہے، پھر روتے ہوئے فرمایا۔

''شیخ! آپ بے شک عظیم تھے کہ اس گناہ گار کو یہ اعزاز بخشا۔ اللہ آپ کی قبر نور سے بھر دے اور آپؒ پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل کرے۔'' مخدوم جہانیاںؒ کے ساتھ دوسرے لوگ بھی حضرت علاؤالدین چشتیؒ کے آخری دیدار میں محو ہو گئے۔ پھر جب ہجوم کو ہوش آیا تو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔

❁❁❁

مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی ایک بڑی کرامت یہ بھی ہے کہ بے شمار ہندوؤں نے آپؒ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا۔ ایک ہندو عورت کے قبولِ اسلام کا واقعہ تو ہندوستان گیر شہرت رکھتا ہے۔ وہ ہندو عورت اپنے مذہب کا بہت زیادہ علم رکھتی تھی۔ اس نے برہمنوں اور پنڈتوں سے لے کر ان سادھوؤں اور جوگیوں تک سے ملاقاتیں کی تھیں جو اپنے فن (شعبدہ بازیوں) میں ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ خود وہ عورت بھی دیومالائی علم کا اکتساب کرتے کرتے شعبدہ بازیوں کے بہت سے امور پر حاوی ہو چکی تھی۔ جب ایک دن اس نے سنا کہ بے شمار ہندو اپنا آبائی مذہب ترک کر کے مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوئے جا رہے ہیں تو وہ بہت زیادہ برہم ہوئی۔ اس نے سخت عالمِ طیش اعلان کیا کہ وہ اپنی روحانی قوتیں استعمال کر کے اپنے ہم مذہبوں کو اس مسلمان فقیر کی قید سے چھڑا لے گی اور پھر کوئی ہندو اسلام کا نام نہیں لے گا۔ غرض اسی قسم کے ان گنت دعوؤں کے بعد وہ عورت حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خانقاہ میں داخل ہوئی۔ حضرت مخدومؒ نے جب ایک عورت کو آتے دیکھا تو خدمت گاروں کو حکم دیا کہ وہ خانقاہ کے باہر چلے جائیں۔ عورت غضب ناک حالت میں اندر آئی۔ مگر جیسے ہی اس کی نظر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے رخِ روشن پر پڑی، اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔

پھر نہایت دردناک لہجے میں چیخنے لگی۔ ''میں نے جو کچھ کتابوں میں پڑھا، وہ محض دیوانگی کا ایک افسانہ تھا۔ میں نے جن لوگوں کی ریاضتیں دیکھیں، وہ شعبدہ بازیاں تھیں۔ میں نے جو کچھ سیکھا، وہ حرفِ باطل تھا۔ میں نے جہل و گمراہی کے تاریک سایوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنی عمر تباہ کر ڈالی۔'' بہت دیر تک اس ہندو عورت پر ہذیانی کیفیت طاری رہی، پھر ہوش کچھ بحال ہوئے تو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے فریادی لہجے میں کہنے لگی۔

''شیخ! میرے دل و دماغ میں سجے ہوئے بت خانوں کو مسمار کر دیجئے اور مجھے اس آگ سے بچا لیجئے جو اپنی

فطرت میں بڑی ہولناک ہے۔''

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے اسے تسلی دی اور پھر کلمۂ طیبہ کی تلقین کی۔ زبان سے کلمۂ طیبہ کے ادا کرتے ہی ہندو عورت کے دل و دماغ کی ساری تاریکیاں چھٹ گئیں اور کچھ دن تک حضرت مخدومؒ کے زیر تربیت رہ کر اس نے ولایت کا درجہ حاصل کیا۔ پھر جیسے ہی اس ہندو عورت کے قبولِ اسلام کی خبریں دوسرے شہروں تک پہنچیں تو وہاں بھی زلزلہ سا آ گیا۔ لاتعداد ہندو، حضرت مخدومؒ کی خانقاہ کی جانب دوڑے اور اپنی روح کے تاریک مکانوں کو ایمان کی روشنی سے سجانے لگے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کو چھتیس بار حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ آخری حج کے بارے میں اوچ کے مشہور عالم، مولانا شمس الدین کی روایت ہے کہ وہ اس سفر میں حضرت مخدومؒ کے ہمراہ تھے۔ اس جہاز میں دوسرے علاقے کے کچھ درویش بھی سفر کر رہے تھے۔ ابھی تین چار دن ہی گزرے تھے کہ درویشوں کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی مگر انہوں نے کسی سے اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ بحری سفر میں مچھلی کا حصول تقریباً ناممکن تھا۔

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے درویشوں کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''حق تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ دوستوں کی خواہش بہت جلد پوری ہو جائے گی۔''

درویشوں نے بڑی حیرت سے حضرت مخدومؒ کی طرف دیکھا۔ مچھلی کھانے کی خواہش جو اُن کے سینوں کی گہرائیوں میں دبی ہوئی تھی، وہ حضرت مخدومؒ پر کس طرح ظاہر ہو گئی۔

ابھی تمام درویش حیرت و استعجاب میں مبتلا تھے کہ یک دومن کی مچھلی پانی سے اُچھل کر جہاز میں آ گری۔

''اللہ نے اپنے بندوں کی ضیافت کا اہتمام کیا ہے۔'' مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے درویشوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اپنے خالق کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔''

پھر اس مچھلی کو بھون کر کھایا گیا۔ اور جہاز کے تمام مسافروں کو معلوم ہو گیا کہ اس سفر میں اللہ کا ایک ولی اُن کا ہم سفر ہے۔

❀❀❀

ایک بار مشہور بزرگ حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی خدمت میں اپنا کفش (جوتا) بھیجا جس کا واضح مطلب یہی تھا۔ ''میں شرف الدین آپ کا کفش پا ہوں۔''

حضرت مخدوم جہانیاںؒ نے ایک بزرگ کے اظہارِ عقیدت کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور جواب میں آپؒ نے حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی خدمت میں اپنی دستار بھیج دی۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ دستار بھیجنے کا واضح مفہوم یہ تھا۔

''آپ کی حیثیت میری نظر میں تاجِ شاہی جیسی ہے۔''

سماع کے بارے میں حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا قول مبارک ہے۔

''سماع اس شخص کے لئے مباح ہے جو اس کے سننے کی اہلیت رکھتا ہو۔''

روشنی کا یہ سفر 78 سال جاری رہا۔ پھر حضرت مخدوم جہانیاںؒ بیمار ہو گئے۔ چند روز علالت کے بعد آپؒ نے عید الاضحیٰ کے دن 785ھ میں دنیا سے منہ موڑ لیا۔ آپؒ کا مزارِ مبارک اوچ (ضلع بہاولپور) میں آج بھی اہلِ دل کا مرکزِ نظر ہے۔

بے شک! معرفت کا یہ آفتابِ ضیا بار، ظاہر پرستوں کے لئے غروب ہو گیا مگر اہلِ دل کی محفلیں آج بھی اس کے ذکر سے روشن ہیں اور اس روشنی کو کبھی زوال نہیں ہو گا ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے

❁❁❁

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ

اب ہم کچھ اور تاریخ ساز صوفیائے کرامؒ کا ذکر کریں گے جنہوں نے صرف ذاتِ وحدۂ لاشریک کے سامنے سر جھکایا۔ بڑے بڑے شاہانِ ستم پیشہ اور کج کلاہانِ وقت کی نفی کی۔ تاج و تخت، کلاہ و سیاہ اور شمشیر و سناں کے بغیر پاک و ہند کے عوام کے دلوں پر حکومت کی۔ ایسی حکومت کہ جسے حشر اٹھائے جانے کے دن تک اندیشۂ زوال نہیں۔

سلسلۂ چشتیہ کے سب سے زیادہ صاحبِ جلال بزرگ، حضرت مخدوم علاؤالدین احمد صابر کلیریؒ اپنے پیر و مرشد حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کا اجازت نامہ لے کر ہانسی پہنچے۔ حضرت بابا فریدؒ کے نامور خلیفہ، حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ قیام فرماتے۔ مخدوم علاؤالدین صابرؒ کو دہلی کی ولایت بخشی گئی تھی۔ حضرت بابا فریدؒ نے اپنے حقیقی بھانجے اور مرید خاص کو حکم دیا تھا کہ وہ ہانسی پہنچ کر شیخ جمال الدینؒ سے اجازت نامے کی تصدیق کرالیں۔

جب حضرت مخدوم علاؤالدین صابرؒ دہلی پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔

حضرت شیخ جمالؒ نے بڑے والہانہ انداز میں مخدوم کا استقبال کیا اور پیر و مرشد کی خیریت دریافت کرتے رہے۔ اسی اثناء میں مغرب کی اذان ہو گئی۔ دونوں بزرگوں نے نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد مخدوم علاؤالدین احمد صابرؒ نے حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو پیر و مرشد کا اجازت نامہ پیش کیا۔ اس وقت خانقاہ میں چراغ موجود نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی حضرت شیخ جمالؒ کے ایک خادم نے چراغ لاکر رکھ دیا۔ پھر جیسے ہی اجازت نامہ پڑھنے کے لئے کھولا گیا، تیز ہوا چلی اور چراغ بجھ گیا۔

حضرت شیخ جمالؒ نے دوبارہ چراغ جلانے کے لئے خادم کو آواز دی۔

''آپ اسے کیوں زحمت دیتے ہیں؟'' یہ کہہ کر حضرت مخدوم علاؤالدین صابرؒ نے پھونک ماری اور چراغ پھر سے روشن ہو گیا۔

حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو مخدوم کی یہ ادا پسند نہیں آئی۔ آپؒ نے حضرت علاؤالدین صابرؒ کا اجازت نامہ چاک کر دیا اور نہایت پُرجلال لہجے میں فرمایا۔

''دہلی میں اتنی طاقت کہاں کہ وہ تمہاری سانسوں کی گرمی برداشت کر سکے۔ پورا شہر ہی جل کر راکھ ہو جائے گا۔ اس لئے میں نے تمہارا اجازت نامہ چاک کر ڈالا۔''

حضرت مخدوم علاؤالدین صابرؒ بچپن ہی سے جلالی کیفیت رکھتے تھے۔ آپؒ کو بھی شیخ جمالؒ کی یہ ادا پسند نہیں آئی۔

''آپ نے میرا اجازت نامہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور میں نے آپ کا سلسلہ ہی چاک کر ڈالا۔''

حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ نے مخدوم کے لہجے کی حرارت کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا۔ ''کہاں سے چاک کیا؟ اوّل سے یا آخر سے؟''

''اوّل سے۔'' یہ کہہ کر حضرت مخدوم، شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی خانقاہ سے نکلے اور پاک پتن کا رخ کیا۔

حضرت بابا فریدؒ نے صورتِ حال دریافت کی تو حضرت علاؤالدین احمد صابرؒ نے عرض کرتے ہوئے کہا۔

''سیّدی! مجھ سے شیخ جمال کا یہ طرزِ عمل برداشت نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے غصے میں ان کا سلسلہ چاک کر ڈالا۔''

''کہاں سے چاک کیا؟ اوّل سے یا آخر سے؟'' حضرت بابا فریدؒ نے مخدوم سے پوچھا۔

''اوّل سے۔'' مخدوم نے سر جھکاتے ہوئے عرض کیا۔

''خیر! یہی مشیت تھی۔'' حضرت بابا فریدؒ کے لہجے میں اُداسی کا رنگ شامل تھا۔ ''تمہاری دعا قبول ہوگئی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ آخر کا سلسلہ باقی رہ گیا۔ ایک دن وہ آئے گا، جب تمہارے ہی مرید، جمالؒ کے لئے دعا کریں گے اور اس کا سلسلہ دوبارہ جاری ہو جائے گا۔''

حضرت مخدوم علاؤالدین صابرؒ نے دہلی کے لئے دوسرا اجازت نامہ طلب کیا تو بابا فریدؒ نے فرمایا۔

''میں جمال کے چاک کئے ہوئے کو نہیں سی سکتا۔ آخر وہ بھی تو اپنا ہے۔ اس کی لاج بھی رکھنا ہی پڑے گی۔ نہ تمہیں چھوڑ سکتا ہوں اور نہ اسے فراموش کر سکتا ہوں۔ تم دونوں ہی میرے دست و بازو ہو۔ مجھے اس ناخوشگوار واقعہ سے شدید قلبی تکلیف پہنچی ہے۔ مگر یہی مقدر تھا۔ اس لئے تم بھی گزشتہ باتوں کو فراموش کر دو اور کلیر چلے جاؤ۔''

اس کے بعد حضرت بابا فریدؒ نے اپنے دستخط کے ساتھ مخدوم کو نیا اجازت نامہ عطا کیا اور مخدوم کلیر تشریف لے آئے۔

کلیر، یوپی کے مشہور شہر سہارنپور کا ایک قصبہ ہے۔ سہارنپور کے بعد مشرقی پنجاب کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ جب مخدوم یہاں تشریف لائے تو ہر طرف گھنا اور تاریک جنگل تھا جس میں درندوں کی کثرت تھی۔ کلیر سے چند میل کے فاصلے پر ہندوؤں کا مشہور ''تیرتھ استھان'' ہردوار واقع ہے۔ اس وقت یہاں بتوں، بت خانوں اور بت پرستوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اور مخدوم علاؤ الدین احمد صابرؒ کو اسی کفرستان کے قلب میں رہ کر پیغامِ حق سنانا تھا۔ پھر جب مخدوم کی صدائے حق گونجی تو صنم کدوں میں زلزلہ آ گیا اور بے شمار بت منہ کے بل اوندھے گر پڑے۔ مخدوم، صاحبِ جلال تھے۔ اس لئے آتشِ شوق نے ہر ماسوا کو جلا ڈالا۔ بس ایک حضرت شمس الدین ترکؒ ہی تھے، جو اس شعلۂ عشق کی حرارت کو برداشت کر سکے۔ مخدوم نے اُنہیں شرفِ باریابی بخشا اور سلسلۂ چشتیہ کی امانت منتقل کر دی۔ حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ سے حضرت علاؤالدین احمد صابر کلیریؒ کا روحانی سلسلہ جاری ہوا۔

پھر مخدوم، دنیا سے پردہ کر گئے۔ حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی ابھی حیات تھے لیکن بوڑھے ہو چکے تھے۔ انہیں اپنے سلسلۂ روحانی کے منقطع ہو جانے کا بہت افسوس تھا مگر اپنے پیر و مرشد، حضرت بابا فریدؒ کے اس فرمان کے سہارے زندہ تھے۔

''جمال! تم مطمئن رہو۔ علی احمد صابر کے خانوادے کا ایک شخص آئے گا، جو تمہارے سلسلہ کو جاری کر دے گا۔''

حضرت بابا فریدؒ بھی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر شیخ جمالؒ کی سماعت میں پیر و مرشد کے الفاظ گونجتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی آپؒ بشریت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر پکار اُٹھتے۔

''میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ فرشتۂ ازل دروازے پر کھڑا ہے۔ پھر وہ آنے والا کب آئے گا؟''

آخر ایک دن شیخ جمال الدین ہانسویؒ کو خواب میں بشارت ہوئی۔ ''وہ آنے والا، درویشوں کے ہجوم کے ساتھ آیا ہے۔ اس سے اپنے سلسلے کے جاری ہونے کی دعا کراؤ۔''

حضرت شیخ جمالؒ ہانسوی نیند سے بیدار ہوئے، وضو کیا، دو رکعت نماز ادا کی اور اپنے خدمت گار کو روانہ کیا کہ فقراء کی جماعت کو احترام کے ساتھ خانقاہ میں لے آئے۔

خادم نے باہر نکل کر دیکھا تو وہاں چند ضرورت مندوں کے سوا کوئی نہیں تھا، جو حضرت شیخ جمالؒ ہانسوی سے اپنے حق میں دعا کرانے کی غرض سے حاضر ہوئے تھے۔

''ان درویشوں کی جماعت کو تلاش کرو۔'' حضرت شیخ جمالؒ ہانسوی نے خادم سے فرمایا۔ ''ممکن ہے کہ وہ مردانِ خدا یہاں سے کچھ فاصلے پر خیمہ زن ہوں۔ انہیں اس وقت تک ڈھونڈتے رہو، جب تک وہ تمہیں مل نہ جائیں۔''

خادم دوبارہ ان درویشوں کی جستجو میں نکلا۔ خانقاہ سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر اپنی گدڑیوں، کمبلوں اور مختصر سے سامانِ ضرورت کے ساتھ فقراء کی جماعت پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ حضرت شیخ جمالؒ کے خادم نے اپنے مخدوم کا پیغام سنایا تو تمام درویش یہ کہہ کر اسی وقت چلنے پر آمادہ ہو گئے۔

''ہمارے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ شیخ ہمیں یاد فرمائیں۔''

حضرت شیخ جمال الدینؒ ہانسوی بڑی بے چینی کے عالم میں خانقاہ کے دروازے پر درویشوں کا انتظار کر رہے تھے۔ جب فقراء کی یہ جماعت وہاں پہنچی تو حضرت شیخ نے بڑے والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا۔ پھر ایک ایک درویش کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ حضرت شیخ جمال الدینؒ ہانسوی عارفِ کامل تھے۔ جب آپ کو ان چہروں میں اپنا مطلوبہ چہرہ نظر نہیں آیا تو درویشوں سے فرمانے لگے۔

''کیا آپ لوگوں میں سے ابھی کوئی اور درویش باقی رہ گیا ہے؟''

''ہاں! ایک اور لڑکا ہے جسے ہم اپنے سامان کی حفاظت کے لئے چھوڑتے ہیں۔'' درویشوں نے جواب دیا۔ مگر ان کے لہجے سے حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''مجھے اسی محبوبِ خدا لڑکے کی تلاش ہے۔ اور میں نے اسی کی وجہ سے آپ حضرات کو زحمت دی ہے۔'' حضرت شیخ جمال الدینؒ ہانسوی نے درویشوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''آپ میں سے کوئی شخص وہاں جائے اور میرے محبوب کو میرے پاس لے آئے۔ کون جانے کہ میں کب سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔''

وہ لڑکا برسوں سے درویشوں کے ساتھ تھا اور ان کا سامان اپنے سر پر اُٹھائے اُٹھائے پھرتا تھا۔ درویش اس لڑکے کو اپنا خادم سمجھتے تھے۔ مگر آج جب حضرت شیخ جمال الدینؒ ہانسوی جیسے بزرگ نے اسی لڑکے کو اپنا محبوب کہہ کر پکارا تو سارے درویش دم بخود رہ گئے۔ پھر ایک درویش تیز تیز قدموں کے ساتھ وہاں پہنچا اور اس لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر دوبارہ خانقاہ میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ جمالؒ اسی طرح پیکرِ انتظار بنے ہوئے خانقاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔

جب وہ لڑکا قریب پہنچا تو حضرت شیخ جمالؒ نے اُس کا اس طرح استقبال کیا جیسے وہ کوئی مردِ بزرگ ہو یا کسی اقلیم کا شہنشاہ۔ پھر حضرت شیخ نے اسے اپنے قریب بٹھایا، درویشوں کی دعوت کی۔ جب فقراء کی جماعت کھانے سے فارغ ہو گئی تو صوفیاء کی رسم کے مطابق اجتماعی دعا ہوئی اور پھر حضرت شیخ جمالؒ نے درویشوں کو رخصت کر دیا مگر اس نوجوان لڑکے کو روک دیا۔

خلوت ہوتے ہی حضرت شیخ جمال الدینؒ ہانسوی نے مخدوم علاؤالدین صابرؒ کا اجازت نامہ چاک کرنے کا پورا واقعہ سنایا اور اپنے لئے دعا کی درخواست کی۔

یہ واقعہ سن کر نوجوان کا چہرہ زرد ہو گیا اور پورا جسم کانپنے لگا۔

''معاذ اللہ! آپ کے اور مخدوم کے سامنے میری کیا حیثیت ہے؟ کہاں شہنشاہ اور کہاں یہ ادنیٰ غلام؟ مہرِ نیمروز کے سامنے ایک مدھم سا چراغ؟..... شیخ! مجھے جانے دیجئے۔ آپ جس قدر اصرار کریں گے، میں اسی قدر اپنے آپ کو گناہ گار تصور کروں گا۔ پھر یہ احساس مجھے زندگی بھر چین سے جینے نہیں دے گا۔''

''یہی مشیتِ الٰہی ہے فرزند!'' حضرت شیخ جمال الدینؒ ہانسوی نے نوجوان کو سمجھایا۔ ''خدا ہی جانے کہ کوچۂ عشق میں کون بڑا ہے اور کون محترم۔ اپنی حیثیت کو درمیان میں نہ لاؤ اور میرے اذیت و کرب کا اندازہ کرو۔''

نوجوان مجبور ہو گیا۔ اور پھر اس نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔ لہجے میں بڑا سوز تھا اور لفظوں میں بڑی تپش تھی۔ مانگنے والا اس یقین اور اس عاجزی سے مانگ رہا تھا کہ جیسے دینے والا انکار نہیں کر سکے گا۔ ہاتھ بھی پھیلے ہوئے تھے اور دامن بھی..... ہونٹ بھی سوالی تھے اور دل بھی۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خانقاہ کے بے جان بام و در بھی اپنے خالق کے حضور گریہ و زاری کر رہے ہوں۔

اور پھر حضرت جمال الدینؒ ہانسوی کو یقین آ گیا کہ نوجوان کی دعا مستجاب ہو گئی ہے۔

نوجوان رخصت ہونے لگا تو حضرت شیخ نے اسے بڑے دل نشین لہجے میں سمجھایا۔

''فرزند! تم اللہ کے پسندیدہ بندے ہو، تمہارے لئے ان قلندروں کے ساتھ مارے مارے پھرنا ہرگز مناسب نہیں۔ اپنے وطن میں قرار پکڑے رہو۔ عنقریب تمہاری ملاقات ایک صاحبِ کمال سے ہو گی۔ پھر تم اپنی مراد کو پہنچ جاؤ گے۔''

نوجوان پر حضرت شیخ جمالؒ ہانسوی کی باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے خانہ بدوش قلندروں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے شہر کی طرف واپس لوٹ گیا۔

❀❀❀

اس واقعے کے ایک سال کے بعد حضرت بابا فریدالدینؒ گنج شکر کے خلیفہ، حضرت شیخ جمال الدینؒ ہانسوی بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بیٹے شیخ نورالدینؒ دو سال کے تھے۔ اسی نوعمری میں اُنہیں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ محبوبِ الٰہیؒ نے انہیں خلعتِ خاص سے نوازا اور اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لیا۔ حضرت شیخ جمال الدینؒ ہانسوی کے جس سلسلۂ روحانی کو مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابرؒ کلیری نے چاک کر ڈالا تھا، وہ ایک نوجوان کی دعاؤں سے جاری ہوا۔

وہ نوجوان، حضرت جلال الدین محمد کبیر الاولیاءؒ پانی پتی تھے۔

آپؒ کا خاندانی نام خواجہ محمد تھا۔ آپؒ 595ھ میں پیدا ہوئے۔ ''جلال الدین'' اور ''کبیر الاولیاء'' آپؒ کے خطابات تھے۔ آپؒ کا سلسلۂ نسب براہِ راست امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ سے ملتا ہے۔ کسی معتبر تذکرے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس سرزمین کو آپؒ کے مقامِ پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے۔ بہرحال یہ روایت ہے کہ خواجہ جلالؒ مادر زاد ولی تھے۔ آپؒ اپنے بچپن ہی میں جو کچھ زبانِ مبارک سے فرماتے، وہ پورا ہو کر رہتا۔ ابھی خواجہ جلالؒ کی عمر تین چار سال سے زیادہ نہیں تھی کہ والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس جانکاہ حادثے کے بعد مشفق و مہربان چچا نے خواجہ جلالؒ کے لئے اپنی آغوشِ محبت وا کر دی۔ یہ تو عالمِ اسباب میں ایک ظاہری وسیلہ تھا کہ ان کی پرورش چچا کے زیرِ سایہ ہو رہی تھی۔ مگر حقیقتاً خواجہ جلالؒ کی تربیت تو کوئی اور ہی کر رہا تھا۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت آپ کر لیتی ہے لالے کی حنا بندی

بعض تذکرہ نویسوں نے تحریر کیا ہے کہ ایام طفلی ہی سے آپؒ بوعلی شاہ قلندرؒ کے منظورِ نظر تھے۔ خواجہ جلالؒ سے حضرت قلندرؒ کی محبت کا یہ حال تھا کہ وہ آپؒ کو دیکھنے کے لئے روزانہ تشریف لاتے تھے۔ ایک دن حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کسی جگہ بیٹھے تھے کہ خواجہ جلالؒ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر سامنے سے گزرے۔ آپؒ کو دیکھتے ہی حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

''زہے اسپ وزہے سوار۔'' (کیا گھوڑا ہے اور کیا گھڑسوار)

حضرت قلندرؒ کا یہ فرمانا تھا کہ خواجہ جلالؒ کی حالت غیر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بے خودی کے عالم میں گھوڑے سے گر پڑے بہت دیر تک بے ہوش رہے اور پھر ہوش آیا تو گریبان چاک کر کے جنگل کی طرف نکل گئے۔

قلندرؒ کی ایک نظر نے خواجہ جلالؒ کے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ آپؒ انسانی آبادی سے متنفر ہو گئے تھے اور سکونِ قلب کے لئے ویرانہ تلاش کرتے تھے۔ کئی سال تک خوفناک جنگلات اور تاریک غار حضرت خواجہ جلالؒ کے مسکن رہے۔ آپؒ نے نفس کی سرکشی ختم کرنے کے لئے عجیب عجیب انداز سے ریاضت کی۔ ایسے ایسے مجاہدات کئے، جن سے آپؒ کے جسم کو سخت آزار پہنچتے تھے۔ اسی دوران حضرت جلالؒ نے دو بار حج کی سعادت بھی حاصل کی دیارِ حجاز میں بے شمار علماء سے ملاقاتیں کیں۔ مگر عشق کی وہ آگ جو آپؒ کے سینے میں روشن تھی، کسی منطق اور کسی کلام کے چھینٹوں سے سرد نہیں ہوئی۔ لحظہ بہ لحظہ وحشت بڑھتی جا رہی تھی اور آپؒ لمحہ بہ لمحہ بے سکون ہوتے جا رہے تھے۔

آخر ایک روز حضرت خواجہ جلال الدینؒ اپنے شب و روز کے معمولات سے بیزار ہو گئے۔ جنگلوں سے نکل کر آبادی میں آئے اور سرزمینِ پانی پت کا رخ کیا۔ اس تاریخی شہر میں اس وقت دو عظیم بزرگ حضرت شمس الدین ترک پانی پتی اور حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ مقیم تھے۔ خواجہ جلال الدینؒ پانی پت پہنچے اور جاں سوختۂ عشق حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ پھر رو رو کر کہنے لگے۔

''قلندر! میں بہت بے سکون ہوں۔ یہ ویرانے، یہ صحرا، یہ جنگل، یہ غار مجھے متاعِ سکون نہ بخش سکے۔ میں پہلے سے زیادہ مضطرب ہو گیا ہوں۔ اب تو یہی بہتر ہے کہ مجھ پر نگاہِ کرم ڈال اور میرے جسم کو پھونک دے یا اس جانِ بے قرار کے لئے اللہ سے منزلِ عافیت طلب کر۔ اب میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں اور میرے پاؤں آبلوں سے بھر گئے ہیں۔''

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے آپ کو اُٹھا کر سینے سے لگایا اور پھر نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''فرزند! تم جس دولتِ سکون کی تلاش میں ہو، وہ اس فقیر کی دسترس میں نہیں۔ مجھ بے سروسامان کے ساتھ رہ کر تیری آتشِ شوق کچھ اور بھڑک جائے گی۔'' یہ کہہ کر حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ کی خانقاہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں جو مردِ خدا، گوشہ نشین ہے، وہی تیرے دل کا معالج ہے۔ اس کے پاس جا اور نگاہِ کرم کی بھیک مانگ۔ اگر ترک ایک بار بھی تیری طرف نظر اٹھا کر دیکھ لے تو پھر ہمیشہ کے لئے اس کے دامن سے لپٹ جا۔ یہی میری نصیحت ہے اور یہی ہدایت ہے۔ اگر تُو اپنی عقیدت میں ثابت قدم رہا تو تجھے سکون کی وہ دولتِ عظیم حاصل ہو جائے گی جو طویل صحرا نوردی کے بعد بھی نہ مل سکی۔ جا! ترک کے پاس جا۔ خدا ضرور تیرے اضطراب کا مداوا کرے گا۔''

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا حکم پا کر خواجہ جلالؒ، حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ کی خانقاہ میں داخل ہو گئے۔ اور جیسے ہی حضرت ترکؒ کی نگاہِ جمال آپؒ پر پڑی، بے قرار جذبوں میں ٹھہراؤ سا آ گیا۔ جس آگ نے حضرت جلالؒ کو برسوں چین سے نہ بیٹھنے دیا تھا، اب وہ بجھتی سی محسوس ہو رہی تھی۔

''قلندر ٹھیک ہی کہتے تھے۔ یہی ہے میری منزلِ سکون۔ یہی ہے میرا مقامِ عافیت۔'' خواجہ جلالؒ نے برسرِ محفل ایک آہِ سرد کھینچی اور حضرت شمس الدین ترکؒ کی بارگاہِ معرفت میں خم ہو گئے۔ پھر حضرت ترکؒ نے آنے والے کو سینے سے لگا کر اپنے پیر و مرشد حضرت علاؤالدین صابر کلیریؒ کا بخشا ہوا سوز و گداز اس دل میں منتقل کر دیا۔ جو برسوں سے بے قرار و مضطرب تھا۔ ایک بار پھر آگ بھڑکی مگر یہ وہ آگ نہیں تھی، جس کی تپش انسان کو وحشیوں کی طرح دربدر پھراتی ہے۔ اس آگ میں معرفت کی سوزش تھی، یقین کی حرارت تھی اور اعتماد کی حدت۔ حضرت خواجہ جلال الدینؒ اب بھی جل رہے تھے مگر شمعِ انجمن کی طرح خاموش اور پُرسکون۔

❀❀❀

حضرت شمس الدینؒ کے دستِ مبارک پر بیعت ہونے کے بعد خواجہ جلال الدینؒ کی آنکھوں سے حجابات اُٹھ گئے اور آپؒ کی ذات سے کشف و کرامات اس طرح ظاہر ہونے لگے کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ ایک دن حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ پورب کی طرف سفر کر رہے تھے۔ جب آپؒ ایک دیہات سے گزرے تو یہ عجیب و غریب منظر دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنا سارا سامان سمیٹ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خواجہ جلالؒ کو مقامی باشندوں کے اس طرزِ عمل پر شدید حیرت ہوئی۔

آخر آپؒ نے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''تم لوگوں پر ایسی کیا آفتِ ناگہانی آپڑی ہے، جس کے سبب ترکِ سکونت کر رہے ہو؟''

وہ شخص، حضرت جلالؒ سے ناآشنا تھا مگر آپؒ کا نورانی چہرہ دیکھ کر ٹھہر گیا۔ پھر نہایت خوف زدہ لہجے میں بولا۔ ''بزرگ! ہم ایک ناقابلِ بیان مصیبت سے دوچار ہیں۔ یہاں کا حاکم ایک ظالم و جابر شخص ہے، جو تمام دیہاتیوں سے اس سرزمین پر رہنے کے لئے مال طلب کرتا ہے۔ ہم سب کے سب نہایت عاجز و مفلس ہیں حاکم کا مطالبہ ہم پورا نہیں کر سکتے۔ مجبوراً اپنے گھر چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف جا رہے ہیں۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمیں کس گوشۂ زمین پر پناہ ملے گی۔'' یہ کہتے کہتے وہ شخص رو پڑا۔

مظلوم دیہاتیوں کی رودادِ الم سن کر حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کا چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا۔ پھر آپ نے اس شخص کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تم فکرمند نہ ہو۔ اس زمین کا مالک صرف اللہ ہے۔ اس کی بارگاہ سے انسانوں کو سکونت و قیام کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ تم اپنے سردار سے میری ملاقات کراؤ۔''

وہ شخص فوراً ہی حضرت خواجہ جلالؒ کو بستی کے اس معزز فرد کے پاس لے گیا جو بوڑھا ہو چکا تھا اور شکل صورت سے نہایت شریف نظر آتا تھا۔ سردار نے ایک پیکرِ نورانی کو دیکھتے ہی ادب سے سلام کیا۔

''کیا اگر تم لوگ مقرر کردہ رقم ادا کر دو تو حاکم کے قہر و غضب سے محفوظ رہو گے؟'' حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے بستی کے سردار سے سوال کیا۔ ''پھر تو اپنے آباد گھروں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤ گے؟''

''بزرگ! یہ بات بظاہر ناممکن ہے کہ ہم اس جابر شخص کو اتنی بڑی رقم ادا کر سکیں۔'' سردار بہت شکستہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''ہمیں اپنے گھر چھوڑنا ہی پڑیں گے۔ یہی تو نوشتۂ تقدیر ہے اور یہی ہمارا انجام ہے۔''

"کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؟ مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ خالقِ کائنات کی رحمت سے مایوس ہو کر گناہ کے اندھیروں میں ڈوب جائیں۔" خواجہ جلال الدینؒ نے سردار کی انتہائی مایوس کن باتوں کے جواب میں فرمایا۔
"فی الوقت تم ایسا کرو کہ مجھے اپنے گاؤں کا مالک و مختار بنا دو اور تمام بستی والوں سے کہہ دو کہ وہ میرے حکم پر سختی سے کار بند ہو جائیں۔"

سردار چند لمحوں تک غور کرتا رہا اور پھر اس نے خواجہ جلالؒ کی بات مان لی۔ تمام دیہاتیوں نے بھی باآواز بلند اقرار کیا کہ آج سے آپ ہی اس بستی کے سردار ہیں۔ گاؤں کے باشندوں نے اپنی زبان سے تو اقرار کرلیا، مگر ان کے دل و دماغ میں بے شمار وسوسے اور اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ایک بے سروسامان اجنبی درویش اُن کے مسئلے کو کس طرح حل کرسکتا ہے؟ غرض ان ہی پریشان خیالات کے ہجوم میں بستی کے تمام لوگ حضرت جلال الدینؒ کے روشن چہرے کو دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد حضرت جلال الدینؒ نے دیہاتیوں کو حکم دیا کہ لوہے کہ تمام آلات ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں۔ بستی والے حیرت زدہ ہوتے ہوئے بھی حضرت شیخ کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کا سارا لوہا ایک جگہ ڈھیر کر دیا گیا۔ حضرت شیخ نے حکم دیا کہ بہت سی لکڑیاں جمع کر کے ان میں آگ لگا دی جائے۔ یہ ایک دیر طلب کام تھا۔ لکڑیوں کا انبار لگانے میں شام ہوگئی۔ حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے مغرب کی نماز ادا کی اور پھر اپنے ہاتھ سے ان لکڑیوں میں آگ لگا دی، جن کے نیچے بستی والوں کے تمام آہنی آلات، اوزار اور ہتھیار دبے ہوئے تھے۔ آگ روشن ہوئی اور شعلے بھڑکنے لگے۔ تیز روشنی میں دیہاتیوں کے مغموم اور افسردہ چہرے کچھ عجیب سے نظر آ رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ نے عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر آپؒ نے بستی والوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"اب تم لوگ جاؤ اور چین کی نیند سو جاؤ۔ میں تمہاری عافیت کے لئے اپنے مالک سے دعا کر رہا ہوں۔"
حضرت شیخ کا حکم پاتے ہی بستی والے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ ان کے قدم تھکے ہوئے تھے اور ذہنوں میں ایک انتشار برپا تھا۔ اجنبی بزرگ کا ہر ایک عمل ان کے فہم و ادراک سے بالاتر تھا۔

جب ہر طرف سناٹا چھا گیا اور حضرت شیخ نے اندازہ کرلیا کہ اب کوئی دیہاتی قرب و جوار میں موجود نہیں ہے تو آپؒ نے بھڑکتی ہوئی آگ کے قریب اپنا مصلّٰی بچھا دیا۔ پھر آپؒ کے دونوں ہاتھ فضا میں دراز ہوئے اور ہونٹ لرزنے لگے۔ ایک گدائے بے نوا اپنے آقا سے بستی والوں کے لئے سکون و عافیت کی بھیک مانگ رہا تھا۔

"اے مالکِ ارض و سما! اے لامحدود سلطنت رکھنے والے! اے شہنشاہِ حقیقی! اپنی عظیم الشان مملکت میں سے ان بستی والوں کو ایک گوشۂ زمین بخش دے کہ یہ تیرے کرم کے بغیر خس و خاشاک سے بھی زیادہ حقیر ہیں۔ اے علیم و خبیر! تجھ پر یہ حقیقت بھی روشن ہے کہ میں ان بے گھروں سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اپنے عزت و جلال کے صدقے میں اس گناہ گار و عاجز بندے، محمد جلال الدین کو سرخرو فرما۔" حضرت جلال الدینؒ کی یہ گریہ و زاری نصف شب تک جاری رہی۔ طویل التجاؤں کے بعد آپؒ نے بستی پر ایک نظر ڈالی۔ تمام لوگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے حضرت خواجہ جلالؒ نے اپنا مصلّٰی اُٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گاؤں کی حدود سے نکل گئے۔ پھر ایک مقام پر ٹھہر کر آپؒ نے دوبارہ بستی کی طرف رخ کیا اور نہایت پُرسوز آواز میں فرمایا۔

"تم پر ہمیشہ اللہ کی رحمت سایہ فگن رہے۔" اس آخری دعا کے بعد حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ تاریک رات میں اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

سورج طلوع ہوا۔ بستی کے لوگ دیوانہ وار اپنے اپنے بستروں سے اُٹھے اور اس آگ کی جانب دوڑے جو سرِ شام روشن کر دی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کا گاؤں ایک مرکز میں سمٹ آیا۔ آگ ساری توانائی کھونے کے بعد بجھ چکی تھی۔ کل رات جہاں سرخ شعلے بھڑک رہے تھے، اب وہاں راکھ کا ڈھیر تھا۔ بستی والوں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اجنبی بزرگ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جانے والے کو آوازیں دی گئیں، بار بار پکارا گیا مگر حضرت خواجہ جلالؒ تو بہت دور جا چکے تھے۔ آخر جب اس نورانی چہرے کا کوئی سراغ نہیں ملا تو مجبور ہو کر دیہاتیوں نے سوچا کہ سارے گاؤں کا لوہا جمع کر کے آگ لگانے سے ان بزرگ کا کیا مقصد تھا؟ تجسّس بڑھا تو بستی کے سردار نے راکھ کو کریدا۔ پھر اس خاک کے ڈھیر سے جو کچھ برآمد ہوا، اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لئے بستی والے اپنی بصارتوں کا اعتبار کھو بیٹھے۔ زنگ آلود لوہا، تپتے ہوئے سونے میں بدل چکا تھا۔ ہوش وخرد سر بہ گریباں تھے اور مفلس و نادار دیہاتیوں کے چہروں پر ناقابلِ بیان مسرت کے سائے لرز رہے تھے۔

کیمیا گر اپنی عمریں تباہ کرنے کے بعد ایک مشتِ خاک کو سونے میں تبدیل نہ کر سکے۔ پھر وہ مردِ خدا کون تھا، جس نے کثیف و سیاہ آہن کو سنہری لباس پہنا دیا تھا؟ لوگ مسلسل سوچتے رہے۔ آخر جب اُن کے منتشر ذہن سوچتے سوچتے تھک گئے تو وہ اجنبی بزرگ کی لمحاتی ملاقات کو یاد کر کے رونے لگے۔ پھر یہ جذباتی فضا ختم ہوئی تو سونے کے اس ڈھیر کو برابر کے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ حاکم کے مطالبات پورے ہو گئے۔ اور پھر اس بستی میں طویل دورِ خزاں کے بعد، اپنے ہونٹوں پر تبسم جاں فزا سجائے عہدِ بہار طلوع ہوا۔

یہ واقعہ 650ھ کے قریب پیش آیا تھا۔ چار سو سال بعد مشہور بزرگ حضرت شیخ الہدیہؒ نے اپنی کتاب ''سیر الاقطاب'' تصنیف کی۔ شیخ الہدیہؒ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے صدیوں پہلے اس محتاج بستی کو اپنی دعاؤں سے سرفراز کیا تھا۔ آپؒ کی دعاؤں کی اثر انگیزی کا یہ حال ہے کہ دوبارہ بستی والوں پر غربت و افلاس کا سایہ نہیں پڑا۔ آج بھی لوگ خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

❀❀❀

ایک بار حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کسی کوہستانی علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ جب آپؒ ایک پہاڑ پر پہنچے تو ایک جوگی نظر آیا۔ وہ آنکھیں بند کئے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا۔ حضرت خواجہ جلال الدینؒ اُسے دیکھ کر ٹھہر گئے اور جوگی کے طریقۂ عبادت کا جائزہ لینے لگے۔ کچھ دیر بعد جوگی نے آنکھیں کھول دیں اور حضرت خواجہ جلالؒ کی طرف دیکھا۔ پھر اچانک اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''تُو ہماری تلاش میں یہاں تک آ پہنچا ہے؟'' جوگی، خواجہ جلالؒ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''تیری جستجو کامیاب ہو گی۔ ہمارے پاس آنے والا کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔'' جوگی نہایت تکبر کے انداز میں بول رہا تھا اور حضرت خواجہ جلالؒ خاموشی سے اس تارک الدنیا کو دیکھ رہے تھے۔ ''آج ہم تجھے وہ چیز دیتے ہیں، جس کی تمنا میں نہ جانے کتنے انسان پہاڑوں اور جنگلوں کی راہ لیتے ہیں، عمر بھر بھٹکتے رہتے ہیں اور پھر اپنے سینوں پر ناکامی کا داغ سجا کر گزر جاتے ہیں۔''

حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے جوگی کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر آپؒ کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت دیکھ کر جوگی شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا اور اس نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈال کر ایک پتھر نکالا۔

''یہ پارس پتھر ہے۔ اگر ایک بار بھی کسی لوہے کے ٹکڑے کو چھو لے گا تو اسے سونا بنا دے گا۔'' جوگی نے

بڑے غرور کے ساتھ دعویٰ کیا اور وہ پتھر حضرت خواجہ جلالؒ کی طرف بڑھا دیا۔

حضرت شیخؒ نے خاموشی سے پتھر لے لیا اور چند لمحوں تک اُسے بغور دیکھتے رہے۔ پھر یکا یک آپؒ نے پتھر کو اس چشمے میں پھینک دیا جو قریب ہی بہہ رہا تھا۔ جوگی آپؒ کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر بڑے کرب ناک انداز میں چیخنے لگا۔

''تُو نے میری ساری عمر کی کمائی پانی میں غرق کر دی۔''

''جب تم نے وہ پتھر مجھے دے دیا تو پھر میں با اختیار ہوں کہ اسے غرقِ آب کر دوں یا کسی فولاد سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دوں۔ اب یہ سب کچھ میری مرضی پر منحصر ہے۔'' حضرت خواجہ جلالؒ نے پہلی مرتبہ جوگی کی بے سر و پا باتوں کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

''میں نے تجھے وہ بیش بہا چیز اس لئے نہیں دی تھی کہ اسے اس طرح ضائع کر دیا جائے۔'' جوگی تحقیر آمیز لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ ''جس شخص کو پارس اور دیگر پتھروں کی تمیز نہ ہو، میں اسے معاف نہیں کر سکتا۔'' یہ کہہ کر جوگی اپنی جگہ سے اٹھا اور حضرت شیخؒ سے جھگڑا کرنے لگا۔ ''میں تجھے یہاں سے اس وقت تک جانے نہیں دوں گا، جب تک میرا پارس مجھے واپس نہیں مل جائے گا۔''

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ، جوگی کی لاف زنی پر مسکرائے۔ ''خیر، یہ علیحدہ بات ہے کہ تم مجھے روکنے پر قادر ہو یا نہیں؟ ویسے اس چشمے کی تہ میں ہزاروں پارس پڑے ہوئے ہیں۔ تمہیں جتنے پتھروں کی ضرورت ہو، نکال لو۔'' حضرت شیخؒ، جوگی کے گستاخانہ لہجے کے باوجود اپنی روایتی شیریں بیانی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ہزاروں پتھروں کی بات سن کر جوگی حیران رہ گیا۔ اب اس کا غصہ ختم ہو چکا تھا اور نہایت تعجب سے حضرت شیخؒ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا یہ فریب تو نہیں؟'' جوگی نے کبیر الاولیاءؒ سے دریافت کیا۔ ''اِدھر میں پانی میں اُتروں اور اُدھر تُو غائب ہو جائے۔ کہیں یہ بہانہ سازی تو نہیں؟'' جوگی کو ہزاروں پارس پتھروں کے انکشاف پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اے شخص! تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ میں مذہباً مسلمان ہوں اور مسلمان کے لئے دروغ گوئی جائز نہیں۔'' حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ ''میں اس وقت تک یہاں کھڑا رہوں گا، جب تک تم اپنا پتھر حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ جاؤ! تہِ آب جا کر دیکھو کہ قدرت کی صناعی کس کس انداز سے ظاہر ہوتی ہے۔''

آخر جوگی کو یقین آ گیا اور پھر وہ شدید اضطراب کے ساتھ چشمے کی تہ میں اُتر گیا۔ حضرت شیخؒ نے جو کچھ فرمایا تھا، وہ حرف بہ حرف درست تھا۔ پانی کے نیچے ہزاروں پارس بکھرے پڑے تھے اور ان ہی پتھروں میں اس کا پتھر بھی موجود تھا۔ جوگی نے اپنے پتھر کے ساتھ کئی دوسرے پتھر بھی جیب میں رکھے اور چشمے کی سطح پر اُبھر آیا۔

''تمہیں تمہارا پتھر مل گیا؟'' حضرت شیخؒ نے جوگی کے باہر آتے ہی سوال کیا۔

''ہاں! مل گیا۔'' جوگی نے ندامت سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''یہ بد دیانتی ہے۔'' حضرت شیخؒ نے اُسے تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تمہیں صرف یہ حق حاصل ہے کہ اپنا پتھر لے لو اور باقی جو پتھر چشمے کی امانت ہیں، انہیں واپس پانی میں ڈال دو۔'' حضرت کبیر الاولیاءؒ نے اپنے کشفِ باطن سے جوگی کی بد نیتی کا حال جان لیا تھا، اس لئے آپؒ نے اس پر ظاہر کر دیا کہ وہ خیانت کا مرتکب ہو رہا ہے۔

ہندو جوگی کو ایک مسلمان بزرگ کی روشن ضمیری نے بدحواس کر دیا تھا۔ اور اب اس کے لئے کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہی تھی۔ وہ شرمندگی کے پسینے میں نہا گیا۔ اور پھر اس نے تمام پتھر نکال کر حضرت شیخ کے سامنے ڈال دیئے۔ کبیر الاولیاءؒ نے پتھروں پر ایک نگاہ کی اور پھر جوگی کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

''افسوس! انسان چند پتھروں کے لئے اپنی زندگی کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔'' یہ کہہ کر آپؒ مڑے اور واپس جانے لگے۔ ابھی حضرت شیخ دو چار ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ جوگی دیوانہ وار چیخنے لگا۔

''میری تمام ریاضتوں کو خاک میں ملا کر کہاں جا رہا ہے؟ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چل کہ باقی ماندہ زندگی اندھیروں میں گزارنا نہیں چاہتا۔''

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ، جوگی کی آواز سن کر ٹھہر گئے۔ ''میں نے ساری زندگی برباد کر کے ایک پارس پتھر حاصل کیا۔'' جوگی کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔ ''تُو نے کسی تحقیق کے بغیر پانی کی تہ میں ہزاروں پتھر تلاش کر لئے۔ آخر یہ فرق کیوں ہے؟ میں پتھر کے ایک ٹکڑے کو اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھ کر سینے سے لگائے پھر رہا ہوں اور تُو پارس کے انبار کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یہ کیسی بے نیازی ہے؟ پہلے تجھ پر پانی کی تہ میں پڑے ہوئے پتھر بے نقاب ہوئے۔ پھر تُو نے میری جیب میں چھپے ہوئے پارس بھی دیکھ لئے۔ یہ کیسی روشنی ہے جو ہر تاریکی سے گزر کر چند لمحوں میں اشیائے ظاہری کی حقیقت کو سمجھ لیتی ہے؟ مجھے بتا کہ تیرے اور میرے علم میں یہ نمایاں فرق کیوں ہے؟'' اتنا کہہ کر جوگی نے حضرت کبیر الاولیاءؒ کے پاؤں پکڑ لئے۔ لحظہ بہ لحظہ اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

''میں اس وقت تک ان قدموں سے جدا نہیں ہوں گا، جب تک تُو میرے سوالات کا جواب دے کر مجھے مطمئن نہیں کر دے گا۔'' بڑی عجیب صورتِ حال تھی کچھ دیر پہلے جوگی، شیخ سے ایک پتھر کے لئے لڑ رہا تھا اور اب اس روشنی کی حقیقت جاننا چاہتا تھا، جس کی تمازت سے اندھیروں کے جگر چاک ہو جاتے تھے۔

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ، جوگی کی ضد دیکھ کر مسکرائے اور پھر آپؒ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''میرے پاؤں چھوڑو۔ میں اس فرق کی وضاحت کر دوں گا، جو میری اور تمہاری نظروں کے درمیان قائم ہے۔''

حضرت شیخ کی پُر جلال آواز گونجی۔ ''پتھر بذاتِ خود بے جان ہیں، اس لئے ان کے پجاری بھی ایک دن مردہ ہو جاتے ہیں۔ تمہارا دل بھی مر چکا ہے۔ روح بھی اور آنکھیں بھی۔ اس لئے تمہیں ایک حقیر پتھر کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تمہارے جسم کے اندر ایمان کا شعلہ روشن ہوتا تو تمہاری آنکھ بھی روشن ہو جاتی اور پھر تمہیں نظر آنے لگتا کہ قدم قدم پر کیسے کیسے قیمتی پتھر بکھرے پڑے ہیں۔''

''ایمان کی روشنی کیا ہوتی ہے اور اسے کیسے حاصل کیا جاتا ہے؟'' جوگی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''اللہ کی وحدانیت اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر گواہی دینا ایمان ہے۔'' حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے جوگی کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ ''جب بندہ ایک خدا کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے تو ایمان کی روشنی دل میں اُتر جاتی ہے۔ دماغ و روح کی کثافت دُور ہو جاتی ہے۔ اور پھر انسان کی آنکھوں کے سامنے سے حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ اسی روشنی نے پہاڑی چشمے کی تہ کو میرے سامنے اس طرح ظاہر کر دیا تھا، جیسے میں سورج کے اُجالے میں اپنے اطراف کی چیزوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اس روشنی کو پانے کے بعد انسان کا دل حرص و ہوس سے پاک ہو جاتا ہے اور دولت کے انبار بھی اس کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے۔ بس یہی فرق ہے جو تمہارے اور میرے علم کے درمیان نمایاں ہے۔''

جوگی ہدایت پا چکا تھا۔ اس نے کفر کی مالا توڑ دی اور راہبانہ لباس چاک کر ڈالا۔ اب حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کے نقشِ قدم اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ پھر ساری دنیا نے دیکھا کہ باطل کے غبار میں تمام عمر بھٹکنے والا، منزلِ حقیقت کی جانب تیزی سے گامزن تھا اور سلسلۂ چشتیہ کے اس عظیم بزرگ کی چند روزہ صحبت نے ایک گم کردہ جوگی کو ولیٔ کامل بنا دیا تھا۔

ایک تپتی دوپہر میں خواجہ جلال الدینؒ سے حضرت شمس الدینؒ نے فرمایا۔ ''شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

جلال الدینؒ یہ سن کر چپ ہو گئے اور کوئی جواب نہ دیا تو حضرت شمس الدینؒ نے دوبارہ فرمایا۔ ''تم شادی کرلو۔''

حضرت جلال الدینؒ نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''اگر ایسا نہ کروں تو؟''

''یہ خلافِ سنت ہوگا۔'' حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ نے فرمایا۔

''ڈر لگتا ہے۔'' جلال الدینؒ نے آہستہ سے کہا۔

''ڈر کیوں لگتا ہے؟'' حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ نے اپنے مرید خاص سے سوال کیا۔

''آنے والے وقت سے ڈر لگتا ہے۔'' حضرت جلال الدینؒ نے متبسم انداز میں عرض کیا۔

''سارے وقت اللہ کے ہیں۔ اور اللہ ہی سب وقتوں کو بنانے والا ہے۔ وقت سے کیا ڈرنا؟'' حضرت شمس الدینؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔

''بس ایسے ہی.....'' جلال الدینؒ دل کی بات زبان پر لانہیں پا رہے تھے۔

''معلوم تو ہو کہ آخر ایسا کون سا عذر ہے جو تمہیں سنت کے خلاف قدم اُٹھانے پر مجبور کر رہا ہے؟''

''ڈرتا ہوں۔'' حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے عرض کیا۔

''کیوں ڈرتے ہو؟'' حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ نے اپنے مرید سے اس خوف کی وضاحت طلب کی۔

''اولاد کا کیا بھروسہ'' جلال الدینؒ نے نرمی سے کہا۔ ''جانے کیسی ہو؟ اگر بدعمل ہوئی تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟''

شمس الدین ترک پانی پتیؒ نے یہ بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جلال الدین! اتنی دُور چلے گئے۔''

''کیا عرض کروں حضرت اگر اولاد بدعمل ہوئی تو سزاوار کہلاؤں گا۔'' جلال الدین کبیر الاولیاءؒ بات کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔

''انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔'' حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ نے فرمایا۔

''حضرت! یہ آپ فرما رہے ہیں؟'' جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے کسی قدر حیرت سے عرض کیا۔

''ہاں..... ہاں..... میں کہہ رہا ہوں۔'' شمس الدینؒ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ''تم شادی کرو۔ تمہاری اولاد میں سے جو نیک ہوگا، وہ تمہارا...... جو بد ہوگا، وہ ہمارا..... تمہاری بد اولاد کی ذمے داری ہم قبول کرتے ہیں۔''

یہ بات جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کے دل کو ایسی لگی کہ آپؒ نے شادی کر لی۔ ان خاتون کے بطن سے دو لڑکیاں اور پانچ لڑکے پیدا ہوئے۔ حضرت شمس الدین ترکؒ کی دعا سے آپؒ کے تمام صاحبزادے منصبِ ولایت پر فائز ہوئے اور روحانیت کے درجۂ کمال کو پہنچے۔

❁❁❁

سلطان فیروز شاہ تغلق، حضرت خواجہ کبیر الاولیاءؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ ایک بار وہ آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ دیر تک باادب بیٹھا رہا، پھر اُس نے ایک عجیب سا سوال کیا۔

''شیخ! آپ کا مقامِ معرفت یقیناً ہمارے فہم وادراک سے باہر ہے۔ مگر کیا کبھی آپ نے خداوند ذوالجلال کو دیکھا ہے؟''

حضرت خواجہ جلال الدینؒ نے چند لمحوں کے لئے سکوت فرمایا۔ اس کے بعد آپؒ نے قرآن کریم کی ایک آیت تلاوت کی، جس کا مفہوم یہ ہے۔

''اللہ لطیف ہے......کوئی آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی۔''

''بے شک!'' فیروز شاہ تغلق نے کہا۔ ''میں قرآنِ کریم کی اس آیت پر ایمان رکھتا ہوں۔ لیکن روحانیت میں آپ کا مشاہدہ کیا ہے؟'' سلطان نے اپنے سوال کو مختلف انداز میں دہرایا۔

''ہاں! میں نے اللہ کا عکس دیکھا ہے، جسے بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔'' حضرت جلال الدینؒ نے ایک خاص کیفیت جذب میں فرمایا۔

فیروز شاہ تغلق آپؒ کے جواب سے بہت خوش ہوا اور اس نے رخصت ہوتے وقت زر و جواہر بطور نذر پیش کئے۔ ''اگر آپ یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمالیں تو میں اس سعادت پر ہمیشہ نازاں رہوں گا۔'' سلطان کا لہجہ بڑا عاجزانہ تھا۔

''خدا، سلطان کو حُسنِ نیت کا حوصلہ دے درویشوں کو دولتِ دنیا سے کیا کام؟'' یہ کہہ کر حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے فیروز شاہ تغلق کو اس طرح رخصت کیا کہ آپؒ کے چہرۂ مبارک پر حرص وطلب کا کوئی عکس تھا اور نہ غرورِ بے نیازی کی کوئی جھلک۔

سلطان خانقاہ سے اُٹھا اور راستے میں اس نے مقامی باشندوں سے حضرت شیخؒ کے فرزندوں کی مالی حالت کے بارے میں دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ کبیر الاولیاءؒ کے یوں تو سارے فرزند ہی غربت و افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر ایک صاحبزادے پر اکثر فقر و فاقے کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ فیروز شاہ تغلق نے لوگوں سے حضرت شیخؒ کے اس فرزند کا پتہ پوچھا اور اپنے وزیروں کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ سلطان نے کبیر الاولیاءؒ کے فرزند کو دیکھتے ہی اندازہ کرلیا کہ وہ شدید تنگ دستی کا شکار ہیں۔ مگر چہرے سے بھوک اور طلب کا اظہار نہیں ہورہا تھا۔

وزراء نے اپنے شہنشاہ کا تعارف کرایا۔ جواب میں حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کے صاحبزادے نے سلطان کا والہانہ استقبال کیا۔ فیروز شاہ تغلق کو چند لمحوں کے لئے گمان ہوا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے گا۔ شاہی نذرانے، جنہیں حضرت کبیر الاولیاءؒ نے قبول نہیں کیا تھا، وہ ان کے بیٹے کے کام آجائیں گے اور اس طرح اس کا دلی مقصد حاصل ہوجائے گا۔

حضرت شیخؒ کے فرزند نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو اپنے مکان کے فرشِ خاک پر بٹھا کر رسمِ مہمانی ادا کرنی چاہی مگر فرمانروائے ہند نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ حضرت کبیر الاولیاءؒ سے ملاقات کرکے یہاں آیا ہے، اپنی مصروفیت کے باعث وہ زیادہ دیر پانی پت میں قیام نہیں کرسکتا۔

''پھر آپ نے کس لئے زحمت گوارا کی؟'' کبیر الاولیاءؒ کے فاقہ کش فرزند نے کہا۔ فیروز شاہ کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ نوجوان کا جسم یقیناً لاغر و نحیف ہے مگر لہجے میں وہی جلال ہے جو حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کی

خاص پہچان ہے۔

''میں ہندوستان کے تمام درویشوں سے عقیدت رکھتا ہوں۔ خصوصاً آپ کے والد گرامی سے۔'' سلطان کے چہرے اور لہجے دونوں سے عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''میری خواہش ہے کہ یہ حقیر سی نذر آپ قبول فرمالیں۔'' اس کے ساتھ ہی فیروز شاہ تغلق نے اپنے خدام کو اشارہ کیا، خدام زر و جواہر سے بھرے ہوئے خوان لے کر آگے بڑھے۔

جب خدام، کبیر الاولیاءؒ کے فرزند کے روبرو پہنچے تو افلاس زدہ نوجوان نے سلطان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''یہ سب کیا ہے اور کس کام آتا ہے؟''

اس سے پہلے کہ فیروز شاہ تغلق کوئی جواب دیتا، ایک وزیر درمیان میں بول اٹھا۔

''یہ ہند کے فرمانروا، سلطان فیروز شاہ تغلق کی بارگاہِ امارت سے دریشوں کے لئے ایک تحفہ ہے۔ یہ قیمتی زر و جواہر ہیں، جن سے شکم کے علاوہ جسم کی تمام آسائشیں خریدی جاسکتی ہیں۔''

''سلطان کی آمد اور اس نوازش کا بے حد شکریہ۔'' کبیر الاولیاءؒ کے فرزند کی آواز سے نقاہت ظاہر ہو رہی تھی مگر لہجے میں وہی قلندرانہ بے نیازی تھی۔ ''سلطان کو شاید یہ بات نہیں معلوم کہ ہم لوگ سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے غلاموں کے حلقے میں شامل ہیں۔ اور ایک غلام اپنے آقا کی روش کو ترک نہیں کر سکتا۔ بے شک! یہ زر و جواہر جسم و شکم کی آسائشیں خرید سکتے ہیں، مگر ہم فاقہ مستِ ازل تو دنیا میں آنے سے پہلے ہی بھوک خرید چکے ہیں۔ اگر ہماری زبانیں اپنے رب سے عہد نہ کر چکی ہوتیں تو ہم ناآسودہ لوگ، سلطان کی عنایات پر یقیناً بہت زیادہ خوشی کا اظہار کرتے۔ سلطان! آپ خود ہی سوچیں کہ جس ذاتِ جلیل نے مجھے پیدا کیا ہے، میں اس کی رزّاقی پر کس طرح شک کروں؟ راندۂ درگاہ نہ ہو جاؤں گا؟ جب وہ کسی کی خوشامد کے بغیر میری کفالت کرتا ہے تو میں غیر کی جانب نگاہ اُٹھا کر کیوں دیکھوں؟ سلطان! آپ کی محبت بجا، مگر آپ یہ راز نہیں جانتے کہ میرے ناتواں کاندھے کسی کے احسان کا بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔''

یہ کہہ کر آپؒ نے فیروز شاہ تغلق سے اجازت چاہی اور اپنے بوسیدہ لباس کے ساتھ اس مکان میں واپس چلے گئے جس کی شکستہ حالت، مکیں کی غربت و افلاس کا مرثیہ پڑھ رہی تھی۔

تمام وزراء اور خدام اس نوجوان درویش کے طرزِ عمل پر حیران تھے اور سلطان فیروز شاہ تغلق اس مکان کے دروازے کو دیکھ کر رو رہا تھا، جس سے گزر کر حضرت کبیر الاولیاءؒ کے فرزند اندر تشریف لے گئے تھے۔ عنایتِ شاہی کی آمد کو روکنے کے لئے اپنے گھر کے کواڑوں کو سختی سے مقفل کر لینا انسانی زندگی کا نہایت سنگین مرحلہ تھا، جس سے وہی لوگ گزر سکتے ہیں جو اپنی جانیں خدا کے ہاتھ فروخت کر چکے ہوں۔ حضرت کبیر الاولیاءؒ کے فرزند بھی ان ہی جاں فروشوں میں سے تھے کہ آپؒ نے تین چار وقت کے فاقے کے باوجود اکرامِ شاہی سے منہ موڑ لیا تھا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق یہ کہتا ہوا واپس لوٹا۔ ''خدا کی قسم! کبیر الاولیاءؒ کا پورا گھرانہ ہی درویش ہے۔'' اس نے خدام کو حکم دیا کہ ساری دولت ان غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دی جائے جو حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کے آستانے کے باہر پڑے رہتے ہیں۔

تاریخ ہند میں سلطان فیروز شاہ تغلق کے حوالے سے ایک اور عجیب واقعہ درج ہے۔ سلطان کو اپنی زندگی میں یہ سعادتِ عظیم حاصل تھی کہ اس کے پاس رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدمِ مبارک کا نشان موجود تھا، جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان کے خالہ زاد بھائی، فتح خان کی بھی شدید

واہش تھی کہ کسی طرح سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ مقدس نشانی اسے حاصل ہو جائے۔ جب فیروز شاہ تغلق کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے فتح خان کو طلب کر کے کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ آقا ﷺ کی نشانی حاصل کرنے کے لئے غلاموں کے دلوں میں رنجش و کدورت پیدا ہو۔'' سلطان کا لہجہ مصالحانہ تھا۔

''سلطانِ معظم کچھ بھی کہیں، لیکن کُوئے محبت کا یہ بھکاری ہی اس بات کا مستحق ہے کہ رسالت پناہ ﷺ کے قدمِ مبارک اس کے سینے پر سجائے جائیں۔'' یہ کہتے کہتے جوشِ عقیدت سے فتح خان رونے لگا تھا۔

فیروز شاہ تغلق بھی اپنے بھائی کی قلبی کیفیات سے متاثر ہوا تھا۔ مگر وہ اس نعمتِ عظیم سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ آخر سلطان نے فتح خان کے سامنے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی نہیں جانتا کہ کس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟ لیکن پھر بھی ہم ایک فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟'' فتح خان نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''ہم دونوں میں سے جس کی موت بھی پہلے واقع ہو گی، اسی کے سینے پر رسالت مآب ﷺ کی یہ مقدس نشانی رکھ دی جائے گی۔'' فیروز شاہ تغلق نے ایک ایسی تجویز پیش کر دی جس سے کسی بھی فریق کے مقصد کی تکمیل ہو سکتی تھی۔

''ہاں مجھے سلطان کا یہ فیصلہ منظور ہے۔'' اچانک فتح خان بہت خوش نظر آنے لگا تھا۔ ''میں اپنے خدا سے اُمید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے پہلے موت کا مزہ چکھائے گا اور پھر میں اپنے آقا ﷺ کے نقشِ کفِ پا کو دل پر رکھ کر کفن پہن لوں گا۔'' فتح خان عجیب وارفتگی کے عالم میں اس شے کی تمنا کر رہا تھا جس کے تصور سے بھی شجاعانِ وقت کو پسینہ آ جاتا ہے۔

''فتح خان! تمہارا یہ اضطراب قبل از وقت ہے۔'' فیروز شاہ تغلق نے سلسلۂ کلام منقطع کرتے ہوئے کہا۔ ''موت کا علم صرف خدا کو ہے۔''

''بے شک! مگر سلطان میرے ذوقِ طلب کو نہیں سمجھ سکتے۔'' یہ کہہ کر فتح خان اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''خدا اس بات پر قادر ہے کہ وہ میرے لئے لوحِ محفوظ کو بدل ڈالے۔ میں اس سے یہاں تک اپنی موت کی التجا کروں گا کہ ایک دن وہ مجھ سے راضی ہو جائے گا۔'' فتح خان کی حالت غیر ہو رہی تھی اور وہ اسی بے قراری کے عالم میں قصرِ شاہی سے نکل کر چلا گیا۔

دوسرے دن یہ مردِ جانباز ایک برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر پانی پت کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ قیام فرماتے۔ پانی پت پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی تھی۔ فتح خان نے کبیر الاولیاءؒ کی خانقاہ کے دروازے پر گھوڑا روکا اور کسی سے کچھ کہے بغیر حضرت شیخ کے حجرۂ خاص کی طرف جانے لگا۔ دروازے پر حضرت کبیر الاولیاءؒ کے خلیفہ مخدوم شیخ زیناؒ عالمِ کیف میں کھڑے جھوم رہے تھے۔

جب آپؒ نے ایک اجنبی جوان کو بے باکانہ انداز میں بارگاہِ شیخ کی طرف جاتے دیکھا تو بڑے عجیب سے لہجے میں کہنے لگے۔

''نادان بچے! کہاں جا رہا ہے؟ تُو سلامتی کے ساتھ واپس آنا نہیں چاہتا؟'' مخدوم شیخ زیناؒ کے ایک ایک لفظ سے جلالِ روحانی ظاہر ہو رہا تھا۔

''میں جس طرح جا رہا ہوں، اسی طرح واپس لوٹ آؤں گا۔'' فتح خان نے شیخ زیناؒ کی بات کو کوئی اہمیت نہیں

دی اور بے نیازانہ حضرت کبیر الاولیاءؒ کے حجرے کی طرف بڑھنے لگا۔

"اگر تُو سلامتی کے ساتھ واپس آ گیا تو میرے پیرہن کی دھجیاں اُڑا دینا۔ ورنہ میں تیرا لباس چاک کر ڈالوں گا۔" مخدوم شیخ زیناؒ کا لہجہ آتشیں ہو گیا تھا اور چہرے پر غیظ و غضب کی برق لہرا رہی تھی۔

فتح خان پر ایک مردِ جلیل کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سیدھا حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کے حجرے میں داخل ہو گیا۔ اس وقت حضرت شیخ عالمِ استغراق میں تھے۔ فتح خان ایک گوشے میں دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد حضرت خواجہ جلالؒ کی کیفیتِ جذب ختم ہوئی تو آپؒ نے فتح خان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"بہت ضدی ہو مگر پسندیدہ ہو۔ اچھا جاؤ! تم ہی اپنے سینے کو روشن کر لو۔"

فتح خان نے حضرت کبیر الاولیاءؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور حجرے سے نکل کر باہر آیا۔ مخدوم شیخ زیناؒ کسی مستعد پہریدار کی طرح اپنی جگہ موجود تھے۔ فتح خان نے قریب پہنچ کر با آواز بلند کہا۔

"تم نے دیکھ لیا کہ میں سلامتی کے ساتھ گیا اور سلامتی کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔"

"بچے! خوش قسمتی سے تیر نشانے پر بیٹھ گیا۔" مخدوم کا لہجہ غیر متوقع طور پر نرم محسوس ہو رہا تھا۔ "اچھا! یوں ہی سہی۔ جا، دستِ غیب نے تیری قبا چاک کر ڈالی۔ دہلی تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

خانقاہ میں موجود دوسرے خدام بھی ایک اجنبی کے ساتھ شیخ زیناؒ کی گفتگو سن رہے تھے مگر مفہوم سب کے ذہنوں کی گرفت سے دور تھا۔

فتح خان نے آگے بڑھ کر شیخ زیناؒ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر بڑے والہانہ انداز میں بولا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ اس گناہ گار کو دوبارہ بشارتِ مرگ حاصل ہوئی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔

"ایسی بھی کیا جلدی؟" شیخ زیناؒ پہلی بار مسکرائے۔ "بہت تھکن ہو گئی ہو گی۔ رات تو آرام سے کاٹ لے۔"

"شیخ! ابھی میری قسمت میں آرام کہاں؟" فتح خان بہت زیادہ پُر جوش نظر آ رہا تھا۔ "خود ہی پیرہن چاک ہونے کی خبر سناتے ہو اور خود ہی رفو گری کا مشورہ دیتے ہو۔ شیخ! مجھ جاں سوختہ پر رحم کرو۔" یکایک فتح خان کی آواز سے رقت جھلکنے لگی۔

شیخ زیناؒ بھی فوراً ہی سنجیدہ ہو گئے۔ اور پھر محبت آمیز لہجے میں کہنے لگے۔

"جا میرے بے قرار بچے! اللہ تجھ پر منزل آسان کرے۔"

فتح خان نے چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور عقیدت سے سر جھکا دیا۔ پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور شدید تھکن کے باوجود دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ بالآخر طویل مسافت کے بعد جب دہلی کے قریب پہنچا تو اسے نیند آنے لگی۔ فتح خان نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ سفر جاری رہے اور گھر پہنچ کر آرام کرے۔ مگر اعصاب اس قدر شل ہو گئے تھے کہ ہاتھوں سے گھوڑے کی لگامیں چھوٹنے لگیں۔ مجبوراً گھوڑے سے نیچے اُترا اور ایک درخت کے سائے میں چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ فتح خان کو تھوڑی دیر تک محسوس ہوتا رہا جیسے وہ مدہوشی کے عالم میں کسی دلکش وادی سے گزر رہا ہے۔ وقت کی گردش تیز تر ہو گئی۔ پھر اس کا یہ احساس بھی مٹ گیا۔ فتح خان کو نیند آ گئی۔ ایسی نیند جو صورِ اسرافیل کی آواز سن کر ہی ٹوٹے گی۔

دوسرے دن سلطان فیروز شاہ تغلق کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر ملی تو وہ سناٹے میں آ گیا اور بہت دیر تک

تخت پر کسی مجسمے کے مانند ساکت بیٹھا رہا، پھر ایک آہِ سرد کھینچی اور نہایت دل گرفتہ انداز میں سرِ دربار کہنے لگا۔

''فتح خان کا جذبہ صادق تھا۔ اس نے مجھے شکست دے دی۔ میری دولت، میرا اقتدار، میرا لشکر و سپاہ کسی کام نہیں آئے۔ نصرت اُسی کا مقدر تھی اور وہی فاتح ٹھہرا۔''

جب فتح خان کو غسل دیا جا چکا تو سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنے ہاتھ سے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قدم مبارک کا نشان اس کے سینے پر رکھ دیا، پھر روتے ہوئے بولا۔

''الفراق میرے بھائی! یہ بڑے جاں گداز لمحات ہیں۔ مگر میں تجھے تیری موت پر مبارکباد دیتا ہوں۔''

فتح خان کو دفن کر دیا گیا۔ اس کی موت بظاہر ایک عام موت تھی۔ مگر جو لوگ اس راز سے باخبر ہیں کہ فتح خان، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پائے اطہر کا عکس اپنے دل پر سجائے ہوئے ابدی نیند سو رہا ہے، آج بھی ایک خاص جذبے کے ساتھ اس مقام پر جمع ہوتے ہیں۔ فتح خان، ہند کا کوئی حکمران نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا؟ بڑے بڑے باجبروت حکمران اپنا نشان کھو چکے ہیں۔ آج کوئی جانتا بھی نہیں کہ سلاطینِ خلجی اور سلاطینِ تغلق کہاں دفن ہیں؟ مگر فتح خان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے سینے پر تمغۂ نجات آویزاں کئے ہوئے محوِ خواب ہے۔ اور اسی غیر معمولی اعزاز کے باعث اس کا مقبرہ زیارت گاہِ خاص و عام بن گیا ہے۔

تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے جب بھی فتح خان کے مرقد کی طرف ایصالِ ثواب کے لئے آتے ہیں، ان کے کانوں میں حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کے الفاظ گونجنے لگتے ہیں۔ وہ الفاظ جو حضرت شیخ نے فتح خان کو نصرت و کامیابی کی بشارت دیتے ہوئے کہے تھے۔

''بہت ضدی ہو مگر پسندیدہ ہو۔ اچھا جاؤ! تم ہی اپنے سینے کو روشن کر لو۔''

یہ حضرت کبیر الاولیاءؒ کی بڑی کرامت ہے۔ اگر اہلِ دانش اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔''

❀❀❀

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کے یہاں ہمیشہ فقر و فاقے کی حالت رہتی تھی۔ ایک دن ایک کیمیا گر، حضرت شیخ کے صاحبزادوں کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''مخدوم زادے ہوتے ہوئے بھی تم لوگ غربت و افلاس کی زندگی گزارتے ہو۔''

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کے صاحبزادوں نے فرمایا۔ ''حق تعالیٰ نے ہمیں دل کی دولت عطا فرمائی ہے۔''

مخدوم زادوں کا جواب سن کر کیمیا گر نے کہا۔ ''میں دل کی دولت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، مگر تمہیں دنیا کی دولت حاصل کرنے کا طریقہ بتا سکتا ہوں۔''

''ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔'' مخدوم زادوں نے کہا۔ ''ہم کسی فانی شے کے لئے اس قدر مشقت برداشت نہیں کر سکتے۔''

''میں سونا بنانے کا ہنر جانتا ہوں۔'' کیمیا گر نے کہا۔ ''تمہیں محنت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ گھر بیٹھے سونا بناتے رہو اور آسودہ حال زندگی بسر کرتے رہو۔''

کیمیا گر واپس چلا گیا تو ایک صاحبزادے نے اپنے والد محترم کو پورا واقعہ سنا دیا۔

حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے فرزند کی بات سن کر فرمایا۔ ''اپنے بھائیوں کو بلا لو۔ یہ فقیر تمہیں بتائے گا کہ سونا کسے کہتے ہیں اور کیمیا گری کا فن کیا ہے؟''

پھر جب تمام صاحبزادے جمع ہو گئے تو حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے اپنے حجرے کی ایک دیوار پر تھوک دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا حجرہ سونے کا ہو گیا۔

مخدوم زادوں نے حیرت سے یہ منظر دیکھا تو حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے فرمایا۔ ''میرے بچو! مومن کا لعابِ دہن ہی کیمیا ہے جو پتھر کو بھی سونا بنا دیتا ہے۔''

اس کے بعد کسی مخدوم زادے کے دل میں کبھی خواہشِ دنیا پیدا نہیں ہوئی اور حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کے تمام فرزند، فقر کی دولت پر رضامند ہو گئے۔

❁❁❁

آخری عمر میں حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ پر استغراق کا غلبہ رہنے لگا تھا۔ جب نماز کا وقت آتا تو کوئی خادم قریب جا کر آپؒ کے کان میں ''حق، حق، حق'' کہتا اور آپؒ ہوش میں آ جاتے۔ پھر وضو کر کے نماز ادا کرتے اور نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ استغراق کی حالت میں چلے جاتے۔

ایک دن حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ اچانک ہوش میں آئے اور اپنے صاحبزادوں کو طلب کر کے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں اپنی زندگی میں سے چند سال اپنے ہم نام، سیّد جلال الدین بخاریؒ (مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ) کو بخش دوں۔ کیونکہ شیخ کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟''

والد محترم کی بات سن کر آپؒ کے بڑے صاحبزادے حضرت شیخ عبدالقادرؒ نے عرض کیا۔ ''مجھے کس طرح گوارا ہوگا کہ آپ کی حیاتِ مبارک میں کمی واقع ہو؟ میں تو اپنی پوری زندگی آپ کو دینے کے لئے تیار ہوں۔''

پھر جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے اپنے دوسرے صاحبزادے حضرت شیخ ابراہیمؒ سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔

پھر تیسرے صاحبزادے حضرت خواجہ شبلیؒ سے یہی سوال کیا گیا تو آپؒ نے نہایت پُر جوش لہجے میں عرض کیا۔ ''سیّدی کی عمر دراز ہو۔ لیکن اگر حکمِ الٰہی یہی ہے تو پھر ہمیں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت گزر جائے اور ہمیں حق تعالیٰ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ رضائے الٰہی پر ایسی ہزاروں جانیں قربان۔''

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ اپنے صاحبزادوں کے جواب سے بہت خوش ہوئے، انہیں بہت دعائیں دیں۔ پھر آپؒ پر استغراق کی کیفیت طاری ہو گئی۔ حضرت شیخؒ کے دونوں صاحبزادے اُٹھ کر چلے گئے مگر حضرت شیخ عبدالقادرؒ وہیں بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ ہوش میں آئے۔ بڑے صاحبزادے کو بیٹھے دیکھا تو فرمایا۔ ''جب تم یہاں موجود ہو تو میرے ساتھ اوچ چلو۔'' حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اُس وقت اوچ (بہاولپور) میں مقیم تھے۔

''میرے پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ دو اور آنکھیں بند کر لو۔'' حضرت مولانا جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے شیخ عبدالقادرؒ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

شیخ عبدالقادرؒ نے اپنے والد محترم کی ہدایت پر عمل کیا۔ پھر جب آنکھیں کھولیں تو خود کو اوچ میں موجود پایا۔

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ اپنے صاحبزادے کو لے کر حضرت سیّد جلال الدین بخاریؒ کے آستانے پر حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ پر نزع کا عالم طاری تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے بے حد عقیدت تھی، اس لئے وہ خود بھی اوچ حاضر ہوا تھا۔ مگر جب حضرت

جلال الدین کبیر الاولیاءؒ تشریف لائے تو فرمانروائے ہندوستان وضو کرنے گیا ہوا تھا۔

حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے سرہانے آ کر اُنہیں وضو کرایا۔ حیرت انگیز طور پر حضرت مخدومؒ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ پھر حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ نے حضرت جہانیاں جہاں گشتؒ کو دو رکعت نماز پڑھوائی، اس کے بعد آپؒ نے دس انگلیوں کے اشارے سے اپنی زندگی کے دس سال حضرت مخدومؒ کو بخش دیئے اور سلام کر کے پانی پت واپس چلے آئے۔

پھر جب سلطان فیروز شاہ تغلق کو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی زبانی اس واقعہ کا علم ہوا تو اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''خوش نصیب کہ میرے عہد میں ایسے ایسے اولیائے کرام بھی موجود ہیں''

تقریباً ڈیڑھ سو سال تک حضرت خواجہ جلال الدینؒ نے بے شمار گم کردہ راہ انسانوں کو منزل کا پتہ بتایا۔ لاتعداد مریضوں کی مسیحائی کی، ان گنت ضرورت مندوں کو ظاہری دولت سے نوازا اور پریشان حالوں کی غم خواری کی۔ پھر خاندانِ چشتیہ کا یہ روشن آفتاب سرزمینِ ہند پر ایک صدی سے زیادہ حکومت کرنے کے بعد غروب ہو گیا۔ حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کا انتقال 765ھ میں ہوا۔ آپؒ نے طویل عمر پائی۔ اس قدر ضعف کے باوجود حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ آخری وقت تک اپنے سارے کام آپ ہی انجام دیتے رہے اور اللہ کے سوا کسی غیر کے شرمندۂ احسان نہیں ہوئے۔ حضرت کبیر الاولیاءؒ کا مزار پانی پت میں ہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی خاکِ مشرقی پنجاب صرف اس لئے روشن و تابناک ہے کہ پانی پت کی زمین میں سلطان الہندؒ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا ایک غلام آرام فرما رہا ہے۔

❁❁❁

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ

قارئین کرام پر واضح رہے تصوف میں عام طور پر چار سلسلوں کو زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ اور سلسلۂ چشتیہ۔ برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ چشتیہ نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

کوئی سمجھے تو یہ سب برصغیر پاک و ہند
غور سے دیکھے تو سارا دیار چشتیہ

اب ہم سلسلۂ چشتیہ کے ایک اور عظیم بزرگ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا ذکر کریں گے۔

آپؒ کا خاندانی نام، محمد اشرف ہے۔ صحیح النسب سیّد ہیں، اس لئے بعض تذکروں میں میر سیّد محمد اشرف بھی تحریر کیا گیا ہے۔ دن اور مہینے کا تو پتہ نہیں چلتا مگر اس بات کی سند موجود ہے کہ 688ھ میں پیدا ہوئے۔ سمنان، عراق کا ایک علاقہ ہے اور اسی خطّے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں سیّد محمد اشرف نے آنکھیں کھولیں۔ آپؒ کے والد سلطان ابراہیم، سمنان کے حاکم تھے۔ کچھ لوگوں نے انہیں بادشاہ کہہ کر بھی پکارا ہے۔ بہرحال یہ تحقیق درجۂ اعتبار کو پہنچ جاتی ہے کہ سیّد محمد اشرف، شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بے شمار افراد آپؒ کو شہزادہ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ دنیاوی شہزادگی ہمارا موضوع نہیں، لیکن سیّد محمد اشرف، معرفت کے شہزادے ضرور تھے۔ رسمِ دنیا کے مطابق آپؒ کی پرورش نہایت ناز و نعم کے ساتھ ہوئی۔ ایک حاکم کا فرزند ہونے کے باعث آپؒ کو دنیا کی ہر آسائش میسر تھی۔ مگر سلطان ابراہیم نے بیٹے کے ذہن کو مادی جاہ و جلال سے زنگ آلود ہونے نہیں دیا۔ سیّد محمد اشرف کو علم کے راستے پر گامزن ہونے کی ہدایت بھی کی اور تعلیم و تربیت کے لئے بہترین استاد بھی مقرر کئے۔ سیّد اشرف کو قدرت کی طرف سے بہترین حافظہ بخشا گیا تھا۔ نتیجتاً آپؒ نے سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر کے اپنے والد گرامی اور اہلِ دربار کو حیران کر دیا۔

پھر ایک تقریبِ خاص میں اس نو عمر حافظ کو اکابر علماء کے سامنے پیش کیا گیا۔ علماء کی یہ جماعت بہترین قرأت کرنے والوں پر مشتمل تھی۔ اور ان میں سے ہر شخص حفظِ قرآن کی دولت سے سرفراز تھا۔ آخر روحوں کی کثافت دُور کرنے والے وہ کیف آور لمحات آئے جب عراق کے نامور علماء، قراء اور حفاظ جمع ہوئے۔

سلطان ابراہیم بھی احترام قرآن میں تخت سے نیچے اُتر آئے اور علماء کی جماعت کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئے۔ مساوات کا عجیب منظر تھا۔ کچھ دیر بعد چند سپاہی، شہزادے سیّد اشرف کو لئے ہوئے دربار میں داخل ہوئے۔ شہزادے سیّد اشرف نے والیٔ سمنان اور علماء کی خدمت میں سلام پیش کیا اور دست بستہ اپنے والد کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کم سنی کے باوجود شہزادے کے چہرے سے گھبراہٹ یا پریشانی کے آثار نمایاں نہیں تھے۔ امتحان اور آزمائش کا احساس ہی فکر مند ہونے کے لئے کافی ہوتا ہے اور اس منزل میں مضبوط اعصاب کے انسان بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ مگر شہزادہ اشرف حیرت انگیز طور پر بہت زیادہ پُرسکون نظر آ رہے تھے۔

جب محفلِ قرأت آراستہ ہو گئی تو والیٔ سمنان، سلطان ابراہیم اپنی نشست پر کھڑے ہوئے اور بڑے پُرسوز لہجے میں تقریر شروع کی۔

''میں ایک حقیر و ناتواں بندہ سب سے پہلے اپنے اللہ کی کبریائی بیان کرتا ہوں اور پھر اس ذاتِ عالی مرتبت پر درود و سلام بھیجتا ہوں جس کی ہدایت نے ہمیں ذلت و گمراہی کے تاریک غاروں سے نکالا اور تہی دستوں کو اس دولتِ لازوال سے نوازا جس کے ہم اہل نہیں تھے۔''

حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد سلطان ابراہیم نے اس تقریب کے انعقاد کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا۔

''حضرات! یہ حکومتِ سمنان کا وارث، محمد اشرف آپ کے سامنے حاضر ہے۔ میں نے دینی تعلیم کے آغاز میں شہزادے کو حفظِ قرآن کرایا ہے۔ آپ اس کم سن حافظ کی زبان سے کلامِ الٰہی کی سماعت کریں اور میری درخواست ہے کہ شہزادے کی قرأت پر بھی خصوصی توجہ فرمائیں۔ میں اپنے فرزند کے سلسلے میں آپ کی عطا کردہ سند کا طلب گار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ علمائے کرام اپنی حق گوئی و بے باکی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے صحیح رائے کا اظہار کریں گے۔''

سلطان ابراہیم کی مختصر سی تقریر کے بعد دربار میں سناٹا چھا گیا۔ شہزادہ اشرف نے ممتحن علماء کی خدمت میں سلام پیش کیا اور آغازِ قرأت کی اجازت طلب کی۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد حکومتِ سمنان کا کم سن ولی عہد چند لمحوں تک آنکھیں بند کئے خاموش بیٹھا رہا، پھر ایک معصوم اور دل نشیں آواز دربار میں اُبھری۔ سیّد اشرف بڑے اعتماد کے ساتھ قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ شہزادے کی خوش الحانی نے ایک عجیب سماں پیدا کر دیا تھا۔ آخر کئی نشستوں میں کلامِ الٰہی ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی پورا دربار تحسین و آفرین کے کلمات سے گونجنے لگا۔ شہزادہ اشرف نے اس نوعمری میں حُسنِ قرأت کے علاوہ بہترین حافظ ہونے کا بھی ثبوت فراہم کیا تھا۔ اگرچہ قرآنِ کریم میں ''متشابہات'' کے کئی مقام آتے ہیں، جہاں اکثر حفاظ کی زبان لڑکھڑا جاتی ہے اور وہ بھٹک کر دوسری آیات تلاوت کرنے لگتے ہیں۔ مگر سیّد محمد اشرف کے حافظے کا یہ کمال تھا کہ ایک بار بھی ان کی زبان کو لغزش نہیں ہوئی اور دریا کی روانی جیسے انداز میں سورۂ ''الفاتحہ'' سے ''الناس'' تک ان لوگوں کو پوری کتابِ مقدس سنائی، جو اپنے وقت کے بہترین عالم، بہترین قاری اور بہترین حافظ تھے۔

(متشابہات سے مراد قرآنِ کریم کی وہ آیاتِ مقدسہ ہیں جو اپنی ظاہری شکل و ساخت میں یکسانیت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی حافظ کو دھوکا ہو جاتا ہے اور وہ بہک کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے)

ختمِ قرآن پر تمام علماء نے بیک زبان کہا۔

''سلطان خوش نصیب ہیں کہ اللہ نے انہیں قوی الحافظہ فرزند عطا کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ شہزادہ اشرف، علم کے حوالے سے اپنے آباؤ اجداد کا نام روشن کریں گے۔'' یہ بظاہر ایک رسمی تعریف تھی مگر والیٔ سمنان کے لئے بڑی حوصلہ افزا تھی۔ آج ان کی خاموش دعائیں بارآور ہوتی نظر آ رہی تھیں اور وہ اپنے فرزند کی کامیابی پر بے حد مسرور و مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔

اس تقریبِ روحانی کے اختتام پر سلطان ابراہیم نے علماء کی جماعت کو قیمتی نذریں پیش کیں۔ دربار سے رخصت ہوتے وقت تمام مذہبی عالموں نے سیّد اشرف کے حفظِ قرآن کے سلسلے میں والیٔ سمنان کو پُرجوش تہنیت پیش کی مگر ایک بزرگ نے سلطان ابراہیم سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''میں قرآنِ کریم کی تلاوت کے دوران مسلسل شہزادے کی پیشانی کو دیکھتا رہا ہوں۔'' بزرگ بہت آہستہ لہجے میں بول رہے تھے۔

''پھر آپ کو سیّد اشرف کے ماتھے پر کیا نظر آیا؟'' سلطان ابراہیم نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''اس کی پیشانی کی لکیروں سے ایک خاص روشنی پھوٹ رہی ہے۔'' بزرگ اپنے ظاہری حلیے سے بہت شکستہ اور افلاس زدہ نظر آ رہے تھے مگر ان کے لہجے میں بڑا جلال تھا۔ شہنشاہوں اور فرمانرواؤں سے بھی زیادہ جاہ و جلال۔

سلطان ابراہیم نے چونک کر ان بزرگ کی طرف غور سے دیکھا۔ بزرگ کے جسم پر ایک بوسیدہ لباس تھا اور چہرے پر غربت و فاقہ کشی کا گہرا رنگ نمایاں تھا۔ والیٔ سمنان کو خیال گزرا کہ یہ بزرگ اپنے معاشی حالات کے سبب شہزادے کی تعریف کرر ہے ہیں کہ شاید اس طرح انہیں دربارِ شاہی سے مزید مراعات حاصل ہو جائیں۔''

ابھی سلطان ابراہیم کے ذہن میں اسی قسم کے اندیشے سر اُبھار رہے تھے کہ وہ بزرگ دوبارہ سرگوشی کے انداز میں بولے۔

''سلطان! اللہ کے بندوں سے بدگمانی نہیں کرتے۔''

سلطان شرمسار ہو گئے۔ بزرگ نے اپنی قوتِ کشف کے ذریعے ان کے منتشر خیالات کو پڑھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سلطان ابراہیم لب کشائی کرتے، بزرگ دوبارہ مخاطب ہوئے۔

''بادشاہ کی پیش کردہ یہ نذر بھی یوں قبول کر لی کہ والیٔ سمنان کی دل آزاری نہ ہو۔ ورنہ ہمارا رازق اللہ ہے۔ وہی اللہ جو اپنے اس گناہ گار بندے کی بھی کفالت کرتا ہے اور سلطان ابراہیم کی بھی۔''

والیٔ سمنان ندامت کے پسینے میں ڈوب گئے۔ اس لئے اپنی پراگندہ خیالی پر معذرت کرنے لگے۔ بزرگ نے ان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ پر ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ بس ایک عجیب سے عالمِ جذب میں بولتے رہے۔

''میں نے شہزادے اشرف کی پیشانی کی لکیروں سے ولایت کے آفتاب کو طلوع ہوتے دیکھا ہے۔ عنقریب خداوندِ ذوالجلال، سلطان کے فرزند کو ایسی شاہی عطا کرے گا کہ جس کے آگے دنیا کے تمام اقتدار بجھ کر رہ جائیں گے۔ ظاہری مملکتیں فنا ہو جائیں گی، مگر اس کی سلطنت کو بقائے دوام حاصل ہو گی۔ اللہ، شہزادے کی عمر دراز کرے اور اسے زمانے کی تمام فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رکھے۔''

یہ کہہ کر بزرگ چلے گئے۔ سلطان ابراہیم نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ایک مردِ قلندر تھے۔ شاہی رعب و جلال ان کے پیروں میں زنجیریں نہ ڈال سکا۔ محل سے نکل کر بزرگ نے سلطان کی دی ہوئی تمام دولت غریبوں میں تقسیم کر دی۔

وقت گزرتا رہا۔ سلطان ابراہیم، روز و شب کے ہنگاموں اور امورِ مملکت کے پیچ و خم میں اُلجھنے کے باوجود نامعلوم بزرگ کی پیش گوئی کو فراموش نہ کر سکے۔ قدم قدم پر انہیں ایک مردِ خدا کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ جس سے متاثر ہو کر وہ سیّد اشرف کی تعلیم و تربیت پر مزید توجہ دینے لگے۔

بالآخر سمنان کے شہزادے نے چودہ سال کی عمر میں علومِ ظاہری کی تکمیل کر لی۔ یہ ایک اور کارنامہ تھا جسے دیکھ کر اہلِ شہر حیران رہ گئے۔ بیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے پورا عراق، سیّد اشرف کے حلقۂ شہرت میں شامل ہو چکا تھا۔

پھر آپؒ روحانیت کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے۔ مگر ابھی آپؒ کسی مردِ کامل کے دامن سے وابستہ ہونے نہیں پائے تھے کہ لوحِ محفوظ کا ایک اور فیصلہ زمین پر نازل ہو گیا۔ سلطان ابراہیم اچانک بیمار ہوئے اور چند روز بسترِ علالت پر دراز رہ کر انتقال کر گئے۔ یہ ایک جاں گداز حادثہ تھا، جسے سیّد اشرف نے کمال صبر کے ساتھ

برداشت کیا۔ پھر سمنان کی شاہی رسم کے مطابق آپؒ نے حکومت کی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ کچھ دن اس کارِ دشوار کو بحسن و خوبی نبھاتے رہے۔ دن بھر رعایا کے مسائل حل کرتے اور پھر نصف شب تک اپنے خدا کے حضور خم رہتے۔ آپؒ کے دورِ حکومت میں ظلم کے لئے کوئی اماں نہیں تھا۔ انصاف عام تھا اور گھر گھر آسودہ حالی کے واضح نشانات نظر آتے تھے۔

پھر ایک روز سیّد اشرف نے خواب میں کسی بزرگ کو دیکھا۔ بزرگ والیٔ سمنان سے مخاطب تھے۔

''سیّد! تمہیں اس لئے پیدا نہیں کیا تھا کہ ہنگامۂ اقتدار میں اُلجھ کر رہ جاؤ۔ دنیا کی حکومت عارضی ہے اور یہ تاجِ شاہی بہت جلد خاک میں مل جانے والا ہے۔ تم کہاں تک فانی چیزوں کے پیچھے بھاگتے رہو گے؟ منزلِ ابد کی طرف دیکھو کہ وہ تمہیں کب سے پکار رہی ہے۔ اُٹھو اور قبائے ریشمی کو اُتار پھینکو۔ یہ مختصر سا علاقہ تمہارا حلقۂ اثر نہیں۔ تمہیں ہندوستان کی طویل و عریض سرزمین کا روحانی شہنشاہ منتخب کیا گیا ہے۔ بنگال میں شیخ علاؤالدین چشتیؒ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ جاؤ ان سے اپنا حصہ لے لو۔''

جیسے ہی خواب میں وہ بزرگ روپوش ہوئے، سیّد اشرف کی آنکھ کھل گئی۔ آپؒ پر ایک دہشت سی طاری ہوگئی تھی۔ بہت دیر تک اس عجیب و غریب منظر کے بارے میں سوچتے رہے جس نے آپؒ کے دل کی کیفیت ہی بدل ڈالی تھی۔ پھر صبح ہوگئی اور سیّد اشرف، حکومت کے ضروری کاموں میں اس خواب کو فراموش کر بیٹھے۔ اگر کسی وقت خیال بھی آیا تو یہ سوچ کر مطمئن ہوگئے کہ وہ دبی ہوئی خواہشات کا عکس ہوگا یا پھر تصورات کی کرشمہ سازی۔

کئی دن گزر گئے۔ یہاں تک کہ سیّد اشرف کے ذہن سے خواب کے نقوش تک محو ہوگئے۔ وقت رواں دواں تھا اور والیٔ سمنان، امورِ سلطنت کی اصلاح میں گم تھے کہ ایک رات وہی بزرگ خواب میں دوبارہ نظر آئے۔

''کیا تم زندہ حقائق کو وہم و گمان سمجھتے ہو؟'' بزرگ کا لہجہ تلخ تو نہیں، پُرجلال ضرور تھا۔ ''کیا تمہاری روح اس عہد کو فراموش کر چکی ہے جو اُس نے ''روزِ الست'' میں اپنے رب کے سامنے کیا تھا؟ یہ کیسی بے خبری ہے؟ کب تک تاجِ شاہی سر پر سجائے ہوئے دنیا سے کیف و نشاط کی بھیک مانگتے رہو گے؟ اُٹھو کہ مہلتِ زیست بہت کم ہے۔ اللہ اس پر قادر ہے کہ جسے چاہے ولایت بخش دے اور جسے چاہے اپنی حضوری سے محروم کر دے۔''

دوسرا خواب ایک کھلی تنبیہہ تھی۔ سیّد اشرف گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ وہ صبح صادق کا وقت تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی طاری تھی۔ مگر والیٔ سمنان کے ذہن میں حشر بپا تھا اور دل پر قیامت سی نازل ہو رہی تھی۔ آپؒ نے جلتی ہوئی کافوری شمعوں پر نگاہ کی، قیمتی فانوسوں پر نظر ڈالی، بیش بہا ریشمی بستر کی طرف دیکھا، اس کی نرمی اور گداز کو محسوس کیا اور پھر لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ نیچے اُتر آئے۔ اب سیّد اشرف کے پیروں کے نیچے نادر و نایاب قالین تھا۔ آپؒ کے تصرف میں آنے والی ہر شے سے امارت جھلک رہی تھی۔

''کیا تمام بندگانِ خدا کو اتنی آسائشیں حاصل ہیں؟'' اگرچہ سیّد اشرف ایک نرم دل حکمراں تھے لیکن زندگی میں پہلی بار آپؒ نے اپنے دل میں ایک عجیب سا درد محسوس کیا تھا اور خود کلامی کے انداز میں اپنی ذات سے سوال کر رہے تھے۔

''نہیں! یہ کہاں ممکن ہے؟'' سیّد اشرف خود ہی سوال کا جواب دینے لگے۔ ''محلاتِ شاہی تو کجا، لوگوں کو سر چھپانے کے لئے خس و خاشاک کا سائبان بھی میسر نہیں۔''

''انسانی زندگی میں یہ عدم مساوات کیوں ہے؟'' سیّد اشرف نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں اس ناہمواری کا ذمے دار ہوں؟''

''ہاں اے والیٔ سمنان!...... سرِ محشر تُو ہی اللہ کے سامنے مخلوق کی بے سروسامانی کا جواب دہ ہے۔''
سیّد اشرف کی خواب گاہ، پُرشور آواز سے گونج رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے در و دیوار کو زبان مل گئی ہو اور سنگ و آہن ایک ہی آہنگ میں بول رہے ہوں۔ ابھی آپؒ کے دل و دماغ میں شدید کشمکش جاری تھی کہ شہر سمنان کی جامع مسجد سے مؤذن کی صدا اُبھرنے لگی۔
''اللہ سب سے بڑا ہے۔''
سیّد اشرف، اذان تو روز ہی سنتے تھے۔ مگر آج ایک ایک کلمہ سماعت سے گزر کر روح کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔ اور پھر آپؒ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ گرد و پیش کی فضا آنسوؤں میں غرق ہو گئی۔ کچھ دیر بعد طبیعت قدرے بحال ہوئی تو اپنی خواب گاہ سے نکلے۔ سیّد اشرف کے باہر آتے ہی محافظین میں ہلچل سی مچ گئی۔ لیکن آج خلافِ توقع آپؒ نے کسی کو خدمت کا موقع نہیں دیا۔ فوج کے پہرے کے بغیر محل سے نکل کر جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔
''حضور! آج طبیعت تو ناساز نہیں؟'' خدام نے باادب ہو کر پوچھا۔
''کیوں، میری طبیعت کو کیا ہوا ہے؟'' سیّد اشرفؒ کی آواز میں کرختگی تھی، بے نیازی تھی۔ خدام مزاجِ شاہ کو دیکھ کر سہم گئے۔ ان میں حضورِ سلطان میں بات کرنے کی جرأت نہیں تھی، مگر پھر بھی وہ اپنی وفاداریوں سے مجبور تھے۔ کانپتے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔
''آپ کا اس طرح مسجد میں جانا احتیاطی تدابیر کے خلاف ہے۔''
''احتیاطی تدابیر کیا ہوتی ہیں؟'' والیٔ سمنان نے راستہ چلتے ہوئے اپنے خدام سے پوچھا۔
''بادشاہ کی زندگی ایک عام انسان کی زندگی سے مشابہ نہیں ہوتی۔'' خدام نے خوف زدہ انداز میں کہا۔
''سلاطینِ وقت کے بے شمار دشمن ہوتے ہیں۔ اس لئے حکمران پر لازم ہے کہ محتاط دستے کے ساتھ محل سے باہر نکلے۔''
''محافظ کیا کرتے ہیں؟'' اشرفؒ نے اس طرح سوال کیا کہ خدام کو اُن کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا۔
''محافظ اپنے شاہ کے جاں نثار ہوتے ہیں۔'' خدام کی آوازیں لرز رہی تھیں۔ ''گردش کے وقت وہ اپنے شاہ کے سامنے ڈھال بن جاتے ہیں اور خطرہ ٹل جاتا ہے۔''
''تمہیں میری موت کی فکر ستا رہی ہے؟'' سیّد اشرفؒ کے لہجے سے تلخی بدستور نمایاں تھی۔
''خاکم بدہن وہ وقت کبھی نہ آئے۔'' خدام کی آوازیں آہستہ آہستہ پست ہوتی جا رہی تھیں۔
''اگر وہ وقت آ ہی گیا؟'' اچانک سیّد اشرفؒ مسکرانے لگے۔
اپنے شاہ کی بدلی ہوئی روش کو دیکھ کر خدام کے حوصلے بڑھے۔ پھر وہ بیک زبان کہنے لگے۔ ''اگر ایسا ہوا تو ہم اپنی جانیں نذر کر دیں گے۔''
''میرے والدِ محترم سلطان ابراہیم نے بھی کچھ دن پہلے موت کا ذائقہ چکھا تھا۔'' سیّد اشرف نے ماضی کے ایک جاں گداز واقعے کو دہراتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت بھی تم ہی لوگ ان کی خدمت پر مامور تھے۔ پھر تم نے انہیں کیوں بچا نہیں لیا؟ آخر وہ تمہارے ہوتے ہوئے خاک میں کس طرح مل گئے؟''
خدام کے پاس بظاہر اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا مگر پھر بھی جوشِ وفاداری میں مسلسل بول رہے تھے۔
''وہ طبعی موت تھی۔ ہم اس صورت میں سلطان کا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔'' خدام نے ایک شکستہ منطق پیش کر

کے والیٔ سمنان کو مطمئن کرنا چاہا۔
"موت طبعی ہو یا غیر طبعی، اسے ایک لمحے کے لئے نہیں ٹالا جا سکتا۔" ایک بار پھر سید اشرف کا لہجہ نہایت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "تم سپاہی ہو اور دفاع کرنا جانتے ہو۔ مگر جب مجھ پر فرشتۂ اجل حملہ آور ہو گا تو عظیم الشان لشکر بھی میرے کام نہ آ سکے گا۔ سپاہی صف بہ صف میرا محاصرہ کر کے کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر بھی قدرت کے ترکش سے چھوڑا ہوا تیر مجھ تک پہنچ جائے گا۔ اس تیرِ قضا کو ساری کائنات بھی مل کر نہیں روک سکتی۔ جب تمہارا سلطان اس قدر بے دست و پا ہو تو پھر ان حفاظتی دستوں کی کیا ضرورت ہے؟ جاؤ، تم محل کی نگرانی کرو اور مجھے خدا کی نگہبانی کے سائے میں چھوڑ دو کہ اوّل و آخر وہی میرا محافظ ہے۔" یہ کہہ کر آپؒ مسجد میں یہ دعا پڑھتے ہوئے داخل ہو گئے۔
"بسم اللّٰہ و السلام علیٰ رسول اللّٰہ ، اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتک۔"
(شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے اور سلامتی ہو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر، اے اللہ! مجھ پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دے)
اب خدام، سلطان کی ناراضی مول لے کر مسجد کے باہر قیام نہیں کر سکتے تھے۔ مجبوراً نہایت آزردگی کے عالم میں واپس لوٹ آئے اور محل پہنچتے ہی ان لوگوں نے تمام شاہی خاندان کے افراد کو والیٔ سمنان کے اس غیر متوقع روّیے سے آگاہ کر دیا۔
یہ بڑا عجیب واقعہ تھا۔ خاندان کے بعض بزرگوں کو محسوس ہوا جیسے سید اشرف ذہنی طور پر بیمار ہو گئے ہوں۔ کچھ لوگوں نے دبے الفاظ میں والیٔ سمنان کی اس حرکت کو دماغی خلل سے تعبیر کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں محل کا گوشہ گوشہ، سرگوشیوں سے بھر گیا۔ ذہنوں میں ہولناک اندیشے سر اُبھارنے لگے اور پھر خاندان کے ذی ہوش اور تجربہ کار افراد کے درمیان مشورے ہوتے رہے۔
ادھر سیّد اشرفؒ دوسرے نمازیوں کے ساتھ ایک قطار میں دست بستہ کھڑے تھے۔ اس سے پہلے بھی سمنان کے حکمران نے بے شمار نمازیں ادا کی تھیں، مگر آج اُنہیں جو حضوری حاصل ہوئی تھی، اس کی کیفیت نا قابلِ بیان تھی۔ امام قرأت کرتا رہا اور سیّد اشرفؒ بے اختیار روتے رہے مگر بڑی خاموشی کے ساتھ۔ والیٔ سمنان مسلسل سجدہ میں تھے۔ گریہ و زاری جاری تھی اور اشکِ ندامت زمین میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ اگر کوئی شخص سیّد اشرفؒ کے قریب ہوتا تو با آسانی سن لیتا کہ سمنان کا یہ حکمران اپنے رب سے کیا مانگ رہا تھا۔
"اے خدائے عزوجل! سمنان کے اس فقیر کے سر پر تاجِ شاہی سجانے والے! یہ تیرا احسانِ عظیم ہے کہ میرے گناہ اور سرکشی کے باوجود تُو نے مجھے فراموش نہیں کیا۔ بے شک! میں نے بہت دیر کر دی، مگر تیرے سوا کون ہے؟ سر سے پاؤں تک معصیت آلود ہونے کے بعد بھی جب میں تیری بارگاہِ کرم کی طرف آؤں گا تو مجھے مایوسی نہیں ہو گی۔ تو یقیناً میرے لئے اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دے گا۔ لاریب کہ تُو ہمارے وہم و گمان سے بھی زیادہ رحیم ہے۔" طویل دعا مانگنے کے بعد سیّد اشرف نے سجدے سے سر اٹھایا۔ آنکھیں شدتِ جذبات سے سرخ تھیں اور ریشِ مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی۔
"تُو میرے ناتواں قدموں کو استقامت بخش دے کہ میں تیری ہی طرف آ رہا ہوں۔ خارزاروں سے گزرنے کی توفیق عطا کر کہ تیری دستگیری کے بغیر میری آبلہ پائی مجھے راستے ہی میں ہلاک کر دے گی۔" اتنا کہہ کر سیّد اشرفؒ مسجد سے باہر آئے اور اپنے آبائی محل کی طرف روانہ ہو گئے۔

محل میں داخل ہوتے ہی آپؒ کو محسوس ہوا کہ ساری فضا ہی بدلی ہوئی ہے۔ تمام رشتے دار دیکھتے ہی دیکھتے آپؒ کے گرد سمٹ آئے اور سلطان کی مزاج پرسی کرنے لگے۔ کچھ دیر تک سیّد اشرفؒ سارے عزیزوں کے چہروں کو بغور دیکھتے رہے، پھر بڑے حیرت زدہ لہجے میں فرمانے لگے۔

''لوگو! تم اتنے مضطرب کیوں ہو؟ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے، میں مکمل طور پر صحت مند ہوں۔ پھر یہ فکر و تشویش کس لئے؟''

کسی دوسرے فرد میں تو یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ والیٔ سمنان کے اس سوال کا جواب دے سکے، بس ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے جو اپنے رشتے کی قربت کا احساس کر کے آگے بڑھے اور خدام کی زبانی سنا ہوا پورا واقعہ بیان کر دیا۔

''اس صورتِ حال سے آپ حضرات کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟'' سیّد اشرفؒ کے ہونٹوں پر تبسم نمایاں تھا۔

''سلطان! تم بہت تھک گئے ہو۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہئے۔'' بزرگ اپنے دل کی بات تو نہ کہہ سکے تاہم سلطان کو آرام کا مشورہ دینے لگے۔

''میرے غمگسار مطمئن رہیں۔'' سیّد اشرفؒ نہایت اطمینان سے بول رہے تھے۔ ''کل تک میں واقعتاً بیمار تھا۔ مگر آج ہی تائیدِ غیبی کے سبب مجھے اپنی روح کی توانائی کا احساس ہو رہا ہے۔ آپ لوگ پُرسکون رہیں اور معمولاتِ زندگی کو دل جمعی کے ساتھ انجام دیں۔'' سیّد اشرف کی یقین دہانی کے بعد خاندانِ شاہی نے سکوت اختیار کر لیا مگر ان میں سے بیشتر لوگ اب بھی والیٔ سمنان کی ذہنی کیفیت کو متوازن قرار نہیں دے رہے تھے۔

دربار اپنے وقت پر آراستہ ہوا۔ حفظِ مراتب کے ساتھ تمام وزراء اور امراء اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ سیّد اشرف کے قریب دائیں جانب آپؒ کے چھوٹے بھائی، شہزادہ محمد بیٹھے ہوئے تھے۔ دربار میں بظاہر کوئی انتشار نظر نہیں آ رہا تھا لیکن پھر بھی ان لوگوں کے ذہنوں میں مسلسل وسوسے پرورش پا رہے تھے، جنھوں نے ایک خاص حالت میں صبح کے وقت والیٔ سمنان کو جامع مسجد کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایسے تمام لوگوں کی نظریں سیّد اشرفؒ کے چہرے پر مستقل جمی ہوئی تھیں۔ یکایک والیٔ سمنان اپنے تخت سے اُٹھے اور چند قدم آگے بڑھ کر نیچے اُتر آئے۔ پھر دربار کے ایک ایک گوشے پر نظر ڈالی۔ آخر میں اپنے حقیقی بھائی، شہزادہ محمد کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''اہلِ سمنان! میں کوئی بے نفس فرشتہ نہیں تھا کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو سکتا۔ اس لئے تمہارے سامنے اپنی پارسائی کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں۔ پھر بھی میرے ذہن میں جب کوئی واقعہ محفوظ نہیں کہ میں نے قصداً تم میں سے کسی کی دل آزاری کی ہو یا اقتدار کی جبری روایتوں کا مظاہرہ کیا ہو یا اپنے نفس کی خاطر تمہاری عزت و آبرو کا خون بہایا ہو یا ہوسِ ملک گیری کی تسکین کے لئے غیروں کی سرزمین پر قبضہ کیا ہو۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکا، میں نے رعایا کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کی۔ پھر بھی جہاں جہاں مجھ سے کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں، اُنہیں اہلِ سمنان معاف کر دیں۔ میں اپنے خدا کے روبرو اس طرح جانا نہیں چاہتا کہ میرا دامن، حقوق العباد کے خون سے سرخ ہو۔''

یہ کہہ کر سیّد اشرف کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے اور اہلِ دربار کی طرف دیکھنے لگے۔ دربارِ شاہی پر غیر معمولی سناٹا طاری تھا۔ حاضرین کے جیتے جاگتے چہروں نے پتھر کے مجسموں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ سلطان ان سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ ہر آنکھ حیرت زدہ تھی اور ہر زبان ساکت۔

''کیا میں نے کبھی اپنے اختیارات کا سہارا لے کر تم میں سے کسی پر تشدد کیا ہے؟'' دربار میں والیٔ سمنان کی

بارعب آواز گونجی۔

''نہیں.....کبھی نہیں۔'' دربار کے مختلف گوشوں سے مدھم آوازیں اُبھریں مگر اس طرح کہ بولنے والوں کی گردنیں ادب سے جھکی ہوئی تھیں۔ ''آپ عدل و انصاف کا پیکر ہیں۔ امیر و غریب، سب پر آپ کی عدالت کے دروازے کھلے ہیں۔ آپ نے کسی مظلوم کو مایوس نہیں کیا اور کبھی کسی ظالم کا ساتھ نہیں دیا۔'' اہلِ دربار اپنے عظیم حکمران کے کردار کی بلندی کا اعتراف کر رہے تھے۔

''کیا تم حکومت و اقتدار سے ڈرتے ہو؟ کیا تمہیں شمشیرِ اختیار کی چمک کچھ کہنے نہیں دیتی؟'' یہ کہتے کہتے سیّد اشرفؒ کا لہجہ نہایت پُرسوز ہو گیا تھا۔ ''اس سے پہلے کہ زمین پر شر برپا ہو جائے اور میں تمہارا قرض ادا کرنے کے قابل نہ رہوں، تم بے جھجک اُٹھ کر میرے قریب چلے آؤ اور میرا گریبان پکڑ کر اپنا قرض وصول کر لو۔'' آج سیّد اشرفؒ کے جلالِ شاہی میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ آپؒ کے چہرے پر کوئی آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔

''کیا میں تم میں سے کسی کے حقوق کا غاصب ہوں؟'' سیّد اشرف نے ایک ہی انداز میں اہلِ دربار کو مخاطب کر کے کہا مگر جواب میں کوئی صدا بلند نہیں ہوئی۔

سیّد اشرف نے ایک خاص کیفیت سے دوچار ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ شاید حالتِ اطمینان کا اظہار تھا۔ کچھ دیر بعد آپؒ نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور با آواز بلند کہا۔

''اے مالکِ ارض و سما! یہ تیرا احسانِ عظیم ہے کہ تُو نے اپنے ایک عاجز بندے کو کسی آدم زاد کا مقروض نہیں بنایا۔ مجھے تو بس اپنے درِ گدائی کا پابند کر دے۔ یہاں تک کہ میں تیری بخشش اور عطا کے کوچے میں کاسہ لیسی کرتے کرتے اپنے انجام کو پہنچ جاؤں۔''

اہلِ دربار پر سکتہ طاری تھا۔ اپنے فرمانروا کی باتیں سن کر انہیں عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ مگر وہ والیٔ سمنان کے ارادوں سے بے خبر تھے۔ بالآخر سیّد اشرفؒ نے اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ محمد کی طرف دیکھا۔ وہ بھی دوسرے درباریوں کی طرح حیران آنکھوں کے ساتھ حاکمِ سمنان کی باتیں سن رہے تھے۔

''محمد! اُٹھو کہ میرے کاندھے شل ہو گئے اور اعصاب جواب دے چکے۔ اس سے قبل کہ میں اقتدار کی تاریکیوں سے آلودہ ہو کر بربادی و رسوائی کے غاروں میں گر پڑوں، تم اپنی برادرانہ محبت سے کام لے کر مجھے تباہ ہونے سے بچا لو۔''

شہزادہ محمد، والیٔ سمنان کا حکم سن کر فوراً اپنی نشست پر کھڑے ہو گئے مگر وہ اپنے برادرِ بزرگ کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔ ''سلطان! میں آپ کی کس طرح خدمت کر سکتا ہوں؟'' شہزادہ محمد سر جھکائے ہوئے اس قدر آہستہ لہجے میں بول رہے تھے کہ چند قریب بیٹھے ہوئے درباریوں کے علاوہ کوئی اور شخص ان کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ ''پھر بھی حکم دیجیے کہ امکانی حد تک آپ مجھے فرمانبرداری کے راستے میں ثابت قدم پائیں گے۔'' یہ کہہ کر شہزادہ محمد نے بڑے بھائی کے سامنے اپنی گردن کو مزید خم کر دیا تھا۔

''محمد!'' سیّد اشرف اپنے چھوٹے بھائی سے مخاطب ہوئے۔ ''اب میرے ناتواں کاندھوں سے حکومت کا بارِ گراں نہیں اُٹھتا۔ تم میری مدد کرو اور آج ہی سلطنت کی ساری ذمے داریاں قبول کر لو۔'' سیّد اشرف بلند لہجے میں بول رہے تھے اور آپؒ کی آواز دربار کے ایک ایک گوشے میں سنائی دے رہی تھی۔ یہ ایک ایسا انقلاب تھا، جسے کسی شخص کی عقل بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ سیّد اشرفؒ اپنی عمر کے اعتبار سے نوجوان تھے اور عین عالمِ شباب میں ایسی ناتوانی اور بے دلی کا اظہار کرنا، اہلِ دنیا کے نزدیک ایک بے یقینی کی بات تھی۔

"سلطان! یہ کیسے ممکن ہے؟" شہزادہ محمد نے نہایت ادب سے کہا۔ "سمنان کی رعایا آپ پر مکمل اعتماد کرتی ہے۔ پوری مملکت میں آپ کا انصاف مشہور ہے۔ لوگ امن و آسائش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پھر آپ یہ کس طرح کہتے ہیں کہ آپ سے بارِ امانت نہیں اُٹھ سکتا؟ یہ اہلِ سمنان کی خوش نصیبی ہے کہ اللہ نے انہیں آپ جیسا حکمران بخشا۔ آپ فخرِ اسلاف ہیں۔ آپ نے بزرگوں کے نام کو روشن کر دیا ہے۔ اگر میرے یہ الفاظ بارگاہِ سلطان میں گستاخی تصور نہ کیے جائیں تو آپ کا امورِ سلطنت سے یہ گریز سمنان کے باشندوں پر ایک ظلم ہے۔"

شہزادہ محمد کا لہجہ اس قدر جذباتی ہو گیا تھا کہ شدتِ احساس سے آواز لرز رہی تھی اور آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"ہاں! اب میں گریز ہی چاہتا ہوں۔" سیّد اشرف کے لہجے میں اچانک سختی آ گئی تھی۔

"ایک سمنان یا عراق پر ہی کیا منحصر ہے۔ اگر ساری دنیا کی حکومت بھی مل جائے تو اسے قبول نہیں کروں گا۔" سیّد اشرف کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ آپؒ کے فیصلے میں اب کوئی تبدیلی ناممکن ہے۔ چند لمحوں تک دربار پر گہرا سکوت طاری رہا، پھر آپؒ تخت سے اُٹھے اور بڑی محبت کے ساتھ شہزادہ محمد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"لوگو! یہ میرا چھوٹا بھائی، محمد ہے۔ سلطان ابراہیم کا دوسرا وارث۔ میں سمنان کی حکومت اس کے حوالے کرتا ہوں۔ یہ تمہارے روبرو بھی جواب دہ ہے اور اپنے اللہ کے سامنے بھی۔ ہو سکتا ہے کہ آسمان کے کچھ فیصلے کسی حکمران کی زندگی میں زمین پر نازل نہ ہوں مگر قدرت کے اس طرزِ عمل سے تم فریب میں نہ پڑ جانا۔ اللہ کا نظام ایک عجیب نظام ہے۔ وہ اپنی مصلحت کے سبب کبھی بھی ان لوگوں کو چھوڑ دیتا ہے جو اس کی زمین پر ظلم و تشدد کی فصلیں بوتے رہتے ہیں۔ اللہ کے سوا طریقہ کار سے مخلوق بدگمان ہو کر اپنے خالق کے بارے میں گمراہ کن تصورات کا شکار ہو جاتی ہے۔ حکمران سمجھ لیتا ہے کہ نگاہِ قدرت میں اس کا عمل پسندیدہ ہے اور اسی وجہ سے اس پر کوئی عذاب نازل نہیں ہو رہا ہے۔

مخلوق، حاکموں کا ظلم سہتے سہتے مایوسیوں کی حد سے گزر جاتی ہے اور پھر اپنے خالق کے سلسلے میں شک کرنے لگتی ہے کہ معاذ اللہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ایسے پراگندہ ذہن دلیل یہ لاتے ہیں کہ اگر اللہ موجود ہوتا تو پھر ظالموں کو اس طرح آزادی کے ساتھ نہیں چھوڑ دیتا۔ یہ بڑی گمراہی ہے۔ لوگو! ایسے شیطانی اندیشوں کے غبار سے اپنے آئینۂ دل کو محفوظ رکھنا۔ اگر تم نے میری باتیں دھیان سے نہیں سنیں تو پھر تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ تم سے پہلے بھی بڑے طویل القامت، طاقتور اور سرکش لوگ اس زمین پر بستے تھے، انہیں بھی یقین ہو گیا کہ ان کی جفاکاریوں کا حساب کرنے والا اس کائنات میں موجود نہیں۔ وہ منکر، وہ راندۂ درگاہ آسمانوں کی طرف منہ اُٹھا کر دیکھتے تھے۔ بہت دیر تک ان کا یہ عمل جاری رہتا تھا، پھر وہ اپنے چہرے موڑ کر زمین کی طرف لے آتے تھے۔ بے کسوں کے ہجوم پر وحشیانہ نظریں ڈالتے تھے اور استہزائی قہقہوں کے ساتھ چیختے تھے:

"اگر کوئی خدا ہے تو ہمارے دست و پا کو مفلوج کیوں نہیں کر دیتا؟ ہم سے ہمارے تاج و تخت کیوں نہیں چھین لیتا؟ اور پھر ہم پر آسمان سے عذاب کیوں نازل نہیں کر دیتا؟ ہم انتظار کرتے کرتے تھک چکے ہیں۔ کب آئے گا وہ عذاب؟ کب چلے گی وہ تباہ کار ہوا؟ کب آتش فشاں پھٹے گا اور زلزلے آئیں گے؟ کب عرش کی بلندیوں سے آتش و آب کا طوفان زمین پر اُترے گا؟"

پھر اُن کا یہ ہذیان غرقِ مئے ناب ہو جاتا۔ یہاں تک کہ ان کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتیں۔ دولت کے چشمے اُبل پڑتے۔ پھر ایک دن اچانک آتشی چنگھاڑ اُنہیں پکڑ لیتی اور وہ بجھ کر رہ جاتے۔"

سیّد اشرفؒ عالمِ جذب میں بول رہے تھے۔ گفتگو کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ اہلِ دربار، پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت نظر آرہے تھے۔

''خبردار! تم ایسے بے خبر نہ ہو جانا کہ توبہ کی مہلت بھی نہ مل سکے۔'' سیّد اشرف بیک وقت اپنے بھائی شہزادہ محمد اور اہلِ دربار سے مخاطب تھے۔ حاضرینِ دربار میں سے اکثر کے چہروں کے رنگ اُڑ گئے تھے اور انتہائی ضبط کے باوجود آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے تھے۔

پھر سیّد اشرفؒ کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور آپؒ نے اپنا تاج اُتار لیا۔ اب اہلِ دربار کو یقین ہو چکا تھا کہ سیّد اشرفؒ اپنے فیصلے میں اٹل ہیں اور سمنان کا اقتدار، شہزادہ محمد کی طرف منتقل ہونے والا ہے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

''محمد! میرے نزدیک آؤ۔'' سیّد اشرفؒ نے اپنے چھوٹے بھائی کو انتہائی شفیق اور مہربان لہجے میں مخاطب کیا۔ شہزادہ محمد، جن کا خود شدتِ گریہ سے برا حال تھا، لرزتے ہوئے آگے بڑھے اور والیٔ سمنان کے آگے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ سیّد اشرف نے وہ تاج جس کے لئے ہزاروں سال سے خون کے دریا بہتے رہے ہیں، اپنے چھوٹے بھائی کے سر پر رکھ دیا۔ اہلِ دربار کو اپنے سینوں میں سانسیں رُکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ان کی آنکھوں نے آج تک ایسا ناقابلِ یقین منظر نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو اب تک یہی سنتے آئے تھے کہ تاج و تخت اس وقت حاصل ہوتے ہیں، جب انسانی سروں کے مینار بن جاتے ہیں اور عالم تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ مگر آج سیّد اشرفؒ نے ماضی کی تمام رسمیں بدل ڈالی تھیں اور شاہی خاندان کی ایک ایک روایت توڑ دی تھی۔

''سلطان!'' تاج رکھنے کے بعد سیّد اشرف نے چھوٹے بھائی کو دوبارہ مخاطب کیا۔ ''اس تاج میں جو زر و جواہر استعمال ہوئے ہیں، ان کا رنگ بہت جلد اُڑ جانے والا ہے۔ جس تخت پر تم بیٹھو گے، وہ بہت شکستہ ہے اور جس اقتدار کی بنیاد پر تم بندگانِ خدا کی موت و زیست کے فیصلے کرو گے، وہ بہت عارضی اور نامعتبر ہے۔ جب تک اپنی حقیقت پر غور کرتے رہو گے، کوئی فساد برپا نہیں ہوگا اور جہاں تم دولت اور حکومت کے فریب میں مبتلا ہو گئے، وہیں سے تمہاری تباہی کی منزل کا آغاز ہوگا۔ وہ منزل، جس کی حدود دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ تک پہنچ کر ختم ہوتی ہیں اور وہ آگ جو ازل سے ایک ہی صدا دے رہی ہے ''ھل من مزید'' (ہے کوئی اور؟) اللہ تمہیں اس آگ کا ایندھن بننے سے محفوظ رکھے اور اہلِ سمنان پر ہمیشہ اس کی رحمت سایہ فگن رہے۔'' یہ کہہ کر سیّد اشرفؒ دربار سے نکل گئے۔

پھر آپؒ نے اپنے تمام قریبی عزیزوں سے ملاقات کی اور ایک نہایت سادہ لباس پہن کر محلاتِ شاہی سے باہر آ گئے۔ آباؤ اجداد کی قیام گاہ چھوڑتے وقت سیّد اشرفؒ آبدیدہ ہو گئے تھے اور مڑ مڑ کر بلند میناروں کی طرف دیکھتے تھے۔

''اے دنیا! تُو بہت فریب کار ہے۔ مگر میں تیرے طلسم کی ہلاکت خیزیوں سے باخبر ہوں۔ تُو نے قدم قدم پر میرے لئے بے شمار دامِ زریں بچھائے تھے لیکن میرے اللہ نے مجھے تیرا اسیر ہونے سے بچا لیا۔ آج میں آزاد ہوں اور تجھے آخری سلام کرتا ہوں۔ یاد رکھنا کہ میں تیری طرف لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ تُو یقیناً مایوس ہو گی کہ میں تیرے حلقۂ پرستش سے نکل گیا۔ اپنی بے ثباتی کا ماتم کر اور دیکھ کہ اللہ جسے چاہتا ہے، تیرے شر سے بچا کر منزلِ بقا کی طرف لے جاتا ہے۔''

پورا شہر سیّد اشرف کے عقب میں گریہ و زاری کرتا ہوا چل رہا تھا۔ آپؒ بار بار اپنی رعایا کو واپس جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ لیکن بے قرار ہجوم نافرمانی کے جرم کا مرتکب ہوتے ہوئے بھی آگے بڑھ رہا تھا۔ دراصل یہ

محکوم لوگ اپنے مہربان فرمانروا کو آخری بار جی بھر کے دیکھ لینا چاہتے تھے۔ آخرکار سمنان کی سرحدیں ختم ہو گئیں اور وارفتگانِ شوق نے اشکباری کی فضا میں سیّد اشرفؒ کو رخصت کیا۔

بڑا عجیب منظر تھا۔ کل تک جس کا بدن قیمتی کپڑوں سے آراستہ تھا، آج اُس کے جسم پر ایک معمولی سی قبا تھی۔ کچھ دیر پہلے جس کی خدمت کے لئے غلاموں کی ایک کثیر جماعت تھی، سواری کے لئے بہترین عربی النسل گھوڑے موجود تھے اور جس کی ایک جنبشِ چشم سے تمام کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے تھے، آج وہ اپنے وطن سے دُور پیادہ پا اس طرف جا رہا تھا کہ اس کی متاعِ حیات ایک مصلےٰ اور پانی کے برتن کے سوا کوئی تیسری چیز نہیں تھی۔ عشق نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ ایفائے عہد کی ساعتیں طلوع ہو چکی تھیں اور جاں فروشوں نے اپنی جانیں، اللہ کے ہاتھ فروخت کر دی تھیں۔ سیّد اشرفؒ، عراق سے نکلنے کے بعد ماوراء النہر پہنچے۔ خدا کی وسیع و عریض زمین دیکھی اور اس کی تخلیقات کا مشاہدہ کیا۔ اولادِ آدم سے ملے، علماء کی بارگاہ میں حاضر ہوئے مگر وہ آگ جو سینے میں برسوں سے بھڑک رہی تھی، اسے سرد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ سیّد اشرف کیسے بتاتے کہ وہ کون ہیں؟ اگر اُنہیں یہی ظاہری علم حاصل کرنا ہوتا تو پھر سرزمینِ عراق کی وسعتیں کیا کم تھیں؟ سیّد اشرفؒ جس سے بھی ملے، اس نے یہی سمجھا کہ ایک نوجوان ہے جو دنیاوی آسائشوں کے حصول میں ناکام ہو کر آخرت کی طرف مڑ گیا اور در در کی خاک چھان رہا ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس نے تاجِ شاہی کو ٹھکرا کر قبائے گداگری پہن لی تھی۔

والیٔ سمنان کوچہ کوچہ، قریہ قریہ گھومتے رہے لیکن انہیں کوئی درد آشنا نہیں ملا۔ علم قدم قدم پر بکھرا ہوا تھا مگر بے روح تھا۔ عرفوں کے انبار تھے مگر آگہی معدوم تھی۔ ہوش و خرد تھے مگر جذبوں کا نشان تک نہ تھا۔ دل تھے مگر گداز نہیں تھا۔ سر تھے مگر رسمِ سرفروشی نہیں تھی۔ سیّد اشرفؒ کئی خانقاہوں میں داخل ہوئے، روز و شب بسر کئے، اہلِ طلب کو دیکھا اور پھر مایوسی کے عالم میں تشنہ لب لوٹ آئے۔ چند بوندوں سے کیا ہوتا تھا۔ انہیں تو آسودگی کے لئے سمندر درکار تھا۔

پھر یہ جاں سوختۂ عشق، بخارا پہنچا۔ یہاں بھی علم و حکمت کے چشمے جاری تھے۔ سیّد اشرفؒ نے کئی آستانوں پر دستِ سوال دراز کیا۔ علم کے ذخیروں نے اُن کا دامنِ مراد بھر دینا چاہا، مگر آپؒ متاعِ جاں کے طلب گار تھے اور انہیں یہ دولت دینے والا کوئی نہیں تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ بخارا، دل کی دولت سے خالی ہو گیا تھا۔ وہاں بھی بڑے بڑے صاحبانِ دل موجود تھے۔ مگر سیّد اشرفؒ کی قسمت میں کچھ اور تحریر کر دیا گیا تھا۔ اس لئے آپؒ جہاں گئے، وہاں وہی لوگ سامنے آئے جو علمِ ظاہری کی دولت سے مالا مال تھے۔ اہلِ دل کو نظروں سے پوشیدہ کر دیا گیا تھا کہ یہی مشیتِ الٰہی تھی۔

سیّد اشرفؒ بخارا سے سمرقند تشریف لائے مگر یہاں بھی صورتِ حال کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ علم و حکمت کے حوالے سے بڑے بڑے اکابر موجود تھے۔ مگر کسی نے آپؒ کے سامنے دل کا ذکر نہیں کیا، عشقِ سرمدی کی بات نہیں چھیڑی۔ آخر سیّد اشرفؒ، سمرقند کی درسگاہوں سے بھی خالی ہاتھ اُٹھ گئے۔ آپؒ کی طلب کے کشکول میں عقل و ہوش کو مطمئن کرنے کے لئے منطق و کلام کا بڑا خزانہ موجود تھا لیکن دل کی بستی اب بھی اُجاڑ تھی۔ جسم پر موسم کی سختیوں نے عجیب عجیب گل کاریاں کیں۔ وقت کی دھوپ نے چہرے کا رنگ تک بدل ڈالا۔ پاؤں آبلوں سے بھر گئے مگر جذبات کی وارفتگی نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ پھر یہ طالبِ دیدار، اُفقِ ہند پر نمودار ہوا۔ زمین نے مضطرب قدموں میں زنجیریں سی ڈال دیں۔ خاک کے ذرّوں نے عجیب سے لہجے میں مخاطب کیا۔

"ہوش میں آ! کہ یہی کوچۂ دوست ہے۔ ادب سے چل کہ یہی دیارِ حبیب ہے۔"

سیّد اشرفؒ بے قرار ہو گئے۔ بت خانۂ ہند سے کیسی صدائیں بلند ہو رہی تھیں؟ پہلی بار آپؒ کی سماعت نے قربت و آشنائی کا آہنگ محسوس کیا، پھر ہواؤں نے سرگوشیاں کیں۔

''اے آبلہ پائے شوق! ٹھہر جا کہ یہی تیری منزل ہے۔''

سیّد اشرف نے پیغامِ بادِ نسیم کو غور سے سنا، پھر آپؒ کو محسوس ہوا جیسے مشامِ جاں معطر ہو گیا ہو۔ ہواؤں سے خوشبوئے دوست آ رہی تھی۔

شوقِ دید، والیٔ سمنان کو ملتان کھینچ لایا۔ یہی وہ روشن خاک تھی، جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے عزیز ترین دوست اور مشہور بزرگ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ محوِ خواب تھے۔ سیّد اشرفؒ نے مقامی لوگوں سے طویل ملاقاتیں کیں، پھر آپؒ پر یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ ملتان کے علاقے اوچ میں مشہور بزرگ، مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ رونق افروز ہیں۔

پاکستان کے موجودہ نقشے میں اوچ ضلع بہاولپور کی ایک تحصیل احمد پور شرقیہ کی سب تحصیل ہے۔ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا نام سن کر سیّد اشرف بے قرار ہو گئے۔ یہاں تک کہ آپؒ نے سارے کام چھوڑ کر مخدوم کے آستانۂ عالیہ پر حاضری دی اور بہت دن تک اس مردِ جلیل کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی صحبت میں رہ کر سیّد اشرفؒ نے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا تھا۔ اس کے برعکس کچھ لوگوں کی نگاہ میں یہ محض چند روزہ روحانی ملاقات تھی۔ اس جماعت کی پیش کردہ دلیل یہ ہے کہ سیّد اشرفؒ اپنی ریاست سمنان کی حکومت چھوڑنے کے بعد مختلف طبقاتِ ارض سے گزر رہے تھے۔ اور جس علاقے سے آپؒ کو علم و حکمت کی جو بات بھی محسوس ہوتی تھی، اُسے سرمایۂ دل و جاں سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ اسی طویل سفر کے دوران آپؒ ملتان ہوتے ہوئے اوچ پہنچے اور پھر عظیم بزرگ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں رہ کر کچھ وقت گزارا تھا اور اپنے دل کے نہاں خانوں کو معرفت کی ضیا پاشیوں سے روشن کرتے رہے تھے۔ پھر سیّد اشرفؒ نے حضرت مخدومؒ سے اجازت طلب کی تھی اور اپنی اس منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے جو آپؒ کو مسلسل خوابوں میں پکار رہی تھی۔ اگر ہم اسے ایک عارضی ملاقات تصور کریں تو پھر یہی ایک عام سا اکتساب روحانی تھا جو خانقاہی نظام کا حصہ ہے۔ اکثر صوفیاء دوسرے بزرگوں کی مجلس میں بیٹھ کر اس طرز کی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ سیّد اشرف کے بارے میں بھی کچھ لوگوں کی یہی رائے ہے مگر جب ہم تصوف کی مستند کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے خلفاء میں سیّد اشرفؒ کا نامِ گرامی بھی شامل ہے۔ خلافت کی تصدیق ہو جانے کے بعد حالات کا یہ حیرت انگیز رخ سامنے آتا ہے کہ سیّد اشرفؒ، حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خدمت میں ایک مختصر سے عرصے کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ عام طور پر خلافت کا اصول یہ ہے کہ جب کوئی مرید اپنی ساری زندگی مرشد کے قدموں میں بسر کر دیتا ہے، تب کہیں جا کر اُسے خلافت کی نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوتی ہے۔ یا پھر مرشد دنیا سے رخصت ہوتے وقت یہ بارِ امانت اپنے چند مریدوں کو منتقل کر دیتا ہے۔ ویسے تصوف کی دنیا میں خال خال ہی یہ واقعہ رونما ہوتا ہے کہ کوئی نووارد، کوچۂ شوق میں داخل ہوا اور پھر کچھ دن بعد ہی وہ مرشد کی توجہ کا مرکز بن جائے۔ سیّد اشرفؒ بھی روحانیت کے انہی جاں بازوں میں شمار ہوتے تھے جو اوچ کی خانقاہ میں پہنچتے ہی حضرت مخدومؒ کے محبوب بن گئے تھے۔ پھر یہی محبوبیت آپؒ کو درجۂ خلافت تک لے گئی تھی۔

الغرض یہ گراں بہا اعزاز حاصل کرنے کے بعد سیّد اشرفؒ بظاہر بہت خوش تھے لیکن دل و دماغ پر ایک نامعلوم

سی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ آپؒ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی خانقاہ میں آنے والے ہزاروں انسانوں میں گم رہتے تھے۔ اِن کے مسائل دریافت کرتے تھے۔ ان کے شریکِ غم ہوتے تھے، مگر پھر بھی آپؒ کو کسی شے کی کمی محسوس ہوتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن سیّد اشرفؒ نے کسی بزرگ کے دُھندلے نقوش خواب میں دیکھے۔ بزرگ کہہ رہے تھے۔

''سیّد! ابھی تمہاری منزل بہت دُور ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اوچ کی دلکشی دیکھ کر بنگال کو فراموش کر چکے ہو۔ وہاں تمہارا بہت شدت سے انتظار ہو رہا ہے۔'' سیّد اشرفؒ نے عالمِ ہوش میں اس غیبی تنبیہہ کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔ دراصل آپؒ بنگال کے خواب کو بھولے نہیں تھے۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی صحبت کے باعث وہ خواب کچھ دن کے لئے پیش منظر میں چلا گیا تھا۔ لیکن جیسے ہی سیّد اشرفؒ کے سر پر دستارِ خلافت باندھی گئی، وہ بزرگ خواب میں نمودار ہوئے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اب اوچ میں سیّد اشرف کا کام ختم ہو چکا ہے اور آپؒ کو اپنی منزلِ خاص کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ سیّد اشرفؒ اپنے سفر کا مفہوم بھی جانتے تھے اور اپنی حقیقی منزل سے بھی آشنا تھے۔ مگر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی محبت اور حلقۂ درس نے آپؒ کو اسیر کر لیا تھا۔ اس لئے رخصت کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ انجام کار آپؒ اُداس رہنے لگے۔

کچھ دن تک حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نے خاموشی کے ساتھ آپؒ کی اداسی کو دیکھا اور جب لحظہ بہ لحظہ اس افسردگی میں اضافہ ہونے لگا تو ایک روز مخدومؒ نے آپؒ کو خلوت میں طلب کر کے پوچھا۔

''سیّد! تم بہت مضمحل نظر آتے ہو۔'' حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ نہایت مشفقانہ لہجے میں فرما رہے تھے۔ ''کیا تمہیں وہ خونی رشتے یاد آ رہے ہیں جو پیچھے رہ گئے؟''

''شیخ! ان خوابوں کو تو میں کبھی کا فراموش کر چکا۔'' سیّد اشرف نے مرشد کے حضور نیچی نظروں اور آہستہ لہجے کے ساتھ کہا۔ ''ایک رشتے کی خاطر سارے رشتے توڑ چکا۔ ہاں، کبھی ہوا سمنان کی گلیوں کو چھو کر آتی ہے تو چھوٹے بھائی، شہزادہ محمد کے پیرہن کی خوشبو محسوس ہونے لگتی ہے۔ مگر وہ بھی بشریت کا ایک تقاضا ہے۔ میرے مشامِ جاں میں جو خوشبو محفوظ ہے، اُس نے مجھے دنیا کے ہر سمن زار سے بے نیاز کر دیا ہے۔''

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اپنی قوتِ کشف سے سیّد اشرفؒ کی دلی کیفیات کو بخوبی جانتے تھے، تاہم آپؒ اپنے مرید کو آزما رہے تھے۔ جب سیّد اشرفؒ نے اپنی بے قراریوں کا سبب بیان کیا تو حضرت مخدومؒ فرمانے لگے۔

''سیّد! میں جانتا ہوں کہ تم کس اضطراب میں مبتلا ہو؟ مگر یہ اضطراب، معرفت کی راہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ تمہیں بہرحال اپنی حقیقی منزل کی طرف جانا ہے۔ میرے پاس تمہارا جس قدر حصہ تھا، تمہیں مل چکا۔ اب تمہیں شیخ علاؤالدین علاء الحق چشتیؒ کی بارگاہِ جلال میں حاضر ہونا ہی چاہئے۔ میں جتنی رہنمائی کر سکتا تھا، کر چکا۔ لیکن تمہاری مکمل رہبری کے فرائض، شیخ علاؤالدین ہی انجام دیں گے۔ لوحِ محفوظ پر یہی رقم ہو چکا ہے۔ زمین پر بندے تو محض آلۂ کار ہیں۔ فیصلے تو آسمان ہی کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی آسمانی فیصلہ ہے کہ تمہیں بہرحال ارضِ بنگال جانا ہوگا۔''

سیّد اشرفؒ کی خلش دُور ہو چکی تھی۔ آپؒ آخری بار حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کی قدم بوسی سے شرف یاب ہوئے اور پھر دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی سیّد اشرفؒ کے سامنے ایک اور دشوار گزار منزل موجود تھی۔

دہلی اُس زمانے میں اولیائے کرام کا مرکز تھا۔ سیّد اشرفؒ نے کئی نامور بزرگانِ دین سے ملاقاتیں کیں اور

خدا کے ان تمام دوستوں سے حسبِ مقدور فیض حاصل کیا۔ سیّد اشرفؒ ابھی دہلی میں مزید قیام فرمانا چاہتے تھے کہ اچانک ایک روز آپؒ کا ارادہ بدل گیا اور آپؒ نے اپنا سامانِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ مقامی دوستوں اور عقیدت مندوں نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر سیّد اشرفؒ یہی فرماتے رہے۔ ''مجھے جانا ہوگا۔ کوئی آوازِ غیب ہے جو بار بار کہہ رہی ہے، سیّد! یہاں سے کوچ کر جاؤ۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے یہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے؟'' اور واقعتاً سیّد اشرفؒ مجبور تھے۔ قدرت کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ نتیجتاً آپؒ دہلی کی حدود سے نکل کر صوبہ بہار کے قصبے ''منیر'' میں آئے۔ اب یہ اتفاق تھا یا قدرت کا کوئی راز کہ جس روز مشہور بزرگ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ کا انتقال ہو گیا، جنازہ ایک میدان میں رکھا ہوا تھا کہ اچانک سیّد اشرفؒ وہاں پہنچے۔ آپؒ کو دیکھتے ہی انسانی ہجوم پکار اُٹھا۔ ''بزرگ! آپ ہی ہمارے شیخ کی نمازِ جنازہ پڑھائیں گے۔''

''تمہارے شیخ کا اسمِ گرامی؟'' سیّد اشرف نے جنازے کے گرد کھڑے ہوئے لوگوں سے دریافت کیا۔

''حضرت شیخ شرف الدین احمد منیریؒ۔'' ہجوم میں سے ایک شخص نے کہا۔ جو بظاہر مرحوم بزرگ کا مرید معلوم ہو رہا تھا۔ ''ہمارے شیخ کا انتقال رات کے پچھلے پہر ہوا تھا۔ ہم نے وصال کے وقت شیخ کی وصیت معلوم کرنی چاہی تھی کہ آپ کی نمازِ جنازہ کون پڑھائے گا؟ جواب میں حضرت شیخ نے فرمایا کہ تم لوگ میرے جسم کو کفن پہنا کر سرِ میدان رکھ دینا۔ اس کے بعد اللہ میرا دستگیر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ شخص خاموش ہو گیا اور سیّد اشرفؒ کے ذہن میں وہ واقعہ اُبھرنے لگا، جب آپؒ دہلی میں کسی نامعلوم سبب کے بغیر ذہنی طور مضطرب نظر آ رہے تھے اور بار بار کوئی صدائے غیب آپؒ کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی کہ دہلی کی حدود چھوڑ کر نکل جاؤ۔ اب سیّد اشرف کو یقین آ گیا تھا کہ یہ سب کچھ ایک مردِ خدا کی نمازِ جنازہ کا درپردہ اہتمام کیا جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر سیّد اشرفؒ آگے بڑھے اور حاضرین سے نماز ادا کرنے کے لئے کہا۔ پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت شیخ یحییٰ منیریؒ کی میت کو قبر تک پہنچایا۔ اور جب سیّد اشرفؒ اس آفتابِ معرفت کو سپردِ خاک کر رہے تھے تو آپؒ کی آنکھیں فرطِ جذبات سے اشکبار تھیں۔

حضرت شیخ کی تدفین کے بعد سیّد اشرفؒ، مزارِ اقدس پر کچھ عرصے تک چلّہ کش رہے۔ پھر ایک دن حضرت شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ، سیّد اشرفؒ کے خواب میں تشریف لائے اور فرمانے لگے۔

''شہزادے! میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے ایک غریب درویش کو عزت و احترام کے ساتھ اس کی آخری منزل تک پہنچایا۔ اللہ عنقریب تم پر اپنے بے پناہ رحم و کرم کی بارش کرنے والا ہے۔ سمنان کی یہ شہزادگی، ہندوستان کی شہنشاہیت میں تبدیل ہونے والی ہے۔ عراق میں جو غیبی اشارہ ہوا تھا، اس پر سختی سے عمل کرنے کی کوشش کرو اور اس شخص تک جلد از جلد پہنچ جاؤ جو برسوں سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

جب سیّد اشرفؒ بیدار ہوئے تو آپؒ کو اس خواب کے ساتھ وہ خواب بھی یاد آ گیا جو آپؒ نے سمنان کی حکمرانی کے دوران کئی بار دیکھا تھا۔ سیّد اشرفؒ نے حضرت یحییٰ منیریؒ کے لئے طویل دعائے خیر کی اور پھر مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے بنگال تشریف لے گئے۔

اس وقت بنگال میں سلسلہ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ علاؤالدینؒ قیام فرما تھے۔ آپ کا تعلق ایک امیر خاندان سے تھا۔ حضرت شیخ کے دوسرے عزیز و اقارب، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے۔ مگر آپؒ نے خاندانی روایات کے خلاف درویشی اختیار کر لی تھی۔ آپؒ کے کشف و کرامات کا یہ حال تھا کہ ایک دنیا خانقاہ کے گرد سمٹ آئی تھی اور بے شمار بندگانِ خدا، آپؒ کے فیضِ روحانی سے سیراب ہو رہے تھے۔ سیّد اشرفؒ جیسے ہی بنگال کی

حدود میں داخل ہوئے، اس وقت ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ کی خانقاہ میں صبح و شام ہزاروں انسان کھانا کھاتے تھے۔ اس دن غریبوں کے طعام کا انتظام کرنے کے بعد حضرت شیخ علاؤالدینؒ اپنے حجرۂ خاص میں کچھ دیر کے لئے آرام فرما رہے تھے۔ آپؒ کے گرد مریدوں کے علاوہ کچھ امرائے شہر بھی موجود تھے اور معرفت کے رموز و اکات پر گفتگو کر رہے تھے۔ اچانک حاضرین نے دیکھا کہ حضرت شیخ بولتے بولتے خاموش ہو گئے اور آپؒ کے چہرۂ مبارک پر ایک عجیب سا رنگ اُبھر آیا۔ ایسا رنگ، جس سے بے اندازہ دلی مسرتوں کا اظہار ہو رہا تھا۔ حاضرین بھی حضرت شیخ کی یہ کیفیت دیکھ کر حیران ہو گئے اور خانقاہ میں موجود ہر شخص اپنی جگہ سوچنے لگا کہ یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہے، جس سے حضرت شیخ متاثر نظر آ رہے ہیں۔ شدتِ احساس کے باوجود کسی خادم یا عقیدت مند میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ سرِ خانقاہ اُٹھ کر کوئی شیخ کے اس تغیرِ حال کا سبب دریافت کر سکتا۔ خانقاہ کے در و دیوار پر سکوت چھایا ہوا تھا۔

یکایک حضرت علاؤالدین چشتیؒ نے متبسم ہو کر فرمایا۔ ''خوشبوئے دوست آ رہی ہے۔'' یہ کہتے کہتے حضرت شیخ کے چہرے پر محبتوں کا سمندر موجزن نظر آنے لگا۔

اگرچہ مقام ادب تھا لیکن پھر بھی ایک مرید ضبطِ سخن نہ کر سکا اور برسرِ مجلس نہایت احترام سے عرض کرنے لگا۔

''شیخ! وہ کون دوست ہے، جس کی خوشبو اتنی دور سے آپ محسوس کر رہے ہیں؟''

''وہ میرا شہزادہ ہے جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔ آج وہی شہزادہ اس فقیر کو شرفِ میزبانی بخشنے والا ہے۔ تم لوگ خاموش کیوں بیٹھے ہو؟ اُٹھو اور میرے ساتھ چل کر شہزادے کا استقبال کرو۔ آخر وہ اپنی ریاست کا حکمران رہ چکا ہے۔ ہمیں آدابِ شاہی کا کچھ لحاظ ہونا چاہئے۔''

یہ کہہ کر حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ اپنی نشست سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ کے ایستادہ ہوتے ہی حجرے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ بھی کھڑے ہو گئے اور پھر جیسے ہی حضرت شیخ باہر تشریف لائے، خانقاہ میں موجود سینکڑوں عقیدت مند اور خدام بھی پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے۔

اب حضرت علاؤالدین چشتیؒ کے قدم شہری حدود سے گزر کر مضافات کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ ہجوم میں سے کوئی شخص بھی نہیں جانتا تھا کہ حضرت شیخ کا شہزادہ کون ہے اور یہ خوشبوئے دوست کہاں سے آ رہی ہے۔ غرض درویشوں کے اس قافلے کا یہ سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ انسانی آبادی سے دُور نکل جانے کے بعد لوگوں کو ایک شخص نظر آیا، جس کا چہرہ روشن و تابناک تھا۔ سمنان کی حکومت ترک کر کے بنگال کی طرف آنے والے ایک یہی سیّد اشرفؒ تھے۔ جیسے ہی آپؒ کی نظر حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ کے چہرے پر پڑی، لرز کر رہ گئے۔ کچھ کہنا چاہا تو قوتِ گویائی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ کا جلالِ معرفت تھا جس نے کچھ دیر کے لئے سیّد اشرفؒ کے حواس چھین لئے تھے۔ جب حضرت شیخ علاؤالدینؒ نے آپ کی یہ کیفیت دیکھی تو بے تابانہ آگے بڑھے اور سیّد اشرفؒ کو سینے سے لگایا۔ ایک برق تھی جو آنے والے کے رگ و پے میں اُتر گئی۔

''یہی میرا شہزادہ ہے جو حکومت و اقتدار چھوڑ کر مجھ غریب کی خانقاہ میں پناہ لینے آیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی جانیں مالکِ حقیقی کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں۔ اللہ میرے اس سوختہ جاں کو متاعِ سکون بخشے۔'' یہ کہہ کر حضرت علاؤالدین چشتیؒ نے اپنا دستِ کرم سیّد اشرفؒ کے سر پر دراز کر دیا۔ آگ جو بھڑکی تھی، وہ آہستہ آہستہ سرد ہوتی گئی اور پھر سیّد اشرفؒ کے حواس بحال ہونے لگے۔

جب یہ کیفیتِ جذب ختم ہو گئی تو حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ، سیّد اشرفؒ کو اپنے ہمراہ لے کر خانقاہ کی طرف

واپس ہوئے۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سارا شہر حضرت شیخ کے گرد سمٹ آیا ہے اور جاننے والے جان گئے کہ والیٔ سمنان، شیخ کی جستجو میں طویل ترین راستہ طے کر کے بنگال تک آ پہنچا ہے۔

سیّد اشرفؒ بارہ سال تک حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ کی خدمت میں رہے۔ پیر و مرشد سے اس قدر محبت تھی کہ آپؒ کا جذبۂ شوق مثالی حیثیت اختیار کر گیا۔ طویل عبادت و ریاض کے بعد آخر وہ وقت بھی آیا جب حضرت علاؤالدین چشتیؒ بے ساختہ پکار اُٹھے۔

''سیّد اشرفؒ میرا جہانگیر ہے۔'' حضرت شیخ نے ایک بار زبانِ مبارک سے فرمایا تو یہ لفظ قرطاس وقت پر قیامت تک کے لئے رقم ہو گیا۔ والیٔ سمنان جو کل تک سیّد اشرفؒ کے نام سے مشہور تھے، پیر و مرشد کے عطا کردہ لقب کے بعد سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے نام سے مقبولِ خلائق ہوئے اور حضرت شیخ سے خاندانی چشت کا خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

تعلیمِ روحانی کی تکمیل کے بعد حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ نے ایک دن آپؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''جہانگیر! اب تم ہندوستان کے تاریک گوشوں کو منور کرو۔ یہی تمہارا کارِ منصبی ہے اور یہی تمہاری جہانگیری۔''

''میری تو دلی خواہش تھی کہ تمام زیست مرشد کے قدموں میں بسر کروں۔'' فراق سے حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ آبدیدہ ہو گئے تھے۔

''جہانگیر! یہی منشائے قدرت ہے کہ ہم اللہ کے لئے جمع ہوں اور اللہ ہی کے لئے بچھڑ جائیں۔'' حضرت شیخ نے اپنے مرید باصفا کے جذبات سے متاثر ہوتے ہوئے فرمایا۔ ''جو لوگ اس کی راہ میں فنا ہو چکے ہیں، ان کے لئے نشاط و غم، دُوری و قربت، فراق و وصال سب یکساں ہیں۔ تم اگر ہزاروں میل کے فاصلے پر بھی قیام پذیر ہو گے تو میرے دل و نگاہ کے حلقے سے باہر نہیں جا سکو گے۔'' خود حضرت شیخ کا لہجہ بھی رقت آمیز ہو گیا تھا۔ مگر آپؒ نہایت صبر و استقامت سے حضرت سلطان الہندؒ کے نئے وارث کو اس کی زندگی کا مقصد سمجھاتے ہے۔ آخر بچھڑنے کا وقت آ گیا۔ حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ نے اپنے باکمال مرید سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو بنگال سے اس طرح رخصت کیا کہ اس خطۂ ارض کے بیشتر باشندے آپؒ کو الوداع کہنے کے لئے شہر کی آخری سرحد پر جمع ہو گئے۔

حضرت شیخ علاؤالدین چشتیؒ، سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو رخصت کرتے ہوئے فرما رہے تھے۔ ''سمنان کی حکومت کو ٹھکرانے والے! تجھے یہ لازوال شہنشاہی مبارک ہو۔ اللہ تجھے ہمیشہ اپنی امان میں رکھے۔'' ان کلمات کے ساتھ ہی یہ بارہ سالہ قربت، طویل فاصلوں میں تبدیل ہو گئی۔

پیر و مرشد کا حکم پاتے ہی حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔ حضرت شیخ نے رخصت کرتے وقت اشارتاً کہا تھا کہ آپ ضلع جون پور کو تبلیغ اسلامی کا مرکز بنائیں۔ نتیجتاً سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ اسی شہر کے نواحی علاقے میں تشریف لے گئے اور قصبہ محمد آباد کہنہ کو اپنے قیام کے باعث شرف خاص بخشا۔ یہ عجیب بات تھی کہ جیسے ہی سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ اس علاقے میں نمودار ہوئے، لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ اس وقت نہ کوئی آلۂ تشہیر تھا اور نہ کوئی منادی۔ مگر آپؒ کی آمد کی خبر اس طرح پھیل گئی کہ روزِ اوّل ہی سے لوگ قطار در قطار آپؒ کی طرف آنے لگے۔ پھر تو ضرورت مند انسانوں کا اژدھام اس قدر بڑھ گیا کہ زمین تنگ ہوتی نظر آنے لگی۔ سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے کئی سال تک بیماروں کی مسیحائی کی، وقت کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو اپنی آغوشِ محبت میں جگہ دی اور بے شمار گم کردہ انسانوں کو صراطِ مستقیم پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔

پھر آپؒ ظفر آباد تشریف لے گئے۔ بنیادی طور پر ان بستیوں میں اہلِ انکار کی کثرت تھی۔ مگر جب سیّد اشرف

جہانگیر سمنانیؒ کا علمِ معرفت ظاہر ہوا تو صدیوں سے رائج سرکشی کی رسمیں فنا ہو گئیں اور لوگ خدائے واحد کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔

پھر کچھ عرصے بعد آپؒ دوبارہ جون پور تشریف لائے۔ اس دوران حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے کمالاتِ روحانی کی شہرت دُور دُور تک ہو چکی تھی۔ آپؒ کی عارفانہ عظمت سے متاثر ہو کر علاقہ شرقی کا حکمران ابراہیم شاہ بھی کئی بار خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا۔ ہندوستان کی مستند تاریخی کتابوں میں ابراہیم شاہ کی پہلی حاضری کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:

ایک دن سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ اپنے اوراد و وظائف میں مشغول تھے کہ آپؒ کے چند خدام نے ابراہیم شاہ شرقی کی آمد کی خبر دی۔ سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اس اطلاع کو ذرا بھی لائق التفات نہیں سمجھا اور اپنی عبادت میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ ابراہیم شاہ شرقی اپنے معززینِ سلطنت اور بے شمار لشکریوں کے ہمراہ حضرت سیّد اشرفؒ کی خانقاہ کی طرف جا رہا تھا۔ جب یہ شاہی ہجوم مسجد کے قریب پہنچا تو قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے بادشاہ کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ یہ انسانی ہجوم، یہ شاہی رسموں کے مظاہرے اور یہ شور شرابا ایک مردِ بزرگ کے شایانِ شان نہیں۔ شاہ کو لازم ہے کہ وہ ایک ولی اللہ کا مقام پہچانے اور عجز و انکسار کے ساتھ حاضرِ خدمت ہو۔ تاکہ دلی مقاصد حاصل کر سکے۔ اس شاہی طمطراق کے ساتھ سیّد کی بارگاہ میں جانا مناسب نہیں۔ اس نمود و نمائش سے وہ آزردہ خاطر ہوں گے اور یہ بات کسی طرح بھی بادشاہ کے لئے سودمند ثابت نہیں ہو گی۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے قاضی شہاب الدین کے مشورے کو بغور سنا اور پھر اپنا طریقہ کار بدل ڈالا۔ ابراہیم شاہ مرصع ہاتھی سے نیچے اُتر آیا۔ تمام فوجیوں اور سرداروں کو حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی خانقاہ سے دُور روک دیا اور ہجوم میں، بیس اہلِ فراست کو اپنے ہمراہ لے کر سیّد کے روبرو حاضر ہوا۔

پھر حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی خانقاہ میں موجود صدہا افراد نے یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھا کہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی اپنے تمام تر جبروت کے باوجود ایک درویش کے سامنے دست بستہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

''سیّد! میں بھی آپ کا خادم ہوں۔ مجھے بھی ایک نگاہِ کرم سے سرفراز کیجئے۔''

سلطان کے عاجزانہ لہجے سے حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ بہت زیادہ متاثر ہوئے، پھر فرمانے لگے۔

''اگر اہلِ دل میں سے ہے تو آتش کدہ بھی چمن زار بن جائے گا۔'' سیّد کا یہ اشارہ سلطان ابراہیم کے اس اندیشے کی طرف تھا جو مسلسل اسے ذہنی خلش میں مبتلا کئے ہوئے تھا۔ سلطان نے قلعہ ''جنادہ'' کی فتح کے لئے ایک لشکرِ جرار روانہ کیا تھا مگر اس کے بعد بھی اسے اپنی فتح مشکوک نظر آ رہی تھی۔ آخر حضرت سیّد اشرف سمنانیؒ کا شہرہ سن کر نیاز مندوں کی طرح حاضر ہوا اور پھر دعا کی درخواست کی۔ جواب میں سیّد نے اسے پُرسکون رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے فتح کی نوید سنا دی۔

سلطان ابراہیم شاہ، سیّد کے فرمودات سن کر چلا گیا۔ برق رفتار قاصد مسلسل اسے جنگ کی خبریں دے رہے تھے۔ عرصہ کارزار کا رنگ لحظہ بہ لحظہ بدل رہا تھا۔ ماہرینِ حرب و ضرب اُداس تھے۔ آثار و قرائن بتا رہے تھے کہ سلطان کو اس محاذ پر شکست ہو جائے گی۔ ابراہیم شاہ شرقی بھی تذبذب کا شکار تھا اور کبھی کبھی مایوسی کے اندھیروں میں غرق ہونے لگتا۔ مگر پھر فوراً ہی حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے الفاظ اس کی سماعتوں میں گونجنے لگتے۔

''اگر اہلِ یقین میں سے ہے تو آتش کدہ بھی چمن زار بن جائے گا۔''

سیّدؒ کے انہی الفاظ نے سلطان کو اذیت ناک لمحوں میں متوازن رکھا اور پھر تاریخ کے اُفق پر وہ ساعت جاں

نواز طلوع ہو گئی، جب کسی نے چیخ کر کہا۔

''سلطان کا اقبال بلند ہو کہ ''جنادہ'' کے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی ہے۔ دشمن، ابراہیم شاہ کی ہیبت و جلال دیکھ کر میدان سے فرار ہو گیا۔''

آگ بحکمِ خدا گلزار ہو گئی تھی۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی اپنی عقیدت و شکر گزاری کا مظاہرہ کرنے کے لئے دوبارہ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ سلطان کی آمد کی اطلاع پا کر ہزاروں افراد خانقاہ کے گرد و نواح میں جمع ہو گئے تھے۔ ابراہیم شاہ کو دیکھتے ہی مجمع چیخنے لگا۔

''سلطان کو غنیم کے قلعے کی بربادی مبارک ہو۔''

جب ابراہیم شاہ، سیّدؒ کے حضور پہنچا تو خانقاہ کے کچھ لوگوں نے بھی رسمِ زمانہ کے مطابق سلطان کو اس عظیم الشان فتح پر مبارک باد دی۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ خانقاہ میں حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی پُر جلال آواز گونجی۔ آپؒ حاضرین کو مخاطب کر کے فرما رہے تھے۔

''قلعوں کے دروازے تو کھلتے اور بند ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اگر دل کا در ایک بار بند ہو جائے تو پھر مشکل ہی سے وا ہوتا ہے۔ سلطان کو قلعے کی فتح پر نہیں، دل کا دروازہ کھل جانے پر مبارک دو۔''

ابھی سیّدؒ کے الفاظ کی بازگشت تھی کہ ابراہیم شاہ شرقی بے ساختہ پکار اُٹھا۔ ''غلام تو سیّد کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو ہی چکا۔ اب غلام زادوں کو بھی حلقۂ ارادت میں شامل کیجئے۔'' اس کے ساتھ ہی تینوں شہزادے بھی حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مرید ہو گئے۔

غلامی کی اس سعادت سے شرف یاب ہونے کے بعد سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی خدمت میں کئی بار قیمتی نذریں پیش کیں مگر سیّدؒ نے ہر مرتبہ انکار کر دیا۔

''سلطان! دولتِ دنیا پر میرے اور تمہارے درمیان کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ اگر تمہاری پُر جوش عقیدت کا یہی حال رہا تو اس خانقاہ کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میری خانقاہ تمہاری زمین پر آباد ہے تو میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔'' حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے لہجے سے سختی نمایاں تھی۔ بالفرض سیّدؒ کو دولتِ عرفان حاصل نہ ہوتی، تب بھی آپؒ ایک ریاست کے سابق حکمران تھے اور آپؒ نے باہوش و حواس دنیا کی تمام آسائشوں اور لذتوں کو ترک کیا تھا۔ جو شخص ایک زمانہ دراز تک مادی عیش و نشاط سے آشنا رہ چکا ہو، اسے ابراہیم شاہ شرقی کے قیمتی تحائف کس طرح متاثر کر سکتے تھے؟

سیّد کی آتشِ جلال اور بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سلطان گھبرا گیا اور بڑے ندامت آمیز لہجے میں معافی طلب کرنے لگا۔

''سیّد! مجھے یہ گوارا ہے کہ میں اپنے نذرات و تحائف کے ساتھ ناکام و نامراد واپس چلا جاؤں گا مگر اس اذیت کو برداشت نہیں کر سکتا کہ یہ علاقہ آپ کی ذات کی روشنی سے محروم ہو کر تاریکیوں میں ڈوب جائے۔''

اس اعتراف کے بعد حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ مطمئن ہو گئے۔ سلطان ابراہیم امورِ سلطنت سے فارغ ہو کر آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور سیّد نہایت شفقت و مہربانی کے ساتھ اسے کتاب و سنت کے احکام کی تبلیغ فرماتے۔

مختصر سے عرصے میں ہندوستان کا مشرقی علاقہ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی تعلیمات و کرامات کے شور سے گونجنے لگا۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ جون پور کے نواحی علاقے میں ایک ہندو جوگی رہتا تھا۔ جوگی نے بھوکا

پیاسا رہ کر جنگلوں، غاروں اور پہاڑوں کی خاک چھان کر یہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ وہ جب چاہتا، ہوا میں اُڑنے لگتا اور جب چاہتا، زمین پر اُتر آتا۔ دورانِ پرواز وہ چیخ چیخ کر تاریک بستیوں کے جاہل باشندوں سے کہتا۔
''میرا مذہب سچا ہے، میں حقیقت کے راستے پر گامزن ہوں۔ اگر کسی دوسرے شخص کو اپنے مذہب کی صداقت کا دعویٰ ہے تو وہ میری طرح ہوا میں اُڑ کر دکھائے۔'' جوگی کے ان پُرشور نعروں سے جہل زدہ لوگ بہت متاثر ہو رہے تھے اور وہ نومسلم جو سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی تبلیغ کے سبب اپنے آبائی مذہب کے حلقے سے نکل کر نئے دین میں داخل ہو چکے تھے، انہیں بھی اپنے عقائد پر شبہ سا ہونے لگا تھا۔
آخر کار ہندو جوگی کے شرانگیز ہنگاموں کی اطلاع سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ تک بھی پہنچی۔ کہنے والوں نے کہا۔''سیّدی! اگر اس جوگی کی شورشوں کا یہی حال رہا تو ہم اشاعتِ اسلام کے مقصد میں ناکام ہو جائیں گے۔''
جواباً حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے فرمایا۔''یہ انسان کی گمراہ سوچ ہے کہ اس کے ذریعے نظامِ کائنات متاثر ہو سکتا ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اگر سارا عالم بھی کسی فریب خوردہ شخص کو راہِ راست پر لانا چاہے تو یہ ممکن نہیں۔ اس بستی میں اب تک جن لوگوں کی زبانیں کلمہ طیبہ سے آشنا ہوئی ہیں، وہ محض اللہ کا کرم ہے۔ آئندہ بھی اہلِ ایمان کے جو قافلے اس راستے سے گزریں گے، ان پر اللہ کی رحمت ہی سایہ فگن ہو گی۔ جون پور کے ایک جوگی کا کیا ذکر ہے، اگر ہندوستان کے تمام سادھو اور سنت یکجا ہو کر بھی مسلمانوں پر یلغار کریں تو خدا کی قسم وہ اپنے آپ کو حشرات الارض سے بھی زیادہ حقیر و عاجز پائیں گے۔ تم اپنا کام جاری رکھو اور اس جوگی کو بھی پوری آزادی کے ساتھ کام کرنے دو۔ بہت جلد دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی کہ حق پر کون تھا اور کس کے عقائد باطل کا شکار تھے۔
حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے ارشاداتِ گرامی سن کر اہلِ ایمان کی مختصر سی جماعت مطمئن ہو گئی۔ مگر دوسری طرف با اثر ہندو، جوگی کو آلہ کار بنانے کے منصوبے ترتیب دینے لگے۔ حلقۂ کفار کا مقصد یہ تھا کہ جوگی مسلسل اپنی روحانی قوت کا مظاہرہ کرتا رہے تاکہ مزید ہندو، اسلام کی طرف متوجہ نہ ہوں اور جو لوگ بت کدوں سے ناراض ہو کر مسجدوں میں داخل ہو گئے ہیں، وہ بھی ہندو مذہب کی سچائی کا احساس کر کے واپس لوٹ آئیں۔
اسی منصوبے کے تحت جوگی تواتر کے ساتھ اپنی شعبدہ باز پروازوں کا مظاہرہ کرتا رہا۔ ہر بار اس کی زبان پر یہی مخصوص الفاظ ہوتے۔
''اگر مسلمان کو اپنے مذہب کی فضیلت پر برتری کا دعویٰ ہے تو ان میں سے کوئی ایک شخص بھی میری طرح ہوا کے دوش پر اُڑ کر دکھائے۔''
جوگی کی لاف زنی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مگر مسلمانوں کی جماعت نے اس کے کافرانہ دعوؤں کا کوئی تاثر قبول نہیں کیا۔ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ اور آپؒ کے مرید خاموشی سے تبلیغ کا کام انجام دیتے رہے۔ اس دوران مقامی ہندوؤں نے آپؒ سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ جوگی کی مانند کوئی مسلمان بھی اپنی روحانی قوت کا مظاہرہ کرے۔ جواب میں سیّدؒ نے فرمایا کہ کوئی انسان، جانوروں جیسی حرکات کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔
جب حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا یہ قول، جوگی نے سنا تو وہ شدتِ غضب سے اپنے حواس کھو بیٹھا اور پھر اسی اشتعال کی کیفیت میں سیّدؒ کی بارگاہ تک جا پہنچا۔ جوگی نہایت گستاخانہ انداز میں داخل ہوا اور بڑی بے ادبی کے ساتھ سیّدؒ کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔
''انسان کی آخری شکست یہ ہے کہ وہ کسی بات کا عملی جواب دینے کے بجائے اپنے حریف پر الزام تراشی

کرنے لگے۔ آج کل تم مسلمانوں کا یہی شیوہ ہے۔ اگر تمہاری جماعت کا ایک فرد بھی روحانی قوت کا مالک ہوتا تو کم سے کم میرے دعوے کو جھٹلانے کے لئے کوئی نہ کوئی دلیل ضرور لاتا۔'' جوگی کا لہجہ اس قدر استہزائیہ تھا کہ خانقاہ میں موجود تمام لوگوں کے چہروں پر نفرت و غضب کے رنگ نمایاں ہو گئے۔ مگر ایک حضرت سیّد اشرفؒ ہی تھے کہ حسبِ عادت مسکراتے رہے۔

جوگی کے خاموش ہو جانے کے بعد سیّدؒ نے ایک نظر اس گم کردہ راہ کی طرف دیکھا اور بڑے عجیب سے لہجے میں فرمایا۔ ''تُو کیا اور تیرا دعویٰ کیا؟''

''میرے دعوے کو تو ساری دنیا اپنی آنکھ سے دیکھ چکی ہے۔ بس تم لوگ ہی بینائی سے محروم ہو کہ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔'' جوگی کی گستاخی برقرار تھی اور وہ گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ مزید بے ادب ہوتا جا رہا تھا۔

''تیرے دعوے کا کوئی تماشائی اس بستی میں موجود ہے؟'' حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے جوگی سے سوال کیا۔

''وہ کون ہے جو میرے دعوے کا گواہ نہیں؟'' جوگی کی نخوت اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔

''میں نے آج تک اپنی آنکھوں سے تیری جسمانی پرواز کا کوئی مظاہرہ نہیں دیکھا۔ مگر اب میری بھی خواہش ہے کہ میں تجھے ہوا میں اُڑتا ہوا دیکھوں۔''

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اپنے مخصوص تبسم کے ساتھ فرمایا۔

''میں اسی وقت اور اسی جگہ اپنی روحانی طاقت کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔'' مسلمان درویش کی بات سن کر جوگی کا اشتعال کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

''میں اس تنہائی میں تیری پرواز دیکھنا پسند نہیں کرتا۔'' سیّد نے فرمایا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اس پرواز کے دوران تیرے تمام گواہ بھی موجود ہوں۔'' حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے جوگی کی روحانی قوت کے مظاہرے پر اپنی شرط عائد کر دی تھی۔

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ساری دنیا مجھے فضاؤں میں محوِ پرواز دیکھے اور آنکھ والوں پر یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ ہندو مذہب کس قدر سچا ہے اور اس کے ماننے والے کتنے عظیم ہیں۔'' جوگی کا جوش حد سے گزر چکا تھا۔ ''تم لوگ ابھی میرے ساتھ بستی میں چلو تا کہ میرے روحانی کمالات تمہارے سامنے بھی ظاہر ہو سکیں۔''

''ہمیں کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' حضرت سیّد اشرف جہانگیرؒ نے فرمایا۔ ''تُو حاجت مند ہے، اس لئے تجھ پر لازم ہے کہ تمام بستی کو جمع کر اور اس میدان میں اپنے کمالات کی جھلک دکھا۔'' یہ کہتے ہوئے سیّدؒ نے اس میدان کی طرف اشارہ کیا جو آپؒ کی خانقاہ کے سامنے واقع تھا۔

سیّدؒ کی بات سن کر جوگی رخصت ہو گیا۔ جاتے وقت وہ انتہائی تکبر کے ساتھ زمین پر پاؤں مار رہا تھا۔

دوسرے دن حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی خانقاہ کے قریب ایک عجیب سا ہنگامہ برپا تھا۔ بستی کے لوگ قطار در قطار ایک مرکز پر جمع ہو رہے تھے اور جوگی دیوانہ وار چیخ رہا تھا۔

''لوگو! میری طرف آؤ کہ میں لازوال روحانی قوتوں کا مالک اور ہندو مذہب کی عظمتوں کا زندہ ثبوت ہوں۔ آج یہ مسلمان بھی اپنی آنکھوں سے مجھے ہواؤں میں اُڑتا ہوا دیکھ لیں گے اور پھر اُنہیں یقین آ جائے گا کہ کس کا عقیدہ برتر ہے؟'' جوگی مسلسل ہذیانی کیفیت سے دوچار ہو کر بولتا رہا اور لوگ سیّدؒ کی خانقاہ کے قریب جمع ہوتے رہے یہاں تک کہ میدان میں ہر طرف انسانی سر نظر آنے لگے۔

جب ہندو جوگی کے تمام گواہ آ چکے تو حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ اپنے خدام کے ہمراہ خانقاہ سے باہر تشریف لائے اور انسانی ہجوم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

''اے بے خبر لوگو! تم نے بارہا پرندوں کو آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتے ہوئے دیکھا ہے، اپنی اونچی اُڑان کے باوجود وہ جانور ہی رہتے ہیں، انہیں کسی بھی حالت میں انسان پر فضیلت نہیں دی جا سکتی۔'' حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا لہجہ اس قدر اثر انگیز تھا کہ سینکڑوں انسانوں کا مجمع ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ ''اگر تم میں سے کوئی بھی شخص زمین سے بلند ہو کر فضا میں پرواز کرنے لگے تو یہ انسانی فعل ہرگز نہیں ہوگا۔'' یہ کہہ کر سیّدؒ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئے اور پھر با آوازِ بلند فرمانے لگے۔

''تمہاری آنکھیں جس انسان کے عمل پر خیرہ ہو جاتی ہیں، وہ محض ایک فریب ہے۔''

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے جوگی کی طرف اشارہ کیا اور پھر فرمایا۔ ''یہ شخص ہواؤں میں اُڑنے کا دعویدار ہے مگر میں اُس کی کسی بات پر یقین نہیں رکھتا۔ اگر یہ سچا ہے تو اس سے کہو کہ اپنی روحانی قوتوں کا مظاہرہ کرے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ ایسا کرنے سے قاصر رہے گا۔''

جیسے ہی سیّدؒ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، جوگی وحشیانہ انداز میں چیخنے لگا۔

''یہ مسلمان جھوٹا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کون ہوں اور مجھے ہندو مذہب میں کیا مقام حاصل ہے۔'' جوگی نے شخصی ادب واحترام کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور نہایت متکبرانہ لہجے میں لاف زنی کر رہا تھا۔ ''میں ابھی تمہیں اپنی بلند پروازی دکھاؤں گا اور اس مسلمان کی باتوں کو جھٹلا دوں گا جس نے مجھ پر تہمت طرازی کی ہے۔'' اتنا کہہ کر جوگی خاموش ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ پھر انسانی ہجوم نے اس کے ہونٹوں کو لرزتے دیکھا۔ شاید وہ پرواز سے پہلے اپنے کسی منتر کا وِرد کر رہا تھا۔ چند ساعتوں تک جوگی کی یہی حالت رہی، پھر یکایک اس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف دراز کر دیئے۔ سارا مجمع حیرت وسکوت کے عالم میں جوگی کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہندو مذہب کے ماننے والوں کو یقین تھا کہ اگلے ہی لمحے جوگی ہوا میں پرواز شروع کر دے گا اور اس کے ساتھ ہی مسلمان درویش کے مقدر میں ندامت وشرمساری رقم ہو جائے گی۔

مگر وہ لمحہ جس کا بت پرستوں کو شدید انتظار تھا، وقت کے اُفق پر طلوع نہ ہو سکا۔ جوگی وحشیوں کی طرح اپنے جسم کو حرکت دیتا رہا لیکن فضا میں پرواز تو کجا، وہ اپنے پیروں کو سطحِ زمین کی قید سے بھی آزاد نہ کرا سکا۔ جوگی اور اس کے نام لیواؤں پر سکوت طاری تھا۔ کفر کے دعوے باطل ٹھہرے تھے اور ایک مردِ مومن ہی معتبر قرار پایا تھا۔ پھر سننے والوں کی سماعتوں میں ایک بت پرست کے یہ الفاظ محفوظ ہو گئے۔ ''کچھ دیر پہلے تک میری عبادت و ریاضت بھی بے اعتبار نہیں تھی اور میرا کوئی دعویٰ بھی جھوٹا نہیں تھا۔ مگر اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ میری تمام عمر رائیگاں بسر ہو گئی۔ میں نے جو کچھ سیکھا، وہ مہمل تھا۔ جو کچھ پڑھا، وہ حرفِ غلط تھا اور جو کچھ عمل کیا، وہ ایک فریب کار خواب تھا۔

جوگی اعترافِ شکست کر رہا تھا اس کے برعکس مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کے انداز فاتحانہ تھے اور ان کے چہروں سے نصرت وکامیابی کا نور جھلک رہا تھا۔

اس کے بعد جوگی اپنی عبادت گاہ تک گیا اور پھر واپس آ گیا۔ لوگوں نے دوسرا عجیب منظر دیکھا، جوگی اور اس کے شاگردانِ خاص اپنے ہاتھوں میں کتابوں کا ایک انبار اُٹھائے ہوئے تھے پھر اس نے تمام کتابیں سرِ میدان جمع کیں اور ان میں آگ لگا دی۔ جیسے جیسے آگ کے شعلے بلند ہوتے جا رہے تھے، جوگی مجمع کے سامنے چیخ چیخ کر

کہتا جاتا تھا۔
"لوگو! آج میں تم سب کے روبرو گمراہیوں کے اس طلسم کو نذرِ آتش کر رہا ہوں، جس سے تم نے ہوا میں میری پروازیں دیکھی ہیں، اسی طرح میرے عقائد کا عبرت ناک انجام بھی دیکھ لو۔ میرا علم راکھ کا ڈھیر ہوتا جا رہا ہے اور میں کوچۂ اصنام سے نکل کر اس راستے پر جا رہا ہوں جدھر مجھے یہ مردِ حق پرست بلا رہا ہے۔"
اتنا کہہ کر جوگی بے اختیار آگے بڑھا اور اس نے حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔
دوسرے ہی لمحے انسانی ہجوم نے یہ عجیب منظر بھی دیکھا کہ سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ اس جوگی کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا رہے تھے۔ اب جون پور کی فضاؤں میں جوگی کی نئی آواز اُبھر رہی تھی اور وہ انتہائی جذب کے لہجہ و آہنگ میں اللہ کی وحدانیت اور نبی آخر الزماں ﷺ کی رسالت پر گواہی دے رہا تھا۔
جوگی کے ساتھ اس کے پانچ ہزار چیلے بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ، جوگی سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ آپؒ نے اس کی کٹیا (عبادت گاہ) میں اپنی نئی خانقاہ تعمیر کرائی۔ یہ سیّدؒ کی خصوصی توجہ ہی تھی کہ جوگی نے بہت جلد معرفت کے سخت مراحل طے کئے اور پھر "بابا کمال پنڈت" کے نام سے پورے ہندوستان میں مشہور ہوا۔
اس انداز کا ایک اور واقعہ بھی مستند تاریخوں کے اوراق میں محفوظ ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ تبلیغ کے لئے بت پرستوں کے گڑھ بنارس تشریف لے گئے تھے۔ صوبہ اتر پردیش کا یہ تاریخی شہر ماضی بعید میں بھی ہندوؤں کا سب سے بڑا مذہبی مرکز تھا اور آج دورِ جدید میں اسے وہی حیثیت حاصل ہے۔ جب سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ، بنارس تشریف لے گئے تو آپؒ نے مقامی لوگوں کے سامنے اسلامی عقائد کو پیش کیا اور واشگاف الفاظ میں پتھر کے پجاریوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
"اے لوگو! میں نہیں جانتا کہ آج سے پہلے تمہیں کسی شخص نے خدائے واحد کی پرستش کا پیغام دیا ہے یا تم اس کلمۂ سرمدی کی ساعت سے محروم رہے ہو۔ بہر حال آج بہت غور سے سن لو کہ تم اور تمہارے آباؤ اجداد صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔ اگر تمہیں یہ بتانے والا کوئی نہیں آیا کہ تم جن پتھروں کی عبادت کرتے ہو، وہ خود تمہارے ہی ہاتھوں کے تراشے ہوئے ہیں تو پھر میری زبان سے سن لو کہ اتنی بے جان چیزیں معبود بنانے کے لائق نہیں ہوتیں، کوئی ذی ہوش ان ہستیوں کو خدا کیسے تسلیم کر سکتا ہے جو اپنی جگہ سے جنبش کرنے میں بھی انسانی مدد اور تعاون کی محتاج ہوں۔ یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ تم صدیوں سے فریب کھا رہے ہو۔ اب جبکہ مجھ فقیر کے ذریعے تم تک خدائے واحد کا پیغام پہنچ چکا ہے تو اپنی سابق روایات کو یکسر ترک کر دو اور بت پرستی کے اس ناقابلِ معافی گناہ سے باز آ جاؤ جس کا انجام بھڑکتی ہوئی آگ کے سوا کچھ نہیں۔"
سینکڑوں ہندو جن میں بڑے بڑے پنڈت اور گیانی بھی شامل تھے، حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی باتیں سنتے رہے مگر ان کے دل پتھر کے ہو چکے تھے۔ اس لئے سیّدؒ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک کلمہ بھی اُنہیں متاثر نہیں کر سکا۔ یہاں تک کہ آپؒ کے پیغام کو جھٹلانے کے لئے ایک بوڑھا پنڈت برسرِ مجمع کھڑا ہوا اور نہایت تلخ لہجے میں کہنے لگا۔
"کیا تم وہی شخص ہو جسے پہلی بار زندگی کا عرفان حاصل ہوا ہے؟" پنڈت نے سیّد سے عجیب و غریب سوال کر ڈالا تھا۔
"نہیں!" حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے فرمایا۔ "مجھ سے پہلے بھی بے شمار اہلِ ایمان کو حقیقت کا

ادراک ہو چکا ہے۔ میں تو اس ذاتِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ادنیٰ سفیر ہوں، جس نے مکمل نظامِ حیات پیش کیا اور بنی نوع آدم کو بتایا کہ اللہ کی مرضی کیا ہے۔"

"تم سمجھتے ہو کہ ہم سب کے سب احمق ہیں اور تاریکیوں میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں؟" بوڑھے پنڈت کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا تھا۔

"کیا ہمارے وہ لاکھوں بزرگ بھی دیوانے تھے جو صدیوں تک بتوں کی پوجا کرتے رہے؟ یقیناً اتنے افراد غلطی کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ غلطی پر تو وہ لوگ ہیں جن کا مذہب بھی نیا ہے اور نظریات بھی جدید ہیں۔ تم نے اپنے آباؤ اجداد سے ایسی ناقابلِ فہم باتیں نہیں سنیں، پھر کس طرح تمہاری گفتگو لائقِ سماعت ہو سکتی ہے؟" یہ کہہ کر پنڈت واپس جانے کے لئے مڑا۔ جاتے جاتے بھی وہ اپنے ہم مذہبوں سے یہی کہہ رہا تھا۔

"دیوتاؤں کے پجاریو! اس مخبوط الحواس انسان کی باتوں پر کان نہ دھرو اور اپنے ان بزرگوں کے اعمال پر نظر رکھو جو آخری سانس تک ثابت قدم رہے۔ یہاں تک کہ آگ کے شعلوں نے ان کے جسموں کو پھونک کر انہیں مکتی (نجات) دے دی۔"

پنڈت کی تنبیہہ سن کر مجمع منتشر ہو گیا۔

اب حضرت جہانگیر سمنانیؒ اور آپ کے چند ساتھی خاموش کھڑے تھے۔ جھٹلانے والوں کی بھیڑ اپنے گھروں کو واپس جا چکی تھی۔

"پتھروں کو پوجتے پوجتے ان کے دل بھی سخت ہو گئے ہیں۔" حضرت شیخ کے ایک خادم نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "ان پر آپ کا کلامِ نرم و نازک اثر انداز نہیں ہو سکتا۔" خادم کے لہجے سے شدید مایوسی جھلک رہی تھی۔

"ایک بندے کا اختیار صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے خدا کا پیغام دوسروں تک منتقل کر دے۔" حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے خادم کی مایوس کن باتیں سن کر فرمایا۔ "اور خدا کا اختیار یہ ہے کہ وہ جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے ہمیشہ سرکشی و گمراہی میں مبتلا رکھے۔ زمین بھی اس کی، آسمان بھی اس کا۔ کلمہ بھی اس کا، کلام بھی اس کا۔ مکین بھی اس کا، مکان بھی اس کا۔ ہم کون ہیں، کسی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے والے؟ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں تبلیغ اشاعت و دین کا کارِ منصبی بخشا۔ وہ چاہتا تو تمہیں نافرمانوں کی صف میں شامل کر دیتا اور نافرمانوں کو اپنا اطاعت گزار بنا دیتا۔"

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی تنبیہہ سن کر خدام کی گردنیں جھک گئیں اور انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ تبلیغِ دین کے لئے کس قدر قوتِ برداشت کی ضرورت ہے۔

وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا رہا، حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے کئی بار ہندو اکثریت کے درمیان نظریۂ اسلام پیش کیا مگر بت پرستوں کی سرکشی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ ہر مرتبہ اپنے دیوتاؤں کا حوالہ دیتے اور سیّد کے ساتھ استہزاء کرتے ہوئے گزر جاتے۔

آخر حجت تمام ہو چکی۔ ایک دن حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ اپنے چند خدام کے ہمراہ خانقاہ سے باہر نکلے اور ایک طرف روانہ ہو گئے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ سیّدؒ کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ خدام نے تو بس چہرۂ مبارک سے اندازہ کر لیا تھا کہ آج غیر معمولی جلال نمایاں ہے اس لئے وہ کسی بڑے واقعہ کے رونما ہونے کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ خاموشی کے ساتھ چلتے رہے مگر آج خلافِ معمول آپؒ کے قدموں کی رفتار زیادہ تیز تھی۔

پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سیدؒ بنارس کے سب سے بڑے مندر میں داخل ہو رہے تھے۔ جیسے ہی پتھر کے پجاریوں نے ایک مسلمان درویش کو اپنی عبادت گاہ کے اندر آتے دیکھا تو ہلچل سی مچ گئی۔ مندر میں وہ بوڑھا پنڈت بھی موجود تھا، جس نے ایک بار بھرے مجمع میں سیدؒ کی باتوں کو جھٹلایا تھا۔ بتوں کو پوجنے والے مسلسل آرہے تھے اور دیوتاؤں کے قدموں پر سر رکھ کر اپنی بندگی کا اظہار کر رہے تھے۔

جیسے ہی حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ مندر میں داخل ہوئے، بوڑھا پنڈت گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''تم یہاں کیسے آگئے؟'' پنڈت کے لہجے سے شدید سراسیمگی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں اپنی آنکھوں سے تمہارا طریقۂ عبادت دیکھنا چاہتا تھا۔'' سیدؒ نے جواباً فرمایا۔

''دیکھ لو! خوب غور سے دیکھ لو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔ اسی پر چل کر انسان زندگی کے عذابوں سے نجات حاصل کرتا ہے۔'' پنڈت کے لہجے سے احساسِ غرور اس طرح نمایاں تھا جیسے بت پرستی کے سوا کائنات میں کسی دوسری شے کا وجود ہی باقی نہیں ہے۔

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ، بوڑھے پنڈت کی بے سروپا باتیں سن رہے تھے۔ مگر آپؒ کی نظریں مستقل اس بت پر جمی ہوئی تھیں جو اپنی جسامت کے اعتبار سے بہت قد آور تھا۔

''یہ کون ہے؟'' سیدؒ نے پنڈت کے دعوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ آپؒ کا اشارہ اسی قد آور بت کی جانب تھا۔

''یہ ہمارا سب سے بڑا دیوتا ہے۔'' پنڈت کے لہجے میں وہی غرور تھا جیسے وہ بت کائنات کا حکمران ہو۔

''تم اس پتھر کے مجسمے سے اپنی مرادیں مانگتے ہو؟'' حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے بوڑھے پنڈت سے دوسرا سوال کیا۔ اس دوران تمام پجاری بھی اپنی عبادت چھوڑ کر سیّد کے گرد سمٹ آئے تھے اور ایک مسلمان درویش اور پنڈت کے درمیان ہونے والے مکالمات کو پورے انہماک کے ساتھ سن رہے تھے۔

''یہ پتھر کا مجسمہ نہیں، ہمارا مشکل کشا ہے۔ ہمارا خدا ہے۔'' پنڈت کا لہجہ اچانک غضب ناک ہو گیا تھا۔ ''یہ ہمیں سب کچھ دیتا ہے۔ رزق، عزت، آرام، آسائش۔ یہ ہماری ایک ایک بات سنتا ہے۔ ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے۔ جب ہم اپنے دکھوں میں اسے پکارتے ہیں تو یہ ہمارے تمام رنج و الم دور کر دیتا ہے۔'' پنڈت اپنے دیوتا کی وہی صفات بیان کر رہا تھا جو مسلمانوں کے خدائے واحد میں پائی جاتی ہیں۔

''یہ بڑی قدرت والا بت ہے۔'' پہلی بار حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے لہجے سے طنز نمایاں تھا۔ مندر کے در و دیوار پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ پوجا کے لئے آنے والے تمام ہندو شدید حیرت کے عالم میں مسلمان درویش کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یکایک حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ چند قدم آگے بڑھے اور قد آور بت کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔ پھر آپؒ نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور انگشت شہادت اس بت کی طرف کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

''اے پتھر کے بے جان مجسمے! کیا تُو ان لوگوں کا مشکل کشا ہے؟'' حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ، بت سے مخاطب تھے۔ ''کیا تُو ان توہم پرست اور جہل انسانوں کے سامنے خدائی کا دعویٰ کرتا ہے؟'' سیّد اشرفؒ پتھر کے مجسمے سے اس طرح گفتگو کر رہے تھے، جیسے آپؒ کا روئے سخن کسی انسان کی طرف ہو۔

مندر میں موجود تمام لوگوں کی عجیب حالت تھی۔ اگرچہ ہندو پجاری ذہنی طور پر ایک مسلمان درویش کی باتوں کو مجنونانہ حرکت سے تعبیر کر رہے تھے لیکن پھر بھی ان میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے

ہوئے بھی لب کشائی کر سکتے۔
پھر جو کچھ پردۂ غیب سے ظاہر ہوا، اسے دیکھ کر پجاریوں کی آنکھیں پتھرا گئیں اور ان کی سماعتوں میں شگاف پڑ گئے۔ مندر کا سب سے بڑا بت، حضرت سیّد جہانگیر سمنانیؒ کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔
''میں تو صرف پتھر کا ایک ٹکڑا ہوں اور باقی تمام اعزازات سے محروم۔ ان ہی لوگوں نے مجھے تراشا ہے اور مندر کی چار دیواری میں نصب کر دیا ہے۔ یہی لوگ مجھے خدا کہتے ہیں اور دن رات مرادیں مانگتے رہتے ہیں۔ وہ ان کی مشکل کشائی کیا کرے گا جو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا۔'' یہ کہہ کر بت خاموش ہو گیا۔
یہ قدرت کی کرشمہ سازی تھی کہ اس نے ایک بت کو قوتِ گویائی عطا کی اور اپنے ایک دوست کو بت خانۂ ہند میں ہزاروں انسانوں کے سامنے سرفراز کیا۔ بعض تاریخ نویسوں کی رائے کے مطابق یہ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی سب سے بڑی کرامت تھی جس سے متاثر ہو کر بنارس کے بے شمار ہندوؤں نے اپنی پیشانیوں کے ''تلک'' مٹا دیئے، زُنار توڑ کر پھینک دیئے اور اپنے آباؤ اجداد کی صدیوں پرانی رسموں کو پامال کر ڈالا۔ جس مندر سے صبح و شام ناقوس کی صدائیں اُبھرتی تھیں، وہاں اذانیں گونجنے لگیں۔

صنم کدہ ہے جہاں، لا الٰہ الا اللہ

اب حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اپنے ظاہری علم اور کشف و کرامات سے اہلِ ہند کو عاجز کر دیا تو کچھ تنگ نظر مسلمان بھی آپؒ کی شہرت و عظمت سے حسد کرنے لگے۔ اکثر و بیشتر یہ کم ظرف جماعت، سیّد کی خانقاہ میں داخل ہوتی اور نہایت جاہلانہ بحث شروع کر دیتی۔ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ خندہ پیشانی کے ساتھ ان لوگوں کے مہمل سوالات کے جوابات دیتے رہے مگر وہ حاسد و نادان لوگ جہل کے باعث اپنے عقائد سے رجوع نہ کرتے یہاں تک کہ سیّدؒ ایک مخصوص عارفانہ تبسم کے ساتھ فرمانے لگتے۔
''اگر تمہارے ذہن میرے خیالات سمجھنے سے قاصر ہیں تو میں ضد نہیں کرتا۔ تم اپنے نظریات پر قائم رہو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔''
حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ اسی طرح مصالحت روی کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی کی تکمیل میں مصروف تھے کہ ایک روز چند مجذوب و ملنگ نما لوگ سیّدؒ کی خانقاہ میں بے حجابانہ داخل ہوئے۔ خدام نے ان گستاخوں کو روکنے کی کوشش کی مگر حضرت اشرف جہانگیرؒ نے فرمایا۔ ''درویش کی خانقاہ کا دروازہ سب کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ جو جس انداز میں طلب کرے گا، اسے آخر کار وہی حاصل ہو جائے گا۔'' پیر و مرشد کا حکم سن کر خدام خاموش ہو گئے اور ملنگوں کی یہ مختصر سی جماعت حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے قریب پہنچ گئی۔
بعض تاریخ نویسوں نے ان لوگوں کو قلندر کہہ کر پکارا ہے مگر ہمارے نزدیک وہ ملنگ ہی تھے، شریعت کے تمام ظاہری آداب سے بے نیاز۔ بدقسمتی سے تصوف کے موضوع پر لکھنے والے غیر ذمے دار اہلِ قلم نے ہر بے لباس اور بے حال شخص کو قلندر جیسے عظیم لقب سے متصف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ قلندر تو کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے۔ وہی قلندر جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات !
تُو جھکا جب غیر کے آگے ، نہ تن تیرا نہ من

اللہ کے ایسے بے نیاز بندے یقیناً جماعتوں اور گروہوں کی شکل میں دربدر نہیں پھرتے۔ وہ ملنگوں ہی کی ایک بے لگام ٹولی تھی جو بزرگانِ دین کی خدمت میں حاضری کے تمام مہذبانہ طریقوں کو فراموش کر کے سیّد کی

مزاج پرسی کی اور پھر نہایت کریمانہ انداز میں اپنے مہمانوں سے مخاطب ہوئے۔
"آپ حضرات نے جس مقصد کے لئے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی ہے، وہ بعد میں زیر بحث آئے گا لیکن پہلے اس فقیر کو میزبانی کی سعادت دیجئے۔" یہ کہہ کر سیّد نے ملنگوں کی خاطر تواضع کرنی چاہی۔
"ہم تیری روٹیوں کے بھوکے نہیں ہیں۔" ملنگوں میں سے ایک نے نہایت بے ادبی کے ساتھ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی دعوت کو ٹھکراتے ہوئے کہا۔
"اگر آپ حضرات اس فقیر کو مدارات کا موقع فراہم نہیں کرتے تو پھر اپنی آمد کا مقصد بیان کیجئے۔" سیّدؒ نے ملنگ کی تلخ کلامی اور بے ہودگی سے چشم پوشی کرتے ہوئے فرمایا۔
"ہم تجھ سے صرف یہ دریافت کرنے آئے ہیں کہ تُو نے جہانگیری کہاں سے حاصل کی؟" ملنگ پر حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے شیریں سخن اور نرم گفتاری کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی تحقیر آمیز لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔
"میرا خاندانی نام اشرف ہے۔" سیّدؒ نے حُسنِ کلام کی تمام روایتوں کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے میرے مرشد نے جہانگیر کا لقب عطا فرمایا ہے۔ ورنہ میں تو اللہ کا ایک عام سا گناہ گار بندہ ہوں۔" اس کشیدہ فضا میں سیّدؒ کا انکسار قابلِ دید تھا۔
"تیرا مرشد کون ہے؟" ملنگ کی گستاخی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔
"حضرت علاؤالدین چشتیؒ میرے مرشد ہیں۔" یہ کہتے کہتے سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا تھا۔ اس کی وجہ ملنگ کا وہ گستاخانہ طرزِ گفتگو تھا جو اس نے سیّدؒ کے پیر و مرشد کی شان میں روا رکھا تھا۔
"میرے مرشد کے فرمودات ہی میرے لئے ثبوتِ آخر ہیں۔" حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا لہجہ پُرجلال ہو گیا تھا اور خلافِ عادت چہرے پر غیظ و غضب کی کیفیت واضح نظر آنے لگی تھی۔
"میں تیرے مرشد کے کسی قول کو تسلیم نہیں کرتا۔" ملنگ ہذیانی انداز میں بول رہا تھا۔ "میں تیری جہانگیری کا زندہ ثبوت چاہتا ہوں۔"
اب ضبطِ سخن کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ جلالِ معرفت مکمل طور پر بے حجاب ہو چکا تھا۔ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ کیا ادا ہوئے کہ اہلِ خانقاہ نے اپنے جسموں میں آتشیں لہر اُترتی ہوئی محسوس کی۔
"میرے مرشد کے فرمودات کو عملی شکل میں دیکھنے کے لئے تُو زندہ ہی کب بچے گا؟" یہ کہہ کر سیّد نے شدید حالتِ غضب میں گستاخ ملنگ کی طرف دیکھا۔
اس کے منہ سے ایک جگر خراش چیخ بلند ہوئی اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد اس کا جسم سرد ہو گیا۔ دوسرے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے سیّد اشرفؒ کی "جہانگیری" کا ثبوت دیکھ لیا تھا۔ مگر ثبوت طلب کرنے والا اپنی بدعقیدگی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ جب ملنگوں نے اپنے ایک ساتھی کا یہ عبرت خیز انجام دیکھا تو لڑکھڑاتے قدموں اور لرزتے جسموں کے ساتھ فرار ہو گئے۔
بعد میں حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔
"افسوس! عقیدے کی خرابی اور سیاہ بختی نے اسے کھا لیا۔" پھر سیّد ہی کے حکم پر ملنگ کو خانقاہ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

جب سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ ظفر آباد میں مقیم تھے، اس وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے کی بنیاد بھی وہی تنگ نظری تھی جو اہلِ زمانہ کی عادتِ ثانیہ بن کر رہ گئی ہے۔ ظفر آباد میں سیّدؒ کی شہرت و بزرگی کا یہ عالم تھا کہ آپؒ کی خانقاہ کے دروازے پر عقیدت مندوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ یہاں آپؒ کی آمد سے قبل کچھ علمائے ظاہری اپنی پُر جوش تقریروں کے ذریعے سادہ لوح انسانوں کے دماغوں پر حکومت کرتے تھے لیکن جیسے ہی حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ، ظفر آباد میں تشریف لائے تو مقامی باشندوں کا ہجوم آپؒ کی خانقاہ کے گرد سمٹ آیا۔ علماء کے نزدیک یہ بات سخت ناپسندیدہ تھی کہ برسوں کے اسیر عوام ان کے کھینچے ہوئے حصار سے نکل کر ایک درویش کے حلقۂ اثر میں چلے جائیں۔ علماء کی اس جماعت نے کچھ دن تک پورے زور و شور کے ساتھ حضرت سیّد اشرف جہانگیرؒ کی درویشی کا مذاق اُڑایا اور آپؒ کے عقیدت مندوں کو بدگمان کرنے کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ مگر وہ عاقبت نااندیش علماء، سیّدؒ کے مقامِ روحانی سے بے خبر تھے، اس لئے اپنی سازشوں میں بری طرح ناکام ہو گئے۔ اصولی طور پر ان لوگوں کو ایک مردِ کامل کی برتری تسلیم کر لینی چاہئے تھی مگر شکست خوردگی کے احساس اور حاسدانہ فطرت نے انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ پھر وہ اپنی خلوتوں میں حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو بے اثر ثابت کرنے کے لئے ایک منصوبہ ترتیب دینے لگے۔ جب منصوبے کے دھندلے خاکوں میں عقلِ عیار نے رنگ بھر دیا تو ان حاسد علماء کے اشارے پر کچھ مقامی اور با اثر لوگوں نے ایک زندہ شخص کو کفن پہنایا اور حضرت سیّد اشرف سمنانیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔

"شیخ محترم! یہ ہمارا ایک عزیز تھا جو مرگِ ناگہانی کا شکار ہو گیا۔ براہِ کرم اس کی نمازِ جنازہ پڑھا دیجئے۔"

درخواست گزاروں کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ فریب و عیاری میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض کی آنکھوں سے مصنوعی آنسو بھی بہہ رہے تھے تاکہ سیّدؒ کو کسی سازش کا گمان نہ ہو۔ اس طرح وہ کم نظر لوگ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی قوتِ کشف کو آزمانا چاہتے تھے۔

حاسدین کی جماعت نے منصوبہ اس طرح ترتیب دیا تھا کہ جنازہ دیکھ کر سیّد اشرف جہانگیرؒ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔ مگر جیسے ہی تکبیر شروع ہو گی، وہ مردہ شخص، کفن سمیت اُٹھ کر بیٹھ جائے گا۔ پھر مخالفین کا گروہ ظفر آباد میں ہنگامہ برپا کر دے گا کہ یہ ہیں وہ پیرِ روشن ضمیر، اشرف جہانگیر جو زندہ لوگوں کی نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں۔ اور یہ ہیں ولایت کا دعویٰ کرنے والے والیٔ سمنان، جن کے کشف و کرامت کی سارے ہندوستان میں دھوم ہے۔ حاسدین کے خیال میں جیسے ہی یہ شور بلند ہوتا، لوگ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے بدظن ہو جاتے اور پھر ان کا قصرِ ولایت (معاذ اللہ) ہمیشہ کے لئے منہدم ہو جاتا۔ غرض نفاق و حسد کے اسی منصوبے کے ساتھ لوگوں نے سیّد سے نمازِ جنازہ پڑھانے کے لئے درخواست کی۔

"اس شہر میں بہت سے عالم و فاضل اور بزرگ حضرات موجود ہیں۔ آپ ان سے نمازِ جنازہ کی امامت کے لئے کہیے۔" حضرت اشرف جہانگیرؒ نے انکار کرتے ہوئے فرمایا۔ آپؒ کے لہجے میں طنز و تضحیک کا شائبہ تک نہ تھا۔

"آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔" حاسدین کی جماعت کے ایک فرد نے سیّدؒ کا انکار سن کر کہا۔

"نہ یہ عجز ہے، نہ انکسار۔" حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے جواباً فرمایا۔ "بہر حال میری گزارش یہی ہے کہ نمازِ جنازہ کے لئے آپ حضرات کسی دوسرے امام کا انتخاب کر لیں۔"

"آپ خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔" دوسرے شخص نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا مگر اس کے سینے میں شرارت و نفاق کا ایک دریا موجزن تھا۔ "ہماری التجا ہے کہ آپ مرحوم کی نمازِ جنازہ پڑھا دیجئے۔ دنیا سے رخصت ہونے والا

بہت گناہگار تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کی دعاؤں سے بخش دیا جائے گا۔"

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اتمام حجت کے طور پر کچھ دیر تک مزید گریز سے کام لیا مگر جب وہ لوگ نہیں مانے تو آپؒ وضو کے لئے تشریف لے گئے۔ پھر چند لمحوں بعد حضرت اشرف جہانگیرؒ اس مصنوعی مردے کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے تھے جو ایک خاص منصوبے کے تحت کفن پہنے لیٹا ہوا تھا

فضاؤں میں تکبیر کی آواز بلند ہوئی۔ اس فتنہ انگیز جماعت کے تمام افراد اگلی صف میں موجود تھے۔ باقی صفوں میں حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے خدام، مریدین اور دوسرے عقیدت مند کھڑے تھے۔ وہ لوگ جو مُردے کو لے کر آئے تھے، بظاہر انہوں نے نماز کی نیت باندھ لی تھی۔ مگر اُن کی نظریں بدستور مُردہ شخص کے بے حس و حرکت جسم پر جمی ہوئی تھیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جس شخص کو مُردے کی حیثیت سے حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی خدمت میں لایا گیا تھا، وہ حبسِ دم کا ماہر تھا۔ اس کے فن کا کمال یہ تھا کہ وہ کئی کئی گھنٹے اس طرح سانس روک کے لیٹا رہتا تھا کہ دیکھنے والوں کو اس کی موت کا یقین آ جاتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی اسی مہارت کا ثبوت دے رہا تھا اور کفن اوڑھے یوں لیٹا ہوا تھا جیسے اس کی سانسوں کا شمار ختم ہو گیا ہو۔ منصوبہ سازوں کو یقین تھا کہ تکبیر کی آواز سنتے ہی مُردہ اُٹھ کر بیٹھ جائے گا اور منصوبے کے مطابق حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے کہے گا۔

"السلام علیکم یا پیرِ محترم! آپ کی قوتِ کشف کا یہ حال ہے کہ ایک زندہ شخص کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔"

مگر وہاں تو کوئی اور ہی منظر نگاہوں کے سامنے تھا۔ سیّد کی پُر جلال آواز فضا میں گونجی لیکن مُردے کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ فتنہ پردازوں کو گمان ہوا کہ شاید وہ شخص ان کی ہدایت بھول گیا ہے، اس لئے خاموش لیٹا ہے۔

پھر دوسری تکبیر کی آواز بلند ہوئی۔ نماز میں شریک ہونے کے باوجود زمانہ سازوں نے گھبرا کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ جنازہ اب بھی ساکت تھا۔ کفن میں برائے نام بھی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ سیّدؒ کے مخالفین بدحواس نظر آنے لگے۔ مگر پھر بھی اُنہیں اُمید تھی کہ وہ شخص عنقریب اُٹھ کر بیٹھ جائے گا۔

پھر آخری تکبیر کی صدا بلند ہوئی۔ اس کے بعد بھی مُردہ شخص کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی تو منصوبہ ساز ناقابلِ بیان وحشت کا شکار نظر آنے لگے مگر اپنے دلوں پر جبر کئے ہوئے کھڑے رہے۔

آخر نمازِ جنازہ تمام ہوئی اور حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ یہ کہتے ہوئے اپنی خانقاہ میں تشریف لے گئے۔

"مرحوم کو دفن کر دیجئے اور اس کے لئے دعائے خیر کیجئے۔"

اب تو ایک قیامت سی برپا تھی۔ مخالفین نے اپنے ساتھی کو مسلسل آوازیں دیں۔ اس کے ساکت جسم کو جھنجوڑ کر رکھ دیا مگر وہاں نہ کوئی حرکت تھی، نہ کسی بات کا جواب۔ جس انسان پر مصنوعی موت طاری کی گئی تھی، وہ حقیقی موت سے دوچار ہو چکا تھا۔

مخالفین بدحواس ہو گئے۔ جو حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کو تماشا بنانے آئے تھے، قدرت نے خود انہیں ایک عبرت ناک تماشا بنا دیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ اپنے اس ساتھی کو حسرت و یاس اور خوف و دہشت سے دیکھتے رہے جو حبسِ دم کا ماہر تھا مگر ایک مردِ حق آگاہ کے سامنے اس کا فن، عذابِ جاں بن گیا تھا۔ جب مخالفین کو اپنی نجات کی کوئی راہ نظر نہیں آئی تو وہ سیّدؒ کے خدام کے آگے گڑگڑانے لگے۔

خدام حیران تھے۔ "آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟" حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے ایک خادم نے مرنے

والے کے متعلقین سے پوچھا۔

جواب میں حاسدین کے گروہ نے اپنے مفسدانہ منصوبے کی تمام تفصیلات سیدؒ کے خدمت گاروں کے گوش گزار کیں تو ایک مرید نے کہا۔

''اہلِ حسد کو ایسے ہی انجام سے دوچار ہونا چاہئے تھا۔ اولیاء اللہ سے اس قدر بغض و کینہ رکھنے والوں کو ایسی ہی آگ میں جلنا چاہئے۔ یہی ان تنگ نظروں کی سزا ہے۔''

پھر بہت دیر تک وہ لوگ گریہ وزاری کرتے رہے۔ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے خدام اور دیگر عقیدت مندوں نے انہیں سمجھایا۔

''اب ایک ہی صورت باقی ہے کہ تم لوگ سیدؒ کے حضور جاؤ اور اپنے گناہ کی معافی طلب کرو۔ یہ معاملہ براہِ راست اللہ اور سیدؒ کے درمیان ہے۔ تم نے اللہ کے ایک پسندیدہ بندے کے اعمال کا مذاق اُڑانا چاہا تھا، اس لئے آخر کار رُسوا ہوئے۔ اب وہی بندہ جس کے لباسِ زہد و تقویٰ پر تم نے سیاہی ملنے کی کوشش کی تھی، اگر وہ اپنے مالک سے تمہارے لئے نجات طلب کرے تو ممکن ہے کہ مُردہ دوبارہ زندہ ہو جائے۔ کون جانے کہ معرفت میں سیدؒ کا کیا مقام ہے۔ مگر ہمیں اتنا ضرور معلوم ہے کہ اللہ، سیدؒ کی سنتا ہے۔ اگر سیدؒ بھی اپنے رب کے سامنے دامن پھیلا دیں تو وہ اُنہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔'' یہ کہہ کر تمام خدمت گار اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی خانقاہ کے دروازے پر ایک شورِ ماتم برپا تھا۔ وہ لوگ جو علمائے ظاہری کا آلہ کار بن کر سیّد کے کشف و کرامات کا امتحان لینے آئے تھے، اب مصروفِ فغاں تھے اور سینہ چاکوں کی مانند گریہ و زاری کر رہے تھے۔

''سیّد! ہم تیرے سامنے سرنگوں کھڑے ہیں۔ ہمارے فہم و خرد نے ہمیں فریب دیا اور ہم تیرے عشقِ جاں سوز کو مذہبی سوداگروں کی طرح ''ہاؤ ہو'' کا کاروبار سمجھنے لگے۔ ہمیں معاف کر دے کہ اب تیری چشمِ کرم کے سوا ہماری کوئی پناہ گاہ نہیں۔''

شورِ فغاں اس قدر تیز تھا کہ جسے سن کر حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ بھی بے قرار ہو گئے۔ پھر آپؒ نے اپنے خدام سے فرمایا۔

''ان شوریدہ سروں کو میرے سامنے لاؤ۔''

جب فتنہ پردازوں کی وہ جماعت سیدؒ کے حضور پہنچی تو دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ حضرت اشرف جہانگیرؒ کے مخالفین کے جسموں پر لرزہ طاری تھا اور ان کی گردنیں مجرموں کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔

''اب تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' سیّد نے اپنے مخالفین کے اس گروہ کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ''میں نے تمہاری خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے نمازِ جنازہ پڑھا دی۔ اب تم میت کی آخری رسوم ادا کرو۔ اس سینہ کوبی اور ماتم سے کیا حاصل؟ اسلام میں ان کافرانہ رسموں کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''سیّد! وہ تو ایک مذاق تھا۔'' حاسدین میں سے ایک شخص اس طرح بولا کہ شدتِ خوف سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''ہم ایک زندہ شخص کو آپ کے روبرو لائے تھے مگر وہ اچانک زندگی سے محروم ہو گیا۔''

''معاذ اللہ! کیا میں کسی انسان کی زندگی اور موت پر قادر ہوں؟'' فرطِ جلال سے سیدؒ کا لہجہ آتش ہو گیا تھا۔

''نہیں۔'' اس شخص کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''پھر مجھ سے کسی کی موت کا شکوہ کیوں کرتے ہو؟'' حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے فرمایا۔ ''کائنات

کے دیگر امور کی طرح نظامِ حیات وموت کا مالک بھی اللہ ہے۔ اسی نے تمہارے ساتھی کی سانسیں سلب کی ہیں۔ وہی اس بات پر بھی قادر ہے کہ دوبارہ تنِ مُردہ میں جان ڈال دے۔ اسی کو پکارو۔ وہ پکارنے والوں کی صدائیں خوب سنتا ہے۔

''سیّد! ہم تو راندۂ درگاہ ہیں۔ اگر ہماری سیاہ کاریاں ہمیں اس قدر ناپسندیدہ نہ بنا دیتیں تو ہم آپ جیسے بزرگ سے یہ تحقیر آمیز مذاق کیوں کرتے؟''

اس شخص نے روتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہماری بد اعمالیوں کی سنگین سزا ہے۔ ہم اپنی ندامتوں کا اظہار کیسے کریں کہ ہماری زبانوں سے ادا ہونے والا ذخیرۂ الفاظ بھی اس گستاخی کے ازالے کے لئے ناکافی ہے۔ بس آپ کے اخلاقِ کریمانہ ہی سے توقع ہے کہ ہم سراپا معصیت لوگ معاف کر دیئے جائیں گے۔''

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کچھ دیر تک ان نادم وشرمسار لوگوں کا واویلا سنتے رہے، پھر آپؒ نے ایک عجیب سے عالمِ جذب میں فرمایا۔ ''تم نادانوں کو زرنگار مسندوں پر بیٹھے ہوئے جن مشائخ وعلماء نے درویشوں کی دل آزاری پر اُکسایا ہے، ان سے کہہ دینا کہ سب خرقہ پوش یکساں نہیں ہوتے۔ اگر وہ بندگی کی راہ میں رسمِ جاں فروشی سے واقف نہیں تو دوسروں کو چشمِ حقارت سے بھی نہ دیکھیں اور اللہ کی زمین کو فتنوں سے اس قدر بھی نہ بھر دیں کہ راہ چلنے والے تنگ آ کر کفر وجہل کی طرف لوٹ جائیں۔ میں نے تمہیں معاف کیا اور ان دنیا پرستوں کو بھی جو دن رات میرے راستے میں کانٹے بچھاتے رہتے ہیں۔''

اس معافی کے بعد جب وہ شرپسند لوگ سیدؒ کی خانقاہ سے واپس لوٹے تو ان کے مُردہ ساتھی کی سانسیں بحال ہو چکی تھیں۔ ان لوگوں نے اسے اپنے ہمراہ لے جانا چاہا لیکن وہ ماہرِ حبسِ دم لوٹ کر دوبارہ اپنے گھر نہیں گیا۔ ایک بار سیدؒ کے آستانے پر سر رکھا اور اسی در کا غلام ہو کر رہ گیا۔

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی ذاتِ گرامی سے اس قدر کرامات ظاہر ہوئیں کہ اگر ان سب کا احاطہ کیا جائے تو ایک ضخیم دفتر درکار ہوگا۔ آپؒ کی زندگی کے اس پہلو سے قطع نظر سیدؒ ایک نہایت عالم وفاضل بزرگ تھے۔ جب بھی کسی موضوع پر گفتگو فرماتے تو سامعین کو یوں محسوس ہوتا جیسے علم کا سمندر موجزن ہے۔ جس میں اہلِ دنیا کا تمام مشاہدہ اور مطالعہ غرق ہو گیا ہے۔ مسلمان علماء کے علاوہ ہندو گیانی بھی آپؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے، بحث ومناظرہ کرتے مگر کوئی شخص بھی سیدؒ کے علم کی ہمہ گیری کو نہ پہنچ پاتا۔ روحانیت میں درجۂ کمال پر فائز ہونے کے باوجود حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ شریعت پر نہایت سختی سے کاربند رہتے تھے۔ آپؒ کا مشہور قول ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک مکمل انسان نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنے فعل، اعتقاد اور عمل میں شرع کا پابند نہ ہو۔

ملک الامراء محمود، سیدؒ سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ آخر کار وہ آپؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوا۔ اسی کے حکم پر ایک قصبہ ''روح آباد'' بسایا گیا تھا۔ روح آباد کو ہندوستان کے جدید جغرافیے کے مطابق ''کچھوچھہ'' کہتے ہیں۔ محمود ہی کی درخواست پر حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ مستقل طور پر اس علاقے میں تشریف لے گئے اور پھر آخری سانس تک یہیں قیام فرمارہے۔ سیدؒ کا طریقہ کار یہ تھا کہ مختلف شہروں کی سیاحت کرتے اور مقامی لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے۔

کچھوچھہ کو اپنی مستقل قیام گاہ بنانے کے بعد حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ پہلے آپؒ نے مدینہ منورہ پہنچ کر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضۂ اطہر پر حاضری دی اور نہایت رقت وعاجزی کے ساتھ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں درود وسلام پیش کیا۔ اس کے بعد نجف اشرف اور

کربلائے معلیٰ تشریف لے گئے۔ پھر آپؒ روم پہنچے اور وہاں کے نامور علماء سے ملاقاتیں کیں۔ ارضِ روم کو الوداع کہہ کر سیدؒ نے دمشق کا رخ کیا۔ وہاں آپؒ نے مشہور بزرگ حضرت فخر الدین عراقیؒ کی زیارت کی۔ مکہ معظمہ پہنچ کر حج بیت اللہ سے شرف یاب ہوئے۔ حج کے بعد حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ بغداد تشریف لے گئے۔ اس تاریخی شہر میں بھی آپؒ نے کئی بزرگانِ دین سے ملاقاتیں کیں۔ پھر کاشان ہوتے ہوئے اپنے آبائی وطن سمنان پہنچے اور اپنی ہمشیرہ اور چھوٹے بھائی سلطان محمد سے ملے۔ اس کے بعد مشہد تشریف لائے اور کچھ دن تک حضرت امام علی رضاؒ کے آستانے پر معتکف رہے۔ انہی دنوں امیر تیمور بھی حضرت امام علی رضاؒ کے مزارِ اقدس پر حاضر ہوا تھا۔ جب تیمور نے حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی خبر سنی تو وہ نہایت ذوق وشوق اور عقیدت کے ساتھ حاضر خدمت ہوا۔ پھر سیدؒ ہرات تشریف لے گئے اور ماوراء النہر پہنچ کر حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، کچھ دن قیام فرمایا اور حضرت شیخ سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے ترکستان چلے گئے۔ وہاں سے بخارا، قندھار اور کابل ہوتے ہوئے ملتان تشریف لائے۔ ملتان سے اجودھن (پاک پتن) پہنچے اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے آستانۂ عالیہ پر حاضری دی۔ پھر دہلی ہوتے ہوئے اجمیر شریف پہنچے۔ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی زندگی کا یہ عجیب لمحہ تھا۔ آج سیدؒ اس مردِ جلیل کی بارگاہ میں حاضری دینے جارہے تھے جو برصغیر کا شہنشاہ تھا۔ ایسا شہنشاہ جسے دنیا سے رخصت ہوئے پونے دوسو سال گزر چکے تھے مگر اہلِ ہند کے دلوں پر اس کی حکومت روزِ اوّل کی طرح قائم تھی۔ جب حضرت سلطان الہندؒ کے قصرِ معرفت کا گنبد نظر آیا تو سیدؒ کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور سرِ نیاز اس طرح خم ہو گیا جیسے کوئی وفادار غلام اپنے آقا کے روبرو حاضر ہو۔

اجمیر کے باشندے چشمِ حیرت سے آج ایک ایسے شخص کو دیکھ رہے تھے جس کی پیشانی سے ولایت کی تیز روشنی پھوٹ رہی تھی مگر وہ اس مردِ بزرگ کی ذاتِ گرامی سے ناآشنا تھے۔ انہیں قطعاً خبر نہیں تھی کہ آج سلسلۂ چشتیہ کا ایک جہانگیر اپنے سلطان کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوا ہے۔ جیسے جیسے سیدؒ آگے بڑھتے جاتے تھے، آپؒ پر سلطان الہندؒ کا رعب وجلال طاری ہوتا جارہا تھا۔ پھر تمام فاصلے ختم ہو گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ کے مجاہدین نے اجنبیوں کی طرح حضرت اشرف جہانگیرؒ کی طرف دیکھا۔ سیّد پائینِ مزار دست بستہ کھڑے ہوئے تھے۔ فرطِ ادب سے گردن جھک گئی تھی اور نظریں مزارِ اقدس کے فرش پر جم کر رہ گئی تھیں۔ بدن اس طرح کانپ رہا تھا کہ جیسے کوئی خشک پتا، تند وتیز ہواؤں کی زد پر ہو۔

پھر مجاورینِ مزار نے دیکھا، سیدؒ زاروقطار رو رہے تھے۔

''سلطان! میرے تیرے زندہ وتابندہ دربار کا ایک ادنیٰ خادم سیّد اشرف، جسے تیرے ہی واسطے سے جہانگیری عطا ہوئی۔ میں ارضِ ہند میں ایک غریب الدیار مسافر جو تیرے ہی حوالے سے پہچانا گیا۔ میں سمنان کا شہزادہ جو تیری غلامی پر اس طرح رضامند ہوا کہ اب کسی خلعت شاہی کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ یہاں تک کہ تیرے مرقدِ پاک کو چھو کر گزرنے والی ہوائیں مجھے خوشبوئے معرفت سے سرشار کر دیں۔ تیرے مینارِ عظمت سے شرف یاب ہو کر نیچے اُترنے والی دھوپ مجھے جلا ڈالے اور تیری گلیوں سے اُٹھنے والا مقدس غبار مجھے اس طرح چھپالے کہ میں اس جگہ منجمد ہو کر رہ جاؤں۔ پھر جب تیرے غلاموں کے قافلے ادھر آئیں اور تیرے در کے خدام سے پوچھیں کہ یہ کون ہے تو خاکِ اجمیر گواہی دے۔

''یہ ہے آفتابِ چشت کی ایک کرن، سیّد اشرف دریائے عشق کا ایک قطرہ جسے سوزِ نہاں نے پھونک دیا۔ سلطان الہندؒ کے نقشِ کفِ پا سے بھی کم تر والیٔ سمنان، خواجہ خواجگانؒ کے آستانۂ عالیہ کا ایک دامن چاک بھکاری،

معین الدین چشتیؒ کے غلاموں کا غلام، جہانگیر سمنانیؒ۔

سیّد اس طرح عرضِ حال کر رہے تھے کہ مجاورینِ درگاہ کی آنکھیں بھی نم ناک ہوگئیں۔ وہ روزانہ سینکڑوں سوختہ جانوں کو سلطان الہندؒ کے دربار میں حاضر ہوتے اور گریہ وزاری کرتے ہوئے دیکھتے تھے مگر ایسا وارفتہ شوق ان کی نظروں سے آج تک نہیں گزرا تھا۔

پھر اجمیر اور اس کے گرد و نواح میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ، سلطان الہندؒ کی زیارت کے لئے تشریف لائے ہیں۔ لوگ قطار در قطار اس مردِ بزرگ کی ایک جھلک دیکھنے کو مزار مبارک کے احاطے میں جمع ہو رہے تھے۔ پھر کسی نے آپؒ کی تعریف میں چند الفاظ کہے تو سیّدؒ نے اسے سختی سے روک دیا اور انتہائی ناگوار لہجے میں فرمایا۔

''یہ بے ادبی کی انتہا ہے کہ شہنشاہ کے دربار میں کسی غلام کے لئے ستائشی کلمات ادا کئے جائیں۔ میں تو اجمیر کے اس عام انسان سے بھی کم حیثیت ہوں جسے ہمہ وقت سلطان الہندؒ کی قربت حاصل ہے۔''

پھر کسی شخص نے اپنے لئے دعا کی درخواست کی تو حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے فرمایا۔ ''جو بیمار ہے، اس کے لئے خاکِ اجمیر ہی اکسیر ہے اور جو مفلس و حاجت مند ہے تو اس کی امیری کے لئے سلطان الہندؒ کی نسبت ہی کافی ہے۔ یہ بڑا تعلق ہے، بڑا رشتہ، بڑی سعادت ہے۔ اگر لوگ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔''

کچھ عرصہ اجمیر میں قیام کرنے کے بعد حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ دکن تشریف لے گئے۔ وہاں آپؒ نے مشہور بزرگ حضرت سیّد گیسو درازؒ سے ملاقات کی۔ گلبرگہ سے آپؒ سراندیپ پہنچے۔ پھر گجرات ہوتے ہوئے اپنی مستقل قیام گاہ ''کچھوچھ'' تشریف لے آئے۔

چند سال بعد حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے دوبارہ طویل سیاحت کی۔ اس مرتبہ بہت سے جزیروں اور جنگلوں سے گزرے۔ مختلف علاقوں میں قیام فرمایا اور کئی نامور اولیاء اللہ کی ملاقاتوں سے فیض یاب ہوئے۔ اسی سیاحت کے دوران آپؒ تیسری بار حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے ملے۔ پھر ارضِ بنگال پہنچے اور اپنے پیر و مرشد حضرت علاؤالدین چشتیؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضری دی۔ پھر کچھوچھ تشریف لائے اور باقی زندگی اسی مقام پر بسر کردی۔

اسی دوران آپؒ کی تعلیمات کا سلسلہ جاری رہا۔ گرد و نواح کے بے شمار انسان حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوتے اور اپنے ذہنوں کی تاریکیاں دُور کر کے چلے جاتے۔ کوئی زیادہ پُرجوش ہوتا تو سیّدؒ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ہمیشہ کے لئے غلامی کا طوق پہن لیتا۔ پھر کچھ دن بعد یہی غلامی اسے دل کی شہنشاہیت سے ہمکنار کردیتی۔

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ جب معرفت کے رموز و نکات بیان کرتے تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہنے لگتے۔ آپؒ دورانِ گفتگو بڑی عجیب عجیب تشبیہات استعمال فرماتے تھے۔ توحید کے بارے میں سیّدؒ کا قول تھا۔

''اللہ کو ایک جاننے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اس کی صفات میں فنا ہوجائے۔''

پھر فرمایا۔ ''جب ایک سالک صوفیہ کے عقائد و اصلاح سے واقف ہوگیا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ بیشتر وقت محفلِ توحید میں گزارے اور بگلے (ایک پرندہ) کے مانند بیٹھا رہے۔''

کسی مرید نے حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے پوچھا۔ ''بگلے کی طرح بیٹھنے سے کیا مراد ہے؟''

جواب میں سیّدؒ نے فرمایا۔ ''تلاش کے بغیر پانا اور مچھلی کو دیکھے بغیر اس بات کا یقیناً ہونا کہ وہ ضرور آئے گی۔''

ولایت کے بارے میں حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا خیال تھا: ''ولایت یہ ہے کہ بندہ فنا کے بعد بھی قائم رہے۔''

سیدؒ کے اس قول کی وضاحت یہ ہے کہ بیشتر صوفیائے کرام کو دنیا سے گزرے ہوئے سینکڑوں سال ہو چکے ہیں مگر آج بھی بے شمار بندگانِ خدا اُن کے مزاراتِ مقدسہ پر حاضر ہو کر ایصالِ ثواب کرتے ہیں اور اکثر مجالسِ علم میں ان کا ذکر اس طرح ہوتا ہے، جیسے وہ آج بھی زندہ ہیں۔

خدمتِ خلق کے بارے میں حضرت جہانگیر سمنانیؒ اس طرح اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

''بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ نوافل پڑھنا خدمتِ خلق سے بہتر ہے۔ اس سلسلے میں ان لوگوں کی سوچ غلط ہے۔ کیونکہ خدمتِ خلق کا اثر براہِ راست دل پر پڑتا ہے اور اللہ، بندے کے اس عمل سے بہت خوش ہوتا ہے۔ پھر جب ہم دونوں کے نتائج پر نظر کرتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدمتِ خلق، نفل نماز سے افضل ہے۔'' (سیدؒ کے ان فرمودات میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اگر فرض نماز کے وقت کوئی شخص قریب المرگ ہو اور دوا دینے سے اس کی زندگی بچ سکتی ہو تو فرض نماز بھی قضا کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح نفل نماز کسی مسلمان کے لئے اسی وقت جائز ہے جب اس پر بندگانِ خدا کا کوئی حق باقی نہ ہو۔ اگر شریعت کے قائم کردہ حقوق العباد کو پامال کرنے کے بعد کوئی اہلِ ایمان نفل نمازوں میں اپنا وقت گزارتا ہے تو وہ ایک صریح غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں ، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو ، خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے چند مشہور اقوال یہ ہیں:

''گروہِ صوفیاء کے لئے علمِ توحید کا جاننا ضروری ہے کیونکہ طریقت و حقیقت کا انحصار اسی علم پر ہے۔''

''اربابِ ذوق کے نزدیک اگر ایک سانس بھی نسبتِ خدا اور رسولِ کریم ﷺ سے خالی ہوتی ہے تو اہلِ دل سے اُسے مُردہ تصور کرتے ہیں۔''

''ولی کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ عالم ہو، جاہل نہ ہو۔ ولایت اور جہل میں کسی طرح بھی کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ ولایت کی ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ کسی کو چشمِ حقارت سے نہیں دیکھنا چاہئے کیونکہ ایسے لوگوں میں اللہ کے دوست بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔''

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ صرف عام انسانوں ہی کو نصیحت نہیں فرماتے تھے بلکہ آپؒ کا رُوئے سخن، حکمرانوں کی طرف بھی ہوتا ہے۔ جس بے باک لہجے میں سیدؒ، عوام الناس سے گفتگو کرتے تھے، اسی جرأتِ گفتار کے ساتھ شاہانِ وقت سے بھی مخاطب ہوتے تھے۔ آپؒ نے ابراہیم شاہ شرقی اور دیگر حکمرانوں کے لئے اس طرح ایک ہدایت نامہ تحریر فرمایا تھا:

''بادشاہ اپنے اوقات کو اس طرح ترتیب دیں کہ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد اشراق تک وظیفہ پڑھیں۔ پھر علماء اور صالحین کے ساتھ صحبت رکھیں اور چاشت کے وقت تک ان سے عدل و انصاف کے متعلق قرآنی آیات کا مفہوم پوچھیں۔ اسی جگہ وزیروں اور حکومت کے دیگر عاملوں کو طلب کریں۔ پھر یہ لوگ عوام الناس کے بارے میں جو معروضات پیش کریں، ان کا مناسب جواب دیں۔ ہر شخص کا مدعا پورا کریں۔ اس کے بعد دربارِ عام ہو جس میں رعایا اور مسلمانوں کے مقدمات پیش ہوں اور ان کے فیصلے شریعت و انصاف کے مطابق کئے جائیں۔ سلطنت

کے وزیر تمام علوم وفنون سے آراستہ ہونے کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ دین دار ہوں۔ وکالت کا منصب ایسے شخص کو دیں جو پسندیدہ اخلاق کا حامل، نہایت عقل مند اور حاضر جواب ہو۔ اس قسم کے ہر فرد کو کوئی نہ کوئی مناسب عہدہ ضرور دیں۔ ایک عہدیدار کے کام کے متعلق دوسرے شخص سے باز پرس نہ کریں۔ جس طرح ایک انسان اپنے ہر عضو کا محتاج ہے اور ہر ایک کے بغیر اس کے جسمانی نظام کو نقصان پہنچ جاتا ہے، اسی طرح ایک بادشاہ کو چاہیئے کہ تمام ارکانِ دولت کی صلاحیت اور سیرت کو اچھی طرح پرکھ کر ان کو ملک کے مختلف حصوں پر مقرر کرے اور انہیں مکمل اختیارات دے تاکہ وہ اپنے کاموں کو پوری آزادی کے ساتھ انجام دے سکیں۔ اس کے ساتھ ہی بادشاہ کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے اعمال کی حرکات وسکنات پر گہری نظر رکھے اور اس خبر گیری میں ذرّہ برابر بھی کوتاہی سے کام نہ لے۔''

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے تحریر کردہ ہدایت نامے کو پڑھ کر ایک عام انسان بھی اندازہ کرسکتا ہے کہ سیّدؒ نے اپنی زندگی غاروں، جنگلوں اور خانقاہ کے گوشے میں بیٹھ کر چلہ کشی کے سہارے نہیں گزاری تھی۔ اگر ایک طرف آپؒ روحانیت کے اعلیٰ مقامات سے واقف تھے تو دوسری جانب ملکی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اگر موجودہ سائنسی دور میں بھی حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی ہدایات پر عمل کیا جائے تو ایک صحت مند اور خوش حال معاشرہ تعمیر کیا جاسکتا ہے۔

وہ اسلامی سال کا پہلا مہینہ تھا۔ 20 محرم الحرام کو حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ پر حالتِ جذب طاری ہوگئی۔ کھانا بالکل ترک کردیا تھا۔ کسی مرید یا خادم سے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ بس ایک بے ہوشی کی حالت تھی، جس نے عالمِ ظاہری سے سیّدؒ کا رشتہ منقطع کردیا تھا۔ والیٔ سمنان کا اس سرزمین پر یہ آخری دن تھا۔ سیّد نے نمازِ فجر ادا کی۔ اس روز چہرۂ مبارک پر قدرے شادابی نظر آرہی تھی۔ مریدین وخدام بہت خوش تھے کہ پیر ومرشد کی صحت بحال ہو رہی ہے۔

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے سب کے سامنے سیّد عبدالرزاقؒ کو اپنا خلیفہ نامزد کیا اور بزرگانِ چشت کے تمام تبرکات ان کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ گواہ ہے کہ فقیر کو جو کچھ سرمایہ حاصل ہوا تھا، اسے میں نے تم لوگوں میں تقسیم کرنے کی پوری کوشش کی۔ میں نے کسی بھی لمحے تنگ نظری اور بخل سے کام نہیں لیا۔ اب یہ لوگوں کی قسمت ہے کہ کس نے کیا پایا؟ عبدالرزاق میرے بعد میرے علم کا امین ہے۔ اس کے ضعیف و ناتواں کاندھوں پر دیگر پیرانِ چشت کی امانتوں کا بارِ گراں بھی ہے۔ میں بارگاہِ ذوالجلال میں دست بہ دعا ہوں کہ اللہ، عبدالرزاق کو خارزارِ حیات میں استقامت بخشے اور سلسلۂ چشتیہ کو تم سب کے ذریعے فروغ دے۔ چند روزہ آسائش کی خاطر اپنے آپ کو شیطان کے حوالے نہ کردینا۔ جب کسی مرحلۂ آزمائش سے گزرتے ہوئے تمہارے قدم غیر متوازن ہوجائیں تو اپنے ذہنوں میں حضرت سلطان الہندؒ اور دیگر خواجگانِ چشت کی حیاتِ مبارکہ کے نقوش تازہ کرلینا کہ ان مردانِ جانباز نے کس طرح اپنے سرکش نفس سے انتقام لیا۔ جاؤ! تم پر ہمیشہ اللہ کی رحمت سایہ فگن رہے۔'' یہ کہہ کر حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ خاموش ہوگئے اور آپؒ نے آنکھیں بند کرلیں۔

تمام مریدین وخدام منتظر تھے کہ سیّدؒ دوبارہ ان سے مخاطب ہوں گے مگر وہ آخری فرصتِ کلام تھی۔ سانسوں کا شمار ختم ہوا اور 27 محرم 808ھ کو والیٔ سمنان نے قبائے مرگ پہن لی۔

سیّدؒ کو دنیا سے رخصت ہوئے چھ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن یو پی کی ایک چھوٹی سی بستی ''کچھوچھ'' کو برصغیر

پاک و ہند میں صرف اس لئے تاریخی حیثیت حاصل ہے کہ اس کی خاک میں ایک مردِ خدا، آسودۂ خواب ہے۔ گردشِ روز و شب نے کیسے کیسے ناموروں کو گمنام کر دیا مگر حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا مزارِ مبارک اب بھی اہلِ دل کا مرکزِ نظر ہے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان، کیا مفلس اور کیا اہلِ سرمایہ، کیا راندہ وقت اور کیا اہلِ اقتدار، وہ کون ہے جس کا سر، سیّدؒ کے آستانے پر خم نہیں؟ جب تک سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ زندہ رہے، اس وقت تک آپؒ کی ذات سے مسلسل کرامات کا اظہار ہوتا رہا اور جب آپؒ تہ خاک ہو گئے، تب بھی اس آگ کی سوزش کم نہ ہو سکی جو سیّد کے سینے میں روشن تھی۔

نہ جانے مادہ پرست اس روشن نشانی کی کیا توجیہہ پیش کریں گے جو مزارِ مبارک کے قریب واقع پانی کے ایک حوض میں نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ وہی حوض ہے جس میں سیّدؒ وضو کیا کرتے تھے پھر بعد میں کسی عقیدت مند نے اس حوض کا طول و عرض بڑھا کر اسے قیمتی پتھروں سے آراستہ کر دیا۔ موجودہ زمانے میں صورتِ حال یہ ہے کہ حوض کے اندر بہت سی بڑی بڑی مچھلیاں چھوڑ دی گئی ہیں۔ مچھلیوں کی موجودگی سے اصولی طور پر پانی کو کثیف اور غلیظ ہو جانا چاہئے تھا مگر حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس حوض کا پانی نہایت صاف و شفاف نظر آتا ہے۔ ایک مچھلی کے سارے تالاب کو گندا کر دینے کا مسلمہ اصول، سیّدؒ کے حوالے سے غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اللہ علیم و خبیر ہے کہ یہ کیا راز ہے۔ لیکن بظاہر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ حدِ ادب ہی ہے کہ جس نے مچھلیوں سے ان کا ایک مشہور فطری عمل چھین لیا ہے۔

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مزارِ مبارک سے یہ زندہ حقیقت بھی وابستہ ہے کہ آپؒ کی بارگاہِ جلال میں کوئی عورت حاضر نہیں ہو سکتی۔ سیّدؒ کا مزارِ اقدس بلندی پر واقع ہے۔ آپؒ کی آرام گاہ تک پہنچنے کے لئے زائرین کو طویل سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ ہندوستان کے دور دراز مقامات سے آنے والی خواتین زیادہ سے زیادہ آخری سیڑھی تک پہنچ پاتی ہیں۔ وہاں سے قبرِ مبارک کافی فاصلے پر ہے۔ دعا مانگنے والی عورتیں بس اسی حدِ ادب کے درمیان کھڑے ہو کر سیّدؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کرتی ہیں اور پھر اپنے گھروں کو واپس چلی جاتی ہیں۔ کہنے والے یہاں تک کہتے ہیں کہ جوان عورت تو کجا کوئی معصوم بچی بھی اس مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس بندش اور رکاوٹ کی اصل وجہ کیا ہے؟ یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر مشہور روایت ہے کہ جب بھی کسی عورت نے زیارت کے قائم کردہ اصول کو توڑنے کی کوشش کی، اُس کے اعصاب پر ایک نامعلوم دہشت طاری ہو گئی، یہاں تک کہ اسے ایک مخصوص دائرے سے نکل جانا پڑا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب پاک و ہند کے دیگر مقاماتِ مقدسہ پر خواتین حاضر ہو سکتی ہیں تو پھر حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مزارِ مبارک میں ایسی کیا خاص بات ہے جو عورتوں کو وہاں جانے سے روک دیتی ہے؟ کہنے والے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا روحانی درجہ کسی بھی حال میں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بڑھ کر نہیں۔ پھر جب حضرت خواجہؒ کی بارگاہِ عالیہ میں عورتوں کا گزر ممکن ہے تو پھر سیّدؒ کے مزار پر یہ خاص پابندی کیوں؟

یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس پر منطقی نقطۂ نظر سے کوئی بحث نہیں کی جا سکتی۔ قدرت کے بے شمار سربستہ راز ایسے ہیں کہ جن پر عام دنیا پرست کی نظر تو کجا، خود اہلِ اللہ کی نگاہ بھی نہیں پہنچ سکتی۔ مثال کے طور پر حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے حقیقی بھانجے اور سلسلۂ چشتیہ کے مشہور ترین بزرگ مخدوم علاؤالدین صابر کلیریؒ کے جلالِ روحانی کا یہ عالم تھا کہ حیاتِ مبارک میں صرف حضرت شمس الدین ترک پانی پتیؒ ہی حاضرِ خدمت ہو سکے۔ وہ بھی بڑی گریہ و زاری اور التجاؤں کے بعد۔ ظاہری جسم کے ساتھ یہ شرارِ عشق بجھ گیا مگر وصال کے بعد تقریباً تین سو سال

تک نواحِ کلیر میں ایک آگ سی بھڑکتی محسوس ہوتی تھی۔ صدیوں کی دُوری کے باوجود فضاؤں میں اتنی تپش باقی تھی کہ بڑے سے بڑا صاحبِ کمال بھی ادھر سے نہیں گزر سکتا تھا۔ پھر کہیں سینکڑوں سال بعد صورتِ جمال پیدا ہوئی۔ لیکن اب بھی یہ حال ہے کہ ایک گناہ گار شخص بھی درگاہِ مخدومؒ پر حاضری دیتے وقت لرز کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت سلطان الہندؒ کے خلیفۂ اکبر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزارِ اقدس پر حاضر ہونے کے بعد ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے گناہوں کی دھوپ میں جھلسے ہوئے انسانوں کی جانِ بے قرار پر معرفت کی شبنم برس رہی ہے۔ اگرچہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت مخدوم علاؤالدین صابر کلیریؒ ایک ہی خانوادۂ روحانی کے دو بزرگ ہیں لیکن ایک سراپا جمال ہے اور دوسرا مجسم جلال۔ یہی کیفیت حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے مزارِ مبارک کی ہے۔ آپؒ کے روبرو خواتین حاضر نہیں ہو سکتیں لیکن یہی جماعتِ نسواں دیگر بزرگانِ دین کے آستانوں کی زیارت سے شرف یاب ہو جاتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ قدرت کا ایک راز ہے۔ گناہ گار، عاجز انسانوں کے لئے نجات اور اطمینان کا یہی راستہ ہے کہ وہ زمین پر نازل ہونے والی قدرت کی نشانیوں کو بغور دیکھیں اور اپنے اللہ کی کبریائی بیان کریں کہ وہ کس قدر عظیم خلاّق ہے۔ جس طرح چاہتا ہے، اپنے حکم کا نفاذ کرتا ہے۔ کوئی اس کی مرضی میں دم نہیں مار سکتا۔ سب مجبور و بے کس ہیں اور سب بے دست و پا۔ آسمانوں میں، زمینوں میں، مکاں و لامکاں میں اسی کی حکومت ہے۔ ایسی حکومت کہ جس پر ایک لمحے کے لئے بھی عکسِ رواں نمایاں نہیں ہوتا۔

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی ایک اور زندہ کرامت مشہور ہے کہ اگر خللِ دماغ میں مبتلا ہو جانے والے افراد کو آپؒ کے مزارِ مبارک پر لے جایا جائے تو وہ بحکم خدا صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ ان مریضوں میں اکثر وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جنہیں ہندوستان کے بہترین ڈاکٹر لاعلاج قرار دے دیتے ہیں۔ ایسے مریضوں میں ہندو اور مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ خدا نے سیّدؒ کے مزار کو ہر مذہب و ملت کے ماننے والوں کے لئے ''رحمت کدہ'' بنا دیا ہے۔ یہ بات بھی انسانی عقل سے ماورا ہے کہ کسی ظاہری طریقۂ علاج اور دوا کے بغیر ایک پیچیدہ بیماری کس طرح دُور ہو جاتی ہے؟ انسانی ذہن کا فطری تجسس اور مادہ پرستوں کے دماغوں پر سائنسی ایجادات کی یلغار اُنہیں مسلسل اُکساتی رہتی ہے کہ وہ ان واقعات کی توجیہہ طلب کریں مگر اُنہیں تو طوفانِ نوح کی دلیل بھی مطمئن نہ کر سکی تھی۔ یہاں تک کہ وہ غرق آب ہو کر دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کا ایندھن بن گئے تھے۔ اور جو صاحبِ دل ہیں، اہلِ یقین ہیں، انہیں مولانا جلال الدین رومیؒ کا یہ شعر ہمیشہ طمانیت بخشتا رہے گا اور پھر ایک دن ان کے ناآسودہ جذبے قرار پا جائیں گے۔

ترجمہ: ''اللہ کی طرف سے اس کے دوستوں کو یہ قدرت بخشی گئی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس لا سکتے ہیں۔''

حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ بھی ان ہی مردانِ جلیل میں ایک نمایاں فرد تھے جو کمان سے چھوٹے ہوئے تیروں کو واپس لا سکتے ہیں۔ سیّدؒ نے ایک سو بیس سال کی عمر پائی۔ اگر ہم آپؒ کے اوائل عمری اور معرفت کے راستے میں طلب و جستجو کے پچاس سال کم کر دیں تو آپؒ نے تقریباً پون صدی تک اہلِ ہند کے دل و دماغ پر حکومت کی۔ سیّدؒ نے اللہ کے عشق میں چھوٹی سی ریاست چھوڑی مگر دینے والے نے اُنہیں اتنی بڑی سلطنت دی کہ اس میں سینکڑوں ''سمنان'' سما جائیں۔

❀❀❀

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ

آٹھ سو سال پہلے ہندوؤں کے مقدس شہر ہردوار میں رہنے والے ایک بوڑھے سنیاسی، گیان چند نے ایک خواب دیکھا۔ ہولناک اور اعصاب شکن خواب! وہ کئی دن پریشان رہا اور آخر اس نے مندر کے سب سے بڑے پجاری، پنڈت آتمارام سے جب اپنی اس ذہنی خلش کا ذکر کیا تو ہردوار کی تمام مذہبی شخصیات اس کا خواب سننے کے لئے مرکزی عبادت گاہ میں جمع ہوگئیں۔ گیان چند نے ڈرتے ڈرتے اپنا خواب بیان کرنا شروع کیا:

''تیز روشنی کا ایک ہیولا ہردوار کے مندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پجاریوں نے اسے دیکھ کر اپنی عبادت گاہ کے آہنی دروازے بند کر لئے مگر روشنی تمام امکانی رکاوٹوں سے گزر کر اندر آ گئی۔ پنڈت لرزتے جسموں کے ساتھ کوئی گوشۂ عافیت ڈھونڈ رہے تھے۔ پروہتوں (پجاریوں) کو کسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ مندر کے تمام نگہبان، اُجالے کی لکیر کو روکنے میں ہر طرح ناکام ہو گئے تھے۔ پھر بھی اُنہیں یقین تھا کہ دیوتاؤں کے جلال کے سامنے یہ روشنی بجھ جائے گی۔''

اتنا کہہ کر بوڑھا سنیاسی خاموش ہو گیا۔ اُس کا لاغر بدن کانپ رہا تھا اور آنکھوں میں خوف و دہشت کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' پنڈت آتمارام نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔ وہ گیان چند کی ظاہری حالت سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

''روشنی مسلسل آگے بڑھتی رہی۔'' الفاظ سنیاسی کے ہونٹوں کی قید سے بمشکل آزاد ہو رہے تھے۔ ''پھر ہمارے خداؤں نے اس روشنی کو سجدہ کر لیا۔'' گیان چند کی نحیف آواز اُبھری اور دوسرے ہی لمحے مندر کے طویل و عریض صحن میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گیان چند کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر اس سے گویائی کے تمام حقوق چھین لئے گئے۔

اعلیٰ نسل برہمنوں کی ایک جماعت نے اس بدشگونی کے جرم میں سنیاسی کی زبان کاٹ دی۔ گیان چند ہر بستی، ہر شہر میں اچھوت ٹھہرا۔ یہاں تک کہ کچھ دن بعد بھوکا پیاسا، بے زبان بوڑھا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ سنیاسی کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی نفرتوں کی آگ بجھ گئی اور اندھیرے کے تاجروں کو قرار آ گیا۔ بیشتر لوگوں کی رائے تھی کہ گیان چند کی لاش کو اس طرح جنگل میں پڑا رہنے دیا جائے تاکہ مردار خور پرندے اسے کھا جائیں یا پھر کوئی درندہ اس کے غلیظ جسم کو اپنی خوراک بنا لے۔ یہاں تک کہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور آئندہ کوئی شخص اس قسم کا شیطانی خواب نہ دیکھ سکے۔

اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ ہو چکا تھا مگر کچھ اعتدال پسند پجاریوں نے مذہبی رسموں کے مطابق گیان چند کے جسم کو نذرِ آتش کرنے کی تجویز پیش کی۔ ان کے خیال میں مرنے والا، بدترین مجرم ضرور تھا مگر بنیادی طور پر اچھوت نہیں تھا لہٰذا سنگ دلی کا یہ عمل دیکھ کر بعض لوگوں کے جذبات بھڑک سکتے تھے۔ غرض ایک طویل بحث کے بعد گیان چند کو جلانے کے لئے لکڑیوں کا ڈھیر جمع کیا گیا اور جب کچھ لوگ اس کی لاش اُٹھانے کے لئے جنگل پہنچے تو انہیں ایک بڑے سے پتھر پر کچھ لکھا ہوا نظر آیا۔ ایک بار پھر ہلچل سی مچ گئی۔ پنڈت آتمارام اور دوسرے معزز پجاری بھی گیان چند کی لاش کے قریب سمٹ آئے۔ وہ سب کے سب حیرت سے اس پتھر کی طرف دیکھ

رہے تھے، جس پر یہ عبارت تحریر تھی۔

''میں اپنا مکمل خواب بیان کرنا چاہتا تھا مگر لب کشائی کی مہلت ہی کب ملی؟ تم نے میری زبان کاٹ کر مجھے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ مگر تمہارے اس عمل سے روشنی کا سفر نہیں رک سکتا۔ میں نے خواب میں واضح طور پر دیکھا تھا کہ روشنی کا وہ ہیولا، ہردوار سے نکل کر دوسرے مندروں کی طرف بڑھا تھا اور پھر ہمارے بے شمار دیوتا اس کے آگے زمین بوس ہو گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اب میں چند گھنٹوں سے زیادہ کا مہمان نہیں ہوں۔ وقت میری مذہبی خدمات کا بہترین صلہ دے چکا ہے۔ میں تم سے اپنے خون کا حساب نہیں مانگتا لیکن اس خوف ناک روشنی کی حیثیت پر غور کرو، جو ہماری عبادت گاہوں کے نظام کو زیروزبر کر دینا چاہتی ہے۔''

عبارت یہاں ختم ہو گئی تھی۔ گیان چند نے اپنے خواب کا دوسرا حصہ پتھر پر رقم کر دیا تھا۔ پنڈت آتما رام اور دوسرے پجاریوں نے بوڑھے سنیاسی کے اکڑے ہوئے جسم کو دیکھا اور مرنے والے کے بارے میں مزید توہین آمیز کلمات کہے۔ مسلسل ضربوں سے پتھر کو ریزہ ریزہ کر دیا اور پھر گیان چند کی لاش کو معمولی لکڑیوں کی آگ میں جلا کر اس کی خاک، گنگا میں بہانے کے بجائے ہوا میں اُڑا دی۔ مذہبی اجارہ دار مطمئن تھے کہ ان کی پیش بندی نے اپنے دیوتاؤں کو تباہی سے بچا لیا تھا اور عوام بھی خوش تھے کہ اُنہیں فتنۂ عظیم سے نجات مل گئی تھی۔

اس اَلمناک واقعے کے چند سال بعد سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ایک مرید، امام ابوصالح محمدؒ نے اسلامی لشکر کے ہمراہ ہردوار کا رخ کیا۔ امام پیشے کے اعتبار سے خود بھی سپاہی تھے۔ اس وقت راجا کرن، ہردوار کا حکمران تھا جس کی سلطنت رڑکی، سہارن پور اور دوسرے قریبی اضلاع تک پھیلی ہوئی تھی۔ بالآخر ایک خوفناک جنگ ہوئی۔ ہندو سپاہی اپنی بقا کے لئے دلیری کے ساتھ لڑے مگر مسلمانوں نے انہیں شکست فاش دی۔ راجا کرن فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا۔ امام ابو صالح محمدؒ بھی شہید ہوئے۔ لیکن اس طرح کہ مسلمانوں کا پرچم، قلعے پر لہرا چکا تھا۔ اسلامی لشکر نے راجا کرن کے اقتدار کی بنیادیں تک کھود ڈالیں اور تاریخ کے سینے پر اپنی فتح کا نشان ثبت کرنے کے لئے حضرت امام ابو صالح محمدؒ کے جسم مبارک کو قلعہ معلّٰی میں دفن کیا۔ سطح زمین سے سینکڑوں فٹ بلند امام کا مزارِ مبارک آج بھی موجود ہے۔ ہر سال یہاں لاکھوں عقیدت مند حصولِ سعادت کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور روضۂ مبارک کے صحن میں کھڑے ہو کر نشیب کی جانب نظر ڈالتے ہیں جہاں اب بھی راجا کرن کے دور کے بعض کھنڈرات مرثیہ خواں دکھائی دیتے ہیں۔ گیان چند نے جو خواب دیکھا تھا، اس کی یہی تعبیر تھی۔

طویل عرصے تک یہاں مسلمانوں کی حکمرانی رہی۔ مگر جب ان کے ہاتھوں میں شمشیر وسناں کے بجائے چنگ ورباب آ گئے تو مشہور بزرگ، حضرت مخدوم علاؤالدین صابرؒ یہاں تشریف لائے۔ فرمانروا کے ساتھ وزیر وامیر بھی شراب وشباب میں غرق تھے۔ چند سال کی حکومت نے ان کے دلوں سے اسلامی جذبۂ غیرت کو چھین لیا تھا۔ جب حضرت مخدوم صابرؒ نے کلیر میں قیام فرمایا تو حکومت کے قریبی حلقوں کو یہ بات گراں گزری اور جیسے جیسے آپؒ کے فقیرانہ کلام میں شدت آتی گئی، مزاجِ شہر یار بھی برہم ہوتا چلا گیا۔ حضرت مخدومؒ انتہائی بے باکی سے طرزِ حکومت پر تنقید کرتے۔ سیاہ کاروں کو عذابِ الٰہی سے ڈراتے۔ مگر ان کے دلوں کی کجی، کوئی اثر قبول نہ کرتی۔ یہاں تک کہ وقتِ معلوم آ پہنچا۔ حاکم کلیر کے کہنے پر جمعہ کی نماز سے علاؤالدین صابرؒ کو نکال دیا گیا۔ مخدوم جامع مسجد سے باہر تشریف لے آئے۔ جلال جو اب تک پردۂ جمال میں تھا، بے نقاب ہو گیا۔ جیسے ہی امام سجدے میں گیا، حضرت مخدومؒ نے مسجد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''سارے انسان اپنی بندگی

کا اظہار کر رہے ہیں، پھر تُو سجدہ کیوں نہیں کرتی؟''

ابھی ان الفاظ کی گونج بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ پوری جامع مسجد منہدم ہو گئی۔ تمام سرکش و نافرمان، ملبے کے ڈھیر میں دفن ہو گئے۔ حضرت علاؤالدین صابرؒ اپنے حقیقی رنگ میں ظاہر ہو چکے تھے۔ اب انہیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ بس ایک کیفیتِ جذب تھی جو عقل و ہوش پر حکمراں تھی:

تھا ضبط بہت مشکل ، اب سیل معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے ، اسرارِ کتاب آخر

شعلۂ ذات بھڑکا اور پھر چاروں طرف آگ ہی آگ پھیل گئی۔ کلیر کا پورا قصبہ اور گرد و نواح کے تمام علاقے اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ یہ اس فقیر کے جلال کی آگ تھی، جس نے اپنی بیوی کا چہرہ دیکھنے سے پہلے کہا تھا: ''جب میں ایک کا ہو چکا تو پھر درمیان میں یہ دوسرا کون ہے؟'' اس جملے کے ادا ہوتے ہی وہ پاکباز شریکِ حیات جل کر خاکستر ہو گئی اور پھر درمیان میں کوئی دوسرا موجود نہیں رہا۔ اب وہی آگ گمراہوں کی بستی میں بھڑکی تھی، لہٰذا یہاں بھی کوئی شے درمیان میں حائل نہ رہی۔ دُور دُور تک سناٹا تھا اور وہ مردِ حق یہی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے قریب نہ آئے۔

بڑے بڑے قطب اس کے سائے کی تمنا کرتے تھے، بڑے بڑے اولیاء کو اس کی قربت کی خواہش تھی۔ مگر وہ ایک سے ملنے کے بعد کسی دوسرے سے ملنے کا آرزومند نہیں تھا۔ لوگ شوقِ دید میں حدودِ ادب سے گزر جاتے اور اس کے نشاط و غم میں شریک ہونے کی کوشش کرتے۔ یہ سب کچھ اسے گوارا نہیں تھا، اسی لئے مخدومؒ نے اپنے چاروں طرف آگ کا حصار کھینچ لیا تھا۔ اگر کوئی طالبِ دیدار اس کی مملکت میں داخل ہونے کی گستاخی کرتا تو وہی برقِ جلال اپنی پوری توانائیوں سے چمکتی اور مسافرِ عشق کو دہشت زدہ کر کے اسے لوٹ جانے پر مجبور کر دیتی۔ کبھی کبھی کلیر اور ہردوار کے جنگلی درندے قدم بوسی کو حاضر ہوتے اور چپ چاپ واپس چلے جاتے۔ صدیوں سے یہی عمل جاری تھا۔

آج ایک اور عاشق کے دل میں درد نے کروٹ لی۔ وہ جاں سوختہ، ضلع سہارن پور میں کئی سال سے مقیم تھا۔ (سہارن پور مشرقی پنجاب اور یو پی کا سرحدی شہر ہے، سہارن پور کی تحصیل رڑکی ہے اور رڑکی کا ایک چھوٹا سا قصبہ کلیر ہے، اسی قصبے میں حضرت مخدوم علاؤالدین صابرؒ کا مزارِ اقدس ہے۔ آج بھی اس قصبے میں ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ مگر 600ھ میں یہاں جلالِ صابر کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہزاروں اولیاء سلسلۂ چشتیہ کے اس عظیم بزرگ کے روضۂ مبارک پر حاضری دینے کی تمنا اپنے دل میں لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے) مخدومؒ کے انتقال کے تین سو سال بعد تک یہی اس نگری کی ریت تھی۔ طالبانِ شوق کا جو قافلہ بھی ادھر سے گزرا، اسے برقِ جلال نے پھونک ڈالا۔ مسافرانِ عشق نے ہر زمانے میں اس راستے پر چلنے کی کوشش کی مگر ان کا سفر ضلع سہارن پور میں آ کر ختم ہو جاتا۔ اس سے آگے جانے کی کسی میں جرأت نہ ہوتی۔ مگر اچانک کوچۂ عشق میں ایک سرفروش جا نکلا۔ اُسے بھی دیدارِ مخدومؒ کی تمنا تھی۔

اس سرفروش کے بے شمار عقیدت مند تھے۔ جیسے ہی انہیں اپنے رہنما کی اس خواہش کا علم ہوا، وہ سب کے سب اُداس ہو گئے۔ ساری دنیا کو علم تھا کہ اس سفر میں آج تک کسی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔

تھک تھک کے ہر مقام پر دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

یقیناً ان کا شیخ بھی تھک کر کسی جگہ بیٹھ جاتا اور اس کے دامن پر بھی وہی نامرادی کا داغ اُبھر آتا جواب تک بے شمار انسانوں کا مقدر بنتا رہا ہے۔ کسی میں حضورِ شیخ، لب کشائی کی جرأت نہ تھی۔ آخر ایک مرید جسے وہ سرفروش بہت چاہتا تھا، اپنی جگہ ادب سے کھڑا ہوا اور دست بستہ عرض کرنے لگا۔

''غلاموں کی یہ مجال نہیں کہ اقلیم معرفت کے شہنشاہ کو مشورہ دے سکیں۔'' مرید کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''بے جھجک ہو کر کہو۔'' سرفروش نے مسکراتے ہوئے اپنے خادم کی ہمت بندھائی۔ ''ادب و احترام اچھی چیز ہے، مگر یاد رکھو! اس راستے میں سب فقیر ہیں۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے، کہہ ڈالو۔''

مرید کو اجازت مل چکی تھی مگر پھر بھی وہ ڈرتے ڈرتے کہہ رہا تھا۔ ''مخدوم کو یہ گوارا ہی نہیں کہ کوئی ان کی قدم بوسی کو حاضر ہو۔''

''حضرت شمس الدین ترکؒ بھی تو ان کی زندگی میں حاضر ہوئے تھے۔'' سرفروش نے انتہائی نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''ترکؒ کو مخدومؒ نے اپنا بیٹا بنایا تھا۔ میں فرزندی کے لائق تو نہیں مگر اس در پر گداگری ضرور کروں گا۔ شاید سلطان الاولیاءؒ مجھ گناہگار کو غلامی کا شرف بخش دیں۔''

بے شک شمس الدین ترکؒ کو بارگاہِ مخدوم میں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا مگر وہ آخری انسان تھے۔ پھر اس کے بعد شاہ نے اپنا دروازہ بند کر لیا۔ مرید کی آواز سے گہری اُداسی جھلک رہی تھی۔ ''اب تک جانے کتنے حاجت منداس دروازے پر دستک دے چکے ہیں، کوئی جواب نہیں آتا، کوئی صدا نہیں اُبھرتی۔''

سرفروش نے مرید کے چہرے کو غور سے دیکھا، پھر وہی تبسم ہونٹوں پر نظر آیا جو اس کی عادت بن چکا تھا۔ ''دروازہ کھلے گا میرے عزیز بچے! یقیناً دروازہ کھلے گا۔ ہم اس کوہِ طور کی سیر کو ضرور جائیں گے۔ کیا ضروری ہے کہ سب کو ایک سا جواب ملے۔''

مرید بہت مایوس ہو چکا تھا۔ مگر وہ بے اختیار آگے بڑھا اور سرفروش کے قدموں سے لپٹ گیا۔

''یہ گفتگو تو بہانہ تھی کہ شاید حضور، غلاموں کا دل رکھنے کے لئے ان کی بات مان لیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم آپ کی محبت کے سائے سے دُور نہیں رہ سکتے۔''

میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' سرفروش نے اسے تسلی دیتے ہوئے دوسرے مریدوں کی طرف دیکھا۔ ہر چہرہ سوگوار تھا اور ہر آنکھ اشکبار۔

''اگر آپ اس راہ سے گم ہو گئے تو ہم بھی لاوارث ہو جائیں گے۔'' مرید بچوں کی طرح رو پڑا۔

''خدا تمہارا نگہبان ہے۔'' سرفروش اس وارفتہ شوق کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔

''تو پھر ہمیں بھی اس سفر میں اپنے ساتھ لے چلئے۔'' آخر مرید کی حسرتِ ناکام، زبان تک آ ہی گئی۔

''دیوانے ہو گئے ہو؟'' سرفروش پہلی بار غصے سے بھڑک اُٹھا تھا۔ ''جس راہ پر چلتے ہوئے تمہارے پیر و مرشد کے قدم کانپ رہے ہیں، تم اس راستے پر آگے بڑھنے کی طاقت رکھتے ہو؟ یہ کیسا جنون ہے؟ یہ کیسی گستاخی ہے؟'' سرفروش کی حالتِ غضب دیکھ کر خانقاہ کے در و دیوار پر سکوتِ مرگ سا چھا گیا اور مریدوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ ''مجھے جانا ہی ہو گا۔ تم کیسے خودغرض ہو کہ اپنے سکونِ دل کی خاطر دوسروں کی بے قراری نہیں دیکھتے۔ مخلوقِ خدا کب سے مخدومؒ کے آستانے پر حاضری کے لئے ترس رہی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ میں اس منزل کی طلب میں ہلاک ہو جاؤں گا؟ ہاں، ہلاکت ہی سعادت ہے۔ خاک ہی پاک ہے۔ اگر اس شعلۂ عشق نے مجھے جلا ڈالا اور میں غبار ہو کر فضاؤں میں بکھر گیا تو تم پہلے سے زیادہ محترم ہو جاؤ گے کہ تمہارے پیر کو سوختہ جانوں سے نسبت ہو گی۔''

فیصلہ ہو چکا تھا..... مریدوں کی گریہ وزاری بھی اسے تبدیل نہ کر سکی۔ آخر وقتِ رخصت آ پہنچا۔ مریدوں کی طویل قطار حسرت و یاس کی تصویر بنی خانقاہ کے پاس کھڑی تھی اور سرفروش کے مضطرب قدم کلیر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

سہارن پور سے نکلتے ہی آتشِ جلال کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ اگرچہ ابھی منزل بہت دور تھی لیکن فرطِ ادب سے سرفروش کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ تسبیح و درود پڑھنے لگا۔ رڑکی تک پہنچتے پہنچتے اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ یہاں کچھ دیر ٹھہر کر اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن سب کچھ بے سود تھا۔ وہ آگ جو براہِ راست دل کو جلائے دیتی تھی، اسے کون بجھاتا؟ یہ تو داستانِ شوق کی تمہید تھی۔ فسانۂ عشق ابھی کہاں شروع ہوا تھا۔ سرفروش نے تسبیح و درود میں اضافہ کر دیا۔ اب وہ بلند آواز میں آیاتِ قرآنی کی تلاوت کر رہا تھا۔ بارگاہِ خیر الانام صلی اللہ لیہ وآلہٖ وسلم میں درود وسلام بھیج رہا تھا کہ ہر درد کی یہی دوا ہے، ہر سوزش کا یہی علاج ہے۔

وہ کلیر کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ شعلۂ حُسنِ ازل نے دل و جان سے گزر کر روح تک کو جلا ڈالا۔ سرفروش اپنے رب کی پناہ مانگنے لگا۔

آتشِ دوزخ میں وہ گرمی کہاں
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے!

ایک تو آتشِ جلال، دوسری آتشِ فراق! آگ میں آگ مل گئی تھی اور کائناتِ خاکی نے کرۂ آتشی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ امتحان کے آخری لمحات آ پہنچے تھے۔ سرفروش نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے تھے اور اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری تھا۔ برقِ جلال پوری شدت سے چمکی۔

''آقا! میں گدائے بے نوا، دربارِ ولایت کا ادنیٰ ترین غلام، اس طرح خالی ہاتھ نہ جاؤں گا۔ اگر بارگاہِ عالیہ میں حاضری کی اجازت نہ ملی تو یہ زندگی فضول ہے۔ مجھے بھی پھونک دیجئے کہ آپ سے دُور رہ کر یہ سر، کاندھوں پر بوجھ ہے آج یہ بارِ گراں اُترے گا یا میں بھی کلیر کی فضاؤں میں خاک بن کر بکھر جاؤں گا۔'' فریاد کی لے اتنی تیز اور لہجہ اس قدر سوزناک تھا کہ برقِ جلال چند لمحوں کے لئے تھم سی گئی۔

''کیا چاہتا ہے؟'' بجلی کی کڑک ہوئی اور ہر شے لرز کر رہ گئی

سرفروش کے ہاتھ اور دراز ہو گئے۔ اُس نے بارگاہِ جلال میں حاضری کی اجازت چاہی۔ اس کے لہجے میں فراوانیٔ شوق، مانندِ بحرِ ذخار تھی۔

تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اِک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دُور

گداگر نے ان لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا مگر جواب میں گہری خاموشی مسلط تھی۔ ''آقا! بس اب شانِ جمالی میں ظاہر ہو جائیے۔ صدیوں سے مخلوقِ خدا، قدم بوسی کے لئے ترس رہی ہے۔''

سرفروش نے خاموشی پا کر ایک بار پھر گریہ وزاری شروع کر دی تھی۔ ''اے سلطانِ معرفت! بارگاہِ مقدس کی بے مثال روشنی! اے مسیحائے وقت! بیماروں پر محبت کی ایک نظر۔ خواجہ خواجگاںؒ کی نسبت کا صدقہ، بابا فریدؒ کے رشتوں کی بھیک۔'' سرفروش شدتِ جذبات میں رو پڑا۔

ابھی فریادی کی صدائے بازگشت باقی تھی کہ آتشِ جلال آخری بار بھڑکی اور پھر کلیر کی فضا پُرسکون ہو گئی۔ خواجہ غریب نوازؒ اور بابا فریدؒ کا واسطہ کام آ گیا تھا۔ سرفروش دیوانہ وار زمین کلیر پر سجدہ ریز ہو گیا۔ وہ اپنے خالق کی حمد و

ثناء کر رہا تھا:

''یہ تیرا کرم ہے کہ جن حدود میں بڑے سے بڑے قطب کا گزر نہیں ہو سکا، وہاں تُو نے اس فقیرِ بے نوا کو پہنچا دیا۔ جو کچھ ہے، وہ تیری طرف سے ہے اور جو کچھ ہو گا، تیری طرف سے ہو گا۔'' اس کے بعد سرفروش نے نمازِ عشق ادا کی اور دست بستہ دیارِ مخدومؒ میں داخل ہو گیا۔

سرفروش کو شرفِ باریابی حاصل ہو گیا تھا مگر اب ایک دوسری مشکل درپیش تھی کہ وہ اس گھنے جنگل میں کدھر جائے؟ ہر طرف گھاس، جنگلی بیلیں اور سرکش درخت اس طرح پھیلے ہوئے تھے کہ کوئی گوشۂ زمین خالی نظر نہ آتا تھا۔ آبادی تو کجا، انسانی گزرگاہ کی دھندلی سی علامت تک نہ تھی۔ سرفروش نے ماضی کے بزرگوں سے روایت سنی تھی کہ مخدومؒ کے مرید حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ، شیخ کے انتقال کے وقت کلیر میں موجود تھے اور انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے قبرِ مبارک تعمیر کی تھی، لیکن آج مخدومؒ کی آخری آرام گاہ کا نشان تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ سرفروش کے بے قرار ذہن میں کئی سوال اُبھرے اور ڈوب گئے۔ وہ منزل کے قریب پہنچ کر بھی حیران کھڑا تھا۔ بے شمار خاردار جھاڑیوں سے گزرا، کئی بار نحیف جسم کو لہولہان کیا، مگر مخدومؒ کے مزار کو تلاش نہ کر سکا۔ حجاب اندر حجاب! ایک پردہ درمیان سے اُٹھا تو دوسرا حائل ہو گیا۔ کئی ماہ تک وہ اس مردِ گوشہ نشیں کی مملکت میں بھٹکتا رہا جس نے مادی دنیا سے تمام رشتے توڑ لئے تھے۔ خودرو درختوں کے پھل کھا کر اور گنگا کا سرد پانی پی کر سرفروش نے وقت گزارا۔ قدم قدم پر جنگلی درندے نظر آتے اور کچھ کہے بغیر تاریک جھاڑیوں میں روپوش ہو جاتے۔ شاید انہیں اس حقیقت کا علم تھا کہ وہ کس عظیم الشان ہستی کا مہمان ہے۔ کئی مرتبہ اس نے وحشی درندوں سے بھی اپنے میزبان کا پتہ پوچھنا چاہا مگر وہ ہر بار خاموشی سے سر جھکا کر گزر گئے۔ سرفروش چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ بالآخر اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ ایک درخت کے نیچے گر کر فریاد کرنے لگا۔

''سیّدی! اس سے بہتر تھا کہ آتشِ جلال مجھے راکھ کر دیتی اور پھر میں کلیر کے سرسبز و شاداب پیڑوں پر جم جاتا۔ میری خاک تیرے دیار کا طواف کرنے والے غبار میں مل جاتی۔ مگر اب کہاں جاؤں؟ قریب آ کر بھی راندۂ درگاہ ٹھہرا۔ قافلۂ شوق کے سالار! میری رہنمائی کر۔''

کرم کرم کہ غریب الدیار ہے اقبال

سرفروش آدھی رات تک گریہ وزاری کرتا رہا اور پھر کسی بچے کے مانند روتے روتے سو گیا۔

اس نے خواب میں ایک مردِ بزرگ کو دیکھا۔ انتہائی جاہ و جلال کے باعث چہرے کے نقش و نگار پر تو نظر نہ جم سکی مگر بزرگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''اے بے قرارِ عشق! میرے قریب آ کہ میں یہاں محوِ خواب ہوں۔'' خواب بہت مختصر تھا۔ چند لمحوں بعد ہی اس سوختہ جاں کی آنکھ کھل گئی۔ سحر قریب تھی۔ وہ تیزی سے اُٹھا، دریا پر جا کر وضو کیا اور پھر نمازِ فجر ادا کی۔ صبح کی عبادت سے فارغ ہو کر وہ اپنے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے لگا۔ کئی گھنٹے کی جستجو انجام کار اسے منزل تک لے گئی۔ سرفروش اب ایک ایسی جگہ کھڑا تھا جو اسے جانی پہچانی محسوس ہوئی تھی۔ پھر اچانک اسے بزرگ کے الفاظ یاد آئے۔ ''میرے قریب آ، میں یہاں محوِ خواب ہوں۔'' ان الفاظ کی بازگشت کے ساتھ ہی اس کا ذہن روشن ہو گیا۔ یہی مقام اسے خواب میں دکھایا گیا تھا۔ سرفروش کو اپنی بینائی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بہت دیر تک اس نے اپنی یادداشت کو تازہ کیا، خواب کے ایک ایک عکس کو اُبھارا، پھر اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین آ گیا۔ وہ مخدومؒ کے حضور پہنچ چکا تھا۔ اس نے احتیاط کے پیشِ نظر کچی زمین پر لکڑی سے ایک دائرہ کھینچا کہ کہیں دوبارہ یہ مقامِ مقدس

آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

اب کلیر کے گھنے جنگل میں تسبیح درود اور عبادت و ریاضت کا ایک طویل دور شروع ہو چکا تھا۔ اس نے مسلسل مراقبے کئے، پیہم دعائیں مانگیں۔ مخدوم دوبارہ خواب میں تشریف لائے۔ "ہاں! میں یہیں محو خواب ہوں۔" اس کے بعد سرفروش کا یقین مکمل ہو گیا۔ پھر آسمان کی آنکھ نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک کمزور سا شخص اپنے کاندھوں پر مٹی اُٹھا کر لا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ مٹی کا یہ ڈھیر ایک قبر میں تبدیل ہو گیا۔ شمس الدین ترک پانی پتیؒ کے بعد یہ دوسرا انسان تھا جسے آفتابِ چشتیہ کے مرقد کی تعمیر کا شرف حاصل ہوا تھا۔ "تمام تعریفیں خدائے بزرگ و برتر کے لئے ہیں جو اپنے عاجز و حقیر بندوں کی فریاد سنتا ہے اور انہیں معرکہ حیات میں سربلند کرتا ہے۔" اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد اس نے قبرِ مخدومؒ کی طرف اشک آلود نگاہوں سے دیکھا اور دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھا دیئے۔

"خدا آپ پر بے شمار رحمتیں نازل کرے کہ آپ کے تعلق سے سیاہ کار بھی پارسا ٹھہرے۔" یہ کہہ کر سرفروش اپنے مسکن کی طرف لوٹ گیا۔

کلیر سے رخصت ہوتے وقت اس کے ہونٹوں پر ایک نعرۂ جذب و کیف تھا جس سے فضائیں گونج رہی تھیں۔

"اے رہ نوردانِ دشتِ شوق! آؤ کہ درِ رحمت کھل گیا۔ تشنہ لبانِ وقت! دیکھو کہ ابرِ کرم برس رہا ہے۔"

وہ دن ہندوستان کی روحانی تاریخ کا یادگار دن تھا، جب مخدوم علاؤالدین صابرؒ کی آتشِ جلال سرد ہوئی اور عام لوگوں کو ایک مردِ قلندر کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا اجازت نامہ ملا۔ یہ اس سوختۂ جاں کے بے قرار جذبوں کی کرشمہ سازی تھی جو سر بکف کوچۂ عشق میں جا نکلا تھا۔ یہ سرفروش مشہور بزرگ، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ تھے جنہیں روضۂ مخدوم صابر کلیریؒ کی تعمیر کا شرف حاصل ہے اور اہلِ دل کے نزدیک یہی ان کی سب سے بڑی کرامت ہے۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کا شمار دنیا کے ان خوش نصیب انسانوں میں ہوتا ہے، جنہیں بیک وقت کئی شرف حاصل تھے۔ اگر ایک طرف آپ حضرت مخدومؒ کی نسبت سے پہچانے جاتے ہیں تو دوسری طرف آپؒ کا سلسلۂ نسب حضرت امام ابوحنیفہؒ سے جا ملتا ہے۔ ماضی بھی درخشاں اور حال و مستقبل بھی روشن! آپؒ کے مورثِ اعلیٰ شیخ نظام الدین، عراق سے ترکِ سکونت کر کے غزنی میں آباد ہو گئے تھے۔ یہاں پُرسکون حالات میں درس و تدریس کا مشغلہ جاری تھا کہ گردشِ وقت نے سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ یہ مسلمانوں کی سرکشی و نافرمانی کی سزا تھی یا پردۂ غیب سے کوئی آزمائش کہ چنگیز خان کا پوتا ہلاکو خان، عالم اسلام پر قہر بن کر نازل ہوا۔ قتل و غارت کا وہ بازار گرم ہوا کہ انسانیت اپنے نام سے شرمانے لگی۔ جبر و تشدد کی وہ آندھیاں چلیں کہ علم و فضل کے بڑے بڑے سورج بجھ گئے۔ اگرچہ فتنۂ تاتار میں شیخ نظام الدین اور ان کا خاندان کسی مصیبت سے دوچار نہیں ہوا تھا لیکن ہر شخص اپنی جگہ سہما ہوا تھا۔ بظاہر کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سیلابِ بلا کس کے گھر جائے گا۔ آخر ایک دن شیخ نظام الدین کو یہ الم ناک خبر ملی کہ مشہور بزرگ حضرت فرید الدین عطارؒ بھی شہید کر دیئے گئے۔ اس واقعے سے خاص و عام کے چہرے اُتر گئے۔ شیخ نظام الدین بھی بڑھتے ہوئے خطرات کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اب وہ اس قدر دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ انہیں غزنی میں مزید قیام مشکل نظر آتا تھا۔ مجبوراً علاؤالدین خلجی کے عہدِ حکومت میں دہلی چلے آئے۔ یہاں اس خاندان کو عزت و سکون بھی حاصل ہوا اور اس کے مراتب میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ چند سلسلوں کے بعد شیخ صفی الدین حنفیؒ پیدا ہوئے۔ آپؒ نے جوانی کی منزل تک دہلی میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور پھر قصبہ ردولی (ضلع بارہ بنکی) میں سکونت اختیار کر لی۔ شیخ صفی الدینؒ علم

ظاہری کی تکمیل کر چکے تھے مگر آپؒ کی روحانی تشنگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شیخ کو برسوں سے کسی مرشدِ کامل کی تلاش تھی۔ خوش قسمتی سے کچھ عرصے بعد جیسے ہی شیخ نے حضرت سمنانیؒ کی آمد کی خبر سنی، بے قرار ہو گئے۔ دو چار دن اس تذبذب میں رہے کہ شاید اشرف جہانگیرؒ اُنہیں اپنے حلقۂ ارادت مندی میں شامل نہ کریں۔ لیکن پھر اسی خیال سے کچھوچھ روانہ ہو گئے کہ کم سے کم ایک مردِ خدا کے دیدار ہی سے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھالیں گے۔

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی مجلسِ روحانی آراستہ تھی۔ مریدوں کے علاوہ سینکڑوں عقیدت مند گردنیں خم کئے ہوئے ایک عارف کی خانقاہ میں بیٹھے تھے۔ شیخ صفی الدین نے بصد عجز و انکسار خادم سے اندر جانے کی اجازت طلب کی۔ اور جب آپؒ درس گاہِ اشرفیہ میں لرزتے قدموں سے داخل ہوئے تو عجیب کیف آور نظارہ تھا۔ شیخ مبہوت ہو کر رہ گئے۔ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کسی خاص موضوع پر تقریر فرما رہے تھے۔ چند لمحوں بعد اُس مردِ کامل کی نظر شیخ صفی الدین پر پڑی جو محفل کے آخری گوشے میں بیٹھنے کے لئے جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔

''میرا مرید صفی الدین آ گیا۔'' اچانک خانقاہ میں حضرت سمنانیؒ کی آواز گونجی۔ تمام لوگ شیخ کی طرف دیکھنے لگے۔ خود اُن کی یہ حالت تھی کہ حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی زبانِ مبارک سے اپنا نام سن کر حیران رہ گئے تھے۔ پہلی ملاقات میں اس طرح دل کا حال جان لینا یقیناً درویشِ خدا کی بڑی کرامت تھی۔ ''اے طالبِ شوق! اِدھر آ۔ تیری جگہ میرے قریب ہے۔'' حضرت سمنانیؒ نے دوبارہ ارشاد فرمایا۔ اس حکم کے بعد شیخ کو یقین آ گیا کہ ان کی نذرِ عقیدت قبول کر لی گئی ہے۔ کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ آگے بڑھے اور پھر حضرت اشرف جہانگیر کے قدموں سے لپٹ گئے۔

''اے شہنشاہ! یہ غلام اس سرفرازی کے لائق نہ تھا۔'' شیخ صفی الدین رقت آمیز لہجے میں اپنے دل کا درد بیان کر رہے تھے۔

''نہیں صفی الدین! تم امامِ اعظم کے خاندان میں سے ہو۔'' حضرت سمنانیؒ نے شیخ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

''سیّدی! وہ بھی آپ کے در کے خادم تھے۔'' صفی الدین کے لفظوں کا گداز کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور انہیں اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ کچھ دیر بعد ظاہری رسمِ بیعت ادا کی گئی۔ جب شیخ اپنے مرید کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کر چکے تو حضرت سمنانیؒ نے اُن کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

''اللہ! صفی الدین اور اس کی اولاد پر اپنے فضل و کرم کی بارش فرما۔'' عجیب نشاط انگیز لمحات تھے۔ حاضرین کو شیخ صفی الدین کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ اس عظیم الشان روحانی کامیابی کے بعد وہ کافی دن تک حضرت سمنانیؒ کی خدمت میں حاضر رہے اور بے شمار برکات حاصل کیں۔ شیخ ایک دن حسبِ معمول خانقاہ میں گئے۔ آپ کو دیکھتے ہی حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے حالتِ جذب میں فرمایا۔

''صفی الدین! میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، خدا اسے اپنے فضل سے عملی شکل عطا فرما دے۔'' پیر و مرشد کے الہامی کلمات سن کر شیخ کی طرح دوسرے مرید بھی حیران ہو رہے تھے۔ ''میری آنکھیں تجھ پر دولتِ آسمانی کا نزول دیکھ رہی ہیں۔'' حضرت سمنانیؒ نے کسی قدر توقف کے بعد فرمایا۔ شیخ صفی الدین دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

''سیّدی ہی بہتر جانتے ہیں۔'' فرطِ ادب سے شیخ کی گردن کچھ اور جھک گئی تھی۔ ''خدا تجھے عنقریب ایک ایسا فرزند عطا کرے گا جو اپنے وقت کا قطبِ عالم ہوگا۔'' آخر حضرت سمنانیؒ نے قدرت کا ایک راز منکشف فرما دیا۔

''صفی الدین! بارشِ کرم سے پہلے اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کر۔ آدھی رات کے سناٹے میں اُسے پکار

اور گریۂ نیم شبی اختیار کر۔ وہ بے نیاز ہے مگر پھر بھی سب کی سنتا ہے۔ تیری بھی سنے گا۔ اور وہ نہیں سنے گا تو کون سنے گا؟'' یہ کہہ کر حضرت سمنانیؒ خاموش ہو گئے۔ مرشد کی دعاؤں کے بعد شیخ کو ایک نا قابلِ بیان خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ مگر صفی الدین اس دولت سے سرفراز نہیں ہوئے جس کی طرف حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اشارہ کیا تھا۔ شیخ کبھی کبھی بہت اُداس ہو جاتے۔ مگر پھر اُنہیں پیر و مرشد کے ارشادِ گرامی کا خیال آتا اور فوراً توبہ استغفار کرتے۔ گردشِ ماہ و سال کچھ اور تیز ہو گئی۔ لیکن ابھی فرزند کی آمد کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ایک دن بے اختیار ہو کر حضرت سمنانیؒ سے اپنی اس محرومی کا ذکر کیا تو پیر و مرشد نے جواباً فرمایا۔

''صفی الدین! صبر کر۔ وہ علیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ بندے کو چاہئے کہ درِ رحمت پر دستک دیتا رہے کبھی نہ کبھی دروازہ کھل ہی جائے گا۔ تُو اہلِ یقین میں شامل ہے تو اس کے کرم پر بھی اعتبار کر۔'' حضرت سمنانیؒ کی عارفانہ گفتگو سے شیخ کی بے قراریوں کو قرار آ گیا۔ مگر یہ سکونِ دل زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ حضرت سمنانیؒ دنیا سے رخصت ہو گئے اور صفی الدین کی نظر میں سارا عالم تاریک ہو گیا۔ گھر میں پہلے ہی سناٹا تھا، اب دل کی محفل بھی ویران ہو گئی۔ پھر کئی برس بیت گئے۔ شیخ کے ذہن میں مرشد کی پیش گوئی کے الفاظ گونجتے رہے مگر تمناؤں کی کھیتی اسی طرح خشک رہی۔ ابرِ کرم کا کوئی ٹکڑا بھی نہیں برسا۔ آپ بار بار آسمان کی طرف نگاہ کرتے اور اُداس ہو جاتے۔ بہت دنوں سے شیخ کا یہی عمل تھا۔ جب وحشتِ دل حد سے زیادہ بڑھ جاتی تو ردولی سے کچھوچھ چلے جاتے اور آستانۂ مرشد پر حاضر ہو کر فریاد کرتے۔ ''سیّدی! آنے والا اب تک نہیں آیا۔'' پھر کئی بار حضرت سمنانیؒ کو خواب میں دیکھا۔ پیر و مرشد صفی الدینؒ کو ہر بار صبر کی تلقین فرماتے۔

آخر فغانِ نیم شبی رنگ لائی اور خدا نے شیخ صفی الدین کو ایک خوب صورت فرزند عطا کیا۔ یہ 860ھ کا واقعہ ہے، جب عبدالقدوس گنگوہیؒ عالمِ امکاں میں تشریف لائے۔ کم و بیش پچاس سال بعد حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ شیخ صفی الدین، اولاد کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔ مگر یہ ان کے بڑھاپے کا دور تھا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ ایک تو حضرت سمنانیؒ کا یہ ارشاد کہ آنے والا لڑکا قطبِ عالم ہو گا، دوسرے شدید مایوسی اور طویل انتظار کے بعد فرزند کی ولادت نے ماں باپ کو بہت زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ وہ شروع ہی سے اپنے بیٹے کی ہر بات کا خیال رکھتے اور ایک ایک لمحے کو یادگار بنانے کی کوشش کرتے۔ مگر انسانی کوشش کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس سے آگے پوری کائنات بے بس نظر آتی ہے۔ شیخ عبدالقدوس ابھی مشکل سے تین چار سال کے ہوں گے کہ آپؒ کے والدِ محترم، صفی الدین بیمار ہو گئے۔ اس وقت کے بہترین طبیبوں نے علاج کیا لیکن مرض روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ تمام رشتے دار اور احباب اُنہیں صحت کا یقین دلاتے رہے لیکن صفی الدین اپنی حالت سے زیادہ واقف تھے، اس لئے مسکرا کر رہ گئے۔ اور پھر ایک رات جب پوری دنیا نیند کی آغوش میں ڈوبی ہوئی تھی، انہوں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ وہ نیک سیرت شریکِ حیات جو کئی ماہ کی تیمارداری کے بعد تھک کر سو گئی تھی، شوہر کی آواز سنتے ہی گھبرا کر اُٹھیں اور شیخ صفی الدین کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

''بس اب مکمل صحت یاب ہونے ہی والا ہوں۔'' صفی الدین نے بڑی ہمت سے جواب دیا۔ ''عبدالقدوس کو میرے پاس لاؤ۔ میں اسے آخری بار دیکھنا چاہتا ہوں۔''

بیوی جو کچھ دیر پہلے شوہر کی پُر اُمید باتیں سن کر مطمئن نظر آ رہی تھیں، آخری الفاظ پر چونک اُٹھیں۔

''جلدی کرو۔ قطرہ، سمندر میں ملنے ہی والا ہے۔''

شریکِ حیات دوڑتی ہوئی عبدالقدوسؒ کے پاس پہنچیں۔ وہ اس وقت گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ ماں نے جھنجوڑ کر اُٹھایا اور اُنہیں آغوش میں لے کر تیزی سے صفی الدین کے قریب گئیں۔ اتنی دیر میں ان پر غفلت طاری ہو چکی تھی۔ بیوی نے مسلسل کئی آوازیں دیں۔ صفی الدین ہوش میں آئے اور بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔

''فرزند! دنیا کی یہی رسم ہے کہ ہر آنے والے کو ایک دن واپس جانا پڑتا ہے۔ مجھے بھی تمہیں خدا کے سپرد کر کے اپنے مرکز کی طرف جانا پڑے گا۔ الوداع میرے بچے! الوداع۔ اللہ تمہیں یتیمی کے بعد پیش آنے والے حادثات وصدمات سے محفوظ رکھے۔'' یہ کہہ کر بیوی کو اشارہ کیا کہ وہ بیٹے کو ہٹا دے۔ شریکِ حیات نے لرزتے ہاتھوں سے شیخ عبدالقدوسؒ کو دوبارہ اپنی گود میں لے لیا۔ ''تم بھی بیوگی کا زیادہ غم نہ کرنا۔ ممکن ہے کہ عبدالقدوسؒ کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہ آئیں، اس لئے زیادہ سختی سے پیش نہ آنا۔ اس کا معاملہ بہت احتیاط طلب ہے۔'' آخری نصیحت کرنے کے بعد شیخ صفی الدین نے کروٹ لی اور مالک حقیقی سے جا ملے۔

سوگوار ماں نے شیخ عبدالقدوسؒ کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے روز و شب کی ایک ایک ساعت وقف کر دی تھی۔ شوہر کی آخری خواہش اور محبتِ مادری ایک نقطے پر جمع ہو گئی تھیں۔ حضرت شیخ کے ماموں، قاضی دانیال، حکومت کے ایک اہم عہدے پر فائز تھے، اس لئے بظاہر کوئی مالی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ نتیجتاً حضرت شیخ پوری یکسوئی کے ساتھ علم حاصل کرنے لگے۔ قاضی دانیال نے آپؒ کے لئے بہترین استادوں کا انتظام کیا تھا۔ خود حضرت شیخ عبدالقدوسؒ کے شوق کی یہ کیفیت تھی کہ ہر وقت کتابوں کے مطالعے میں غرق رہتے۔ اگر کبھی خاندان کے دوسرے بچے آپؒ سے سیر و تفریح اور کھیل کی باتیں کرتے تو فوراً ان سے علیحدہ ہو جاتے۔ بس ایک گوشۂ تنہائی تھا اور کتابیں تھیں۔ مادرِ گرامی جب یہ منظر دیکھتیں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔ خدا کا شکر ادا کرتیں کہ شوہر کی وصیت کے مطابق اولاد کی نگہداشت جاری تھی۔

ایک دن عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ حضرت شیخ نے بہت سے لوگوں کی زبانی سن رکھا تھا کہ ردولی میں ایک بزرگ کا مزار ہے جہاں دعا مانگنے والے شخص کو اس کی مراد حاصل ہو جاتی ہے۔ آپؒ کے دل میں بھی ایک خواہش پیدا ہوئی اور والدہ سے اجازت لئے بغیر مزار کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب حضرت شیخ مطلوبہ مقام پر پہنچے تو ایک شاندار عمارت دکھائی دی۔ یہ مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالحق ردولویؒ کا مزارِ مبارک تھا۔ اتفاق سے اس دن کوئی عقیدت مند، روضۂ اقدس پر حاضر نہیں ہوا تھا۔ آپ نے مجاور کو ادب سے سلام کیا اور اندر جانے کی اجازت طلب کی۔ مجاور ایک نوعمر لڑکے کی تہذیب اور سلیقے سے بہت خوش ہوا۔ اس نے آپؒ کو دعا دیتے ہوئے مزارِ مبارک کا دروازہ کھول دیا۔ آپؒ دبے قدموں سے کچھ گھبرائے ہوئے اندر چلے گئے۔ اس وقت آپؒ کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ جب آپؒ گھر سے روانہ ہوئے تھے تو دل میں سوچا تھا کہ بزرگ کے مزار پر جا کر اپنے علم میں اضافے کے لئے دعا مانگیں گے۔ لیکن جیسے ہی حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ کی قربت میسر آئی، آپؒ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بہت دیر تک دعا مانگنے کی کوشش کی مگر زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو سکا۔ پھر اچانک آپؒ کو مزارِ مبارک کے اندر سے ''حق، حق'' کی آوازیں آنے لگیں۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے کہ شاید آپؒ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص وہاں موجود ہے۔ لیکن جب آپؒ کو یقین آ گیا کہ مزارِ مبارک بالکل خالی ہے تو حیرت میں ڈوب گئے۔ آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

"حق.....حق.......!"

در و دیوار پر ایک لرزہ سا طاری تھا۔ آپؒ پورے ہوش و حواس کے ساتھ ان آوازوں کو سننے لگے۔ پھر کچھ دیر بعد آپؒ کو یقین آ گیا کہ یہ آوازیں بزرگ کی قبر سے بلند ہو رہی ہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی خوف کی ایک تیز لہر پورے جسم میں دوڑ گئی اور آپؒ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑے۔ دوبارہ جب حالت سنبھلی تو حضرت شیخ عبدالحقؒ کے قدموں میں دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ سر کو جھکا لیا اور دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔ آپؒ دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔ "اے اللہ! میرے علم کو بڑھا دے۔" بہت دیر تک یہی ایک آواز سینے میں موجزن رہی، پھر کسی نے سرگوشی کی۔

"فرزند! علم ظاہری سب سے بڑا حجاب ہے۔ خدا تجھے حقیقت کا علم دے اور تیری آنکھوں کے سامنے سے تمام پردے ہٹا دے۔"

آپؒ لرز اُٹھے۔ اب کی بار آواز کانوں کے بالکل قریب سنائی دی تھی۔ آپؒ پر ایک جذب سا طاری ہو گیا اور اسی حال میں اُٹھ کر گھر کی طرف چل دیئے۔

دعا قبول ہو چکی تھی مگر ابھی اس کا کسی کو علم نہیں تھا۔ آپؒ نے گھر پہنچتے ہی ساری کتابیں پھاڑ کر پھینک دیں۔ جب مادرِ گرامی کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو انہیں اپنے خوابوں کا محل زمین بوس ہوتا نظر آیا۔ شوہر کے انتقال کے بعد یہ فرزند ہی ان کی تمناؤں کا مرکز تھا اور آج یہ مرکز بھی ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ حقیقت جاننے کے لئے دیوانہ وار بیٹے کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ہر طرف کتابوں کے پھٹے ہوئے اوراق بکھرے پڑے تھے۔

"عبدالقدوس! یہ سب کچھ کیا ہے؟" والدہ کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی اور آواز سے غصہ جھلک رہا تھا۔

"مادرِ گرامی!" یہ کہتے ہوئے حضرت شیخ کھڑے ہو گئے۔ "میں نے کتابِ علم سے توبہ کر لی ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ بے کار اور انسان کو گمراہ کرنے والا ہے۔ افسوس! میں نے اپنی زندگی کے کئی قیمتی سال برباد کر دیئے۔"

حضرت شیخ بڑے اعتماد سے بول رہے تھے۔ والدہ دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اتنی عمر کے بچے اس طرح گفتگو نہیں کرتے۔ آج انہیں اپنے بیٹے کا رنگ ہی بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے حضرت شیخ سے ایک کے بعد دوسرا سوال نہیں کیا۔ وہ سیدھی اپنے بھائی قاضی دانیال کے گھر چلی گئیں۔

"دانیال! اپنے بھانجے کی خبر لو۔ فوراً کسی بڑے طبیب کو بلاؤ۔" ماں کی آواز سے دل کا درد جھلک رہا تھا۔

"خیر تو ہے؟" قاضی دانیال گھبرا گئے۔ "اس کی بیماری کے متعلق تفصیل سے بتایئے۔"

"خدا نہ کرے، اس کے دماغ پر شاید اثر ہو گیا ہے۔" انتہائی ضبط کے باوجود ماں کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"جلدی کرو۔ کہیں مرض......" شدتِ غم سے بات نامکمل رہ گئی۔

قاضی دانیال نے فوراً اپنے خادم کو ردولی کے سب سے بڑے حکیم کے پاس بھیجا اور خود بہن کو ہمراہ لے کر حضرت شیخ کے مکان کی طرف چل پڑے۔ تیز رفتار سواری نے تھوڑی ہی دیر میں انہیں بھانجے کے مکان تک پہنچا دیا۔

قاضی دانیال بہت سرعت سے حضرت شیخ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ والدہ اپنے بیٹے کی یہ حالت نہیں دیکھ سکتی تھیں، اس لئے اشکبار آنکھوں اور بجھے ہوئے چہرے کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ قاضی دانیال اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئے۔ حضرت شیخ آنکھیں بند کئے ہوئے بستر پر دراز تھے اور چاروں طرف پھٹی ہوئی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ انہیں پہلی ہی نظر میں معاملے کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔ دبے پاؤں اپنے چہیتے

بھانجے کے قریب پہنچے اور آہستہ سے آواز دی۔
''عبدالقدوس!''
حضرت شیخ، ماموں کی آواز سنتے ہی اُٹھے اور احتراماً پلنگ سے نیچے اُتر آئے۔ پھر سلام کر کے خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔
''میرے عزیز! یہ کیا تماشا ہے؟'' قاضی دانیال نے بھی وہی سال کیا جو کچھ دیر پہلے شیخ کی والدہ کر چکی تھیں۔
بھانجے نے ایک نظر ماموں کو دیکھا اور حرف بہ حرف وہی جواب دے دیا جو ڈیڑھ دو گھنٹے قبل ہونٹوں پر آ چکا تھا۔ البتہ ایک فرق تھا کہ دوسری بار جواب دیتے وقت حضرت شیخ کا لہجہ کچھ زیادہ بے باک ہو گیا تھا۔
''تمہیں کسی نے بہکا دیا ہے میرے بچے!'' قاضی دانیال نے صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنی آواز کو زیادہ بلند نہیں ہونے دیا۔ سخت کلامی سے مزید دماغی انتشار پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔
''مجھے آج ہی ہدایت ملی ہے۔'' حضرت شیخ نے اطمینان سے کہا۔ ''ہاں، آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ میں کل تک بہکا ہوا تھا۔''
قاضی دانیال اپنے نوعمر بھانجے کی بے باکانہ گفتگو پر حیران ہو رہے تھے۔ اب تک اُنہیں ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی تھی جس سے وہ حضرت شیخ کے خللِ دماغی کا اندازہ لگاتے۔ مجبوراً انہوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ ''بزرگ اپنے تجربے کی بنیاد پر بچوں کے مستقبل کے لئے زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں اور ہمارا فیصلہ یہی ہے کہ تم اپنی تعلیم جاری رکھو گے۔'' قاضی دانیال نے یہ بات محبت سے کہی تھی لیکن ان کے لہجے سے تحکمانہ انداز جھلک رہا تھا۔
''ضروری نہیں کہ بزرگوں کا فیصلہ درست ہو۔'' یہ کہتے ہوئے حضرت شیخ نے احتراماً سر جھکا لیا تھا۔
''تو اب تم سرکشی پر اُتر آئے ہو؟'' قاضی دانیال کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ ''عبدالقدوس! بغاوت کے یہ انداز کس سے سیکھے؟ نافرمانی کی یہ تعلیم کہاں سے حاصل کی؟'' اب ان کے لہجے میں طنز کے ساتھ ساتھ غصہ بھی نمایاں تھا۔
''سچی بات بغاوت نہیں ہوتی ماموں حضور!'' حضرت شیخ بڑی روانی سے بول رہے تھے۔ مگر آپ نے بزرگ کے احترام میں کوئی کمی نہیں آنے دی تھی۔
اپنی ہر بات کا جواب سن کر قاضی دانیال کے غیظ و غضب میں مزید اضافہ ہو گیا۔ کہنے لگے۔
''عبدالقدوس! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہارا ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں کا حاکم بھی ہوں۔'' انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم نے میرے حکم کے مطابق اپنی تعلیم جاری نہیں رکھی تو میں تمہیں سزا بھی دے سکتا ہوں۔'' قاضی نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔
''حاکم آپ نہیں، کوئی اور ہے۔'' حضرت شیخ کے سکون میں ذرّہ برابر فرق نہیں آیا۔ ''آپ سزا ضرور دے سکتے ہیں۔ مگر میں دنیا کی سزا سے نہیں ڈرتا۔'' جو کچھ کسر باقی تھی، وہ پوری ہو چکی تھی۔ قاضی دانیال نے سوچا بھی نہ تھا کہ بھانجے کی گستاخیاں اس حد تک پہنچ جائیں گی۔ وہ جوشِ غضب میں مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اسی وقت کچھ میراثی عورتیں مکان کے قریب سے گاتی ہوئی گزریں۔ وہ ہندی میں کوئی دوہا الاپ رہی تھیں جس میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر تھا۔ عورتوں کی آواز سن کر حضرت شیخ پر جذب کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ گرد و پیش سے اس

طرح بے خبر ہو گئے جیسے وہاں آپ کے سوا کوئی دوسرا موجود ہی نہ ہو۔ جب تک عورتوں کا گیت فضا میں رچا بسا رہا، حضرت شیخ کسی مجسمے کے مانند کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد آواز آہستہ آہستہ ڈوب گئی تو آپ کو ہوش آیا۔ پھر قاضی دانیال کی طرف دیکھا اور انتہائی ادب سے سوال کیا۔ ''ماموں حضور! آپ کچھ فرما رہے تھے؟''

قاضی دانیال نے حضرت شیخ کے چہرے پر گہری نظر ڈالی۔ ''اب مجھے تم سے کچھ نہیں کہنا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل کر اپنی بہن کے پاس چلے گئے۔

اس دوران ردولی کے مشہور طبیب بھی آ چکے تھے مگر قاضی دانیال نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اب بچے کی طبیعت ٹھیک ہے۔ طبیبوں کے جاتے ہی حضرت شیخ کی والدہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بھائی سے پوچھا۔

''کیا عبدالقدوس نے تمہاری بات مان لی ہے؟ کیا اب اس کی ذہنی حالت درست ہے؟''

''ہمشیرۂ محترم! اس کی ذہنی حالت کو اب کوئی نہیں بدل سکتا۔'' قاضی دانیال نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہوں۔ ''میں نے عبدالقدوس سے بہت دیر تک باتیں کی ہیں۔ اس نے بے باکی کے ساتھ میرے ہر سوال کا صحیح جواب دیا ہے۔ ایک عام بزرگ، اولاد کے اس طرزِ عمل کو گستاخی کا نام دے کر اپنے اختیارات کا مظاہرہ کر سکتا ہے مگر میں اسے نہ گستاخ و بے ادب کہوں گا اور نہ اپنے جذبات کو تسکین دینے کے لئے اس پر کوئی جبر کروں گا۔ وہ کسی خللِ دماغی کا شکار نہیں۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ کسی اور ہی منزل کا مسافر ہے۔ میں ابھی اس راہ کی نشان دہی نہیں کر سکتا لیکن خدا ایک دن ضرور ظاہر کر دے گا کہ عبدالقدوس کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔'' یہ کہہ کر قاضی دانیال اپنے گھر چلے گئے۔

بھائی کی باتوں سے ایک بے قرار ماں کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر حال میں اپنے بیٹے کو ایک کامیاب انسان دیکھنا چاہتی تھیں مگر قاضی دانیال نے جس طرف اشارہ کیا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی عبدالقدوس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ کچھ دیر تک خیالات میں اُلجھے رہنے کے بعد وہ بیٹے کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ حضرت شیخ بستر پر محوِ خواب تھے اور پھٹی ہوئی کتابیں اسی طرح بکھری پڑی تھیں۔ بیٹے کے آرام کے خیال سے جلد ہی باہر آ گئیں۔ انہیں اپنے خاندان کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔

''کیا شیخ صفی الدین کا وارث جاہل اور دیوانہ بن جائے گا؟'' اس اذیت ناک خیال نے انہیں وحشت زدہ کر دیا۔ آج وہ پہلی بار حقیقی معنوں میں خود کو بیوہ سمجھ رہی تھیں۔ جذبات کی دنیا میں ایک طوفان سا آ گیا تھا۔ آخر اس تکلیف دہ صورتِ حال سے نجات پانے کے لئے وہ اپنے خالق کے آگے سجدہ ریز ہو گئیں۔ نماز کے بعد انہوں نے اس ذاتِ بے نیاز کے دربار میں گریہ و زاری شروع کر دی جہاں ہر مفلس و مجبور کی بات سنی جاتی ہے۔ حضرت شیخ کی والدہ بہت دیر تک معبودِ حقیقی سے فریاد کرتی رہیں اور پھر دعا کے دوران ہی ان کے ذہن میں ایک برق سی لہرائی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے شوہر شیخ صفی الدین مخاطب ہوں:

''ممکن ہے کہ عبدالقدوس کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہ آئیں، اس لئے زیادہ سختی سے پیش نہ آنا۔ اس کا معاملہ بہت احتیاط طلب ہے۔'' شوہر کے الفاظ یاد آتے ہی ہر طرف روشنی سی پھیل گئی اور مایوسی کے گہرے اندھیرے چھٹ گئے۔ انہیں اپنے اس سوال کا جواب مل گیا جسے حل کرنے کے سلسلے میں شاید ساری دنیا عاجز رہتی۔

اس واقعہ کے بعد حضرت شیخ کی والدہ نے آپؒ کو کسی قسم کی تنبیہہ نہیں کی اور زندگی کا قافلہ تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ کچھ دن تک تو حضرت شیخ کی طبیعت معمول پر رہی مگر پھر ظاہری حالت میں بگاڑ شروع ہو گیا۔ آپؒ حضرت عبدالحقؒ کے مزارِ مبارک پر پابندی سے حاضری دینے لگے۔ ایک مردِ کامل کی یہ قربت بہر حال

رنگ لائی اور آپؒ کا دل ساری دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ نماز کے شوق کا یہ عالم تھا کہ حضرت شیخ تمام لوگوں سے پہلے مسجد جا کر اگلی صف میں بیٹھتے۔ جیسے جیسے نمازی آتے، آپؒ پیچھے ہٹتے چلے جاتے۔ یہاں تک کہ نمازیوں کی آخری قطار میں شامل ہوتے اور جب نماز ختم ہو جاتی تو آپؒ اللہ کی بندگی کرنے والوں کی جوتیاں سیدھی کرتے۔ اس انکسار اور جذبۂ خدمت نے آپؒ کی دلی حالت کو یکسر بدل ڈالا تھا۔ حضرت شیخ کو دوسری ضروریاتِ زندگی کا خیال تھا، ورنہ اپنے جان وتن کا ہوش، نماز پڑھتے اور حضرت احمد عبدالحقؒ کے روضۂ مبارک پر حاضری دیتے بس زندگی کا یہی معمول تھا۔ رات گئے جب اپنے کاموں سے فارغ ہو کر گھر لوٹتے تو والدہ محترمہ کے پاؤں دباتے، پھر وہ سو جاتیں تو آپؒ بھی اپنے بستر پر چلے جاتے۔

اس عرصے میں بظاہر ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا جس سے آپؒ کی والدہ کو فکر لاحق ہوتی۔ مگر عزیزوں اور محلے داروں نے ایک بیوہ عورت کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ کوئی رشتے دار کہتا کہ شیخ صفی الدین کا خاندان تباہ ہو گیا۔ کوئی جاہل پڑوسن اظہارِ ہمدردی کے طور پر کہتی کہ ایک تو بیوگی کا صدمہ، دوسرے پاگل اولاد کا غم۔ غرض جتنی زبانیں تھیں، اتنی ہی باتیں۔ دل شکستہ ماں کب تک ان اعتراضات کو برداشت کرتی؟ اور پھر جب ایک رشتے دار نے یہ طعنہ دیا کہ "تیرا بیٹا مسجد میں لوگوں کی جوتیاں اٹھا کر خاندانی عزت کو نیلام کر رہا ہے" تو حضرت شیخ کی والدہ اپنی محرومیوں پر رو پڑیں۔ انہیں ایک بار پھر اپنے بھائی، قاضی دانیال کے گھر جانا پڑا۔

"میں نہیں جانتی کہ عبدالقدوس کس منزل کا مسافر ہے؟ لوگ تو اسے پاگل ہی کہتے ہیں۔" ماں نے اپنے بیٹے کی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کی باتوں پر نہ جائیں۔" قاضی دانیال نے بہن کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "وہ کسی کو پتھر تو نہیں مارتا۔ نمازیوں کے جوتے اُٹھانا بھی ایک سعادت ہے۔ میں تو اسے اپنی بے عزتی نہیں سمجھتا۔"

"میں لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کر سکتی ہوں مگر حقیقت سے کیسے آنکھیں چراؤں؟ کسی بھی متوازن ذہن رکھنے والے انسان کی یہ حرکتیں نہیں ہوتیں۔ وہ گھنٹوں خلاؤں میں گھورتا رہتا ہے۔ کبھی ہنستا ہے اور کبھی رونے لگتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کسی ماہر طبیب کو بلا کر دکھا دو۔ شاید وہ کسی دماغی کمزوری کی نشاندہی کرے۔"

قاضی دانیال نے بہن کی باتوں کو غور سے سنا اور مزید بحث کئے بغیر طبیبِ خاص کو اپنے مکان پر طلب کیا۔ اس کے ساتھ ہی حضرت شیخ کو بھی آدمی بھیج کر وہیں بلوا لیا۔ دراصل قاضی دانیال نے اس بار اپنے ذہن میں ایک خاص منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ وہ منصوبہ کچھ اس طرح تھا کہ حضرت شیخ اور طبیب کے آنے سے پہلے ہی انہوں نے اپنی بہن کے لئے برابر والے کمرے میں نشست کا انتظام کر دیا تھا تاکہ وہ طبیب اور اپنے بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو براہِ راست سن سکیں۔ حکیم صاحب تو قاضی دانیال کا حکم سنتے ہی حاضر ہو گئے تھے مگر حضرت شیخ کو تلاش کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ الغرض سب لوگ جمع ہوئے۔ طبیب کو پہلے ہی تمام صورتِ حال سمجھا دی گئی تھی کہ وہ مریض سے طویل گفتگو کر کے اس کی بیماری کی تشخیص کرے۔ حضرت شیخ، سلام کرنے کے بعد ایک گوشے میں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ آپؒ کی آنکھوں میں وحشت تھی اور چہرہ زرد نظر آ رہا تھا۔ ایک عام آدمی بھی نوعمر لڑکے کی یہ حالت دیکھ کر بیماری کا اندازہ کر سکتا تھا۔ طبیب نے قاضی دانیال کے سامنے اپنی علمیت کا مظاہرہ کرنے کے لئے حضرت شیخ پر سوالات کی بارش کر دی۔

"صاحبزادے! کیا غذا کھاتے ہو؟ پیٹ میں کوئی تکلیف تو نہیں رہتی؟ نیند کیسی آتی ہے؟ خواب میں ڈرتے تو نہیں؟" تمام سوالوں پر حضرت شیخ خاموش رہتے تھے مگر آخری سوال کے جواب میں آپؒ نے سر کو جنبش دیتے

ہوئے کہا۔

''ہاں! میں نیند میں بھی ڈرتا ہوں اور جاگتے میں بھی۔''

آپؒ کا جواب سن کر طبیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بیماری کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

''کس سے ڈرتے ہو؟'' طبیب نے خوف کی وضاحت چاہی۔

''اپنے خدا سے۔'' حضرت شیخ نے اطمینان سے جواب دیا جسے سنتے ہی طبیب کا چہرہ اُتر گیا۔

''بیداری کے عالم میں کبھی ایسا تو محسوس نہیں ہوتا کہ آوازیں مسلسل آ رہی ہوں مگر آواز دینے والا، آنکھوں سے روپوش ہو۔''

طبیب نے دوسرا سوال کیا۔ اُسے حضرت شیخ پر کسی آسیبی اثر کا شبہ ہو رہا تھا۔

''حق، حق......بس یہی ایک آواز سنائی دیتی ہے۔'' حضرت شیخ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ''ویسے کانوں میں تو بہت شور ہوتا رہتا ہے، مگر میں دوسری آوازوں پر دھیان نہیں دیتا۔''

طبیب آپؒ کے جوابات سن کر عاجز آ چکا تھا لیکن شرمندگی سے بچنے کے لئے اس نے آپؒ کو حکیمانہ مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''دوسری آوازیں بھی سنا کرو۔ پھر یہ بیماری جاتی رہے گی۔ تمہارا ذہن ایک نقطے پر جم کر رہ گیا ہے، بس یہی خرابی ہے۔ گھبراؤ نہیں، جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

حضرت شیخ نے طبیب کی طرف دیکھا۔ آپؒ کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ ''میرے بزرگ! بیمار تو آپ ہیں کہ مجھے دوسری آوازیں سننے کا مشورہ دیتے ہیں۔ پہلے اپنا علاج کیجئے.....حق، حق.....''

یہ کہتے ہوئے آپؒ تیزی سے اُٹھے اور قاضی دانیال کے مکان سے نکل کر حضرت احمد عبدالحقؒ کے مزارِ مبارک کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت شیخ کے جاتے ہی قاضی دانیال، طبیب کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ بے چارہ عمر رسیدہ شخص سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ''میں ایسے مریضوں کا علاج کرنے سے قاصر ہوں جو خود مسیحا کو بیمار سمجھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ قاضی دانیال نے اس کی دل جوئی کی اور کچھ رقم دے کر رخصت کر دیا۔ پھر اپنی بہن کے کمرے میں چلے گئے۔ حضرت شیخ کی والدہ اُداس بیٹھی تھیں۔

''اب تو آپ نے اپنے کانوں سے عبدالقدوس کے جوابات سن لئے۔'' قاضی دانیال نے کہا۔

''کیا کوئی پاگل لڑکا اس قسم کی گفتگو کر سکتا ہے؟ میرے خیال میں تو باہوش بوڑھے بھی اس طرح بات نہیں کر سکتے۔''

''اب مجھے یقین ہو گیا کہ عبدالقدوس کسی دماغی خلل کا شکار نہیں۔'' والدہ نے آہستہ لہجے میں کہا۔ ''مگر میری خواہش تھی کہ وہ اعتدال میں رہتا۔''

''میں پھر عرض کروں گا کہ آپ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ خود راہ بنا لے گا۔ بہتا ہوا پانی ہے۔ لوگوں کی باتوں پر نہ جائیں۔ وہ تو دنیاداری میں اس قدر غرق ہو چکے ہیں کہ انہیں ہر خدا پرست، دیوانہ نظر آتا ہے۔ بس آپ اُس کے حق میں دعائے خیر فرمائیے۔ وہ ادب و احترام کے باعث آپ کے سامنے کچھ نہیں بولتا۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے بھی لاجواب کر دیا تھا اور جو شخص بھی اس سے گفتگو کرے گا، وہ لاجواب ہو جائے گا۔'' یہ

کہتے کہتے قاضی دانیال آبدیدہ ہو گئے۔ ''خدا اس کی عمر میں اضافہ کرے اور اس پر یہ کڑی منزل آسان ہو جائے۔''

حضرت شیخ کی والدہ نے مسکراتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھا اور خود بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ اس طرح کہ پلکوں پر آنسو صاف نظر آ رہے تھے۔

اس واقعہ کے بعد حضرت شیخ کی والدہ تو مطمئن ہو گئی تھیں مگر آپؒ کی وحشت پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔ ادھر آپ کے استغراق میں اضافہ ہوا اور ادھر نکتہ چینوں کی زبانیں پہلے سے زیادہ دراز ہو گئیں۔ لیکن روز و شب کا کاروبار جاری رہا۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ حضرت شیخ کی عمر کوئی پندرہ سال کے قریب ہو گی کہ آپ کی والدہ بیمار ہو گئیں۔ بڑھاپے کا وقت تھا اس لئے کمزوری روز بہ روز بڑھتی چلی گئی۔ قاضی دانیال نے بہترین طبیبوں سے علاج کرایا مگر تمام تدبیریں اُلٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ اس دوران حضرت شیخ نے نماز کے سوا اپنے تمام معمولات ترک کر دیئے تھے۔ کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے حضرت احمد عبدالحقؒ کے مزار مبارک پر حاضری دیتے ورنہ بیشتر وقت ماں کے قدموں میں بیٹھ کر گزارتے۔ تیمارداری میں ساری ساری رات جاگتے، یہاں تک کہ والدہ کے ساتھ دوسرے رشتے داروں کو بھی ترس آنے لگتا۔ قاضی دانیال نے بھی بہت سمجھایا لیکن آپؒ نے اپنی روش نہیں بدلی اور کئی ماہ تک مسلسل ماں کی اسی طرح خدمت کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ آخر منزلِ فراق قریب آ گئی۔ ایک رات جب کوئی دوسرا اعزیز کمرے میں موجود نہیں تھا، آپؒ نے اپنی والدہ کے سینے پر سر رکھ دیا اور بلک بلک کر رونے لگے۔ والدہ اپنے نحیف ہاتھوں سے شفقت کا مظاہرہ کرتیں، کانپتی آواز سے تسلیاں دیتیں مگر سیلاب اشک کی طرح نہیں تھمتا تھا۔ اور جب ہچکیوں کا طوفان رک گیا تو آپؒ نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا۔

''مادرِ گرامی! میں اس زمین پر سب سے ناکارہ اولاد ہوں۔ میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔ مجھے معاف کر دیجئے کہ آپ کی معافی کے بغیر دنیا بھی برباد ہو جائے گی اور آخرت بھی۔'' ایسا دردناک منظر تھا کہ والدہ انتہائی ضعف کے باوجود چیخ پڑیں:

''عبدالقدوس! تُو دنیا کا لائق ترین بیٹا ہے۔ خالقِ کائنات سب ماؤں کو ایسی اولاد دے کہ ان کی آغوش سکون پا جائے۔ تُو نے خدمت کا حق ادا کر دیا۔ میں تجھ سے راضی ہوں۔ اللہ بھی تیرے جذبوں کو قبول فرمائے۔'' آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ حضرت شیخ بے قرار ہو گئے۔

''مادرِ گرامی! ساری دنیا مجھے پاگل کہتی ہے، مگر آپ تو ایسا نہیں سمجھتیں؟'' آج حضرت نے پہلی بار اپنے دل کا درد، ماں کے سامنے بیان کیا تھا۔

''نہیں۔'' والدہ کی آواز بہت دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''تُو میرا بیٹا ہے...... میرا دانا بیٹا، میرا عاقل فرزند۔'' آواز بہت تیزی سے ڈوبتی جا رہی تھی۔ ''خدا دونوں...... جہان میں...... تجھے...... سربلند...... کرے۔'' الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ حضرت شیخ نے کئی بار پکارا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ آپؒ نے والدہ محترمہ کے پیروں پر سر رکھ دیا اور بہت دیر تک خاموشی سے آنسو بہاتے رہے۔ پھر اُٹھے، ماں کے بے جان قدموں کو بوسہ دیا اور پورے جسم پر چادر ڈالنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئے۔

دفن تک انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے رہے۔ لوگوں نے آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھا۔ مگر جب آخری رسم کی ادائیگی کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو آپؒ بے اختیار گریہ وزاری کرنے لگے۔

''آج میرا سب سے بڑا دعا گو رخصت ہو گیا۔ اب میں آسمان کے نیچے تنہا ہوں۔ اے خدا! مجھے اپنے قہر و غضب سے محفوظ رکھ۔''

قاضی دانیال اکثر آپؒ کو ماں کی قبر سے لپٹے ہوئے دیکھتے، صبر کی تلقین کرتے اور گھر چلنے کے لئے کہتے مگر حضرت شیخ انکار کر دیتے۔ سارے عزیزوں اور شہر والوں نے تو پہلے ہی پاگل قرار دے دیا تھا، بس ایک ماموں تھے جو کھانے پینے کا خیال رکھتے۔ ورنہ خود حضرت شیخ کا تو یہ عالم تھا کہ کئی کئی دن تک غذا کا ہوش نہ رہتا۔ قاضی دانیال ہی زبردستی کچھ کھلا دیتے۔ کئی ماہ تک یہی صورتِ حال رہی۔ پھر ایک دن ماموں کی خدمت میں حاضر ہو کر فرمایا۔

''اب اس دنیا میں آپ ہی میرے بزرگ ہیں۔ والدہ کی وفات نے مجھے غم سے نڈھال کر دیا ہے۔ میں یہاں سے کہیں اور جانا چاہتا ہوں۔ میری سابق گستاخیوں اور نافرمانیوں کو معاف کرتے ہوئے مجھے سفر کی اجازت دیجئے۔ زندہ رہا تو پھر قدم بوسی کو حاضر ہوں گا۔'' حضرت شیخ کی درخواست سن کر قاضی دانیال بھی رونے لگے۔ آخر بہن کی نشانی تھے، کسی طرح بھی جدائی گوارہ نہیں تھی۔ محبت سے سمجھایا، خوشامد تک کی مگر شیخ جانا ہی چاہتے تھے، آخر چلے گئے۔ قصبہ ردولی سے بہت دُور، کسی نامعلوم منزل کی طرف!

والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد حضرت عبدالقدوسی گنگوہیؒ کہاں تشریف لے گئے؟ تمام تاریخوں میں اس زمانے کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بعض تذکروں سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ ردولی سے رخصت ہونے کے بعد آپؒ قصبہ سدھور چلے گئے تھے۔ یہاں سیّد اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے سلسلے کے ایک بزرگ حضرت شیخ خواجگیؒ موجود تھے جن کی خانقاہ سے چشمۂ ہدایت جاری تھا۔ ہزاروں تشنہ لب آتے اور پیاس بجھا کر چلے جاتے۔ آپؒ بھی شیخ خواجگیؒ کے دربارِ نورانی میں حاضر ہوئے اور ایک ادنیٰ ملازم کی طرح خدمتِ شیخ میں مصروف ہو گئے۔ حضرت خواجگیؒ نوعمری کے باوجود آپؒ کے خلوص سے بہت متاثر نظر آتے تھے۔ یہاں ایک طویل عرصہ گزارا۔ حضرت خواجگیؒ کی اس طرح خدمت کی کہ بڑے بڑے مریدوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ بچپن ہی سے ریاضت و عبادت آپؒ کے محبوب مشاغل تھے۔ ان میں غرق ہوئے تو عمر رسیدہ حضرات بھی حیران رہ گئے۔ دلوں کا تعلق بڑھتا چلا گیا۔ حضرت شیخ خواجگیؒ کی مہربانیوں میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا اور پھر قربت کی ایک خاص منزل آ گئی۔ خانقاہ میں روز و شب رہنے والے دوسرے لوگ آپؒ کی روحانی ترقی سے حسد رکھتے تھے مگر آپؒ نے اس غبار کو کبھی دل کے قریب نہیں آنے دیا۔ روشنی اور تیز ہو گئی۔ حضرت خواجگیؒ برملا آپؒ سے اپنی محبت کا اظہار کرنے لگے۔ ایک دن آپؒ نے شیخ سے بڑی عاجزی کے ساتھ عرض کیا:

''میں نے قصداً علم ظاہری ترک کر دیا تھا۔ اپنے اسی اضطراب کی وجہ سے علم فقہ بھی حاصل نہ کر سکا۔ اب اپنی اس محرومی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر آپؒ اُداس ہو گئے۔ حضرت شیخ خواجگیؒ سے آپؒ کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ انتہائی جذب کے عالم میں فرمانے لگے:

''عشق کی راہ میں ابھی سے تھک کر بیٹھ گیا؟ سرفروشی کے بڑے دعوے تھے، وہ کہاں گئے؟ ابھی تو آبلہ پائی کی منزل باقی ہے۔ تیرے زخموں سے خون بہہ رہا ہو یا پاؤں کٹ گئے ہوں، تجھے اپنا سفر جاری رکھنا ہو گا۔ پاؤں ٹوٹ جائیں تو سر کے بل چل۔ معذوروں کی طرح راستے کا پتھر نہ بن۔ اُٹھ اور علمِ باطنی حاصل کر۔ پھر تیری آنکھوں سے کوئی چیز اوجھل نہ ہو گی۔ آنکھیں کھول اور دیکھ کہ پسِ دیوار کیا ہے؟ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وہ تجھے علمِ ظاہری بھی عطا کرے گا۔''

حضرت خواجگیؒ کی باتیں سن کر آپؒ پریشان ہو گئے اور کتابی علم کا جو سلسلہ کچھ دن پہلے منقطع ہو گیا تھا، وہ دوبارہ بحال ہو گیا۔ آپؒ نے حضرت شیخ خواجگی کے سائے میں بہت تیزی سے یہ مراحل طے کئے اور ایک مختصر سی مدت میں تمام شرعی مسائل سے آگاہ ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپؒ نے حضرت خواجگیؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنی چاہی تھی مگر شیخ کی زبان سے یہ سن کر کہ "تیرا حصہ کہیں اور ہے" آپؒ خاموش ہو گئے تھے۔ پھر کئی سال تک قصبہ سدھور میں مقیم رہے۔ ایک روایت ہے کہ آپؒ حضرت خواجگیؒ کی زندگی ہی میں یہاں سے رخصت ہو کر چلے گئے تھے۔ لیکن دوسری روایت سے پتہ لگتا ہے کہ شیخ کے انتقال کے بعد آپؒ کی طبیعت اُچاٹ ہو گئی تھی اور کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو، مگر اتنا ضرور ہے کہ سدھور سے رخصت ہونے کے بعد آپؒ کی علمی اور روحانی مصروفیات کے بارے میں کوئی تاریخی حوالہ نہیں ملتا۔ اخبار الاخیار کے مشہور مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے تھے کہ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کا تعلق ہمارے قبیلے سے تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد حضرت شیخ عبدالقدوس دوبارہ اپنے آبائی قصبے رودلی تشریف لائے۔ یہ آپؒ کا دورِ شباب تھا۔ اس وقت عمرِ مبارکہ پچیس اور تیس کے درمیان ہو گی۔ کسی تاریخ یا تذکرے سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ شیخ خواجگیؒ کی خانقاہ سے رخصت ہونے کے بعد آپؒ نے مزید تعلیم حاصل کی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب آپؒ اپنے وطن لوٹے تو ظاہری علم کا ہی یہ حال تھا کہ اہلِ شہر دیکھتے ہی رہ گئے۔

شدتِ گفتار کی یہ کیفیت تھی کہ اگر کسی موضوع پر تقریر کرتے تو اہلِ محفل تصویرِ حیرت بن جاتے اور اہلِ دل اپنے گریبان کھول لیتے۔ لوگوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ شیخ صفی الدین مرحوم کا وہ لڑکا ہے جو چند سال پہلے دیوانوں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔

آپؒ نے کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ ایک بار تمام رشتے داروں سے ملے، ان کی خیریت دریافت کی اور چلے آئے۔ کبھی کبھی اپنے ماموں قاضی دانیال کے یہاں تشریف لے جاتے۔ وہ اب بہت بوڑھے ہو چکے تھے، ان کی دل جوئی کرتے اور ہر قسم کی خدمت گزاری کے لئے تیار رہتے۔ والدہ محترمہ کی قبر پر پابندی سے حاضری دیتے، ان کی مغفرت کے لئے طویل دعائیں مانگتے۔ حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہونا بھی آپؒ کے معمولات میں شامل تھا۔ آپؒ اکثر اوقات خاموش رہتے۔ فضول باتوں سے مکمل گریز کرتے۔ اگر کبھی کوئی مذہبی یا علمی بحث چھڑ جاتی تو آپؒ اس طرح بولتے کہ عقل و دانش کا سمندر اُبل پڑتا۔ آپؒ کی شخصیت کا یہ انقلاب طویل سیر و سیاحت کے بعد آیا تھا۔ ویسے سب کچھ وہی تھا۔ وہی فقیرانہ لباس، وہی قلندرانہ مزاج، پہلے بھی باہوش تھے اور آج بھی بس لوگوں کی سمجھ کا پھیر تھا۔ نہ کل کوئی آپؒ کے مقام سے واقف تھا اور نہ آج......

کسی کی بندہ پروری سے حضرت شیخ کے دن گزر رہے تھے کہ ایک رات آپؒ نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ بزرگ فرما رہے تھے۔ "فرزند! علمِ ظاہری، حجابِ اکبر ہے۔ اس پردے کو ہٹانے کی کوشش کرو۔" آپؒ بزرگ سے مزید کچھ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ غائب ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت شیخ کی آنکھ کھل گئی۔ باقی رات آپؒ نے جاگ کر گزاری۔ خواب کے ایک ایک زاویے پر غور کیا مگر یہ راز نہ کھل سکا۔ وہ بزرگ کون تھے اور اس مبہم اشارے سے ان کا کیا مطلب تھا؟ ذہن پر ایک عجیب سا بوجھ ہو گیا۔ سارا دن اسی سوچ میں گزار دیا لیکن مسئلہ وہی کا وہی رہا۔ دوسری رات وہی خواب آپؒ نے دیکھا۔ پھر تمام وقت شدید بے چینی میں گزرا۔ حضرت شیخ اس حد تک تو خواب کا مفہوم سمجھ چکے تھے کہ انہیں پردۂ غیب سے کسی مردِ حق پرست کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے مگر خواب میں آنے والے بزرگ کون تھے؟ اس سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بعض معتبر

حضرات کو آپؒ نے بزرگ کے خدوخال بتا کر اس معمے کو حل کرنا چاہا لیکن وہ سب کے سب کسی قسم کی رہنمائی کرنے سے قاصر رہے۔ تیسری رات حضرت شیخ نے پھر وہی خواب دیکھا۔ اب آپؒ کا ذہنی کرب اور دلی اضطراب اپنے عروج پر تھا۔ ایک خواب کا مسلسل نظر آنا غیر معمولی بات تھی، جسے آپؒ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ مجبوراً آپؒ نے شیخ احمد عبدالحقؒ کی بارگاہ کا رخ کیا۔

پہلے آپؒ نے نماز ادا کی، پھر قرآن حکیم اور درود شریف پڑھ کر حضرت احمد عبدالحقؒ کی روح مبارک کو ایصالِ ثواب کیا اور دوزانو ہو کر مراقبے میں بیٹھ گئے۔ زیرلب ایک ہی دعا مانگ رہے تھے۔

''اے خدا! اپنے اس بندۂ عاجز کی رہنمائی فرما۔'' آپؒ کو اس طرح بے حس وحرکت بیٹھے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے۔ راز اب تک راز تھا مگر آپؒ نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ دل ہی دل میں اپنے خدا سے فریاد کرتے رہے۔ یکایک ذہن میں ایک برق سی لہرائی اور پھر سب کچھ یاد آ گیا۔

''فرزند! علمِ ظاہری سب سے بڑا حجاب ہے۔'' یہی آواز آپؒ نے بچپن میں اسی مقام پر سنی تھی اور آپؒ کو محسوس ہوتا تھا جیسے یہ آواز حضرت احمد عبدالحقؒ کی قبر سے بلند ہو رہی ہو۔ ذہن تیزی سے ماضی کی طرف لوٹ گیا۔ راز بے نقاب ہو چکا تھا۔ آپؒ نے مزارِ مبارک کی طرف دیکھا اور فرطِ عقیدت سے آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ بزرگ حضرت احمد عبدالحقؒ تھے جو پیہم تین راتوں سے آپؒ کے خوابوں میں تشریف لا رہے تھے۔

اس وقت مزارِ مبارک سے اُٹھے اور حضرت شیخ محمدؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ شیخ محمدؒ، حضرت احمد عبدالحقؒ کے پوتے تھے جنہیں اپنے والد محترم، شیخ عارفؒ سے خلافت حاصل ہوئی تھی۔ شیخ محمدؒ بظاہر نوجوان تھے لیکن معرفت کی راہ میں پیرِ کامل کا درجہ رکھتے تھے۔ شیخ محمدؒ نے جیسے ہی آپؒ کو خانقاہ میں داخل ہوتے دیکھا، احتراماً کھڑے ہو گئے۔ شیخ کے اس طرزِ عمل سے آپؒ کو شدید ندامت کا احساس ہوا۔ بے اختیار شیخ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور فرمانے لگے۔ ''میں آپ کے در کا خادم ہوں۔ مجھے اس قدر شرمندہ نہ کیجئے کہ دنیا میں کسی کو منہ نہ دکھا سکوں۔''

شیخ محمدؒ نے یہ سن کر آپؒ کو گلے سے لگا لیا اور بڑی محبت سے اپنے قریب بٹھایا۔ آپؒ رات گئے خانقاہ میں بیٹھے رہے۔ آخر جب تمام مرید ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اور تنہائی میسر آئی تو آپؒ نے شیخ محمدؒ کے سامنے خواب میں نظر آنے والے بزرگ کا حلیہ بیان کیا اور پوچھا کہ کیا وہ اس مردِ خدا کو پہچانتے ہیں؟ شیخ محمدؒ نے جواب میں فرمایا کہ اس شکل وصورت کے بزرگ ان کے دادا مرحوم، حضرت احمد عبدالحقؒ تھے۔ آپؒ پہلے ہی اندازہ کر چکے تھے۔ لیکن جب مکمل تصدیق ہو گئی تو شیخ محمدؒ سے پورا خواب بیان کر دیا اور ساتھ ہی مرید ہونے کی خواہش بھی ظاہر کی۔ شیخ محمدؒ کم وبیش آپؒ ہی کے ہم عمر تھے، اس لئے انکسار کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

''اے اللہ! دنیا والے سمجھتے ہیں کہ مجھے تیری ذاتِ پاک سے بندگی کی نسبت ہے۔ لوگوں کے حُسنِ ظن کو برقرار رکھ اور مجھے توفیق دے کہ میں تیرے بندوں کی خدمت کر سکوں۔'' دعا اس قدر اثر انگیز تھی کہ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ساتھ تمام اہلِ مجلس پر رقت طاری ہو گئی۔

سلسلۂ صابریہ میں بیعت کا شرف حاصل ہونے کے بعد آپؒ نے سخت مجاہدے کیے۔ عبادت وریاضت میں بے شمار راتیں گزاریں۔ ایک بار پھر آپؒ پر جذب طاری ہو گیا۔ یہ حالت بچپن کی کیفیت سے بھی زیادہ شدید تھی۔ کئی بار لباسِ ظاہری کو چاک کیا اور اس ارادے سے صحرا کی جانب چل پڑے کہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ مگر ہر مرتبہ کوئی غیبی طاقت آپؒ کو زنجیر پہنا دیتی تھی۔ اپنی اس کیفیت کے بارے میں خود حضرت شیخ فرمایا کرتے تھے۔

''میں دنیاوالوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میری تو خواہش تھی کہ پہاڑوں میں عمر گزاروں...... جنگلوں میں اس طرح گم ہو جاؤں کہ پھر مجھے کوئی ڈھونڈ نہ سکے۔ مگر کیا کرتا؟ میں مشیت کے فیصلوں کے آگے مجبور تھا۔ روحِ احمد عبدالحقؒ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ اور بابا شیخ فرید گنج شکرؒ نے مجھے جبراً سجادے میں بٹھا دیا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ پیدائشی ولی تھے اور آپؒ کی مجذوبانہ کیفیت اس بات کی متقاضی تھی کہ سارے ظاہری رشتے توڑ کر تارک الدنیا ہو جائیں۔ آپؒ نے اپنی طرف سے بار بار کوشش کی کہ اس بارِ گراں کو اُتار پھینکیں مگر قدرت آپؒ سے گمراہوں کی بستی میں ہدایت کا کام لینا چاہتی تھی، اس لئے حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ نے اپنی روحانی قوت سے آپؒ کو شیخ محمدؒ کی بارگاہ میں بھیجا۔ کچھ دن یہاں بھی جوشِ جنوں رہا لیکن سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں کی خاص نظر اور شیخ محمدؒ کے بتائے ہوئے اوراد و وظائف نے آپؒ کی وحشتوں کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا اور آپؒ اکثر اوقات حالتِ اعتدال میں نظر آنے لگے تھے۔

حضرت شیخ محمدؒ اپنے درس میں فرمایا کرتے تھے کہ اس زمین پر خدا کو چاہنے والی دو جماعتیں ہیں۔ ایک سالکوں کی جماعت اور دوسری مجذوبوں کی۔ مجذوب بننا نسبتاً آسان ہے۔ اس راہ میں انسان کے کاندھوں پر ذمے داریوں کا بوجھ نہیں رہتا۔ ساری دنیا سے کٹ جانے کے بعد وہ اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے اور پھر بے ہوشی کی حالت میں وہ مخلوقِ خدا کے کام نہیں آ سکتا۔ یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مبارکہ پر بھی عمل نہیں کر سکتا۔ جب کہ سالک، بندگانِ خدا کے ہجوم میں رہتا ہے۔ آگ سے کھیلتے ہوئے بھی اپنے دامن کو بچاتا ہے۔ لوگ اس کا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ہدایت پاتے ہیں۔ مجذوب ابرِ کرم کا وہ ٹکڑا ہے جو صرف اپنی ذات پر برستا ہے...... یا کسی جنگل کے دُور دراز گوشے پر۔ سالک کی بارشِ کرم خاص و عام پر ہوتی ہے۔ وہ بھوکا بھی رہتا ہے اور روزی کمانے کے لئے مزدوری بھی کرتا ہے۔ وہ بیوی بچوں کو بھی پالتا ہے اور نفس کشی بھی کرتا ہے۔ یہی احکامِ الٰہی اور یہی شریعتِ رسول ﷺ ہے۔''

اس حُسنِ برق وش کے دل سوختہ وہی ہیں
شعلوں سے بھی جو کھیلیں، دامن کو بھی بچائیں

شیخ محمدؒ کے وعظ نے آپؒ کے جذبۂ بے قرار کو سکون بخشا۔ رفتہ رفتہ طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ اب آپؒ کو انسانی چہرے دیکھ کر وحشت نہیں ہوتی تھی۔ شریعت کا غلبہ ہوا تو قاضی دانیال اور خاندان کے دوسرے بزرگوں نے آپؒ سے شادی کرنے کو کہا۔ حضرت شیخ نے دامن بچانے کی کوشش کی تو سمجھانے والوں نے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ پاک سے مثال پیش کی۔ آپؒ اس دلیل کے آگے دم نہ مار سکے۔ پھر اپنی غربت کا سہارا لے کر اس ذمے داری سے بچنے کی کوشش کی۔

''میں اپنی کفالت نہیں کر سکتا تو شادی کے اخراجات کس طرح برداشت کروں گا؟'' آپؒ کو یقین تھا کہ لوگ اس معذرت کو قبول کر لیں گے اور کوئی شخص بھی اپنی لڑکی کو فاقے کرانے کے لئے آپؒ کے گھر نہیں بھیجے گا۔

''تمہارے باپ دادا مفلس نہیں تھے۔ خدا نے انہیں اپنے فضل سے جاگیریں عطا کی تھیں۔'' قاضی دانیال نے آپؒ کے عذر کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''اب بھی جائیداد اتنی ہے کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ آرام سے گزر کر سکتے ہو۔'' اس کے بعد کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہی تھی۔ آپ نے بادلِ ناخواستہ ماموں کو اجازت دے دی مگر ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی۔

''اس معصوم لڑکی کو بھی مجھ فقیر کی حالتِ زار بتا دیجئے گا۔ میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ آپ اپنے اثرات سے

کام لے کر انہیں سنہری باغ دکھائیں اور بعد میں جب لڑکی اور اس کے اہلِ خانہ کو میری حقیقت معلوم ہو تو خیالوں کی دلفریب جنت، آزمائشوں کے جہنم میں بدل جائے۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ خاموش ہو گئے اور قاضی دانیال کے چہرے پر بے پناہ مسرتوں کا رنگ نمایاں ہو گیا۔ اس بھری دنیا میں بس ایک ماموں ہی آپؒ کے حقیقی غم خوار تھے۔ حضرت شیخ کی شادی کا ذکر چھڑا اور پھر چند ہی دنوں میں یہ بات بستی بستی پھیل گئی۔ قاضی دانیال کو یقین تھا کہ وہ ایک بار عبدالقدوس کے رشتے کی بات اپنی زبان پر لے آئیں گے اور پورا شہر ان کے دروازے پر ٹوٹ پڑے گا۔ یہ اُس علاقے کا معزز ترین خاندان تھا۔ جن کی درویشی دلوں پر حکومت کرتی تھی۔

قاضی دانیال دماغوں پر حکومت کرتے تھے، اس لئے عام لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جہاں بھی شادی کا پیغام لے کر جائیں گے، صاحبِ خانہ ان کی بات ٹالنے کی جرأت نہ کرے گا۔ خود قاضی دانیال بھی اپنے رعب و جلال کے بارے میں یہی تصور رکھتے تھے۔ مگر جب عمل کا وقت آیا تو انہیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ جہاں بھی اپنے بھانجے کی شادی کی بات کرتے، لوگ یہ کہہ کر معذرت طلب ہوتے کہ کچھ دن پہلے ہی ان کی لڑکی کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ اگر اُنہیں ذرا بھی علم ہو جاتا تو وہ اس نسبت پر فخر محسوس کرتے۔ ابتداء میں قاضی دانیال نے اسے محض اتفاق سمجھا۔ لیکن جب تسلسل کے ساتھ ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا تو سوچ میں پڑ گئے۔ فوراً ہی خیال گزرا کہ لوگ ان کی حاکمیت کے خوف سے واضح انکار کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس کے بعد قاضی دانیال نے اپنے چند معتمد دوستوں کو اس کام پر آمادہ کیا کہ وہ ان لڑکی والوں سے ملیں اور خفیہ طور پر حقیقت جاننے کی کوشش کریں۔ چند ہی دنوں میں اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ برآمد ہو گیا۔ دوستوں نے قاضی دانیال کو بتایا کہ لوگ آپ کے حکمانہ اختیارات سے ڈرتے ہیں، اس لئے روبرو اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر پاتے۔ ویسے ان کا خیال ہے کہ کوئی دانش مند باپ ایک پاگل لڑکے کو اپنی لڑکی نہیں دے سکتا۔

''پاگل؟'' ایک لمحے کے لئے قاضی دانیال کے ہونٹ کانپے مگر دوسرے ہی لمحے ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ پھر پورے جسم میں غصے کی ایک تیز لہر اُٹھی، جس پر انہوں نے بمشکل تمام قابو پایا۔ جذبات کی اس کشمکش میں قاضی دانیال کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا، پیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھے اور بھانجے کے گھر چلے گئے۔

حضرت عبدالقدوسؒ نے کھڑے ہو کر ماموں کا استقبال کیا اور جیسے ہی ان کے چہرے پر نظر پڑی، آپ چونک اٹھے۔

''ماموں حضور! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' حضرت شیخ نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

''بیٹے! دنیا والوں نے مجھے شکست دے دی ہے۔'' قاضی دانیال، گلوگیر آواز میں بول رہے تھے۔ ''میں تیرے لئے دَر دَر پھرا، مگر کسی نے میری بات نہیں مانی۔ اب تو یہی دل چاہتا ہے کہ ایک بار بستی والوں کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کروں، پھر لوگوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہاں کون پاگل ہے۔'' قاضی دانیال کے جذبات بھڑک چکے تھے۔

''آپ کا اپنی اولاد سے جذبۂ محبت تسلیم مگر وہ لڑکیاں بھی تو کسی کا جگر گوشہ ہیں۔ ان کے پیاروں کو بھی ان سے محبت ہوگی۔'' حضرت شیخ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ انتہائی پُرسکون انداز میں بول رہے تھے۔ ''اپنی محبت کے جوش میں دوسروں کی محبت کو فراموش نہ کیجئے۔ آج یقیناً آپ ان بے بس انسانوں کے سامنے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں مگر کل یہی مظاہرہ آپ کے خلاف ہوگا۔ اس وقت سے خوف کھائیے جب یہ زمین جس پر آپ کھڑے ہیں، اپنے رب کے حضور تمام خبریں بیان کر دے گی، ساری ناانصافیوں کا پتہ بتا دے گی۔

پھر آپ اپنے بھانجے کی ذلت سے ڈرتے کیوں ہیں؟ وہ تو کوچۂ عشق میں ازل سے رُسوا ہے۔ بازار کا ایک مسلمہ اصول ہے، کوئی ہوش مند تاجر بیکار چیزوں کی خریداری نہیں کرتا۔ اس حقیقت کو فراخ دلی سے برداشت کیجئے اور ان لوگوں کو معاف کر دیجئے۔ وہ معصوم و بے گناہ ہیں، ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔ خدا کی قسم! ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔"

دکھلائیں گے لے جا کے تمہیں مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنسِ گراں کا

قاضی دانیال اس مردِ حق کی باتوں کا کیا جواب دیتے، لڑکھڑاتے قدموں سے واپس چلے گئے۔

آپؒ کے پیر و مرشد حضرت شیخ محمدؒ کی دو بہنیں تھیں جو حضرت شیخ عارفؒ کی صاحب زادیاں اور حضرت احمد عبدالحقؒ کی پوتیاں تھیں۔ ان میں سے بڑی لڑکی کا عقد سیّد شریف نام کے ایک شخص سے ہوا تھا۔ شروع میں تو سیّد شریف کا کردار ظاہر نہ ہوسکا، مگر شادی کے فوراً بعد ہی اس کی بداعمالیاں سامنے آ گئیں۔ ایک قطب کی پارسا بیٹی، شوہر کی سیاہ کاریوں کو کب تک برداشت کر سکتی تھی؟ بہت دن انتظار کیا، مگر سیّد شریف راہِ راست پر نہیں آیا۔ آخر دونوں میاں بیوی کے درمیان ہمیشہ کے لئے نفرت کی ایک دیوار کھڑی ہو گئی۔

شیخ محمدؒ کی والدہ کو اپنی بیٹی کی خوشیوں کی تباہی کا بہت غم تھا۔ وہ اس صدمے سے نڈھال ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب کچھ دنوں سے انہیں چھوٹی لڑکی کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی مگر مناسب رشتہ نہ ملنے پر تمام اہلِ خانہ فکر مند تھے۔ ردولی کے کئی معزز خاندان اپنے لڑکوں کی شادی شیخ محمد کی بہن سے کرنا چاہتے تھے مگر لڑکی کی والدہ ایک انجانے خوف سے سہمی ہوئی تھیں۔ اگر چھوٹی لڑکی کا شوہر بھی آوارہ نکل گیا تو وہ مکمل طور پر زندہ درگور ہو جائیں گی۔ اس خیال سے انہوں نے رشتے واپس کر دیئے تھے۔ جب کوئی رشتے داران سے اس جھجک کا سبب دریافت کرتا تو وہ صاف صاف کہہ دیتیں کہ میں نے لڑکی کا معاملہ اس کے دادا پر چھوڑ دیا ہے۔

یہ جواب سن کر بعض تنگ نظر اور حاسد عورتیں جل اُٹھتیں اور تلخ لہجے میں پوچھنے لگتیں۔ "کیا لڑکی کے دادا، قبر سے اُٹھ کر تمہیں بتانے آئیں گے؟"

شیخ محمدؒ کی والدہ بھی ان فضول سوال و جواب سے جھنجلا اُٹھتیں اور غصے میں کہہ دیتیں۔ "ہاں! انہیں پوتی کے لئے قبر سے اُٹھ کر آنا ہوگا۔"

رشتہ مانگنے والی عورتیں یہ عجیب و غریب انکار سن کر لڑکی کی ماں کا مذاق اُڑاتی ہوئی چلی جاتیں۔ بعض دل جلی یہاں تک کہہ دیتیں کہ کیا بڑی لڑکی کا رشتہ بھی طے کرنے کے لئے دادا جان ہی قبر سے اُٹھ کر آئے تھے؟ یہ ایک ایسا طنز ہوتا کہ وہ دل پکڑ کر رہ جاتیں۔ زبان سے کچھ کہنے کے بجائے آسمان کی طرف دیکھنے لگتیں اور پھر ان کے چہرے پر گہری اُداسی پھیل جاتی۔

یہ کوئی بہانہ سازی نہیں تھی کہ وہ لڑکی کے دادا کا نام لے کر رشتہ مانگنے والوں کو ٹالنا چاہتی تھیں۔ بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت تھی کہ انہوں نے چھوٹی لڑکی کے سلسلے میں حضرت احمد عبدالحقؒ کی رہنمائی طلب کی تھی۔ وہ بہت دن سے اس بات کی منتظر تھیں کہ لڑکی کے دادا روحانی طور پر ان کی مدد کریں گے مگر ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی انہیں اپنی اس درخواست کا جواب نہیں ملا۔

شیخ محمدؒ کی والدہ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھیں۔ آخر اسی کرب کے عالم میں ایک رات انہوں نے خواب دیکھا۔ محفلِ سماع آراستہ تھی۔ عبدالقدوس گنگوہیؒ جو حاضرین کی پہلی صف میں موجود تھے، اچانک اپنی جگہ سے

اُٹھتے ہیں اور پھر فوراً ہی لڑکھڑا کر گر جاتے ہیں۔ محفل میں ایک شور سا برپا ہوتا ہے، ہر شخص اپنی جگہ پریشان ہے اور حیرت زدہ نگاہوں سے عبدالقدوسؒ کو دیکھ رہا ہے جن کے دونوں ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ تمام اہلِ مجلس، شیخ عبدالقدوسؒ سے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے مگر کوئی اُنہیں اُٹھانے کے لئے آگے بڑھنے کو تیار نہیں تھا۔ یکایک محفل میں ایک گوشے سے حضرت احمد عبدالحقؒ نمودار ہوئے۔ آپؒ کو دیکھتے ہی تمام حاضرین احتراماً کھڑے ہو گئے۔ حضرت احمد عبدالحقؒ نے شیخ عبدالقدوسؒ کو اپنی آغوشِ مبارک میں لیا اور پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی خواتین کی طرف بڑھے۔ پھر شیخ محمدؒ کی والدہ کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔

''اس بچے کو اپنی آغوش میں لے لو اور پرورش کرو۔''

اس کے ساتھ ہی خواب کی کیفیت ختم ہو گئی اور شیخ محمدؒ کی والدہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ عجیب و غریب نا قابلِ فہم خواب تھا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی تھی کہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو بیٹا بنا لیا جائے مگر ان کے پاؤں ٹوٹنے کا مفہوم عقل سے بالاتر تھا۔ آپؒ خود بھی ایک پارسا عورت تھیں لیکن خواب کی تعبیر ایک الگ چیز ہے۔ آپؒ نے کئی دن تک بہت غور و فکر کیا مگر حضرت احمد عبدالحقؒ کے اشارے کو نہ سمجھ سکیں۔ عاجز آ کر اپنے بیٹے شیخ محمدؒ کو خواب سنایا۔ وہ بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ پھر کسی نے بتایا کہ ضلع بارہ بنکی کی ایک مسجد کے امام خواب کی تعبیر کا فن جانتے ہیں۔ وہ گوشہ نشین بزرگ ہیں، دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، نماز پڑھ کر اپنے حجرے میں چلے جاتے ہیں اور دوسری نماز سے پہلے باہر نہیں آتے۔ شیخ محمدؒ کی والدہ نے مجبوراً یہ طویل سفر اختیار کیا اور بارہ بنکی پہنچیں۔ جب ان بزرگ کو آپؒ کی آمد کا علم ہوا تو شرمسار ہو کر کہنے لگے۔

''آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے حکم دیتیں، میں خود حاضر ہو جاتا۔ آپ تو ان کی بہو ہونے کے ناطے لائق صد احترام ہیں۔ ویسے میری نظر میں حضرت احمد عبدالحقؒ کی گلی کا ہر ذرّہ آفتاب ہے۔ فرمائیے! آپ نے یہ تکلیف کیوں گوارا کی؟''

شیخ محمدؒ کی والدہ، بزرگ کے آداب و اخلاق سے بہت متاثر ہوئیں اور پھر آپ نے پوری تفصیل سے اپنا خواب بیان کر دیا۔ بزرگ کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے، آخر کار کافی غور و فکر کے بعد انہوں نے شیخ محمدؒ کی والدہ سے پوچھا۔

''غالباً آپ اپنی کسی بیٹی کی شادی کے بارے میں پریشان ہیں۔''

شیخ کی والدہ نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

''آپ آنے والے رشتوں کی طرف سے پریشان ہیں کہ لڑکا کس کردار کا ہوگا؟ کیا آپ کو اس سلسلے میں پہلے بھی کوئی تلخ تجربہ ہو چکا ہے؟'' بزرگ نے دوسرا سوال کیا۔

''جی ہاں!'' شیخ کی والدہ نے مختصراً جواب دیا۔ انہیں بزرگ کے علم پر حیرت ہو رہی تھی۔

''آپ نے خواب میں جس نوجوان کے پاؤں ٹوٹے ہوئے دیکھے ہیں، وہ کون ہے؟'' بزرگ نے تیسری بار پوچھا۔

''وہ نوجوان، شیخ عبدالقدوسؒ ہے۔ میرے بیٹے، شیخ محمدؒ کا مرید۔'' والدہ نے وضاحت کی۔

''محترم خاتون! یہ خواب آپ کے تمام اندیشوں کا جواب ہے۔'' بزرگ نے تعبیر بیان کرنی شروع کی۔

''میری نظر میں نوجوان عبدالقدوس کے پاؤں ٹوٹنے کا یہی مطلب ہے کہ وہ معرفت کی منزل کا مسافر ہے۔ اب اس کے قدم کسی دوسرے راستے پر نہیں پڑیں گے۔ اور گود لینے سے یہ مراد ہے کہ آپ اسے اپنی دامادی میں

قبول کرلیں۔'' اتنا کہہ کر بزرگ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے پھر کہنے لگے۔

''جس نوجوان کے کردار کی حضرت احمد عبدالحقؒ گواہی دیں، میری زبان اس کی اس تعریف سے قاصر ہے۔ آپ اپنے دل میں کسی شک، کسی وسوسے کو جگہ نہ دیں۔ لڑکی کے لئے اس سے بہتر رشتہ فی الوقت ممکن نہیں۔''

شیخ محمدؒ کی والدہ نے بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور رودولی لوٹ آئیں۔ اپنے خواب کی تعبیر سن کر آپ کے تمام شبہات دُور ہو چکے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں آخری مشکل یہ درپیش تھی کہ بات کس طرح آگے بڑھے؟ خود اظہار کرتے ہوئے آپ کو شرم محسوس ہوتی تھی۔ غرض کچھ عرصہ اسی کشمکش میں گزرا لیکن ایک روز یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ شیخ عبدالقدوسؒ کے قریبی دوستوں کے دل میں کچھ خیال آیا تو سب نے مل کر ان کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ شیخ محمدؒ کی بہن سے شادی کرلیں۔

حضرت عبدالقدوسؒ اس تجویز پر سخت برہم ہوئے۔ ''ایک غلام کو آقازادی سے کیا نسبت؟''

دوست آپ کی ناراضگی سے دل برداشتہ نہیں ہوئے بلکہ انتہائی نرم لہجے میں کئی دن تک سمجھاتے رہے۔ بالآخر آپؒ نے کسی حد تک آمادگی کا اظہار کیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ شاید لڑکی کی والدہ اس رشتے کو پسند نہ کریں۔

''شیخ! تم راضی ہو گئے، بس یہ کافی ہے۔ باقی باتیں ہم پر چھوڑ دو۔'' دوستوں نے بے پناہ خوشی کا اظہار کیا اور فوراً آپ کے ماموں قاضی دانیال کے پاس گئے۔ انہوں نے لڑکوں کی بات سنی مگر اپنے سابق تجربات کی روشنی میں جانے سے انکار کر دیا۔ قاضی دانیال کو یہاں بھی ناکامی کا اندیشہ تھا۔ حضرت شیخ کے دوستوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''صرف ہماری خاطر یہ آخری تکلیف گوارا کر لیجئے۔'' لڑکوں کی ضد یہاں تک بڑھی کہ قاضی دانیال، شیخ محمدؒ کے گھر جانے کے لئے رضامند ہو گئے۔ رسمی گفتگو ہوئی اور پھر یہ عظیم رشتہ طے پا گیا۔ شیخ محمدؒ کے اہلِ خانہ نے اس نسبت کی شدید مخالفت کی۔ بعض لوگوں نے حضرت عبدالقدوسؒ کو دیوانگی کی تہمت سے بھی نوازا مگر لڑکی کی والدہ اور حضرت شیخ محمدؒ پر ان جاہلانہ باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

حضرت شیخ کے دوستوں نے شادی کے لئے خصوصی جوڑے کا اہتمام کیا تھا۔ پہلے تو آپؒ نے شادی کا لباس زیب تن کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر پھر احباب کی خوشنودی کے لئے اس پیرہن کو اپنے جسم پر سجا لیا۔ بارات کی روانگی سے قبل آپؒ اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے۔ اس کے بعد انتہائی سادہ اور باوقار انداز میں تقریب گاہ تک گئے۔ نکاح کی رسم ادا ہوئی، دوستوں نے مبارک باد دی۔ قاضی دانیال نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ آپؒ کی پیشانی چومی اور اہلِ محفل نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ نکاح سے فارغ ہوئے تو آخری رسم کی ادائیگی کے لئے آپؒ کو زنان خانے میں بلایا گیا۔

حضرت شیخ کا چہرۂ مبارک دیکھنے کے لئے عورتوں کا ایک ہجوم منتظر تھا۔ آپؒ نظریں نیچی کئے ہوئے اندر تشریف لے گئے۔ کچھ دیر تک عورتوں کی مخصوص رسمیں جاری رہیں۔ (واضح رہے کہ یہ وہ ہندوانہ رسمیں نہیں تھیں جو آج بھی پاک و ہند کے مسلمانوں میں شادی کے موقع پر انتہائی ناگزیر سمجھی جاتی ہیں) پھر ایک عورت نے حضرت امیر خسروؒ کا سہاگ پڑھا جسے سنتے ہی شیخ بے اختیار ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے آپؒ نے شادی کا لباس ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا۔ عورتیں اس راز کو کیسے سمجھتیں کہ محض ایک گیت نے شیخ کے دل کی دنیا کو زیر وزبر کر دیا ہے۔ ان کے خیال کی رسائی تو بس یہاں تک تھی کہ دولہا پر دیوانگی کا دورہ پڑا ہے۔ فریاد کی لے کیا تیز ہوئی کہ جاہلوں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ بعض بے ادب عورتیں حضرت شیخ محمدؒ کی والدہ سے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔

"آپ نے کس پاگل سے اپنی بیٹی بیاہ دی ہے؟"
کچھ توہم پرست خواتین تو اس لمحے کہہ رہی تھیں، جیسے کوئی کسی کے مرنے پر ماتم کرتا ہو۔"شادی کے جوڑے کی دھجیاں؟ ہائے کیسی بدشگونی ہے!"
کچھ نے ہمدردی کے پردے میں نشتر زنی کی اور کچھ نے دل آزاری کی تمام حدیں پار کرلیں۔ کسی نے کہا۔
"ایک کا شوہر آوارہ، دوسری کا دیوانہ۔"
کسی نے کہا۔"یہ لڑکی کے دادا جان کا انتخاب ہے۔"
بے شمار زبانیں تھیں اور گفتگو کے اَن گنت انداز۔ جس نے چاہا، شیخ کے عمل پر اظہارِ خیال کیا۔ مگر لڑکی کی والدہ خاموش رہیں۔ وہ اس اذیت ناک ہنگامے میں صبر و ضبط کی بہترین مثال پیش کر رہی تھیں۔ انہیں اپنے داماد کے کردار پر کوئی شک نہیں تھا لیکن وہ شیخ کی حالتِ جذب کو جاننے سے قاصر تھیں۔ رشتہ طے ہونے سے پہلے انہوں نے حضرت عبدالقدوس کی دیوانگی کے بہت سے واقعات سنے تھے لیکن خواب میں حضرت احمد عبدالحقؒ کے حکم اور پھر اس خواب کی تعبیر نے ان کے تمام اندیشوں کو دُور کر دیا تھا۔ پھر ایسا کیوں ہوا؟ انسانی فطرت سے مجبور ہو کر وہ مسلسل سوچ رہی تھیں۔ انہیں درویشوں کی حالتِ جذب کا کسی حد تک اندازہ تھا مگر شادی کے موقع پر اس مظاہرے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک ماں کے سینے میں حسرتِ ناکام جل اُٹھی۔ تقدیر نے بیٹی کی رخصت کے لئے عجیب وقت کا انتخاب کیا تھا۔ کئی تمناؤں کے دُھندلے خاکے ذہن میں اُبھرے، کئی آرزوؤں کی لاشیں نظروں کے سامنے سے گزریں لیکن شیخ محمدؒ کی والدہ نے اس مقدس خاندان کی روایت پر حرف نہیں آنے دیا۔ بڑے باوقار انداز میں چاک گریباں داماد کے سر پر ہاتھ رکھا اور لازوال محبت کے سائے میں بیٹی کو الوداع کیا۔
لوگ آہستہ آہستہ چلے گئے۔ غم خوار بھی، دشمن بھی۔ کسی سے کوئی شکایت نہیں کی، میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ تنہائی ملی تو خیالات پھر بھٹک گئے۔ درد کی لہریں اُٹھتی رہیں مگر کوئی آہ لب تک نہ آئی۔ نصف شب سوچتے سوچتے گزر گئی، پھر نیند نے اپنے حصار میں لے لیا۔ خواب میں انہوں نے دیکھا کہ حضرت احمد عبدالحقؒ فرما رہے تھے۔
"اُداس نہ ہو کہ تم نے اپنی بیٹی اس شخص کو دی ہے جو ہندوستان میں سب سے زیادہ باہوش ہے۔"
شادی کے دوسرے روز رسمِ دنیا کے مطابق حضرت شیخ اپنی سسرال تشریف لے گئے تھے۔ آج آپؒ نے ایک عمدہ لباس زیب تن فرمایا تھا۔ ساس کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی باادب کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹے جب تک انہوں نے انتہائی محبت سے آپؒ کے سر پر اپنا دستِ شفقت نہ رکھ دیا۔
"مادرِ گرامی! آپ کا یہ ناکارہ بیٹا سخت شرمندہ ہے کہ اس کی وجہ سے شادی کی تقریب ہنگاموں کی نذر ہو گئی۔" حضرت شیخ کے لہجے سے شدید کرب کا اظہار ہو رہا تھا۔"بے شک یہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ آپ کی تو ساری خوشیاں خاک میں مل گئی ہوں گی۔ مگر میں مجبور تھا۔ مادرِ محترم! آپ مجھے معاف فرما دیجئے۔" حضرت شیخ کا اخلاقِ عالیہ دیکھ کر وہ خوشی کے جذبات سے سرشار ہو گئیں اور گزشتہ رات کے واقعات تیزی سے دُھندلانے لگے۔
"اپنے بچوں سے شکایت کس ماں کو نہیں ہوتی۔" شیخ کی مادرِ نسبتی نے محبت سے کہا۔"وہ تو بس چند لمحوں کی بات تھی۔ جاہل عورتوں کے شور نے کچھ دیر کے لئے پریشان کر رکھا تھا۔ مگر اب مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ تم بھی شیخ محمدؒ کی طرح میرے لائق فرزند ہو۔" یہ کہہ کر آپ مسکرانے لگیں۔ رات کی سوگوار فضا ختم ہو چکی تھی۔
حضرت شیخ اپنے دوستوں کے ساتھ ایک آراستہ تخت پر جلوہ افروز تھے۔ آج آپؒ کے چہرے کی دلکشی کا عالم

ہی کچھ اور تھا۔ ایسی نورانی شکل کہ دیکھنے والوں کی نظر ہی نہیں ٹھہرتی تھی۔ لباس بھی شادی کا تھا۔ غرض آپؒ مردانہ حُسن و وجاہت کا بہترین نمونہ دکھائی دیتے تھے۔ لوگ آپؒ کی اس ظاہری تبدیلی کو دیکھ کر حیران و پریشان ہو رہے تھے کہ راتوں رات یہ انقلاب کیسے آ گیا؟ وہ اسے بھی آپؒ کی دیوانگی کی کوئی ادا سمجھتے تھے مگر انہیں کیا معلوم کہ حضرت شیخ نے اپنی بیوی کی خوشی کی خاطر یہ ظاہری شکل اختیار کی تھی۔ کچھ دیر کے بعد آپؒ کو زنان خانے میں بلایا گیا۔ حسبِ دستور وہاں بے شمار عورتیں موجود تھیں۔ آپؒ نے خواتین کے ہجوم پر نظر ڈالی، اکثر عورتیں منہ پھاڑے ہنس رہی تھیں۔ آپؒ نے فوراً اندازہ کر لیا کہ یہ وہی مذاق اُڑانے والی خواتین ہیں جنہوں نے دُلہن کی والدہ کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ حضرت شیخ نے کھڑے ہو کر تمام عورتوں کو رسمی سلام کیا اور پھر اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

''آج تو یہ پاگل کچھ ٹھیک نظر آ رہا ہے۔''

اچانک حضرت شیخ کے کانوں میں ایک عورت کی آواز آئی۔ آپؒ نے بے نیازانہ اس طرف دیکھا جدھر سے یہ آواز آئی تھی۔ سامنے ہی ایک بے ہنگم سی عورت کھڑی جانوروں کی طرح اپنے دانتوں کی نمائش کر رہی تھی۔ حضرت شیخ نے اس بے ہنگم خدوخال والی عورت کو مخاطب کیا۔

''خاتون! آپ کے بچے کا کیا حال ہے؟'' حضرت شیخ کا لہجہ بہت نرم تھا۔ ''اسے بھی شادی کی تقریب میں لانا چاہئے تھا، بچہ ان ہنگاموں میں بہل جاتا۔'' حضرت شیخ نے مسکراتے ہوئے اس عورت سے کہا۔

آپؒ کی بات سن کر عورت کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ وہ حیرت سے آپؒ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''آپ ایک سنگ دل عورت ہیں۔'' شیخ نے دوبارہ اس عورت سے کہا۔ ''یہ بھی تو مائیں ہیں جو بچوں کو اپنے ہمراہ لئے پھرتی ہیں، وہ معصوم کب تک اکیلا گھر میں پڑا رہے گا؟ اس کا بھی حق ہے کہ وہ دنیا کی رونق دیکھے، اپنے ہم عمر بچوں کے ہمراہ کھیلے۔ آخر اس نے کیا گناہ کیا ہے کہ اسے اتنی کڑی سزا دی جا رہی ہے۔ مجرم تو ماں باپ ہیں، بچے کا کوئی قصور نہیں۔ جاؤ، گھر کے دروازے کھول دو۔ اس بچے کو عبدالقدوسؒ کی شادی کے جشن میں شریک ہونا چاہئے۔'' یہ کہہ کر آپؒ دوبارہ مردان خانے میں چلے گئے اور عورتوں کی محفل پر موت کا سناٹا چھا گیا۔ تمام خواتین اس عورت کو دیکھنے لگیں جس سے کچھ دیر قبل حضرت شیخ مخاطب تھے۔ بات پھیل چکی تھی، کئی عورتیں اس راز سے واقف تھیں کہ اس عورت کا دس سالہ بچہ جذام (کوڑھ) کے مرض میں مبتلا ہے۔ اسی وجہ سے اس لڑکے کو گھر میں نظر بند رکھا جاتا تھا۔ ماں باپ نے گھر کے ایک گوشے میں اس کے رہنے کی جگہ بنا دی تھی۔ ابھی مرض ابتدائی مرحلے میں تھا، ورنہ کچھ دن ان لوگوں کو وہ بستی میں بھی چھوڑنی پڑتی۔ تمام عورتیں اس کے قریب سمٹ آئی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھی۔ ''بہن! جلدی سے اسے لے آ۔'' ایک عورت نے مشورہ دیا۔

''کیسے لے آؤں؟'' غم زدہ عورت سسک پڑی۔ ''اسے یہاں کون آنے دے گا؟'' اب وہ کسی سے نہیں مل سکتا۔ اس پر دنیا کے دروازے بند ہو چکے ہیں، اسے وہیں مر جانے دو۔ اسے وہیں گھٹ گھٹ کر مر جانے دو۔'' ایک ماں کی مجبوری قابل دید تھی۔ کچھ نرم دل عورتیں بھی اس کے ساتھ رونے لگیں۔

یکایک دُلہن کی والدہ اس عورت کی طرف بڑھیں اور پُر جوش لہجے میں بولیں۔ ''اسے لے آ! میرے گھر لے آ۔ یہاں اسے کوئی نہیں روکے گا۔ میرے شیخ نے اسے بلایا ہے۔ وہ میرے داماد کا مہمان ہے۔''

''نادان عورت! جلدی کر۔'' دُلہن کی والدہ کے کہنے پر وہ عورت اپنے بچے کو لینے کے لئے گھر چلی گئی اور خانۂ عروس پر گہرا سناٹا چھا گیا۔ دُلہن کی والدہ نے مہمان عورتوں پر نظر ڈالی، سب کے چہروں پر شرمندگی کے آثار تھے اور گردنیں جھکی ہوئی تھیں مگر میزبان کا سر کچھ اور بلند ہو گیا تھا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا، حضرت شیخ سے دعوت

میں شریک ہونے کے لئے کہا گیا مگر آپؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔
''میرا ایک دوست آنے والا ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں کھا سکتا۔''
آپؒ کے تمام قریبی دوست موجود تھے، پھر کس کا انتظار ہے؟ لوگ سوچ سوچ کر حیران ہو رہے تھے مگر کسی میں حضرت شیخ سے معلوم کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا، شادی کے جس گھر میں کچھ دیر قبل نشاط انگیز شور برپا تھا، اب وہاں ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ مرد اپنے سوال کا جواب نہ ملنے پر حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے لیکن عورتیں اس خاموشی کے راز سے واقف تھیں۔ کچھ دیر اور ہو گئی پھر نا گہاں حضرت، زنان خانے میں تشریف لے گئے۔ پوری محفل پر ایک اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ حضرت شیخ نے جاتے ہی بلند آواز سے پوچھا۔ ''بچہ آ گیا؟'' جواب میں کئی آوازیں اُبھریں۔ آپؒ نے اِدھر اُدھر نگاہ کی تو ایک کونے میں وہی عورت اپنے بچے کو لئے کھڑی تھی۔ بچے کا پورا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ جذام کے اثرات سے بچنے کے لئے تمام عورتیں دُور دُور تھیں۔
''تم سب نے اس معصوم بچے کو تنہا ہی چھوڑ دیا۔ حالانکہ یہ بھی تمہاری طرح انسان ہے۔ پھر یہ فاصلے کیوں؟ تم اس واقعے سے عبرت کیوں نہیں پکڑتے؟ اگر تمہارا رب بھی تمہیں اسی طرح چھوڑ دے؟'' یہ کہہ کر حضرت شیخ، بچے کی طرف بڑھے اور اس کے جسم پر پڑی ہوئی چادر علیحدہ کر دی۔ بچہ بہت خوب صورت تھا لیکن اس کے ساتھ ہی کوڑھ کے داغ بھی نمایاں ہو چکے تھے۔ لڑکے کی ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے مگر دوسری عورتیں چیخ چیخ کر توبہ و استغفار کر رہی تھیں۔ کچھ کی آنکھیں خوف و دہشت سے اس طرح پھیل گئی تھیں جیسے انہوں نے فرشتۂ اجل کو اپنے قریب دیکھ لیا ہو۔
''آؤ میرے دوست!'' زنان خانے میں حضرت شیخ کی آواز گونجی۔ آپؒ کے دونوں ہاتھ لڑکے کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔ بچہ معصومانہ حیرت سے شیخ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جب اس کے قدموں کو جنبش نہ ہوئی تو آپؒ نے بے اختیار اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور لڑکے کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ یہ عمل دیکھ کر اکثر عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کے خیال میں پاگل دولہا ایک بار پھر اپنی دیوانگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ لیکن شیخ، حاضرین کے محسوسات سے بے نیاز اپنے کام میں مشغول رہے۔ لڑکے کے چہرے پر جہاں جہاں جذام کے نشانات تھے، وہاں وہاں شیخ نے اپنے مبارک ہونٹ رکھے۔ پھر اس کوڑھی بچے کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ آپؒ کی آنکھیں بند تھیں۔ یکایک دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شیخ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ در و دیوار ساکت ہو گئے۔ عورتوں کی زبانیں گنگ تھیں اور ان کے دلوں نے دھڑکنا چھوڑ دیا تھا۔ شیخ نے لڑکے کو اپنے جسم سے الگ کیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔
''اے طبیبِ حقیقی! زندوں کو مُردہ اور مُردوں کو زندہ کرنے والے! اس بچے پر رحم کر۔ اس کے ماں باپ کو ہدایت دے اور ان نادانوں کو بھی معاف کر دے جنہیں میری دل آزاری کے سوا کوئی اور کام نہیں ہے۔'' دعا ختم ہوئی۔ عورتوں نے دیکھا، لڑکے کا چہرہ صاف اور روشن تھا۔ جذام کے داغ اس طرح غائب ہو گئے تھے کہ ان کا ہلکا سا عکس تک باقی نہ تھا۔ محفل میں دوبارہ شور بلند ہوا۔ لڑکے کی ماں دیوانوں کی طرح آپؒ کے پائے مبارک پر اپنا سر رکھنے لگی۔ آپؒ نے پاؤں کھینچ لئے اور نہایت غضب کے عالم میں فرمایا۔
''بت پرستی کی عادت اب تک نہیں گئی۔'' یہ کہہ کر آپؒ نے لڑکے کو ساتھ لیا اور مردان خانے میں کھانا کھانے کے لئے تشریف لے گئے۔

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

شادی کے بعد بھی حضرت شیخ کی عبادت و ریاضت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ازدواجی ذمے داریاں پوری کرنے کے بعد آپؒ سارا وقت بندگانِ خدا کی خدمت اور یادِ الٰہی میں گزارتے۔ آپؒ بچپن ہی سے قناعت پسند تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ آپؒ کے صبر و قناعت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لڑکپن کا کچھ زمانہ حالتِ جذب میں گزرا۔ لیکن شیخ محمدؒ سے بیعت ہونے کے بعد آپؒ کی طبیعت معتدل ہوتی چلی گئی اور بھڑکتے ہوئے جذبات میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سنت پر شدت سے عمل کرتے تھے۔ آپؒ کا شمار صوفیائے کرام کے اس گروہ میں ہوتا ہے جو انتہائی محنت و مشقت کے بعد حلال روزی کماتے ہیں۔ حضرت شیخ کا پیشہ زراعت تھا۔ آپؒ زمین پر بڑی محنت کے بعد اناج بویا کرتے تھے۔ فصل اچھی ہوتی تو اُداس ہو کر فرماتے کہ اس سال میری ذمے داریاں بڑھ جائیں گی۔ اگر فصل خراب ہوتی تو خدا کا شکر ادا کرتے کہ اس نے اپنے گناہ گار بندے کو حساب سے بچا لیا۔ اپنی ضرورت کا اناج گھر میں رکھ لیتے، باقی درویشوں اور ضرورت مند افراد میں تقسیم فرما دیتے۔

یہ اسی تربیت کا نتیجہ تھا جو آپؒ نے اپنے پیر و مرشد اور دیگر اساتذہ کے سائے میں رہ کر حاصل کی تھی۔ حضرت شیخ اپنے ماضی کے واقعات اس طرح بیان فرماتے تھے۔

''میری عمر کا بڑا حصہ پانی بھرنے، مٹی ڈھونے، لکڑی کاٹنے اور اسی قسم کے دوسرے کاموں میں بسر ہوا۔ جمعہ کے دن خصوصاً اپنے اور اساتذہ کے کپڑے تالاب پر دھویا کرتا تھا۔ ہمارے یہاں ہر کام کا وقت مقرر تھا اور اس پر اتنی سختی سے عمل کیا جاتا تھا کہ شدید بیماری یا کسی دوسری مجبوری کے علاوہ طے شدہ کام ٹل نہیں سکتا تھا۔ یہ سختیاں میرے پیر و مرشد اور استادوں کی طرف سے اس لئے کی جاتی تھیں کہ ہم لوگ وقت کی قیمت کا اندازہ کریں۔ ہمارا ایک لمحہ بھی بے کار نہ گزرے اور شیطان، انسانی نفس پر حاوی نہ ہو۔ اتفاقاً ایک بار میرے پاس کپڑے کے دو جوڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے اپنے میلے لباس کو دھونے کے لئے استاد سے اجازت طلب کی مگر استاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید استاد نے میری بات نہیں سنی۔ میں نے دوبارہ درخواست کی مگر اس بار بھی استاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجبوراً میں نے تیسری مرتبہ گزارش کی تو استاد نے غصے سے فرمایا۔ ''تجھے ان کپڑوں نے خراب کیا ہے۔ تیرا نفس بے قابو ہو گیا ہے۔ لباس کو صاف کرنے کے لئے بے چین ہے، روح کو نہیں دھوتا کہ پھر تجھ سے متعلق ہر شے اُجلی ہو جائے۔'' اس تنبیہہ کے بعد میں جسم سے زیادہ روح کی صفائی پر توجہ دینے لگا۔''

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت شیخ نے مزید فرمایا۔ ''ہم اپنے اساتذہ کی خدمت کو عبادت ہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے، اس لئے جو تکلیفیں ہم نے اُٹھائی ہیں، آج کے مرید اُن کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آنے والا زمانہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہو گا اور پھر ایک وقت وہ بھی آئے گا، جب مرید بغیر محنت کے ولایت مانگیں گے۔''

یہ اسی روحانی تربیت کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ ''قطب عالم'' کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپؒ بظاہر شیخ محمدؒ کے مرید خاص تھے لیکن در پردہ آپؒ کو روح احمد عبدالحقؒ کی سرپرستی حاصل تھی۔ بچپن میں ایک بار مزارِ مبارک میں داخل ہوئے تھے، پھر تمام عمر اس روحانی حصار سے باہر نہ نکل سکے۔ آپؒ نے طویل سفر اختیار کئے بے شمار مقامات کی سیر کی، بزرگانِ دین سے فیض حاصل کیا۔ فقیروں کے درمیان بیٹھے، شاہوں کے دربار میں

کچھ دن گزارے مگر روح عبدالحقؒ زندگی کے ہر موڑ پر نگران رہی۔ بعض تاریخی روایتوں میں یہ بھی درج ہے کہ آپؒ نے جاگتی آنکھوں سے کئی بار حضرت عبدالحق ردولویؒ کے نورانی پیکر کو دیکھا۔ یہ شادی کے بعد کا واقعہ ہے۔ ایک رات آپؒ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ اچانک احمد عبدالحقؒ دروازے سے اندر داخل ہوئے اور تیز لہجے میں فرمانے لگے۔

''ہم نے تمہارا سب کچھ جلا دیا مگر تم اب بھی گھر نہیں چھوڑتے۔ اُٹھو اور اپنی بیوی کو لے کر بھیکن درزی کے یہاں چلے جاؤ۔''

بڑا ہولناک خواب تھا۔ فوراً آپؒ کی آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ آپؒ نے اپنی شریک حیات کو جگایا، سامان کو چھوا تک نہیں، صرف قرآن شریف لیا اور مکان سے نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر بعد بھیکن درزی کے یہاں پہنچے۔ وہ اپنے دروازے پر بے قراری کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ آپؒ کو دیکھتے ہی تیزی سے آگے بڑھا اور انتہائی ادب کے ساتھ مخاطب ہوا۔

''آیئے آقا زادے! ابھی حضرت شیخ تشریف لائے تھے اور غلام کو آپ کی آمد کی خبر دی تھی۔''

آپؒ بیوی کے ہمراہ اندر چلے گئے۔ جب تک وہاں رہے، بھیکن ملازموں کی طرح دست بستہ آگے پیچھے گھومتا رہا اور آپؒ زیر لب یہی کہتے رہے:

''تیرے چاہنے والے کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں نظر آتے ہیں۔''

آتش زنی کے اس واقعہ میں حضرت شیخ کے لئے بڑا سبق تھا۔ آپؒ اپنے مریدوں کو اس حادثے کی تفصیلات سناتے ہوئے فرماتے تھے۔ ''وہ آگ نہیں، ایک آزمائش تھی۔ خدا نے مجھے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے ذریعے دہری تنبیہہ کی تھی۔ ایک یہ کہ اللہ کی گرفت سے کوئی شخص بھی دُور نہیں، وہ چاہے تو اولیاء کو پکڑ لے اور گناہ گاروں کو اپنے فضل سے بخش دے۔ دوسرے یہ کہ ولایت کسی کی میراث نہیں۔ ہم جسے دھوبی، درزی یا حجام سمجھتے ہیں، وہ قطب وقت بھی ہوسکتا ہے۔''

آگ لگنے کا ایک اور واقعہ بھی بہت مشہور ہے۔ ابراہیم لودھی کی شکست سے پہلے حضرت شیخ، ردولی میں مقیم تھے۔ ایک روز اس علاقے میں خوفناک آگ لگی۔ بے شمار مکانات جلنے کے ساتھ سینکڑوں انسان بھی ہلاک ہو گئے۔ یہاں تک کہ شعلے حضرت شیخ کے جسم مبارک کی طرف بھی بڑھے۔ آپؒ کے ہاتھ کا رومال اور تسبیح جل گئی کپڑے بھی جلے مگر بدن محفوظ رہا۔ اس واقعہ نے حضرت شیخ کو بہت مغموم کر دیا تھا۔ آپؒ ایک دن اسی افسردگی کے عالم میں مسجد کی طرف جا رہے تھے کہ ایک مجذوب نعرہ زنی کرتا ہوا قریب سے گزرا۔

''اسی پر عاشقی کا دعویٰ تھا کہ ایک چنگاری دامن تک آئی تو چیخ اُٹھا۔ لوگوں کے گھر جلے، جسم جلے، دل جلے روح جلی، سب کچھ جل گیا۔ مگر جلنے والوں نے اُف تک نہ کی۔''

مجذوب کی باتیں سن کر آپؒ رات بھر مسجد میں روتے رہے۔ برسوں اس واقعے کو یاد کر کے لرز جاتے۔ اور پھر نہ جانے کتنی راتیں آپؒ نے آہ و زاری میں گزار دیں۔

محاسبۂ نفس، کثرتِ عبادت، گریۂ نیم شبی، عجز و انکسار، آسائش دنیا سے بے نیازی، غرض یہی وہ ہتھیار تھے جن سے آراستہ ہو کر آپؒ جہادِ زندگانی میں شریک ہوئے۔ طاغوتی قوتوں سے طویل جنگ کی اور پھر فاتح عالم قرار پائے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، مخدوم علاؤالدین صابر کلیریؒ، محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ اور شیخ عبدالحقؒ کی ارواحِ مقدسہ آخری سانس تک آپؒ پر سایہ فگن رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیدائش سے پہلے حضرت اشرف

جہانگیر سمنانیؒ نے آپؒ کو "قطب عالم" کہہ کر پکارا اور بعد میں آنے والے مردانِ کامل نے "بایزید دہر" اور "فرید عصر" کے ناموں سے یاد کیا۔

لودھی خاندان کے دورِ حکومت میں عمر خان شیروانی ایک بااثر شخص تھا۔ سلطان بہلول لودھی نے شہزادے نظام سکندر شاہ کی تربیت کی ذمے داری اس کے سپرد کر دی تھی۔ سکندر شاہ فطرتاً مغرور تھا۔ فرمانروائے وقت کا بیٹا ہونے کے احساس نے سے کسی حد تک گستاخ بھی بنا دیا تھا۔ عمر خان کچھ دن تک سکندر شاہ کی حرکتیں برداشت کرتا رہا اور پھر ناراض ہو کر سلطان کے دوسرے لڑکے باربک شاہ کے پاس جون پور چلا گیا مگر اسے ہاں بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ باربک شاہ اپنے بھائی سکندر شاہ سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ عمر خان نے دل برداشتہ ہو کر جون پور بھی چھوڑ دیا۔ غیرت مند انسان تھا۔ شاہوں کی خوشامد سے نفرت تھی، اس لئے دربدر بھٹک رہا تھا۔ پھر کسی نے حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا۔ عمر خان خود بھی زندگی سے بے زار تھا، اس لئے سکونِ دل حاصل کرنے کی غرض سے بارگاہِ شیخ میں جا پہنچا۔

"میرا دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں۔ بڑی امیدیں لے کر آیا ہوں۔ اپنی عظیم الشان مملکت کے ایک گوشے میں غلام کو بھی جگہ دیجئے۔" یہ کہہ کر عمر خان شیروانی، حضرت شیخ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

آپؒ پٹھان سردار کے اندازِ گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور عمر خان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

"اگر اللہ کی زمین پر ہمارے لئے جگہ ہے تو پھر تجھے بھی ٹھکانا مل جائے گا۔ فکر مند نہ ہو کہ خدا تیرے تصور سے بھی زیادہ رحیم و کریم ہے۔" اس کے بعد حضرت شیخ نے عمر خان شیروانی کو ملک یونس مجذوب سے ملنے کے لئے کہا، ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ اس سوختہ جاں کا مزاج دیکھ کر حالِ دل بیان کرنا۔

عمر خان، حضرت شیخ کے حکم کے مطابق روانہ تو ہو گیا مگر راستے بھر اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کرتا رہا کہ کیا عبدالقدوس گنگوہیؒ جیسے بزرگ کی دعائیں ناکافی ہیں؟ اور کیا وہ مجذوب، حضرت شیخ سے زیادہ عارفانہ مقام کا مالک ہے؟ غرض ان ہی وسوسوں میں اُلجھا ہوا وہ ردولی کی حدود سے نکلا۔ ملک یونس کوئی چالیس پچاس میل کے فاصلے پر ایک جنگل میں گوشہ نشین پڑا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تو گاؤں کی طرف نکل آتا ورنہ اپنی جھونپڑی میں مہینوں گزار دیتا۔ قصبے کا ایک آسودہ حال شخص، مجذوب کا عقیدت مند تھا۔ وہی کھانے پینے کی اشیاء فراہم کر دیتا۔ ویسے ملک یونس نے خود کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اس شخص سے بھی کبھی گفتگو نہیں کی جو اسے دونوں وقت کھانا پہنچایا کرتا تھا۔ جب عمر خان شیروانی کو یہ حالات معلوم ہوئے تو اس پر شدید مایوسی طاری ہوئی مگر وہ حضرت شیخ کے حکم سے مجبور تھا۔ چار و ناچار مجذوب کی جھونپڑی تک پہنچا۔

ملک یونس ایک بوسیدہ سی میلی چادر اوڑھے ہوئے چٹائی پر لیٹا تھا۔ اس کی آنکھوں کا زاویہ بتا رہا تھا کہ جیسے وہ کسی خاص نقطے کو بغور دیکھ رہا ہو۔ عمر خان بہت دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ آخر مجذوب نے کروٹ لی۔ ایک لمحے کے لئے عمر خان کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی منہ پھیر لیا۔ یہ ایک ثانیے کی بات تھی۔ مگر عمر خان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا پورا جسم جل اُٹھا ہو۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو یقیناً دہشت زدہ ہو کر بھاگ جاتا۔ لیکن وہ حضرت شیخ کے حوالے سے یہاں آیا تھا، اس لئے بے خوف ہو کر کھڑا رہا۔ کافی دیر ہو گئی۔ عمر خان منتظر تھا کہ شاید مجذوب اس سے مخاطب ہو، مگر وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بالآخر عمر خان نے ملک یونس کو پکارا۔ مجذوب بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اس نے دوبارہ پکارا، لیکن ملک یونس کے جسم کو ہلکی سی جنبش تک نہ ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سماعت سے محروم ہو یا پھر اس کی روح اس دارِ فانی کی حدود سے نکل کر کسی دوسری دنیا میں محوِ پرواز ہو۔ عمر خان شیروانی

مایوس ہو چکا تھا لیکن اچانک اسے کچھ یاد آ گیا اور پھر وہ بلند آواز میں مجذوب سے مخاطب ہوا۔
''مجھے حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔'' ابھی جنگل کی فضا میں عمر خان کے الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ ملک یونس اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دیوانہ وار افغان سردار کی طرف بڑھا۔
''تجھے شاہ نے بھیجا ہے؟ کیسا ہے میرا شاہ؟ ٹھیک تو ہے؟'' مجذوب نے عمر خان کے دونوں بازو پکڑ لئے، اسے کھینچتا ہوا چٹائی تک لایا اور اپنی چادر بچھاتے ہوئے بولا۔ ''بیٹھ جا۔'' عمر خان احتراماً کھڑا رہا مگر ملک یونس نے اسے زبردستی چٹائی پر بٹھا دیا۔ ''کیا حکم ہے میرے شاہ کا؟'' مجذوب نے محبت سے پوچھا۔ اب رسمِ بیگانگی ختم ہو چکی تھی اور ملک یونس شدید اپنائیت کی باتیں کر رہا تھا۔ عمر خان نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ مجذوب یکایک خاموش ہو گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ عمر خان امید و بیم کی حالت میں اس کے رنگ بدلتے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ پٹھان سردار اس راز کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے اسے ایک دیوانے شخص کے پاس کیوں بھیجا ہے؟
چند لمحوں کے سکوت کے بعد مجذوب نے تیز آواز میں کہا۔ ''شاہ کا حکم ہے کہ تُو جا، حکومت کی کرسی پر بیٹھ جا۔'' ملک یونس ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ عمر خان نے گھبرا کر دیکھا۔ مجذوب کا ہاتھ اب بھی لکڑی کی اس بوسیدہ تپائی کی جانب اٹھا ہوا تھا جو گرد و غبار سے اٹی ہوئی جھونپڑی کے ایک گوشے میں پڑی تھی۔ ''جا بیٹھ جا۔ دربار کی کرسی پر بیٹھ جا۔'' مجذوب بڑبڑایا۔ ''عمر خان ہچکچا رہا تھا۔ ''جلدی کر..... کرسیاں ختم ہونے والی ہیں۔'' ملک یونس کی آواز ہیبت و جلال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عمر خان چپ چاپ اٹھا اور اس غلیظ سی تپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ مجذوب نے میلی چادر اٹھا کر اس کے جسم پر ڈال دی۔
''شاہ تجھے اپنے ہاتھ سے بھی خلعت پہنا سکتا تھا مگر وہ تو ہمیشہ غلاموں کو آگے بڑھا دیتا ہے۔ اس کے آگے کون زبان کھولے؟ ہونٹ نہیں جل جائیں گے؟''
عمر خان واپس ردولی آیا اور حضرت شیخ کی بارگاہ میں پہنچ کر پورا واقعہ سنا دیا۔ آپؒ مجذوب کی باتیں سن کر مسکرائے اور پھر فرمانے لگے۔
''وہ عشقِ الٰہی میں جل کر خاک ہو چکا ہے۔ اللہ اپنے سوختہ جانوں کی بات نہیں ٹالتا۔''
عمر خان نے ایک رات خانقاہ میں قیام کیا اور صبح حضرت شیخ کی قدم بوسی کے بعد اپنے گھر چلا گیا۔ اسے رہ رہ کر مجذوب کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ ابھی اس واقعے کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ سلطان بہلول لودھی کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ شہزادہ نظام، سکندر لودھی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اقتدار حاصل ہوتے ہی سکندر لودھی نے عمر خان شیروانی کو بے شمار تحائف بھیجے اور آئندہ ادب و احترام کے ساتھ پیش آنے کا یقین دلایا۔ عمر خان، دربارِ شاہی میں جانے سے پہلے حضرت شیخ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور اپنی عزت و آبرو کی سلامتی کے لئے مزید دعاؤں کی درخواست کی۔ سرہند شریف، پٹیالہ، شاہ آباد (ضلع کرنال) بھٹورا اور پائل پور، عمر خان شیروانی کا علاقہ تھا۔

اسی زمانے میں ردولی کے سیاسی حالات خراب ہونے لگے۔ سلطان بہلول لودھی کی موت اور اس کے جانشین کی نااہلی کے باعث مرکز کی گرفت کمزور ہو گئی تھی اور صوبائی شورشیں سر اٹھانے لگی تھیں۔ پورب کے علاقے میں کافروں نے یہاں تک غلبہ پا لیا تھا کہ بازاروں میں شراب کی دکانیں کھل گئی تھیں اور سرِ عام سور کا گوشت فروخت ہونے لگا تھا۔ ہوس پرستی اور قمار بازی، انسانی تہذیب کی علامت بن گئی تھی۔ شاہراہوں پر دن

کی روشنی میں بے حیائی کے مظاہرے ہونے لگے تھے۔ حضرت شیخ اس اخلاقی زوال سے اس قدر آزردہ ہوئے کہ آپؒ اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ جب عمر خان شیروانی کو حضرت شیخ کے اس فیصلے کی اطلاع ملی تو وہ خود ردولی آیا اور آپؒ سے اپنے علاقے شاہ آباد میں قیام فرمانے کی التجا کی۔ نتیجتاً آپ 897ھ میں شاہ آباد تشریف لے آئے اور پھر یہیں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے۔

شاہ آباد میں حضرت شیخ کا قیام تقریباً اڑتیس سال تک رہا۔ آپؒ کے دستِ حق پرست پر بے شمار لوگ مسلمان ہوئے۔ لاتعداد گمراہوں نے توبہ کی اور دولتِ ایمان سے سرفراز ہو کر اپنی آخرت کو سنوارا۔ اسی دوران آپؒ کو اپنے پیر و مرشد، حضرت شیخ محمدؒ کی شدید علالت کی خبر ملی۔ آپؒ بے قرار ہو کر دوبارہ ردولی پہنچے۔ مرض الموت شروع ہو چکا تھا۔ حضرت شیخ محمدؒ کبھی ہوش میں آ جاتے اور کبھی گھنٹوں بے ہوشی طاری رہتی۔ ایک بار حواس بحال ہوئے تو اہلِ خانہ سے پوچھا۔ ''عبدالقدوس آ گئے؟'' آپؒ نے فوراً آگے بڑھ کر سینۂ مرشد پر سر رکھ دیا۔

''سیّدی! غلام حاضر ہے۔'' اتنا کہا اور بچوں کی مانند چیخیں مار کر رونے لگے۔

''خاندانِ چشتیہ کا وارث آ گیا۔'' یہ کہہ کر شیخ محمدؒ نے پیرانِ چشت کے تبرکات آپؒ کے سپرد کئے اور نحیف آواز میں پوچھا۔ ''عبدالقدوسؒ! تمہاری امانت تم تک پہنچ گئی؟''

آپؒ جواب دینا چاہتے تھے مگر شدتِ غم سے زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

''یہ گریہ و زاری کا وقت نہیں۔ تمہارا زبانی اقرار ضروری ہے۔ فرشتۂ اجل انتظار کر رہا ہے۔'' نقاہت سے شیخ محمدؒ کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔

''بے شک! آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔''

''خدا کا شکر ہے۔ وہی اپنے بندوں کو اس بارِ گراں سے سبک دوش کرتا ہے۔'' یہ شیخ محمدؒ کے آخری الفاظ تھے۔ پھر ان ہونٹوں پر دائمی سکوت کی مہر لگ گئی جن سے نصف صدی تک علم و حکمت کے آبشار پھوٹتے تھے۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے آفتابِ معرفت کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا اور سوئم کے بعد ہی شاہ آباد واپس لوٹ آئے۔ ہندوؤں کی فتنہ انگیزیوں نے پہلے ہی ردولی کی فضا میں کثافت گھول دی تھی۔ مرشد کی وفات نے اس شہر کو مکمل تاریک کر دیا۔

شاہ آباد کے قیام کے دوران حضرت شیخ کے معمولات میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ آپؒ مخلوقِ خدا سے بے زار ہو کر گوشۂ تنہائی ڈھونڈتے تھے اور اب یہ صورت تھی کہ آپؒ ہر وقت انسانی ہجوم میں گھرے رہتے۔ بڑے بڑے امراء کو خطوط کے ذریعے نصیحت فرماتے۔ حاکموں کو انتہائی بے باکی کے ساتھ حق و انصاف کی تلقین کرتے اور سیاہ کاریوں میں مبتلا رہنے پر عذابِ الٰہی کی خبر دیتے۔ عام انسانوں کے لئے مجلسِ وعظ آراستہ کرتے۔ شرعی مسائل بیان فرماتے اور قوموں کے عروج و زوال کے واقعات اس قدر دلکش انداز میں سناتے کہ لوگ اپنی اپنی نشستوں پر پتھروں کی طرح جم جاتے۔

کچھ دنوں سے آپؒ کی تقریروں میں ایک اور انقلاب رونما ہوا تھا۔ شیریں سخنی ختم ہو گئی تھی اور لفظوں نے آتشیں لباس پہن لیا تھا۔ کبھی آپؒ فرماتے۔

''مسافروں کو کیا ہو گیا ہے؟ آنکھیں بند کئے نامعلوم منزل کی طرف بڑھے چلے جاتے ہیں...... کسی کو بھی ہوش نہیں کہ قزاق ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ کوئی بھی رہزنوں کے قدموں کی چاپ نہیں سنتا۔''

کبھی فرماتے۔ ''ہوا کے نرم جھونکوں نے سب کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔ پھر وہ ہوا، سیاہ آندھی میں تبدیل ہو

گئی......سونے والے اس وقت بیدار ہوئے، جب آندھی نے بڑے بڑے درختوں کو اُکھاڑ پھینکا۔ مکینوں کو اس وقت ہوش آیا، جب مکان سنگ وخشت کا ڈھیر بن گئے...... بے خبروں کا یہی حشر ہوتا ہے۔''

کبھی ارشاد ہوتا۔ ''لوگو! کیا تمہاری آنکھوں کی بینائی زائل ہو چکی ہے؟ آسمان سے خون برس رہا ہے۔ زمین سرخ ہو گئی......قہر ونفرت کی آگ نے تمہارے گھروں کو گھیر لیا ہے اور تم اطمینان سے دروازے بند کئے بیٹھے ہو۔ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔''

حاضرین آپؒ کا وعظ سن کر یہی سمجھتے کہ اُنہیں عذابِ آخرت سے ڈرایا جا رہا ہے۔ جب مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا اور افغان حکومت کی بنیادیں تک کھود ڈالیں، اس وقت لوگ آپؒ کی تقریروں کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہوئے۔ مگر طوفان سر سے گزر چکا تھا۔

بابر کے مقابلے میں ابراہیم لودھی کو شکست فاش ہوئی۔ اس وقت شاہ آباد، پٹھانوں کا مرکز تھا۔ میدانِ جنگ سے بھاگے ہوئے افغان بھی اسی مقام پر جمع ہو رہے تھے۔ بابر کی فوجوں نے اپنے حریف کا آخری نشان مٹانے کے لئے شاہ آباد پر بھی حملہ کر دیا۔ کئی دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ جو لوگ زندہ بچ گئے، انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ بھی اسیروں کے قافلے میں شامل تھے۔ شیخ عبدالقدوسؒ کی بابر کے دربار میں حاضری کی روایت یوں بیان کی جاتی ہے:

''شاہ آباد پر مغلوں کے حملے سے پہلے ہی آپؒ نے اپنے اہلِ خانہ سے فرما دیا تھا۔ ''اب بزرگوں کی سنت پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ہمارے مورثِ اعلیٰ، حضرت امام ابو حنیفہؒ کو بھی خلیفہ منصور نے زنجیر پہنائی تھی۔ ہمارے روحانی پیشوا، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی زنداں کے حوالے کئے گئے تھے، اس لئے ہم بھی رسمِ ماضی کو زندہ کریں گے۔'' اور پھر ایسا ہی ہوا۔ بابر کے فوجیوں نے آپؒ کے مکان کو گھیر لیا۔ عورتوں سے بدسلوکی نہیں کی گئی۔ انہیں صرف مردوں کی ضرورت تھی۔ حضرت شیخ نے انتہائی صبر وسکون سے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ مغل سپاہیوں نے آگے بڑھ کر آپؒ کے سر سے سیاہ پگڑی اُتار لی۔ اور اس سے دونوں فرزندوں کے ہاتھ باندھ دیئے۔ (باقی بچے چھوٹے تھے، اس لئے انہیں چھوڑ دیا گیا تھا) پھر اسیروں کا یہ مختصر سا قافلہ روانہ ہوا۔ حضرت شیخ اس وقت بیمار تھے، اس لئے آپؒ کو چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ مگر بابر کے سپاہیوں سے کوئی رعایت طلب نہیں کی۔ آپؒ راستے بھر اپنے دونوں بیٹوں کو صبر کی تلقین کرتے رہے۔

بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب آپؒ کو مغل شہنشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بعض مقامی لشکروں نے شکست کھانے کے بعد بابر کی اطاعت قبول کر لی تھی، اس لئے وہ بھی بابر کے خیمے میں موجود تھے۔ ان میں سے بعض لوگ آپؒ کی شخصیت سے واقف تھے اور ان کا خیال تھا کہ مغل شہنشاہ آپؒ کو ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ حضرت شیخ یا تو قتل کر دیئے جائیں گے یا پھر آپؒ کو عمر بھر کے لئے زنداں کی تاریکیوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس قیاس آرائی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ دوسرے مقامی باشندوں کو بابر نے معاف کر دیا تھا۔ لیکن ابراہیم لودھی اور اس کے ہم نواؤں کے لئے اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ موجود نہیں تھا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بہت سے لوگ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے قتل کی پیش گوئی کر رہے تھے، مگر آپؒ کے اطمینانِ قلب کا یہ حال تھا کہ چہرہ مبارک پر فکر و پریشانی کی ہلکی سی لہر بھی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ مغل شہنشاہ کی رنگین مزاجیوں کا وہی زمانہ تھا، جب امیر تیمور کا وارث ہاتھ میں شراب کا لبریز جام لے کر علی الاعلان کہا کرتا تھا ۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایسی صورتِ حال میں مغل حکمرانوں سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ دشمن کی صفوں میں رہنے والے کسی عالمِ دین کا لحاظ کریں۔

جب آپؒ بابر کے خیمے میں داخل ہوئے تو وہاں جشنِ فتح کا ہنگامہ برپا تھا۔ تمام وزیر و امیر اس عظیم الشان فتح پر مغل شہنشاہ کو مبارکباد پیش کر رہے تھے اور وہ جامِ سرخ سے دل بہلا رہا تھا۔

''یہ بوڑھا آپ کے دشمن، ابراہیم لودھی کے عہدِ حکومت میں بہت معزز تھا۔'' سپاہیوں نے اس تعارف کے ساتھ حضرت شیخ کو بابر کے سامنے پیش کیا۔ ''ہم نے مقامی لوگوں سے معلوم کیا تو پتہ لگا کہ پورا شاہ آباد اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہے۔''

بابر نے تضحیک کے انداز میں آپؒ کی طرف دیکھا۔ بابر فولادی اعصاب رکھنے والا ایک جنگجو انسان تھا۔ مگر حضرت شیخ سے نظر ملتے ہی اس کا جسم کانپنے لگا اور شراب کا پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ پورے دربار پر سکتہ طاری تھا۔ بابر کے درباری پہلی بار اپنے حکمران کو خوف و دہشت میں مبتلا دیکھ رہے تھے۔ وہ تخت سے اُٹھا اور آہستہ قدموں سے چلتا ہوا حضرت شیخ کے قریب آ کر رک گیا۔

''اگر یہ بزرگ، ابراہیم لودھی کے دور میں معزز تھے تو بابر کے عہد میں بھی محترم رہیں گے۔'' پھر حضرت شیخ سے ادب کے ساتھ مخاطب ہوا۔

''میرے سپاہیوں نے آپ کو غلطی سے گرفتار کر لیا ہے۔ دراصل وہ آپ کے مقام سے واقف نہیں تھے۔ میں ان کی اس حرکت پر شرمندہ ہوں...... آپ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ کی رہائی کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ سپاہی شاہی سواری میں آپؒ کو چھوڑنے کے لئے مکان تک آئے۔

قید سے آزادی حاصل کرتے ہی سب سے پہلا کام آپؒ نے یہ کیا کہ مغل شہنشاہ بابر کو خط لکھا۔ وہ ایک نصیحت نامہ تھا۔

''اگر تُو شریعتِ محمدی ﷺ پر عمل کرے گا تو دونوں جہاں میں سرخرو ہوگا۔ ابراہیم لودھی راستے سے بھٹک گیا تھا۔ گمراہوں کا حشر تُو نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ قدرت کسی کی بداعمالی کو معاف نہیں کرتی۔''

اگرچہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی گرفتاری اور پھر آپؒ کو اسی اسیری کی حالت میں مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر کے سامنے پیش کئے جانے کا واقعہ درست ہے...... اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مغل حکمران ''سلسلہ صابریہ'' کے عظیم بزرگ سے نہایت عزت و تکریم سے پیش آیا تھا..... مگر افغان مورخین نے مغل دشمنی سے کام لیتے ہوئے تاریخی حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے جس کے نتیجے میں بعض واقعات مسخ ہو کر رہ گئے ہیں۔ نتیجتاً تاریخ کے طالب علموں کو مغلیہ دور اور پٹھانوں کے زوال کا مطالعہ کرتے وقت شدید ذہنی اُلجھن پیش آ سکتی ہے۔ اس لئے یہاں حالات کے صحیح خدوخال کو پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔

ظہیرالدین بابر کی شخصیت شجاعت و مردانگی اور عیش پرستی کا عجیب مجموعہ تھی۔ جب وہ کیف و نشاط کی طرف متوجہ ہوا تو ہندوؤں کا دیو مالائی کردار ''راجہ اندر'' بن جاتا۔ راجہ اندر کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی سبھا (محفل) میں دنیا بھر کی سیم تن رقاصائیں جمع رہتیں۔ راجہ اندر، شراب میں بدمست ہو کر ان نوخیز اور ہوشربا عورتوں کا رقص دیکھتا رہتا۔ مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر کا بھی یہی حال تھا۔ اس نے بھی راجہ اندر کی طرح اپنی محفل آراستہ کی تھی جہاں پری چہرہ نازنینوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس وقت ظہیرالدین بابر، کابل کا حکمران تھا۔ اُس نے اس تاریخی شہر میں ایک نہایت دلکش سبزہ زار کے اندر سنگِ مرمر کا طویل و عریض حوض تعمیر کرایا تھا اور اسے اعلیٰ قسم کی شراب

سے لبریز کر دیا تھا۔ بابر اس حوض کے کنارے اپنے خوش ذوق دوستوں کے ساتھ رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کرتا اور جی بھر کے شراب پیتا...... لیکن بابر کی خوبی یہ تھی کہ شراب پینے کے بعد ظہیر الدین بابر نہ ہذیان بکتا تھا اور نہ اپنے ہوش و خرد گنواتا تھا۔ جبکہ اس کے تمام ساتھی کثرت شراب نوشی کے سبب اپنے حواس کھو بیٹھتے تھے۔ ظہیر الدین بابر نے اسی سنگِ مرمر کے حوض پر اپنا یہ شعر کندہ کرایا تھا۔

نوروز و نوبہار و مئے دلربا خوشیست
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

(زندگی بس نوروز، نوبہار، شراب اور عاشقی کا نام ہے..... اس لئے اے بابر ہر وقت عیش و نشاط کی تلاش کر..... کیونکہ تجھے دوبارہ زندگی نہیں ملے گی)

مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کا یہ فارسی شعر عالمگیر شہرت رکھتا ہے اور برصغیر پاک و ہند کے علاوہ امریکہ اور یورپ میں بھی ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ آج کل تمام مادہ پرست قوموں کا ایک ہی فلسفہ، ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی مذہب ہے۔ وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا تصور ہی موجود نہیں۔ اس لئے ایسے تمام افراد اور قومیں اسی نظریے کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتے ہیں۔ "Eat, drink and be happy" (کھاؤ، پیو اور خوش رہو) اہلِ نظر سمجھ سکتے ہیں کہ مغرب زدہ لوگوں کا یہ نظریہ دراصل ظہیر الدین بابر کے فارسی شعر کا ترجمہ ہے۔ واضح رہے کہ مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر، ترکی زبان کا بہت بڑا ادیب و شاعر بھی تھا۔ اس کی خود نوشت سوانح "توزک بابری" کو ترک ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے اور بابر کی شاعرانہ عظمت کا یہ حال ہے کہ چار سو سال گزر جانے کے بعد آج بھی ظہیر الدین بابر کو ترکی کا دوسرا بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے۔

ایک طرف مغل بادشاہ کے عیش و نشاط کا یہ حال تھا اور دوسری طرف جب ظہیر الدین بابر، میدانِ جنگ کا رخ کرتا تھا تو دشمنوں کی صفوں کی صفیں اُلٹ دیا کرتا تھا۔ ہم مغل سلطنت کے بانی کی صورت میں بیک وقت ایک ادیب، شاعر اور شمشیر زن کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تینوں صفات کسی کسی حکمران میں جمع ہوتی ہیں اور ظہیر الدین بابر ان ہی تاریخ ساز شخصیات کی فہرست میں نمایاں نظر آتا ہے۔

بے شک مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر، رقص و شراب کا بے حد دلدادہ تھا..... مگر ہمارے نزدیک یہ روایت درست نہیں کہ جب حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو پابہ زنجیر کر کے بابر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس وقت مغل شہنشاہ شراب پی رہا تھا...... اور تذکرہ نویسوں کے بقول حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا روحانی جلال دیکھ کر بابر کے ہاتھ سے شراب کا پیالہ گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو اپنے دربار میں طلب کرنے سے پہلے ظہیر الدین بابر نہ صرف شراب چھوڑ چکا تھا بلکہ اپنی گناہ گارانہ زندگی سے تائب ہو چکا تھا۔

اس واقعے کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت ہندوستان پر افغان حکمران سلطان ابراہیم لودھی کی حکومت تھی۔ اور مشہور تاریخی شہر آگرہ اس کا پایہ تخت تھا۔ سلطان ابراہیم لودھی ایک شجاع انسان ضرور تھا مگر خود پرستی اور تنگ نظری اس کی فطرت میں شامل تھی۔ مزید یہ کہ وہ نہایت مغرور و متکبر انسان تھا۔ سلطان ابراہیم لودھی کی کم ظرفی کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے قریب ترین رشتے داروں کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ نیز یہ کہ وہ اپنے امیروں اور فوجی سرداروں کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ پھر ایک ایسے خود غرض حکمران سے عدل و انصاف اور رعایا کی فلاح و بہبود کی امید کس طرح

رکھی جا سکتی تھی۔ اس کے دورِ حکومت میں ہندوستان کا گوشہ گوشہ جبر وستم اور ناانصافیوں سے بھر گیا تھا۔ سلطان ابراہیم لودھی، حق تعالیٰ کی بے پناہ نوازشات کا شکر ادا نہ کر سکا اور شدید کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوا۔ آخر سلطان ابراہیم لودھی کو دی ہوئی مہلت چھین لی گئی......اور ظہیرالدین بابر، عذابِ الٰہی کی صورت بن کر میدانِ جنگ میں نازل ہوا۔

سلطان ابراہیم لودھی کی کثیر تعداد فوج نے آغازِ جنگ میں بہت تیزی دکھائی۔ مگر گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ لودھی کی عسکری طاقت سلب ہوتی چلی گئی۔ سلطان کے متکبرانہ سلوک سے تمام لشکری پہلے ہی نالاں تھے۔ پھر جب مغل فوج کا دباؤ بڑھا تو افغانوں کی صفیں ٹوٹ کر بکھرنے لگیں۔ پٹھان سپاہیوں نے ایک انا پرست اور مغرور بادشاہ کے لئے زندگی داؤ پر لگانے کے بجائے اپنی جانیں بچانے ہی میں عافیت سمجھی۔ نتیجتاً افغان سپاہی مسلسل پسپا ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سلطان ابراہیم لودھی ذلت و بے کسی کی موت مارا گیا۔ اس جنگ میں سولہ ہزار افغان سپاہی تہہ تیغ ہوئے اور پچاس ہزار کے قریب ہندوستانی فوجی موت کی خوراک بنے۔ ظہیرالدین بابر فاتحانہ شان کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا۔ شیخ زین صدر نے ''بابر شاہ'' کے نام کا خطبہ پڑھا۔ اسی دن سے ظہیرالدین بابر نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ پھر وہ اس تاریخی شہر کی سیر کے لئے نکلا اور اولیائے کرام کے مزاراتِ مبارکہ پر جا کر فاتحہ خوانی کی۔ اس واقعے سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شہنشاہ بابر شراب نوش ضرور تھا لیکن وہ خدا کے برگزیدہ بندوں کا دل سے احترام کرتا تھا۔ بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضری دینے کے بعد آگرہ چلا گیا۔ اب مغل شہنشاہ کو بڑی اور فیصلہ کن جنگ کا سامنا تھا۔

اس وقت رانا سانگا، ہندوستان کے ہندو راجاؤں میں سب سے بڑا راجا تھا۔ ہندوستان میں بہت پہلے اس راجپوت خاندان کی حکومت تھی۔ رانا سانگا، میوات کا حاکم تھا۔ دہلی اور اجمیر کے راجا جو سلطان قطب الدین ایبک کے ہاتھوں تباہ ہوئے تھے، رانا سانگا کے قبیلے سے تھے۔ تین چار پشتوں کے بعد ان کا سلسلۂ نسب آپس میں مل جاتا ہے۔ شہنشاہ بابر کے حملے کے وقت تقریباً ایک لاکھ راجپوت، رانا سانگا کے زیرِ اثر تھے۔ اس کے علاوہ سلطان ابراہیم لودھی کے بہت سے امیر بھی رانا سانگا سے آملے تھے۔ سلطان سکندر لودھی کا بیٹا محمود خان لودھی بھی اپنے دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ رانا سانگا کے لشکر میں شامل ہو گیا تھا۔ مارواڑ کے علاقے کے تمام راجے پرم دیو، نرسنگھ دیو، راجہ چندیری، راجہ ڈونگر پور، رائے چندر بھان چوہان، مانک چند چوہان اور رائے دلیپ بھی پچاس ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر اس سیاسی اتحاد میں شامل ہو گیا۔ معتبر روایتوں کے مطابق دو لاکھ سواروں کا لشکرِ عظیم، ظہیرالدین بابر سے جنگ کرنے اور ہندوستان کو مغلوں کے تسلط سے بچانے کے لئے آگرہ روانہ ہوا۔

جب ظہیرالدین بابر کو دشمنوں کی منصوبہ بندی کا علم ہوا تو وہ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے آگرہ سے نکل کر ''بیانہ'' پہنچا۔ اس وقت بابر کے ہمراہ مشکل سے تقریباً پندرہ ہزار مغل سپاہیوں کا لشکر تھا۔ اگرچہ سلطان ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد ہزاروں ہندوستانی مسلمان فوجی بھی بابر سے آملے تھے، لیکن سیاسی تدبر اور جنگی حکمت عملی کے تحت وہ ہندوستانی سپاہیوں کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے ظہیرالدین بابر نے صرف ترکی نژاد اور منگول سپاہیوں پر بھروسہ کیا۔ دوسرے یہ کہ بابر کو اتحادیوں کی صحیح تعداد کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ مغل شہنشاہ کے خیال میں کوئی عام سی یورش تھی، جس کے مقابلے کے لئے مغل سپاہیوں کی موجودہ تعداد کافی تھی۔ بابر کی خوش فہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ چند ماہ پہلے وہ سلطان ابراہیم لودھی کے لشکرِ جرار کو عبرت ناک شکست سے دوچار کر چکا تھا۔ نتیجتاً بابر اطمینان کے ساتھ بیانہ پہنچا۔ اور اس کے مضافاتی قصبے ''کانوہ'' میں خیمہ زن ہوا۔ اور اپنے بیٹے

نصیرالدین ہمایوں کا جشن "شراب نوشی" پورے اہتمام کے ساتھ منایا۔

مغلوں میں شراب نوشی کی لعنت عام تھی۔ اور اس قبیح رسم کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ جب کبھی مغل سردار کا بیٹا جوانی کی منزل کو پہنچتا تھا تو وہ سردار ایک شاندار تقریب کا اہتمام کرتا تھا اور معزز مہمانوں کی موجودگی میں پہلی بار اپنے ہاتھ سے بیٹے کو شراب پلاتا تھا۔ "قصبہ کانوہ" میں ایک بڑے جشن کا اہتمام کیا گیا۔ سلطان ابراہیم لودھی کے مقابل فتح حاصل کرنے کی خوشی..... اور دوسرے نصیرالدین کے جوان ہونے کی خوشی..... الغرض دونوں خوشیاں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں۔

ابھی یہ "جشن شراب نوشی" جاری تھا کہ ظہیرالدین بابر کے جاسوسوں نے رانا سانگا کے لشکر کی آمد کی اطلاع دی جو چند میل کے فاصلے پر خیمہ زن ہو گیا تھا۔ اور بابر کی فوج پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بابر پہلی فتح کے نشے میں چور تھا...... دوسرے دن سورج طلوع ہوتے ہی مغل شہنشاہ اپنے لشکر کے ساتھ "کانوہ" کی حدود سے نکل کر آگے بڑھا پھر جب بابر کے جاسوسوں نے دوسری اطلاع دی کہ دشمن کی فوجی طاقت بے اندازہ ہے اور ایسا لگتا ہے کہ پورا ہندوستان ہی "پانی پت" کے میدان میں اُمڈ آیا ہے تو بابر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اور پھر اس نے فوراً ہی اپنے عسکری ماہرین کا ایک خفیہ اجلاس طلب کر لیا۔

شہنشاہ بابر کو ان کے تمام امراء نے بیک زبان ایک ہی مشورہ دیا۔ "اس وقت آگے بڑھ کر اتحادی فوجوں کا مقابلہ کرنا دانش مندی کے خلاف ہے۔"

"بادشاہ کو چاہئے کہ بڑے قلعے، امراء کے حوالے کر کے خود پنجاب کی طرف چلا جائے..... اور وہاں ٹھہر کر غیبی امداد کا انتظار کرے۔"

ظہیرالدین بابر کے مشیروں میں مشہور نجومی، محمد شریف بھی شامل تھا۔ ماہر نجوم محمد شریف کی بہت سی پیش گوئیاں درست ثابت ہو چکی تھیں۔ اس لئے عام لوگ اس کے علم پر اندھا اعتبار کرتے تھے۔ بہت سے توہم پرست لوگوں کا تو یہ عقیدہ تھا کہ محمد شریف کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات عالمِ اسباب میں ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اگر وہ یہ کہہ دیتا ہے کہ فلاں شخص کسی خوف ناک بیماری میں مبتلا ہو کر چند ماہ میں مر جائے گا، تو واقعتاً ایسا ہی ہوتا۔ پھر جب ایسی کئی مثالیں سامنے آئیں تو لوگ، محمد شریف سے ڈرے سہمے رہنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک نجومی "باکرامت ولی" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ظہیرالدین بابر نے اپنے فوجی ماہرین کے مشورے کے بعد ماہر نجوم، محمد شریف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "اس سلسلے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

قارئین کو معلوم ہونا چاہئے کہ مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر خود بھی علم نجوم میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔

نجومی محمد شریف نے ایک نظر شہنشاہ بابر کی طرف دیکھا اور پھر زائچہ بنا کر مختلف ستاروں کی رفتار کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران تمام امراء کی نظریں محمد شریف کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ سب کے سب منتظر تھے کہ اس نازک اور سنگین موقع پر وہ ماہر نجوم کیا پیش گوئی کرتا ہے۔

آخر محمد شریف کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ "زائچے میں ستارہ مریخ، مغرب کی طرف طلوع ہے۔" محمد شریف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں رعونت جھلک رہی تھی جیسے وہ اپنے علم کی وسعت پر نازاں ہو۔

مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر نے حیرت سے محمد شریف کی طرف دیکھا۔ اگرچہ بابر، فولادی اعصاب رکھنے والا

انسان تھا لیکن ماہرِ نجوم کی بات سن کر اس کے چہرے پر کسی قدر فکرمندی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔
محمد شریف نے اسی مغرورانہ لہجے میں دوبارہ لب کشائی کی۔ ''اتنا علم تو شہنشاہ بھی رکھتے ہیں کہ اگر ستارہ مریخ مغرب کی جانب سے طلوع ہو اور ان ساعتوں میں جنگ چھڑ جائے تو حملہ آور کو اپنے حریف کے مقابلے میں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑے گا۔''
قارئین کی معلومات کے لئے ہم یہاں اتنا بتاتے چلیں کہ علمِ نجوم کے حساب سے ''مریخ'' جنگ کا ستارہ ہے۔ اگر یہ ''سعد'' حالت میں ہو تو فتح و نصرت لاتا ہے۔ اور اگر ''نحس'' دور سے گزر رہا ہو تو ذلت، بربادی اور شکست لاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس وقت ستارہ مریخ کی رفتار ظہیر الدین بابر کے حق میں نہیں تھی۔ اسی بنیاد پر محمد شریف نے پیش گوئی کی تھی کہ اگر مغل شہنشاہ نے آگے بڑھ کر رانا سانگا اور اس کی اتحادی فوج پر حملہ کیا تو اسے شکست فاش سے دوچار ہونا پڑے گا۔ محمد شریف کی پیش گوئی سن کر تمام درباری امراء بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگے تھے۔ لیکن مغل شہنشاہ نے انتہائی استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس ماہرِ نجوم سے پوچھا۔
''کیا یہ کلیہ ہے کہ مریخ کا یہ زاویہ ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوگا؟ نفع بخش بھی ہو سکتا ہے۔''
''ہرگز نہیں۔'' نجومی محمد شریف نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں نے ہزار بار تجربہ کیا ہے..... نجوم کے استادوں نے جو اصول بنا دیئے، ان میں تبدیلی ممکن نہیں۔''
محمد شریف کا دعویٰ سن کر ظہیر الدین بابر کچھ دیر تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر انتہائی باوقار لہجے میں اس ماہرِ نجوم اور اپنے دوسرے امراء سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اگر میں میدانِ جنگ چھوڑ کر چلا جاؤں تو دنیائے اسلام کے فرمانروا میرے بارے میں کیا کہیں گے؟''
''فراست اور تدبر کا تقاضا یہی ہے کہ لوگوں کی باتوں کی طرف سے کان بند کر کے اپنی جان بچانے کی راہ اختیار کی جائے۔'' محمد شریف اور دوسرے امیروں نے بیک زبان کہا۔
یکایک ظہیر الدین بابر کا چہرہ شدتِ جذبات سے سرخ ہو گیا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں کہ وہ لوگ میری اس روش پر کس طرح طعنہ زنی کریں گے۔ کہنے والے کہیں گے کہ یہ مغل زادہ، دنیا کا بدترین انسان تھا جس نے صرف اپنی جان کے خوف سے میدان چھوڑا اور اتنا بڑا ملک اپنے ہاتھ سے گنوا دیا۔ پشت دکھانے سے تو کہیں بہتر ہے کہ میں رانا سانگا کے لاکھوں سپاہیوں سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں اور کافروں کی سرزمین کو اپنے خون سے سرخ کر جاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ میرے بعد کوئی دوسرا مردِ خدا یہاں آئے اور ان بت پرستوں سے ظہیر الدین بابر کے خون کا حساب لے۔''
شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی تقریر اس قدر اثر انگیز تھی کہ وہ امراء جو شہنشاہ بابر کو میدان میں چھوڑ کر پنجاب کی طرف کوچ کر جانے کے مشورے دے رہے تھے، یکایک ان سب کی رائے بدل گئی اور ہر امیر نے اپنی شمشیر کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر با آواز بلند قسم کھائی۔
''یا تو ہم غازیانِ اسلام کی طرح میدانِ کارزار پر چھا جائیں گے یا پھر اپنے خون میں نہا کر شہادت کی سعادتِ عظمیٰ حاصل کریں گے۔''
پھر جب مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر اپنے پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ رانا سانگا اور اس کے اتحادیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدانِ جنگ کی طرف جا رہا تھا تو نجومی محمد شریف نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
''میں نے آپ کے بزرگوں کا نمک کھایا ہے۔ اس لئے حقِ نمک ادا کرتے ہوئے آخری بار عرض کر رہا ہوں

کہ جنگ کے ارادے سے باز رہیں۔ خود کو ستارہ مریخ کی نحوست سے بچائیں ......اور کسی اچھے وقت کا انتظار کریں۔"

ظہیرالدین بابر نے محمد شریف کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور اپنی مختصر فوج کے ساتھ میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ پھر جب مغل شہنشاہ رزم گاہ پہنچا تو نظر کی آخری حد تک دشمنوں کے سر ہی سر تھے۔ بابر نے رانا سانگا کے لشکر پر ایک نظر ڈالی اور گھوڑے کی پشت سے نیچے اُتر آیا۔ پھر اس نے وضو کر کے میدانِ جنگ میں دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے بعد انتہائی گریہ وزاری کے ساتھ یہ دعا مانگی۔

"اے غفور الرحیم! تُو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں کفار پر غلبہ عطا فرما۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ شراب ترک کر دوں گا اور کسی معصیت کے قریب نہیں جاؤں گا۔ بس آج مجھے اور میرے ساتھیوں کو ذلت و بربادی سے بچا لے۔"

اس کے بعد ایک نہایت خونریز جنگ ہوئی۔ اور شام ہونے سے پہلے اہلِ ہنود کی طاقت کا سورج غروب ہو گیا۔ حسن خان میواتی اور دوسرے راجپوت سردار لقمۂ اجل بن گئے۔ رانا سانگا، جسے اپنی کثرتِ فوج اور راجپوتوں کی غیرت و شجاعت پر بڑا ناز تھا، نہایت ذلت اور روسیاہی کے ساتھ میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔

یہ تاریخ ساز اور یادگار فتح حاصل کرنے کے بعد ظہیرالدین بابر نے نجومی محمد شریف کو اپنے دربار میں طلب کر کے کہا۔ "میں تیرے علم پر لعنت بھیجتا ہوں۔" اس کے بعد مغل شہنشاہ نے محمد شریف کو اپنے مقبوضہ علاقوں سے نکال دیا اور یہ حکم جاری کر دیا کہ وہ دوبارہ نظر آیا تو اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی۔

راجپوت حکمران، میدنی رائے نے اپنے دورِ اقتدار میں چنیری، سارنگ پور، رنتھمبور اور رائے سین کی مسجدوں کو گھوڑوں کے اصطبل میں تبدیل کر دیا تھا۔ بابر نے اپنی نگرانی میں ان تمام مسجدوں کو پاک و صاف کرایا اور خدائے واحد کی نشانیوں کا تقدس دوبارہ بحال کیا۔

ان تاریخی حقائق کی روشنی میں قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو ایک قیدی کی حیثیت سے بابر کے دربار میں پیش کیا گیا تھا، اس وقت مغل شہنشاہ ترکِ شراب نوشی کے ساتھ اپنے تمام گناہوں سے تائب ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ظہیرالدین بابر، سلسلۂ صابریہ کے عظیم بزرگ، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا تھا۔

شاہ آباد کی بربادی سے حضرت شیخ کے دل کو گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ آپؒ کی آنکھوں کے سامنے بے شمار انسان تہ تیغ کئے گئے تھے۔ اگرچہ بابر کے اقتدار سنبھالنے کے بعد آپؒ کے عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں آئی تھی لیکن آپؒ وہاں قیام کرنا نہیں چاہتے تھے جہاں کی زمین خونِ آدم سے سرخ ہو گئی ہو۔ ملک عثمان، حضرت شیخ کے انتہائی فرماں بردار مرید تھے۔ آخر ان کی درخواست پر آپؒ گنگوہ (ضلع سہارن پر) تشریف لے گئے۔ گنگوہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے..... مگر قدرت نے اسے حضرت شیخ کے نام سے وابستہ کر کے ہمیشہ کے لئے عظیم بنا دیا ہے۔

جب آپؒ گنگوہ تشریف لائے تو یہاں ایک ہندو جوگی کے کمالات کا بہت شور تھا۔ ابتدا میں تو آپؒ نے ان بے سروپا باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا، مگر جب اس سادھو کے تذکرے شہرت کی بلندیوں تک پہنچ گئے تو آپؒ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں عام لوگ گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ آپؒ نے لوگوں سے پوچھا کہ وہ جوگی کون ہے اور کس قسم کے روحانی کمالات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مقامی باشندوں نے بتایا کہ جوگی اپنے غار نما مٹھ میں رہتا ہے۔ کئی کئی سال تک غار سے باہر نہیں آتا۔ پانی کے سوا کوئی غذا استعمال نہیں کرتا۔ غار میں ہوا جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

بس ایک چھوٹا سا سوراخ ہے، جس میں انسانی انگلی بھی مشکل سے داخل ہو سکتی ہے۔ وہ خوراک اور ہوا کے بغیر کئی سال سے زندہ ہے۔ اور یہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔ حضرت شیخ یہ عجیب و غریب واقعہ سن کر چند لمحوں تک سوچتے رہے، پھر اپنے مریدوں سے فرمایا۔

''اللہ کے بندے ان شعبدہ بازیوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ شروع میں ہم نے بھی جوگی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب احساس ہوتا ہے کہ مخلوقِ خدا کے دل اس کی طرف کھنچتے جا رہے ہیں۔ اگر ہندو قوم اُسے اپنا دیوتا مان لے تو یہ قابلِ اعتراض بات نہیں لیکن جب ہم، مسلمانوں کو اس کے عقیدے میں خلل نہ ڈال دیں۔ اب ہمیں اس مرض کا علاج کرنا ہی ہوگا۔'' یہ کہتے کہتے آپؒ کا چہرہ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ پھر آپؒ نے لوگوں سے جوگی کے مٹھ (عبادت گاہ) کا پتہ پوچھا اور اکیلے ہی اس طرف روانہ ہو گئے۔ قصبہ گنگوہ کے مضافات میں ایک گھنا جنگل تھا۔ جوگی نے درختوں کے درمیان ایک مندر نما عمارت بنائی تھی جہاں اس کے سینکڑوں چیلے افیون اور بھنگ کے نشے میں دھت پڑے رہتے تھے۔ مندر سے کچھ فاصلے پر جوگی کا طویل و عریض مٹھ تھا۔ جب حضرت شیخ اس مندر میں پہنچے تو وہاں ہلچل سی مچ گئی۔ تمام چیلے اس طرح چونک کر اُٹھ بیٹھے جیسے ان کے درمیان کوئی دشمن آ پہنچا ہو۔ وہ ایک مسلمان بزرگ کو دیکھ کر بدحواس ہو گئے تھے۔

''تمہارے گرو کہاں ہیں؟'' حضرت شیخ نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

''ان سے کوئی نہیں مل سکتا۔'' ایک چیلے نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ وہ نشے سے بدمست ہو رہا تھا۔

''مجھے ایک ضروری کام ہے۔ میں ان سے ملے بغیر نہیں جا سکتا۔'' حضرت شیخ نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

''وہ ایک سال بعد اپنی عبادت گاہ سے نکلیں گے۔ تم بھی اس وقت آ جانا۔'' دوسرے چیلے نے قدرے ادب سے جواب دیا اور اپنے گرو کی عبادت کا طریقہ کار سمجھانے لگا۔ حضرت شیخ یہ ساری تفصیلات پہلے ہی سن چکے تھے اس لئے اپنی بات پر بضد رہے اور گرو کی عبادت گاہ کا پتہ پوچھنے لگے۔

''وہ ہے، درختوں کے جھنڈ میں۔'' تیسرے چیلے نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''اگر تُو جا سکتا ہے تو سوراخ سے گزر کر اندر چلا جا۔'' اس کے ساتھ ہی بے ہنگم قہقہوں کا شور بلند ہوا۔ جوگی کے چیلے، حضرت شیخ کا مذاق اُڑا رہے تھے مگر آپؒ ان تمام بے ہودگیوں سے بے نیاز، گرو کے مٹھ کی طرف چلے گئے۔

وہ باہر سے ایک غار سا دکھائی دیتا تھا۔ حضرت شیخ نے دروازہ تلاش کیا، مگر وہاں اس معمولی سوراخ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ آپؒ نے چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کیں اور پھر مٹھ کی دیوار پر اپنی انگشت مبارک رکھ دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دیوار میں اتنا چوڑا شگاف پڑ گیا جس سے گزر کر ایک آدمی اندر جا سکتا تھا۔ پھر آپؒ اطمینان سے گرو کی عبادت گاہ میں داخل ہو گئے۔ ایک گوشے میں خوشبودار تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ جوگی کی آنکھیں بند تھیں اور وہ حبسِ دم کئے ہوئے اس طرح بیٹھا تھا جیسے اس کی روح جسم سے پرواز کر گئی ہو۔

''پاپی! من کی آنکھیں کھول۔'' آپؒ نے اندر داخل ہوتے ہی تیز آواز میں فرمایا۔

جوگی، حضرت شیخ کی آواز سن کر اس طرح اُچھل پڑا جیسے غار میں شدید زلزلہ آ گیا ہو۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ حضرت شیخ کو پاگلوں کے مانند دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس کے حواس درست ہوئے تو انتہائی گستاخانہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''تُو کون ہے اور یہاں اندر کیسے آیا؟''

حضرت شیخ اس کی بدکلامی پر خفا نہیں ہوئے۔ حسبِ عادت اسی جاں فزا تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ''میں ایک مسلمان ہوں اور تیرے روحانی کمالات دیکھنے آیا ہوں۔''

"تجھے میرے چیلوں نے اندر کیسے آنے دیا؟" جوگی غضب ناک لہجے میں چیخ رہا تھا۔

"ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں۔" حضرت شیخ مسکرانے لگے۔ "میں نے تیری عبادت گاہ میں شگاف ڈال دیا ہے اور اس شگاف سے گزر کر کوئی بھی اندر آ سکتا ہے۔"

جوگی بے قرار ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور پھر چند گز کے فاصلے پر ہی اسے وہ شگاف نظر آ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ماہر معمار نے پتھر کو کمالِ فن کے ساتھ تراشا ہو۔ جوگی بہت حیران ہوا اور پھر ناگوار لہجے میں کہنے لگا۔ "جادو کا یہ ادنیٰ سا مظاہرہ ہے۔ ایسے شعبدے تو میرے چیلے بھی دکھا سکتے ہیں۔"

"میں جادوگر نہیں، اللہ کا ایک گناہ گار بندہ ہوں۔ تیرے چیلے کیا کر سکتے ہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں تو صرف تجھ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تُو نے اپنے جسم کو اتنی تکلیفیں پہنچانے کے بعد کیا حاصل کیا؟"

"میرا کمال دیکھنا چاہتا ہے؟" جوگی نے حضرت شیخ کا تمسخر اُڑاتے ہوئے کہا۔ "دیکھ! انسان کس طرح پانی ہوتا ہے۔" اتنا کہنے کے بعد جوگی ایک مخصوص انداز سے زمین پر بیٹھا۔ اس نے اپنی سانس روکی اور پھر آہستہ آہستہ پانی ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کچھ دیر بعد جوگی کا پورا وجود پانی میں تحلیل ہو گیا۔ حضرت شیخ نے فوراً اپنا رومال نکالا اور اسے زمین پر پھیلے ہوئے پانی میں تر کیا۔ چند لمحے گزرے تھے کہ جوگی دوبارہ اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیا اور بڑے نخوت و غرور کے ساتھ حضرت شیخ سے پوچھنے لگا۔

"تُو نے دیکھا میرا کمال؟ کیا میرے سوا کوئی دوسرا انسان اپنی روحانی قوتوں کا اس طرح مظاہرہ کر سکتا ہے؟ اگر تجھے کوئی دعویٰ ہے تو میری طرح تُو بھی پانی ہو جا۔"

حضرت شیخ نے بڑی عاجزی سے فرمایا۔ "میں تو احساسِ ندامت سے پہلے ہی پانی پانی ہو چکا۔ اب مزید پانی ہونے کی اس گناہ گار میں طاقت نہیں۔ تمہیں کمال کی یہ بلندیاں مبارک ہوں۔" یہ کہہ کر آپؒ نے اپنا رومال جوگی کی طرف بڑھایا۔ "جب تم اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانی ہو گئے تھے تو میں نے یہ رومال اس پانی میں بھگو لیا تھا۔ اب میری خواہش ہے کہ تم اس رومال کو سونگھ کر اپنے روحانی کمالات کا اندازہ کرو۔"

جوگی نے فوراً ہی وہ رومال آپؒ کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے سونگھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے رومال کو زمین پر پھینک دیا۔ جوگی کے لئے رومال سے اُٹھنے والا تعفن ناقابلِ برداشت تھا۔

"یہ تیرے بدن کی خوشبو ہے۔ اپنے آپ سے اتنی نفرت؟" حضرت شیخ نے جوگی کی وحشت دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "اب تُو اپنا کوئی کپڑا میرے وضو کے پانی میں تر کر۔ پھر تماشا دیکھ۔"

جوگی نے امتحان کی غرض سے حضرت شیخ کو پانی فراہم کیا۔ اور جب آپؒ وضو کرنے لگے تو اس نے بھی اپنا رومال پانی میں بھگو لیا۔

"اب اسے سونگھ اور اس حقیقت پر غور کر کہ ایک ہی پانی دو انسانی جسموں سے مس ہونے کے بعد کیوں بدل جاتا ہے؟"

جوگی نے آپؒ کی ہدایت پر عمل کیا اور کپڑے کو سونگھنے لگا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ رومال میں کسی قسم کی بدبو موجود نہیں ہے۔ ورنہ وہ اسے بھی زمین پر پھینک دیتا۔

"تُو نے کیا محسوس کیا؟" حضرت شیخ نے جوگی کو حیران دیکھ کر پوچھا "اب اس رومال کو نچوڑ دے۔"

جوگی نے ایسا ہی کیا اور پھر ایک تیز خوشبو سارے مٹھ میں پھیل گئی۔

"یہ کیسا فرق ہے؟" جوگی نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کی تمام عمر کی ریاضت خاک میں مل گئی تھی۔

"یہ کفر و اسلام کا فرق ہے۔" حضرت شیخ نے فرمایا۔ "تُو نے ساری زندگی جس شے کا کاروبار کیا، اس کا فائدہ تجھے غلاظت کی شکل میں حاصل ہوا۔ اور یہ خوشبو میری متاعِ حیات ہے جس سے تیرے در و دیوار مہک رہے ہیں۔" اس روشن دلیل کے آگے جرأتِ انکار ممکن نہ تھی۔ جوگی نے بھی سر جھکا دیا اور اسلام قبول کر کے آپؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔

حضرت شیخ کی دعائیں سب کے لئے عام تھیں۔ مگر مریدی کی دولت سے کسی کسی کو سرفراز فرماتے تھے۔ اس کی وجہ یوں بیان کرتے کہ جب ایک بار کسی انسان کا ہاتھ تھام لیا تو پھر اس کی ذمے داریاں بھی قبول کرنی پڑتی ہیں۔ مجھ ناتواں سے اپنا ہی بوجھ نہیں اُٹھتا تو دوسروں کا بارِ گراں کس طرح اٹھاؤں گا؟ یہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جو پیرانِ طریقت اپنے حلقۂ ارادت میں بے دریغ اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں، اُنہیں یومِ حساب سے ڈرنا چاہئے۔ آخرت میں پیرانِ کرام سے ان کے مریدوں کی تربیت کے متعلق ہی سوال کیا جائے گا۔ اسی خوف سے حضرت شیخ ہر کس و ناکس کو مرید نہیں بناتے تھے۔ مگر جب کسی کو مرید کے لفظ سے شرف یاب کر دیتے تو پھر ہر وقت اس کے اعمال پر کڑی نظر رکھتے۔

مولانا چندن، حضرت شیخ کے صاحبزادے شیخ رکن الدین کے استاد تھے۔ اسی تعلق سے آپؒ نے مولانا کو بیعت سے سرفراز فرمایا تھا اور دیگر معاملات میں بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ایک دن مولانا چندن دُور تالاب میں کپڑے دھونے گئے۔ وہاں ایک حسین عورت کو دیکھ کر بے اختیار ہو گئے۔ جنگل میں دُور دُور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے شیطانی خیالات کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہی تھے کہ اچانک انہیں حضرت شیخ، تالاب میں عصا لئے ہوئے کھڑے نظر آئے۔ مولانا چندن پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہیں کپڑے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ پھر شرمندگی کے باعث کئی دن تک خانقاہ میں حاضر نہ ہو سکے۔ آخر ایک روز پیر و مرشد کی بارگاہ میں سر جھکائے ہوئے پہنچے۔ مولانا چندن کو دیکھتے ہی حضرت شیخ نے فرمایا۔

"تمہارا ہاتھ یوں ہی تو نہیں پکڑا تھا کہ مصیبت کے وقت تمہیں تنہا چھوڑ دیتے۔" پھر فرمایا۔ "شیطان مختلف شکلوں میں انسان کے سامنے آتا ہے۔ اپنے رب سے پناہ مانگتے رہا کرو۔"

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے عقیدت مندوں میں شیروانی خاندان کے دو افراد شامل تھے۔ ایک عمر خان شیروانی اور دوسرا ابراہیم خان شیروانی۔ تاریخ تصوف میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی بعض ایسی کرامات کا ذکر بھی ملتا ہے، جن کا راوی حضرت شیخ کا مرید شیروانی ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ عمر خان شیروانی تھا یا ابراہیم خان شیروانی۔ بہرحال، شیروانی نام کا ایک شخص، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک سپاہی تھا اور شاید سالاری کے منصب پر فائز تھا۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب گجرات کے علاقے پر سلطان بہادر شاہ کی حکومت تھی اور شیروانی، والئ گجرات کے لشکر میں شامل تھا۔ شیروانی اپنا ایک خواب اس طرح بیان کرتا ہے۔

"میں ایک رات شاہی محل کے ایک آراستہ کمرے میں نرم ریشمی بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ یکایک دروازہ کھلا اور ایک پُر جلال شخصیت اندر داخل ہوئی، جس کے چہرے سے تیز روشنی پھوٹ رہی تھی اور پورا کمرہ عجیب و غریب خوشبو سے مہک اُٹھا تھا۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ مگر پھر بھی میں نے اپنے پورے ہوش و حواس اور قوتِ ارادی کو سمیٹتے ہوئے اجنبی بزرگ سے سوال کیا۔

"یہ کمرہ اندر سے مقفل تھا۔ پھر آپ کس طرح اندر داخل ہوئے؟"

اجنبی بزرگ کے ہونٹوں پر ایک خاص تبسم اُبھر آیا، جس میں محبت وشفقت کی آمیزش تھی۔ پھر وہ اجنبی بزرگ چند قدم آگے بڑھے، پھر میرے قریب آ کر فرمانے لگے۔

''میں تو حق تعالیٰ کا ایک عام سا بندہ ہوں، جس کی کوئی طاقت نہیں۔ تم ذرا فرشتۂ اجل کے بارے میں سوچو کہ کسی بادشاہ کے کمرے کے دروازے پر ہزاروں مسلح سپاہی موجود ہوتے ہیں مگر فرشتۂ اجل کو اندر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

شیروانی کا بیان ہے کہ اجنبی بزرگ کی باتیں سن کر مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''آپ میرے کمرے میں کس لئے تشریف لائے ہیں؟''

''میں تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ بساط لپیٹی جا چکی ہے اور مغل شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں کی توسیعِ سلطنت کوئی نہیں روک سکتا۔'' اجنبی بزرگ کے ایک ایک لفظ سے انتہائی روحانی جلال جھلک رہا تھا۔ پھر وہ بزرگ جس طرح تشریف لائے تھے، اسی طرح واپس چلے گئے۔

گجرات کے سالار شیروانی پر مسلسل سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ پھر اس کی آنکھوں نے ایک اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ یکایک شیروانی کے آراستہ کمرے کے در و دیوار گر گئے اور سامنے حدِ نظر تک فوجی خیمے ہی خیمے دکھائی دینے لگے۔ گجراتی سالار شیروانی بدحواس ہو کر سپاہی سے پوچھتا ہے۔ ''کیا یہ کسی کا لشکر ہے؟ اور یہاں کیوں آیا ہے؟''

اس سپاہی نے انتہائی فخریہ لہجے میں شیروانی کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم مغل ہیں اور ہمارے شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں نے پورے گجرات کا احاطہ کر لیا ہے۔''

پھر گجراتی سالار شیروانی کی آنکھ کھل گئی اور اس عجیب و غریب خواب کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ خوف و دہشت کے اثر سے شیروانی کا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ شیروانی کئی دن تک اس دہشت آمیز خواب کے مناظر میں اُلجھا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ اس کا ذہنی انتشار، اعتدال کی طرف لوٹنے لگا اور وہ پُرسکون و مطمئن نظر آنے لگا۔ اس اطمینان کی وجہ یہ تھی کہ سلطان بہادر شاہ، گجرات کا ایک طاقتور اور خودمختار حکمراں تھا۔ دہلی اور گجرات کے درمیان طویل فاصلے حائل تھے۔ یہ مغل شہنشاہ کس طرح والئ گجرات، بہادر شاہ کو شکست دے سکتا تھا؟ ان ہی سیاسی حقائق کے پیش نظر سالار شیروانی نے اپنے اس خواب کو محض ایک وہم سمجھا اور روز و شب کے کاروبار میں مشغول ہو گیا۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی اس کرامت اور سالار شیروانی کے خواب کی تعبیر بیان کرنے کے لئے تاریخِ ہندوستان کے کچھ اوراق اُلٹنا ہوں گے۔

نصیرالدین ہمایوں، مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر کا سب سے بڑا اور محبوب بیٹا تھا۔ اسی لئے بابر نے رسمِ دنیا اور آئینِ شاہی کے مطابق نصیرالدین ہمایوں کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ پھر ایک ایسا عجیب اور جانگداز واقعہ پیش آیا جو پوری دنیا کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

اس وقت شہزادہ نصیرالدین ہمایوں ''سنبھل'' (یو۔ پی) میں مقیم تھا کہ اچانک اسے بخار آیا۔ شاہی طبیبوں نے بہترین نسخے تجویز کئے مگر ہمایوں کی بیماری بڑھتی چلی گئی۔ جب شہنشاہ بابر کو ولی عہدِ سلطنت کی ناسازئ طبع کا علم ہوا تو اس نے حکم جاری کیا کہ ہمایوں بلاتاخیر ''سنبھل'' سے ''آگرہ'' چلا آئے۔ اس طرح تبدیلئ آب و ہوا کے ساتھ بہترین طبیبوں کی نگرانی میں تیمارداری کی جا سکے گی۔ حکمِ شاہی کے مطابق شہزادہ نصیرالدین ہمایوں، آگرہ پہنچا۔ مشفق و مہربان باپ نے ہندوستان کے گوشے گوشے سے مایہ ناز حکیم، طبیب اور ''وید'' طلب کر لئے۔ تمام

اہلِ حکمت سر جوڑ کر بیٹھے اور کئی دن تک شہزادے کی بیماری کے متعلق تبادلہ خیال کرتے رہے۔ جس کے دماغ میں جو نسخۂ شفا تھا، وہ ولی عہدِ سلطنت پر آزمایا گیا۔ مگر نصیر الدین ہمایوں کا مرض لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ پھر وہ سنگین ساعت بھی آئی جب سارے طبیبوں نے شہنشاہ بابر کے سامنے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے بیک زبان کہا۔

''شہنشاہ! انسان کی عقل کا کام ختم ہوا۔ دوائیں اپنی تاثیر کھو چکیں۔ بس ایک دعاؤں کا خانہ خالی رہ گیا۔ اگر قدرت، شہزادہ نصیر الدین ہمایوں کے معاملے میں براہِ راست مداخلت کرے تو ولی عہدِ سلطنت صحت یاب ہو سکتے ہیں...... ورنہ......'' تمام طبیبوں نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی تھی۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ بات اپنی جگہ مکمل تھی..... اور ہمایوں کا وقتِ رخصت قریب آ پہنچا تھا۔

اس مجلس میں دیگر امرائے سلطنت بھی موجود تھے۔ طبیبوں کی متفقہ رائے سن کر شہنشاہ ظہیر الدین بابر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہم گزشتہ سطور میں واضح کر چکے ہیں کہ مغل شہنشاہ فولادی اعصاب رکھنے والا انسان تھا۔ انتہائی سنگین اور جان لیوا ساعتوں میں بھی اس کے چہرے پر فکر و پریشانی کے آثار نمایاں نہیں ہوتے تھے۔ اس نے اپنے جسم پر بے شمار زخم کھائے تھے۔ اور اس کے بدن سے کئی بار خون کے آبشار بہے تھے۔ مگر بابر کے منہ سے ہلکی سی کراہ بھی نہیں نکلی تھی۔ پھر آج اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے آبشار کیوں جاری ہو گئے تھے؟ ایسی صورتِ حال سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغل شہنشاہ اپنے دشمنوں کے لئے قہر ساماں تھا۔ لیکن دوستوں کے لئے اس کا دل ''گل و شبنم'' کی طرح نرم تھا۔

ایسے نازک لمحات میں امراء کے پاس تسلی کے چند رسمی الفاظ کے سوا کچھ نہیں تھا۔

آخر کار ابوالبقا نے شہنشاہ بابر کو رائے دیتے ہوئے کہا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے کی زندگی کسی بہت بڑے صدقے کی طلب گار ہے۔'' میر ابوالبقا ایک عالم و فاضل انسان تھے اور شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے مشیروں میں شامل تھے۔

''کیسا صدقہ؟'' بابر نے اپنے مشیرِ خاص میر ابوالبقا سے سوال کیا۔

''اگر شہنشاہ ایسی کوئی قیمتی شے جس سے زیادہ عزیز کوئی اور چیز نہ ہو، اپنے بیٹے پر سے قربان کر دیں تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ولی عہدِ سلطنت کو مکمل شفا عطا فرما دے گا۔''

شہنشاہ ظہیر الدین بابر اور دیگر امرائے سلطنت نے میر ابوالبقا کے اس مشورے کو بہت غور سے سنا۔ پھر یہ تخمینہ لگایا جانے لگا کہ شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے پاس سب سے زیادہ قیمتی شے کون سی ہے؟ آخر کچھ امراء طویل غور و خوض کے بعد ایک نتیجے پر پہنچے اور فرماں روائے ہندوستان کو مشورہ دینے گئے۔

جب بابر نے سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر شاہی خزانے پر قبضہ کیا تھا تو ایک نایاب الماس (ہیرا) اس کے ہاتھ آیا تھا۔ سب سے پہلے یہ قیمتی ہیرا، سلطان علاؤ الدین خلجی نے حاصل کیا تھا۔ پھر یہی الماس، آگرہ کی فتح کے دن شہزادے نصیر الدین ہمایوں کے ہاتھ لگا تھا۔ اور پھر ولی عہدِ سلطنت نے بڑی عقیدت کے ساتھ یہ نایاب ہیرا اپنے باپ، ظہیر الدین بابر کی خدمت میں بطور نذر پیش کیا۔ بابر اس قیمتی تحفے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ پھر والئ ہند نے بھرے دربار کے سامنے دو لاکھ چاندی کے سکوں اور دوسرے اعزازات کے ساتھ یہی ہیرا شہزادہ نصیر الدین ہمایوں کو عطا کر دیا تھا۔ میر ابوالبقاء اور امرائے سلطنت کے خیال میں یہی سب سے قیمتی شے تھی، جس کا صدقہ دے کر ولی عہدِ سلطنت نصیر الدین ہمایوں کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ اس سلسلے میں میر ابوالبقاء

اور معزز اراکینِ سلطنت کی رائے یہ تھی کہ اس قیمتی الماس کو فروخت کر دیا جائے اور اس سے جو رقم حاصل ہو، اسے غریبوں اور بہت زیادہ ضرورت مند افراد میں تقسیم کر دیا جائے۔

شہنشاہ ظہیر الدین بابر کچھ دیر تک مشیروں کی تجویز پر غور کرتا رہا اور پھر اپنے امرائے سلطنت کو مخاطب کر کے بولا۔

''وہ پتھر کا ٹکڑا میری اور میرے بیٹے کی جان سے زیادہ عزیز اور قیمتی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمایوں کے بعد مجھے کوئی شے محبوب ہے تو وہ میری اپنی جان ہے۔ انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی صدقہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ کیوں نہ اپنے بیٹے پر اپنی جان ہی قربان کر دوں۔'' یہ کہہ کر مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر اس مجلسِ خاص سے اُٹھ گیا۔

امرائے سلطنت کا خیال تھا کہ یہ محض نمائش اور دکھاوا ہے۔ ورنہ کون کس کے لئے اپنی جان قربان کرتا ہے۔ ان لوگوں کے سامنے سینکڑوں مثالیں موجود تھیں کہ جوان اور کڑیل بیٹوں نے اپنے باپوں کے سامنے دم توڑا تھا، مگر کسی باپ نے بیٹے کے لئے جان کا نذرانہ پیش نہیں کیا تھا۔ اپنے انہی تجربات کی بنا پر میر ابوالبقاء اور دیگر امرائے سلطنت نے مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے الفاظ کو صرف جذباتی ردِعمل اور نمائش سے تعبیر کیا تھا۔ اور یہ سچ ہے کہ آج بھی ایسے ہزاروں واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ جوان اولادیں مرتی ہیں اور ان کے ماں باپ، جنازوں پر بین اور نوحہ خوانی کرتے رہتے ہیں۔ ''کاش! تمہارے بدلے ہمیں موت آ گئی ہوتی۔''

مگر شہنشاہ بابر نے اپنے امرائے سلطنت کے سامنے جو دعویٰ کیا تھا، اس پر عمل کر دکھایا۔ مغل فرمانروا، مجلسِ خاص سے اُٹھ کر اپنے خلوت کدے میں پہنچا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کی اور گڑگڑا کر دعا مانگی۔

''اے حی و قیوم! تُو ہی اس کائنات کا مالک ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں۔ تیرے نزدیک زندوں کو موت سے ہم کنار کر دینا اور مُردوں کو دوبارہ زندگی بخش دینا، ایک بہت ہی معمولی بات ہے۔ میں تیری قدرتِ کاملہ اور بے پناہ رحمت پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میرے صدقۂ جان کو قبول فرما لے......اور ہمایوں کو نئی زندگی بخش دے۔'' مغل فرمانروا کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

پھر دعا مانگ کر ظہیر الدین بابر اٹھا اور نصیر الدین ہمایوں کے بستر کے قریب آیا۔ بس سانس کا ڈورا چل رہا تھا اور یہ ڈورا کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا تھا۔

ظہیر الدین بابر نے اپنے قریب المرگ بیٹے کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''خداوند ذوالجلال تمہارا اقبال بلند کرے۔''

مغل دور کے مشہور اور بے باک مؤرخ، ہاشم علی خافی خان نے اپنی معتبر تاریخ ''منتخب اللباب'' میں اس واقعے کو اس طرح تحریر کیا ہے:

''بیٹے کی پیشانی کو چومنے کے بعد مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر نے ولی عہدِ سلطنت کے بسترِ علالت کے چاروں طرف سات چکر لگائے۔ اس دوران بابر کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔ اور وہ بار بار یہ مخصوص الفاظ دہرا رہا تھا۔

''برداشتم...... برداشتم..... برداشتم۔'' (یعنی میں نے اس کی بیماری اپنے سر لے لی)

پھر جیسے ہی سات چکر مکمل ہوئے، ظہیر الدین بابر کو شدید تھکن کا احساس ہونے لگا۔ اور پھر مغل شہنشاہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔

مؤرخ خافی خان، جس نے مغل شہنشاہوں کے حالات کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے، کہتا ہے کہ اس عمل کے بعد جب شہنشاہ بابر اپنے بستر پر لیٹا تو دوبارہ نہیں اٹھا۔ اسی دن شہزادہ نصیر الدین ہمایوں نے آنکھیں کھول

دیں اور اس کے بے جان چہرے پر زندگی کی رمق نظر آنے لگی۔ پھر ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ساتھ ولی عہدِ سلطنت کی صحت بہتر ہونے لگی۔ اور پھر فرمانروائے ہندوستان کی جسمانی حالت بگڑنے لگی۔ پھر جس روز شہزادہ نصیرالدین ہمایوں نے مکمل صحت یاب ہو کر ''غسلِ صحت'' کیا، اسی دن شہنشاہ بابر کا انتقال ہو گیا۔ بیٹے کا ''غسلِ صحت'' اور باپ کا ''غسلِ میت''......

انتقال کے وقت ظہیرالدین بابر کی عمر 50 سال تھی۔ اگر ہم چار سو سال پہلے انسانی صحت کا جائزہ لیں تو عام لوگ بھی بڑی طویل عمر پاتے ہیں۔ اس اعتبار سے جب بابر رخصت ہوا تو ہم اسے ''جوان'' کہہ سکتے ہیں۔ مغل شہنشاہ بچپن ہی سے ایک جنگجو، جفاکش اور خطر پسند طبیعت کا مالک تھا۔ اس لئے اس کے اعصاب، عضلات اور قویٰ عام انسانوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور صحت مند تھے۔ بیٹے کے لئے صدقۂ جان دینے سے پہلے بابر کو نزلہ و زکام جیسی معمولی بیماری تک نہیں تھی۔ پھر وہ یکایک کیوں بیمار پڑا؟ اور نصیرالدین ہمایوں جو قبر کے بہت نزدیک پہنچ گیا تھا، حیرت انگیز طور پر بھرپور زندگی کی طرف کیوں لوٹ آیا؟ اس سوال کا بس ایک ہی جواب ہے کہ بابر نے خلوصِ نیت اور دل کی گہرائیوں سے خالقِ کائنات کی بارگاہِ کرم میں اپنا صدقۂ جان پیش کیا تھا، جو قبول کر لیا گیا۔

بڑی حیرت کی بات ہے کہ تمام مؤرخین شہنشاہ ظہیرالدین بابر کو عظیم سالار، عظیم فاتح، عظیم ادیب اور عظیم شاعر قرار دیتے ہیں۔ مگر کسی تاریخ نویس نے بابر کی شخصیت کے سب سے انوکھے اور جداگانہ پہلو پر غور نہیں کیا۔ میرے نزدیک مغل شہنشاہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دنیا کا عظیم ترین باپ تھا۔ ایسا باپ جس کی مثالیں تاریخِ انسانی میں خال خال نظر آتی ہیں۔ جن لوگوں نے کھلی آنکھوں اور حاضر دماغی کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، ان پر یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی کہ دنیا کی سب سے خوف ناک شے دولت و اقتدار ہے۔ اس کے حصول کے لئے بہت سے باپوں نے اپنے بیٹوں کا اور بیٹوں نے باپوں کا خون بہایا ہے۔ بھائی نے بھائی کی گردن کاٹی ہے۔ ماں نے بیٹی کو ذبح کیا ہے اور بیٹی نے ماں کو کفن پہنایا ہے۔ پھر شہنشاہ ظہیرالدین بابر، جسے تاج و تخت بھی حاصل تھا اور بہت بڑا خزانہ بھی، وہ کیوں اپنے بیٹے پر اپنی زندگی قربان کر کے چلا گیا؟ اس لئے کہ بابر عظیم ترین باپ تھا۔

یہ ہیں شہنشاہ نصیرالدین بابر کے مختصر حالاتِ زندگی، جن کے بارے میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے فرمایا۔

''شیروانی! ذرا ہمایوں کے خیمے کی وسعت تو دیکھو...... ہر طرف اس کے سپاہی نظر آ رہے ہیں۔''

گجراتی سالار شیروانی اپنے اس خواب کو بھول چکا تھا۔ روز و شب انتہائی پُرسکون انداز میں گزر رہے تھے کہ یکایک سلطان بہادر شاہ کے دل میں ملک گیری کے جذبات نے پوری شدت کے ساتھ کروٹ لی۔ پھر اس نے 940ء میں راجستھان کے علاقے چتوڑ پر حملہ کر دیا۔ یہ وہی چتوڑ ہے جس کا قلعہ ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ مگر سلطان علاؤالدین خلجی نے آٹھ ماہ کا محاصرہ کر کے چتوڑ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ جب گجرات کے حکمراں، سلطان بہادر شاہ نے چتوڑ پر حملہ کیا، اس وقت اس علاقے کی حکمراں ایک بہادر راجپوت عورت، رانی کرن وتی تھی۔ عورت ہونے کے باعث رانی کرن وتی، سلطان بہادر شاہ گجراتی کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ نتیجتاً اسے چتوڑ کی مکمل تباہی صاف نظر آ رہی تھی۔ بالآخر رانی کرن وتی نے اپنے فوجی سالاروں کا اجلاس طلب کر کے ان سے مشورہ کیا۔

''اس بڑھتے ہوئے خونی سیلاب کو کس طرح روکا جا سکتا ہے؟''

چتوڑ کے سالار اپنی جنگی صلاحیتوں سے پوری طرح باخبر تھے۔ سلطان بہادر شاہ گجراتی کے مقابلہ میں

راجپوت سپاہیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس لئے جنگ کا انجام بھی سب پر ظاہر تھا۔ ہر طرف مایوسی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بہت غور و فکر کے بعد ایک فوجی سالار، بھیم سنگھ نے رانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''ریاست چتوڑ تنہا اپنا دفاع نہیں کر سکتی۔ اگر گجرات کے حاکم سے جنگ چھڑی تو ہماری شکست یقینی ہے۔''
''یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔'' رانی کرن وتی نے انتہائی جھنجلاہٹ کے عالم میں کہا۔ ''میں تم سے مکتی (نجات) کا طریقہ پوچھتی ہوں اور تم مجھے ذلت آمیز موت کی خبر سناتے ہو۔''
''مہارانی! میں یہی تو عرض کر رہا ہوں کہ کسی طاقتور اتحادی کے بغیر ہمیں اس خونی سیلاب سے نجات نہیں مل سکتی۔'' سالار بھیم سنگھ نے ادب و احترام کے ساتھ جواب دیا۔
اتحادی کے نام پر رانی کرن وتی بری طرح چونکی۔ ''اتحادی سے تمہارا کیا مطلب ہے بھیم سنگھ؟''
''ہمیں چتوڑ کے دفاع کے لئے سلطان بہادر شاہ کی ٹکر کا اتحادی تلاش کرنا ہوگا۔'' سالار بھیم سنگھ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ طاقتور اتحادی مغل شہنشاہ ہمایوں کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔''
بھیم سنگھ کی تجویز سن کر دوسرے راجپوت سرداروں کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''بھیم سنگھ! ہمیں تم جیسے ذہین انسان سے ایسی غیر دانشمندانہ تجویز کی توقع نہیں تھی۔'' ایک دوسرے فوجی سردار، رام راج چوہان نے انتہائی تند و تیز لہجے میں کہا۔ اس سردار کا تعلق امیر اور دہلی کے راجپوت سمراٹ پرتھوی راج چوہان کے خاندان سے تھا جسے 587ء میں افغان سردار شہاب الدین غوری نے ''ترائن'' کے مقام پر شکست فاش سے دوچار کیا تھا۔
رام راج چوہان کی گرم گفتاری کا مظاہرہ دیکھ کر سالار بھیم سنگھ کی پیشانی بھی شکن آلود ہوگئی۔ ''تم میری رائے کو احمقانہ کس طرح کہہ سکتے ہو؟''
''سلطان بہادر شاہ بھی مسلمان ہے۔ اور مغل شہنشاہ بھی اسی مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔'' رام راج چوہان کے لہجے کی تندی و تیزی کا وہی عالم تھا۔ ''پھر ہمایوں ایک ہندو ریاست کی مدد کو کیوں آئے گا؟''
سالار بھیم سنگھ نے کچھ سوچتے ہوئے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔ ''تمہارا اندازہ درست ہوسکتا ہے رام راج! مگر اس وقت چتوڑ کی کشتی خوفناک طوفان میں گھری ہوئی ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی کو تو پکارنا ہی ہوگا۔ چاہے ہماری آوازیں رائیگاں اور بے اثر جائیں۔''
پھر سالار بھیم سنگھ، چتوڑ کی حکمراں رانی کرن وتی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مسلمان لاکھ ہمارے دشمن ہوں مگر یہ میرا تجربہ ہے کہ مغل عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ اگر آپ کسی طرح اپنا سفیر آگرہ بھیج کر شہنشاہ ہمایوں کو اپنا بھائی بنالیں تو مجھے یقین ہے کہ مغل حکمران اس رشتے سے مجبور ہو کر آپ کی مدد کو ضرور آئے گا۔'' کچھ دیر تک اس مجلسِ خاص پر سناٹے کی سی کیفیت طاری رہی۔ سپہ سالار بھیم سنگھ کی اس تجویز نے تمام حاضرین مجلس کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ یہ بڑی عجیب چال تھی جو راجپوت سردار، سیاست کی بساط پر چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔
رانی کرن وتی بھی بھیم سنگھ کی اس عجیب و غریب تجویز کے ہر پہلو پر غور کرتی رہی۔ پھر اس نے اپنے ایک معتمد سردار، پرتاب سنگھ کو طلب کر کے ایک خوبصورت ''راکھی'' اس کے حوالے کر دی۔
''رکھشا بندھن'' ہندوؤں کا مشہور تہوار ہے۔ اس موقع پر لڑکیاں اپنے بھائیوں کے ہاتھ پر ایک خوبصورت دھاگا باندھتی ہیں۔ اس دھاگے کا نام ''راکھی'' ہے۔ رسم ادا ہونے کے بعد بھائی، بہن کو تحفہ دیتا ہے اور زبانی عہد کرتا ہے کہ وہ ہر حال میں اپنی بہن کی حفاظت کرے گا۔ ہندو مذہب کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ کوئی بہن اپنے سگے بھائی کے ہاتھ پر راکھی باندھے۔ اگر لڑکی کسی غیر لڑکے کے راکھی باندھ دے تو وہ بھی اس کا بھائی بن جاتا ہے۔

نسلی یا خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے شادی نہیں کر سکتے۔
چتوڑ کی حکمران، رانی کرن وتی نے سونے کی ایک چھوٹی سی صندوقچی میں ایک خوب صورت ریشمی دھاگا رکھ دیا جس پر زرد رنگ کے ایک گیندے کا پھول بنا ہوا تھا۔ واضح رہے کہ ہندو مذہب میں گیندے کے پھول کو بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ راکھی کے ساتھ رانی کرن وتی نے مغل شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں کو ایک مختصر خط بھی تحریر کیا تھا جس کی عبارت حسبِ ذیل تھی۔

"اگرچہ میرے اور تمہارے خاندان و مذہب میں بہت فرق ہے۔ لیکن میں اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ تمہیں حقیقی بھائی تسلیم کرتی ہوں۔ مغل شہنشاہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس وقت میری حکومت، والیٔ گجرات سلطان بہادر شاہ کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے اور میری شہ رگ اس کی تلواروں کی زد پر ہے۔ اگر تم برق و باد کے طوفان کی طرح اپنی بہن کی مدد کو پہنچ سکتے ہو تو میرا خط ملتے ہی ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لو اور اس کا رخ چتوڑ کی طرف کر دو۔ اگر کوئی مجبوری یا سیاسی مصلحت تمہارے راستے میں رکاوٹ ہو تو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ تمہاری بہن، رانی کرن وتی۔"

پھر چتوڑ کا سفیر، سردار پرتاب سنگھ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آندھی کی طرح آگرہ کی طرف بڑھا۔ راجپوت سفیر کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ اس نے دو دن کا فاصلہ ڈیڑھ دن سے کم وقت میں طے کیا۔ پھر مغل دربار میں راکھی باندھنے کی رسم ادا کی گئی۔ اس کے بعد مغل شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں نے اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر انتہائی پُر جلال لہجے میں چتوڑ کے سفیر کو مخاطب کر کے کہا۔

"رانی کرن وتی کو میرا پیغام دو کہ میں نے تہہ دل سے اس نئے رشتے کو قبول کیا...... اور واپس جا کر والیٔ چتوڑ کو بتا دو کہ نصیرالدین ہمایوں اپنی بہن کی مدد کو ضرور آئے گا۔"

چتوڑ کا سفیر اسی رفتار کے ساتھ اپنی ریاست کی طرف لوٹ گیا۔

قاصد کے جاتے ہی شہنشاہ ہمایوں کے امیروں نے اپنے فرمانروا کے فیصلے سے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔

ایک امیر طفر مرزا نے نصیرالدین ہمایوں کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"شہنشاہ! یہ دو ریاستوں کا جھگڑا ہے۔ آپ کو اس نازک سیاسی معاملے میں فریق نہیں بننا چاہیئے۔"

"آپ کو آگرے میں بیٹھ کر یہ خوں رنگ تماشا دیکھنا چاہیئے...... ایک فاتح قرار پائے گا اور دوسرا مفتوح۔ بالفرض اگر یہ جنگ برابری پر بھی چھوٹ گئی تو دونوں طرف شدید جانی نقصان ہوگا۔" دوسرے مغل سردار، صفدر برلاس نے شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ صورت ہمارے لئے نہایت سودمند ثابت ہو گی۔ کیونکہ دونوں ہمارے سیاسی حریف ہیں۔"

سیاسی اور جنگی نقطہ نظر سے صفدر برلاس کا مشورہ بہت دانش مندانہ تھا۔ مگر اس کی رائے سن کر مغل فرمانروا کی کشادہ پیشانی شکنوں سے بھر گئی اور پھر نصیرالدین ہمایوں نے کسی قدر تلخ لہجے میں صفدر برلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اور میرے اس وعدے کا کیا ہوگا جو میں نے چتوڑ کے سفیر سے کیا ہے؟"

مغل سردار، صفدر برلاس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "سیاست میں عہد و پیماں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ صرف وقت کی رفتار اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس کے مطابق فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ جنگی مصلحتوں اور تقاضوں کے مطابق جھوٹ کو سچ کہنا پڑتا ہے...... اگر ہم......"

ابھی مغل سردار کی بات مکمل ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں نے چیخنے کے سے انداز میں کہا۔

''صفدر برلاس! مجھے کافروں کی سیاست سکھانے کی کوشش نہ کرو۔ میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمان ہر حال میں اپنے عہد کا پابند ہوتا ہے۔ تم اپنے بہترین شہہ سواروں اور تیر اندازوں پر مشتمل فوجی دستے تیار کرو۔ مجھے ہر حال میں چتوڑ کا دفاع کرنا ہے۔ اگر سلطان بہادر شاہ کو اس موقع پر اس کی حدوں میں نہ رکھا گیا تو آئندہ وہ ہمارے لئے بھی خطرات پیدا کر سکتا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی مغل شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں نے اپنی فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ مگر اتفاق سے مکمل منصوبہ بندی میں کچھ تاخیر ہو گئی اور پھر ہمایوں اور رانی کرن وتی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سلطان بہادر شاہ اس قدر عجلت سے کام لے گا۔ سلطان بہادر شاہ نے ایک لشکرِ جرار کے ساتھ ریاست چتوڑ پر یلغار کر دی۔ راجپوت سپاہی قلعے سے نکل کر مردانہ وار لڑے۔ مگر سلطان بہادر شاہ کے فوجیوں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور وہ چتوڑ کے مقابلے میں بہتر اسلحے سے لیس بھی تھے۔ نتیجتاً راجپوتوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ رانی کرن وتی اضطراب کے عالم میں قلعے کی فصیل پر ٹہل رہی تھی۔ اور اس کی بے چین نظریں ایک ہی منظر کو تلاش کر رہی تھیں کہ کب چتوڑ کی طرف آنے والے راستوں سے غبار اُٹھے گا...... اور کب اس غبار سے نصیر الدین ہمایوں کے برق رفتار سپاہیوں کے چہرے اُبھریں گے۔ رانی کرنی وتی کا اضطراب بڑھتا گیا۔ اور نصیر الدین ہمایوں کے لشکر کو چتوڑ پہنچنے میں دیر ہوتی چلی گئی۔

بالآخر شدید مایوسی کا شکار ہو کر رانی کرن وتی، راجپوت سرداروں کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ قلعے کی فصیل سے نیچے اُتر آئی۔ پھر یہ تمام عورتیں محل کے طویل و عریض صحن میں جمع ہو گئیں۔ اس کے بعد رانی کرن وتی نے راج گھرانے کا سارا خزانہ، قیمتی ہیرے اور نوادرات اسی کمرے میں ڈھیر کر دیئے۔ پھر تمام عورتوں نے ماتمی گیت گانا شروع کر دیا۔

''اے عظیم راجپوتوں کی سرزمین چتوڑ...... ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم تیرے در و دیوار کی حفاظت نہ کر سکے...... اپنی کمزوریوں کے سبب ہمیں اس پر اختیار نہیں تھا۔ لیکن ہم اپنے جان و مال پر پورا اختیار رکھتے ہیں۔ دیوتاؤں کی قسم! ہم دشمنوں کے ہوس کار ہاتھوں کو اپنے پاکیزہ آنچلوں تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ اس سے پہلے کہ کوئی شسترو (دشمن) ہماری عزت و آبرو کے آبگینوں کو توڑ ڈالے، ہم خود اپنے جسموں کو مقدس آگ کے حوالے کر دیں گے۔''

ماتمی گیت ختم ہوا...... پھر رانی کرن وتی کے ساتھ راج گھرانے کی تمام خواتین اور لڑکیوں نے اپنے دیوتاؤں کی پوجا کی۔ اس کے بعد محل کی کنیزوں نے اس مخصوص کمرے کے علاوہ تمام کمروں میں نفط (مٹی کا تیل) چھڑک دیا...... پھر آگ لگائی...... آن کی آن میں ہر طرف شعلے ہی شعلے بھڑک رہے تھے۔

رجپوتوں کی یہ مخصوص رسم تھی کہ جب ان کے مرد دشمن کے مقابلے کے لئے میدانِ جنگ کی طرف جاتے تھے...... اور انہیں اس جنگ میں کامیابی کی توقع نہیں ہوتی تھی تو ان کی عورتیں اپنے سارے زیورات پہن کر ایک کمرے میں جمع ہو جاتی تھیں...... پھر اس کمرے کو آگ لگا دی جاتی تھی...... تاکہ دشمن اگر ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہو تو وہ راجپوت عورتوں کو استعمال میں نہ لا سکے۔

رانی کرن وتی نے بھی اس موقع پر وہی صدیوں پرانی رسم ادا کی۔ پھر جب آگ کے شعلوں نے پورے

کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو رانی کرن وتی نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا۔

''ہمایوں! تُو نے مجھے اپنی بہن تسلیم کرلیا تھا۔ اور میں بھی اس رشتے پر اعتبار کر بیٹھی تھی۔ مگر میرے سردار ٹھیک ہی کہتے تھے کہ ایک ہندو عورت کسی مسلمان کی بہن نہیں ہوسکتی...... میں نے آخری وقت تک تمہارا انتظار کیا...... مگر دیوتاؤں کو یہی منظور تھا۔''

محل کی کئی کنیزوں نے رانی کرن وتی کی یہ دردناک فریاد سنی۔ پھر آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے اس سے فریاد کی مہلت بھی چھین لی...... اور سب کچھ جل کر راکھ ہوگیا۔

میدانِ جنگ سے لے کر چتوڑ کے قلعے تک راجپوت سپاہیوں کی خون آلود لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور سلطان بہادر شاہ اپنے فوجیوں کے ہمراہ ان کی لاشوں کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر جب وہ فاتحانہ غرور کے ساتھ چتوڑ کے محل میں داخل ہوا تو والئ گجرات کی حیرت اور مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پورا محل راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ ابھی سلطان بہادر شاہ کفِ افسوس مل ہی رہا تھا کہ اس کے جاسوسوں نے شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں کے لشکر کے آنے کی خبر دی۔

والئ گجرات کی فتح کا نشہ ٹوٹ گیا۔ وہ چتوڑ پر مکمل قبضے اور حکمرانی کے خواب کے زیر اثر کیف و نشاط اور سرشاری کی کیفیت سے دوچار تھا۔ مگر شہنشاہ ہمایوں کی آمد کی خبر نے سلطان بہادر شاہ کے ہوش اُڑا دیئے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مغل شہنشاہ کسی آفتِ ناگہانی کی طرح چتوڑ پر نازل ہوسکتا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر سلطان بہادر شاہ نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ وہ برق رفتاری کے ساتھ گجرات کی طرف واپس لوٹ جائے۔ گجرات کے سپاہیوں نے بڑی حیرت کے ساتھ اپنے فرمانروا کا حکم سنا۔ وہ جی بھر کر چتوڑ کو لوٹنا چاہتے تھے مگر اُنہیں واپسی کا حکم مل گیا۔ اگر گجراتی لشکر، لوٹ مار میں مشغول ہو جاتا تو عقب سے آنے والا مغل لشکر اُنہیں گھیر لیتا...... اور پھر ان کی واپسی کے تمام راستے بند ہو جاتے۔ مجبوراً سلطان بہادر شاہ گجراتی کو فتح حاصل کرنے کے باوجود ناکام و نامراد واپس لوٹ جانا پڑا۔ مغل شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں جس رفتار سے چتوڑ کی طرف بڑھ رہا تھا، اسی تیزی کے ساتھ گجراتی اپنے علاقے کی طرف واپس جا رہے تھے۔

پھر جب مغل شہنشاہ ہمایوں، چتوڑ پہنچا تو وہاں راجپوت سپاہیوں کی سڑتی ہوئی لاشوں اور راج محل کے جلے ہوئے ملبے کے سوا کچھ باقی نہیں تھا۔ رانی کرن وتی کی کنیزوں نے بڑے دردناک لہجے میں اپنی حکمران کے آخری الفاظ دہرائے تو شہنشاہ کی آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔

''بے شک! مہارانی اپنی آنکھوں سے ہمایوں کے ایفائے عہد کو نہ دیکھ سکیں...... مگر چتوڑ کے بام و در اور تاریخِ ہندوستان گواہ ہیں کہ میں پورے خلوص کے ساتھ اپنی بہن کی مدد کو آیا تھا...... مگر قدرت کے فیصلے تبدیل نہیں کئے جاسکتے۔''

چتوڑ کی بربادی کے بعد سلطان بہادر شاہ کے حوصلے بہت زیادہ بڑھ گئے تھے۔ نتیجتاً وہ ہندوستان پر حکمرانی کے خواب دیکھنے لگا۔ صرف مغل شہنشاہ نصیرالدین ہمایوں ہی اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ بہادر شاہ کے فوجی مشیروں نے اسے بہت سمجھایا کہ ابھی قسمت آزمائی کا وقت نہیں آیا ہے...... مگر چتوڑ کی فتح کا نشہ اتنا گہرا تھا کہ بہادر شاہ کی عقل اور آنکھوں پر دبیز پردے پڑ گئے تھے، جنہیں کسی رائے یا مشورے سے ہٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ سلطان بہادر شاہ کے غرور و سرکشی کی ایک بڑی وجہ اس کا بہترین آتشیں اسلحہ بھی تھا۔ اسی وجہ سے **941**ء میں سلطان بہادر شاہ نے پوری طاقت کے ساتھ شہنشاہ ہمایوں کے علاقوں پر یلغار کی۔

اس حملے کے دوران سالار شیر وانی کو اپنا بھولا ہوا خواب یاد آیا۔ وہی خواب، جس میں شیر وانی نے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو دیکھا تھا، جب آپؒ فرما رہے تھے۔

''شیر وانی! ذرا ہمایوں کا خیمہ تو دیکھو! کس قدر وسیع ہے۔ سارے گجرات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔''

اس خواب کے یاد آتے ہی گجراتی سالار شیر وانی پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ وہ سلطان بہادر شاہ کو سمجھانا چاہتا تھا مگر اس کا وقت گزر چکا تھا۔ والیٔ گجرات اور اس کے دیگر فوجی سالاروں کو اپنے آتشیں اسلحے کی برتری کے سبب فتح کا یقین تھا۔ مگر تنہا شیر وانی یہ راز جانتا تھا کہ سلطان بہادر شاہ کی گردش کا زمانہ بہت قریب آچکا ہے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ مغل شہنشاہ نصیر الدین نے گجرات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سلطان بہادر شاہ، میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔ اور پھر ساری زندگی خانہ بدوش فقیروں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔ اور پھر اسی بے کسی کی حالت میں فرشتۂ اجل نے اُس کی سانسیں غصب کر لیں۔

سلطان بہادر شاہ گجراتی کی اس شکست نے ہزاروں سپاہیوں کی تقدیروں پر خاک ڈال دی۔ مگر سالار شیر وانی کی قسمت یکسر بدل گئی۔ اس خوں ریز معرکہ آرائی کے بعد اس نے خواب میں نظر آنے والے بزرگ کی تلاش شروع کر دی۔ وہ کئی ماہ تک شہر شہر، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں مارا مارا پھرا...... ہزاروں لوگوں سے خواب میں نظر آنے والا بزرگ کا حلیہ بیان کیا اور پوچھا کہ اس شکل و صورت کے بزرگ کہاں رہتے ہیں؟......لوگوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا......مگر سالار شیر وانی نے ہمت نہیں ہاری۔ بالآخر طویل مسافت طے کر کے ایک دن حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے آستانۂ عالیہ تک پہنچ ہی گیا اور پھر انتہائی عقیدت کے ساتھ سلسلۂ صابریہ کے اس عظیم بزرگ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا۔

معتبر تذکروں میں حضرت شیخ کے اسی مرید شیر وانی کے ایک اور خواب کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس وقت پورے ہندوستان پر شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں کا پرچم لہرا رہا تھا اور مغل حکمراں کو ناقابلِ تسخیر سمجھا جانے لگا تھا۔ اسی زمانے میں شیر وانی نے اپنے پیر و مرشد حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو خواب میں دیکھا۔ آپؒ انتہائی پُرمسرت لہجے میں فرما رہے تھے۔

''شیر وانی! ذرا فرید خان کے خیمے پر تو نظر کرو۔ سارا ہندوستان اس کے آگے سرنگوں ہے۔ فرید خان، عادل و منصف ہے۔ اس لئے اسے بزرگانِ دین کی تائید حاصل ہے۔ وہ بحکم خدا، ہندوستان کا شہنشاہ بن جائے گا۔ مگر ہم اس وقت اس دنیا میں موجود نہیں ہوں گے۔''

فرید خان، پٹھانوں کے ''سوری'' قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور سہسرام کے ایک معمولی جاگیردار کا بیٹا تھا، جس نے اپنی سوتیلی ماں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر گھر چھوڑ دیا تھا۔ اور مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے لشکر میں ایک عام سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا تھا۔ بہت ذہین اور شجاع نوجوان تھا......اس لئے جلد ہی ایک فوجی دستے کا سالار بن گیا۔ اور پھر ایک دن اس نے شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں کی مضبوط ترین سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا اور شیر شاہ سوری کے نام سے ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ صرف پانچ سال تک پورے عدل و انصاف کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کی۔ اس مختصر ترین عرصے میں کئی سیاسی، فلاحی، اصلاحی اور تعمیراتی کارنامے انجام دیئے۔ شیر شاہ سوری کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ **Grand Truk Road** ہے، جسے عام طور پر جی ٹی روڈ کہا جاتا ہے۔ یہ سڑک، پشاور سے شروع ہو کر بنگال تک جاتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ جدید الیکٹرانک سسٹم کی سہولتوں کے دور میں بھی یہ ہزاروں میل لمبی شاہراہ اتنے کم عرصے میں تعمیر نہیں کی جا سکتی۔

شیر شاہ سوری کی تخت نشینی سے تین سال پہلے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے اور اپنے خالقِ حقیقی کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہوئے۔

وفات سے کوئی دو سال قبل حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے مکمل طور پر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ہر وقت یادِ الٰہی میں گم رہتے۔ ایک دن کسی مرید نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

''سیّدی! یہ سکوت کس وجہ سے ہے؟''

جواب میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے فرمایا۔ ''میرا وجود دریائے ذکر ہو گیا ہے۔ ہر وقت فنا کی موجیں آتی ہیں اور مجھے غرق کر کے حضورِ حق لے جاتی ہیں.....اس طرف آنے ہی نہیں دیتیں۔''

15 جمادی الآخری 945ھ پیر کے دن حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ کا عرس مبارک تھا۔ اسی روز حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو سردی سے بخار آیا۔ جمعہ کے دن قدرے افاقہ ہوا۔ آپؒ نے نماز ادا کی......مریدوں کا خیال تھا کہ حضرت شیخ آہستہ آہستہ صحت یاب ہو جائیں گے۔ مگر نماز کے فوراً بعد ہی دوبارہ بخار آ گیا۔ اور پھر مسلسل چار روز تک آپؒ شدید بخار میں مبتلا رہے۔ انتقال سے کچھ دیر پہلے ہوش آیا تو مریدوں کو حکم دیا کہ وضو کرائیں۔ نقاہت کے سبب کروٹ بھی نہیں لے سکتے تھے۔ بمشکل تمام سہارا دے کر وضو کرایا گیا۔ پھر آپؒ بستر پر دراز ہو گئے۔ اشاروں سے نماز ادا کی اور پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنے صاحبزادے حضرت شیخ رکن الدینؒ کو قریب بلا کر فرمایا۔

''اللہ تم سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ اب تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔ ملاقات کا وقت قریب آ پہنچا......دیدارِ دوست کے لئے خلوت ضروری ہے۔''

حضرت شیخ رکن الدینؒ اور دوسرے مرید اشک بار آنکھوں کے ساتھ چلے گئے۔ خانقاہ کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد اندر سے ''حق، حق'' کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ در و دیوار پر لرزہ طاری تھا۔ فضائیں سوگوار تھیں اور عقیدت مندوں کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ آفتابِ معرفت غروب ہونے والا تھا۔ روشنی زرد ہوتی جا رہی تھی۔ پھر آخری کرن بھی بجھ گئی......حق کی صدائیں دینے والا، حق سے جا ملا تھا۔

صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ۔

❁❁❁

حضرت جلال الدین تبریزیؒ

اب ہم سلسلۂ سہروردیہ کے ایسے عظیم بزرگ کا ذکر کریں گے جن کے حالاتِ زندگی سے پاک و ہند کے مسلمانوں کی اکثریت ناواقف ہے۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے، جب سلطان قطب الدین ایبک ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کر کے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش فقیروں کی صحبت میں رہ کر خود بھی کسی حد تک فقیرانہ مزاج کا مالک بن گیا تھا۔ روحانیت کی تعلیم نے اس کے دل و دماغ سے فرعونی نخوت و غرور کے اثرات زائل کر دیئے تھے اور وہ ہندوستان کا ایک ایسا فرماں روا بن گیا تھا جس کے دل میں رعایا کی محبت اور خدا کا خوف جاگزیں تھا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی مریدی نے اس کو یہاں تک پگھلایا کہ وہ اپنی لامحدود سلطنت پر ناز کرنے کے بجائے اکثر راتوں کو خدا کے حضور خم رہنے لگا۔ اسی پاکبازی اور رقیق القلبی کے سبب حضرت قطبؒ، سلطان سے بہت محبت کرتے تھے۔

ایک روز سلطان شمس الدین التمش، حضرت قطبؒ کی محفلِ سماع میں با ادب سر جھکائے بیٹھا تھا۔ عارفانہ کلام پڑھنے والے کی آواز اتنی دلکش تھی کہ در و دیوار اس کے اثر سے جھوم رہے تھے۔ خود حضرت قطبؒ پر وجد کا عالم طاری تھا۔ جیسے جیسے مطرب کی پُرسوز آواز تیز ہوتی جا رہی تھی، حضرت قطبؒ بھی اپنے آپ سے بے خبر ہوتے جاتے تھے۔ جذب و مستی کی عجیب کیفیت تھی جس نے پوری فضا کا احاطہ کر لیا تھا۔ یکایک حضرت قطبؒ گھبرائے ہوئے انداز میں کھڑے ہو گئے۔ آپؒ کے اس عمل پر تمام حاضرین چونک پڑے۔ آج پہلی بار سماع میں شریک ہونے والوں نے حضرت قطبؒ کا یہ اضطراری عمل دیکھا تھا۔ اس لئے حضرت قطبؒ کے ساتھ ہی دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ کھڑے ہونے والوں میں ہندوستان کا با اختیار شہنشاہ سلطان شمس الدین التمش بھی تھا۔ ناگہاں حضرت قطبؒ نے فرمایا۔

''خدا کا دوست آ رہا ہے۔''

یہ کہہ کر آپؒ اللہ کے دوست کا استقبال کرنے کے لئے اپنی خانقاہ سے باہر نکل آئے۔ تمام لوگ حیران تھے۔ ''خدا کا دوست کون ہے؟'' وہ اس رمز کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ پھر بھی حاضرینِ مجلس کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والا یقیناً کوئی مردِ کامل ہے۔ اگر وہ نامعلوم شخص، خدا کا برگزیدہ بندہ نہ ہوتا تو حضرت قطبؒ جیسے عارف اس عقیدت مندانہ انداز میں اپنی خانقاہ سے باہر نکل کر اس کا استقبال نہ کرتے۔ حضرت قطبؒ نے آنے والے کو خوش آمدید کہنے کے لئے صرف دروازے پر کھڑے ہونے ہی کو کافی نہ سمجھا۔ آپؒ بے اختیار آگے بڑھے اور گلیوں سے گزرتے ہوئے اس مردِ خدا کے قریب پہنچے۔ جیسے ہی آنے والے پر حضرت قطبؒ کی نظر پڑی، آپؒ نے دوڑ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ آنے والا بھی حضرت قطبؒ سے اس طرح لپٹ گیا جیسے وہ بختیار کاکیؒ سے ملنے کے لئے صدیوں سے بے قرار و مضطرب ہو۔ گلے ملنے کے بعد حضرت قطبؒ اس بزرگ کو لئے اپنی خانقاہ میں داخل ہوئے اور انتہائی ادب و احترام سے اس طرح اپنی مجلس میں بٹھایا، جیسے میرِ مجلس وہی شخص ہو۔

سلطان شمس الدین التمش بہت غور سے حضرت قطبؒ کا یہ عمل دیکھ رہا تھا۔ وہ آنے والے بزرگ کو پہچان گیا

تھا۔ مگر اس ملاقات سے پہلے اسے بزرگ کے مرتبے کا اندازہ نہیں تھا۔ یہ بات اس کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ حضرت قطبؒ، بزرگ کا اس قدر احترام کریں گے۔ لیکن جب اس نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیا تو بزرگ کی پاکیزہ شبیہ اس کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی۔

یہ بزرگ، حضرت جلال الدین تبریزی سہروردیؒ تھے۔

حضرت ابوالقاسم جلال الدینؒ، تبریز میں پیدا ہوئے۔ تذکرہ نویسوں نے آپؒ کی تاریخ پیدائش 532ھ تحریر کی ہے۔ عام طور پر آپؒ کے بچپن کے حالات کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ اور جہاں سے آپؒ کی شخصیت کا پتہ چلتا ہے، وہ ایک ایسا زمانہ ہے، جب آپؒ جوانی گزار کر پختہ عمر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اسی عہد میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت جلال الدینؒ ابتدا میں ایک پُرشکوہ بادشاہ تھے۔ حکمرانی کے دور میں آپؒ کی دنیا پرستی کا یہ عالم تھا کہ زمین پر قدم رکھتے ہی آپؒ کو عجیب سا احساسِ غرور ہوتا۔ اس قدر قیمتی لباس پہنتے کہ لوگوں کی نظریں پیرہنِ شاہی پر نہ ٹھہرتیں غرض آپؒ کی شخصیت میں وہ تمام باتیں جمع ہو گئی تھیں، جو ایک دنیا دار بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ آپؒ شب و روز عیش و عشرت میں پڑے رہتے۔ یہاں تک کہ شہنشاہیت کے ہنگاموں میں ایک لمحے کے لئے بھی آپؒ کو عاقبت کا خیال نہ آتا۔ عجیب سی سرمستی کی کیفیت تھی، جس نے جلال الدین تبریزیؒ کو صراطِ مستقیم سے ہٹا کر ان بادشاہوں کے راستے پر لگا دیا تھا، جو انسانی زندگی کو صرف اسی دنیا تک محدود سمجھتے ہیں اور پھر اس نشے میں بندگانِ خدا کے حقوق کو پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ اپنی بے خبری کے زمانے میں ایک ظالم حکمراں تو نہیں تھے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دورانِ حکومت آپؒ اتنے خدا ترس بھی نہ تھے کہ آپؒ کی راتیں قیام میں گزرتیں اور دن یادِ خدا میں بسر ہوتے۔ غرض آپؒ کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی غفلت میں گزر گیا۔

ایک روز حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے ساتھ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ آپؒ کی نشست کے مخصوص کمرے کے دروازے پر ہمیشہ ایک دربان متعین رہتا تھا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت جب آپؒ اپنے کمرے سے نکل کر دربار میں جانے لگے تو آپؒ نے دیکھا کہ دربان وہاں سے غائب ہے۔ آپؒ نے شدید غصے کے عالم میں اسے پکارا اور غضب ناک حالت میں کمرے سے باہر نکل آئے۔ آپؒ کی آواز سنتے ہی کئی پہرے دار لرزتے ہوئے دوڑ پڑے مگر وہ خصوصی دربان پکارنے پر بھی نہیں آیا تھا۔ آپؒ نے چاروں طرف اپنی قہر آلود نگاہیں دوڑائیں اور پھر وہ دربان نظر آ گیا جو محل کے ایک گوشے میں عصر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ چند لمحوں تک آپؒ پر غصے کی عجیب سی کیفیت طاری رہی مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد آپؒ پُرسکون ہو گئے۔ دربان شریعت کی تمام پابندیوں کے ساتھ نماز ادا کرتا رہا۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ خاموشی سے دربان کو عبادت کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ آخر نماز ختم ہوئی اور دربان نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ وہ اپنے مالکِ حقیقی سے زیرِ لب کچھ مانگتا رہا اور جب دعاؤں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تو وہ اٹھا اور اس نے قریب ہی زمین پر رکھے ہوئے ہتھیار اُٹھائے اور انہیں جسم پر سجایا۔ پھر آگے بڑھا اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ کو دیکھ کر آدابِ شاہی بجا لایا۔ محل کے دوسرے پہریداروں کا عجیب عالم تھا۔ شدتِ خوف سے ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ ہر محافظ کو یقین تھا کہ اب اس محافظ کو دنیا کی کوئی طاقت موت سے نہیں بچا سکتی۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ دربان کے چہرے پر خوف کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔ آخر جلال الدین تبریزیؒ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور پھر محل کی فضا میں ایک شہنشاہ کی آواز گونجنے لگی۔

''تم یہاں کس لئے آئے ہو؟'' حضرت جلال الدینؒ نے انتہائی خشمگیں لہجے میں دربان سے پوچھا۔
''خدماتِ شاہی انجام دینے۔'' دربان نے اپنے فرمانروا کو انتہائی ادب و احترام کے ساتھ مختصر جواب دیا۔
''مگر کچھ دیر پہلے تو تم اپنے فرائض بھول کر دوسرے کام میں مصروف تھے۔ کیا تمہیں اسی لئے ملازم لگا رکھا ہے؟ جب تمہاری بے خبری کا یہ عالم ہے تو تم کس طرح ہماری حفاظت کر سکتے ہو؟'' حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے لہجے کی تلخی بدستور تھی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں دربارِ شاہی کا ادنیٰ خدمت گار ہوں مگر ایک لمحے کے لئے بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں۔ حضور جس چیز کو میری غفلت سمجھ رہے ہیں، وہ درحقیقت فرض شناسی ہے۔ جو ذمے داریاں مجھے سونپی گئی ہیں، میں ان کو اس حد تک پورا کرتا ہوں کہ اگر آپ رات کے تین بجے بھی تشریف لائیں گے تو مجھے جاگتا ہوا پائیں گے۔ میں ایک دن بھی اپنے اوقاتِ کار کے دوران نہیں سویا۔ میں حکومت کا معمولی ملازم ہوں۔ آپ جب بھی مجھے آواز دیں گے، میں سر کے بل چلا آؤں گا۔ مگر جب اس کائنات کا حقیقی شہنشاہ پکارے گا، اس وقت میں دنیا کے کسی بادشاہ کا حکم نہیں سنوں گا۔ آپ جس گھڑی کمرے سے باہر تشریف لائے، اس سے تھوڑی دیر قبل مجھے شہنشاہِ حقیقی نے پکارا تھا۔ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ (آؤ نماز کی طرف) میں اُس کا گناہ گارترین بندہ سہی لیکن نافرمانی میرا شعار نہیں۔ اس نے مجھے آواز دی، میں دوڑا ہوا چلا گیا۔ یہ تو شاہی محل کا گوشۂ عافیت ہے، خداوندِ ذوالجلال کی عزت کی قسم! اگر وہ مجھے سرِ مقتل بھی پکارے گا تو میں اسی انداز میں چلا جاؤں گا۔ میرے قدموں میں کوئی لغزش نہیں ہوگی۔'' دربان نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا اور پھر حضرت جلال الدینؒ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اگر آپ کی نظر میں یہ فرض شناسی نہیں تو میں شاہی اعزاز واپس کرتا ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس محل سے دُور اپنی روزی تلاش کروں یا پھر آپ کی سلطنت کی حدود سے نکل کر خدا کی وسیع زمین پر کہیں اور چلا جاؤں۔ میں اپنی فرض شناسی کی وضاحت کر چکا۔ پھر بھی اگر حضور کے خیال میں مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے تو میں سزا کے لئے تیار ہوں۔ چاہے آپ کے قانون میں یہ سزا موت ہی کیوں نہ ہو۔''

محل کے در و دیوار نے آج تک ایسی بے باک گفتگو نہیں سنی تھی۔ اس لئے قصرِ شاہی پر عجیب سا سکوت طاری تھا۔ دوسرے محافظوں کو دربان کی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ خود حضرت جلال الدینؒ بھی سناٹے کے عالم میں کھڑے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک آپؒ کے چہرے پر قہر و غضب کے جو سائے لرز رہے تھے، وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

''یقیناً تم ایک فرض شناس خدمت گار ہو۔ تم اپنے آقا کو پہچانتے ہو۔ تمہیں حقیقی اور غیر حقیقی شہنشاہ کا فرق معلوم ہے۔ بے شک تم ایک جاگنے والے انسان ہو۔ واحسرتا کہ میں ہی آج تک سوتا رہا۔ افسوس! صد ہزار بار افسوس۔'' یہ کہہ کر حضرت جلال الدین تبریزیؒ دربار جانے کے بجائے واپس لوٹ آئے۔

پورے محل میں ہنگامہ برپا تھا۔ بادشاہ کی خلافِ معمول واپسی اور غیر معمولی خاموشی نے محل کی فضا کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ آپؒ کسی سے کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جب حضرت جلال الدینؒ کی بیگم کو اس اچانک واپسی کا علم ہوا تو وہ مضطرب ہو کر آپؒ کے کمرے میں پہنچیں اور مزاج پرسی کرنے لگیں۔ حضرت نے پُرسکون انداز میں بیگم کو بتایا کہ ان کی طبیعت ٹھیک ہے مگر حکومت کے کچھ ضروری کام ہیں جو تنہائی طلب ہیں۔ بیگم آپؒ کا یہ جواب سن کر مطمئن انداز میں واپس چلی گئیں۔ مگر آپؒ کی بے قراریاں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ

حضرت جلال الدین تبریزیؒ رات بھر کمرے میں ٹہلتے رہے اور پھر نا قابل بیان کرب میں ڈوبی ہوئی یہ رات بھی گزر گئی۔ صبح ہوئی اور جیسے ہی اذان کی آواز سنائی دی، آپؒ بے اختیار رو پڑے۔

''اے شہنشاہوں کے شہنشاہ! میری نیند ٹوٹ گئی ہے۔ میں تیرے حضور آ رہا ہوں۔ میرے خواب بکھر گئے ہیں۔ ریشمی بستر نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اے آقا! مجھے اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لے۔ گدائے بے نوا، تیرا غلام، جلال الدین تبریزی آ رہا ہے۔''

اس کے بعد آپؒ نے نمازِ فجر ادا کی اور پھر بیوی بچوں کو مختلف نصیحتیں کرنے کے بعد یہ پُر شکوہ بادشاہ ہمیشہ کے لئے دنیاوی اقتدار سے محروم ہو گیا۔ اسے کسی دشمن نے میدانِ جنگ میں شکست نہیں دی تھی بلکہ وہ خود اپنے ضمیر سے شکست کھا گیا تھا۔ ایک معمولی دربان نے اس خوابیدہ فرمانروا کو یہاں تک جھنجوڑا تھا کہ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا تھا اور جب اُس کی آنکھ کھلی تھی تو اُس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تھا۔ تخت و تاج اسے پکار رہے تھے۔ بیوی بچے اسے سمجھا رہے تھے، مگر وہ نہیں مانا۔ اس کی ظاہری آنکھیں اندھی ہو گئی تھیں مگر وہ دل کی آنکھوں سے آسمانوں کے پار دیکھ رہا تھا۔ اس کے کان مادی سماعت سے محروم ہو گئے تھے لیکن وہ گوشِ باطن سے ایک ابدی نغمہ سن رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ نغمہ اُس کی روح کی گہرائیوں میں اُتر گیا اور پھر اُس نے ریشمی قبا جسم سے اُتار کر ٹاٹ لپیٹ لیا۔ بیوی، بچے، عزیز، رشتے دار اور درباری تمام حیران تھے۔ کچھ لوگ اس کی ذہنی حالت پر شک کر رہے تھے۔ مگر وہ سب سے بے نیاز کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ آخر اس نے مردانہ وار اپنے سر سے تاج اُتارا اور بیٹے کے سر پر رکھ دیا۔ ایک لمحے میں تیس سالہ دورِ اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن تک نہ تھی۔

اور جب وہ قصرِ شاہی سے اُٹھ کر چلا گیا تو اُس کے پاس بے شمار دولت تھی۔ لوگ اب بھی اُس کی نیت پر شبہ کر رہے تھے لیکن وہ لوگوں کی تمام قیاس آرائیوں سے بے پروا محل سے نکل کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے قدم تیز رفتار تھے۔ مملکت کے لوگ اپنے بادشاہ کی آخری منزل کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھے۔ آنکھیں برابر اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اور پھر لوگ یہ دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئے کہ بادشاہ ایک فقیر کی خانقاہ میں داخل ہو رہا ہے۔

بادشاہ نے اندر داخل ہوتے ہی تمام زر و جواہر، فقیر کے قدموں میں ڈال دیئے اور بڑے اثر انگیز لہجے میں کہا۔

''یہ سب کچھ حضور کی نذر ہے۔ اسے قبول فرما لیجئے۔''

فقیر، بادشاہ کے اضطراب پر مسکرایا اور اس کے ہاتھ سے تمام زر و جواہر لے کر ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر دیئے۔

جب تمام دولت غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم ہو گئی تو فقیر نے بادشاہ سے کہا۔

''میں نے تمہیں اپنے حلقۂ ارادت میں شامل تو کر لیا ہے مگر ابھی عشق کے کئی مشکل امتحانات باقی ہیں۔ تم نے عشق کی راہ میں اپنی دولت لٹائی، یہ بہت بڑی بات ہے۔ مگر اس سے بڑی بات یہ ہے کہ تم مسلسل محرومیوں کا شکار رہو اور تمہارے قدم نہ لڑکھڑائیں۔''

حضرت جلال الدین تبریزیؒ، فقیر کی یہ بات سن کر اس قدر خوش ہوئے جیسے ایک چھوٹی سی ریاست کھونے کے بعد انہیں عظیم الشان ملک کی حکومت مل گئی ہو۔ فقیر نے انہیں آزمائش کی بھٹی میں ڈال دیا تھا۔ مگر وہ جانثاروں کی طرح عشقِ حقیقی کے شعلوں میں چپ چاپ جل رہے تھے۔

جن فقیر کے کہنے پر حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے اپنی ساری دولت لٹا دی تھی، وہ دنیائے اسلام کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تھے۔ ''سلسلۂ سہروردیہ'' آپؒ ہی کی ذاتِ گرامی سے منسوب ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین کا پورا نام شہاب الدین یحییٰ تھا۔ اور والد کا اسمِ گرامی حبش بن امیرک۔ آپؒ ''سہروردیہ'' کے مقام پر پیدا ہوئے۔ یہ عراق میں زنجان کے قریب ایک علاقہ ہے۔ اکثر مؤرخین کے مطابق حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی تاریخ ولادت نامعلوم ہے۔ مگر کچھ روایتوں کے مطابق آپؒ 549ھ میں پیدا ہوئے۔ شعور کی منزل کو پہنچنے کے بعد آپؒ نے مشہور عالم حضرت امام مجدالدینؒ کی شاگردی اختیار کی اور ان سے حکمت اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ نوعمری ہی سے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا رجحان یونانی فلسفے کی طرف تھا۔ اس لئے آپؒ نے فقہ کے ساتھ ساتھ فلسفے کی کتابوں کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپؒ ''حلب'' تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت سلطان صلاح الدین ایوبی کا بیٹا ملک الظاہر، حلب کا حاکم تھا۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فلسفے کی روشنی میں حلب کے علماء اور فقہاء سے زبردست مناظرے کئے اور ان دونوں جماعتوں کو بحث کے دوران شکست دی۔ نتیجتاً مقامی علماء آپؒ کے دشمن ہو گئے اور اپنی مجلسوں میں اس ''فلسفی صوفی'' پر کفر کے فتوے لگانے لگے تاکہ حلب کے عوام، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے بدظن ہو جائیں اور آپؒ کی خانقاہ میں جانا ترک کر دیں۔ مگر علماء کے یہ فتوے عقیدت کے اس سیلاب کے آگے بند نہ باندھ سکے جو، عوام کی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے تھی۔

اس عوامی مقبولیت اور عقیدت کا ایک ہی سبب تھا کہ حضرت شیخ ایک صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ اور ''علمائے حلب'' کوئی کرامت دکھانے سے قاصر تھے۔ عظیم صوفی شاعر حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ اپنی مشہور تصنیف ''نفحات الانس'' میں تحریر کرتے ہیں۔

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ علم و حکمت کا دریا تھے۔ بعض مخالفین نے انہیں ''جادوگر'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ شیخ اپنے طلسم کے ذریعے ''روح'' کو ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کرنے کا فن جانتے تھے۔ وہ لوگوں کو کھلی آنکھ سے ایسی چیزیں دکھا سکتے تھے جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہ ہو۔

اگر ہم موجودہ زمانے کے اعتبار سے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ پر عائد کردہ اس الزام کی تشریح کریں تو حضرت شیخ ایک شعبدہ باز اور نظر بندی کے ماہر تھے..... جیسا کہ آج کل کچھ ماہرین ہزاروں انسانوں کے مجمع میں اپنے میجک شوز (Magic Shows) دکھاتے ہیں....... جو چیز موجود نہیں ہوتی، اسے سامنے کر دیتے ہیں۔ اور جو حاضر ہوتی ہے، اسے غائب کر دیتے ہیں۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی کرامات کے بارے میں بھی علمائے حلب کا یہی خیال تھا۔

پھر جب عوام مخالفین کے کفر کے فتوؤں سے بھی متاثر نہیں ہوئے اور جب حضرت شیخ کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تو حلب کے علماء اور فقہاء نے متفقہ طور پر سلطان صلاح الدین ایوبی کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی، جس کی عبارت حسبِ ذیل تھی۔

''ہم سلطان کو ایک شخص شہاب الدین یحییٰ کی فتنہ انگیزیوں سے باخبر کرتے ہیں جو زنجان سے آکر حلب کے سادہ لوح عوام کو گمراہ کر رہا ہے۔ یہ شخص ملحد، کافر، زندیق اور جادوگر ہے۔ اگر بروقت اس فتنے کا تدارک نہ کیا گیا تو لوگوں کی بڑی اکثریت کے بہک جانے کا اندیشہ ہے۔'' اس یادداشت پر حلب کے ہر قابلِ ذکر عالم اور فقیہہ

کے دستخط موجود تھے۔
بعض روایتوں کے مطابق سلطان صلاح الدین ایوبی نے بغور اس یادداشت کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے بیٹے، گورنر حلب ملک الظاہر کے نام یہ حکم جاری کر دیا۔
''شہاب الدین یحییٰ نامی شخص کو کسی تاخیر کے بغیر قتل کر دیا جائے۔''
اس سلسلے میں کچھ روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے فرزند ملک الظاہر کو تحریر کیا تھا کہ جلد از جلد اس معاملے کی تحقیق کی جائے۔ اور اگر علمائے حلب کے عائد کردہ الزامات درست ثابت ہوں تو مذکورہ شخص کو قتل کر دیا جائے۔
گورنر حلب، ملک الظاہر بھی مقامی علماء اور فقہاء کے زیر اثر تھا، اس لئے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکے اور آپؒ کو قتل کر دیا گیا۔
کچھ روایتوں کے مطابق جب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ مقامی علماء اور فقہاء کے فتوے سے متاثر ہو کر والئ حلب آپ کے قتل کا فیصلہ کر چکا ہے تو شیخ نے والئ حلب کے نام ایک خط تحریر کیا۔
''مجھے معلوم ہے کہ میں حلب کے علماء، فقہاء اور اراکین سلطنت کے نزدیک واجب القتل ٹھہرا ہوں۔ میری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ اس سلسلے میں کوئی عدالت قائم کی جائے اور میں عدالت میں آ کر اپنی صفائی پیش کروں۔ ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ آپ کی گردن پر میرے قتل کا الزام نہ آئے۔ اس الزام سے بچنے کی ایک بہت ہی آسان ترکیب ہے کہ مجھے ایک کمرے میں قید کر کے دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ بٹھا دیا جائے۔ دونوں وقت کھانے پینے کی اشیاء فراہم کی جائیں۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ ان چیزوں کو ہاتھ تک نہیں لگاؤں گا۔ پھر ایک دن یہ بھوک اور پیاس مجھے مار ڈالے گی اور آپ میرے قتل سے بری الذمہ ٹھہریں گے۔''
حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے خط کے آخر میں زور دے کر لکھا تھا۔
''میری تحریر سے والئ حلب کو یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ میں موت سے فرار ڈھونڈنے یا اسے ٹالنے کی تدبیر کر رہا ہوں۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے جس کا ذائقہ ہر ذی روح کو مقررہ وقت پر چکھنا پڑتا ہے۔ مجھے نرم و نازک بستر پر موت آئے یا میں سرِ مقتل لے جا کر ذبح کر دیا جاؤں...... میرے لئے دونوں حالتیں یکساں ہیں۔''
ان ہی روایتوں کے مطابق سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے ملک الظاہر نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کو ایک کمرے میں قید کر دیا تھا، جہاں آپؒ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گئے تھے۔ مگر ثقہ مؤرخین کے نزدیک ایسی ساری روایات غیر معتبر ہیں۔ واقعہ وہی ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے حلب کے علماء اور فقہاء کے فتوؤں کی روشنی میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا معاملہ ملک الظاہر کے سپرد کر دیا تھا۔ جس نے سلسلہ ''سہروردیہ'' کے بانی بزرگ کو قتل کرا دیا۔
اگر تاریخ کے پس منظر میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے قتل کا جائزہ لیا جائے تو مشہور بزرگ حضرت منصور حلاجؒ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ دونوں صوفیاء کے انجام میں کئی باتیں حیرت انگیز طور پر مماثلت رکھتی ہیں۔ حضرت منصور حلاجؒ ''انا الحق'' کا نعرہ لگاتے تھے...... اس لئے کفر کا فتویٰ لگا کر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ اگرچہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ ''انا الحق'' (میں خدا ہوں) کا نعرہ بلند نہیں کرتے تھے لیکن ان کے فلسفیانہ خیالات کو بنیاد بنا کر کفر کا فتویٰ عائد کیا گیا۔ حضرت منصور حلاجؒ پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپؒ نے ہندوستان جا کر اہلِ ہنود سے جادو سیکھا تھا اور اس فن میں کمال حاصل کیا تھا...... اسی طرح حضرت شیخ شہاب

الدین سہروردیؒ کو بھی ماہر جادوگر کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ الغرض یہ دونوں مشہور صوفی ایک ہی راستے سے گزر کر اپنے انجام کو پہنچے۔ تصوف کی تمام مستند کتابوں میں حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کو ''شیخ مقتول'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ قتل کے وقت آپؒ کی عمر مبارک 36 یا 38 سال تھی۔

بے شک! سہروردیہ سلسلہ کے بانی کو ملحد، کافر، زندیق اور ساحر (جادوگر) قرار دے کر قتل کر دیا گیا تھا..... یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اصل صورتِ حال کیا تھی۔ مگر ہم تاریخ کے آئینے میں اس واقعے کے حقیقی خدوخال دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم بزرگ، حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خدمت میں اٹھارہ دن تک حاضر رہے تھے..... اور آپؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کیسے عالم و فاضل بزرگ تھے۔ پھر آپؒ نے ایک کافر، ملحد، زندیق اور جادوگر کے ہاتھ پر کیوں بیعت کی؟ (معاذ اللہ) کیا حضرت زکریا ملتانیؒ اتنے کم نظر تھے؟..... اہلِ نظر ہماری پیش کردہ اس دلیل پر غور کریں۔

اب ہم حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی صوفیانہ عظمت پر ایک اور تاریخی گواہی پیش کریں گے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ عظیم چشتی بزرگ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ نے علم کی تلاش میں طویل سیر و سیاحت کی تھی۔ اور اپنے دور کے تقریباً تمام بڑے بڑے اولیائے کرام سے فیضِ روحانی حاصل کیا تھا۔

معتبر روایت ہے کہ حضرت بابا فریدؒ، حضرت شیخ شہاب لدین سہروردیؒ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت حضرت شیخ، بغداد میں مقیم تھے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''عوارف المعارف'' کا کچھ حصہ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کو خود پڑھایا اور اس کے مطالب ذہن نشین کرائے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''اگر دولت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جائے تو اہلِ دنیا، درویش کو تونگری کا طعنہ دیں گے اور یہ ایک بڑی سنگین تہمت ہو گی جسے درویش کسی بھی حال میں برداشت نہیں کر سکتا۔ درویشی تو نام ہی خود فروشی کا ہے سو میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے۔''

ایک دن حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خانقاہ میں حضرت جلال الدین تبریزیؒ، حضرت اوحد الدین کرمانیؒ اور حضرت شیخ برہان الدین سیستانیؒ حاضر تھے۔ بابا فریدؒ نے دیکھا کہ حضرت شیخ کے مرید نے خرقۂ خلافت کی درخواست کی۔ یہ مرید ایک عرصۂ دراز سے عبادت و ریاضت میں مشغول تھا اور اب اس کی خواہش تھی کہ جواب میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے دوسرے خلفاء کی طرح اس اعزاز سے نوازا جائے۔

مرید کی اس خواہش کے جواب میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا۔

''آج مجھے معاف کرو، کل کسی وقت آؤ گے تو اس معاملے پر غور کریں گے۔ پھر جو خدا کی مرضی ہو گی، وہی ظاہر ہو جائے گا۔''

پیر و مرشد کا حکم سن کر مرید چلا گیا۔ پھر دوسرے دن واپس آیا تو خانقاہ کے ایک گوشے میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اہلِ مجلس نے دیکھا کہ مرید کے چہرے پر افسردگی کا رنگ نمایاں تھا۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے مرید کی طرف نگاہ کی اور فرمایا۔ ''کیا اب بھی تمہیں خرقۂ خلافت کی خواہش ہے؟ رات تم نے خواب میں اپنی آنکھوں سے ایک پیر اور اس کے مرید کا حشر دیکھ لیا ہے۔ فرشتے ان دونوں کو کھینچتے ہوئے دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف لے جا رہے تھے۔ تم نے اپنے اس خواب کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی؟''

مرید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بے حس و حرکت سر جھکائے بیٹھا رہا۔
حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے دوبارہ اپنے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم جانتے ہو کہ ان دونوں کا یہ عبرت ناک انجام کیوں ہوا؟ اس لئے کہ وہ خرقے کے نام سے دنیا کمایا کرتے تھے اور ہر وقت اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں مصروف رہتے تھے۔'' اس کے بعد حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے دیگر حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''جب تک انسان کا دل دنیا کی کثافتوں سے پاک نہ ہو جائے، اس وقت تک مرشد پر فرض ہے کہ وہ کسی شخص کو خرقہ نہ دے۔ اور مرید کے لئے بھی لازم ہے کہ خرقہ نہ پہنے۔''
اگرچہ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل نہیں ہوئے تھے لیکن تاریخی طور پر ثابت ہے کہ سلسلۂ چشتیہ کے اس عظیم صوفی نے ''شیخ مقتول'' سے کچھ عرصے تک درس لیا تھا اور تصوف کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کی تھی۔ اگر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے عقائد میں ذرا بھی ٹیڑھ ہوتی تو حضرت بابا فریدؒ جیسے عالم اور جانباز بزرگ ایک لمحے کے لئے بھی ''شیخ مقتول'' کی صحبت اختیار نہ کرتے۔ اور اگر بعد میں یہ راز کھلتا تو حضرت بابا فریدؒ اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب پاک پتن کا درویش اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے تو بغداد کا فقیر اسے اپنی دعاؤں کے سائے میں رخصت کرتا ہے۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ اور حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی ارادت اور حضرت بابا فریدؒ کی عقیدت، یہ تین گواہیاں ایسی ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا مقامِ معرفت کیا ہے؟
اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے پیر و مرشد کے حکم پر اپنا سارا مال و زر لٹا دیا اور شیخ کے دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ پھر ایک دن حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
''جلال الدین! تم میں ابھی تک شہنشاہیت کی بُو باقی ہے۔''
حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے گھبرا کر پیر و مرشد کی طرف دیکھا اور نہایت عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔
''سیّدی! میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔''
اپنے مرید کا جواب سن کر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا۔ ''انسان کو اس وقت تک اپنے صحیح خدوخال کا اندازہ نہیں ہوتا، جب تک اس کے سامنے آئینہ موجود نہ ہو۔ پیچیدہ بیماری کی تشخیص کوئی ماہر طبیب ہی کر سکتا ہے۔''
پیر و مرشد کی بات سن کر حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے خادمانہ انداز میں سر جھکا دیا۔ ''سیّدی نے بجا فرمایا۔ میں اپنی کم علمی اور گستاخی پر سخت نادم ہوں۔''
حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے اس مرید کو جو کبھی تبریز کا بادشاہ رہ چکا تھا، حکم دیا۔ ''آج سے تم درویشوں کے وضو اور غسل کے پانی کا انتظام کیا کرو گے؟''
وہ بڑا عجیب منظر تھا، جب دیکھنے والوں نے حضرت جلال الدین تبریزیؒ کو دریا سے پانی بھر کر لاتے ہوئے دیکھا۔ جو بے خبر تھے، انہوں نے حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی اس خدمت کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ مگر جو جانتے تھے کہ پانی بھر کر لانے والا کچھ دن پہلے تک تبریز کا حکمران رہ چکا ہے، انہیں اس انقلاب پر شدید حیرت تھی۔ اکثر روایتوں کے مطابق حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے چار سال تک خانقاہ کے

درویشوں کے لئے پانی بھرنے کی خدمت انجام دی۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کبھی کبھی اپنے مرید کی دلی کیفیات کا جائزہ لیتے اور یہ اندازہ کرتے کہ کہیں اس کے چہرے پر ناگواری کی کوئی علامت تو نہیں؟ مگر حضرت جلال الدین تبریزیؒ کا چہرہ ہمیشہ شگفتہ وشاداب نظر آتا جیسے آپؒ کو بے پناہ روحانی سکون میسر ہو۔ کبھی کوئی شناسا، حضرت جلال الدین تبریزیؒ سے یہ سوال کر بیٹھتا۔

''اے تبریز کے حاکم! یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ جس کی جوتیاں اُٹھانے کے لئے سینکڑوں خدمت گار تھے، آج وہ معمولی لوگوں کو پانی پلا رہا ہے۔ یہ دماغی خلل نہیں تو اور کیا ہے؟''

اس قسم کے سوالات سن کر حضرت جلال الدین تبریزیؒ مسکرا دیتے اور نہایت باوقار لہجے میں فرماتے۔ ''تم جن درویشوں کو معمولی انسان کہہ رہے ہو، وہ سب کے سب اپنی جگہ شہنشاہ ہیں۔ میں تو بس ایک چھوٹی سی ریاست کا حاکم تھا...... میرے خدمت گار تو مجھے بس عام سا پانی پلاتے تھے...... مگر میں اپنے شیخ کے طفیل لوگوں کو ''آبِ حیات'' پلا رہا ہوں۔''

درویشوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ حضرت جلال الدین تبریزیؒ اپنے پیر و مرشد کے آرام کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؒ کی نظریں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے چہرۂ مبارک پر جمی رہتیں کہ کب شیخ کے رُوئے ورانی پر کسی ضرورت کا عکس اُبھرے اور آپؒ دوڑ کر یہ خدمت انجام دیں۔

حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت گزاری کا یہ عالم تھا کہ سفر میں ہمیشہ کھانا پکانے کا چولہا اپنے سر پر اُٹھائے پھرتے تھے کہ جیسے ہی پیر و مرشد کھانا طلب کریں، فوراً تیار کر دیا جائے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنے مرید کی اس محنت و مشقت اور خلوص پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مگر زبانِ مبارک سے کچھ نہیں کہتے تھے شاید ابھی آزمائش اور امتحان کے چند مرحلے باقی تھے۔

اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ آخر ایک روز حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے حج کے لئے مکہ معظمہ اور پھر دربارِ رسالت مآب ﷺ میں حاضری کا ارادہ کیا۔ اس متبرک سفر میں حضرت جلال الدین تبریزیؒ بھی اپنے پیر و مرشد کے ہمراہ تھے۔ شدید گرمی کا موسم تھا، مگر آپؒ، حضرت شیخ کی سواری کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ جب اس طرح کئی میل کا سفر طے ہو گیا تو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے آپؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''جلال الدین! اس قدر تکلیف کیوں اٹھا رہے ہو؟ تم بھی اونٹ پر سوار ہو جاؤ۔''

''سیّدی! طریقت کے راستے میں یہ بڑی بے ادبی ہے کہ ایک مرید اس طرح اپنے شیخ کا ہم سفر ہو...... دھوپ میں جلنا میرے لئے ایک سعادتِ عظیم ہے اور جل کر خاک ہو جانا باعثِ نجات۔'' حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ جواب دیا۔ آپؒ کے ایک ایک لفظ سے بے پناہ خلوص کا اظہار ہو رہا تھا اور چہرے سے اس قدر شادابی ظاہر ہو رہی تھی کہ جیسے آپؒ جلتے ہوئے ریگستان کے بجائے کسی مہکتے ہوئے سبزہ زار میں محوِ خرام ہوں۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنے مرید باصفا کا جواب سن کر خاموش ہو گئے۔ ایک بادشاہ نے دنیا کی ساری مادی آسائشیں ترک کر کے اپنے نفس پر قابو پالیا تھا۔ اور وہ حقیقتاً درویشوں کی جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ بس اب اس نفس کشی، صبر و ضبط، ایثار اور قربانی کا صلہ باقی تھا جو مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد دے دیا گیا۔

جب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، آقائے کائنات، سرورِ کونین، سرکارِ دو عالم ﷺ پر درود و سلام بھیج چکے تو آپؒ نے بے اختیار حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور روضۂ رسول ﷺ کی طرف

دیکھتے ہوئے نہایت پُرسوز لہجے میں عرض کیا۔

''آقا! میں جلال الدین سے راضی ہوں۔ آپ بھی اسے غلامی کی سند عطا فرما دیجئے۔ یہ بہت دُور سے آیا ہے۔''

خود حضرت جلال الدین تبریزیؒ کا بیان ہے۔''طویل خدمت گزاری کے بعد پیر و مرشد نے مجھے اپنے گلے سے لگایا تھا اور یوں محسوس ہوا تھا جیسے ایک برقی رو میرے اندر دوڑ رہی ہے اور پورا جسم جل رہا ہے۔ کچھ دیر تک میری یہی کیفیت رہی کہ مجھے اٹھا کر آگ کی بھٹی میں ڈال دیا گیا ہے۔ میں بار بار حضرت شیخ کی طرف دیکھتا تھا۔ پیر و مرشد کی آنکھیں بند تھیں اور آپؒ زیرلب کچھ پڑھ رہے تھے۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میرے سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ سرد ہوگئی ہے اور میں ایک ناقابل بیان فرحت محسوس کر رہا ہوں۔ عین اسی وقت حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ پیر و مرشد کے ہونٹوں پر ایک عجیب آسودہ سی مسکراہٹ تھی جو آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر حضرت شیخ دلنواز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''جلال الدین! تم بہت خوش نصیب ہو کہ تمہیں درِ آقاؐ سے غلامی کی سند عطا ہوگئی ہے۔ آج سے تم ایسے غلام ہو کہ قیامت تک تم پر دنیا کی بادشاہتیں قربان ہوتی رہیں گی۔''

اس واقعے کے بعد حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی دنیا ہی بدل گئی۔ آپؒ جس طرف دیکھتے، ہر چیز بے نقاب نظر آتی۔ ہر طرف معرفت کا نور ہی نور تھا۔ حج سے واپسی پر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے عقیدت مندوں نے بے شمار تحائف پیش کئے۔ جب نذریں پیش کرنے والے افراد رخصت ہوگئے تو حضرت شیخ نے تمام فقیروں کو اجازت دے دی کہ تحفوں کے انبار میں سے جس کا جو جی چاہے، اٹھا لے۔ تقریباً سارے فقیروں نے قیمتی تحفوں کی طرف ہاتھ بڑھائے لیکن حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے اس غریب عورت کا تحفہ اٹھا لیا جو کچھ دیر پہلے بڑی عقیدت کے ساتھ حضرت شیخ کی بارگاہ میں نذر پیش کرنے آئی تھی۔ یہ ایک درہم تھا جو تحفوں کے انبار میں سب سے حقیر تحفہ تھا۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے اسی تحفے کو اٹھا لیا۔ آپؒ کے پیر و مرد تمام فقیروں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ اور انتخاب کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ جب سارے درویش اپنے تحفے لے چکے تو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے آپؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

''جلال الدین! بظاہر تم نے ایک ایسی حقیر چیز اٹھائی ہے جس کی طرف کسی کی نظر بھی نہیں گئی۔ مگر کون جانتا ہے کہ وہی حقیر چیز ان تمام تحفوں کی روح تھی...... تم نے جسم سے روح کو نچوڑ لیا...... اب کیا بچا؟ خدا کی قسم! کچھ بھی نہیں بچا۔ دنیا نے اس عورت کے غربت و افلاس کو دیکھا..... مگر تمہارے علاوہ کسی کی آنکھوں میں اتنی بینائی نہیں تھی کہ کوئی اس کے دل پر بھی نگاہ ڈال لیتا۔ اس کا دل خلوص و محبت کا صاف و شفاف آئینہ تھا۔ اس لئے اس کی پیش کی ہوئی نذر بھی سب سے قیمتی تھی۔ وہ ایک درہم..... واللہ جو کچھ تھا، وہی تھا..... جلال الدین! تم نے کسی کے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔''

یہ سب کچھ حضرت شیخ کا فیضانِ نظر تھا یا پھر خود جلال الدین تبریزیؒ کا وہ ایثار جس کے باعث آپؒ دنیا کی تمام آسائشوں سے منہ موڑ کر فقر و قناعت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ نفس کشی، یہ صبر و تحمل، یہ شب بیداری عام چیزیں نہیں تھیں جنہیں کوئی بازار سے خرید سکے۔ یہ ایک بندے کا اپنے خالق سے ناقابلِ شکست عہد تھا۔ یہ جان و دل کا زیاں تھا...... جسے دنیا کا ہر شخص برداشت نہیں کر سکتا۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے خدا کے ہاتھ اپنی راحت فروخت کر دی تھی اور ہر سکون بیچ دیا تھا۔ اس کے بدلے میں انہوں نے جو شے خریدی، وہ مالکِ کائنات

کی مرضی تھی......خدا کی مرضی جو کبھی کبھی سر کٹا کر بھی حاصل نہیں ہوتی۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ اکثر راتوں کو رویا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؒ کی ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ آخر قدرت نے آپؒ کو اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لیا اور پھر آپؒ کے جسم مبارک پر آسمان سے انوار کی بارشیں ہونے لگیں۔

حضرت جلال الدینؒ کی روحانی تربیت مکمل ہو چکی تھی۔ دنیا کے نقطۂ نظر سے جو کچھ کھویا تھا، اس سے کہیں زیادہ پا لیا تھا۔ آپ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبت میں تقریباً سات سال رہے۔ آخر ذمہ داریاں قبول کرنے کے لئے دہلی کی ولایت تجویز فرمائی تھی۔ ابھی آپؒ رخصت ہونے ہی والے تھے کہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے دوسرے خلیفہ حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ بغداد تشریف لے آئے۔ جلال الدین تبریزیؒ سے آپؒ کا تعارف ہوا اور پھر ان دونوں بزرگوں کے تعلقات عام رشتوں سے گزر کر دوستی کی حدود تک پہنچ گئے۔ حضرت شیخ نے بہاؤ الدین زکریاؒ کو ملتان جانے کا حکم دیا۔ آپؒ کے ہمراہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ بھی ملتان چلے گئے۔ کچھ دن تک آپؒ نے مغربی پنجاب کے اس تاریخی شہر میں قیام فرمایا اور پھر اولیاء کی سرزمین دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔

دہلی پہنچنے کے تھوڑے دن بعد ہی پورے شہر میں آپؒ کے روحانی کمالات کا چرچا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ جیسے بزرگ بھی آپؒ کے استقبال کے لئے اپنی خانقاہ سے نکل کر دہلی کی گلیوں تک تشریف لائے۔ حضرت قطبؒ کی اس محبت نے دہلی کے باشندوں کے دلوں پر گہرا نقش چھوڑا اور پھر یہاں کے لوگوں کو حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی عظمتوں کا اندازہ ہوا۔ سلطان شمس الدین التمش کو بھی اسی دن احساس ہوا کہ یہ بے مایہ فقیر، روحانی دنیا میں کس اقلیم کا مالک ہے۔

دہلی تشریف لانے کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے ساتھ آپؒ کی مخصوص صحبتیں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی اس محفلِ خاص میں حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ اہلِ معرفت کی یہ مجلس نور کا ایک ایسا شہر تھی کہ اگر کبھی دوسرا کوئی شخص یہاں آجاتا تو اس کے نفس کی ساری کثافتیں دُور ہو جاتیں۔ غرض ان بزرگوں کا فیض جاری ہوا اور پھر یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان فقیروں نے پورے ہندوستان کو مسخر کر لیا ہے۔ مخلوقِ خدا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا کہ تاریک دلوں میں معرفت کے چراغوں سے روشنی ہوتی تھی۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئی تھیں اور دل حسد و بغض کے غبار سے بھر گئے تھے۔ ان لوگوں میں شیخ الاسلام صغریٰ سرفہرست تھے۔ شیخ الاسلام پہلے حضرت قطبؒ کی بے پناہ شہرت سے حسد رکھتے تھے......اور جب حضرت جلال الدین تبریزیؒ دہلی میں حضرت قطبؒ کے قریب آئے تو وہ بھی نجم الدین صغریٰ کے حسد کا شکار ہو گئے۔ نجم الدین صغریٰ بلاشبہ ایک بہت بڑے عالم تھے۔ ان کے دماغ میں کتابوں کے علم کا سمندر موجزن تھا۔ مگر بدقسمتی سے ان کا دل علم کی روشنی سے خالی تھا۔ آخر اسی تنگ دلی نے شیخ الاسلام کو اس راستے پر موڑ دیا جو حریص و خودغرض قسم کے عالموں کی گزرگاہ رہا ہے۔ نجم الدین صغریٰ کو دہلی کے باشندوں سے شکایت تھی کہ وہ ان کا ادب و احترام نہیں کرتے۔ وہ اپنے شیخ الاسلام ہونے پر ناز کرنے کے ساتھ عوام الناس سے یہ مطالبہ بھی کرتے تھے کہ ان کا عہدہ مذہبی اعتبار سے تمام عہدوں سے زیادہ ہے اس لئے بندگانِ خدا کی نظر میں انہیں زیادہ محترم ہونا چاہئے۔ مگر جب وہ آنکھیں کھول کر اپنے اطراف کا جائزہ لیتے تھے تو چند دنیا دار اور مطلب پرست لوگوں کے سوا انہیں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

اس کے برعکس جب شیخ الاسلام کی نظریں بھٹکتی ہوئی حضرت قطبؒ اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی

خانقاہوں تک پہنچتی تھیں تو انہیں عقیدت مندوں کی ایک بھیڑ دکھائی دیتی تھی۔ شیخ الاسلام اس منظر کو زیادہ دن برداشت نہ کر سکے اور پھر ان کے مضطرب دماغ نے حضرت قطبؒ اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے خلاف سازش کا خاکہ تیار کرنا شروع کر دیا۔

اس سازش کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کا مختصر تعارف بھی ضروری ہے۔ نجم الدین صغریٰ، سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے مرید تھے۔ اور یہ وہی خواجہ عثمان ہرونیؒ ہیں جن کے مایہ ناز مرید سلطان الہند غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ چشتیہ کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ اس طرح خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اپنے پیر و مرشد کے حوالے سے انہیں ہمیشہ قابلِ احترام سمجھا۔ مگر شیخ الاسلام نے کبھی اس رشتے کو اہمیت نہیں دی۔ بعض روایتوں سے تو یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بہت زیادہ حسد رکھتے تھے اور اس حسد کی ایک ہی وجہ تھی کہ حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو خلافت عطا کی تھی۔ جبکہ نجم الدین صغریٰ خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔

پھر گردشِ ماہ و سال نے نئی کروٹ لی۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ پیر و مرشد کے حکم پر اپنے خلیفۂ اکبر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔ پھر حضرت قطبؒ کو دہلی میں قیام کرنے کا حکم دیا اور خود اجمیر تشریف لے گئے۔ کچھ دن بعد شیخ نجم الدین صغریٰ بھی دہلی پہنچ گئے اور اسی تاریخی شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس وقت ہندوستان پر سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی۔ یہ وہی شمس الدین التمش ہے جو کسی زمانے میں فاتح ہندوستان، سلطان قطب الدین ایبک کا غلام تھا۔ ایک دن شمس الدین التمش تیر کمان سنبھالے ہوئے شکار کے لئے جا رہا تھا۔ اس وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت قاضی حمید الدین التمش ان بزرگوں کے قریب سے صوفیاء کے ساتھ دریائے جمنا کے کنارے تشریف فرما تھے۔ جب شمس الدین التمش ان بزرگوں کے قریب سے گزرا تو چند لمحوں کے لئے ٹھہر گیا۔ پھر اس نے بڑے ادب کے ساتھ دریائے جمنا کے کنارے بیٹھے ہوئے صوفیائے کرام کو سلام کیا اور شکار کھیلنے کے لئے آگے بڑھ گیا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اس خوب صورت اور نوجوان غلام کو بہت غور سے دیکھا اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''قطب! خالقِ کائنات اس لڑکے کو اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھائے گا، جب تک یہ ہندوستان کا تاج نہیں پہن لے گا۔''

تمام صوفیائے کرام نے سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اس پیش گوئی کو سنا اور بڑی حیرت و حسرت کے ساتھ کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟ غلام تو غلام ہی رہتا ہے۔''

وقت اپنی مقررہ رفتار سے کچھ اور آگے بڑھا۔ فرمانروائے ہندوستان، سلطان قطب الدین ایبک بے اولاد تھا۔ آخر اس نے شمس الدین التمش کی وفاداری اور جاں نثاری سے متاثر ہو کر اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ پھر جب سلطان قطب الدین ایبک کا انتقال ہوا تو اس کی وصیت کے مطابق شمس الدین التمش کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیا گیا اور سلطان قطب الدین ایبک کے تمام معتمد سرداروں نے کسی حیل و حجت کے بغیر شمس الدین التمش کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ روایت ہے کہ جب بڑے بڑے امرائے سلطنت کی موجودگی میں شمس الدین التمش کو تاجِ شاہی پہنایا جا رہا تھا تو اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور کانوں میں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے یہ

الفاظ گونج رہے تھے۔

''خالقِ کائنات اس لڑکے کو اس وقت تک دنیا سے نہیں اُٹھائے گا، جب تک یہ ہندوستان کا تاج نہیں پہن لے گا۔''

فرمانروائے ہند بننے کے بعد سلطان شمس الدین التمش، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا اور بہت بڑے خزانے کا مالک ہوتے ہوئے بھی درویشانہ زندگی گزارنے لگا۔ انہی دنوں شیخ الاسلام حضرت جمال الدین بسطامیؒ کا انتقال ہو گیا۔ ہندوستان کی اسلامی حکومت میں ''شیخ الاسلام'' کا عہدہ سب سے محترم عہدہ تھا۔ حضرت جمال الدین بسطامیؒ کے انتقال کے بعد سلطان شمس الدین التمش، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اپنے پیر و مرشد سے درخواست کی کہ آپؒ شیخ الاسلام کے منصب کو قبول فرمالیں۔ مگر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

''درویش اس دنیا کے ہنگاموں سے یکسر دور رہنا چاہتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کی فقیر صلاحیت نہیں رکھتا۔ بہتر ہے کہ اس نازک ترین منصب پر کسی لائق شخص کا تقرر کیا جائے۔''

سلطان شمس الدین التمش اچھی طرح جانتا تھا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ جان بوجھ کر اپنا دامن بچا رہے ہیں۔ ورنہ شیخ الاسلام کے عہدے کے لئے آپ سے بہتر کوئی دوسرا شخص دارالحکومت میں موجود نہیں تھا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے انکار کے باوجود سلطان شمس الدین التمش مسلسل کئی دن تک درخواست کرتا رہا۔ مگر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ والئ ہندوستان کو ایک ہی جواب دیتے رہے۔

''یہ فقیر خود کو اس عہدہ و منصب کے لائق نہیں سمجھتا۔''

آخر مجبور ہو کر سلطان شمس الدین التمش نے اس سلسلے میں اپنے امرائے سلطنت سے مشورے شروع کر دیئے۔ پھر کچھ امیروں نے یہ کہہ کر شیخ نجم الدین کا نام پیش کیا۔ ''نجم الدین صغریٰ بھی تو تصوف کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر ظاہری علم و فضل کے اعتبار سے بھی یکتائے روزگار شخصیت کے حامل ہیں۔''

ادھر سلطان شمس الدین التمش اپنے امرائے سلطنت سے مشورے کر رہا تھا اور اُدھر شیخ نجم الدین صغریٰ دن رات دعائیں مانگ رہے تھے کہ انہیں شیخ الاسلام کا عہدہ و منصب حاصل ہو جائے۔ بالآخر شیخ نجم الدین صغریٰ کی دعائیں قبول ہوئیں اور وہ حضرت جمال الدین بسطامیؒ کی جگہ نئے شیخ الاسلام مقرر ہو گئے۔

شیخ نجم الدین صغریٰ کے شیخ الاسلام بن جانے کے بعد ایک بار سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، اجمیر سے دہلی تشریف لائے۔ فرمانروائے ہندوستان، سلطان شمس الدین التمش نے دہلی کی حدود سے نکل کر حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا والہانہ استقبال کیا۔ پھر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خانقاہ میں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی روحانی محفلیں آراستہ ہوئیں۔ ان محفلوں میں سلطان شمس الدین التمش اپنے امرائے سلطنت کے ہمراہ باقاعدگی سے حاضری دیتا تھا۔ خواص کے ساتھ عوام الناس کی بھی ایک بہت بڑی تعداد خانقاہ کے دروازے پر کھڑی رہتی تھی تاکہ خواجۂ خواجگاںؒ کی ایک جھلک دیکھ کر اپنی آنکھوں کو منور کر سکیں۔ طالبانِ دیدار میں دہلی کے اہلِ ہنود بھی شامل ہوتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بلاتفریق مذہب و ملت سب کے لئے دعائے خیر فرماتے۔

اس دوران حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ جیسے انسانی ہجوم میں پیر و مرشد کی نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔ پھر جب ایک رات تنہائی میسر آئی تو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار

کاکیؒ نے سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں دست بستہ عرض کیا۔
''خادم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پیر و مرشد کو کسی خاص شخص کا انتظار ہے۔''
''ہاں قطب! تمہارا اندازہ درست ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے کسی قدر افسردہ لہجے میں فرمایا۔
''جب اپنے کسی محبوب عزیز سے ملاقات نہ ہو تو انسان اُداس ہو ہی جاتا ہے۔ تم نے دیکھا کہ ساری دنیا آ گئی مگر شیخ نجم الدین صغریٰ اب تک ملاقات کے لئے نہیں آئے۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ جب بھی درویش دہلی آیا، شیخ بھی ملنے ضرور آئے۔ اب انہیں کیا ہو گیا ہے؟'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، پیر و مرشد کی بات سن کر بظاہر خاموش ہو گئے۔ لیکن آپؒ نے فوراً ہی ایک خادم کے ذریعے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو یہ پیغام پہنچا دیا کہ سلطان الہند ان سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔
جواب میں شیخ الاسلام نے کہا کہ وہ امورِ سلطنت اور اپنی ذمہ داریوں کے باعث عدیم الفرصت ہیں۔ اگر وقت ملا تو حاضر ہو جائیں گے۔
شیخ نجم الدین صغریٰ کا جواب سن کر حضرت قطبؒ کو سخت اذیت محسوس ہوئی۔ آپؒ شیخ الاسلام کے جواب کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے تھے۔ نجم الدین صغریٰؒ اپنی مصروفیت کا بہانہ کر کے سلطان الہندؒ کی بارگاہ میں آنے سے گریز کر رہے تھے۔ یہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور دوسرے بزرگوں کے لئے ایک تکلیف دہ سلوک تھا۔ حضرت قطبؒ تو پیر و مرشد کے ادب کے باعث خاموش رہے۔ لیکن دیگر حضرات نے شیخ نجم الدین صغریٰ کے اس طرزِ عمل پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔
''شیخ الاسلام ہونے کے بعد وہ بہت مغرور ہو گئے ہیں۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے۔''
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے شیخ نجم الدین صغریٰ کے روّیے پر تنقید کرنے والے حضرات کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''وہ میرے پیر و مرشد کی نشانی ہیں۔ ان کا میرے ساتھ کچھ بھی سلوک ہو، مگر میں انہیں فراموش نہیں کر سکتا۔'' حضرت سلطان الہندؒ نے شیخ الاسلام کا دفاع اس طرح کیا کہ اہلِ مجلس حیرت زدہ رہ گئے۔ ''اگر شیخ نجم الدین یہاں تشریف نہیں لائے تو میں خود ان کے پاس جاؤں گا۔''
یہ کہہ کر حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے حضرت قطبؒ کو اپنے ساتھ لیا اور شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔
شیخ الاسلام اس اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہونے کے بعد آسودہ حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ جس وقت حضرت معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ الاسلام کے یہاں پہنچے تو وہ اپنا نیا مکان تعمیر کر رہے تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر دونوں بزرگوں پر پڑی، وہ مزدوروں کے ساتھ مصروفِ گفتگو ہو گئے۔ حضرت قطبؒ کو اُمید تھی کہ شیخ الاسلام والہانہ انداز میں سلطان الہندؒ کے استقبال کے لئے آگے بڑھیں گے اور اپنے سارے کام ترک کر دیں گے، مگر ایسا نہ ہوا۔ حضرت خواجہؒ کو دیکھ کر وہ کچھ اور مصروف نظر آنے لگے تھے۔ سلطان الہندؒ نے نجم الدین صغریٰ کے طرزِ عمل کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نظر انداز کر دیا اور قریب پہنچ کر اپنے برادرِ روحانی کو سلام کیا۔
شیخ الاسلام نے رسمِ زمانہ نبھانے کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سلام کا جواب تو دے دیا مگر فوراً ہی مزدوروں کی طرف متوجہ ہو گئے اور انہیں مختلف کاموں کے بارے میں ہدایت دینے لگے۔
حضرت سلطان الہندؒ کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن نجم الدین صغریٰ مسلسل مزدوروں سے بات چیت

کرتے رہے تو حضرت خواجہؒ نے بلند آواز میں فرمایا۔ "نجم الدین! آخر تم پر کیا افتاد نازل ہوئی ہے کہ تم درویشی کی بنیادی رسم بھی بھول گئے ہو؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لہجے میں بڑی خلش تھی۔

"میں بالکل نہیں بدلا ہوں۔" شیخ نجم الدین صغریٰ نے اس طرح جواب دیا کہ ان کی آواز ہر جذبے سے عاری تھی۔ "میں درویشی کے آداب سے اچھی طرح واقف ہوں۔" یہ کہتے کہتے شیخ الاسلام کے چہرے پر ایک خاص رنگ اُبھر آیا تھا۔ جیسے انہیں اپنی علمیت پر بہت ناز ہو۔

"میرے بھائی! درویشی تو بڑی چیز ہے، ایک عام آدمی بھی اپنے گھر آنے والے مہمانوں کو اس طرح نظرانداز نہیں کرتا۔" اگرچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ انتہائی برداشت کا مظاہرہ کر رہے تھے لیکن پھر بھی آپؒ کے لہجے سے ہلکی سی تلخی نمایاں ہو چلی تھی۔ "کیا تمہیں سرکاری عہدے نے اتنا مغرور بنا دیا ہے کہ تمہاری نظروں میں اخلاقی قدروں کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہی؟ کیا شیخ الاسلام کے لقب کو بقائے دوام حاصل ہے؟ کیا خاندانِ چشتیہ کی روایتوں کے امین اس قدر دنیا پرست ہوتے ہیں؟ کیا پیر و مرشد کی یہی نصیحت تھی کہ درویش اپنی عزت و جاہ کی مسند آراستہ کر کے مخلوقِ خدا کو فراموش کر دے؟" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی گرم گفتاری کا یہ عالم تھا کہ شیخ نجم الدین صغریٰ کے غرور کا پیرہن جل کر خاک ہو گیا۔

اب شیخ الاسلام کے چہرے پر ندامت کے آثار نمایاں تھے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ "میں کل بھی آپ سے مخلص تھا اور آج بھی میرے دل میں وہی جذبات موجود ہیں۔ مگر اس شخص نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔" شیخ نجم الدین صغریٰ نے حضرت قطبؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے اس مرید خاص کی وجہ سے میری طرف کوئی متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ ساری دنیا اس کی خانقاہ کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے، جیسے اس شہر میں میرا کوئی مقام ہی نہیں۔" آخر شیخ الاسلام کے دل کی بات ان کی زبان پر آ گئی تھی۔

چند لمحوں کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ یہ سوچ کر حیران رہ گئے کہ اتنا بڑا بزرگ بھی حضرت قطبؒ سے حسد رکھتا ہے مگر کچھ دیر بعد ہی آپؒ کے ہونٹوں پر تبسم اُبھر آیا۔

"نجم الدین! اب تمہاری بے اعتنائی اور ناراضگی کی وجہ سمجھ میں آئی۔" حضرت سلطان الہندؒ نے شانِ بے نیازی سے فرمایا۔ "یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں کہی؟ اگر تم آگاہ کر دیتے تو تمہیں اتنے دن یہ اذیت برداشت نہ کرنی پڑتی۔ بہرحال مطمئن ہو۔ جس شہر کے اہلِ علم اتنے تنگ نظر ہوں، وہاں قطب کو قیام نہیں کرنا چاہئے۔" یہ کہہ کر حضرت معین الدین چشتیؒ واپس جانے لگے۔ شیخ نجم الدینؒ نے کچھ دیر بیٹھنے اور کھانا کھانے کی درخواست کی مگر سلطان الہندؒ نے صاف انکار کر دیا۔

چند روز بعد اہلِ شہر ایک انتہائی کرب ناک صورتِ حال سے دوچار ہو گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر واپس جا رہے تھے لیکن اس بار خلافِ توقع حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی آپؒ کے ہمراہ تھے۔ جیسے جیسے یہ خبر عام ہوتی گئی، لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر دیوانہ وار شاہراہ پر نکل آئے۔ شمس الدین التمش کو اطلاع ملی تو وہ بھی گھبرا کر چلا آیا۔ اس نے سلطان الہندؒ سے عاجزانہ درخواست کی کہ حضرت قطبؒ کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں۔ مگر حضرت خواجہ غریب نوازؒ یہی فرماتے رہے کہ جہاں علم و تقویٰ، بغض اور حسد کا شکار ہو جائے، وہاں قطب نہیں ٹھہر سکتا۔ فرمانروائے ہندوستان احتراماً خاموش ہو گیا مگر حضرت خواجہ کے ہمراہ پیادہ پا چلتا رہا۔

جب حضرت سلطان الہندؒ، حضرت قطبؒ کو لے کر شہر کی حدود سے باہر نکلے تو انسانی ہجوم نے گریہ و زاری شروع کر دی۔ سید العارفین کے مصنف حامد بن فضل اللہ جمالی نے اس جانگداز منظر کی تفصیلات بیان کرتے

ہوئے لکھا ہے کہ حضرت قطبؒ کے قدم جہاں پڑتے تھے، لوگ وہاں کی خاک اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگا لیتے تھے یا چہرے پر مل لیتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کچھ دیر تک لوگوں کی اس جذباتی کیفیت کا مشاہدہ کرتے رہے۔ پھر انسانی جوشِ عقیدت پر آپؒ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ یکایک سلطان الہندؒ ٹھہر گئے اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے فرمانے لگے۔

''فرزند! تم دہلی میں قیام کرو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری جدائی میں کہیں اہلِ شہر برباد نہ ہو جائیں۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ واپس اجمیر تشریف لے گئے۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ اپنے منصوبے میں بری طرح ناکام ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے دہلی سے جاتے ہی وہ عوامی مقبولیت حاصل کر لیں گے اور ان کی روحانیت کی دکان چمک اُٹھے گی۔ مگر روحانیت تھی کہاں جو ظاہر ہوتی۔ بس دنیا داری تھی، جسے ''حق'' کے سامنے بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شیخ الاسلام کا اندازہ تھا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی کے عوام میں صرف مقبول ہیں مگر جب حضرت قطبؒ کی رخصت کے وقت دہلی کے تمام باشندے روتے ہوئے اپنے گھروں سے نکل آئے تو نجم الدین صغریٰ کے ہوش اُڑ گئے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ لوگوں میں مقبول نہیں، ان کے محبوب تھے۔ شیخ الاسلام کی آتشِ حسد اور شدت سے بھڑکنے لگی۔ وہ اپنی درس گاہ میں بیٹھ کر چند دنیا دار مریدوں اور خدمت گاروں سے کہا کرتے تھے۔

''میں نے بہت کوشش کی کہ ان اندھے عقیدت مندوں کی آنکھیں کھول دوں اور انہیں ''صراطِ مستقیم'' پر گامزن کر دوں مگر یہ جاہل قوم میری زبان نہیں سمجھتی۔''

اگرچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، نجم الدین صغریٰ کی دلی کیفیات سے باخبر تھے کہ اس دنیا پرست درویش کی اصلاحِ حال ممکن نہیں۔ لیکن پھر بھی آپؒ نے اتمامِ حجت کے لئے اپنے ''پیر بھائی'' کو سمجھایا۔ حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے ارشادات اور نصیحتیں یاد دلائیں اور آخر میں کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا کہ آپ کے خلیفۂ اکبر، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ معرفت کے کس مقام پر فائز ہیں۔ مگر نجم الدین صغریٰ نے اس تاریخی واقعہ سے کوئی سبق، عبرت یا نصیحت حاصل نہیں کی۔ وہ نفس پرستی کے پھندوں میں اُلجھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ حرص اور جاہ پسندی کے جال میں جکڑ کر رہ گئے۔

پھر جب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ اپنے شیخ کے حکم پر دہلی تشریف لائے اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنی خانقاہ سے باہر نکل کر آپؒ کا استقبال کیا تو دہلی کے باشندوں کو اندازہ ہوا کہ آنے والی شخصیت کس قدر محترم ہے۔ شروع میں حضرت جلال الدین تبریزیؒ کا قیام حضرت قطبؒ کی خانقاہ میں تھا۔ جب فرمانروائے ہندوستان، سلطان شمس الدین کو آپؒ کی آمد کی خبر ملی تو وہ بہ نفس نفیس حضرت شیخ کے دیدار کے لئے حضرت قطبؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوا اور نہایت عقیدت کے ساتھ حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے نیاز حاصل کئے۔

کچھ دن بعد سلطان شمس الدین التمش نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے عرض کیا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ آپ میرے مہمان ہیں۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ مجھے میزبانی کا شرف بخشیں۔''

''درویش کی میزبانی ہی کیا؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔ ''حضرت شیخ کا حکم تھا کہ دہلی چلا جاؤں۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے، کسی بھی گوشے میں سما جاؤں گا۔ ہاں! اتنا ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین کے اس خطے کی نگہبانی کے لئے آپ کو مقرر فرمایا ہے تو یہ فقیر بھی اصول کے مطابق آپ سے اس

زمین پر ٹھہرنے کی اجازت چاہتا ہے۔"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی گفتگو نے والئ ہندوستان کو اس قدر متاثر کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ آپ دہلی کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے کو اپنی امامت گاہ بنائیں اور ہندوستان کا دارالحکومت آپ کے فیوض و برکاتِ روحانی سے محروم ہو جائے۔"

"اللہ ہی جانتا ہے کہ کون، کہاں جائے گا۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے مختصر جواب دے کر بات ختم کر دی۔

اس کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے شیخ الاسلام، نجم الدین صغریٰ کو خلوت میں طلب کر کے کہا۔

"میں ذاتی طور پر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے اخلاقِ عالیہ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ ہر چند کہ حضرت شیخ، میرے پیر و مرشد کی خانقاہ میں قیام فرما ہیں مگر اس سلسلے میں حکومت کی بھی کچھ ذمے داری ہے۔"

"کیسی ذمے داری؟" شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے کسی قدر چونک کر کہا کیونکہ وہ خود بھی سلطنت کے ایک اہم رکن تھے۔

"ہمیں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی مہربانی کا حق ادا کرنا چاہئے۔" سلطان شمس الدین التمش نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میرے لئے کیا حکم ہے؟" شیخ الاسلام نے خوشامدانہ لہجے میں کہا مگر ان کے دل میں ایک بار پھر حسد کی آگ پوری شدت سے بھڑک اُٹھی تھی۔ کہنے کو نجم الدین صغریٰ، فرمانروائے ہندوستان کے مصاحبِ خاص بنے ہوئے تھے اور بظاہر سلطان شمس الدین کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے مگر درپردہ وہ ہر اس شخص سے خفا رہتے تھے، جو صوفیائے کرام کا احترام کرتا تھا۔ سلطان شمس الدین التمش پہلے ہی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا مرید و معتقد تھا اور اب ایک دوسرا صوفی، والئ ہند کے دل و دماغ پر مسلط ہو گیا تھا۔ نجم الدین صغریٰ کے لئے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی مگر وہ اپنے عہدہ و منصب کو بچانے کے لئے انتہائی فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"تمہارے خیال میں شیخ جلال الدین تبریزیؒ جیسے بزرگ کو کہاں ٹھہرانا چاہئے؟" سلطان شمس الدین التمش کے ایک ایک لفظ سے انتہائی عقیدت جھلک رہی تھی۔

شیخ الاسلام کے عیار ذہن نے فوراً ہی ایک ترکیب ڈھونڈ لی۔

"ایک درویش کو کسی خاص مقام سے کیا نسبت؟ اسے کہیں بھی ٹھہرایا جا سکتا ہے۔" شیخ الاسلام نے بہانہ سازی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"خود حضرت شیخ نے بھی مجھ سے یہی بات کہی تھی۔ مگر میری غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ میں اپنے مہمان کے شایانِ شان انتظام نہ کروں۔" سلطان شمس الدین التمش کے چہرے سے جھلکنے والا عقیدت کا رنگ کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ شیخ جلال الدین خود بھی تبریز کے حاکم رہ چکے ہیں، اس لئے ایک حاکم کو دوسرے حاکم کی تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑنی چاہئے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ شیخ خود ہی انکار کر دیں۔ میری خواہش ہے کہ حضرت شیخ کسی ایسی جگہ قیام فرما ہوں جو محل سے بہت زیادہ قریب ہو۔ تاکہ جس وقت بھی کاروبارِ سلطنت سے فراغت حاصل ہو، حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری دے سکوں۔"

نجم الدین صغریٰ کا شاطر دیاغ پہلے ہی اس سلسلے میں ایک چال سوچ چکا تھا، مگر انہیں سیاست و مصلحت کے پیش نظر مناسب موقع کی تلاش تھی اور وہ موقع، فرمانروائے ہندوستان نے خود ہی فراہم کر دیا تھا۔ "اگر حضورِ والا، شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی قربت کے خواہاں ہیں تو ان کے قیام کے لئے "بیت الحرام" سے مناسب جگہ کوئی اور نہیں۔"

بیت الحرام کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے محل سے تھوڑے فاصلے پر ایک نہایت عالی شان مکان تھا جو ہر وقت مقفل رہتا تھا۔ مکان کے بند رہنے کی وجہ یہ تھی کہ اس پر "جنوں" کی ایک جماعت نے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب دہلی پر راجپوت سمراٹ پرتھوی راج چوہان کی حکومت تھی۔ پھر جب "جنگِ ترائن" میں پرتھوی راج چوہان کو شہاب الدین غوری کے ہاتھوں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا اور ہندوستان پر اسلامی سلطنت قائم ہو گئی تو سلطان قطب الدین ایبک کے ایک امیر نے اس مکان میں رہنا چاہا۔ پھر پہلی ہی رات اس امیر نے خواب میں دیکھا کہ ایک قد آور جن اسے مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

"تجھے معلوم نہیں کہ یہ مکان گزشتہ پچاس سال سے ہماری ملکیت ہے۔ ہمارے سوا یہاں کوئی دوسرا قیام نہیں کر سکتا۔ تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ صبح ہوتے ہی اپنا ساز و سامان لے کر کہیں اور چلا جا۔ یہ پہلی اور آخری تنبیہہ ہے۔ اگر تُو نے ہمارے حکم پر عمل نہیں کیا تو نتائج کی ساری ذمے داری خود تجھ پر عائد ہوگی۔"

صبح جب سلطان قطب الدین ایبک کا امیر نیند سے بیدار ہوا تو اس نے رات کے خواب کو محض ایک خواب ہی سمجھا اور وقتِ مقررہ پر دربارِ سلطانی میں حاضر ہو گیا۔ ابھی وہ سلطان قطب الدین ایبک کے دربار ہی میں موجود تھا کہ اسے ناگہاں یہ خبر ملی کہ پورا مکان شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔

پھر جب وہ امیر شدید بدحواسی کے عالم میں اپنے گھر پہنچا تو اس کے بیوی بچے باہر کھڑے رو رہے تھے اور مکان کے اندر سجا ہوا قیمتی ساز و سامان خشک پتوں اور سوکھی لکڑیوں کی طرح جل رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد سلطان قطب الدین ایبک کے دوسرے امراء نے بھی اس عالی شان مکان میں قیام کرنے کی کوشش کی تو ان لوگوں کو بھی "جنات" کی طرف سے خواب میں اسی قسم کی تنبیہہ کی گئی۔ مگر جب ان امیروں نے اپنے خواب کو ایک وہم سمجھا تو انہیں بھی شدید نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر جب سلطان قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد سلطان شمس الدین التمش ہندوستان کے تخت پر بیٹھا تو اس نے مکان کو بند کرا دیا۔ ان واقعات کے تسلسل نے خوف و دہشت کی ایسی فضا قائم کر دی تھی کہ لوگ اس طرف سے گزرنے کی ہمت بھی نہیں کرتے تھے۔ بعض مؤرخین کے مطابق اس مکان کو "بیت الحرام" کہا جاتا تھا۔ ہمارے نزدیک اس مخصوص مکان کے لئے "بیت الحرام" کا لفظ استعمال کرنا بہت بڑی غلطی بلکہ گناہ ہے۔ کیونکہ "بیت الحرام" صرف خانہ کعبہ کو کہا جاتا ہے۔ کچھ روایتوں میں اس مکان کو "بیت الجن" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو مناسب اور درست ہے۔ سلطان شمس الدین نے شیخ الاسلام کی اس تجویز کو بڑی حیرت سے سنا اور شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ تو اس راز سے باخبر ہیں کہ یہ ایک آسیب زدہ مکان ہے جس کے اندر قیام کرنے والے بہت سے لوگ جانی اور مالی نقصان اٹھا چکے ہیں۔ اس صورت میں ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم خدا کے اس نیک بندے کو ایک ایسے مکان میں ٹھہرائیں جو وحشت و خوف سے بھرا ہوا ہے۔"

شیخ الاسلام نے فرمانروائے ہندوستان کے اس طنز کو سمجھ لیا مگر فوراً ہی ان کے عیار ذہن نے نئی منطق تراش لی۔ "میں ذاتی طور پر اس حقیقت سے واقف ہوں کہ سلطانِ ذی شان خود ہی درویش ہیں اور درویش نوازی،

حضورِ والا کا خاص مسلک ہے۔'' شیخ نجم الدین صغریٰ کا لہجہ انتہائی ریاکارانہ بھی تھا اور خوشامدانہ بھی۔ ''بے شک یہ اعلیٰ ظرفی اور دریا دلی، سلاطین کی پوری تاریخ میں کسی کسی شہنشاہ کو میسر آئی ہے، مگر دنیا دار لوگ حضور کی ان صفاتِ عالیہ سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھا لیتے ہیں۔''

ابھی شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی بات مکمل ہونے بھی نہیں پائی تھی کہ سلطان شمس الدین التمش درمیان میں بول اٹھا۔ ''کیا آپ کا اشارہ شیخ جلال الدین تبریزی کی طرف ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ فوراً ہی بات بدلتے ہوئے انتہائی پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''جس ہستی کو سلطانِ عالی مقام پسند کرتے ہیں، وہی ذاتِ گرامی اس غلام کی بھی محبوب ہے۔'' اگرچہ شیخ نجم الدین صغریٰ کے دل میں حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے لئے نفرت و حسد کی آگ بھڑک رہی تھی لیکن وہ سلطان شمس الدین التمش کے سامنے انتہائی چرب زبانی اور بہانہ سازی سے کام لے رہے تھے۔

''تو پھر آپ نے ایک متبرک ہستی کے لئے وحشت زدہ مکان کا انتخاب کیوں کیا؟'' والئ ہندوستان، سلطان شمس الدین التمش کے لہجے سے کسی قدر ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

''میں نے ''بیت الجن'' کا انتخاب کرتے وقت بھی آپ کی شاہانہ عظمت و جلال کو پیش نظر رکھا ہے۔'' شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے خوشامد اور فریب کاری کی انتہا کر دی تھی۔

''وہ کس طرح؟'' فرمانروائے ہندوستان نے چونک کر پوچھا۔

''دہلی کے سابق حکمراں، سمراٹ پرتھوی چوہان کے دورِ حکومت سے لے کر سلطان قطب الدین ایبک مرحوم کے اقتدارِ عالیہ تک کسی نے اس آسیب زدہ مکان میں قیام کرنے کی ہمت نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ اپنے روحانی کمالات کے ذریعے اس مکان میں رہنے والے جنات کو مسخر کر لیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو ہندوستان کی رعایا کے دلوں میں حضورِ والا کا مزید رعب و دبدبہ قائم ہو جائے گا کہ آپ ہی کی وجہ سے جلال الدین تبریزیؒ اس مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ اور بفرضِ محال، جلال الدین تبریزیؒ جنات کی جماعت کو زیر کرنے میں ناکام رہے تو ان کی روحانیت کا بھرم کھل جائے گا۔''

ابھی سلطان شمس الدین التمش، شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی باتوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ خادم خاص نے آ کر اطلاع دی۔ ''شیخ جلال الدین تبریزیؒ شرفِ باریابی چاہتے ہیں۔''

یہ خبر سن کر والئ ہندوستان نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا اور بے تابانہ اُٹھ کر کمرے کے دروازے پر پہنچا جہاں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اپنے ایک خدمت گار کے ساتھ موجود تھے۔ اگرچہ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی آمد بہت ناگوار گزری تھی لیکن وہ سلطان شمس الدین التمش کی وجہ سے اپنی ناپسندیدہ شخصیت کا استقبال کرنے پر مجبور تھے۔

''شیخ! آپ نے کیوں زحمت کی؟'' مصافحہ کرنے کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے عرض کیا۔ ''اپنے کسی خادم کو بھیج دیا ہوتا۔ میری خواہش تھی کہ آپ شاہی سواری میں بیٹھ کر تشریف لاتے اور پھر قصرِ سلطانی میں رونق افروز ہوتے۔''

''آپ کا ایک ایک لمحہ اس نکمے درویش کے وقت سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔'' حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں فرمایا۔ ''اور آپ کی ذمہ داریاں اتنی زیادہ ہیں کہ یہ فقیر اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''یہ حضرت شیخ کا حُسنِ محبت ہے۔'' سلطان شمس الدین التمش کے ایک ایک لفظ سے گہری عقیدت کا اظہار ہو

رہا تھا۔

''میرا حُسنِ محبت ہو یا نہ ہو...... مگر یہ حقیقت ہے کہ آپ کے کاندھوں پر کروڑوں عوام کے حقوق و فرائض کا بوجھ ہے اور اس فقیر کے کاندھے بہت ہلکے ہیں۔ صرف ذاتی بوجھ ہے...... اور اس ناکارہ سے وہ بھی نہیں اُٹھتا۔ پھر بھی فقیر کی دعا ہے، حق تعالیٰ، بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی میں آپ کو صبر و استقامت بخشے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی بے پناہ مصروفیت میں خلل انداز ہونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایک مجبوری مجھے قصرِ سلطانی کے دروازے تک لے آئی۔''

اس سے پہلے کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اپنی مجبوری بیان کرتے، سلطان شمس الدین التمش انہیں نہایت ادب و احترام کے ساتھ اپنے مخصوص کمرے میں لے آیا اور خادمِ خاص کو حکم دیا کہ وہ حضرت شیخ کی تواضع کا انتظام کرے۔

اس دوران شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ زیادہ تر خاموش ہی رہے۔ بس سلطان شمس الدین التمش کو دکھانے کے لئے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی رسمی مزاج پرسی کی تھی۔ اس کے برعکس نجم الدین صغریٰ کے ساتھ جلال الدین تبریزیؒ کا روّیہ نہایت مشفقانہ اور دوستانہ تھا۔

شاہی تواضع کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے حضرت جلال الدین تبریزیؒ سے اس مجبوری کے بارے میں دریافت کیا جس کے سبب حضرت شیخ خود چل کر قصرِ سلطانی کے دروازے تک پہنچے تھے۔

''میں نے سلطان سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ فقیر کو دہلی میں قیام کرنے کے لئے بس زمین کا ایک ٹکڑا درکار ہے۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ ''مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ سلطانِ معظم ایک درویشِ بے سروساماں کی تواضع کے لئے بہت زیادہ پریشان نظر آرہے ہیں۔''

حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی بات سن کر شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو شدید حیرت ہوئی کہ جو گفتگو قصرِ سلطانی کے ایک مخصوص کمرے میں صرف دو انسانوں کے درمیان ہو رہی تھی، اس کی خبر جلال الدین تبریزیؒ کو کس طرح پہنچ گئی۔ اس کے برعکس والیٔ ہندوستان سلطان شمس الدین التمش کو ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی کہ وہ درویشوں کی روشن ضمیری اور قوتِ کشف سے اچھی طرح باخبر تھا۔

''پریشان اس لئے ہوں کہ آپ کی میزبانی مجھ پر فرض ہے۔'' سلطان شمس الدین التمش نے انتہائی عقیدت مندانہ لہجے میں کہا۔ ''دہلی کی حدود بہت وسیع ہے...... مگر میری خواہش ہے کہ مجھے حضرت شیخ کی قربت حاصل رہے۔''

''میں والیٔ ہندوستان کے انکسار اور تواضع سے بے حد متاثر ہوں۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت پُر زور لہجے میں فرمایا۔ ''اگر سلطان اس فقیر کو کسی قابل سمجھتے ہیں تو انہیں یہ بھی جان لینا چاہئے کہ فقیر دنیا کے کسی بھی گوشے میں رہے، وہ فرمانروائے ہندوستان کے قریب ہی رہے گا۔ درویشی میں فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی محبت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر عقیدت سے سلطان التمش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں شیخ کی اس عنایت کے لئے بے حد شکر گزار ہوں۔ مگر ایک عام انسان ہوں۔ اس لئے جسمانی اور مکانی قربت کا خواہاں ہوں۔ امورِ سلطنت کی انجام دہی سے فرصت نہیں ملتی۔ خواہش ہے کہ جب بھی ذرا سی فراغت میسر آئے، شیخ کا دیدار کر لوں۔ اس لئے طویل فاصلوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

سلطان التمش کا اضطراب دیکھ کر حضرت جلال الدین تبریزی نے نجم الدین صغریٰ کی طرف دیکھا اور شگفتہ لہجے میں فرمایا۔ "تو پھر شیخ الاسلام کی تجویز پر عمل کیجئے۔ اس طرح سلطان کو اس فقیر سے قربت مکانی حاصل ہو جائے گی۔"

ایک لمحے کے لئے نجم الدین صغریٰ کو سکتہ سا ہو گیا۔

"وہ مکان آپ کے قیام کے لئے مناسب نہیں ہے۔" سلطان شمس الدین نے کسی قدر پریشان لہجے میں کہا۔

"دراصل "بیت الجن" ہی اس درویش کے لئے سب سے زیادہ مناسب مقام ہے۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے انتہائی پُرسکون انداز میں فرمایا۔ آپؒ کے لہجے اور چہرے سے نجم الدین صغریٰ کے لئے کسی طنز کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش شدید ذہنی کشمکش کا شکار تھا۔ بار بار یہی کہتا رہا کہ وہ مکان آپ کے ٹھہرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ "بیت الجن" میں قیام کرنے کے لئے اصرار کر رہے تھے۔

آخر شیخ الاسلام نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے عرض کیا۔ "حضورِ والا! شیخ ہمارے مہمان ہیں..... اور مہمان کی مرضی ہر حال میں مقدم ہوتی ہے۔" نجم الدین صغریٰ تو دل سے چاہتے تھے کہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ "بیت الجن" میں قیام کریں..... پھر ناکام ہو کر وہ مکان چھوڑ دیں۔ اور پھر سلطان شمس الدین التمش کے ساتھ دہلی کے باشندے بھی یہ تماشا دیکھیں کہ تبریز سے آنے والا فقیر محض ناکام درویش ہے۔"

نجم الدین صغریٰ کی بات سن کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ مسکرائے اور پہلی بار طنزیہ لہجے میں فرمایا۔

"خدا، شیخ الاسلام کا بھلا کرے کہ وہ درویشوں کے قیام کو خوب پہچانتے ہیں۔ جب تک وہ اس منصبِ عظیم پر فائز ہیں، دہلی کے درویشوں کو کوئی غم نہیں ہوگا۔"

نجم الدین صغریٰ، درویشوں کی دشمنی میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی گنوا چکے تھے۔ اگر وہ ذرا بھی ہوش میں ہوتے تو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے طنز کو سمجھ کر اپنی اس حرکت سے باز آ جاتے۔ جس درویش کو حق تعالیٰ نے اس قدر قوتِ کشف عطا فرمائی تھی کہ وہ گھر بیٹھے قصر سلطانی کے اس مخصوص کمرے میں ہونے والی گفتگو کو سن سکتا تھا، اسے نجم الدین صغریٰ کے اس سازشی منصوبے کا بھی علم تھا۔ اگر شیخ الاسلام چاہتے تو اس واقعے سے سبق حاصل کر کے اپنی اصلاح کر سکتے تھے۔ لیکن آتشِ حسد نے ان کے فہم و ادراک کو جلا ڈالا تھا اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی ناکامی کا منظر دیکھنے کے لئے بے چین نظر آ رہے تھے۔

آخر مختصر سے سکوت کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ دوبارہ نجم الدین صغریٰ سے مخاطب ہوئے۔

"بیت الجن" کی کنجی عنایت کیجئے تاکہ یہ درویش برسوں سے بند پڑے ہوئے مکان کی صفائی کا انتظام کر سکے۔"

سلطان شمس الدین التمش خاموش تماشائی تھا۔ نجم الدین صغریٰ نے فوری طور پر ایک خدمت گار کے ذریعے "بیت الجن" کی کنجی منگوائی اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے حوالے کر دی۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سلطان شمس الدین التمش سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے۔ اس وقت آپؒ کے ساتھ ایک خدمت گار "تراب" بھی تھا۔ بعض مؤرخین نے اس کا نام "ترابی" تحریر کیا ہے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے "بیت الجن" کی کنجی تراب کو دیتے ہوئے فرمایا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سب سے پہلے مکان میں پڑا ہوا تالا کھولنا..... پھر دروازے میں کھڑے ہو کر باآواز بلند کہنا۔ "اے جنو! یہاں سے بلا تاخیر نکل جاؤ..... اب اس مکان میں جلال الدین تبریزی قیام کرے

گا..... پھر میری ''حمائل شریف'' جو تمہارے پاس موجود ہے، اسے ایک دیوار پر آویزاں کر دینا۔''
شیخ کا حکم سنتے ہی خدمت گار، تراب کھڑا ہو گیا۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے اسے دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
''یہ فقیر جانتا ہے کہ تمہاری بات سن کر جنات کا گروہ بہت شور مچائے گا، گریہ و زاری کرے گا..... مگر تم ان کے فریب میں نہ آنا۔ صاف صاف کہہ دینا کہ وہ دہلی کی حدود سے نکل جائیں اور کسی دوسرے مقام پر قیام کریں۔ مگر اس قیام کی بھی ایک ہی شرط ہو گی کہ آئندہ کوئی جن، اللہ کے کسی بندے کو ستانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو پھر مجھے دوسرا انتظام کرنا پڑے گا۔''
سلطان شمس الدین التمش اور شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ شدید حیرت کے عالم میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی گفتگو سن رہے تھے۔ پھر جب خادم تراب جانے لگا تو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اسے آخری ہدایت دیتے ہوئے فرمایا۔
''اس کے بعد اپنے ساتھیوں کی مدد سے مکان کو تین بار غسل دے دینا۔ تاکہ یہ فقیر اپنے درویشوں کے ساتھ اس مکان میں قیام کر سکے۔''
خادم تراب نے پیر و مرشد کی ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ ''بیت الجن'' کا دروازہ کھلتے ہی جنات نے رونا شروع کر دیا...... ''ہم پر رحم کرو...... ہمارا خاندان یہاں نصف صدی سے آباد ہے...... اس لئے ہمیں اس مکان سے بہت محبت اور لگاؤ ہے...... یہاں سے نکلنے کے بعد ہم دربدر ہو جائیں گے۔ اپنے شیخ سے کہو کہ ہم پر رحم فرمائیں۔''
جنوں کا شورِ فغاں سن کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے خدمت گار، تراب نے کہا۔ ''مجھے اس معاملے میں ذرّہ برابر اختیار نہیں۔ حکمِ شیخ ہر حال میں حکمِ شیخ ہے۔ میں اس پر عمل کر کے ہی رہوں گا۔ چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے، حضرت شیخ سے کہو۔ پھر شیخ مجھے جو حکم دیں گے، اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔''
روایت ہے کہ ''بیت الجن'' سے نکالی جانے والی وہ جماعت حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے آبائی مکان میں رہنے کی اجازت مانگنے لگی۔ دراصل وہ کافر جنوں کی ایک جماعت تھی جو اپنی سرشت اور فطرت کے مطابق بندگانِ خدا کو ستایا کرتی تھی۔
جنوں کی فریاد سن کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا۔ ''دہلی پر اس وقت تک تمہارا حق تھا، جب تک یہاں اہلِ ہنود کی حکومت تھی۔ اب یہ شہر مسلمانوں کا دارالحکومت ہے۔ ہم اہلِ ایمان کا یہ طریقہ نہیں کہ شکست خوردہ قوم پر جبراً دین اسلام مسلط کریں جس طرح دوسرے اہلِ ہنود اسلامی سلطنت میں امن و سکون کے ساتھ رہتے ہیں، اسی طرح تم بھی سر جھکا کر، عام انسانوں کو اذیت پہنچائے بغیر اسلامی سلطنت کی حدود میں کہیں بھی قیام کر سکتے ہو۔ یاد رکھو کہ دنیا کے ہر قانون میں سرکشی اور بغاوت کی سزا موت ہے۔ اگر تم آئندہ اپنی ظالمانہ حرکتوں سے باز نہیں آئے تو تمہارے لئے بڑی ہلاکت و بربادی ہے۔''
حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے مایوس ہو کر جنوں کی یہ جماعت دہلی سے کچھ دُور ایک مضافاتی علاقے میں جا بسی۔ بنیادی طور پر یہ تمام جن کافر اور ظالم تھے۔ مگر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی تنبیہہ کے بعد ان جنوں میں سے جس نے بھی کسی بے گناہ انسان کو ستانے کی کوشش کی تو اچانک ایک غیبی تلوار نمودار ہوئی اور اس

ظالم جن کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح جب دو چار جن اس غیبی تلوار سے قتل ہو گئے تو جنوں کی جماعت میں ایک دہشت ناک ہلچل سی مچ گئی اور انہیں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے الفاظ یاد آنے لگے۔

''اگر تم آئندہ اپنی ظالمانہ حرکتوں سے باز نہیں آئے تو تمہارے لئے بڑی ہلاکت و بربادی ہے''

آخر وہ تمام جن دوبارہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اپنے کافرانہ عقائد سے تائب ہو کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ یہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی عظیم الشان کرامت تھی۔

اس واقعہ کے بعد شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی مقبولیت اور محبوبیت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ دہلی کے ہزاروں باشندے اس آسیب زدہ مکان کے باہر یہ منظر دیکھنے کے لئے کھڑے رہتے تھے کہ جس مکان میں بڑے بڑے امراء اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ ایک رات قیام نہیں کر سکے تھے، وہاں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اپنے بوریا نشیں فقیروں کے ساتھ کس طرح قیام فرما ہیں۔

اگر شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کے سینے میں احساس اور سچائی کی ہلکی سی رمق بھی ہوتی تو وہ اپنی اس شکست سے سبق حاصل کرتے اور صوفیائے کرام کو مزید ستانے سے باز آ جاتے۔ مگر دنیا داری اور حرص و طمع، نجم الدین صغریٰ کے رگ و پے میں اُتر چکی تھی۔ اپنے ایک منصوبے کی ناکامی کے بعد شیخ الاسلام نے دوسرا منصوبہ تراشا جو پہلے سے بھی زیادہ غلیظ و کثیف تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نجم الدین صغریٰ اتنی پست سطح پر اُتر کر ایک مردِ خدا کے خلاف اتنی گھناؤنی سازش کریں گے

دہلی کے باشندوں میں سے جس نے بھی اس واقعے کے بارے میں سنا، حیرت زدہ رہ گیا۔ دہلی کی ایک حسین و جمیل مطربہ نے حضرت جلال الدین تبریزیؒ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے اس کی آبرو ریزی کی ہے۔ سازش کے خاکے میں مزید رنگ بھرنے کے لئے کہا گیا کہ مطربہ کو حضرت جلال الدین تبریزیؒ سے بے انتہا عقیدت تھی۔ چونکہ وہ بہترین گانے والی تھی اور حضرت کو سماع کا شوق تھا۔ اس لئے وہ انہیں ایک خدا رسیدہ بزرگ سمجھ کر ان کے قریب آ گئی اور پھر ایک دن حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے اس کے جذبۂ عقیدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تنہائی میں اس کا دامنِ عصمت تار تار کر دیا۔

حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے مخالفین نے اس واقعہ کو حقیقی سمجھ کر خوب اُچھالا۔ آپؒ کے عقیدت مندوں کے دل پر ایک قیامت گزر گئی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ آپؒ جیسا بزرگ اس گھناؤنے جرم میں ملوث ہو جائے گا۔ پھر اس قسم کے خیالات بھی ذہنوں میں اُبھرنے لگے کہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ آخر انسان ہیں، کوئی پیغمبر نہیں کہ ان سے گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔ غرض عجیب کشمکش کا عالم تھا۔ اس واقعے کے بعد آپؒ کے دشمنوں کے چہروں پر کامیابی کا رنگ اُبھر آیا تھا اور عقیدت مند افسردہ اور مغموم نظر آتے تھے۔ خود سلطان شمس الدین التمش کو بھی اس الزام تراشی پر بے حد افسوس تھا۔ حضرت قطبؒ کا مرید ہونے کے سبب وہ حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے مرتبے سے واقف تھا۔ لیکن وہ مطربہ کے الزام کو اس وقت تک کس طرح جھٹلا سکتا تھا جب تک کہ عدالت اس مقدمے کا فیصلہ نہ سنا دے۔

شیخ الاسلام ہونے کے باعث یہ مقدمہ نجم الدین صغریٰ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ نجم الدین صغریٰ کو حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے تعلقات کی کشیدگی کا علم تھا۔ وہ اس موقع پر ان دونوں بزرگوں کی کشیدگی سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس لئے شیخ الاسلام نے تمام مشائخ کو جمع کرنے کے بعد

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کو اس مقدمے کا منصف بنایا۔ نجم الدین صغریٰ کو پورا یقین تھا کہ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے خلاف فیصلہ دیں گے اور اس طرح ان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

آخر ایک روز دہلی کی ایک جامع مسجد میں اس مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ عدالت کے قانون کے مطابق ایک ملزم کی حیثیت سے حضرت جلال الدین تبریزیؒ کو بھی طلب کیا گیا اور جب آپؒ مسجد کے دروازے پر پہنچے تو سلطان شمس الدین التمش سمیت تمام بزرگ آپؒ کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو شدید حیرت ہوئی لیکن انہوں نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ ان کی کینہ توز نظریں حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک شیخ الاسلام نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ جیسے ہی حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے مسجد میں داخل ہونے کے لئے اپنے جوتے اُتارے، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ تیزی سے آگے بڑھے اور آپؒ نے حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے جوتے اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ سلطان شمس الدین التمش، مشائخِ کرام اور خود نجم الدین صغریٰ بھی حیرت زدہ تھے۔ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی کشیدگی کے بعد حضرت بہاؤالدین زکریاؒ، حضرت جلال الدین تبریزیؒ کا اس قدر احترام کریں گے۔

جب حضرت جلال الدین تبریزیؒ مسجد میں داخل ہو کر اپنی نشست پر بیٹھ گئے تو سلطان شمس الدین التمش نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''حضرت زکریا ملتانیؒ جیسے بزرگ جس شخص کا احترام کرتے ہوئے اس کے جوتے اٹھائیں، اس پر یہ الزام سراسر بہتان اور تہمت ہے.....اس مقدمے کو کارروائی کے بغیر ہی ختم کر دیا جائے۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ بے قصور ہیں۔ گناہ کا یہ غبار آپ کے دامن کو آلودہ نہیں کر سکتا۔''

سلطان شمس الدین التمش کا یہ حکم سنتے ہی شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کا چہرہ اُتر گیا اور ان کا وہ منصوبہ جو بظاہر مکمل نظر آتا تھا، انتہائی ناقص ثابت ہوا۔ شیخ الاسلام کی یہ حالت دیکھ کر حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے فوراً ہی بات کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے فرمایا۔

''شاید شیخ الاسلام یہ سمجھیں کہ میرے اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے درمیان ایک خاص روحانی رشتہ ہے اور میں نے اسی رشتے کے احترام کا مظاہرہ کیا ہے۔ بے شک! یہ رشتہ اپنی جگہ ہے اور حضرت شیخ کی شخصیت اپنی جگہ......اگر کوئی مجھ سے میری ذاتی رائے معلوم کرے تو میں کسی تکلف اور رعایت کے بغیر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ انسانوں سے اس قسم کے گناہوں کا ارتکاب عین ممکن ہے۔ مگر جس ذات پاک نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو معرفت کے اس مقام تک پہنچایا ہے، وہی ذاتِ اقدس ان کی دستگیری بھی کرے گی اور شیخ کی قبائے روحانی کو داغ دار ہونے سے بھی بچائے گی۔ میرے لئے یہی اعزاز کافی ہے کہ اہلِ دنیا کے سامنے حضرت شیخ کے جوتے اُٹھاؤں اور ان کے قدموں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناؤں۔''

حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کا اظہارِ عقیدت دیکھ کر حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؒ نے بھری عدالت کے سامنے انتہائی والہانہ لہجے میں فرمایا۔ ''بلاشبہ آپ محبوب بھی ہیں اور مخدوم بھی۔ حق تعالیٰ آپ کے درجات و مراتب میں مزید اضافہ فرمائے کہ آپ نے اس خانہ بدوش فقیر کے ساتھ اس قدر حُسنِ ظن رکھا۔''

حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے کردار پر پہلے فرمانروائے ہندوستان شمس الدین التمش نے گواہی پیش کی، اس

کے بعد سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم بزرگ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے شہادت دی۔ اور یہ شہادت بڑی شہادت تھی۔ عدالت میں موجود تمام حاضرین کے چہروں پر ناقابل بیان مسرت کے آثار نمایاں تھے۔ بس ایک نجم الدین صغریٰ تھے کہ احساسِ شکست کے باعث ان کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو سلطان شمس الدین التمش کی نظروں سے گرا کر اپنا عہدہ و منصب بچانا چاہتے تھے۔ مگر حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی عظیم الشان گواہی نے شیخ الاسلام کی بچھائی ہوئی بساط اُلٹ دی تھی۔ ابھی نجم الدین صغریٰ شدید اذیت و کرب میں مبتلا تھے کہ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی پُرجلال آواز گونجی۔

''میری گواہی سے انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ بہتر یہی ہے کہ عدالت میں مدعیہ کو بھی طلب کیا جائے۔''

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کی بات سن کر شیخ الاسلام کے چہرے پر رونق دوبارہ لوٹ آئی۔ اُنہیں یقین تھا کہ جب دہلی کی وہ مطربہ اور رقاصہ عدالت کے سامنے اپنا بیان دے گی تو شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا جرم ثابت ہو جائے گا۔

حکمِ سلطانی کے مطابق تھوڑی ہی دیر میں اس گانے والی رقاصہ کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ مدعی عورت سر سے پاؤں تک سفید چادر میں اس طرح لپٹی ہوئی تھی کہ بس اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اگر حاضرینِ عدالت اس عورت کے پیشے سے واقف نہ ہوتے تو یہی سمجھتے کہ وہ کوئی پردہ دار اور عفت مآب خاتون ہیں۔

سلطان شمس الدین التمش نے ایک نظر مطربہ کی طرف دیکھا اور کسی قدر نرم لہجے میں کہا تاکہ عورت رعبِ شاہی کے زیر اثر نہ آ جائے۔ ''خاتون! تم کسی خوف و خطر کے بغیر اپنا مقدمہ پیش کرو اور یقین رکھو کہ تمہارے ساتھ پورا انصاف کیا جائے گا۔''

مطربہ نے من و عن اپنا وہی بیان دہرا دیا جو پہلی بار شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی عدالت میں دیا گیا تھا۔ حاضرینِ عدالت نے شدید حیرت کے ساتھ مطربہ کا بیان سنا۔ پھر جب وہ گانے والی عورت خاموش ہوئی تو حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے مداخلت کرتے ہوئے فرمایا۔

''خاتون! تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا کہ خانۂ خدا میں کھڑے ہو کر ایک بزرگ ہستی پر اتنی سنگین تہمت لگا رہی ہو؟''

''آپ معزز اور با اثر حضرات مسجد میں بیٹھ کر اللہ سے نہیں ڈرتے کہ ایک کمزور اور مجبور عورت کو خوفِ خدا کی تلقین کر رہے ہیں...... اور شیخ جلال الدین تبریزی سے کوئی سوال نہیں کرتا کہ انہوں نے اپنی ایک عقیدت مند کے ساتھ کیسا ظالمانہ سلوک کیا۔''

مطربہ کا انتہائی بے باکانہ جواب سن کر کچھ دیر کے لئے حاضرینِ عدالت پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ خود والیٔ ہندوستان، سلطان شمس الدین التمش بھی بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ بس پوری عدالت میں ایک شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ ہی تھے جن کا مسخ شدہ چہرہ دوبارہ کسی تازہ پھول کی طرح کھل اٹھا تھا۔

مطربہ کے پُرزور بیان نے مقدمے کی نوعیت ہی تبدیل کر دی تھی۔ ایک منصف (جج) کی حیثیت سے حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا نظر آ رہے تھے کہ آخر آپ اس مقدمے کا کیا فیصلہ سنائیں؟

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے حاضرینِ عدالت پر ایک نظر ڈالی اور نشست سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ دہلی کی اس مطربہ کی طرف بڑھے جو اس مقدمے میں مدعی تھی اور آپؒ پر اپنی آبروریزی کا الزام

عائد کر رہی تھی۔

''خاتون! کیا تم مجھے پہچانتی ہو؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے انتہائی نرم و شیریں لہجے میں اس عورت سے پوچھا جو کسی پردہ نشیں اور حیادار عورت کی طرح سر سے پاؤں تک سفید چادر میں لپٹی کھڑی تھی۔

''مجھ سے زیادہ آپ کو کون جانتا ہے شیخ محترم!'' مطربہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ مگر اس کی آواز بلند تھی اور لہجے میں گہرے طنز کی آمیزش تھی۔

''مگر محترم خاتون! میں تو تمہیں نہیں جانتا۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا لہجہ بدستور نرم و شیریں تھا۔

''ہر مجرم یہی کہتا ہے۔ مگر جاننے والا خوب جانتا ہے۔'' اب کی بار مطربہ کے لہجے میں سختی بھی تھی اور تلخی بھی۔

''تم نے سچ کہا خاتون! کہ جاننے والا خوب جانتا ہے۔'' یکایک حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی آواز معمول سے زیادہ بلند ہو گئی تھی اور لہجے میں جلالِ روحانی جھلکنے لگا تھا۔ ''میری طرف غور سے دیکھو اور پھر عدالتِ عالیہ کو بتاؤ کہ تم مجھے جانتی ہو یا نہیں۔''

تمام حاضرین پر ایک سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ دیکھنے والوں نے آج سے پہلے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو اس قدر حالتِ جلال میں نہیں دیکھا تھا۔

ایک مردِ حق کی آواز نے دہلی کی مطربہ پر یکایک ایک وحشت سی طاری کر دی تھی۔ پھر جب اُس نے گھبرا کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے چہرۂ مبارک پر نظر ڈالی تو حاضرینِ عدالت نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دہلی کی رقاصہ بہت زور سے چیخی اور مسجد کے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

پھر جب اُسے ہوش آیا تو اس نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا اور زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگی۔ ''شیخ! تمام دہلی آپ کی بزرگی اور عظمت پر گواہی دیتا ہے۔ میں کیا اور میری گواہی کیا..... مجھے خوف و لالچ نے اندھا کر دیا تھا کہ آپ جیسی محترم ہستی پر تہمت تراشنے لگی۔ مجھ گناہ گار کو معاف کر دیں۔ جب تک آپ معاف نہیں کریں گے، حق تعالیٰ بھی مجھے نہیں بخشے گا۔ میری دنیا بھی جہنم اور آخرت بھی دوزخ۔'' دہلی کی مطربہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت شفقت کے ساتھ مطربہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''خاتون! میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اب تمہارے ذمے میرا کوئی قرض نہیں ہے۔ حساب برابر ہو گیا۔ پھر بھی میں حق تعالیٰ سے تمہاری مغفرت کی دعا کروں گا۔''

حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے چہرۂ مبارک پر ناقابلِ بیان مسرت کا رنگ اُبھر آیا تھا کہ خداوند ذوالجلال نے ان کے ''پیر بھائی'' کو عدالتِ عالیہ کے سامنے سرخرو ٹھہرایا تھا۔ اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی قبائے روحانی سے تہمت کا داغ مٹا دیا تھا۔

بظاہر بات ختم ہو گئی تھی، مگر والیٔ ہندوستان سلطان شمس الدین التمش اس صورتِ حال سے مطمئن نہیں تھا۔ پھر جب مطربہ کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے اور وہ کسی قدر پُرسکون نظر آنے لگی تو سلطان التمش نے مطربہ سے پوچھا۔

''تجھے کس چیز کے خوف اور لالچ نے اندھا کر دیا تھا کہ تُو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی؟''

اس سے پہلے کہ مطربہ، سلطان شمس الدین التمش کے سوال کا جواب دیتی، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے فرمانروائے ہندوستان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''جانے دیں سلطانِ معظم! جو گزر گئی، سو گزر گئی۔ اللہ تعالیٰ پردہ داری کو پسند فرماتا ہے۔''

"یہ شیخ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ ایک تہمت طراز عورت کو معاف کر دیا۔ مگر ابھی انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوئے۔" سلطان التمش نے کہا اور پھر وہ خاتون سے مخاطب ہوا۔ "اب تُو بے جھجک ہو کر اس شخص کا نام بتا دے جس نے تجھے خوف میں مبتلا کر رکھا ہے۔"

والیٔ ہندوستان کی یقین دہانی کے بعد مطربہ نے شیخ الاسلام کی طرف دیکھا اور بے باکانہ لہجے میں کہا۔ "میں نے یہ سب کچھ نجم الدین صغریٰ کے کہنے پر کیا۔"

مطربہ کے اس انکشاف سے عدالت میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ والیٔ ہندوستان، سلطان شمس الدین التمش سے لے کر عدالت میں موجود تمام معزز صوفیائے کرام اور علمائے عظام تک ہر شخص حیران تھا کہ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ سے ایسی پست حرکت بھی سرزد ہو سکتی تھی۔ قرآن کریم میں غیبت کو گناہِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔ ایک مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"غیبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی نے اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھا لیا۔"

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ "ہلاک ہو گیا وہ شخص، جس نے کسی کی غیبت کی۔"

جب یہ آیت قدسیہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام میں سے کسی صحابی نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ ﷺ! اگر کسی شخص میں کوئی عیب موجود ہو اور اسے محفل میں بیان کر دیا جائے تو یہ حقیقت کا اظہار ہو گا۔ آخر اس میں کیا قباحت ہے؟"

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جواباً فرمایا۔ "اس کو غیبت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندوں کی پردہ پوشی کی جائے۔" واضح رہے کہ اللہ کے پاک ناموں میں ایک نام "ستار" بھی ہے..... جس کے معنی ہیں "عیبوں کا چھپانے والا"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دوبارہ ان ہی صحابی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اور اگر اس شخص میں وہ عیب موجود نہیں جو اس کی ذات سے منسوب کیا گیا ہے تو یہ بہتان ہے، تہمت ہے...... جو غیبت سے بھی بڑا گناہ ہے۔"

اگرچہ ظاہر میں دہلی کی مطربہ نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ پر تہمت لگائی تھی لیکن حقیقتاً وہ آلۂ کار تھی اور در پردہ نجم الدین صغریٰ ہی مجرم تھے۔

پھر جب سلطان شمس الدین التمش نے اس عورت سے سازش کی تفصیل پوچھی تو مطربہ نے پوری سچائی کے ساتھ بتا دیا۔ "شیخ الاسلام نے مجھے پانچ سو اشرفیاں دی تھیں۔ میں نے انکار کیا تو انہوں نے مجھے قتل کی دھمکی دی۔ میں بدنام طبقے کی ایک مجبور عورت، موت سے ڈر گئی۔ اور اس پاکباز انسان پر بہتان لگا دیا، جسے بادشاہِ وقت کے ساتھ تمام دہلی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ حق تعالیٰ میرے اس گناہِ عظیم کو معاف فرمائے۔"

یہ کہتے کہتے مطربہ دوبارہ رونے لگی۔ اگرچہ وہ اپنی آواز فروخت کر کے اور نامحرم مردوں کے سامنے اپنے جسم کی نمائش کر کے روزی حاصل کرتی تھی...... لیکن ابھی اس کا احساس مُردہ نہیں ہوا تھا، اس لئے شرم و ندامت سے اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔

اس کے برعکس شیخ الاسلام، نجم الدین صغریٰ کے چہرے پر ندامت کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ حالات کی دلدل میں مکمل طور پر دھنس گئے تھے۔ نتیجتاً ان کے شاطر ذہن نے اس دلدل سے نکلنے کے لئے ایک اور جھوٹ کا مظاہرہ کیا۔ "یہ آوارہ عورت جھوٹ بولتی ہے۔ میں اسے پہچانتا تک نہیں۔" پھر نجم الدین

صغریٰ براہِ راست سلطان شمس الدین التمش سے مخاطب ہوئے۔ ''حضورِ والا! دارالحکومت کے تمام معزز اور تعلیم یافتہ افراد جانتے ہیں کہ فرمانروائے ہندوستان کی خصوصی توجہ اور عنایت کی وجہ سے میں اس منصبِ عظیم تک پہنچا ہوں۔ دہلی کے دوسرے علماء بھی اپنے سینوں میں یہی خواہش رکھتے ہیں کہ کسی طرح ''شیخ الاسلام'' کے عہدے پر فائز ہو جائیں۔ جب ان کی اس دیرینہ آرزو کی تکمیل نہ ہو سکی تو انہوں نے مجھ فقیر کو سلطانِ معظم کی نظروں سے گرانے کے لئے یہ رکیق و ذلیل ترکیب استعمال کی۔ یہ رسوائے زمانہ عورت میرے کسی دشمن کی آلۂ کار ہے...... میں سلطانِ عادل سے درخواست کروں گا کہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لئے خفیہ اور مکمل تحقیقات کرائی جائے تا کہ اس سازش کے حقیقی خدوخال دنیا کے سامنے ظاہر ہو جائیں۔''

جیسے ہی شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ خاموش ہوئے، مطربہ کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے اور اس نے انتہائی دردناک لہجے میں شمس الدین التمش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سلطانِ معظم کو تحقیقات کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں لاکھ گناہ گار سہی مگر اوّل و آخر ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہوں۔ اور ایک مسلمان اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ جب دنیا کی عدالت سے انصاف نہ مل سکے تو اسے اپنا معاملہ خداوند ذوالجلال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر شیخ الاسلام سچے ہیں تو وہ قرآنِ مقدس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھالیں۔''

حاضرینِ عدالت نے اس مطربہ کی اس تجویز کو بڑی حیرت سے سنا۔ مگر نجم الدین صغریٰ نے انتہائی سخت لہجے میں اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''قرآن پاک کی قسم جھوٹے لوگ کھاتے ہیں......اور میں حق پر ہوں...... اس لئے مجھے کتابِ مقدس کو درمیان میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

سب لوگوں نے محسوس کیا کہ گفتگو کرتے وقت شیخ الاسلام کے لہجے سے رعونت جھلک رہی تھی۔

''مگر میں گناہ گار، قرآنِ مقدس کو درمیان میں رکھ کر قسم کھاتی ہوں کہ اگر میری طرف سے شیخ الاسلام پر تہمت طرازی کی گئی ہو تو قادرِ مطلق مجھے ذلت و بربادی کی موت دیدے۔''

مطربہ کی اس قسم کے بعد حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے والیٔ ہندوستان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''سلطانِ معظم! میں نے اس خاتون کے ساتھ شیخ الاسلام کو بھی تہہ دل سے معاف کیا۔ میری گزارش ہے کہ اس مقدمے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔''

نجم الدین صغریٰ ڈوب چکے تھے۔ مگر پھر بھی اپنے عہدہ و منصب کا بھرم رکھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو مخاطب کر کے انتہائی تند و تیز لہجے میں بولے۔ ''آپ اپنی بخشش و عطا اپنے پاس رکھیں۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ خاموش ہو گئے اور عدالت برخواست ہو گئی۔

بظاہر بات ختم ہو گئی تھی مگر مطربہ کی پُرجوش قسم نے فرمانروائے ہندوستان کو شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ سلطان شمس الدین التمش بذاتِ خود نیک سیرت اور درویش صفت حکمران تھا......اس لئے کئی دن تک مسلسل سوچتا رہا کہ کہیں ''شیخ الاسلام'' جیسے نازک اور اہم عہدے کے لئے نجم الدین صغریٰ کا انتخاب غلط تو نہیں ہوا ہے؟...... آخر طویل غور و فکر کے بعد والیٔ ہند نے طے کر لیا کہ وہ اس واقعے کی تحقیقات کرائے بغیر نہیں رہے گا۔ آخر سلطان شمس الدین التمش کے معتبر جاسوسوں نے اس شخص کو لا کر بادشاہ کے سامنے کھڑا کر دیا جو اس سلسلے کی ایک اہم کڑی تھا۔

''سیر العارفین'' کے مصنف حامد بن فضل اللہ جمالی کی روایت کے مطابق شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ پر تہمت لگانے کے لئے پانچ سو دینار سرخ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس ذیل میں نصف رقم پیشگی کے طور پر ادا کی گئی تھی اور آدھی رقم یعنی ڈھائی سو دینار دہلی کے ایک بقال، احمد شرف کے پاس اس شرط کے ساتھ رکھوا دی گئی تھی کہ جیسے ہی مطربہ اپنا کام مکمل کر لے گی، اسے باقی رقم بھی ادا کر دی جائے گی۔ اس وقت جو شخص سلطان شمس الدین کے سامنے کھڑا تھا، وہ احمد شرف بقال (بنیا) تھا۔ اس نے سازش کے اس منصوبے کی پوری تفصیل فرمانروائے ہندوستان کے سامنے بیان کر دی۔

حقیقت سے آگاہ ہوتے ہی سلطان شمس الدین التمش نے شیخ الاسلام کو بھی اپنے مخصوص کمرے میں طلب کر لیا۔ احمد شرف بقال کو دیکھتے ہی نجم الدین صغریٰ کے ہوش اڑ گئے۔

''اس شخص کو پہچانتے ہو؟'' سلطان التمش نے احمد شرف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ مطربہ سچ کہتی ہے۔''

شیخ الاسلام کیا جواب دیتے...... ندامت کے بوجھ سے نجم الدین صغریٰ کا سر جھک گیا اور ذلت کے احساس سے پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔

سلطان التمش نے اپنے جاسوسوں اور احمد شرف بقال کو کمرے سے جانے کا حکم دیا۔ پھر جب نجم الدین صغریٰ تنہا رہ گئے تو والئ ہند نے نہایت غضب ناک لہجے میں کہا۔ ''آپ نے اہلِ علم کو رُسوا کر دیا..... اب کون کس پر اعتبار کرے گا؟''

نجم الدین صغریٰ نے رو رو کر معافی مانگی۔ مگر سلطان التمش نے ان کی ریاکارانہ معذرت اور جھوٹے آنسوؤں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بس اتنا کہا۔ ''آپ کو نہیں، مجھے معافی کی ضرورت ہے۔ میں اپنی کم نظری پر شرمندہ ہوں کہ میں نے ایسے شخص کو ''شیخ الاسلام'' کا عہدہ سونپ دیا۔ پتہ نہیں کہ تم نے کیسے کیسے غلط فیصلے دیئے ہوں گے۔ ان سب کا عذاب میری گردن پر ہے۔ میں نے صرف حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ سے نسبت کے سبب دھوکا کھایا۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے۔''

اس کے بعد نجم الدین صغریٰ شیخ الاسلام کے عہدے سے برطرف کر دیئے گئے۔ پھر دہلی کے گلی کوچوں میں نجم الدین صغریٰ کی وہ رُسوائی ہوئی کہ انہوں نے گھر سے نکلنا ہی بند کر دیا۔ کل تک جو دارالحکومت کا ایک معزز و محترم فرد تھا، آج وہ ذلت و ملامت کا نشان بن کر رہ گیا تھا۔

اب ہم اس واقعے کی مختصر تفصیل پیش کریں گے، جس کے سبب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے درمیان کشیدگی پیش ہو گئی تھی۔ شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ، سلسلۂ سہروردیہ کے دو عظیم بزرگوں کی اسی کشیدگی سے سیاسی فائدہ اٹھاتے ہوئے خود کو سربلند رکھنا چاہتے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ جب حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے رخصت ہوئے تو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بھی آپؒ کے ہمراہ تھے۔ پھر جب دونوں بزرگ نیشاپور پہنچے تو کچھ دن اس تاریخی شہر میں قیام کیا۔ اس وقت نیشاپور میں مشہور صوفی بزرگ، حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ قیام فرما تھے۔ ایک روز حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ، حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ پھر جب واپس آئے تو حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے آپؒ سے پوچھا۔

''برادر! آج کہاں کہاں کی سیر کی؟ کسی درویش سے بھی ملے؟''

''ہاں! حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی خانقاہ میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ کیا عجیب بزرگ ہیں؟''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے لہجے سے حضرت فرید الدین عطارؒ کے لئے ایک خاص عقیدت جھلک رہی تھی۔

''شیخ عطارؒ سے کیا گفتگو رہی؟'' حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے دوسرا سوال کیا۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا۔ ''جب میں خانقاہ میں داخل ہوا تو حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے پوچھا کہ درویش کہاں سے آ رہے ہیں؟ میں نے جواباً کہا کہ یہ درویش بغداد سے آ رہا ہے اور ہندوستان کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پھر حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے مجھ سے دوسرا سوال کیا۔ ''اس وقت بغداد میں کون بزرگ مشغولِ حق ہیں؟''

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟'' حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے اپنے پیر بھائی سے ایک اور سوال کیا۔

''میں خاموش رہا۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا۔

''تم نے یہ کیوں نہ کہا کہ میں شیخ الشیوخ، حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کا مرید ہوں۔ اور ان ہی کی بارگاہِ کرم سے ہوتا ہوا نیشاپور پہنچا ہوں۔'' حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانی نے کسی قدر ناگوار لہجے میں کہا۔

اپنے پیر بھائی کا یہ رنگ دیکھ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ چونک اُٹھے۔ اگر آپؒ چاہتے تو کوئی بہانہ یا عذر تراش سکتے تھے۔ مگر ایک مردِ حق کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا۔ ''برادر! سچ تو یہ ہے کہ اس وقت حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ کے روحانی اثرات سے فضا کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہا۔''

حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا یہ جواب بہت ناگوار گزرا۔ آپؒ نے نہایت تند و تیز اور تلخ لہجے میں فرمایا۔ ''تم شیخ عطارؒ سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ اپنے پیر و مرشد ہی کو فراموش کر بیٹھے۔''

حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کو ناراض و برہم دیکھ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بہت عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''برادر! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں اپنے پیر و مرشد کو کس طرح بھول سکتا ہوں؟ میری تو پہچان ہی شیخ الشیوخ ہیں۔ اگر میں انہیں فراموش کر بیٹھا تو میری پہچان کہاں باقی رہے گی؟ میں تو خود بھی بے نشان ہو جاؤں گا۔''

''سیّد العارفین'' کے مصنف حامد بن فضل اللہ جمالی کی روایت کے مطابق شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کو ان دونوں بزرگوں کی کشیدگی کا علم ہو گیا تھا۔ اس لئے موصوف نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مقدمے میں حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کو منصف (جج) بنایا تھا۔ نجم الدین صغریٰ ایک دنیا پرست انسان تھے۔ انہیں یقین تھا کہ دونوں بزرگوں کی یہ رنجش اور کشیدگی رنگ لا کر رہے گی۔ اور حضرت مخدوم بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے خلاف فیصلہ سنا دیں گے۔ مگر جب حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے جوتے اُٹھا لئے تو شیخ الاسلام کی بچھائی ہوئی سیاسی بساط ایسی اُلٹی کہ خود ان ہی کو بدترین مات ہو گئی جو تاریخ تصوف کا ایک سیاہ باب بن کر رہ گئی ہے۔

صوفیائے کرام کے خلاف دنیا دار علماء کی یہ سازش کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ اس واقعہ سے چند سال پہلے سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلیفۂ اکبر، حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلاف اس سے بھی زیادہ شرم ناک سازش کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر اپنے قارئین کی معلومات کے لئے اس سازش کی تفصیلات بھی پیش کی جائیں۔

دہلی میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ حضرت قطبؒ کے مخالفین جوشِ مسرت میں آپے سے باہر ہو گئے تھے اور عقیدت مندوں کے حلقے میں شدید اضطراب نمایاں تھا۔ بعض مرید اور خادم تو روتے روتے بے حال ہو گئے تھے۔ سلطان شمس الدین التمش حیران تھا اور پھر یہ حیرت لحظہ بہ لحظہ وحشت و پریشانی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

وہ بڑا سنگین وقت تھا جب ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی نے سرِ دربار سلطان شمس الدین التمش سے انصاف مانگتے ہوئے کہا تھا۔ ''شہنشاہ! اس بدنصیب بچے کی طرف دیکھیے جو اپنے باپ کی زندگی میں یتیم ہو چکا ہے۔'' عورت کی دردناک آواز پورے دربار میں گونج رہی تھی۔ ''اور اس مظلوم بیوی کی طرف دیکھیے جس نے شوہر کی موجودگی میں بیوگی کا لباس پہن لیا ہے۔''

''اس بچے کا باپ کون ہے؟'' التمش بھی عورت کی فریاد سے متاثر ہو گیا تھا۔ ''تمہیں ہمارے عدل پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

''مجھے اندیشہ ہے کہ سلطان اس شخص کا نام سننا گوارا نہیں کریں گے۔'' کسی نامعلوم خوف سے عورت کی آواز کانپ رہی تھی۔

''اگر وہ کوئی وزیر سلطنت یا امیرِ شہر بھی ہے تو التمش کے دائرۂ انصاف سے باہر نہیں۔'' والئ ہندوستان یکایک غضب ناک ہو گیا تھا۔

''مجھے میرے بچے کے ساتھ جاں بخشی کا یقین دلایا جائے۔'' اب عورت ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

''ظالم کی گردن اور ہماری شمشیرِ عدل میں زیادہ فاصلہ نہیں۔ وقارِ سلطانی تمہیں ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔'' سلطان شمس الدین التمش نے عورت کو پناہ دے دی تھی۔

وہ بہت دیر تک خاموش کھڑی رہی اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولی۔ ''اس بچے کے باپ، قطب الدین بختیار کاکیؒ ہیں۔''

اہلِ دربار کی سانسیں رک گئیں اور والئ ہند سر سے پاؤں تک ایک سوال بن کر رہ گیا۔ حاضرین کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر عورت مسلسل گریہ وزاری کر رہی تھی اور بار بار سلطان شمس الدین التمش کے انصاف کو آواز دے رہی تھی۔

آخر التمش کو اپنی زندگی کا سب سے ناگوار فرض انجام دینا پڑا۔ حضرت قطبؒ کو بھرے دربار میں طلب کیا گیا۔ سلطان الہندؒ کے خلیفۂ اکبر پر یہ ایک عجیب اور خوفناک الزام تھا۔

''میں نے اس خاتون کو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے عورت کے بیان کردہ رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ حضرت قطبؒ ہی اس بچے کے باپ ہیں۔'' عورت مسلسل قسمیں کھا رہی تھی، خدا کو درمیان میں لانے کے بعد اور کیا باقی رہ گیا تھا؟

حضرت قطبؒ کے ہونٹوں پر مُہرِ خاموشی تھی اور اہلِ دربار اس عظیم الشان قصرِ ولایت کی دیواروں کو لرزتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ عورت سے کہا گیا کہ الزام غلط ثابت ہونے کی صورت میں اسے سخت ترین سزا بھی دی جا سکتی ہے لیکن وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو کر اپنے دعوے پر اصرار کرتی رہی۔

عدالت برخاست ہو گئی۔ اسی رات حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنے پیر و مرشد کو خواب میں دیکھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ فرما رہے تھے۔ ''سلطان سے کہو کہ میری آمد تک اس مقدمے کی کارروائی ملتوی کر

دی جائے۔"

دوسرے دن حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا پیغام پہنچا دیا اور پھر سرکاری اعلان کر دیا گیا کہ سلطان الہندؒ کے تشریف لانے کے بعد از سرِ نو عورت کی رودادِ غم سنی جائے اور پھر حقائق کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے گا۔ حضرت قطبؒ کے عام عقیدت مند اور مرید اس اعلان کے بعد مطمئن ہو گئے تھے کہ اس طرح کچھ دن کے لئے یہ خوفناک طوفان تھم گیا تھا مگر بعض بااثر درباریوں کا اصرار تھا کہ مقدمے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ان کے خیال میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ مجرم ثابت ہو گئے تھے۔ کیونکہ عورت کو نہ پہچاننے کی دلیل کوئی وزن نہیں رکھتی تھی۔ کچھ لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ ایک شریف عورت بھرے دربار میں اس طرح خود کو بے عزت نہیں کر سکتی تھی۔ اس گروہ کو یقین تھا کہ اس عورت کا دعویٰ درست ہے اور سلطان محض اس لئے حضرت قطبؒ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ ان کا مرید ہے۔

سلطان شمس الدین التمش نے انتہائی سخت الفاظ میں اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سے اس قدر حسنِ ظن رکھتا ہوں کہ اگر عدالت جرم ثابت کر بھی دے تو میں اپنی آخری سانس تک انہیں بے گناہ سمجھتا رہوں گا۔ بہت غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مقدمہ نہایت پیچیدہ ہے، اس لئے ہمیں کچھ دن انتظار کر کے حقائق کو تلاش کرنا پڑے گا۔"

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے مقدمے کے التوا کے بارے میں فرمایا تھا۔ "میں سلطان کے تعاون سے روپوش ہو کر دہلی نہیں چھوڑوں گا۔ اس شہر میں میرا قیام اس وقت تک رہے گا جب تک عدالت میری بے گناہی ثابت نہ کر دے یا پھر مجھے مجرم قرار دے دیا جائے۔ میں اپنے مقدمے کی پیروی کرنے سے قاصر ہوں۔ اس لئے میں نے حضرت معین الدین چشتیؒ کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ اب وہی دہلی تشریف لا کر اس کارروائی کو آگے بڑھائیں گے۔"

حضرت خواجہؒ کا اس مقدمے سے کیا تعلق ہے؟" ایک بااثر درباری نے سوال کیا۔ "وہ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟" درباری سردار کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔" حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "مجھے پیر و مرشد نے یہی حکم دیا ہے اور میں اس حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔"

بات ختم ہو گئی تھی مگر سرگوشیاں اب بھی جاری تھیں۔ امرائے دہلی میں سے جو لوگ حضرت قطبؒ کے غیر معمولی اثرات کو ناپسند کرتے تھے، انہیں یہ التوا سخت ناگوار تھا۔ ان کے خیال میں مقدمے کی شکل بگاڑنے کے لئے حضرت قطبؒ کو یہ مہلت دی گئی تھی۔ مخالفین کے نزدیک مہلت خطرناک تھی۔ اس لئے ان لوگوں نے دوبارہ اس مظلوم عورت کو شمس الدین التمش کے دربار میں پیش کیا۔

"مجھے سلطان کے عدل و انصاف پر پورا یقین ہے مگر اس طویل عرصے میں میری اور بچے کی گزر بسر کس طرح ہو گی؟" عورت نے اپنی غربت و افلاس کا ماتم کرتے ہوئے والیٔ ہندوستان کے سامنے دامن پھیلا دیا تھا۔

"تمہیں ساری مراعات بخشی جائیں گی۔" سلطان شمس الدین التمش نے بمشکل اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا اور پھر عورت کو سرکاری مہمان خانے میں داخل کرنے کا حکم دے دیا۔

اس کے بعد سلطان نے کئی بار عورت کو تنہائی میں طلب کیا۔ اسے حضرت قطبؒ کی روحانی عظمت کے بارے میں بتایا۔ سازش کے امکانات پر روشنی ڈالی۔ مگر وہ اپنی بات پر قائم رہی۔ عورت تسلسل کے ساتھ ایک ہی بیان

دے رہی تھی۔

''قطب الدین بختیار کاکیؒ اس بچے کے باپ ہیں اور میں ان کی غیر شرعی بیوی۔''

سلطان التمش لرز کر رہ گیا۔ اگرچہ وہ بھرے دربار میں حضرت قطب کی بے گناہی کا اقرار کر چکا تھا لیکن کبھی کبھی شیطانی وسوسے اس کے ذہن کو تہہ و بالا کر دیتے تھے۔ کبھی وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ خدا عنقریب اس سازش کا پردہ چاک کر دے گا اور کبھی وہ خیالوں میں حضرت قطبؒ کے کردار کی بلند ترین عمارت کو ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ فرمانروائے ہند کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں اور وہ نا قابلِ بیان اذیت میں مبتلا تھا۔ دہلی کے در و دیوار پر وحشت خیز سناٹا تھا۔ شہر کے بیشتر لوگ اُداس تھے کہ ان کا روحانی پیشوا، تہمت کی خوفناک آندھیوں کی زد میں تھا اور خود حضرت قطبؒ کی یہ حالت تھی کہ آپؒ کی بے چین نگاہیں اس شاہراہ پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر سلطان الہندؒ دہلی پہنچنے والے تھے۔ مگر ابھی اہلِ یقین کے لئے اذیت و کرب کے طویل لمحات باقی تھے اور اجمیر سے دہلی بہت دُور تھا۔

راہوں سے غبار اُٹھتا رہا، ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے مسافر آ رہے تھے مگر ان میں وہ ذاتِ گرامی شامل نہیں تھی جس کا حضرت قطبؒ کو شدید انتظار تھا۔ دہلی کی شاہراہِ خاص کو تکتے تکتے اہلِ دل کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں مگر آنے والا ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ایک بار پھر مخالفین کی شورش نے سر اٹھایا۔ دبی زبان میں سلطان شمس الدین کو جانبدار کہا گیا۔ سرگوشیوں میں فرمانرائے ہند پر اس طرح نکتہ چینی کی گئی کہ اب اس مقدمے کا فیصلہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ یہاں تک کہ دہلی کے باشندے اپنے روز و شب کے ہنگاموں میں اُلجھ کر سب کچھ بھول جائیں گے۔ یہ سلطان شمس الدین التمش جیسے عادل بادشاہ پر بڑی جارحانہ تنقید تھی۔ خودمختار حکمران لرز کر رہ گیا۔ کئی بار اس کے دل میں آیا کہ فتنہ و شر پھیلانے والوں کی لمبی زبانیں کاٹ دے مگر وہ دستورِ عدل سے مجبور تھا۔ خوفِ خدا نے التمش کو طاقت کے استعمال سے باز رکھا۔ ورنہ ایک لمحے میں تہمتوں اور افواہوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔ پھر کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ اگر مقدمہ عدالت میں لایا گیا تو دولتِ شاہی کے ذریعے قاضی کا ضمیر خرید لیا جائے گا۔ دریدہ دہن لوگوں کو کسی طرح بھی قرار نہیں تھا۔ سلطان کے جاسوس اسے یہ اذیت ناک خبریں مسلسل پہنچا رہے تھے۔ آخر التمش سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ حضرت قطبؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

''سیّدی!'' سلطان شمس الدین کا لہجہ افسردہ تھا۔ ''میں اس گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ دوبارہ الزام تراشیوں کا ذکر کر کے شیخ محترم کو اضطراب میں مبتلا کر دوں۔ مجھے عمر بھر اذیت میں رکھنے کے لئے یہی احساس کافی ہے کہ میرے دورِ حکومت میں آپ کے لباسِ مبارک کو داغ دار کیا گیا۔ اب مخالفین کو یہ شکایت ہے کہ میں انصاف سے کام نہیں لے رہا ہوں۔''

''میں عدالت میں پیش ہونے کے لئے پہلے بھی تیار تھا اور اس وقت بھی آمادہ ہوں۔ معاذ اللہ! میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لئے بہانہ سازی سے کام نہیں لیا ہے۔ پیر و مرشد کا یہی حکم ہے کہ وہ جب تک تشریف نہ لے آئیں، اس وقت تک کے لئے ساری کارروائیاں ملتوی کر دی جائیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ پیر و مرشد ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ بہر حال اہلِ شہر کچھ دن اور صبر کریں۔ شاہی عدالتیں زیادہ عرصے تک زحمتِ انتظار نہیں کریں گی۔ سلطان الہندؒ دہلی پہنچنے ہی والے ہیں۔''

انتہائی ضبط کے باوجود حضرت قطبؒ کے دل کا درد لفظوں میں جھلکنے لگا تھا۔

''عام لوگوں کا خیال ہے کہ سلطان الہندؒ بہت زیادہ ضعیف ہو چکے ہیں۔ جسم کی یہ ناتوانی اس طویل سفر میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہے۔'' شمس الدین التمش نے حضرت قطبؒ کے روبرو اُن اندیشوں کا اظہار کیا جن کی بازگشت دہلی کی ایک ایک گلی میں سنائی دے رہی تھی۔

''انسانی عقل ایک محدود دائرے میں گردش کر سکتی ہے۔'' حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔ ''بے شک! سلطان الہندؒ بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ تقاضائے فطرت تو یہی ہے کہ اس عمر میں انہیں طویل سفر سے گریز کرنا چاہئے۔ مگر ان حضرات کی کرم فرمائیوں کو کیا کہوں کہ جنہوں نے پیر و مرشد کو دہلی آنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ سلطان الہندؒ صرف میری خاطر یہ تکلیف برداشت کر رہے ہیں۔ آخر اہلِ دنیا کو اس بات پر فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے کہ حضرت خواجہؒ یہاں کس طرح پہنچیں گے؟ میں جس خدا کی پرستش کرتا ہوں اور جس کی کارسازی پر یقین رکھنا ایمان کی شرطِ اوّل ہے، وہی خدا اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لئے زمین کے فاصلوں کو سمیٹ دے اور برسوں کے سفر کو لمحوں میں طے کرا دے۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اس طرح بول رہے تھے جیسے آپؒ اپنی آنکھوں سے قدرتِ خداوندی کو زمین پر نازل ہوتے دیکھ رہے ہوں۔ سلطان شمس الدین التمش کچھ دیر تک بارگاہِ شیخ میں باادب بیٹھا رہا اور پھر اجازت لے کر چلا گیا۔ فتنہ پردازوں نے دوبارہ سلطان کے ردّیے پر تنقید کی تو فرمانروائے ہند کا پیمانۂ صبر چھلک اٹھا۔ اس نے غضب ناک لہجے میں اہلِ دربار کو مخاطب کر کے کہا۔

''میں نہیں جانتا کہ یہ شرپسند کون ہیں مگر خدا عنقریب ان لوگوں کو بے نقاب کر دے گا میں اب تک اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ شاید مفسدین اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں لیکن وہ قہرِ خداوندی سے نہیں ڈرتے۔ جس مردِ خدا کی مسیحائی سے بے شمار مریضوں نے شفا پائی، ہزاروں مفلسوں کو تنگ دستی سے نجات ملی، لاتعداد گمراہوں نے ہدایت حاصل کی، آج وہی ذاتِ گرامی خوفناک تہمتوں کا ہدف بن کر رہ گئی ہے۔ کیا اہلِ شہر، حضرت قطبؒ کی خدمات کا صلہ اس طرح دینا چاہتے ہیں؟ دلیل کے بغیر کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا لیکن مجھے یقین ہے کہ بعض دنیا داروں نے حضرت قطبؒ کے خلاف یہ شرم ناک سازش کی ہے۔ وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ ان کا منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے گا۔ کیا انہیں قدرت کے مزاج کا اندازہ نہیں؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ خدا اپنے نام لینے والوں کو زمین پر تنہا چھوڑ دیتا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر ایک آزمائشی لمحہ ہے جو بہر حال سلامتی سے گزر جائے گا۔ لوگ میری خاموشی پر معترض ہیں اور عدالت عالیہ کو مسلسل بدنام کیا جا رہا ہے کیا انہیں اس بات کا علم نہیں کہ اللہ نے اپنے بندے شمس الدین التمش کو اس ملک میں بے پناہ اختیارات عطا کئے ہیں۔ اگر میں جانبدار ہوتا اور حضرت قطبؒ کو بچانے کی کوشش کرتا تو پھر یہ مقدمہ عدالت میں کس طرح پیش کیا جا سکتا تھا؟ جو لوگ میری نرم دلی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ آئندہ اس قسم کی سرگوشیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ میں سرِ دربار اعلان کر چکا ہوں کہ حضرت سلطان الہندؒ کی آمد کے بعد اس مقدمے کے فیصلے کا اعلان کیا جائے گا۔ جب اس عورت نے بھرے مجمع میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر الزام تراشی کی ہے تو پھر قانونی کارروائی بھی برسرِ عام ہو گی۔'' سلطان شمس الدین التمش نے انصاف کے نام پر فتنہ و فساد پھیلانے والوں کو درپردہ سخت تنبیہ کی تھی۔ پھر اہلِ شہر نے دیکھا کہ حکومت پر تنقید ختم ہو گئی تھی۔ لیکن اشاروں میں گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگوں کے سیاہ قلب اور پراگندہ ذہن ابھی خوف کے احساس سے عارف تھے۔

بظاہر افواہوں اور نکتہ چینیوں کا سلسلہ رک گیا تھا مگر حضرت قطبؒ کی بے قراریوں کا وہی عالم تھا۔ آپؒ کی

مضطرب نگاہیں مستقل اس راستے پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے گزر کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ دہلی پہنچنے والے تھے۔ یہ انتظار کسی عام انسان کا نہیں تھا۔ یہ ایک ایسے مردِ پاکباز کا انتظار تھا جو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے وکیل کی راہ تک رہا تھا۔ ایسا وکیل، جس کی موجودگی مقدمے کی نوعیت کو یکسر بدل دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

آخر کشمکش انتظار ختم ہوئی۔ اہلِ دل، جن کی نبضیں ڈوبی جاتی تھیں، اب اُنہیں نئی زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ طویل مسافت طے کرنے کے بعد دہلی تشریف لے آئے تھے۔ اس سے پہلے بھی سلطان الہندؒ نے اس تاریخی شہر میں قیام فرمایا تھا مگر آج آپؒ کی مدد کے باعث دہلی کے مسلمان باشندے ہیجان انگیز خوشی سے سرشار تھے۔ انسانی ہجوم گھروں سے نکل کر "مہرولی" کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنی نئی خانقاہ تعمیر کی تھی۔

جب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی تشریف لائے تھے تو آپؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حکم سے "کیلوکھڑی" میں سکونت اختیار کی تھی۔ کیلوکھڑی، دہلی کا مضافاتی علاقہ تھا اور یہ جگہ مرکزی شہر سے بہت دُور واقع تھی۔ حضرت قطبؒ فطری طور پر شہر کے ہنگاموں اور شور وغل سے دُور رہنا پسند کرتے تھے مگر جب سلطان شمس الدین التمش آپؒ کا مرید رہا تو آپؒ "کیلوکھڑی" کو چھوڑ کر مہرولی تشریف لے آئے۔ اس نقل مکانی کی وجہ یہ تھی کہ سلطان امورِ سلطنت سے فارغ ہونے کے بعد روزانہ حضرت قطبؒ کی قدم بوسی کو حاضر ہوتا تھا۔

محلاتِ شاہ اور کیلوکھڑی کے درمیان زیادہ فاصلہ ہونے کے سبب شمس الدین التمش کو واپسی میں بہت دیر ہو جاتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے حضرت کے روبرو اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ وہ فرائضِ منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ بارگاہِ شیخ میں روزانہ حاضری دینا چاہتا ہے حضرت قطبؒ، سلطان کی گفتگو کا مفہوم سمجھ گئے تھے، اس لئے آپؒ نے محض اس کے جذبۂ عقیدت سے مجبور ہو کر "مہرولی" میں قیام فرمایا۔ اس وقت حضرت سلطان الہندؒ، مہرولی کی خانقاہ میں مقیم تھے۔ لوگ قطار در آتے گئے اور خانقاہ کے باہر جمع ہوتے رہے۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے قرار تھی۔ آخر غریب نوازؒ بندگانِ خدا کی دلجوئی کے لئے خانقاہ کے دروازے پر تشریف لائے۔ لوگوں نے دیکھا کہ حضرت معین الدین چشتیؒ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ آپؒ کے چہرۂ مبارک سے شدید نقاہت ظاہر ہو رہی تھی۔ پھر بھی ہونٹوں پر وہی جاں فزا تبسم موجود تھا۔ آپؒ کی یہ شانِ جمالی دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ حضرت سلطان الہندؒ کو اپنے درمیان پا کر ہجوم کے جذبات بے قابو ہو گئے۔ کچھ لوگ ادب و احترام سے سر جھکائے ہوئے آگے بڑھے اور پھر حرفِ شکایت ان کی زبان پر آ گیا۔

"آپ ان فتنہ پردازوں کے حق میں بددعا کر دیجئے جو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ اب ہم لوگوں سے یہ اذیت ناک صورتِ حال برداشت نہیں ہوتی۔"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انسانی ہجوم کو دیکھا۔ ہر آنکھ میں رنج و الم کا دھواں تھا اور ہر چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ "میں خوش ہوں کہ تم نے اس آزمائش کے وقت میں اہلِ ہوس کا ساتھ نہیں دیا۔ اللہ تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔" حضرت سلطان الہندؒ نے اہلِ درد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں اس بات پر بھی خوش ہوں کہ تم نے قطبؒ کے غم کو اپنا غم سمجھا۔ قطبؒ کو میں نے دہلی میں متعین کیا تھا۔ اس لئے قطبؒ کی ذات، میری ذات ہے۔ وہ الزام تراشیاں قطبؒ پر نہیں، براہِ راست میں ان کا ہدف ہوں۔" یہ کہتے کہتے

حضرت سلطان الہندؒ کے چہرۂ مبارک پر ہلکا سا عکسِ جلال اُبھر آیا تھا۔ آپؒ نے دوبارہ مجمع کی طرف دیکھا اور پُر جوش لہجے میں فرمانے لگے۔

''ہم سب رحمتہ اللعالمین ﷺ کی اُمت ہیں۔ اگر تم بھول گئے ہو تو میں تمہیں یاد دلا دوں کہ دشمنوں کو دعا دینا، آقا ﷺ کی ممتاز ترین سنت ہے۔ جو لوگ آقا ﷺ کی غلامی کا دم بھرتے ہیں، انہیں ہر حال میں صبر کرنا چاہئے۔ اپنے کاموں کو اللہ کے سپرد کر کے کسی دوسری طرف دیکھنا شرک ہے...... اللہ کی کارسازی پر یقین رکھو اور انتظار کرو کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہونے والا ہے۔'' یہ کہہ کر آپؒ خانقاہ کے اندر تشریف لے گئے اور انسانی ہجوم اس طرح منتشر ہو گیا کہ ہر شخص اپنی جگہ مسرور و مطمئن نظر آ رہا تھا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس بھیڑ میں چند ایسے لوگ بھی موجود تھے، جنہیں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی باتوں سے دلی تکلیف پہنچی تھی۔ وہ ہر حال میں حضرت خواجہؒ کو شرمسار اور حضرت قطبؒ کو گناہ گار دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی پست فطرتیں مسلسل اس بات کا تقاضا کر رہی تھیں کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکیں اور یہ مردِ حق، اہلِ شہر کے نزدیک معتوب و مجرم قرار پائے۔

جیسے ہی سلطان شمس الدین التمش کو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی آمد کی خبر ہوئی، وہ فوراً قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا۔ آپؒ کے روبرو پہنچ کر سلطان کی حالت بھی غیر ہو گئی۔ وہ رقت آمیز لہجے میں عرض کرنے لگا۔ ''خواجۂ خواجگان! دنیا نے تو اہلِ ایمان کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک کیا ہے۔ آئندہ بھی اس کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے شمس الدین التمش کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ ''تمہارا منصب بڑا ہے، اس لئے تمہیں زیادہ صابر ہونا چاہئے۔''

''شیخ محترم! یہ معاملہ اس ذاتِ گرامی کا ہے جو ہمارے لئے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔'' جوشِ جذبات میں فرمانروائے ہند کی آواز لرز رہی تھی۔ ''جسے دیکھ کر اہلِ ایمان روشنی حاصل کرتے ہیں، اگر اس کی شخصیت ہی تہمتوں کی زد میں آ جائے تو پھر جہل و گمراہی کی سیاہ رات کہاں جا کر ٹھہرے گی؟'' سلطان شمس الدین التمش کی باتوں سے شدید کرب نمایاں تھا۔

''سلطان! خدا تمہیں حُسنِ نیت کا صلہ دے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بڑی محبت سے فرمایا۔ ''تم نے جس طرح قطب کی عزت و توقیر کی ہے، اللہ بھی تمہیں دونوں جہان میں سربلند کرے گا۔''

''میں جب تک زندہ رہوں گا، دل کی یہ خلش بھی برقرار رہے گی کہ میرے دورِ حکومت میں حضرت قطبؒ کے پاکیزہ لباس کو داغ دار کرنے کی کوشش کی گئی۔'' یہ کہتے کہتے سلطان التمش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''خواجۂ خواجگان! میں بھی دوسروں کی طرح آپ کا اور حضرت قطبؒ کا مجرم ہوں۔''

''سلطان! خالقِ کائنات تمہارے دل کی اس سوزش کو ہمیشہ قائم رکھے کہ یہ گداز ہی بندے کو اللہ تک پہنچاتا ہے اور یہ عجز و انکسار ہی میزانِ عدل قائم کرتا ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، فرمانروائے ہند کے جذبۂ عقیدت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ ''دنیا اپنا کام کر رہی ہے۔ تم انصاف کے تقاضے پورے کرو۔ قطب پر سرِ دربار الزام لگایا گیا تھا، اس لئے یہ مقدمہ سرِ دربار ہی طے ہو گا۔ اہلِ شہر کو بتا دو کہ کل عدالت آراستہ ہو گی۔ پھر خدا جسے چاہے گا، رُسوا کرے گا اور جسے چاہے گا، عزت و تکریم بخشے گا۔''

سلطان التمش بارگاہِ خواجہؒ سے اُلٹے پاؤں رخصت ہوا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی پورا دہلی ایک

ایسے اعلان سے گونجنے لگا، جس کی دھمک لوگوں کو اپنے دل کے قریب محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دن تاریخِ ہندوستان کا ایک یادگار دن تھا۔ لوگ اپنے کاروبار معطل کر کے دربارِ شاہی کی طرف جا رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اہلِ شہر کو اس مقدمے کا فیصلہ سننے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ مسلمان تو مسلمان، مقامی ہندوؤں کی بھی ایک بڑی تعداد قلعے کے چاروں طرف رواں دواں تھی۔ پتھر کے پجاری دل میں بہت خوش تھے۔ جن مسلمانوں نے ان کے ہاتھوں سے تخت و تاج چھینا تھا، آج اسی قوم کا روحانی پیشوا ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہونے والا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ایک دلچسپ تماشا تھا۔ خود مسلمانوں میں بھی علماء کا ایک گروہ، حضرت قطبؒ کی بدنامی پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کے برعکس حضرت قطبؒ کے عقیدت مند اُداس نظر آ رہے تھے۔ اُن کی زبانیں خاموش تھیں مگر دل مصروفِ دعا تھے۔ یہ ہجوم قلعے کے دروازے پر جا کر ٹھہر گیا تھا۔ عام انسانوں کو دربار میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد حضرت معین الدین چشتیؒ اپنے خلیفۂ اکبر، حضرت قطبؒ کے ہمراہ تشریف لائے۔ قلعہ کے باہر کھڑے بے شمار انسانوں کے سر عقیدت سے جھک گئے۔ جو پہرے دار موجود تھے، اُنہیں پہلی بار اندازہ ہوا کہ حقیقی بادشاہت اسے کہتے ہیں۔ سلطان التمش، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو شاہی اعزاز و احترام کے ساتھ دربار تک لانا چاہتا تھا مگر آپؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس خاطر مدارت سے سلطان کی جانبداری ظاہر ہو گی اور عدالت کا وقار مجروح ہو جائے گا۔ جیسے ہی سلطان الہندؒ اور حضرت قطبؒ دربار میں داخل ہوئے، در و دیوار پر لرزہ طاری ہو گیا۔ سلطان شمس الدین التمش احتراماً اپنی نشست سے اُٹھا اور اس کے ساتھ ہی تمام امرائے دربار بھی کھڑے ہو گئے۔ یہاں تک کہ قاضیٔ عدالت کو بھی اپنے فرماں روا کی تقلید کرنی پڑی۔ حضرت معین الدین چشتیؒ نے دربار کا یہ رنگ دیکھا تو بلند آواز میں فرمایا۔

''آج احترام کا یہ مظاہرہ جائز نہیں۔'' پھر آپؒ نے قاضی سے پوچھا۔ ''کیا مدعی عورت اور اس کا بچہ عدالت میں حاضر ہو چکے ہیں؟''

''جی ہاں! عورت اپنے بچے کے ہمراہ دربار میں موجود ہے۔'' قاضی نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ''عورت کا دعویٰ ہے......''

اس سے پہلے کہ قاضی صاحب کی بات مکمل ہوتی، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے فرمایا۔ ''جس دعوے کی زمانے میں تشہیر ہو چکی، اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف عورت اور اس کے بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

قاضیٔ عدالت نے سپاہی کو اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد ایک عورت اس طرح دربارِ سلطانی میں داخل ہوئی کہ سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور اس کی گود میں تقریباً دو ماہ کا شیر خوار بچہ تھا۔ عورت آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی قاضی کے سامنے آ کے ٹھہر گئی۔ سلطان شمس الدین التمش سے لے کر دربار کے پہرے دار تک اپنی اپنی جگہ ساکت تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطبؒ کے عارفانہ جلال نے لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری کر دی تھی۔ آخر سلطان الہندؒ آگے بڑھے اور انتہائی نرم لہجے میں عورت سے مخاطب ہوئے۔

''خاتون! یہ کیسی قیامت ہے کہ تم جیسی خانہ دار عورت کو بھرے دربار میں اپنا حق طلب کرنے کے لئے آنا پڑا۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں اور چہرۂ مبارک سرخ ہو رہا تھا۔ دراصل آپؒ کو اس حیا سوز واقعے سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔ اس لئے عورت سے گفتگو کرتے وقت حضرت سلطان الہندؒ کو

ناقابلِ بیان اذیت کا احساس ہو رہا تھا۔

''میں خود اپنا گھر چھوڑ کر یہاں تک نہیں آئی ہوں۔'' عورت نے سوگوار لہجے میں کہا۔ ''میری رسوائی کا سبب ان سے پوچھئے۔'' عورت نے حضرت قطبؒ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا چہرہ بدستور چادر میں چھپا ہوا تھا۔

''معزز خاتون! تم اس شخص کو اچھی طرح جانتی ہو؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انتہائی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورت سے حضرت قطبؒ کے بارے میں سوال کیا۔

''دنیا میں مجھ سے زیادہ ان کے متعلق کون جان سکتا ہے؟'' یہ کہتے کہتے عورت رونے لگی تھی۔ ''یہ میرے غیر شرعی شوہر ہیں۔ انہوں نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا مگر بعد میں نظریں پھیر لیں اور اپنے ہر وعدے کو فراموش کر دیا۔ اب میں ایک بے سہارا عورت اپنے جسم پر تہمتوں کے داغ سجائے ہوئے در در بھٹک رہی ہوں۔'' عورت بڑے دردناک لہجے میں فریاد کر رہی تھی۔

''یہ تمہارا غیر شرعی شوہر ہے؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔ آپؒ کو قطعاً یہ اُمید نہیں تھی کہ عورت اس بے باکی کے ساتھ حضرت قطبؒ پر الزام تراشی کرے گی۔

''یہ شخص جو کمسنی کے عالم میں اپنا گھر چھوڑ کر بندگانِ خدا کو ہدایت دینے کے لئے نکلا تھا، جسے میں نے اپنے بچے کی طرح پرورش کیا ہے، جس کے کردار کی بلندی کو سارا عالم جانتا ہے، وہ اتنا عہد شکن اور سیاہ کار بھی ہو سکتا ہے؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بڑے جذباتی انداز میں عورت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اگر کوئی بھٹکا ہوا مسافر منزل کی طرف لوٹ آئے تو اسے گم کردہ راہ نہیں کہہ سکتے۔ ابھی وقت ہے کہ تم رجوع کر لو۔ کوئی گناہ ایسا نہیں کہ اگر بندہ تائب ہو جائے تو اللہ اسے معاف نہ کرے۔''

''جب میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تو کس بات سے توبہ کروں؟'' عورت غم زدہ ہونے کے باوجود بہت بے باکی سے بول رہی تھی۔ ''خوفِ خدا اُنہیں نہیں آتا جو دوسروں کی زندگی سے کھیلتے ہیں۔''

''اہلِ دربار! تم گواہ رہنا کہ حجت پوری ہو چکی۔'' یکایک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لہجے میں تبدیلی آ گئی تھی اور آپؒ کے الفاظ سے جلالِ روحانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر ایوانِ شاہی کے در و بام ساکت ہو گئے۔ ''میں نے تجھے دوزخ کی اس نادیدہ آگ سے بچانا چاہا جسے تیری بیمار آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر انسان کی کیا طاقت ہے کہ وہ کسی کو عذابِ آسمانی سے محفوظ رکھ سکے، جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔'' حضرت سلطان الہندؒ اس عورت سے مخاطب تھے جو بہت دیر سے اپنے آپ کو مظلوم ثابت کر رہی تھی۔ ''تُو نے اپنے نفس پر بڑا ظلم کیا ہے۔ کاش تجھے کوئی بتاتا کہ کسی معصوم انسان پر تہمت طرازی کتنا بڑا گناہ ہے۔''

''عدالت میں وعظ و نصیحت کی کوئی گنجائش نہیں۔'' قاضی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''دنیا میں کسی بھی انسان سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ عورت کے بیانات کو صرف اس لئے جھٹلایا نہیں جا سکتا ہے کہ ملزم خانقاہ میں بیٹھنے والا ایک خرقہ پوش ہے۔''

قاضیٔ عدالت، دہلی کے ممتاز علماء کی جماعت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس پورے گروہ کو سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں بڑے بڑے عہدے حاصل تھے۔ یہ علمائے ظاہر، نظامِ خانقاہیت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان تمام حضرات کو صوفیوں کے مسلک سے خاص عداوت تھی۔ یہ لوگ خانقاہ کے گوشے میں بیٹھنے والے درویشوں کو بے عمل سمجھ کر ان کے طرزِ زندگی پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے۔ آج قاضیٔ عدالت اپنے اسی فطری تعصب کا مظاہرہ کر رہا تھا تاکہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اور ان کے تمام عقیدت مند، سلطان شمس الدین التمش کی نگاہ میں بے

وقعت ہو جائیں۔

''قاضیٔ محترم! آپ کا یہ قول درست ہے کہ کوئی بھی انسان گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس طرح بول رہے تھے کہ آپؒ پر شیریں بخنی ختم ہو چکی تھی۔ ''خانقاہ کے ایک گوشے میں چھپ کر بیٹھنے والے بھی مجرم ہو سکتے ہیں مگر کیا یہ شخص قطب الدین بختیار کاکیؒ آپ کی نظر میں گناہ گار ہے؟'' حضرت سلطان الہندؒ نے قاضیٔ عدالت سے ایک عجیب سوال کر ڈالا تھا۔

قاضی چند لمحوں کے لئے حیران رہ گیا، پھر اپنی سراسیمگی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''اس مقدمے کا تعلق میری ذات سے نہیں۔ اگر میں قطب الدین بختیار کاکیؒ کو بے گناہ سمجھ بھی لوں تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ یہ کرسیٔ عدالت ہے، جس پر مجھے حضرت سلطان کے حکم سے بٹھایا گیا ہے۔ اس کرسی پر بیٹھنے والا، ملزم سے ثبوت طلب کرتا ہے۔ مجھے قطب الدینؒ سے کوئی پرخاش نہیں۔ وہ اپنی بے گناہی کا ثبوت فراہم کریں اور باعزت طور پر اپنی خانقاہ کی طرف لوٹ جائیں۔'' قاضیٔ عدالت بظاہر نہایت معقول لہجے میں گفتگو کر رہا تھا لیکن اہلِ نظر جانتے تھے کہ اس کی نیت صاف نہیں تھی۔ وہ حضرت قطبؒ کی عوامی شہرت اور روحانیت کے بلند درجات سے حسد رکھتا تھا۔ بغض و کینہ کی اس آگ نے قاضی کو یہاں تک جلایا تھا کہ اس کے دل و دماغ سیاہ ہو کر رہ گئے تھے اور اب اسی کثافت کے باعث وہ حضرت قطبؒ کو سرِ دربار رُسوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا اللہ کی راہ میں قطبؒ کا طویل ترین سفر اس کی بے گناہی کے لئے کافی نہیں؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قاضیٔ عدالت کی مخاصمانہ گفتگو سن کر سوال کیا۔

''عدالت کی نگاہ میں اس بات کی کوئی حیثیت نہیں کہ ایک شخص دن کو روزہ رکھتا ہے اور رات میں مسلسل جاگ کر عبادت کرتا ہے۔'' قاضیٔ عدالت کا لہجہ تلخ تو نہیں تھا مگر اس سے بے مروّتی ظاہر ہو رہی تھی۔ ''زہد و تقویٰ اپنی جگہ ہے اور ایک عورت کا دعویٰ اپنی جگہ...... قطب الدین کی عبادت و ریاضت محض خدا کے لئے ہے۔ وہ اپنے فعل کے لئے اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ہم ان سے اس سلسلے میں بازپرس کا کوئی حق نہیں رکھتے۔ عدالت میں ایک عورت نے اپنی حق تلفی کا دعویٰ دائر کیا ہے۔ ہم اس دعوے کی روشنی میں قطب الدینؒ سے ان کی بے گناہی کا ثبوت مانگتے ہیں۔ اس ذیل میں یہ دلیل قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کہ ایک شخص کتنا متقی اور پرہیزگار ہے۔''

''پھر کس طرح بے گناہی کا ثبوت پیش کیا جائے؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ ''قطب بارہا اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ مدعی عورت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ عدالت اس اعلان کو کیوں کافی نہیں سمجھتی؟''

''اپنے بارے میں ملزم کی اپنی گواہی قانونی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔'' قاضیٔ عدالت نے اعتراض کیا۔

''عدالت کی نظر میں اس بات کی اہمیت ہے کہ ملزم کی بے گناہی پر غیر متعلق افراد کس انداز میں شہادت پیش کرتے ہیں؟ اگر آپ کا معیارِ شہادت یہی ہے تو پھر پورا ہندوستان، قطب کی معصومیت پر گواہی دے رہا تھا۔ مگر بدقسمتی سے آپ ان آوازوں کو سننے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے انتہائی تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''یہ تمام لوگ قطب الدینؒ کے عقیدت مند ہیں اور عقیدت، انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔'' قاضیٔ عدالت نے دوسرا اعتراض اُٹھایا۔ ''عقیدت میں انسان بہرا بھی ہو جاتا ہے۔ اُس میں اپنے ممدوح کے خلاف کوئی بات سننے

کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ گواہیاں ان لوگوں کی قبول کی جاتی ہیں جو غیر جانبدار ہوتے ہیں۔''

''آپ کا نقطۂ نظر مجہول ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے قاضیٔ عدالت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ ''شہادت کے لئے پیش ہوتے وقت صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ گواہ صادق القول ہے یا کاذب؟ سود خور ہے یا رزقِ حلال کھانے والا؟ صراطِ مستقیم پر چلنے والا ہے یا گم کردہ راہ؟ اپنے دل میں خوفِ خدا رکھتا ہے یا دنیا کی ہوس؟ بدمعاملہ ہے یا امانت دار؟'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اسلامی عدالت میں پیش ہونے والے ایک گواہ کی صفات اس طرح بیان فرما رہے تھے کہ پورے دربار پر سناٹا طاری تھا۔

ایک مردِ کامل کی جرأتِ گفتار دیکھ کر قاضیٔ عدالت کے چہرے کا رنگ اُڑا جا رہا تھا۔ اُس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اہلِ دربار کی نظروں میں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی باتوں کو جھٹلانے لگا۔ ''میں فقہ کا عالم ہوں اور اسلامی قانون کی باریکیوں کو خانقاہ کے گوشے میں بیٹھنے والے درویش سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔'' علمِ ظاہری کے خمار نے قاضیٔ عدالت کے ہوش و حواس چھین لئے تھے اور وہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ایک عام خرقہ پوش انسان سمجھ کر گفتگو کر رہا تھا۔ اور اس کی لاف زنی کو دیکھ کر سلطان شمس الدین التمش اور بیشتر درباریوں کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے تھے۔ مگر عدالت کے احترام میں کسی ایک شخص نے بھی اپنے ہونٹوں کو جنبش نہیں دی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تو اس مزاج کے انسان ہی نہیں تھے۔ آپؒ نے قاضیٔ عدالت کی تلخ بیانی کو ایک دلنواز تبسم کے ساتھ نظرانداز کرتے ہوئے فرمایا۔ ''بے شک! آپ اسلامی قانون کا بہت زیادہ علم رکھتے ہیں۔ اگر آپ میں قانون دانی کی یہ غیر معمولی صفت موجود نہیں ہوتی تو پھر کرسیٔ عدالت پر کس طرح جلوہ افروز ہوتے؟'' یہ کہہ کر حضرت سلطان الہندؒ نے قاضی کی طرف غور سے دیکھا مگر اس کے چہرے پر شرمساری کی ہلکی سی علامت بھی نمایاں نہیں تھی۔ منصبِ قضا کے عہدے پر فائز ہونے کے احساس نے اس کے سر کو کچھ اور بلند کر دیا تھا۔

''اگر آپ قطبؒ کی گواہی کو اہمیت نہیں دیتے تو پھر عورت کی طرف سے چار گواہ پیش کریں جو اس کو خانقاہ کے ایک گوشے میں بیٹھنے والے خرقہ پوش کی غیر شرعی بیوی ثابت کر سکیں۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قاضیٔ عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''جب آپ کی عدالت قطبؒ کے انکار کو تسلیم نہیں کرتی تو پھر اس عورت کے تنہا اقرار کو مقدمے کی بنیاد کیوں بنایا جا رہا ہے؟'' حضرت سلطان الہندؒ نے ایک عقلی اور مذہبی دلیل پیش کی جسے سن کر اہلِ دربار حیران رہ گئے اور قاضی بھی سراسیمگی کا شکار نظر آنے لگا۔

''عورت کے گواہ عدالت میں موجود ہیں۔'' قاضی نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''پھر اُنہیں تمام حاضرین کے سامنے پیش کیا جائے۔'' خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اصرار کیا۔ ''جب تم لوگوں نے ایک مردِ خدا کو تماشا بنا ہی دیا ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس شہر کے دوسرے پارسا بھی بے نقاب ہو جائیں۔'' اب حضرت سلطان الہندؒ کے لہجے سے جلال ظاہر ہونے لگا تھا۔

''عورت کے دعوے کی صحت پر گواہی دینے والے عدالت کے سامنے حاضر ہوں۔'' قاضی نے دربار کی پچھلی صفوں پر نظر ڈالتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے صدر دروازے کے قریب سے چار تنومند افراد اٹھے اور دبے قدموں سے چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ اہلِ دربار نے ان لوگوں کو دیکھا۔ وہ اپنے لباس سے درمیانی طبقے کے لوگ نظر آتے تھے مگر ان کے

چہروں پر سختی اور بے رحمی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ چاروں قاضیٔ عدالت کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔

ابھی قاضی ان سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ گواہوں سے مخاطب ہوئے۔

''تم یہ بات کس طرح کہتے ہو کہ مدعی عورت، قطبؒ کی غیر شرعی بیوی ہے اور یہ بچہ اس کی غیر قانونی اولاد؟''

حضرت سلطان الہندؒ کی آواز سن کر ایک بار پھر دربار پر سناٹا طاری ہو گیا۔

مقدمہ تیزی سے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا اور حاضرین اس الزام تراشی کا منطقی نتیجہ جاننے کے لئے بے قرار تھے۔

چاروں گواہوں نے بیک وقت حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھا اور ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا۔

''بتاؤ کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے اس عورت کا کیا رشتہ ہے؟'' قاضیٔ عدالت نے گواہوں سے سخت لہجے میں کہا۔ گواہوں کی مایوس نگاہیں پلٹیں اور چاروں آدمی قاضی کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ ان کے لئے اجنبی ہو یا پھر اس کی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

''تم بولتے کیوں نہیں؟'' قاضیٔ عدالت کا لہجہ مزید سخت ہو گیا تھا۔

گواہوں کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کبھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور کبھی قاضی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان سے بیان دینے کے سلسلے میں مسلسل کہا جا رہا تھا لیکن وہ اب تک اپنی زبانوں سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکے تھے۔ اہلِ دربار نے دیکھا کہ گواہوں کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ان کی قوتِ گویائی سلب کر لی گئی ہو۔ سلطان شمس الدین التمش سے لے کر ایک ایک درباری تک، سب کے سب حیران تھے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جن لوگوں کو اس قدر طمطراق اور یقین کے ساتھ بطور گواہ پیش کیا گیا تھا، ان کی زبانیں اس طرح گنگ ہو جائیں گی۔

''بولو! اب مجبوریوں پر گواہی دو۔'' ناگہاں وہ عورت سرِ دربار چیخنے لگی۔ ''عدالت کو بتاؤ کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اس مظلوم بچے کے باپ ہیں۔'' عورت ان گواہوں کو مخاطب کر کے دردناک لہجے میں فریاد کر رہی تھی۔

''تم تو سارے حالات سے آشنا ہو۔ پھر تمہیں کیوں چپ لگ گئی ہے؟ کیا اس دنیا میں ایک ستم رسیدہ عورت کا کوئی پرسان حال نہیں؟ کیا ایک شخص کے تقدس کا بھرم رکھنے کے لئے انصاف کے تمام تقاضوں کو پامال کر دیا جائے گا؟'' گواہوں کو خاموش دیکھ کر عورت پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اور اس کی گریہ وزاری سے پورا دربار گونجنے لگا تھا۔

''خاتون!'' دفعتہً دربار میں سلطان شمس الدین التمش کی آواز اُبھری۔ ''ہم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے دعوے سے ہندوستان کی ایک عظیم مذہبی شخصیت شدید بدنامیوں کی زد میں آ جائے گی، تمہیں انصاف فراہم کرنے کی پوری کوشش کی۔ مگر آج صورتِ حال یہ ہے کہ تمہاری مظلومیت پر گواہی دینے کے لئے ایک شخص بھی موجود نہیں۔'' یہ کہتے کہتے سلطان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

''ظلِ الٰہی!'' عورت خوف سے کانپنے لگی۔ ''یہ لوگ جو کل تک چیخ چیخ کر میرے حق میں گواہیاں دے رہے تھے، آج رعبِ شاہی نے ان کی زبانوں پر مُہر لگا دی ہے۔'' عورت کے بہتے ہوئے آنسو رُک گئے تھے اور اب وہ نئے انداز میں اپنی وکالت کر رہی تھی۔ ''گواہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سلطان کو قطب الدین بختیار کاکیؒ سے کیا نسبت ہے۔ اسی نسبت نے ان کی قوتِ گویائی چھین لی ہے۔ وہ ظلِ الٰہی کے پیر و مرشد کے خلاف کس طرح

گواہی دے سکتے ہیں؟ انہیں اپنے انجام سے ڈر لگتا ہے۔ اگر قاضیٔ عدالت ان سے تنہائی میں بیان لیں تو یہ سب کچھ بتا دیں گے۔" عورت نے اپنی ذہانت سے مقدمے کو نیا رخ دینے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں ظلِ الٰہی! میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ جلالِ شاہی نے اُنہیں خوف زدہ کر دیا ہے۔" جیسے ہی عورت کی گفتگو ختم ہوئی، قاضیٔ عدالت بول پڑا۔ اہلِ دربار ایک منصف کی اس حرکت پر چونک اُٹھے۔ اب بیشتر لوگوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ قاضیٔ عدالت اس مقدمے میں جانب داری سے کام لے رہا ہے۔

"سچائی کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتی۔" سلطان شمس الدین التمش غضب ناک ہو گیا۔ "اگر فرماں روائے وقت بھی کوئی جرم کرتا ہے تو لوگوں کو پوری صداقت کے ساتھ گواہی دینی چاہئے۔ جب ایک معزز ترین انسان پر سرِ دربار اتنا گھناؤنا الزام عائد کیا گیا ہے تو مقدمے کی کارروائی بھی سب کے سامنے ہو گی۔ اگر یہ چاروں گواہ جھوٹے ثابت ہوئے تو انہیں تہمت طرازی کے جرم میں سخت ترین سزا سے گزرنا ہو گا۔" یہ کہہ کر سلطان شمس الدین التمش خاموش ہو گیا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ التمش کا یہ اعلان سنتے ہی تمام گواہوں کے چہرے اس طرح زرد ہو گئے تھے، جیسے وہ اپنے عقب میں موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سن رہے ہوں۔ ایک بار پھر ان چاروں نے پوری توانائی کے ساتھ بولنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ابھی یہ اذیت ناک کشمکش جاری تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو اُن بدنصیب انسانوں پر رحم آ گیا۔

"سلطان! یہ زرخرید غلام مجبور ہیں۔ ان کی زبانوں نے ہمیشہ کے لئے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔"

"سیّدی! پھر یہ مسئلہ کس طرح حل ہو گا؟" سلطان شمس الدین التمش نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے عرض کیا۔

"جس ذاتِ بے نیاز نے اپنے عاجز بندے معین الدینؒ کو اس ضعیفی کے عالم میں اجمیر سے دہلی تک پہنچایا ہے، وہی اس نازک مقام پر بھی دست گیری کرے گا......" سلطان التمش کے سوال کا جواب دے کر حضرت خواجہ غریب نوازؒ، قاضیٔ عدالت سے مخاطب ہوئے...... "بے شک! آپ کا علم وسیع ہے...... مگر دل و دماغ کشادہ نہیں ہیں۔ اسلامی قانون کے مطابق منصف کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ مقدمے کے دوران آخری لمحے تک غیر جانب دار رہے۔ میں اس کا گلہ نہیں کرتا کہ آپ نے قطبؒ سے حُسنِ ظن نہیں رکھا۔ مجھے شکایت ہے کہ آپ نے ایک مردِ حق سے بدگمانی کی۔ ثبوت طلب کرنا یقیناً انصاف کا تقاضا ہے۔ مگر الزام تراشی کرنے والوں کو سہارا دینا عدل کا خون ہے......"

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی حقیقت بیانی سے قاضیٔ عدالت کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے دفاع میں کسی بہانہ سازی سے کام لیتا، حضرت سلطان الہندؒ نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے فرمایا۔ "اب ساری وضاحتوں کا وقت گزر چکا۔ عدالت کا یہ فرضِ اوّلین تھا کہ وہ اپنے ذرائع سے دونوں فریقوں کے بارے میں تحقیقات کراتی۔ اسے اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ مقدمے کی کارروائی سے پہلے اس حقیقت کا ادراک ضروری تھا۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ لوگ اپنے انجام سے اس قدر بے پروا ہو گئے ہیں کہ پارساؤں کے لباس کو داغ دار کرتے وقت اُنہیں جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ میں یہاں کچھ ایسے چہرے بھی دیکھ رہا ہوں جو قطبؒ کی رُسوائی پر مطمئن نظر آتے ہیں۔ لیکن اہلِ دنیا کا یہ اطمینان بہت عارضی ہے۔ اُنہیں معلوم نہیں کہ آنے والے لمحے اُن کے سکون کو غارت کر کے رکھ دیں گے۔ لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ قطبؒ اپنی بے

گناہی ثابت کرنے سے قاصر ہے۔ افسوس! یہ وہ راز نہیں جانتے کہ میرا خدا، قطبؒ کو کسی کی گواہی کا محتاج نہیں کرے گا۔''

یہ کہہ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اُس عورت کی طرف دیکھا جو بے کسی کا مجسمہ بنی سرِ دربار کھڑی تھی۔

''خاتون! اس بچے کے چہرے سے چادر ہٹا دو۔'' حضرت سلطان الہندؒ نے مدعی عورت سے فرمایا۔ ''تمہارا بچہ خود اہلِ دربار کو بتا دے گا کہ اُس کا باپ کون ہے؟ تمہیں اب مزید انتظار کی زحمت برداشت نہیں کرنی پڑے گی۔''

جیسے ہی حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، پورے دربار پر سکوتِ مرگ طاری ہو گیا۔ ہر شخص حیرت زدہ تھا اور اُسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ خود عورت بھی چند لمحوں کے لئے کسی پتھر کی طرح ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔

پھر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ڈرتے ڈرتے کہنے لگی۔ ''یہ دو ماہ کا شیر خوار بچہ کس طرح بولے گا؟'' کسی نامعلوم خوف کے اثر سے عورت کی آواز کانپ رہی تھی۔

''آج اس کے بولنے کا دن ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے جواباً فرمایا اور پھر قاضیٔ عدالت سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''آپ کی عدالت میں یہ معصوم گواہ موجود ہے۔ کیا قانون اس کی شہادت قبول کر لے گا؟''

حضرت سلطان الہندؒ کا سوال بڑا عجیب تھا۔

''شہادت تو بہت دُور کی بات ہے، یہ بچہ بولے گا کس طرح؟'' قاضی کی زبان میں پیدا ہونے والی لکنت صاف محسوس ہو رہی تھی۔

''جس نے بچے کو پیدا کیا ہے، وہی اپنے ایک بندے کی خاطر اسے قوتِ گویائی بھی عطا کرے گا۔'' آج اجمیر کا ایک خرقہ پوش اس طرح بول رہا تھا کہ علمائے ظاہری کی عقل ٹھوکریں کھا رہی تھی اور فرطِ حیرت سے آنکھوں کی پُتلیاں کانپ رہی تھیں۔

''مگر یہ سب کچھ خلافِ فطرت ہے۔'' اب قاضیٔ عدالت کی آواز کی لرزش پہلے سے زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔

''اللہ ہر شے پر قادر ہے۔'' حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے فرمایا۔ ''فطرت بھی اُس کے حکم کی تابع ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے، اپنا حکم نافذ کرتا ہے۔ آپ قدرت کے رازوں کو سمجھنے کے بجائے اس بچے سے اس کے باپ کا نام و نشان دریافت کریں۔''

اب قاضیٔ عدالت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ کرسیٔ انصاف سے نیچے اُتر آئے اور اپنی زندگی کے ایک ناقابلِ بیان مرحلے سے گزرنے کی کوشش کرے۔ ابھی وہ ذہنی کشمکش کا شکار تھا کہ اچانک سلطان شمس الدین بول پڑا۔

''آپ سلطان الہندؒ کی بات پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ انصاف کی تلاش میں منصف کو تو جان لیوا راستوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ پھر یہ تو ایک آسان مرحلہ ہے۔'' والیٔ ہندوستان کی مداخلت نے قاضی کو کرسی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ناگوار انداز میں انصاف کی مسند سے نیچے اُترا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا عورت کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے کہنے پر عورت نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے بچے کا منہ کھولا۔ وہ ایک خوب صورت بچہ تھا جو بہت دیر سے اپنی ماں کی آغوش میں سو رہا تھا۔ اور اُسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ اُس کی پیدائش کے سبب دہلی میں کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے۔ جیسے ہی دربار کی روشنی چہرے پر پڑی، اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور رونے لگا۔

"یہ رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔" قاضیٔ عدالت کا لہجہ تمسخر آمیز تھا۔

"آپ اس سے اس کے باپ کا نام پوچھیں۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے قاضی کے تضحیک آمیز روّیے کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

قاضی بادل ناخواستہ بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے جراً تیز آواز میں پکار کر کہا۔ "بچے! کیا تُو اپنے باپ کا نام جانتا ہے؟"

اہلِ دربار اپنی نشستوں پر ساکت ہو گئے تھے اور اُن کی سماعتیں، بچے کا جواب سننے کی منتظر تھیں۔ مگر بچے پر قاضی کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور روتا رہا۔ قاضی نے دوسری بار اور پھر تیسری بار اپنا سوال دہرایا۔ لیکن جواب میں بچے کی ہلکی ہلکی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ قاضیٔ عدالت جو چند لمحوں کے لئے وحشت زدہ ہو گیا تھا، مطمئن نظر آنے لگا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ تھی۔ اور وہ بار بار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے سلطان الہندؒ کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہہ رہا ہو کہ اتنے کمسن بچے بات نہیں کرتے۔ چاہے کوئی شخص اپنی کرامت کا سہارا لے لے، مگر یہ ممکن نہیں ہے۔

بچہ مسلسل رو رہا تھا۔ اب عورت کی وحشت بھی ختم ہو گئی تھی اور وہ حسبِ سابق بے باک انداز میں سلطان شمس الدین سے کہہ رہی تھی۔

"ظلِ الٰہی! کب تک ایک مجبور عورت کا اس طرح مذاق اُڑایا جائے گا؟ میں پہلے ہی بہت تماشا بن چکی ہوں۔ اب اس جانِ حزیں پر کرم کیجئے اور عدالت کو حکم دیجئے کہ وہ مجھے مزید تماشا نہ بنائے۔" عورت نے ایک بار پھر اپنے دردناک لہجے سے عدالت کو متاثر کرنے کی کوشش کی تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ سلطان شمس الدین التمش، عورت کی فریاد کا کوئی جواب دیتا، حضرت خواجہؒ معین الدین چشتیؒ کی پُر جلال آواز اُبھری۔ "بچے! خاموش ہو جاؤ۔" کچھ دیر پہلے دربار میں جو ہلچل پیدا ہوئی تھی، وہ اچانک ختم ہو گئی۔ پھر اہلِ دربار نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ بچہ جو اپنی ماں کی آواز سن کر بھی خاموش نہیں ہوا تھا، وہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے پکارتے ہی چپ ہو گیا۔

"اے بدنصیب روح! تیرے ماں باپ نے تیری معصوم جان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا وقت تجھے کس نام سے یاد کرے گا۔" حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اس طرح باتیں کر رہے تھے، جیسے وہ شیر خوار بچہ آپ کی گفتگو کا مفہوم سمجھ رہا ہو۔ پھر سلطان الہندؒ نے قاضیٔ عدالت اور فریادی عورت کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر پریشان نظر آنے لگے۔ اچانک حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے دربار کی چھت پر نظر ڈالی۔ انداز ایسا ہی تھا، جیسے آپؒ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ مگر درمیان میں سرخ پتھر حائل تھے۔

"خدایا! تُو اپنے بندوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ اذیت ناک حقیقت دنیا پر ظاہر نہ ہو۔ مگر تُو علیم و خبیر ہے کہ کچھ عاقبت نااندیش لوگوں نے میرے اور قطبؒ کے لئے عافیت کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ خداوندا! تیرا یہ عاجز بندہ معین الدین تجھ سے رحم اور معافی کا طالب ہے۔"

حضرت سلطان الہندؒ نے یہ مختصر سی دعا مانگی اور پھر بچے کے بہت نزدیک آ گئے۔ اہلِ دربار کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں۔ جو لوگ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مقامِ روحانی سے ذرا بھی واقف تھے، اُن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اب چند لمحوں بعد کوئی عجیب و غریب واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت سلطان الہندؒ نے اپنا دایاں ہاتھ بچے کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ پھر نہایت محبت آمیز

لہجے میں فرمایا۔

''اے جانِ معصوم! تُو بے قصور ہے۔ ہر شخص کو اپنے گناہوں کا بوجھ اُٹھانا پڑے گا۔ میں تجھے تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا، مگر تیرے ماں باپ نے ایک ایسے شخص پر تہمت لگائی ہے، جو مجھے رُوئے زمین پر سب سے زیادہ عزیز ہے۔ تجھے کیا پتہ کہ میں کتنی راتوں سے بے خواب ہوں۔ میری بے قراریوں کی طرف دیکھ اور قاضی عدالت کو، اہلِ دربار کو اور اُن لوگوں کو جو قطبؒ کی رُسوائیوں پر جشنِ مسرت منارہے ہیں، اپنے باپ کا نام بتادے۔''

حضرت معین الدین چشتیؒ کی پُر جلال آواز اُبھری اور لوگوں کے دلوں میں اُترتی چلی گئی۔ لوگوں کی آنکھیں گردش کرنا بھول گئی تھیں۔ ہونٹ ساکت تھے اور چہروں پر حیرت کے سائے لرز رہے تھے۔

''السلام علیکم سلطان الہند!'' دفعتہً دربار میں بچے کی باریک سی آواز سنائی دی۔ لوگ شدید اضطراب میں اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہوگئے۔ اُنہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا مگر یہ زندہ حقیقت تھی کہ دو ماہ کا بچہ نہایت صاف لہجے میں بول رہا تھا۔

ایک ثانیے کے لئے دربار پر گہرا سکوت چھا گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے بچے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''میرا باپ سلطان شمس الدین التمش کے دربار کا ایک معزز سردار ہے۔'' یہ کہہ کر اُس شخص کا نام بتا دیا اور خاموش ہوگیا۔

اس انکشاف کے بعد دربارِ شاہی میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ عورت پر اس قدر لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکی۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر فرش پر گرتی، حضرت خواجہؒ کے دستِ کرم نے اُسے سہارا دیا اور وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک دربار میں موجود لوگوں کو وحشت زدہ انداز میں دیکھتی رہی، اور پھر بے ہوش ہوگئی۔

پھر لوگوں نے حضرت قطبؒ کی طرف دیکھا جو بہت دیر سے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ جب قدرت نے آپؒ کی بے گناہی کے لئے غیب سے ایک عجیب و غریب ثبوت فراہم کر دیا تو بے اختیار پیر و مرشد کے سینے سے لگ گئے اور اتنا روئے کہ آپؒ کی ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ بڑا رقت آمیز سماں تھا۔ تمام اہلِ دربار رو رہے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ بھی آبدیدہ ہوگئے۔ پھر سلطان الہندؒ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

''فرزند! یہ آزمائشیں تو ہمیشہ سے اہلِ ایمان کا مقدر رہی ہیں۔ تم خوش نصیب ہو کہ وقت کی عدالت میں معصوم ٹھہرے۔ مگر یہاں کچھ جاں سوختہ عشاق ایسے بھی گزرے ہیں، جو دنیا کی بخشی ہوئی تہمتوں کو اپنے کفن میں سجا کر زمانے سے رخصت ہوگئے۔ اب اُن کے مقدمات کا فیصلہ میدانِ حشر میں ہوگا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارا مجرم اسی دربار میں موجود ہے۔ ورنہ تم اس سیاہ کار دنیا میں کس سے انصاف مانگنے جاتے؟'' یہ کہہ کر سلطان الہندؒ نے حضرت قطبؒ کو علیحدہ کیا اور پُر جلال لہجے میں دوبارہ فرمایا۔ ''فرزند! انتظار کرو۔ ابھی خدا کچھ اور چہروں کو بھی بے نقاب کرے گا۔''

اب لوگوں کی نظریں اُس معزز سردار کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، جو قیمتی خلعت پہنے ہوئے دربار کی سب سے اگلی صف میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ احساسِ جرم کے پسینے میں تر تھا۔ اس سے پہلے کہ سلطان شمس الدین التمش اُس سے کوئی جواب طلبی کرتا، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور عجیب مجذوبانہ انداز میں بڑبڑاتا ہوا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرف بڑھا۔

''دنیا مجھے وادیٔ اجل میں لے گئی۔ ہوس نے میری سانسیں غصب کر لیں۔ پھر میرے نفس نے مجھے ہلاک کر

دیا۔ آنکھیں بھی ظلمت اسیر، دل میں بھی اندھیرا۔ اے روشنی! میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟''

لوگ سمجھ رہے تھے کہ سردار ہوش میں نہیں ہے۔ مگر حقیقتاً وہ بہت با ہوش تھا۔ لرزتے قدموں سے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نزدیک پہنچا اور پھر آپؒ کے پائے مبارک پر سر رکھ کر رونے لگا۔

''شاہا! میری روشنی تیرے پیروں سے اُڑنے والے گرد و غبار میں پوشیدہ ہے۔ مجھے کچھ دیر اپنے قدموں میں پڑا رہنے دے کہ شاید اس گداگر کو سورج کی چند کرنیں بھیک میں مل جائیں۔'' سردار کی آواز بہت اثر انگیز تھی۔ مجرم ہونے کے باوجود اُس کا طرزِ گفتار اہلِ دربار کو متاثر کر رہا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سردار کو محبت آمیز نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے نحیف ہاتھوں سے سہارا دے کر اُسے زمین سے اُٹھایا۔

''اہلِ دہلی پر قیامت نازل کرنے کے بعد روشنی کی تلاش میں گھر سے نکلا ہے؟'' حضرت خواجہؒ کے ارشاد سے قبل ہی سلطان شمس الدین التمش بول پڑا۔ لوگوں نے دیکھا کہ فرماں روائے ہند کا پورا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ ''تجھے معلوم ہے کہ تیری تہمت طرازی سے اہلِ دہلی کا کیا نقصان ہوا ہے؟ لوگ عظیم الشان مذہبی شخصیات کے بارے میں بھی اعتبار کھونے لگے ہیں۔ اس زیاں کا حساب کون دے گا؟''

''اہلِ دہلی کبھی خسارے میں نہیں رہے۔'' سردار نے سلطان التمش کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ ''اے ذاتِ والا حشم! یہ میرا ہی گناہ ہے کہ جس نے لوگوں کو مزید دولتِ یقین بخشی ہے۔ اگر مجھ سے اس جرم کا ارتکاب نہ ہوتا تو حضرت خواجہؒ کی یہ کرامت بھی ظاہر نہ ہوتی۔ اکثر لوگ معرفت کے سمندر کی کچھ گہرائیوں سے ناواقف ہی رہ جاتے۔'' سلطان التمش کے غضب ناک ہونے کے باوجود سردار کے چہرے پر خوف و ہراس کا ہلکا سا نشان بھی نہیں تھا۔

''کیا حضرت خواجہؒ کی تعریف و توصیف اس لئے ہے کہ تجھے اپنے سر پر موت سایہ فگن نظر آ رہی ہے؟'' والیٔ ہندوستان کے لہجے میں بدستور قہر و نفرت کی آگ برس رہی تھی۔ ''اس سے پہلے تیری زبان کیوں مفلوج ہو گئی تھی؟ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی انہی کے خلیفۂ اکبر ہیں۔ جب کسی مردِ حق کی برگزیدہ شخصیت تہمتوں کی آندھیوں کی لپیٹ میں تھی، اُس وقت تُو نے اقرارِ جرم کیوں نہیں کیا؟'' سلطان التمش کی قہر آلود آواز سے پورا دربار گونج رہا تھا۔

''سلطان ذی جاہ! میں موت سے نہیں ڈرتا۔'' سردار نے انتہائی بے باک لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے درباری علماء نے کہا تھا کہ خانقاہوں میں بیٹھنے والے یہ درویش عملی زندگی سے دُور ہوتے ہیں۔ یہ خرقہ پوش پہلے جاہل اور توہم پرست انسانوں کے کمزور دماغوں کو متاثر کرتے ہیں، پھر اُنہی بے نظر لوگوں کی عقیدت کے سہارے یہ اپنی مسندوں کو آراستہ کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ضرورت مند دنیا اُن کے گرد جمع ہونے لگتی ہے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی ایک ایسے ہی بے عمل درویش ہیں جن کے نظامِ خانقاہی سے اسلام کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا تھا کہ سلطانِ معظم، صوفیوں کے حلقۂ اثر میں آ چکے ہیں اور اب درپردہ ہندوستان پر انہی خرقہ پوشوں کی حکومت ہو گی۔ جس کے نتیجے میں حضرت قطبؒ سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے اپنے عہدوں سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ یہ اہلِ اقتدار کے لئے ایک بھیانک خبر تھی۔ میں اپنے جہل کے باعث ان باتوں کی حقیقت کو نہ سمجھ سکا۔ دولت و اقتدار کے نشے نے مجھے یہ توفیق بھی نہیں بخشی کہ میں خود حضرت قطبؒ کی خانقاہ میں حاضر ہو کر ان افواہوں کی تصدیق کرتا۔ آخر میرے نفس نے مجھے کھلا فریب دے دیا اور میں ہوس کی آندھیوں میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ پھر حضرت قطبؒ کی بے داغ شخصیت کو

آلودہ کرنے کے لئے ایک ناپاک منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ اس سازش میں کچھ علمائے وقت اور اربابِ اختیار شامل تھے۔ لیکن میں اس منصوبے میں نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔ سلطانِ ذی حشم کے دربار میں ایک بااثر شخص ہونے کی وجہ سے مجھے پورا یقین تھا کہ میرے خلاف کوئی زبان بھی جنبش نہیں کر سکے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے درویشوں کے عقیدت مندوں سے یہ بھی سنا تھا کہ خانقاہوں میں بیٹھنے والے روشن ضمیر ہوتے ہیں۔ مجھے اس غیر فطری بات پر یقین نہیں آتا تھا، ایک انسان پسِ دیوار کس طرح دیکھ سکتا ہے؟ جب حضرت قطبؒ پر الزام تراشی کی گئی اور وہ بہت دن تک اپنی اس بے گناہی کا ثبوت پیش نہیں کر سکے تو درویشوں کی روشن ضمیری سے میرا اعتبار اُٹھ گیا اور پھر اس منصوبے کے تمام شرکاء یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ حضرت قطبؒ کی روحانی عظمتوں کا مینار ہمیشہ کے لئے منہدم ہو چکا ہے۔ مگر حضرت خواجہؒ کی چشمِ گرہ کشا نے عقل کے تمام طلسمات کو تار تار کر دیا۔ اب روشن ضمیری کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟'' یہ کہہ کر سردار، حضرت قطبؒ کی طرف مڑا۔

''میں آپ کا مجرم ہوں۔ اسلامی شریعت نے تہمت طرازیوں کے لئے جو سزا مقرر کی ہے، مجھے اس سے زیادہ سخت سزا دی جائے تاکہ میرے بعد آنے والے، عبرت حاصل کر سکیں۔'' سردار کی آواز سے کسی قسم کی دہشت نمایاں نہیں تھی۔ پھر بھی اس کا لہجہ اثر انگیز تھا۔ ''میں اپنے جرم کی سزا بھگتنے سے پہلے شہنشاہِ معرفت سے درخواست کروں گا کہ مجھے اپنے دستِ مبارک کو بوسہ دینے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ میرا جرم تو اتنا سنگین ہے کہ مجھے اس میں رعایت اور معافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب میرے لئے یہی ایک امر باعثِ تسکین ہو گیا کہ ایک مردِ خدا کے جسم کو چھولوں اور اگر زندہ بچوں تو تمام عمر اس اعزاز پر فخر کروں۔'' یہ کہہ کر سردار نے درخواست گزار نظروں سے حضرت قطبؒ کی طرف دیکھا۔ حضرت قطبؒ جو کچھ دیر پہلے بہت اُداس نظر آ رہے تھے، اب آپؒ کے ہونٹوں پر وہی جاں فزا تبسم لوٹ آیا تھا۔

اہلِ دربار نے دیکھا کہ اچانک حضرت قطبؒ نے اپنا ہاتھ سردار کی طرف بڑھا دیا اور پھر بڑے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''درویش کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ احترام کی اس رسم کو فروغ دے۔ یہ ایک گمراہ کر دینے والی رسم ہے جس سے انسانی نفس بڑے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے...... فقیر بھی اپنے عقیدت مندوں کے لئے عزت و احترام کے اس مظاہرے کو روا نہیں رکھتا تھا۔ مگر آج تجھے اجازت ہے۔''

جیسے ہی حضرت قطبؒ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، سردار نے بے قرار ہو کر حضرت قطبؒ کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور پھر حاضرینِ دربار نے اُسے ہچکیوں کے ساتھ روتے دیکھا۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک سنگ دل انسان تھا مگر آج رویا تو اس طرح کہ اس کی آنکھوں سے اشکوں کی بارش ہو رہی تھی۔ انسانی فطرت کے اس انقلاب پر تمام اہلِ دربار حیران تھے۔ جب اس کے دل کا غبار دُھل گیا تو وہ سیدھا کھڑا ہوا اور پھر فوراً ہی حضرت قطبؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔ حضرت قطبؒ نے سردار کو اُٹھایا اور پھر نہایت پُرسوز لہجے میں فرمانے لگے۔

''لوگ اپنا کام کر چکے۔ جسے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا اور خدا کو جو کچھ ظاہر کرنا تھا، کر چکا۔'' یہ کہہ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سلطان شمس الدین التمش کی طرف دیکھا۔ ''سلطان! آپ نے اس بوریا نشیں سے حُسنِ ظن رکھا، خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ اور جن لوگوں نے مجھے بے گناہ سمجھا، اُنہیں بھی خدا حُسنِ نیت کا صلہ دے۔ میں نے اس عورت کو بھی معاف کیا جو خوفِ خدا سے بے نیاز ہو کر مجھے بدنام کرتی رہی۔ دربارِ شاہی کا یہ معزز سردار بھی میری نظر میں بے قصور ہے۔ اگر یہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہے تو میں اس کی تالیفِ قلب کے لئے

اسے بھی معاف کرتا ہوں۔ قاضیٔ عدالت کی جانبداری کو بھی میں نظرانداز کرتا ہوں۔ بعض لوگ مجھے اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک خرقہ پوش دنیا داری کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتا۔ اسے اپنی ذات کے محاسبے سے فرصت نہیں ہے، پھر یہ فقیر کسی دوسرے کے حال پر کیا نظر رکھے گا؟ خدا رحیم و کریم ہے، وہ اپنے عاجز بندے، قطب الدین کے گناہوں کو بھی معاف کرے اور انہیں بھی اپنی بے مثال رحمت کے صدقے بخش دے جو اپنے عہدہ و منصب کو دائمی سمجھ کر روزِ حساب کو بھی بھول گئے ہیں۔"

تمام دربار پر گہرا سکوت طاری تھا۔ پھر حضرت قطبؒ نے درباری سردار سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"عورت اور بچے کو ان کے جائز حقوق دے دو۔ بس تم سے میری یہی درخواست ہے۔"

حضرت قطبؒ کی شانِ کریمانہ دیکھ کر سردار پر ایک بار پھر گریہ طاری ہو گیا۔

اس کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ حضرت سلطان الہندؒ کے پیچھے پیچھے اس طرح دربار سے تشریف لے گئے کہ شمس الدین التمش کے ساتھ تمام حاضرین احتراماً کھڑے ہوئے تھے۔ جب یہ دونوں مردانِ حق، شاہی محل سے باہر آئے تو دُور تک راستے کے دونوں جانب بے شمار انسانوں کا ہجوم تھا۔ اس ہجوم میں حضرت سلطان الہندؒ اور حضرت قطبؒ کے عقیدت مند بھی تھے اور وہ تماشائی بھی جو ایک مردِ بزرگ کی رُسوائیوں کا تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر بدخواہوں کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ خدا نے حضرت قطبؒ کی پارسائی کو اہلِ دنیا پر اس طرح ظاہر کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ تو اس مجرم سردار کو معاف کر کے چلے گئے تھے لیکن بعض بااثر درباریوں نے اسے سنگین سزا دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ خود سردار بھی اپنے جرم کے احساس سے بار بار چیختا تھا۔

"مجھے عبرت ناک سزا دو تاکہ آئندہ کوئی بدکار شخص کسی پارسا کی طرف اُنگلی نہ اُٹھا سکے۔ میرے ہاتھ کاٹ دو، زبان قطع کر دو اور منہ کالا کر کے اطرافِ دہلی میں پھراؤ۔ کوچہ کوچہ اعلان کراؤ کہ یہ حضرت قطبؒ کا مجرم ہے اور اس کی یہی سزا ہونی چاہئے تھی۔" احساسِ جرم کی شدت نے سردار کو بہت زیادہ جذباتی بنا دیا تھا۔

سلطان شمس الدین التمش پر لوگوں کا دباؤ بڑھتا رہا لیکن فرمانروائے ہندوستان نے یہ کہہ کر سزا دینے سے انکار کر دیا کہ حضرت قطب اپنے مجرم کو معاف کر چکے ہیں۔

پھر ایک دن حضرت قطبؒ کی خانقاہ کے باہر جمع ہونے والے بہت سے لوگوں نے ایک مرد و عورت کو دیکھا۔ عورت برقعے میں تھی اور مرد اپنی ظاہری حالت سے انتہائی شکستہ حال نظر آ رہا تھا۔ اس کی داڑھی وحشیوں کی مانند بڑھی ہوئی تھی اور سر کے منتشر بال اس کی ذہنی پراگندگی کو ظاہر کر رہے تھے۔ عام لوگ اسے کوئی دیوانہ سمجھ رہے تھے مگر واقفِ حال لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سلطان شمس الدین التمش کے دربار کا وہ معزز سردار تھا، جس نے حضرت قطبؒ کے خلاف سازش کا ایک ناپاک منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس وقت سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ خانقاہ کے اندر موجود تھے۔ دروازے پر خادموں کا پہرہ تھا جو اجازت کے بغیر کسی کو اندر جانے نہیں دیتے تھے۔ وہ اجنبی شخص، عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے دروازے تک آیا اور اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں نے اسے سمجھایا کہ حضرت سلطان الہندؒ کے دربار میں جانے کے لئے کچھ آداب ہوتے ہیں۔

"لوگو! میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوں...... مجھے کچھ خبر نہیں۔" سردار کا لہجہ بڑا دردناک تھا۔ مگر خانقاہ کے خادم آداب کے پابند تھے...... اس لئے ایک شخص نے آگے بڑھ کر ناگوار لہجے میں کہا۔

''یہ کوئی بازار نہیں ہے کہ جب جس کا جی چاہے، منہ اُٹھائے ہوئے چلا آئے۔ابھی کچھ معزز شہری اندر موجود ہیں......وہ رخصت ہو جائیں تو حضرت قطبؒ کے ایما پر تجھے بھی اجازت مل جائے گی۔''

''تب تک تو میری روح بھی خاکستر ہو جائے گی......شاہ کو خبر کرو کہ ایک سوختہ جاں غلام آیا ہے۔'' سردار ہذیانی انداز میں بول رہا تھا۔ خادم اُسے خاموش کرنے کی کوشش کر رہے تھے......مگر وہ ہر شے سے بے نیاز تھا...... یہاں تک کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اس کی آواز سن لی اور پھر سردار کو فوراً ہی اندر طلب کر لیا گیا۔

وہ برقع پوش خاتون کے ساتھ خانقاہ کے اندر داخل ہوا، جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، سلطان الہندؒ اور دوسرے بزرگوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اندر پہنچتے ہی عورت بے نقاب ہو گئی۔ یہ وہی عورت تھی، جس نے اپنے بچے کے حوالے سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر الزام تراشی کی تھی۔عورت زار و قطار رو رہی تھی۔ اس نے حضرت قطبؒ اور حضرت سلطان الہندؒ کے قدموں کو چھونا چاہا مگر حضرت قطبؒ نے عورت کو یہ کہہ کر روک دیا۔

''خاتون! اسلام میں ایک نامحرم عورت کو کسی نامحرم مرد کے جسم کو چھونا قطعاً حرام ہے...... چاہے وہ مرد کوئی مذہبی بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے تم دونوں کو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔ پھر تم لوگوں نے یہاں تک آنے کی زحمت کیوں کی؟''

''شاہ! یہ آپ کے جلال سے ڈرتی تھی۔ مگر میں اسے خدمتِ عالیہ میں لے آیا ہوں۔'' سردار نے انتہائی وارفتگی کے عالم میں کہا۔''یہ آپ کے دستِ حق پرست پر مسلمان ہونا چاہتی ہے۔''

دراصل واقعہ یہ تھا کہ وہ دہلی کے بدنام طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک خوبصورت دوشیزہ تھی، جسے رقص و موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ ایک بار سلطان شمس الدین التمش کے سردار نے کیف و سرور کے عالم میں اسے دیکھا اور دیوانہ ہو گیا۔ پھر اقتدار کی طاقت کے ذریعے اُس نے ہندو دوشیزہ کو داشتہ بنا لیا۔ آج وہ گمراہ اور فتنہ گر عورت، حضرت قطبؒ کے آستانے پر کسی بھکاری کے مانند پڑی تھی۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے یہ درخواست قبول کر لی اور پھر وہ عورت کفر و گناہ کے دائرے سے نکل کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئی۔ اس کے بعد سردار نے خواہش ظاہر کی۔

''شاہا! اس غلام کو ہمیشہ کے لئے اس در پر پڑا رہنے دیا جائے تا کہ وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔''

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے جواباً فرمایا۔''خانقاہ کے بجائے شاہی دربار کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہاں رہ کر پرہیز گاری کی زندگی بسر کرو۔ لوگوں کو نیکی کی دعوت دو، کمزوروں کا سہارا بنو اور بندگانِ خدا کے ساتھ انصاف کرو۔ یہی تمہارے گناہوں کا کفارہ ہے۔ یہی تمہاری عبادت ہے اور یہی تمہاری ریاضت ہے۔'' یہ کہہ کر آپؒ نے اپنے ایک خادم کو فرمانروائے ہندوستان، سلطان التمش کے نام ایک مکتوب تحریر کرنے کا حکم دیا۔

حضرت قطبؒ نے التمش کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔''یہ شخص اپنے گناہوں سے تائب ہو چکا ہے اور میں نے اسے معاف کر دیا۔ آپ بھی اپنے دل میں اس سے کسی قسم کی رنجش نہ رکھیں۔ ہو سکے تو حُسنِ سلوک کے ساتھ پیش آئیں......خدا معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' یہ ایک اور اعزاز تھا جو حضرت قطبؒ کی طرف سے مجرم سردار کو بخشا گیا تھا۔

آخر کچھ دیر بعد وہ بادلِ نخواستہ حضرت قطبؒ کی بارگاہ سے اُٹھا......عورت اُس کے ہمراہ تھی۔ خانقاہ کے

قدموں اور دوسرے لوگوں نے سنا، عورت بڑے والہانہ انداز میں کہتی جا رہی تھی۔
''میں کیسی خوش نصیب ہوں کہ مجھے حضرت قطبؒ کے ذریعے دولتِ ایمان عطا ہوئی ہے۔''
اس کے بعد سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر واپس تشریف لے جانے لگے تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو گلے لگا کر کسی قدر اُداس لہجے میں فرمایا۔ ''فرزند! اگر حق تعالیٰ نے چاہا تو اب میدانِ حشر میں ملیں گے۔''
حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے ان الفاظ نے حضرت قطبؒ کے ساتھ دوسرے خدمت گاروں کو بھی اُداس کر دیا تھا۔ سمجھنے والے سمجھ گئے تھے کہ یہ ان کی حضرت سلطان الہندؒ سے آخری ملاقات ہے۔ سب کی زبانیں خاموش تھیں مگر آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ایک بار پھر راہوں سے غبار اُٹھنے لگا۔ سلطان شمس الدین التمش، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو رخصت کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا اور اُس نے روتے ہوئے عرض کیا تھا۔
''اے روشنی! ہم سیاہ بختوں کے شہر میں کچھ دیر اور قیام کر۔ ہمیں اپنی تاریک بستیوں کو سجانے دے۔ اور دل و دماغ کے بے نور گوشوں کو اپنی معرفت کی ضیاء باریوں سے منور کرنے دے۔''
ایک سلطان شمس الدین التمش ہی نہیں، دہلی کے بے شمار باشندے اپنے دلوں میں شدید خواہش رکھتے تھے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ مستقل طور پر دہلی میں قیام فرمائیں۔ مگر مشیتِ الٰہی میں یہ امر طے پا چکا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی آخری آرام گاہ اجمیر ہی ہوگی۔ اس لئے آپؒ ہزاروں انسانوں کو بے قرار و مضطرب چھوڑ کر واپس تشریف لے گئے۔ مگر جانے سے پہلے حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے اہلِ ایمان کو واضح طور پر سمجھا دیا تھا۔
''خبردار! دنیا کی کسی روشنی کے فریب میں نہ آجانا۔ تمہارے لئے یہ ایک روشنی کافی ہے جو گنبدِ خضریٰ سے نکل کر زمین و آسمان کے بعید ترین گوشوں کو روشن کر رہی ہے۔ ہمیشہ اسی روشنی پر نظر رکھنا۔ پھر نہ تمہارے دل تاریک ہوں گے اور نہ مکان۔''
سلطان الہندؒ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے جانے کے بعد بہت دن تک دہلی کے در و بام آپؒ کی اس کرامت کے ذکر سے گونجتے رہے جس نے حضرت قطبؒ کو عجیب و غریب انداز سے بے گناہ ثابت کیا تھا اور جس سے متاثر ہو کر ہندوؤں نے اپنے ماتھوں پر سجے ہوئے صدیوں پرانے قشقے کھرچ دیئے تھے، زنار کو توڑ کر اس طرح پھینک دیا تھا کہ اب اس کافرانہ رسم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ ہزاروں اہلِ ہند حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ بت پرستوں کے بڑے پجاری اور پروہت وحشت زدہ تھے۔ انہیں اپنے صنم خانوں کی بلند دیواریں زمین بوس ہوتی نظر آرہی تھیں۔ سینکڑوں سال سے فرضی خداؤں کا سہارا لے کر اَن گنت بندگانِ خدا پر اس طرح حکومت کی جا رہی تھی کہ ان کے دل، دماغ، روحیں اور جسم برہمنوں کے پاس رہن رکھے ہوئے تھے۔ آج اس حکومت کی بنیادیں لرز رہی تھیں اور نیم برہنہ پجاری اپنے بدن پر باطل عقائد کی راکھ ملے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔
''لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کہاں جا رہے ہو؟ دیوی کے پرستارو! دیوتاؤں کے پجاریو! تمہیں ایک مسلمان جادوگر نے گمراہ کر دیا ہے۔ ٹھہرو! تمہاری منزل تمہیں پکار رہی ہے۔ آکاش کی طرف دیکھو! تم پر قہر نازل ہونے والا ہے۔ برہما تم سے رُوٹھ گئے ہیں۔ وشنو اور شنکر خفا ہیں۔ کرشن اور رام نے تم سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب تمہارا زمین پر کوئی سہارا باقی نہیں۔ لوٹ آؤ کہ ابھی وقت ہے۔ ہم تمہاری معافی کے لئے دیوتاؤں سے سفارش کریں

گے۔" پجاری مسلسل چیخ رہے تھے۔ پجاری اور جوگی، مسلمان ہو جانے والے ہندوؤں کو پیہم عذاب کی خبریں دے رہے تھے مگر جو ایک بار دیوتاؤں کے حلقے سے نکل گیا، پلٹ کر نہیں آیا۔ دوسرے ہندو بھی اپنے سابقہ ہم مذہبوں کی تقلید میں حضرت قطبؒ کی خانقاہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔

اہلِ ہنود کی صفوں میں عجیب وغریب افراتفری کا عالم تھا۔ عیار برہمنوں نے اسلامی نظریات کو غلط ثابت کرنے کے لئے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو جادوگر کہہ کر پکارا تھا۔ بت پرستوں کا خیال تھا کہ اس الزام تراشی سے جاہل مخلوق اپنے مرکز کی طرف پلٹ آئے گی۔ لیکن جانے والوں نے اپنے روحانی پیشواؤں کی ایک بھی نہیں سنی۔ ہندو معبودوں میں ناقوس زیادہ زور وشور سے بجتے رہے مگر اب لوگ مؤذن کی صداؤں کے منتظر تھے۔ پھر بھی کچھ جذباتی پجاریوں نے جانے والوں کا راستہ روک کر کہا۔

"مسلمان جادوگروں نے تمہارے ہوش وحواس چھین لئے ہیں۔"

جواب میں کہنے والوں نے کہا۔ "تم بھی جادوگری کی کوئی ایسی مثال پیش کر کے ہمارے ہوش وحواس چھین لو۔" بڑا جارحانہ جواب تھا۔ برہمن پجاری اپنے ہم قوموں کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی اس عظیم الشان کرامت کو جادوگری کا نام دینے والے عاجز وقاصر تھے۔ ہندوؤں کے یہاں جادوٹونے اور منتر کی رسم عام تھی مگر وہ حضرت سلطان الہندؒ کے اس مفروضہ جادو کا جواب نہ دے سکے اور شدید بے چارگی کے عالم میں ہندو مذہب کا شیرازہ منتشر ہوتے ہوئے دیکھتے رہے۔

دہلی کے رہنے والے عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ اس روشن دلیل کے بعد حضرت قطبؒ کے مخالفین اپنے لوگ یقیناً شرارتوں سے باز آ گئے تھے۔ لیکن اب بھی چند افراد اپنے فطری حسد کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دراصل یہ علماء کی وہ مخصوص جماعت تھی جو خوشامد کے راستے سے اقتدار کی منزل تک پہنچ گئی تھی۔ پھر ان لوگوں نے برہمن پجاریوں اور عیسائی پادریوں کی طرح اپنی اپنی مسندیں آراستہ کرا لی تھیں اور اب چاہتے تھے کہ خلقِ خدا مذہبی معاملات میں ان کی محتاج رہے۔

جس روز حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، اجمیر روانہ ہوئے، اسی دن مخالفین کے حلقوں میں نئے انداز کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ بعض تنگ دل علماء تو جوشِ اختلاف میں حد سے گزر گئے تھے۔ حضرت خواجہؒ کی روحانی قوتوں کے مظاہرے پر کہنے والوں نے یہاں تک کہا۔

"(معاذ اللہ) یہ شعبدہ بازی ہے۔ پہلے لوگوں کے ہوش وحواس سلب کر لئے اور پھر حاضرینِ دربار سمجھنے لگے کہ دو ماہ کا بچہ گفتگو کر رہا ہے۔ یہ خلافِ عقل بات کس طرح ممکن ہے؟ اسلام میں ایسے روحانی کمالات کی حیثیت نہیں۔ یہ مظاہرے تو ہندو جوگی بھی کر سکتے ہیں۔ اور پھر مسلمانوں کے دین اور کافروں کے مذہب میں کیا فرق باقی رہ گیا؟"

یہ عجیب اذیت ناک صورتِ حال تھی۔ حضرت قطبؒ کے مخالف علماء، کرامت کی حیثیت کو تسلیم کرتے تھے مگر جب یہی کرامت حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ظاہر ہوئی تو تنگ نظر عالموں نے اسے شعبدہ بازی کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کچھ دنوں تک مخالف علماء کی ان فتنہ پردازیوں کو برداشت کرتے رہے، پھر ایک دن آپؒ نے اپنے حلقۂ درس میں موجود ہزاروں انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"لوگو! تم نے مجھ پر الزام تراشیاں کیں۔ میں خاموش رہا۔ پھر تمہاری زبانیں بے لگام ہو گئیں، تم خوفِ خدا

سے بے نیاز ہو کر مجھے ذلیل و رسوا کرنے کے لئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرتے ہوئے گزر گئے۔ میں نے تمہیں شدید عالمِ کرب میں پکارا۔ اپنے روز و شب کے حوالے دیئے۔ تمہارے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کی گواہی پیش کی، مگر تم نے میری ایک نہیں سنی۔ آخر جب اللہ نے مجھے بے گناہ ثابت کر دیا تو تم دوسرے انداز سے میری دل آزاری پر کمر بستہ ہو گئے۔ پہلے مجھے مجرم قرار دیا جا رہا تھا اور اب کہا جا رہا ہے کہ شیر خوار بچے کی گفتگو حضرت سلطان الہندؒ کی شعبدہ بازی کا نتیجہ ہے۔ تم نے میرے پیر و مرشد کی عظیم الشان کرامت کو ہندو جوگیوں کی غیر اسلامی حرکتوں کے مماثل قرار دے دیا۔

''اے بے خبر انسانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہاری محدود عقل، بے پناہ قوتوں کو ایک دائرے میں محصور کرنا چاہتی ہے۔ اللہ تو وہ ہے کہ جس کا ایک اشارہ پتھروں کو بھی گویائی کی صلاحیتیں دے سکتا ہے۔ پھر وہ تو گوشت پوست کا حرکت کرنے والا ایک آدم زاد تھا۔ اس نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے سامنے گفتگو کی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ یہ سلطان الہندؒ کا کمال نہیں، قادرِ مطلق کی خلاّقی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، سرخرو کرتا ہے اور جس چاہتا ہے، ہمیشہ کے لئے ذلت کے تاریک غاروں میں دھکیل دیتا ہے۔ اللہ کو سلطان الہندؒ کی عزت و تکریم منظور تھی، اس لئے انہیں ظاہری سبب بنا دیا گیا۔ بے شک! وہ سرزمین ہند پر اللہ کے محبوب ترین بندے ہیں۔ اللہ ان کی دعاؤں کو ہم سب سے زیادہ سنتا ہے۔ وہ اس بت خانے میں پرچمِ حق لے کر داخل ہوئے ہیں، انہیں اللہ نے ایسے روحانی کمالات سے سرفراز فرمایا ہے کہ جن کا ادراک ہمارے ہوش و خرد سے باہر ہے۔ تم ایک بچے کو موضوع بنا کر سلطان الہندؒ کی عظمتوں سے انکار کر رہے ہو اور ان کی عارفانہ بلندیوں کو پتھر کے پجاریوں کی شعبدہ بازیوں کے ہم منصب قرار دے رہے ہو؟ یہ کیسا ظلم ہے اور کیسی تہمت ہے؟ تم نے اجمیر کے کھنڈرات نہیں دیکھے؟ وہ سونے اور چاندی کے دیوتا، وہ آگ کے پرستار جادوگر، وہ سانپوں کا زہر پینے والے پجاری، وہ بدن پر راکھ مل کر جنگلوں کی خاک چھاننے والے سادھو کہاں گئے؟ اُنہیں تلاش کیوں نہیں کرتے؟ اُن کی بوسیدہ ہڈیوں سے پوچھو کہ تمہارا یہ حشر کیوں کر ہوا؟ اللہ نے ان سب طاغوتی قوتوں کو حضرت سلطان الہندؒ کی دعاؤں سے برباد و ہلاک کیا ہے۔ قادرِ مطلق کی قسم! وہ روحانیت کے بڑے مظاہر ہیں، بڑی کرامات ہیں۔ تم ایک ایسے شخص کے احسانات سے منکر ہو جو تمہارے تاریک مکانوں کو جگمگانے کے لئے دیارِ مدینہ سے روشنی مانگ کر لایا۔ افسوس! تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے، بڑا آزار پہنچایا ہے۔ کاش! سلطان الہندؒ مجھے اپنے ہمراہ لے جاتے اور میں ایسی اذیت ناک باتیں سننے کے لئے یہاں موجود نہ رہتا۔'' یہ کہتے کہتے حضرت قطبؒ آبدیدہ ہو گئے۔

مجلس پر ایک المناک سناٹا طاری تھا۔ حضرت قطبؒ کے عقیدت مندوں میں شدید اضطراب پھیل گیا۔ پھر دہلی کا ایک وارفتہ شوق، لوگوں کے درمیان سے اٹھا اور حضرت قطبؒ سے مخاطب ہو کر عرض کرنے لگا۔

''شیخ محترم! یہ چند ہوس پرست ہیں جو بندگانِ خدا کو گمراہ کرنے کے لئے چیخ رہے ہیں مگر ان کا شور آسمانی فیصلوں کو نہیں بدل سکتا۔ آسمان نے تو آپ کو اور سلطان الہندؒ کو محترم قرار دیا ہے۔ اب اہلِ دنیا کو کتنا بھی ناگوار گزرے۔ کیا آپ ان نفس کے غلاموں کے لئے بے شمار جاں نثاروں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے؟ ہم سلطان الہندؒ اور آپ کے مقامِ معرفت سے واقف نہیں لیکن خدمت گار تو ہیں۔ عشق کی بنیادی رسم سے تو آشنا ہیں۔ حکم دیں تو اپنی جانیں گنوا دیں۔ بس یہی ہے آپ کے غلاموں کی متاع۔ جب بھی حضرت کا اشارہ ہو گا، سرمایۂ حیات لٹا دیں گے لیکن یہ گوارا نہیں کریں گے کہ آپ چند زمانہ سازوں کی باتوں سے بددل ہو کر اپنی محبتوں اور نوازشوں کا

مرکز بدل دیں۔ ہم صرف آپ کے ہیں۔ ہمیں ہمارے گھروں میں قیام کرنے کی اجازت دیں یا اپنے ہمراہ کسی صحرا کی جانب لے چلیں۔ ہمارے لئے دونوں صورتیں یکساں ہیں۔'' اس جاں سوختۂ عشق کی تقریر عجیب تھی۔ ایک ایک لفظ سوزِ محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اہلِ مجلس رونے لگے۔ خود حضرت قطبؒ کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔

''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' حضرت قطبؒ نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے فرمایا۔ ''میں اگر جانا بھی چاہوں تو نہیں جا سکتا۔ پیر و مرشد کا یہی حکم ہے کہ تمہارے درمیان رہوں۔ پھر جب وقت رخصت آئے تو تم مجھے اپنے ہاتھوں سے اسی زمین میں دفن کرو۔ اللہ نے ہر شے کا وقت طے کر دیا ہے۔ کوئی اس کے کھینچے ہوئے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔'' حضرت قطبؒ نے اہلِ دہلی کی تسکین کے لئے چند کلمات ادا کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں اپنی ذات کے لئے کسی سے یہ نہیں کہتا کہ وہ میرے احترام میں گردن جھکائے بیٹھا رہے۔ میں اللہ کا ایک عاجز و گناہ گار بندہ ہوں اور اسی حالت میں اپنے رب کے حضور چلا جانا چاہتا ہوں۔ اس کا شکوہ نہیں کہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ اس کا غم ہے کہ لوگ حضرت سلطان الہندؒ کے مقام سے واقف نہیں۔ اگر بے خبری کا یہ مظاہرہ اہلِ ہنود کرتے تو مجھے بھی کوئی شکوہ نہ ہوتا لیکن یہ سب کچھ ان لوگوں کی طرف سے ہو رہا ہے جو مسندِ علم پر جلوہ افروز ہیں۔ وہ سلطان الہندؒ کے روحانی درجات سے تو آگاہ نہیں مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس مردِ جلیل نے اسلام کی کیا خدمات انجام دی ہیں۔'' یہ کہہ کر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے پھر آپؒ نے انتہائی جذب کے عالم میں فرمایا۔

''خدا نے سلطان الہندؒ کو تمہاری شہادتوں کا محتاج نہیں کیا ہے۔ خواجہ خواجگاں تو وہ ہیں جن کے کارِ عظیم پر آنے والی صدیاں گواہی دیں گی اور اپنی پشت پر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے علم کے یہ تاجر اس طرح بے نشان ہو جائیں گے کہ ان کا کوئی حوالہ باقی نہیں رہے گا۔ لوگ حضرت خواجہؒ کی ایک کرامت پر سرگریباں ہیں یا دیوانوں کی طرح چیخ رہے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ حضرت سلطان الہندؒ کی پوری زندگی ہی کرامت ہے۔''

اہلِ دل بظاہر مطمئن ہو گئے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ ایک اور قیامت ان کی منتظر ہے۔ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جانے والا اس طرح چلا جائے گا۔ شہر دہلی جو صرف اس کے دم سے آباد تھا، اچانک مقبرہ بن جائے گا۔ کسی شخص کو گمان بھی نہیں تھا کہ دہلی کے باشندوں سے یہ حضرت قطبؒ کی آخری ملاقات ہے۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آخری بار دہلی سے اجمیر روانہ ہوئے تھے، اس وقت حضرت قطبؒ کی عمر پچاس سال تھی۔ آج سے آٹھ سو سال پہلے عام انسانی زندگی کا اوسط نوے اور سو سال کے درمیان تھا۔ اس اعتبار سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کو جوان کہا جا سکتا تھا۔ مگر زندگی اور موت کے سلسلے میں قدرت کا ایک نظام ہے۔ آگے جانے والے پیچھے رہ جاتے ہیں اور بعد میں آنے والے بہت پہلے منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ حضرت قطبؒ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ آپؒ ظاہری اعتبار سے مکمل طور پر صحت مند نظر آتے تھے لیکن کسے معلوم تھا کہ زندگی کی آگ کے گرد گہرا دھواں پوشیدہ ہے اور اس توانائی کے پس پردہ ایسی ناتوانی موجود ہے کہ انسان اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا۔

12 ربیع الاوّل 633ھ کی رات کا واقعہ ہے کہ شیخ علی سجستانیؒ کی خانقاہ میں محفلِ سماع منعقد تھی۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی اس محفلِ عرفان میں موجود تھے۔ ایک بزرگ قوال جو خود بھی نہایت پرہیزگار انسان تھے، حضرت شیخ احمد جامؒ کا قصیدہ پڑھ رہے تھے۔ اس محفلِ سماع میں حضرت قطبؒ کے علاوہ دہلی کے دیگر مشائخ بھی

موجود تھے۔ ایک تو حضرت شیخ احمد جامؒ جیسے عظیم صوفی شاعر کا عارفانہ کلام، دوسرے پڑھنے والے کی پُرسوز آواز...... غرض اہلِ مجلس کا عجیب حال تھا۔ دل پگھلتے جا رہے تھے اور جانیں حرف و آہنگ کی جراحت سے ناقابلِ بیان اضطراب میں مبتلا تھیں۔ بس کچھ ایسی ہی کیفیت تھی جیسی حضرت امیر خسروؒ نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے۔

نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائے کہ من بودم

حضرت قطبؒ بہت دیر سے شیخ احمد جامؒ کا طویل قصیدہ سن رہے تھے اور ایک ایک شعر سے لطف اندوز ہو رہے تھے...... مگر جب قوال نے یہ شعر پڑھا تو بے اختیار ہو گئے۔ عشق کی تمام احتیاطیں ختم ہو گئیں اور تکلفات کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں۔

کشتگان خنجر تسلیم را !
ہر زماں از جان دیگر است

(جو لوگ تسلیم و رضا کے خنجر سے قتل ہوئے ہیں، انہیں ہر زمانے میں غیب سے نئی زندگی دی جاتی ہے)

محفل سماع میں موجود دوسرے بزرگوں نے بھی یہ شعر سنا لیکن حضرت قطبؒ کی طرح کوئی اس کی گہرائی اور اثر آفرینی کو نہیں پہنچ سکا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ احمد جامؒ کے اس شعر سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپؒ پر وجد طاری ہو گیا اور پھر سر محفل ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ اس سے پہلے بھی سماع کے دوران حضرت قطبؒ کی حالت غیر ہو جاتی تھی مگر اس بار تو رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی مقتل کی زمین پر لیٹا ہوا ہے اور اسے کسی تیز خنجر سے ذبح کیا جا رہا ہے...... جب دوسرے مشائخ نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا یہ حال دیکھا تو قوال کو اشارہ کر دیا کہ وہ اسی شعر کو بار بار پڑھتا رہے۔ ان بزرگوں کا خیال تھا کہ جب کسی شعر سے انسانی قلب پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اس کو بار بار دہرانے سے ایک مقام وہ آ جاتا ہے کہ ناآسودہ جذبے سکون پانے لگتے ہیں اور مضطرب دل کو آہستہ آہستہ قرار مل جاتا ہے۔ مگر یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ جیسے جیسے قوال کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی، حضرت قطبؒ کے اضطراب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ایک ناقابلِ فہم اذیت سے دوچار تھے۔ ایسی اذیت جو کم ہونے کے بجائے لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور مولانا بدرالدین غزنویؒ، حضرت قطبؒ کو شیخ علی سجستانیؒ کی خانقاہ سے اٹھا کر ان کے گھر لے گئے۔

رات بھر حضرت قطبؒ کی یہی کیفیت رہی مگر جب مؤذن نے فجر کی اذان دی تو حیرت انگیز طور پر حضرت قطبؒ کو ہوش آ گیا۔ آپؒ نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ نماز ادا کی۔ تمام مشائخ، مرید اور عقیدت مند سمجھے کہ جذب کی وہ حالت ختم ہو گئی ہے اور اب حضرت قطبؒ مکمل طور پر پُرسکون ہیں۔ لیکن اس وقت سب لوگ حیران رہ گئے جب نمازِ فجر ادا کرتے ہی دوبارہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ پر بے خودی کی وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس حالتِ جذب سے پہلے حضرت قطبؒ نے شیخ احمد جامؒ کا ہی شعر پڑھا تھا اور پھر آپؒ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ جو آپؒ کے دوست تھے اور مولانا بدرالدین غزنویؒ جو آپؒ کے مشہور خلفاء میں سے تھے، حضرت قطبؒ کی اس کیفیت سے سخت مضطرب تھے۔

پھر ظہر کی نماز کا وقت آیا اور نہایت خشوع و خضوع سے نماز ادا کی۔ اس بار بھی خانقاہ میں موجود لوگوں نے یہی سوچا تھا کہ حضرت قطبؒ کی کیفیتِ جذب ختم ہو چکی ہے۔ مگر نماز ادا کرتے ہی قلبِ مضطرب کا وہی عالم ہو گیا۔ ذہنِ بیدار نے ایک بار پھر ہوش کی دنیا سے تمام رشتے توڑ لئے۔

حضرت قطبؒ کا یہ عرصۂ ہوش و بے خودی تین دن اور تین راتوں پر محیط تھا۔ اس دوران آپؒ نے ساری نمازیں ادا کیں۔ یہ امر اس کی روشن دلیل ہے کہ دنیا کا کوئی بھی با ہوش بزرگ کسی بھی عالم میں نماز ترک نہیں کر سکتا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ بلاشبہ ان صوفیائے کرام میں سے تھے جو آخری سانس تک فرض و سنت کی تکمیل کے لئے پوری قوت کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے۔ بالآخر 14 ربیع الاوّل کو آپؒ ہوش میں آئے اور اپنے ایمان کی گواہی دی۔

''اے اللہ! تُو علیم و خبیر ہے اور بصیر بھی کہ میں نے تیرے سوا کسی کی پرستش نہیں کی۔ تُو شاہد ہے کہ میں تیرا بندۂ حقیر ہوں اور تیرے حبیب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ادنیٰ ترین غلام۔ یہی نسبت میرا سرمایۂ آخرت ہے۔ اسی نسبت کے صدقے میں قطب الدین کے گناہوں کو بخش دے کہ تیری رحمت عالم پناہ ہے۔'' یہ کہتے کہتے حضرت قطبؒ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

دہلی ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ہے جو کئی بار اُجڑا ہے اور کئی بار آباد ہوا۔ اس زمین نے بڑے بڑے مہاراجوں، سلطانوں اور شہنشاہوں کا دور دیکھا ہے۔ اپنے سینے پر نادر روزگار عمارتوں کا بوجھ برداشت کیا ہے۔ مگر آج اس کا حقیقی معمار اپنے کام کی تکمیل کر کے بہت دور جا چکا تھا۔ دیوار و در اُداس تھے، گلی کوچوں میں وحشت برس رہی تھی اور مکان سے شورِ فغاں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ٹھکرائے ہوئے انسانوں کا پرسانِ حال، حاجت مندوں کا کفیل اور بیماروں کا مسیحا اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

کسی نے پکار کر کہا۔ ''اے خاکِ دہلی! قطب کا ماتم کر۔ اب کے تُو ایسی اُجڑی ہے کہ پھر اس شان سے بسانے والا کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔''

بے شک! یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دہلی کی خاک میں بڑے بڑے صوفی، قلندر اور درویش محوِ خواب ہیں مگر ان میں کوئی بھی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے درجے کو نہیں پہنچتا۔

633ھ کا سال ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بڑا گراں ثابت ہوا۔ (اسی سال درویش صفت حکمراں سلطان شمس الدین التمش بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملا تھا) حضرت قطبؒ کی موت سے صرف اہلِ ایمان ہی دل گرفتہ نہ تھے، اہلِ ہنود بھی اسی طرح اُداس نظر آتے تھے، جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز بچھڑ گیا ہو۔ جس طرف بھی نظر جاتی تھی، نظامِ روز و شب درہم برہم نظر آتا تھا۔ بس وہ درباری علماء خوش تھے، جنہوں نے دنیاوی جاہ و حشم کے بدلے اپنی آخرت فروخت کر دی تھی۔

پانچ ماہ بعد مملکتِ ہند اپنے روحانی تاجدار، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بھی محروم ہو گئی ایک تو ضعیفی کا عالم، دوسرے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات کا صدمہ۔ آخر 6 رجب 633ھ کو حضرت سلطان الہندؒ بھی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے...... کہاں پیدا ہوئے...... اور کہاں آسودۂ خاک ہوئے...... اللہ کی خاطر اپنا شہر چھوڑا...... عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کی جدائی برداشت کی۔ دیارِ غیر میں بے شمار تکالیف اُٹھائیں اور کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا کہ جان خطرے میں پڑ گئی۔ مگر آپؒ نے بت خانۂ ہند میں اذان دینا نہیں چھوڑی۔ یہ اسی وفاشعاری اور جاں نثاری کا صلہ تھا کہ ایک درویشِ بے سروساماں ''ہند کا سلطان'' ٹھہرا۔ ایسا سلطان نہیں کہ

مرنے کے بعد جس کے مقبرے میں خاک اُڑتی ہے..... آوارہ کتے اور چمگادڑیں بسیرا کرتی ہیں...... جیسا کہ ایرانی حکمراں شہنشاہ افراسیاب کے بارے میں کسی فارسی شاعر نے کہا ہے ۔

بوم نوبت می زند برگنبد افراسیاب

''شہنشاہ افراسیاب کی زندگی میں بڑے نقارے بجتے تھے...... اور نقیب صدائیں لگاتے تھے...... مگر مرنے کے بعد اس کی گنبد پر اُلّو بولتے ہیں..... یعنی نقارے بجاتے ہیں۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ایسے سلطان تھے کہ آج بھی ہر وقت مزارِ مبارک پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اور اس ہجوم میں صرف مسلمان ہی نہیں، بے شمار ہندو اور سکھ بھی گداگروں کی طرح کھڑے نظر آتے ہیں۔ وہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر، جہانگیر اور اورنگ زیب عالمگیر ہوں... یا ہندوستانی وزیرِاعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اور مسز اندرا گاندھی ہوں..... یا صدرِ پاکستان محمد ضیاء الحق...... بڑے سے بڑا سیاسی رہنما آج بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضۂ مبارک پر حاضری دینے کو اپنے لئے بہت بڑی سعادت سمجھتا ہے۔ بھارت کے سابق صدر اور مشہور ایٹمی سائنس دان عبدالکلام نے بھی صدارت کا الیکشن لڑنے سے پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضۂ مبارک پر حاضری دی تھی ۔

اس کو کہتے ہیں حکومت اور یہ ہے اقتدار
کل بھی تھے سلطانِ ہند اور آج بھی سلطانِ ہند

اب ہم دوبارہ حضرت جلال الدینؒ کے تذکرہ کی طرف لوٹتے ہیں۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ علمائے دہلی کی سیاست سے بیزار تھے۔ اس لئے آپؒ دارالحکومت چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں جانا چاہتے تھے۔ مگر ہر بار حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ یہ کہہ کر آپؒ کو روک لیتے تھے۔

''شیخ! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ہمیں اپنے دیدار سے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہیں؟ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ جب ہم اس دنیا میں نہ رہیں تو آپ بھی دہلی چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔''

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی محبت نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے پیروں میں زنجیر سی ڈال رکھی تھی۔ آپؒ نے کئی بار سامانِ سفر باندھا اور ہر بار حضرت قطبؒ کے اصرار پر اپنا ارادہ بدل دیا۔

کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اس قدر جلد اس دنیا کو خیر باد کہہ دیں گے۔ انتقال کے وقت نہ آپؒ کی عمر اتنی زیادہ تھی اور نہ بظاہر کوئی بیماری۔ مگر جب کسی انسان کا بلاوا آ جاتا ہے تو پھر ظاہری اسباب کی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کسی تیز ہوا کے جھونکے کی طرح چلے گئے۔

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات نے پورے دہلی کو ایک ماتم کدہ سا بنا دیا تھا۔ دارالحکومت کے غریب اور بے سہارا مسلمان، خواجہ قطبؒ سے صرف عقیدت ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اپنا سرپرست بھی سمجھتے تھے۔ گویا دہلی کے تمام مفلس اور نادار لوگوں کا ایک خاندان تھا اور اس خاندان کے تنہا کفیل، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ تھے۔ جس طرح سرپرست کے اُٹھ جانے سے پورا خاندان یتیم اور بے سہارا ہو کر رہ جاتا ہے، اسی طرح حضرت خواجہ قطبؒ کی وفات ان غریب لوگوں کے لئے زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ

بیشتر گھروں کی فضا ماتمی ہو کر رہ گئی تھی۔

حضرت خواجہ قطبؒ کی جدائی سے خود حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا یہ حال تھا کہ ہر وقت روتے ہی رہتے تھے۔

پھر ایک دن حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ، حضرت خواجہ قطبؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے اور نہایت رقت آمیز لہجے میں یہ دعا کی۔

''شیخ! آپ پر اللہ کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں اور حق تعالیٰ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صدقے میں آپ کے روحانی درجات بلند فرمائے۔ بلاشبہ آپ صوفیوں اور درویشوں کی آبرو تھے۔ آپ کے دم سے ان گوشہ نشین فقیروں کا اعتبا قائم تھا۔ بے شک! آپ نے مجھ غریب الدیار اور بے وطن انسان کی بہت عزت و توقیر کی، دوستی کا حق اس طرح ادا کیا کہ یہ فقیر ہمیشہ آپ کی محبتوں پر نازاں رہے گا۔ اب اپنے اس مہمان کو اجازت دیجئے کہ میزبان کے بغیر مکان میں رہنا اچھا نہیں لگتا۔ میں شکر گزار ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ اس زمین پر بہترین میزبان تھے۔ آپ نے مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا۔''

یہ دعا مانگنے کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ دہلی کی حدود سے نکل کر بدایوں تشریف لے گئے۔

اس وقت بدایوں بھی دہلی، لاہور، اجمیر، پاک پتن اور ملتان کی طرح ایک اہم اور با رونق شہر تھا۔ روحانی اعتبار سے بھی بدایوں کو ''ہندوستان کا مدینہ'' کہا جاتا تھا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہاں بے شمار شہداء آرام فرما تھے اور کئی جلیل القدر بزرگوں کے مزارات موجود تھے۔ اس کے علاوہ سہروردی سلسلے کی چند نامور ہستیاں پہلے سے اس شہر میں قیام فرما تھیں۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی تشریف آوری سے بدایوں کی رونق میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

اس وقت بدایوں کے حاکم قاضی کمال الدین تھے۔ انہیں علوم ظاہری میں کمال حاصل تھا۔ احکامِ شریعت کے بھی پابند تھے۔ مگر صوفیائے کرام کو پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرے علمائے ظاہر کی طرح قاضی کمال الدین کا بھی یہ خیال تھا کہ یہ گوشہ نشین درویش خود بھی بے عمل ہوتے ہیں اور ان کے عقیدت مند بھی۔ مختصر یہ کہ قاضی کمال الدین کے مطابق صوفیائے کرام اسلامی معاشرے کی تعمیر میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکتے اس لئے وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ان کے شہر میں سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم بزرگ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ تشریف لا چکے ہیں۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بدایوں آتے ہی الف خان کے محل کے قریب ایک مسجد کی تعمیر شروع کرائی جو آج بھی موجود ہے۔ مسجد کی تعمیر سے پہلے قبلہ کا رخ متعین کرتے وقت مقامی لوگوں کا خیال تھا کہ شاید خانہ کعبہ اس طرف نہیں ہے مگر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے مزدوروں کو حکم دیا کہ وہ مسجد کی تعمیر شروع کریں۔ بے چارے مزدور مجبور تھے۔ اس لئے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے حکم کے مطابق کام کرتے رہے۔ پھر جب مسجد کی بنیادیں رکھنے کا کام شروع ہوا تو بدایوں کے کچھ معزز لوگوں نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے عرض کیا۔ ''شیخ! ہمارے خیال میں آپ نے قبلے کا جو رخ متعین کیا ہے، وہ درست نہیں ہے۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ان معززینِ شہر کی طرف دیکھا اور نہایت نرم و شیریں لہجے میں فرمایا۔

''یہ فقیر تو جب بھی نظر اُٹھاتا ہے تو کعبے کو اسی طرف پاتا ہے۔''

حضرت شیخ کی بات سن کر بدایوں کے معزز افراد احتراماً خاموش ہو گئے مگر ان کے چہروں سے ذہنی کشمکش کا

صاف اظہار ہو رہا تھا۔

حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے ان لوگوں کی طرف بغور دیکھا، پھر یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے اور معززینِ شہر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میرے ساتھ آؤ اور اپنا شک دُور کر لو۔''

یہ کہہ کر حضرت جلال الدین تبریزیؒ اپنی خانقاہ سے نکلے۔ آپؒ کے پیچھے پیچھے وہ لوگ تھے جنہیں قبلے کی سمت کے بارے میں شک تھا۔

پھر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اس جگہ پہنچے جہاں مزدور مسجد کی تعمیر میں مصروف تھے۔ پھر آپؒ نے تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اپنی آنکھوں سے ادھر دیکھو اور دلوں کی تسلی کر لو۔ خدا کی قسم! جلال الدین جھوٹ نہیں بولتا۔'' حضرت شیخ نے قبلے کی سمت شہادت کی اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''تمام مزدور اور دوسرے لوگ گھبرا کر اس طرف دیکھنے لگے جدھر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اپنی انگشت مبارک سے اشارہ کیا تھا۔ عجیب و غریب منظر تھا۔ انسانی آنکھوں کے سامنے خانہ کعبہ اپنی تمام تر ضیا باریوں کے ساتھ منور تھا۔ کئی مزدور بیت اللہ کے اس پُرجلال نظارے کی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔ باقی لوگوں پر سکتہ طاری تھا۔

مسجد تعمیر ہوتی رہی اور پورے بدایوں میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی اس کرامت کے تذکرے ہوتے رہے۔

قاضی کمال الدین کے دوستوں نے بھی اس حیرت انگیز واقعہ کا ذکر کیا۔ مگر بدایوں کے حاکم نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی اس کرامت کا کوئی تاثر نہیں لیا اور وقت اپنی مقررہ رفتار سے گزرتا رہا۔

اگرچہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بادشاہوں، امیروں اور وزیروں سے کوئی ربط نہیں رکھتے تھے لیکن ایک روز حضرت شیخ، قاضی کمال الدین کے مکان پر تشریف لے گئے اور آپؒ نے حاکم بدایوں کے دربان سے کہا۔

''قاضی صاحب سے کہو کہ فقیر، کمال الدین سے ملنے آیا ہے۔''

قاضی صاحب کا دربان، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے واقف نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔ ''آپ نشست گاہ میں تشریف رکھیے۔ قاضی صاحب نماز پڑھ رہے ہیں۔''

دربان کی بات سن کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بڑے تعجب کے ساتھ فرمایا۔ ''کیا قاضی صاحب بھی نماز پڑھنا جانتے ہیں؟'' یہ کہہ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ حاکم بدایوں سے ملاقات کئے بغیر واپس تشریف لے گئے۔

جب قاضی کمال الدین نماز سے فارغ ہوئے تو دربان نے پورا واقعہ بیان کر دیا جسے سن کر حاکم بدایوں کے چہرے پر شدید غصے کا رنگ اُبھر آیا۔ مگر قاضی کمال الدین نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔

پھر دوسرے دن اہلِ بدایوں نے یہ عجب منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قاضی کمال الدین کی سواری حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خانقاہ کے دروازے پر جا رکی۔ قاضی کمال الدین بڑے طمطراق اور حاکمانہ شان کے ساتھ نیچے اُترے اور ایک درویش کی خانقاہ میں چلے گئے۔ اس وقت حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ تشریف فرما تھے اور کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ حاکم بدایوں کو دیکھ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے دوست احتراماً کھڑے ہو گئے۔ مگر حضرت شیخ اپنی نشست پر بیٹھے رہے۔ قاضی کمال الدین کے دل میں پہلے ہی سے حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے خلاف غبار بھرا ہوا تھا۔ پھر جب اُنہوں نے ایک

درویش کی یہ ادائے بے نیازی دیکھی تو سخت ناگوار لہجے میں کہنے لگے۔

''کیا درویشی لوگوں کو یہی سکھاتی ہے کہ وہ ادب واحترام کے طریقے بھول جائیں؟''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے قاضی کمال الدین کے لہجے کی تلخی اور ناگواری کو نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا۔

''ادب و احترام سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اور اس فقیر سے کون سی بے ادبی سرزد ہوئی ہے؟ کیا اس کی وضاحت فرمائیں گے؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے لہجے میں قاضی کمال الدین کے لئے کسی طنز یا اعتراض کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''کیا تم نے قرآن کریم کی یہ آیت مقدسہ نہیں پڑھی؟'' قاضی کمال الدین کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔ ''اے لوگو! اللہ اور رسول اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو۔'' حاکم بدایوں نے اللہ کی کتابِ مقدس سے یہ حوالہ اس طرح پیش کیا کہ جیسے حضرت جلال الدین تبریزیؒ اَن پڑھ ہوں اور شریعت وسنت کا علم نہ رکھتے ہوں۔

حضرت شیخ نے حسبِ عادت انتہائی نرم وشیریں لہجے میں فرمایا۔ ''ابھی یہ بات طے ہونا باقی ہے کہ آپ کا شمار صاحبانِ امر میں ہوتا ہے یا نہیں؟ پھر بھی مجھ سے کیا نافرمانی سرزد ہوئی ہے؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی گفتگو کا مفہوم یہ تھا کہ اللہ کے نزدیک صاحبانِ امر وہ ہیں جو احکامِ شریعت وسنت پر حرف بہ حرف عمل کرتے ہیں۔ قاضی کمال الدین کو ایک درویش کی یہ بات سخت گراں گزری اور انہوں نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔

''میں اس علاقے کا حاکم ہوں اور تم میرے احترام میں کھڑے نہیں ہوئے۔ یہ بے ادبی بھی ہے اور سرکشی بھی ہے۔''

قاضی کمال الدین کی وضاحت سن کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ مسکرانے لگے۔ ''آپ نے مجھے قرآن حکیم کی آیتِ مقدسہ سنا کر میرے علم میں اضافہ بھی کیا اور احسان بھی۔ سورہ رحمٰن میں باری تعالیٰ کا ارشادِ مقدس ہے کہ احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں۔ میں اس احسان کا بدلہ اُتارتے ہوئے آپ کو باخبر کرتا ہوں کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس بات کو سخت ناپسند فرماتے ہیں کہ کوئی شخص آپ کے احترام میں کھڑا ہو۔''

یہ سن کر چند لمحوں کے لئے قاضی کمال الدین کا چہرہ فق ہوگیا مگر حاکم بدایوں نے فوراً ہی اپنی اس حالت پر قابو پالیا۔ تند وتیز لہجے میں بولے۔ ''میں تم سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''آپ تشریف رکھیں تو میں اپنے آقا ﷺ کی ایک اور حدیث مبارک بتاؤں۔''

حاکم بدایوں، قاضی کمال الدین بادل ناخواستہ بیٹھ گئے۔ مگر ان کے چہرے سے ناگواری کا رنگ نمایاں تھا۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بڑے پُرسوز لہجے میں حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر درود وسلام بھیجا اور پھر یہ حدیث مبارک بیان کی۔

''جو شخص یہ خواہش رکھتا ہو کہ لوگ اس کے احترام میں کھڑے رہیں، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

قاضی کمال الدین یہ حدیث سن کر حیرت زدہ ہو گئے مگر اپنی حاکمانہ شان برقرار رکھنے کے لئے انتہائی تلخ لہجے میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے مخاطب ہوئے۔

''تم سب کے سامنے مجھے حدیثِ رسول ﷺ بھی سنا رہے ہو اور نصیحتیں بھی کر رہے ہو۔ مگر کیا ایک مسلمان کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی کی غیبت کرے؟'' قاضی کمال الدین نے بڑی ذہانت سے حضرت شیخ جمال الدین تبریزیؒ کی گرفت کی۔

''اللہ تعالیٰ اس گناہِ عظیم کے ارتکاب سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

''تم نے میری غیبت کی۔'' قاضی کمال الدین نے ناگوار اور بلند آواز میں کہا۔

''کوئی گواہ؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے قاضی کمال الدین سے پوچھا۔

''میرا دربان اس بات کا عینی شاہد ہے۔'' قاضی کمال الدین نے انتہائی تند و تیز لہجے میں کہا۔ ''کل تم جب مجھ سے ملنے آئے تھے تو میرے دربان نے کہا تھا کہ کچھ دیر نشست گاہ میں بیٹھیں، قاضی صاحب ابھی نماز پڑھ کر آ رہے ہیں۔ اس پر تم نے کہا تھا کہ کیا قاضی صاحب بھی نماز پڑھنا جانتے ہیں؟...... اس کے بعد میرا انتظار کئے بغیر واپس چلے آئے۔ کیا یہ غیبت نہیں ہے؟''

قاضی کمال الدین کا خیال تھا کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ لاجواب ہو جائیں گے یا پھر اپنی درویشی کا مظاہرہ کرنے کے لئے مختلف تاویلیں پیش کریں گے۔ مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ کے سکون و اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے حسب عادت انتہائی نرم و شیریں لہجے میں فرمایا۔

''قاضی صاحب! یہ آپ کی غیبت نہیں، بلکہ یہ ایک درویش کی طرف سے ان الزامات کا جواب ہے جو علمائے ظاہر کی طرف سے ہم نکمّے، ناکارہ اور گوشہ نشیں صوفیوں پر لگائے جاتے ہیں۔''

ہم مندرجہ بالا سطور میں اس بات کا ذکر کر چکے ہیں کہ دوسرے علمائے ظاہر کی طرح قاضی کمال الدین بھی درویشوں اور صوفیوں کو بے عمل سمجھتے تھے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت شائستہ لہجے میں حاکمِ بدایوں کے انہی نظریات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

قاضی کمال الدین اپنے علمِ ظاہری اور اقتدار کے سبب ایک درویش کے اس لطیف اشارے کو سمجھنے سے قاصر رہے اور بڑے پُرغرور لہجے میں بولے۔ ''اگر مجھ جیسا عالم و فاضل انسان نماز پڑھنا نہیں جانتا تو پھر یہاں اور کون ہے جو عبادت کے طریقے سے واقف ہے؟''

''میں ان تمام احباب کے سامنے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کرتا ہوں۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے خانقاہ میں موجود دوسرے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''آپ کا علم و فضل اپنی جگہ...... مگر یہ حقیقت اپنی جگہ کہ علماء کی نماز اور ہے...... اور فقیروں کی نماز اور۔''

''کیا فقیر کوئی دوسرا قرآن پڑھتے ہیں؟ کیا ان کے رکوع و سجود علماء سے مختلف ہوتے ہیں؟'' حاکمِ بدایوں قاضی کمال الدین نے انتہائی تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔

''قرآن بھی وہی ہوتا ہے اور رکوع و سجود بھی وہی۔'' حسب معمول حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا لہجہ پُرسکون بھی تھا اور نرم و شیریں بھی۔

''پھر دونوں کی نماز میں کیا فرق ہے؟'' قاضی کمال الدین کا لہجہ بدستور انتہائی طنز آمیز تھا۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے جواباً فرمایا۔ ''علماء صرف خیالی اعتبار سے کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں لیکن فقیر جب تک کعبے کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتے، اس وقت تک تکبیر نہیں کہتے۔ علماء زمین پر نماز پڑھتے ہیں اور فقیروں کی نماز یہ ہے کہ عرشِ بریں پر پڑھی جائے۔''

یہ سن کر حاکمِ بدایوں قاضی کمال الدین اور بھی برہم ہو گئے۔ ''یہی ہے وہ لفظوں کا طلسم جس نے بے خبر اور سادہ دل عوام کو جکڑ رکھا ہے۔ اور یہی ہے وہ جھوٹے دعوؤں کا فریب جس سے متاثر ہو کر جاہل اور احمق انسان

فقیروں کے ہاتھوں کو بوسے دیتے ہیں اور ان کی خدمت میں قیمتی نذریں پیش کرتے ہیں۔ ایسے ہی بے عمل فقیروں اور انتہائی مبالغہ آمیز باتیں کرنے والے درویشوں نے اسلام کو بدنام کیا ہے۔'' یہ کہہ کر حاکم بدایوں قاضی کمال الدین اُٹھ کھڑے ہوئے اور غصے میں بھرے ہوئے خانقاہ سے نکل کر چلے گئے۔

پھر جب رات آئی تو قاضی کمال الدین عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے ریشمی بستر پر سو گئے۔ پھر کچھ دیر بعد ہی حاکم بدایوں نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو آسمان پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ یہ خواب اتنا عجیب تھا کہ قاضی کمال الدین گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور وحشت زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ پھر جب اُنہیں یقین آ گیا کہ وہ محض ایک خواب تھا تو اطمینان سے دوبارہ بستر پر دراز ہو گئے اور کروٹ بدل کر گہری نیند سو گئے۔

پھر کچھ دن بعد بدایوں میں ایک علمی تقریب منعقد ہوئی جس میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بھی شامل تھے۔ ''انسان کی معراج کیا ہے؟'' اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی اور علمائے مجلس نے مختلف خیالات کا اظہار کیا۔

پھر کسی عالم نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شیخ! آپ بھی ارشاد فرمائیں کہ انسان کی معراج کیا ہے؟''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ان عالم سے دریافت کیا۔ ''آپ کی مراد کسی عالم کی معراج سے ہے یا کسی درویش کی معراج سے؟''

''کیا آپ کے نزدیک عالم اور درویش کی معراج میں فرق ہے؟''

قاضی کمال الدین بہت دیر سے یہ گفتگو سن رہے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ درویشوں کے حق میں کوئی دلیل پیش کریں اور حاکم بدایوں، علماء کی بھری محفل میں اپنے دل کا غبار نکالیں۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ان عالم کے سوال کے جواب میں فرمایا۔ ''علماء اور درویشوں کی معراج میں بہت نمایاں فرق ہے۔''

قاضی کمال الدین کو موقع مل گیا اور وہ درمیان ہی میں بول اُٹھے۔ ''کیا قطبِ دوراں اپنے اس قولِ مبارک کی وضاحت کرنا پسند فرمائیں گے؟'' حاکم بدایوں کے ایک ایک لفظ سے حضرت شیخ جلال الدین تبریزی کے لئے انتہائی تحقیر اور تضحیک کا اظہار ہو رہا تھا۔

قاضی کمال الدین کی بات سن کر تمام علمائے مجلس حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی طرف متوجہ ہوئے۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے حاکمِ بدایوں کے طنز اور طعنہ زنی کو محسوس کیا مگر ماتھے پر شکن تک نہ آنے دی اور اسی بے نیازانہ انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''علماء کی معراج صرف یہ ہے کہ وہ کسی مدرسے کے استاد بن جائیں یا پھر قاضیٔ شہر۔ اور اگر زیادہ ترقی کی تو صدر الصدور بن گئے اور بس..... لیکن فقیروں اور درویشوں کے مراتب کی کوئی انتہا نہیں۔ ان کا ابتدائی مرتبہ وہ ہے جو آپ نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا تھا۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ علمائے مجلس نے حاکم بدایوں کی طرف دیکھا۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا جواب سن کر قاضی کمال الدین کو سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ ان کے اس خواب سے بھی واقف ہو جائیں گے جس خواب میں حاکمِ بدایوں نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو نماز پڑھتے دیکھا تھا۔

حاکمِ بدایوں کی یہ کیفیت دیکھ کر ان کے احباب نے پوچھا۔ ''قاضی صاحب! کیا آپ اپنا وہ خواب بیان

کریں گے جس کی طرف شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اشارہ کیا ہے؟ ہم آپ کی زبانی سننا چاہیں گے کہ آخر درویشوں کا ابتدائی مرتبہ کیا ہے؟"

دوستوں کی بات سن کر قاضی کمال الدین کے حیرت وسکوت کی کیفیت زائل ہوگئی۔ مگر وہ اپنے احباب کے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے محفل میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ پھر گھبرا کر اپنے دوستوں سے پوچھا۔

"شیخ جلال الدین تبریزی کہاں ہیں؟" حاکمِ بدایوں کے لہجے سے شدید اضطراب جھلک رہا تھا۔

"شیخ تو چلے گئے۔" ایک دوست نے جواباً کہا۔ اسے قاضی کمال الدین کی بگڑتی ہوئی حالت پر شدید حیرت ہو رہی تھی۔

پھر علمائے مجلس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ حاکمِ بدایوں اپنی نشست سے نیچے اُترے اور تیزی سے بھاگتے ہوئے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے تعاقب میں چلے گئے۔ پھر دیکھنے والوں نے ایک اور عجیب منظر دیکھا کہ قاضی کمال الدین جو شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے سخت ترین مخالف تھے، وہ سرِ راہ ایک درویش کے ہاتھوں کو بوسے دے رہے تھے۔ اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگ رہے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ قاضی کمال الدین، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے اور اپنے فرزند برہان الدین کو اس شخص کا مرید کرا دیا جو ان کی نظر میں ایک گوشہ نشیں اور بے عمل انسان تھا۔ بعض روایتوں کے مطابق قاضی کمال الدین کے صاحبزادے برہان الدین نے روحانیت میں بڑا مقام حاصل کیا۔ یہ بدایوں میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی دوسری کرامت تھی، جس نے اہلِ شہر کو حضرت شیخ کی روحانی عظمتوں کا اسیر بنا دیا تھا۔

کچھ دن بعد اسی تاریخی شہر میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جس نے مقامی باشندوں کو شدید حیرت میں ڈال دیا اور اس طرح حضرت جلال الدین تبریزیؒ کی عظمت و بزرگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ایک دن حضرت شیخ اپنے مکان کے دروازے کے سامنے تشریف فرما تھے کہ ایک دہی بیچنے والا سامنے سے گزرا۔ اس دہی فروش کا نام، مُولا تھا۔ اور وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ جیسے ہی مُولا کی نظر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے چہرۂ مبارک پر پڑی، اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

پھر اس نے دہی کا مٹکا زمین پر رکھ دیا۔ مُولا پر بے خودی کی سی کیفیت طاری تھی اور وہ خود کلامی کے انداز میں بار بار ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا۔

"کیا دنیا میں ایسے بھی مرد ہوتے ہیں؟"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے دہی فروش، مُولا کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟"

مُولا نے انتہائی حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "کیا دنیا میں ایسے مرد ہوتے ہیں؟"

حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے اپنے مخصوص تبسمِ دل نواز کے ساتھ فرمایا۔ "ہاں! اللہ کے حکم سے دنیا میں ایسے مرد بھی رہتے ہیں۔"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی بات سن کر دہی فروش مُولا بے تابانہ آگے بڑھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ "تو پھر مجھے بھی اپنا بنا لیں۔"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "تم پہلے بھی ہمارے ہی تھے۔ بس ذرا

راستہ بھٹک گئے تھے۔ اب تم اپنے گھر کی طرف لوٹ آئے ہو۔"

یہ سنتے ہی دہی فروش مُولا، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے قدموں سے لپٹ گیا اور اس نے اپنے ماتھے پر لگا ہوا "تلک" کا نشان کھرچ ڈالا۔ اور وہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے دستِ حق پرست پر ایمان لے آیا۔ قبولِ اسلام کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے "مُولا" کا نام بدل کر "علی" رکھ دیا۔ پھر اس دہی فروش نے اتنی روحانی ترقی کی کہ حضرت شیخ نے علیؒ کو خرقہ خلافت عطا کیا اور پھر وہ اپنے وقت کے "شیخ" قرار پائے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد ایک دن شیخ علیؒ نے ایک لاکھ روپے کی کثیر رقم اپنے پیر و مرشد، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے قدموں میں رکھ دی۔ (واضح رہے کہ آج سے تقریباً 800 سال پہلے ایک لاکھ روپے کی رقم موجودہ زمانے کے کروڑوں کے برابر تھی)

"یہ کیا ہے؟" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے دولت کے انبار دیکھ کر فرمایا۔ "تم اتنے مالدار شخص ہو کر دہی فروخت کرتے تھے؟" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے چہرۂ مبارک سے شدید حیرت کا رنگ نمایاں تھا۔

پیر و مرشد کے اظہارِ حیرت پر شیخ علیؒ نے اپنی سابقہ زندگی کے حالات سناتے ہوئے کہا۔ "میں بنیادی طور پر دہی فروش نہیں تھا۔ اور نہ دہی بیچنے والوں کی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ میں نسلاً راجپوت ہوں۔"

"پھر یہ حلیہ کیوں بنایا تھا؟" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اپنے مخصوص تبسم دلنواز کے ساتھ فرمایا۔

"میں نے یہ روپ اس لئے دھارا تھا کہ خدا کے بندوں کو بے وقوف بنا سکوں۔ دراصل میں بدایوں کے ڈاکوؤں کا سردار ہوں۔ دن کو دہی کا مٹکا سر پر رکھ کر شہر کے گلی کوچوں میں آوازیں لگاتا تھا۔ اور یہ اندازہ کرتا تھا کہ کون کتنا مالدار ہے۔ پھر رات کے اندھیروں میں اپنے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر مالدار لوگوں کے گھروں میں نقب لگایا کرتا تھا اور یہ تھا میرا کاروبارِ زندگی..... پھر جب ایک دن آپ کی من موہنی صورت دیکھی تو خود ہی لٹ گیا۔" اپنی گناہ گارانہ زندگی کے مختصر حالات سناتے ہوئے شیخ علیؒ زار و قطار رونے لگے۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اپنا دستِ شفقت شیخ علیؒ کے سر پر رکھتے ہوئے فرمایا۔ "یہ اسی ذاتِ پاک کی قدرت اور شان ہے کہ اس نے تمہارے جہنم کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو صراطِ مستقیم کی طرف موڑ دیا۔ بے شک! وہ بہت توبہ قبول کرنے والا، مہربان اور رحیم ہے۔ جب تمہیں ہدایت مل گئی تو تم پر لازم ہے کہ تم وہ لوٹا ہوا مال ان کے مالکوں تک پہنچا دو۔"

پیر و مرشد کی بات سن کر شیخ علیؒ کے چہرے پر شدید پریشانی کا رنگ اُبھر آیا اور آپؒ نہایت شرمسارانہ لہجے میں عرض کرنے لگے۔ "سیّدی! اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ میں نے کس کا مال کب لوٹا تھا؟"

شیخ علیؒ کا جواب سن کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے اور پھر اپنے خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اب تمہارے اس گناہ کا بس ایک ہی کفارہ ہے کہ سارا مال غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دو۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل میں یہ کہتے جاؤ کہ اے غفور الرحیم! میرے اس گناہ کو معاف کر دے۔ اور اس صدقہ و خیرات کا ثواب ان حضرات کو پہنچا دے، جن کا مال میں نے لوٹا تھا۔"

شیخ علیؒ نے ایسا ہی کیا۔ اور پھر معرفت کے بلند درجات تک رسائی حاصل کی۔ یہاں ہم سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ایک حدیث مبارک کا حوالہ پیش کریں گے۔ رسالت مآب ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔

"مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی نظر میں بھی وہ مومن کا "نورِ فراست" شامل تھا جس نے ایک ہندو ڈاکو کی

کایا پلٹ دی تھی۔ اور پھر وہ گم کردہ راہ انسان معرفت کے اعلیٰ درجے تک پہنچا تھا۔ بقول علامہ اقبال۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

''سیر العارفین'' کے مصنف حامد بن فضل اللہ جمالی کے مطابق حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی ذاتِ گرامی سے اس قدر کرامات کا ظہور ہوا کہ اگر انہیں تفصیل سے درج کیا جائے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے گا، پھر بھی بات مکمل نہیں ہو گی۔

مشہور صوفی بزرگ حضرت اوحد الدین کرمانیؒ فرماتے ہیں۔ ''میں کعبۃ اللہ کے سفر میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ہمراہ تھا۔ جب ہم لوگ ''بنی امام'' کے مقام پر پہنچے تو یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کہ آگے جانے کا راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ اس کشاکش میں بہت سے لوگ اور اونٹ ہلاک ہو گئے۔ جو غریب اور فقیر لوگ، حاجیوں کے اس قافلے میں شامل تھے، چلتے چلتے اُن کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اس وقت ''بنی امام'' کے بازاروں میں اونٹوں کا ایک گلہ فروخت ہونے کے لئے آیا۔ جب اونٹوں کے مالک سے ان جانوروں کی قیمت دریافت کی گئی تو اس نے ہر اونٹ کی قیمت ''بیس اشرفی'' بتائی جو عام حالات سے کہیں زیادہ تھی۔ قافلے والوں میں سے جن میں قوتِ خرید کی استطاعت تھی، ان لوگوں نے اپنے سفر کی آسانی کے لئے اونٹ خرید لئے۔ اور جو لوگ قوتِ خرید نہیں رکھتے تھے انہوں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ اپنی جانوں سے قطعاً مایوس ہو چکے تھے۔ یہ سنگین اور ہلاکت خیز صورتِ حال دیکھ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اونٹوں کے مالک کو بلا کر پوچھا۔

''تمہارے کتنے جانور فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں؟''

''میرے پاس پانچ سو اونٹ موجود ہیں۔'' اونٹوں کے مالک نے جواب دیا۔ ''مگر اب قافلے میں ان کا خریدار نظر نہیں آتا۔''

حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے اونٹوں کے مالک کی بات سنی۔ پھر آپؒ نے آسمان کی طرف دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا پاک نام ''یا لطیف'' تین بار دہرایا۔ اس کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے صحرا کی ریت میں ہاتھ ڈالا۔ پھر جب آپؒ کا دستِ مبارک ریت سے باہر آیا تو اس میں چمکتی ہوئی اشرفیاں موجود تھیں...... جیسے ابھی ابھی ٹکسال سے ڈھل کر باہر آئی ہوں۔ پھر حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے وہ تمام اشرفیاں اونٹوں کے مالک کو بطور قیمت دے دیں۔ اور سارے اونٹ غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیئے۔ تاکہ ان بندگانِ خدا پر بیت اللہ کا سفر آسان ہو جائے۔

حضرت اوحد الدین کرمانیؒ فرماتے ہیں کہ ان اونٹوں کو غرباء میں تقسیم کرنے کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ حج بیت اللہ کے لئے پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ یہ آپؒ کی طاقتِ ایمانی ہی تھی کہ آپؒ نے یہ طویل سفر کسی سواری کے بغیر ہی طے کیا۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سیاحت کرتے ہوئے پاک پتن تشریف لے گئے تھے جو حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کا آبائی وطن تھا۔ جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ پاک پتن پہنچے تو آپؒ نے مقامی لوگوں سے دریافت کیا۔ ''یہاں کوئی درویش رہتے ہیں؟''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''ہاں، ایک قاضی بچہ دیوانہ ہے جو اکثر مسجد میں پڑا رہتا ہے۔''

حضرت بابا فریدؒ کا تعلق قاضیوں کے مشہور خاندان سے تھا۔ اس وقت حضرت بابا فریدؒ کم عمر تھے اور آپؒ کو جنون کی حد تک علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اس لئے پاک پتن کے لوگ حضرت بابا فریدؒ کو "قاضی بچہ دیوانہ" کہا کرتے تھے۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ مسجد میں داخل ہوئے تو حضرت بابا فریدؒ اپنا سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک بزرگ کو اپنے سامنے پا کر حضرت بابا فریدؒ احتراماً کھڑے ہو گئے اور نہایت ادب سے سلام کیا۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے انتہائی شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "ماشاء اللہ! بہت ہوشیار ہو۔ ایک دن ساری دنیا دیکھے گی۔" یہ اسی طرف اشارہ تھا کہ پاک پتن کے رہنے والے تحصیل علم کے سلسلے میں حضرت بابا فریدؒ کی بے پناہ مشغولیت دیکھ کر آپؒ کو "قاضی بچہ دیوانہ" کہتے تھے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے حضرت بابا فریدؒ کے چہرے پر ولایت کے آثار دیکھ لئے تھے اسی لئے آپؒ نے فرمایا تھا کہ یہ بچہ دیوانہ نہیں، بہت ہوشیار ہے...... اس کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اپنے پیرہن مبارک کی جیب سے ایک انار نکال کر حضرت بابا فریدؒ کو دیا اور پھر پاک پتن سے نکل کر اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس روز حضرت بابا فریدؒ روزے سے تھے۔ آپؒ نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے دیئے ہوئے انار کو اپنے ہم عمر لڑکوں میں تقسیم کر دیا۔ بس افطار کے لئے صرف ایک دانہ رکھ لیا۔

پھر وقت گزرتا رہا اور حضرت بابا فریدؒ نے حصولِ علم کے لئے طویل سیاحت کی۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے اولیائے کرام اور صوفیائے عظام سے ملاقاتیں کیں اور فیضِ روحانی حاصل کیا۔ اس کے بعد دہلی حاضر ہو کر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ پھر ایک دن جب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی مجلسِ نورانی آراستہ تھی تو اچانک حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کو اپنے بچپن کا وہ واقعہ یاد آیا جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے آپؒ کو ایک انار دیا تھا۔ پھر حضرت بابا فریدؒ نے یہی واقعہ اپنے پیرو مرشد کے سامنے بیان کیا تو جواباً حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا۔

"بابا فرید! انار کے اسی ایک دانے میں تمہارے لئے تمام نعمتیں موجود تھیں۔"

پھر جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بدایوں سے رخصت ہونے لگے تو آپؒ کے خلیفہ، حضرت شیخ علیؒ نے بھی اپنا سامانِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے یہ منظر دیکھا تو مسکراتے ہوئے شیخ علیؒ سے پوچھا۔ "کہاں کے ارادے ہیں؟"

"خادم کا ارادہ ہی کیا؟ جہاں مخدوم جائیں گے، وہاں یہ خدمت گزار بھی جائے گا۔" شیخ علیؒ نے عرض کیا۔

"حق تعالیٰ تمہارے درجات بلند کرے۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

"تمہیں بدایوں میں ہی رہ کر اس کارِ تبلیغ کو آگے بڑھانا ہے۔"

پیرو مرشد کا ارشاد سن کر شیخ علیؒ رونے لگے۔ "سیّدی! اس خادم سے یہ صدمۂ فراق کیسے برداشت ہو گا؟"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اپنے خلیفہ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "ہم حق کے لئے ہی ملے تھے اور حق کی خاطر ہی بچھڑ رہے ہیں۔ وہ وقت یاد کرو، جب صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بچھڑے تھے۔ کیا اس سے بڑا صدمہ کوئی اور ہو سکتا ہے؟ مگر حضور اکرم ﷺ کے جاں نثاروں نے اس صدمے سے نڈھال ہوتے ہوئے بھی کارِ رسالت کو جاری رکھا اور اس شان سے جاری رکھا کہ اپنی

جانوں سے بھی گزر گئے۔ یہی اللہ کی سنت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ تمہیں لوگوں کے ہجوم میں رہ کر ہی دنیا کے ستم برداشت کرنے ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اہلِ دنیا کی جفاؤں سے دل برداشتہ ہو کر کسی غار میں روپوش ہو جاؤ۔ یہ رہبانیت ہے اور اسلام میں رہبانیت جائز نہیں۔''

شیخ علیؒ پیر و مرشد کے حکم سے مجبور تھے۔ دل رو رہا تھا مگر آپؒ نے اپنے آنسوؤں کو پلکوں کی قید سے آزاد ہونے نہیں دیا۔ بدایوں کی حدود سے نکل کر کئی میل تک پیر و مرشد کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلتے رہے۔ پھر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ٹھہر کر اپنے خلیفہ شیخ علیؒ کو گلے سے لگا کر فرمایا۔

''اللہ تمہیں صبر و استقامت عطا فرمائے۔ بظاہر میرے اور تمہارے درمیان طویل فاصلے حائل ہوں گے۔ مگر جب بھی محسوس کرو گے، مجھے اپنے قریب ہی پاؤ گے۔''

اس کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بدایوں سے اودھ تشریف لے گئے۔ اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شیخ علیؒ کی خانقاہ کے دروازے پر عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ گئی۔ اگرچہ بدایوں میں دوسرے بزرگ بھی موجود تھے، لیکن مخلوقِ خدا، شیخ علیؒ کی طرف رجوع کرتی تھی۔

یہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا فیضِ روحانی تھا کہ پہلے ایک ہندو ڈاکو نے اپنا مذہب چھوڑا اور پھر ولایت کے منصبِ عظیم تک پہنچا۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے کچھ عرصے تک ''اودھ'' کے علاقے میں قیام فرمایا۔ اودھ ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے یوپی (اتر پردیش) کا ایک تاریخی علاقہ ہے۔ موجودہ بھارت میں اتر پردیش کا دارالحکومت لکھنؤ ہے جو ماضی میں علم و ادب، شعر و شاعری اور تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا۔ پھر 1857ء کی جنگ آزادی میں اودھ کا آخری تاجدار، نواب واجد علی شاہ اختر فرنگیوں کے ہاتھوں قید ہوا۔ اور اس طرح اودھ کی مخصوص تہذیب اور انفرادی حیثیت ختم ہو گئی۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے کچھ دن تک اسی اودھ کے علاقے میں قیام فرمایا تھا۔ پھر آپؒ مقامی لوگوں کو اپنی روحانیت سے فیض یاب کرتے ہوئے ''بہار'' تشریف لے گئے تھے۔ اس کے بعد آپؒ بنگال کی طرف عازمِ سفر ہوئے۔ اس زمانے میں بنگال کو ''لکھنوتی'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

بنگال کا جادو آج بھی برصغیر پاک و ہند میں خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ یہ کوئی قصہ یا افسانہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ لکھنوتی (بنگال) تشریف لائے تھے تو اس وقت یہ علاقہ انتہا پسند ہندوؤں کا مرکز تھا۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بنگال پہنچ کر ''پنڈو'' کے قصبے میں سکونت اختیار فرمائی۔ زمانۂ قدیم میں پنڈو ایک مشہور اور تاریخی مقام تھا۔ یہ جگہ ہندوؤں کے لئے ''تیرتھ'' (مقامِ مقدس) کی حیثیت رکھتی تھی۔ ''پنڈو'' میں بہت سے مندر موجود تھے اور ہر وقت ناقوسوں کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ اگرچہ جغرافیائی حیثیت سے بنگال کی سرزمین پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا، مگر مقامی لوگوں کے دلوں میں بت خانے آباد تھے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ شمشیروں سے انسانی جسموں پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے مگر دل فتح نہیں کئے جا سکتے۔ اور حقیقی فتح یہی ہے کہ انسانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا جائے۔

تاریخ اور حالات کے تناظر میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ''پنڈو'' کو اپنا مستقر اس لئے بنایا کہ بنگال کے گوشے گوشے سے اہلِ ہنود ''تیرتھ یاترا'' (مقامِ مقدسہ کی زیارت) کے لئے ''پنڈو'' آیا کرتے تھے۔ ہر وقت بت پرستوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ لاکھوں پجاری تھے اور ہزاروں مندر...... تبلیغِ اسلام کے لئے ''پنڈو''

بہترین مقام تھا۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ یہاں رہ کر بہت سے اہلِ ہنود پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔

مشہورِ عالم سیاح، ابنِ بطوطہ اپنے سفر نامے میں "پنڈو" کے حالات تحریر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "اگر چہ بنگال پر مسلمان سپاہیوں کا قبضہ ہو چکا تھا...... لیکن "پنڈو" کی بت پرستانہ فضا سخت ناسازگار تھی۔ اس وقت کسی مسلمان میں اتنی جرأت و ہمت نہیں تھی کہ "پنڈو" میں قدم رکھ سکتا۔"

آگے چل کر ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے۔ "پنڈو میں ہندوؤں کا سب سے بڑا اور مشہور مندر تھا۔ جہاں "کالی ماتا" کی پوجا ہوتی تھی۔"

واضح رہے کہ کالی ماتا کے مجسّمے کی ظاہری شکل وصورت ایک سیاہ فام عورت کی ہے...... جس کی اُبلی ہوئی آنکھیں اور باہر نکلی ہوئی زبان سرخ ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق "کالی ماتا" قہر وغضب کی دیوی ہے اور بقول ان کے کسی انسان یا بستی پر کوئی آسمانی یا زمینی آفت آتی ہے تو کالی ماتا کی ناراضگی کے سبب آتی ہے۔

مختصراً یہ کہ کالی ماتا صرف انسانوں پر عذاب نازل کرتی ہے..... رحمت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

الغرض انتہائی ناسازگار فضا کے باوجود حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ تنِ تنہا "پنڈو" تشریف لے گئے اور آپؒ نے ایک درخت کے نیچے قیام فرمایا۔

اگر حضرت شیخ چاہتے تو بنگال کے مسلمان حاکم سے تعاون طلب کر سکتے تھے۔ لیکن آپؒ کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا۔ معتبر تاریخی روایتوں کے مطابق "پنڈو" میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی بے سروسامانی کا عجیب عالم تھا۔ نیند آتی تو اسی کچی زمین پر سو جاتے۔ بھوک لگتی تو درخت کے پتے کھا کر شکم کی آگ بجھاتے۔ کپڑے میلے ہو جاتے تو خود ہی کسی تالاب یا دریا پر جا کر دھو لیتے۔ نہ کوئی مرید تھا، نہ کوئی خدمت گزار۔ آپؒ بت پرستوں کے ہجوم میں تنہا کلمہ گو تھے اور ذاتِ وحدہٗ لاشریک کے سوا آپؒ کا کوئی سہارا نہیں تھا۔

شروع میں "پنڈو" کے ہندوؤں نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو ایک مسافر سمجھا۔ مگر جب آپؒ کا قیام طویل ہو گیا تو اس علاقے کے معزز ہندو کسی قدر چونکے اور پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھنے لگے۔

"تم کون ہو؟ اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں ایک خدا کی عبادت کرنے والا ہوں اور تمہیں بتانے آیا ہوں کہ اس خدا کا کوئی شریک نہیں۔" حضرت شیخ نے نہایت پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ "تم لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو کہ ایک پتھر کو اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور پھر اسی کے سامنے جھک جاتے ہو۔ یہ کیسی دیوانگی اور جہالت ہے کہ تم ان معبودوں سے مانگتے ہو کہ اگر ان کے سروں پر کوئی مکھی یا چڑیا بیٹھ جائے تو وہ اسے اُڑا نہ سکیں۔"

بت پرستوں نے پہلی بار کسی مردِ مومن کی جرأت اور گرمیٔ گفتار دیکھی تھی۔ پہلے تو اہلِ ہنود کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر جب یہ کیفیت زائل ہوئی تو ان کے چہروں پر سخت غیظ وغضب کا رنگ اُبھر آیا۔

ایک ہندو سرمایہ دار، پونجی لال نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "ہماری ہی زمین پر بسیرا کرتا ہے اور ہمارے ہی دیوتاؤں کو برا کہتا ہے؟"

پنڈو کے دوسرے معزز شخص ہیم چند نے چیخ کر کہا۔ "ہم تجھے بس چند گھنٹوں کی مہلت اور دیتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں جدھر تیرا منہ اُٹھے، اُدھر نکل جا..... ورنہ اپنے بھیانک انجام کا تُو خود ہی ذمہ دار ہو گا۔"

یہ کہہ کر "پنڈو" کے وہ معزز لوگ واپس جانے لگے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بلند آواز میں اُنہیں

مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اسلام آنے کے لئے آتا ہے، جانے کے لئے نہیں۔''

وہ لوگ اپنی طاقت کے نشے میں ایک مسلمان کی بات سنی ان سنی کر کے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک بوڑھا اور تنہا مسلمان ''پنڈو'' کے معزز سرداروں کی اس دھمکی کو برداشت نہ کر سکے گا اور خوف زدہ ہو کر رات کے اندھیرے میں اس ''تیرتھ'' (مقامِ مقدس) کو چھوڑ کر کہیں دُور چلا جائے گا۔

پھر صبح ہوئی اور پنڈو کے معزز سرداروں نے اپنے کارندوں کو یہ دیکھنے کے لئے بھیجا کہ ان کی دھمکی اس بوڑھے مسلمان پر اثر انداز ہوئی یا نہیں۔ وہ ہندو کارندے جنگل میں پہنچے تو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بدستور ذکرِ حق میں مشغول تھے۔ ہندو کارندوں نے چیخ کر کہا۔ ''تُو نے ابھی تک ہمارے سرداروں کے حکم پر عمل نہیں کیا؟'' ہندو کارندوں کا لہجہ نہایت گستاخانہ اور تحقیر آمیز تھا۔

اہلِ ہنود کی چیخ سن کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے آنکھیں کھولیں اور حسبِ عادت مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''میں نے تمہارے سرداروں کو یہ بات بہت وضاحت سے سمجھا دی ہے کہ مسلمان، اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں مانتا۔ ان سے جا کر کہہ دو کہ میں جس جگہ مقیم ہوں، وہ اللہ کی زمین اور ملکیت ہے۔ کسی زمیندار کی جاگیر نہیں۔''

ہندو کارندے واپس چلے گئے اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والے الفاظ من وعن دہرا دیئے جنہیں سن کر ہندو سرداروں اور جاگیرداروں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پھر انہوں نے حکم جاری کر دیا کہ مسلمان بوڑھے کو زبردستی اٹھا کر پنڈو کی حدود سے باہر پھینک آؤ۔ اگر وہ دوبارہ واپس آنے کی کوشش کرے تو اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دو۔'' یہ وہی حکم تھا جو پنڈو کے جاگیردار اور زمیندار اپنے کسانوں کو سزا دینے کے لئے جاری کرتے تھے۔ ان بت پرستوں نے بڑا دھوکا کھایا۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو بھی ایک بے سہارا اور کمزور انسان سمجھا۔

پھر جب ہندو کارندے، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھے تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ ان کے جسم پتھر کے ہو گئے ہیں اور وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔

اپنے جسموں کو مفلوج ہوتے دیکھ کر وہ ہندو کارندے رونے لگے۔ ''اے مہاتما! ہمیں معاف کر دے کہ ہم تو ان زمینداروں کے غلام ہیں...... اپنی خوشی و مرضی سے کچھ نہیں کرتے۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے جواباً فرمایا۔ ''میں تمہیں صرف اس لئے معاف کر رہا ہوں کہ تم واپس جا کر اپنے آقاؤں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ ابھی وقت ہے۔ اگر وہ ایمان لے آئے تو دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح پائیں گے...... ورنہ ذلت و بربادی ان کا مقدر ہے۔''

جیسے ہی حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، ہندو کارندوں کے جسموں کی مفلوجیت ختم ہو گئی۔ پھر وہ بے تابانہ آگے بڑھے اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے پاؤں چھو کر واپس چلے گئے۔

ہندو سرداروں اور جاگیرداروں نے اپنے کارندوں کی زبانی یہ حال سنا تو وہ ان پر برس پڑے۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو۔ کالی ماتا کے نام لیوا ایک ''ملیچھ'' سے ڈر گئے...... لعنت ہو تم سب پر۔''

واضح رہے کہ آج بھی اعلیٰ ذات کے ہندو، نیچ ذات کے تعلق رکھنے والے ہندوؤں کے لئے تین الفاظ بولتے ہیں۔ ایک شودر...... دوسرا اچھوت..... اور تیسرا ملیچھ...... ان تینوں الفاظ کے کم و بیش ایک ہی معنی ہیں..... یعنی

ناپاک...... وہ مخلوق، جس کے چھونے سے اعلیٰ ذات کے ہندو ناپاک ہو جاتے ہیں۔ آج بھی بھارت میں اس قسم کے بے شمار مظاہرے دیکھے جا سکتے ہیں۔ شودروں اور اچھوتوں کی بستیاں الگ ہیں۔ انہیں بڑے مندروں میں جانے کی اجازت نہیں...... ان کے تالاب اور کنویں الگ ہیں۔

بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انتہا پسند ہندوؤں نے "ملیچھ" کا لفظ مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ اس قسم کی مثالیں آج بھی سننے میں آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "پنڈو" کے سرداروں اور جاگیرداروں نے ایک مسلمان درویش کے لئے "ملیچھ" کا لفظ استعمال کیا تھا۔

جب وہ کارندے اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے تو پنڈو کے سرداروں نے کچھ مسلح ہندوؤں کو بھیجا کہ وہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو قتل کر کے لاش جنگل میں چھوڑ دیں تاکہ مُردہ خور پرندے ایک ملیچھ کے مُردہ جسم سے اپنی بھوک مٹالیں۔ جب یہ مسلح اہلِ ہنود، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو قتل کرنے کے لئے جنگل پہنچے تو آپؒ حسبِ معمول مراقبے کی حالت میں تھے اور زیرِ لب اپنے اللہ کا ذکر کر رہے تھے۔ مسلح اور طاقتور ہندوؤں نے جب دُور سے ایک لاغر و نحیف مسلمان درویش کو دیکھا تو بہت زور سے ہنسے۔

"اس بوڑھے مسلمان کو قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو ہماری بے نیام تلواریں دیکھ کر ہی خوف سے مر جائے گا۔"

پھر یہ پتھر کے بدبخت پجاری طاقت کے نشے میں جھومتے ہوئے آگے بڑھے۔ ابھی حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور مسلح حملہ آوروں کے درمیان پندرہ بیس گز کا فاصلہ باقی تھا کہ یکایک تمام اہلِ ہنود کی بینائی زائل ہو گئی اور ان کی قہر آلود آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحوں تک تو وہ اس صورتِ حال کو سمجھ ہی نہ سکے۔ پھر ان پر یہ خوف ناک حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ ہمیشہ کے لئے آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی ان تمام مسلح حملہ آوروں نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو مخاطب کیا اور فریاد کرنے لگے۔

"اے مہاتما! ہمیں چھما (معاف) کر دے...... ہم تجھے جانتے نہیں تھے۔ ہم دھوکا کھا گئے۔ ہم تیری مہانتا (عظمت) کو پرنام (سلام) کرتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کی روشنی واپس کر دے۔ ہم اپنا سارا جیون تیرے چرنوں میں داس (غلام) بن کر گزار دیں گے۔"

اہلِ ہنود کی چیخیں سن کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے آنکھیں کھولیں تو نظروں کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ طاقت ور ہندوؤں کا ایک گروہ بے نیام شمشیریں لئے کھڑا تھا اور وہ سب کے سب دردناک آوازوں میں چیخ رہے تھے۔

کئی بت پرستوں نے بیک زبان کہا۔ "اے مہاتما! ہماری تو دنیا اندھیر ہو گئی۔ کچھ دیر پہلے ہم سب کچھ دیکھ سکتے تھے...... مگر اب لگتا ہے کہ پیدائشی اندھے ہیں، ہماری آنکھوں کو روشنی ملی ہی نہیں تھی۔"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت باوقار اور پُرجلال لہجے میں پتھر کے پجاریوں سے سوال کیا۔ "تم لوگ یہاں کس ارادے سے آئے تھے؟"

"ہمیں پنڈو کے سرداروں اور جاگیرداروں نے آپ کو قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔" کئی بت پرستوں نے اعترافِ جرم کرتے ہوئے کہا۔ "مگر اس کام کی تکمیل سے پہلے ہم اپنی آنکھوں کی روشنی کھو بیٹھے۔"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ان جابر و سفاک لوگوں کی طرف دیکھا جو آپؒ کی جان لینے کی غرض سے آئے تھے۔ پھر حضرت شیخؒ نے تمام حملہ آوروں کی آنکھوں پر ایک ایک کر کے انگشتِ مبارک پھیری اور دیکھتے ہی

دیکھتے ان سب کی بینائی بحال ہوگئی۔تمام بت پرستوں کے خوف زدہ چہروں پر مسرت کا گہرا رنگ اُبھر آیا۔

ابھی وہ لوگ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے انتہائی پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ "تم کچھ دیر پہلے مجھے اس لئے قتل نہیں کر سکے تھے کہ میں تمہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔مگر اب صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔تم جو منصوبہ لے کر آئے تھے،اسے انجام تک پہنچاؤ۔مگر یاد رکھو کہ اس کائنات کے خالق نے جو تنہا اور لاشریک ہے،میری قسمت میں تمہاری تلواروں سے قتل ہونا نہیں لکھا ہے ہے۔تم اپنے تمام خداؤں کو مدد کے لئے پکارو......اور پھر میرے خدا کی طاقت دیکھو جو اپنی ذات میں تنہا ہے اور ہر شے پر غالب ہے۔"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی بے خوفی اور حالتِ یقین دیکھ کر بت پرستوں کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا اور ان سب نے اپنی تلواریں مسلمان درویش کے قدموں میں رکھ دیں۔پھر "پنڈو" کی بت پرستانہ فضا میں یہ آوازیں گونجنے لگیں۔ "اے مہاتما! ہم تو خود ہی قتل ہو گئے۔اور اس خنجر سے قتل ہو گئے جو ہمیں نظر بھی نہیں آیا۔"

پھر ان پتھر کے پجاریوں نے اپنے ماتھوں سے قشقے (تلک) کا نشان کھرچ ڈالا۔اور جنیو توڑ کر پھینک دیئے۔ جنیو کو فارسی زبان میں زنار کہتے ہیں۔یہ وہ مقدس دھاگا ہے جسے اہلِ ہنود اس طرح پہنتے ہیں کہ وہ بائیں شانے سے گزرتا ہوا دائیں طرف پیٹ تک جاتا ہے۔مختصر یہ کہ وہ بت پرست جو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو قتل کرنے آئے تھے،ایک مردِ حق کے قدموں میں اس طرح جھک گئے کہ باپ دادا کا صدیوں پرانا مذہب ترک کر کے خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔

اس واقعہ سے پورے "پنڈو" میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔مقامی سرداروں اور جاگیرداروں نے ہندو غنڈوں کی ایک اور جماعت کو بھیجنا چاہا کہ وہ مسلمان درویش کا کام تمام کر ڈالے......مگر کوئی بت پرست بھی خوف اور دہشت کے باعث خود کو ہلاکت میں ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوا۔نتیجتاً دوسرے پتھر کے پجاری بھی اس مہاتما کے درشن (دیدار) کو قطار در قطار آنے لگے،جس نے کسی مادی ہتھیار کے بغیر بڑے بڑے شمشیر زنوں کو نہ صرف شکست دے دی تھی بلکہ انہیں ان کا مذہب تبدیل کرنے پر بھی مجبور کر دیا تھا۔"پنڈو" کا جو بت پرست بھی حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے چہرۂ مبارک پر نظر ڈالتا،اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔اور پھر جب ہوش میں آتا تو کلمہ طیبہ پڑھ کر حلقۂ اسلام میں داخل ہو جاتا۔

یہ ایک ایسی خوفناک صورتِ حال تھی کہ جس نے پنڈو کے مذہبی ٹھیکے داروں یعنی برہموں اور دوسرے با اثر طبقوں کے ہندوؤں کو شدید ہیجان اور وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔تمام برہمن اور سرمایہ دار سر جوڑ کر بیٹھے اور ان خدشات کا اظہار کرنے لگے کہ اگر مسلمان درویش کے تبلیغی عمل کو نہ روکا گیا تو ایک دن سارا بنگال ہی مسلمان ہو جائے گا۔

آخر تمام لوگ کالی ماتا کے مندر کے سب سے بڑے پجاری پنڈت سیوک رام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیوک رام،پنڈو کے ہندوؤں میں اس قدر مقبول تھا کہ پتھر کے پجاری اسے "مہاتما" (عظیم روح) کہا کرتے تھے اور ہمیشہ اس سے خوف زدہ رہا کرتے تھے۔اس خوف کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پنڈت سیوک رام اپنی مذہبی کتابوں کا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑا جادوگر بھی تھا۔اس نے "کالی ماتا" کے نام پر کئی چلّے کاٹے تھے۔ ان منتروں کا پڑھنا آسان نہیں تھا۔پنڈت سیوک رام نے دو سخت عمل (وظیفے) پڑھے تھے۔ایک عمل (منتر) یہ تھا کہ اس نے بھڑکتی ہوئی آگ کے سامنے کھڑے ہو کر چلّہ کاٹا تھا۔آگ کی تپش اتنی تیز ہوتی تھی کہ بڑے سے

بڑا بہادر اور مضبوط اعصاب رکھنے والا انسان بھی ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سامنے چند منٹ سے زیادہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر پنڈت سیوک رام کی لگن نے اسے آگ کی سوزش برداشت کرنے کی ہمت دی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ''کالی ماتا'' قہر و غضب کی دیوی تھی......اس لئے اس کی نسبت اور حوالے سے پڑھا جانے والا منتر بھی ''ہلاکت و بربادی'' کا منتر تھا۔ اور پنڈت سیوک رام پورے بنگال میں اس منتر کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ جب کسی شخص کو اپنے دشمن سے نجات حاصل کرنی ہوتی تو وہ پنڈت سیوک رام کو بہت بڑی رقم پیش کرتا اور نہایت عاجزانہ لہجے میں کہتا۔

''اے مہاتما! مجھے میرے دشمن سے مکتی (نجات) دلائیں اور اسے نرک (دوزخ) میں بھیج دیں۔''

پنڈت سیوک رام اس شخص سے منہ مانگی رقم طلب کرتا۔ پھر جب یہ سودا طے ہو جاتا تو پنڈت اس شخص کے دشمن کا نام پوچھتا......پھر آٹے کا پتلا بناتا......اور اس پتلے پر اس آدمی کا نام لکھتا......اس کے بعد آٹے کے پتلے کو آگ میں ڈال کر اپنا عمل (منتر) شروع کر دیتا۔ یہاں تک کہ آٹے کا پتلا جل کر کوئلہ ہو جاتا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ شخص بھی ہلاک ہو جاتا، جس کے نام کا پتلا آگ میں ڈالا گیا تھا۔

بس یہی وہ خاص منتر تھا جس کی وجہ سے ''پنڈو'' اور گرد و نواح کے رہنے والے، پنڈت سیوک رام سے خوف زدہ رہتے تھے۔ اور یہی وہ ہلاکت خیز عمل تھا جس نے پنڈت سیوک رام کو ''پنڈو'' کا سب سے مالدار انسان بنا دیا تھا۔ کالی ماتا کے مندر کے ایک خفیہ تہہ خانے میں سیوک رام کی ساری دولت جمع تھی۔ وہ اپنے وقت کا اوباش ترین انسان تھا۔ دن میں جھوم جھوم کر اپنے عقیدت مندوں کے سامنے بھگوان کے بھجن (مذہبی گیت) گایا کرتا تھا......اور رات کے اندھیرے میں خوب صورت دیوداسیوں کے ساتھ رنگ رلیاں منایا کرتا تھا۔

واضح رہے کہ ہندوؤں میں یہ رسم موجود تھی کہ غریب لوگ اپنی لڑکیوں کو مندروں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا کرتے تھے۔ یہ لڑکیاں ''دیوداسی'' یعنی دیوتا کی کنیزیں کہلاتی تھیں۔ ان لڑکیوں پر ہمیشہ کے لئے ایک پابندی عائد کر دی جاتی تھی کہ ''دیوداسیاں'' کسی مرد سے شادی نہیں کر سکتیں۔ بعض لڑکیوں نے جوانی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مندر کے قانون سے بغاوت کی تو اُنہیں زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔ یا پھر انہیں مندر کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا، جہاں وہ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر گئیں۔ عام طور پر یہ مجبور اور مظلوم لڑکیاں مندر کے بڑے پجاری اور دوسرے مرد کارندوں کی ہوس کا نشانہ بنتی تھیں۔

پھر جب حضرت جلال الدین تبریزیؒ کو قتل کرنے کے تمام منصوبے ناکام ہو گئے تو ''پنڈو'' کے جاگیرداروں اور برہموں نے پنڈت سیوک رام کے پاس پہنچ کر فریادی لہجے میں کہا۔ ''آخر تمہارا مخصوص منتر اور کالی ماتا کا قہر غضب کس دن کام آئے گا؟''

پنڈت سیوک رام کچھ دیر تک اُن لوگوں کی گفتگو سنتا رہا، پھر بڑے تکبر کے لہجے میں بولا۔ ''مجھے سب خبر ہے۔ میں تو اس دن کا انتظار کر رہا تھا کہ تم لوگ اپنی سی کوشش کر دیکھو۔''

''ہم نے ہر طریقہ آزما لیا۔'' پنڈو کے ایک جاگیردار نے کہا۔ ''مگر وہ مسلمان بوڑھا بہت بڑا جادوگر ہے۔ کالی ماتا کے پجاری اُسے قتل کرنے جاتے ہیں اور خود ہی قتل ہو جاتے ہیں۔''

''اب کوئی قتل نہیں ہوگا۔'' پنڈت سیوک رام کے چہرے سے غصہ جھلکنے لگا تھا۔ ''بس تم اس ملیچھ (مسلمان) کا نام بتا دو۔ کل صبح وہ اس سنسار میں نہیں ہوگا۔'' پنڈت سیوک رام اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے وہ انسانی زندگی اور

موت پر قادر ہو۔

پنڈو کے سرداروں نے پنڈت سیوک رام کو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا نام بتا دیا اور اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ پھر بڑی بے قراری کے ساتھ آنے والی صبح کا انتظار کرنے لگے۔

پنڈو کے سرداروں کے جانے کے بعد پنڈت سیوک رام نے شام کی تپسیا (عبادت) مندر میں کی۔ اُس کا معمول تھا کہ وہ صبح اور شام کی پوجا کے بعد مذہبی موضوعات پر تقریریں کیا کرتا تھا۔ اور اس دوران دوسرے پجاری مذہبی مسائل کے سلسلے میں مختلف سوالات کیا کرتے تھے۔ آج پوجا ختم ہوئی تو لوگوں نے سارے مسائل بھول کر بس ایک ہی مسئلے کا ذکر کیا۔ اور وہ مسئلہ، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ تھے جن کی روحانی طاقت نے کالی ماتا کے پجاریوں میں خوف و ہراس کی شدید لہر دوڑا دی تھی۔ پنڈت سیوک نے تحقیر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پجاریوں کی شکایات سنیں اور پھر نہایت متکبرانہ لہجے میں کہا۔

''بس یہ اس ملیچھ (مسلمان) کی آخری رات ہے۔ کل صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ماتا کی دھرتی پاک ہو جائے گی۔''

یہ سن کر مندر کے پجاری ''پنڈت سیوک رام کی جے'' کے نعرے بلند کرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ انہیں یقین تھا کہ مسلمان درویش صبح تک زندہ نہیں رہے گا۔ اور اس یقین کی ایک ہی وجہ تھی کہ پنڈت سیوک جس شخص کی موت کی پیش گوئی کر دیتا تھا، اس کی موت واقع ہو جاتی تھی۔

جب رات کے وقت مندر، پجاریوں سے خالی ہو گیا تھا تو پنڈت سیوک رام نے اپنے مخصوص کمرے میں پہنچ کر آگ روشن کی۔ پھر آٹے کا ایک بڑا پتلا بنایا۔ اور اس پُتلے کے ماتھے پر سنسکرت زبان میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا نام لکھا۔ اس کے بعد پنڈت سیوک رام پُتلے کو ہاتھ میں لے کر اپنا مخصوص منتر پڑھنے لگا۔ پھر اُس نے سات پھونکیں ماریں اور آٹے کے پُتلے کو بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔

مگر وہ بڑا ہی ناقابلِ یقین منظر تھا۔ جیسے ہی آٹے کا پُتلا آگ میں گرا، ایک بھڑکتا ہوا شعلہ پنڈت سیوک رام کی طرف لپکا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ شعلے نے کالی ماتا کے سب سے بڑے پجاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

پھر پورا مندر، پنڈت سیوک رام کی دردناک چیخوں سے گونجنے لگا۔

''اے ماتا!...... اپنے پجاری کی مدد کو آ...... اے مہان دیوی! اپنے نام لیوا کو آگ سے بچا۔''

پنڈت سیوک رام کی ہولناک چیخیں سن کر مندر کے سارے خدمت گار گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور مہا پجاری کے کمرے کی طرف بھاگے۔ پنڈت سیوک رام، منتر پڑھتے وقت اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی کمرہ اندر سے بند تھا اور وہ کسی ذبح ہونے والے جانور کی طرح چیخ رہا تھا۔

''تم لوگ کہاں ہو؟...... مجھے اس آگ سے بچاؤ۔''

آخر مندر کے خدمت گاروں نے کمرے کا دروازہ توڑ دیا۔ اور جب وہ اندر داخل ہوئے تو پنڈت سیوک رام، شعلوں میں لپٹا ہوا چیخ چیخ کر مندر کے خدمت گاروں کو اپنی مدد کے لئے پکار رہا تھا۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر خدمت گار اُلٹے پاؤں بھاگے اور پانی کی بالٹیاں بھر کر لائے تاکہ پنڈت سیوک رام کے بدن میں لگی ہوئی آگ کو بجھا سکیں۔ مگر ان کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ پانی کی بھری ہوئی بالٹیاں مسلسل پھینک رہے تھے، مگر آگ بجھنے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ جیسے وہ پانی نہیں، مٹی کا تیل تھا۔ یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھ کر مندر کے

خدمت گار کمرے سے بھاگ گئے اور پنڈت سیوک رام جل کر کوئلے کا ایک ڈھیر بن گیا۔

"پنڈو" کے سردار اور جاگیردار اس صبح کے منتظر تھے جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو جل کر خاک ہو جانا تھا یا پنڈت سیوک رام کے بقول بنگال کی مقدس سرزمین کو ایک مسلمان کے وجود سے پاک ہو جانا تھا۔ پھر جب اہلِ ہنود کی یہ جماعت اس درخت کے نیچے پہنچی جہاں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ قیام فرماتے تو بت پرستوں کی آنکھیں یہ منظر دیکھ کر فرطِ حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مسلمان درویش حسبِ سابق نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنی عبادت میں مشغول تھا۔

پھر جب حیرت اور سکوت کی یہ کیفیت زائل ہو گئی تو پنڈو کے یہ معزز سردار اور جاگیردار شدید ناگواری کی حالت میں کالی ماتا کے مندر کی طرف پلٹے تاکہ پنڈت سیوک رام کو بتا سکیں کہ مسلمان درویش مکمل طور پر محفوظ ہے اور اس پر کیا جانے والا ہلاکت خیز عمل بالکل بے اثر ثابت ہوا ہے۔ جب یہ لوگ مندر پہنچے تو ایک انتہائی لرزہ خیز اور دہشت ناک خبر اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ حضرت جلال الدین تبریزیؒ کو اپنے ہلاکت خیز منتر سے جلانے والا خود ہی جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔

کالی ماتا کے مندر میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ ہزاروں پجاری جمع تھے اور ان کے سامنے پنڈت سیوک رام کی جلی ہوئی لاش رکھی تھی۔ جسے دیکھتے ہی جسموں میں شدید خوف کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اور دیکھنے والے اپنی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔

پنڈت سیوک رام کی عبرت ناک موت نے "پنڈو" کے بت پرستوں پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا اور بڑے بڑے پنڈت، مہنت، سادھو، جوگی اور برہمن کہنے لگے تھے۔ "یہ ہندو دھرم کے لئے اچھا شگون نہیں ہے۔"

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ہزاروں ہندوؤں نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کر لیا۔ شہرہ آفاق سیاح ابنِ بطوطہ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"بڑے پجاری کی موت نے پنڈو کے باشندوں پر لرزہ طاری کر دیا تھا اور انہیں یقین آ گیا تھا کہ ہندو دھرم کے مقابلے میں اسلام زیادہ روحانی طاقت رکھتا ہے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی کرامات کے آگے اہلِ ہنود کے سارے منتر باطل ٹھہرے تھے۔ نتیجتاً سارے بت پرستوں نے اسلام کی چوکھٹ پر اپنے سر ٹیک دیئے اور پورے زور و شور کے ساتھ اللہ کی وحدانیت اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کا اقرار کر لیا۔"

آگے چل کر ابنِ بطوطہ لکھتا ہے۔ "صدیوں سے کفر کی بنیادوں پر بسایا ہوا شہر ایک انقلابِ عظیم سے دوچار ہوا۔ وہ کیسا عجیب منظر تھا کہ جن پجاریوں نے نہایت جوشِ عقیدت کے ساتھ شب و روز محنت کر کے "کالی ماتا" کا مندر تعمیر کیا تھا، اب وہی لوگ با آواز بلند کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرتے ہوئے اسی مندر کو ڈھا رہے تھے۔"

پھر کچھ دن بعد اسی زمین کے ٹکڑے پر ایک اور جانفزا منظر اُبھرنے لگا۔ بت خانے کی بنیادیں کھود کر خانۂ خدا کی تعمیر کی جا رہی تھی۔ جہاں صبح و شام ناقوس کی آوازیں گونجا کرتی تھیں، اب وہاں پانچوں وقت اللہ اکبر کی صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ کچھ دن پہلے پنڈو میں ہر طرف مندر ہی مندر دکھائی دیتے تھے اور اب وہی شہر مسجدوں کا شہر کہلانے لگا تھا۔ جہاں ہر طرف خانۂ خدا کے بلند مینار، اللہ کی کبریائی بیان کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ بنگال میں آج مسلمانوں کی جو کثرت نظر آتی ہے، وہ سب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا روحانی فیض ہے۔

ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے۔ "جب میں دہلی میں مقیم تھا، میں نے سلسلہ سہروردیہ کے عظیم بزرگ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے کشف و کرامات کا بہت ذکر سنا تھا۔ اس لئے میرے دل میں حضرت شیخ کے دیدار کی شدید آرزو

تھی۔ پھر جب میں نے مقامی لوگوں سے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خانقاہ کا پتہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت شیخ بدایوں تشریف لے جا چکے ہیں۔ بدایوں، دارالحکومت دہلی سے قریب تھا، اس لئے مجھے کوئی فکر لاحق نہیں ہوئی۔ میں نے جلدی جلدی اپنے ضروری کاموں کو تکمیل تک پہنچایا اور دل میں جذبہ اشتیاق لئے ہوئے بدایوں جا پہنچا۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اس علاقے میں اس قدر مشہور تھے کہ ہر خاص و عام، ہندو اور مسلم آپؒ کے اسمِ گرامی سے واقف تھا۔ میں نے ایک راہ گیر سے حضرت شیخ کی خانقاہ کا پتہ پوچھا تو اس نے بڑی آسانی اور وضاحت کے ساتھ مجھے خانقاہ کا راستہ بتا دیا۔

پھر جب میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خانقاہ میں داخل ہوا تو میرا شوقِ دید اپنے عروج پر تھا اور جذبات کی وارفتگی ناقابل بیان تھی۔ مگر اس وقت میری مایوسی کی انتہا نہیں رہی، جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ، بدایوں سے بنگال تشریف لے جا چکے ہیں اور ان کے خلیفہ، شیخ علیؒ یہاں موجود ہیں۔ کچھ دیر تک مجھ پر شدید نا اُمیدی کی کیفیت طاری رہی اور میں سوچتا رہا کہ شاید میری قسمت ہی میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے ملاقات نہیں لکھی گئی ہے۔ پھر میں نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور سوچا کہ اگر حضرت شیخ کا دیدار ممکن نہیں تو ان کے خلیفہ ہی سے ملاقات کر لوں۔ کچھ نہ کچھ تو فیضِ روحانی حاصل ہو ہی جائے گا۔

پھر اسی خیال سے شیخ علیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ بڑے متواضع اور منکسر المزاج درویش ہیں۔ اپنے مسند سے کھڑے ہو کر مجھے گلے سے لگایا اور بہت محبت سے پیش آئے۔ خود بہت سادہ اور معمولی غذا استعمال کرتے ہیں۔ مگر میری خاطر مدارات لذیذ کھانوں اور دل پسند مشروبات سے کی۔

میں کئی دن تک شیخ علیؒ کی خانقاہ میں مقیم رہا۔ پھر جب مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ شیخ علیؒ ماضی میں ایک ہندو ڈاکو تھے اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے تصرفِ روحانی سے نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ ولایت کے درجۂ عظیم تک بھی پہنچے تو اس واقعہ نے مجھے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا اور بھی گرویدہ بنا دیا۔ مگر یہ سوچ کر اُداس ہو گیا کہ میرے اور حضرت شیخ کے درمیان طویل فاصلے حائل ہیں۔ پھر شوقِ دیدار کی تسکین کس طرح ہو گی؟

آخر کچھ دن تک بدایوں میں قیام کرنے کے بعد جب میں رخصت ہونے لگا تو شیخ علیؒ نے مجھے گلے لگاتے ہوئے فرمایا۔ ''انشاء اللہ میرے پیر و مرشد سے تمہاری ملاقات ہو کر رہے گی۔ یہ بات لکھی جا چکی ہے۔''

شیخ علیؒ کی بات سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور سوچنے لگا کہ جب مرید کے کشفِ باطن کا یہ حال ہے تو پھر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ، معرفت کے کس مقام پر فائز ہوں گے؟ اور ان کی روشن ضمیری کی کیا کیفیت ہو گی؟

بظاہر یہ ملاقات ناممکن نظر آ رہی تھی۔ مگر یکایک حالات نے ایسی کروٹ لی کہ میں بنگال جا پہنچا اور مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ ''پنڈو'' میں قیام فرما ہیں۔ میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ابھی میں پنڈو سے تین چار میل دور تھا کہ اچانک دو افراد میرے پاس آئے اور آتے ہی بڑی محبت کے ساتھ سلام کیا۔ میں نے حیران ہو کر ان دونوں سے پوچھا۔

''میں آپ حضرات کو نہیں پہچانتا۔ پھر اس یگانگت اور گرم جوشی کی وجہ؟'' وہ دونوں اجنبی ظاہری شکل و صورت سے بہت ثقہ، مؤدب اور شائستہ نظر آ رہے تھے۔

''مگر ہم آپ کو خوب پہچانتے ہیں۔'' ان میں سے ایک شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پیر و مرشد نے فرمایا ہے کہ آپ ان کے مہمانِ خاص ہیں...... اس لئے ہم آپ کے استقبال کو حاضر ہوئے ہیں۔''

میں نے کسی قدر حیرت زدہ لہجے میں ان دونوں اجنبی افراد سے پوچھا۔ "تمہارے پیرومرشد کون ہیں؟"

"حضرت شیخ جلال الدین سہروردی تبریزیؒ۔" دوسرے شخص نے اس طرح اپنے پیرومرشد کا نام لیا کہ اس کا سر عقیدت سے خم ہو گیا تھا۔"

آگے چل کر اس واقعہ کے بارے میں ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے۔ "اُس شخص کا جواب سن کر کچھ دیر کے لئے مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ پھر میں نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مریدوں سے پوچھا۔ "مگر تم لوگوں نے مجھے پہچانا کیسے؟ جبکہ آج سے پہلے ہماری ملاقات نہیں ہوئی ہے۔"

"پیرومرشد نے ہمیں آپ کا حلیہ بتا دیا تھا۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ایک مرید نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

مجھے صوفیائے کرام کے کشفِ باطن کا اندازہ تھا مگر میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری ظاہری شکل وصورت بھی حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے پیشِ نظر ہو گی۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔

مجھے خاموش پا کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ایک مرید نے پوچھا۔ "محترم مہمان! کیا آپ وہ نہیں ہیں جو ہمارے پیرومرشد کو دہلی میں تلاش کر رہے تھے؟"

ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مرید کا سوال سن کر میرے ذہن کو ایک اور جھٹکا لگا کہ کیا شیخ میری ہر کیفیت سے باخبر ہیں؟

فوراً ہی حضرت تبریزیؒ کے دوسرے مرید نے مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا آپ وہ نہیں ہیں جو پیرومرشد کا دیدار کرنے کے لئے دہلی سے بدایوں تشریف لے گئے تھے؟"

یہ سنتے ہی مجھ پر شدید اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی اور میں بے اختیاری کے عالم میں بول اُٹھا۔

"ہاں میں وہی ہوں...... ہاں میں وہی ہوں...... مجھے اپنے پیرومرشد کی خدمت میں لے چلو۔"

پھر جب میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی مجلسِ عرفان میں داخل ہوا تو دیوار و در سے ایک عجیب سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ حاضرین محفل دست بستہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے میری طرف دیکھا اور آپؒ کے چہرۂ مبارک پر خوشی کا گہرا رنگ اُبھر آیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہزاروں معزز افراد نے میری میزبانی کی ہے، مگر جس طرح ایک قطبِ دوراں نے مجھے سرفراز کیا، وہ میری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔"

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے اپنی اس ملاقات کے بارے میں ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے۔ "جب میں مسند کے قریب پہنچا تو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے کھڑے ہو کر مجھے گلے سے لگایا اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"جب بفضلِ خدا یہ ملاقات طے پا چکی تھی تو تم اس قدر پریشان کیوں تھے؟ جب وہ ذاتِ پاک کسی امر کا ارادہ کر لیتی ہے تو پھر ساری کائنات مل کر بھی اسے نہیں ٹال سکتی۔"

میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے اس انکشاف پر حیران رہ گیا۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ اس وقت حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی عمر مبارک 50 سال کے قریب تھی۔ آپؒ دُبلے پتلے اور دراز قامت انسان تھے۔ چہرۂ مبارک سے ایسا جلالِ روحانی جھلکتا تھا کہ کوئی شخص زیادہ دیر تک آپؒ کی طرف دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جب میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوا تو

اس وقت آپؒ ایک نہایت دلکش چغہ پہنے ہوئے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں یہ خواہش کی کہ کاش شیخ اپنا لباس مجھے عنایت کر دیں۔ پھر جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا درس ختم ہوا تو آپؒ نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ لباس پہننا چاہتے ہو؟''

میں اپنی آنکھوں سے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی روشن ضمیری کا اس قدر مشاہدہ کر چکا تھا کہ آپؒ کی یہ بات سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ بلکہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ اور انتہائی وارفتہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''کاش! ایسا ہو کہ آپ کی یہ نشانی ہر وقت میرے پاس رہے۔''

''بس کچھ دن تم بھی یہ لباس پہن لو۔'' حضرت شیخ نے میری عرضداشت سن کر مسکراتے ہوئے فرمایا اور وہ خوبصورت چغہ اُتار کر مجھے پہنا دیا۔

''کچھ دن کیوں؟'' میں نے شکر گزاری کے طور پر عرض کیا۔ ''میں حضرت شیخ کے اس عطیۂ خاص کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گا۔ ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں کروں گا۔''

''دراصل یہ چغہ میں نے اپنے بھائی کے لئے بنایا ہے۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''اب یہ اتفاق ہے کہ تم بھی اس لباس کی خواہش کر بیٹھے۔ آخر مہمان ہو، اس لئے تمہاری دلداری بھی ضروری ہے۔''

اس واقعہ کے متعلق ابنِ بطوطہ مزید تحریر کرتا ہے۔

''مجھے حضرت شیخ کی یہ نشانی پا کر جس قدر خوشی ہوئی تھی، اب اسی قدر دکھ ہونے لگا۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے میرے چہرے سے دلی کیفیت کا اندازہ کر لیا اور نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''تم یکا یک پریشان کیوں نظر آنے لگے؟''

میں نے بصدِ ادب و احترام عرض کیا۔ ''آپ اپنے بھائی کے لئے دوسرا لباس بھی بنوا سکتے ہیں۔ یہ چغہ بطورِ خاص مجھے عنایت فرما دیں۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے میری بات سن کر فرمایا۔ ''میرے پاس اور بھی چغے ہیں۔ تم ان میں سے کوئی دوسرا پسند کر لو۔''

میں نے عرض کیا۔ ''شیخ محترم! مجھے بس یہی پسند ہے۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے میری ضد دیکھ کر بے نیازانہ انداز میں فرمایا۔ ''تمہاری مرضی...... مگر یہ چغہ تمہارے پاس نہیں رہے گا...... ایک کافر بادشاہ تم سے اسے چھین کر میرے بھائی کو پہنچا دے گا۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے عجیب بات کہی تھی جو میری عقل و فہم سے ماورا تھی۔ میں ہندوستان میں مقیم تھا اور ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی...... پھر میں کس ملک میں جاؤں گا، جہاں کا بادشاہ کافر ہو گا؟ اور وہ مجھ سے یہ چغہ کس طرح چھینے گا؟ ...... حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی بات سن کر میرے ذہن میں بہت سے سوالات اُبھر رہے تھے...... مگر میں خاموش رہا۔''

آگے چل کر ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے۔ ''میں کئی ہفتے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خانقاہ میں مقیم رہا جہاں بے شمار ضرورت مند ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ حضرت شیخ کا ایک بڑا لنگر خانہ تھا، جس کے ذریعے بہت سے بھوکے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔ بے لباس لوگوں کو کپڑے عطا کئے جاتے تھے، بیماروں کو اس کنوئیں سے پانی پلایا جاتا تھا، جس میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ صبح و شام دم کیا ہوا پانی اپنے دستِ مبارک سے ڈال

دیتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان بیماروں کو شفایاب ہوتے دیکھا ہے جنہیں اس زمانے کے بڑے بڑے حکیم اور طبیب لاعلاج قرار دے چکے تھے۔

''پنڈو'' میں اپنے قیام کے دوران ابنِ بطوطہ نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی ایک عجیب کرامت دیکھی۔ اس حوالے سے یہ شہرہ آفاق سیاح اپنے سفرنامے میں تحریر کرتا ہے۔ ''حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ فجر کی نماز خانہ کعبہ میں پڑھا کرتے تھے۔ بہت دن تک حضرت شیخ کا یہ عمل ایک راز ہی رہا۔ مگر بعد میں مکہ معظمہ سے حج کر کے آنے والوں نے یہ راز فاش کر دیا کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ، نمازِ فجر خانہ کعبہ میں ادا کرتے ہیں۔ خود میں نے بھی اپنے قیام کے دوران دیکھا کہ جب نمازِ فجر کی صف بندی ہوتی تھی تو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ وہاں موجود نہیں ہوتے تھے۔ پہلے دن جب ایسا ہوا تو میں نے سوچا کہ شاید حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی طبیعت ناساز ہے۔ اسی وجہ سے آپ شریکِ نماز نہیں ہو سکے ہیں۔ پھر جب نمازِ ظہر کا وقت آیا تو حضرت شیخ موجود تھے۔ میں نے بہت غور سے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا۔ کسی بیماری یا نقاہت کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں تھی۔ چہرہ پہلے کی طرح شگفتہ اور پُرنور تھا۔

دوسرے دن جب فجر کی اذان ہوئی تو میں نے بطورِ خاص حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے حجرۂ مبارک پر نظر رکھی۔ مگر حضرت شیخ، دروازے سے باہر تشریف نہیں لائے۔ یہاں تک کہ نماز کھڑی ہو گئی۔ پھر مجھے اس وقت شدید حیرت ہوئی، جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ حسب معمول نمازِ ظہر میں موجود تھے۔ میں خاموش رہا۔ مگر میرے ذہن میں ایک کشمکش سی شروع ہو گئی۔ 'شاید شیخ نمازِ فجر کے وقت کوئی مخصوص وظیفہ پڑھتے ہیں جس کی وجہ سے نماز ترک کر دیتے ہیں۔' پھر خود ہی سوچنے لگتا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ حضرت شیخ، عالم بھی ہیں اور پابندِ شریعت بھی۔ جب چاروں نمازیں باجماعت ادا کرتے ہیں تو پھر فجر کی جماعت میں کیوں شریک نہیں ہوتے؟ الغرض کچھ دن تک میں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر جب میرا ذہن اُلجھ گیا تو ایک دن تنہائی میں حضرت شیخ سے یہ سوال کر ہی بیٹھا۔ ''آخر یہ کیا راز ہے کہ آپؒ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا نہیں کرتے؟''

''آنکھ نہیں کھلتی ہو گی۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

''آپ کی خانقاہ میں اتنے خدمت گار اور مرید موجود ہیں۔ کسی کو بھی یہ ذمے داری سونپ دیں کہ وہ اذان کے وقت آپ کو نیند سے ہوشیار کر دیا کرے۔''

''کوئی کسی کو نہیں جگا سکتا...... جب تک حق تعالیٰ اسے توفیق نہ بخشے۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے انتہائی پُرسوز لہجے میں فرمایا اور دوسری باتوں میں مشغول ہو گئے۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ میرے سوالوں کا واضح جواب دینا نہیں چاہتے۔ میں نے بھی مصلحتاً موضوع بدل دیا۔ مگر میرے ذہن کی یہ خلش برقرار رہی کہ ایسا عالم و فاضل اور پابندِ شریعت بزرگ نمازِ فجر باجماعت کیوں ادا نہیں کرتا۔ آخر میں نے ایک دن حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے خادمِ خاص سے بھی یہ سوال کر ڈالا۔ میری بات سن کر چند لمحوں کے لئے خادمِ خاص کے چہرے پر حیرت کا رنگ اُبھرا۔ مگر اس نے فوراً ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور بڑے بے نیازانہ انداز میں بولا۔

''پیر و مرشد کی باتیں، پیر و مرشد ہی جانیں...... ایک خادم کی کیا مجال کہ وہ مخدوم سے کوئی سوال کرے۔''

مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ خادمِ خاص بھی بات کو ٹالنے کی کوشش کر رہا ہے...... مگر میں اپنے ذہن و دل کی خلش اور اضطراب سے مجبور تھا۔ میں نے خادمِ خاص کو خدائے واحد کی قسم دیتے ہوئے کہا کہ اسے یہ راز بتانا ہی

ہوگا۔

میری بات سن کر خادمِ خاص بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔ پھر اس نے بہت پُرسوز لہجے میں کہا۔ ''تم نے اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر مجھے مجبور کر دیا ہے تو پھر مجھے بھی یہ حق حاصل ہے کہ میں تمہیں بھی اس طرح مجبور کر دوں۔''

خادمِ خاص کی بات سن کر میں نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کہنے لگا۔ ''جس طرح تم نے مجھے خدائے وحدۂ لاشریک کی قسم دے کر یہ راز فاش کرنے پر مجبور کر دیا ہے، اسی طرح میں بھی تمہیں اس ذاتِ پاک کی قسم دیتا ہوں کہ جو کچھ میری زبان سے سنو گے، اسے اپنے سینے کی گہرائیوں میں دفن کر کے رکھو گے۔''

ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے کہ جب میں نے وعدہ کر لیا تو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے خادمِ خاص نے نہایت پُرسوز لہجے میں کہا۔ ''میرے پیر و مرشد نے کبھی فجر کی نماز ترک نہیں کی......خواہ وہ کتنے ہی بیمار ہوں..... حضرت شیخ، فجر کی نماز خانۂ کعبہ میں ادا کرتے ہیں۔''

میں نے کھلی آنکھوں سے حضرت شیخ کی کئی کرامات دیکھی تھیں......مگر خانۂ کعبہ میں نمازِ فجر کی ادائیگی کا سن کر میری حیرت انتہا کو پہنچ گئی۔ کچھ دیر تک مجھ پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ پھر جب یہ کیفیت زائل ہوئی تو میں نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے خادمِ خاص سے پوچھا۔ ''تم یہ بات پورے یقین سے کسی سند کے بغیر کس طرح کہہ سکتے ہو؟''

میری بات سن کر یکایک خادمِ خاص کے چہرے پر ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ ''کیا میں اپنے پیر و مرشد کی روحانی عظمت کے قصے بیان کر کے تمہیں متاثر کرنا چاہتا ہوں؟ کیا میں تم سے کسی نفع یا مال و زر کا طالب ہوں؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے خادمِ خاص کا لہجہ جو کچھ دیر پہلے دوستانہ تھا، اچانک انتہائی تلخ ہو گیا تھا۔

میں نے فوراً ہی پُرزور الفاظ میں اپنی اس کوتاہی کی معذرت طلب کی۔ پھر جب خادمِ خاص کی ناگواری اور تلخی دُور ہو گئی تو اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات پیر و مرشد کے مریدین یا خدمت گار نہیں کہتے بلکہ وہ لوگ کہتے ہیں جنہوں نے حج کے دوران حضرت شیخ کو اپنی آنکھوں سے بیت اللہ میں نمازِ فجر ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس سلسلے میں پیر و مرشد کی سخت تاکید ہے کہ کسی غیر شخص سے اس بات کا ذکر نہ کیا جائے۔ مگر چونکہ تم نے حق تعالیٰ کی قسم دے دی تھی، اس لئے میں مجبور ہو گیا۔''

میں نے ایک بار پھر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے خادمِ خاص سے معذرت طلب کی۔ پھر مجھے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس وزیر کا قصہ یاد آ گیا، جس نے پلک جھپکتے ہی ملکہ بلقیس کا تخت، دربارِ سلیمانی میں حاضر کر دیا تھا۔

قارئین کی معلومات کے لئے ضروری ہے کہ ملکہ بلقیس کا مختصر تعارف پیش کیا جائے۔ بلقیس ایک خوب صورت اور ذہین عورت تھی، جسے ''ملکہ سبا'' کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ بلقیس کا باپ شرجیل بن مالک، یمن کا بادشاہ تھا۔ وہ اور اُس کی پوری قوم سورج کی پرستش کرتی تھی۔ زلیخا کی طرح ملکہ بلقیس کا نام لئے بغیر اس کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔

اہلِ ایمان بخوبی جانتے ہیں کہ جیسی بادشاہت، حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی، اس کی دوسری مثال پوری تاریخِ آدم میں نہیں ملتی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام، انسانوں کے ساتھ جنوں پر بھی حکومت کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے مزید انعام یہ فرمایا کہ آپ کے لئے ہوائیں مسخر کر دی گئی تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کسی

دور دراز علاقے میں جانا چاہتے تو یہی ہوائیں آپؑ کو بہت کم وقت میں وہاں پہنچا دیتیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں ہوائیں آج کل کے ہوائی جہازوں کا کام دیتی تھیں۔ مگر یہ انعام حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے مخصوص تھا۔ معتبر روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام چرندوں اور پرندوں، یہاں تک کہ چیونٹیوں کی زبان بھی سمجھتے تھے۔ ایک دن ہُد ہُد (پرندے) نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکہ بلقیس کے بارے میں خبر دی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فوری طور پر ملکہ بلقیس کے نام ایک خط تحریر کیا اور ہُد ہُد کو حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ "یہ خط کسی تاخیر کے بغیر یمن کی حکمران، ملکہ بلقیس تک پہنچا دے۔"

ہُد ہُد نے اپنے پیغمبر کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنی پرواز تیز کر دی اور محل میں پہنچ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ملکہ بلقیس کی گود میں ڈال دیا۔ ملکہ بلقیس نے بڑی حیرت کے ساتھ وہ خط پڑھا اور پھر اپنے دربانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے میرے معزز سردارو! یہ بڑا عجیب خط ہے جسے ایک پرندے نے میری طرف پھینکا ہے۔ یہ خط سلیمان کی جانب سے ہے اور اللہ رحمان و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ سلیمان نے لکھا ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی اختیار نہ کرو اور ایک اللہ پر ایمان لا کر میرے دربار میں حاضر ہو جاؤ۔ یہ ایک نہایت سنگین معاملہ ہے۔ مجھے واضح طور پر تنبیہہ اور سرزنش کی گئی ہے کہ میں صدیوں پرانا آبائی مذہب چھوڑ کر نیا مذہب قبول کر لوں۔ اس صورتِ حال کو کسی طور بھی ٹالا نہیں جا سکتا۔ مجھے مشورہ دو کہ آخر میں کون سا راستہ اختیار کروں؟ انکار یا اقرار؟" ملکہ بلقیس کے لہجے سے شدید پریشانی اور فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔

یمن کے تمام وزیر و امیر کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر بیک زبان بولے۔ "ہم نے تو اپنے بزرگوں سے یہی سنا ہے کہ جب بادشاہ دوسرے ملک میں داخل ہوتے ہیں تو سبزہ زاروں کو آگ لگا دیتے ہیں...... مقامی رعایا کو بے دریغ قتل کر دیتے ہیں اور معزز لوگوں کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔"

اگر ملکہ بلقیس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو اپنے سرداروں کے بیانات سن کر بدحواس ہو جاتی۔ مگر یمن کی حکمران نے غیر معمولی استقامت کا مظاہرہ کیا۔ ملکہ بلقیس فطری طور پر ایک شجاع اور ذہین عورت تھی۔ اس نے ضبط و تحمل کے ساتھ اپنے سرداروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں سلیمان کے دربار میں قیمتی تحائف بھیجتی ہوں۔ اگر اس نے میری بھیجی ہوئی نذر قبول کر لی تو پھر کوئی خطرہ نہیں۔"

"وہ کس طرح؟" یمن کے سرداروں نے حیرت زدہ لہجے میں اپنی ملکہ سے سوال کیا۔

ملکہ بلقیس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر سلیمان میرے ارسال کردہ قیمتی تحائف قبول کر لیتا ہے تو اس کی نیت ظاہر ہو جائے گی کہ اسے زر و جواہر کی ہوس ہے۔"

اس مختصر سی تقریر کے بعد ملکہ بلقیس نے یمن کے ایک انتہائی تجربہ کار اور ذہین شخص کو بہت سے قیمتی تحفے دے کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں بھیجا۔

اللہ کے برگزیدہ نبی نے ملکہ بلقیس کے بھیجے ہوئے قیمتی تحائف دیکھ کر نہایت پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ "کیا تم لوگ مال و زر دے کر مجھے خوش کرنا چاہتے ہو؟ میری نظر میں ان تحائف کی کوئی حیثیت نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میرے اللہ نے جو لاشریک ہے، مجھے اس قدر نعمتوں سے نوازا ہے کہ تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کسی تاخیر کے بغیر اپنی مملکت کی طرف واپس جاؤ اور اپنی ملکہ کو بتا دو کہ ہم عنقریب ایسا لشکر لے کر آئیں گے کہ تم لوگ

ان کا مقابلہ نہ کرسکو گے۔ ہم تمہیں تمہارے گھروں سے اس طرح ذلیل ورسوا کر کے نکالیں گے کہ تمہاری بربادی کے قصے سن کر دوسرے لوگ عبرت حاصل کیا کریں گے۔''

ملکہ بلقیس کے سفیر نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح معاملہ ٹل جائے۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی ایک نہ سنی اور وہ ناکام ونامراد، یمن کی طرف لوٹ گیا۔

سفیر کے جاتے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم میں سے کون ہے جو ملکہ بلقیس کا تخت میرے پاس لے آئے، اس سے پہلے کہ یمن کی حکمراں مطیع وفرماں بردار ہوکر میرے دربار میں حاضر ہو۔''

اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں انسانوں کے ساتھ جنات کی بھی ایک جماعت موجود تھی۔ اپنے پیغمبر کا ارشاد سن کر ایک قوی ہیکل جن کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا۔

''اے میرے پیغمبر بادشاہ! آپ ایک دربار سے دوسرا دربار کرنے نہیں پائیں گے کہ میں، ملکہ بلقیس کا تخت لا کر آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔''

جیسے ہی قوی ہیکل جن کی بات ختم ہوئی، ایک آدم زاد اپنی نشست پر کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا۔ ''اے میرے پیغمبر و بادشاہ! میں پلک جھپکتے ہی ملکہ بلقیس کا تخت حاضر کر دوں گا۔'' پھر اس آدم زاد نے دربار کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھئے، تخت موجود ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام اور دوسرے درباریوں نے اس طرف دیکھا۔ ایک نہایت دلکش تخت موجود تھا، جس میں بہت قیمتی زروجواہر جڑے ہوئے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام بے اختیار پکار اُٹھے۔ ''یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کا مظاہرہ۔ اور جو کوئی شکر ادا کرتا ہے، اس کا شکر خود اس کے لئے مفید ہے۔ اور اگر کوئی ناشکر گزاری کرتا ہے تو میرا رب بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں عظیم وجلیل ہے۔''

اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے درباری خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ملکہ بلقیس کے تخت کو ایک ایسے زاویے سے رکھ دیا جائے کہ جب وہ یہاں آئے تو غیر محسوس طور پر اُس کی نظر تخت پر پڑ جائے۔

پھر جب ملکہ بلقیس، حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئی تو اس نے اپنے تخت کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک معزز درباری نے بلقیس کو حیرت واستعجاب میں دیکھ کر سوال کیا۔ ''ملکہ یمن اس قدر حیرت سے کیا دیکھ رہی ہیں؟ کیا اس تخت میں کوئی خاص بات ہے؟''

ملکہ بلقیس کی حیرت کا وہی عالم تھا۔ اس نے تخت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تخت میرے تخت سے ملتا جلتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ ہوبہو ویسا ہی ہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام کے درباری نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یہ آپ ہی کا تخت ہے، جسے دربار سے اُٹھوالیا گیا ہے۔'' جب ملکہ سبا، حضرت سلیمانؑ کے حضور پیش آئی تو اس نے بے اختیار کہا۔ ''میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی اور میں نے سرِ اطاعت خم کر دیا تھا۔ مگر جن چیزوں نے مجھے روک رکھا تھا، وہ میری آبائی رسمیں تھیں۔''

پھر ملکۂ یمن، حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہمراہ محل میں داخل ہوئی۔ فرش پر قدم رکھتے ہی ملکہ بلقیس نے گھبرا کر اپنے پائنچے چڑھا لئے کہ کہیں اس کا لباس نہ بھیگ جائے۔ دراصل وہ محل کے فرش کو پانی کا حوض سمجھ رہی

تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ بلقیس کی اس سراسیمگی کو دیکھ کر فرمایا۔ ''بے خوف و خطر چلی آؤ۔ یہ پانی نہیں، شیشے کا فرش ہے۔''

اس انکشاف پر ملکۂ یمن بے اختیار ہوگئی اور با آواز بلند کہنے لگی۔ ''اے میرے رب! آج تک میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی۔ اور اب میں نے سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔''

بعض روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے بعد میں ملکۂ بلقیس سے شادی کر لی تھی اور اسے یمن کی سلطنت پر بطورِ حکمران برقرار رکھا تھا۔ آپؑ ایک مہینے میں ایک بار اس سے ملنے یمن تشریف لے جاتے تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق ملکۂ بلقیس سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد بھی ہوئی۔

یہ ہے ملکۂ یمن کا مختصر واقعہ۔ اب ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار اور یمن کے درمیان سینکڑوں میل کا فاصلہ حائل تھا۔ پھر قرآنِ حکیم کے مطابق ایک آدم زاد نے پلک جھپکتے ہی ملکۂ بلقیس کا تخت دربارِ سلیمانی میں کس طرح پہنچا دیا تھا؟ اس سوال کا جواب خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''ہم نے اس آدم زاد کو کتاب کا علم بخشا تھا۔''

معتبر روایات کے مطابق وہ حضرت آصف بن برخیاہ تھے، جو وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز تھے۔ سیاح ابنِ بطوطہ کو اس بات پر حیرت تھی کہ بنگال اور مکہ معظمہ میں طویل فاصلہ حائل ہے۔ پھر حضرت جلال الدین تبریزیؒ کس طرح نمازِ فجر خانہ کعبہ میں ادا کرتے تھے؟ اور نماز کی ادائیگی کے بعد پنڈو واپس آ جاتے تھے۔ پھر جب اسے ملکۂ بلقیس کے تخت اور حضرت آصف بن برخیاہ کا واقعہ یاد آیا تو ساری ذہنی خلش دُور ہوگئی اور ابنِ بطوطہ کو یقین آ گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ہر زاویۂ اظہار پر قادر ہے۔ وہ اپنے خاص بندوں کے لئے ہر مشکل کو آسان اور ہر طوالت کو انتہائی مختصر کر دیتا ہے۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کو بھی حق تعالیٰ کی طرف سے یہ خصوصی رعایت حاصل تھی۔ اور آپؒ کے قدموں کے نیچے زمین کی وسعتوں کو سمیٹ دیا گیا تھا۔

مشہور بزرگ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ بھی ان ہی بزرگوں میں شامل تھے، جنہیں یہ وصفِ خاص عطا کیا گیا تھا۔ آپؒ کسی سواری کی مدد کے بغیر حضرت علاؤالدین چشتیؒ کی نمازِ جنازہ پڑھانے بہاولپور سے بنگال تشریف لے گئے تھے اور نماز پڑھانے کے کچھ دیر بعد اپنی خانقاہ میں واپس لوٹ آئے تھے۔ اسی لئے آپؒ کو ''جہانیاں جہاں گشت'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے...... یعنی دنیا بھر کی سیر کرنے والا...... ورنہ آپؒ کا خاندانی نام تو میر سیّد جلال الدینؒ تھا۔

الغرض ابنِ بطوطہ کچھ دن تک ''پنڈو'' میں مقیم رہ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی روحانی برکات سے فیض یاب ہوتا رہا۔

ایک دن حضرت شیخ اپنے احباب اور مریدانِ خاص کے ساتھ دریا کے کنارے تشریف فرما تھے۔ اس وقت سیاح ابنِ بطوطہ بھی وہاں موجود تھا۔ یکایک حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہوگیا اور آپؒ نے با آواز بلند فرمایا۔ ''انا للہ و انا الیہ راجعون۔'' (جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے اور اسے اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے)

عام طور پر اہلِ ایمان اس آیتِ مقدسہ کی تلاوت اس وقت کرتے ہیں، جب کسی مسلمان کے انتقال کی خبر سنتے ہیں۔ تمام حاضرین، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی طرف دیکھنے لگے۔ آپؒ نے کسی قدر اُداس لہجے میں فرمایا۔ 'عزیزو! ہر طلوع کا انجام غروب اور ہر زندگی کا اختتام موت ہے۔ افسوس! شیخ الاسلام نجم الدین اب اس

دنیا میں نہیں رہے۔ آیئے ان کی نمازِ جنازہ پڑھ لیں۔ ایک مسلمان کو دنیا ہی میں اپنا حساب صاف کر لینا چاہئے۔ آخرت پر اُٹھا کر نہیں رکھنا چاہئے۔"

ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی اور پھر نہایت پُرسوز لہجے میں یہ دعا کی۔

"اے غفور الرحیم! تُو دلوں کا حال جاننے والا ہے۔ میں نے نجم الدین صغریٰ کو معاف کر دیا۔ تُو بھی اپنے بے پناہ کرم اور بے مثال رحمت کے صدقے میں اُنہیں معاف فرما دے۔"

ایسی ہی دعا محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے بھی اپنے ایک مخالف کے بارے میں کی تھی۔ دہلی کا ایک با اثر شخص حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے شدید بغض و عداوت رکھتا تھا۔ وہ اپنی نجی محفلوں میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو بہت برے الفاظ سے یاد کرتا تھا۔ آپؒ کی شان میں ایسے نازیبا اور ناشائستہ کلمات استعمال کرتا، جنہیں تحریر نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت محبوب الٰہی کا کوئی معتقد یا مرید اُس رئیس کی بے ہودہ گفتگو سن کر شکایتاً احتجاج کرتا تو وہ اور بھی سرکشی اختیار کر لیتا۔

"میں اسی لئے سرِ عام گالیاں بکتا ہوں کہ تم انہیں پیر تک پہنچا دو۔ اگر وہ میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے تو بگاڑ لے۔"

جب کوئی مرید یا خدمت گار، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سامنے اس شخص کی بے ہودہ حرکات کا ذکر کرتا تو آپؒ نہایت صبر و تحمل کے ساتھ فرماتے۔ "تم ایسی باتوں پر کان دھر کے اپنا وقت کیوں برباد کرتے ہو؟ ممکن ہے کہ میری ذات سے اسے کوئی شدید تکلیف پہنچ گئی ہو اور وہ اس طرح اپنے دل کا غبار ہلکا کرنا چاہتا ہو....... اسے اس کا کام کرنے دو اور تم اپنے کاموں میں مشغول رہو۔ قیامت کے دن تم سے اس شخص کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔"

پھر ایک دن کسی مرید نے اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا۔ "سیّدی! کل وہ مردود مر گیا...... اور اللہ کی زمین اس کے بوجھ سے ہلکی ہو گئی۔"

اپنے دشمن کے مرنے کی خبر سن کر محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا چہرۂ مبارک اُداس ہو گیا۔ پہلے آپؒ نے انا اللہ و انا الیہ راجعون پڑھا...... اور پھر اپنے اُس مرید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "دشمن کی موت پر خوشی کا اظہار کیا معنی رکھتا ہے؟ جبکہ کل تمہیں اور مجھے بھی اسی مرحلے سے گزرنا ہے۔"

اس کے بعد حضرت نظام الدین اولیاء اُس قبرستان میں تشریف لے گئے جہاں وہ شخص دفن کیا گیا تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ بہت دیر تک اس کی قبر پر کھڑے یہ دُعا کرتے رہے۔

"اے اللہ! یہ بندۂ عاجز تجھ سے التجا کرتا ہے کہ تُو نظام الدین کے حساب میں اس شخص کی گرفت نہ کرنا اور اسے اپنی رحمتِ بے کنار سے مایوس نہ کرنا کہ تیرے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں ہے۔"

بالآخر کچھ دن تک "پنڈو" میں قیام کرنے کے بعد سیاح ابنِ بطوطہ اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ رخصت ہونے سے قبل حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اُسے گلے سے لگایا اور دعا دی۔ "اللہ تعالیٰ تمہارے سفر کو آسان کرے۔"

ابنِ بطوطہ تحریر کرتا ہے۔ "میں نے حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے وہ چغہ حاصل تو کر لیا مگر میرے ذہن میں ہر وقت یہ الفاظ گونجتے رہتے تھے۔

"یہ چغہ تیرے پاس نہیں رہے گا۔ ایک کافر بادشاہ تجھ سے چھین کر میرے بھائی تک پہنچا دے گا۔"

میں نے اس سلسلے میں یہ احتیاطی تدبیر اختیار کی تھی کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ادا کردہ چغے کو پہن کر کسی محفل میں نہیں جایا کرتا تھا۔ جب بھی دل چاہتا، اس خوبصورت لباس کو اپنے گھر میں کچھ دیر پہن کر خوش ہو لیتا۔ مجھے کسی بھی حال میں ایک عظیم بزرگ کی اس نشانی سے محروم ہونا گوارا نہیں تھا۔ مگر جب تنہائی میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی کرامات پر غور کرتا تو کچھ دیر کے لئے خوف زدہ سا ہو جاتا کہ حضرت شیخ کے فرموات عالم اسباب میں حاضر ہو کر رہتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میرا پسندیدہ چغہ میرے پاس محفوظ رہے غرض اسی ذہنی کشمکش میں دن گزرتے رہے۔ میں اپنے طور پر اس قدر احتیاط کرتا کہ حضرت قطب الدین تبریزیؒ کے بخشے ہوئے لباس کو دوستوں کی نظروں سے بھی پوشیدہ رکھتا۔

پھر میں بنگال سے نکل کر مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا چین پہنچا۔ چین کا قانون تھا کہ جب کوئی غیر ملکی سیاح اس ملک میں داخل ہوتا تھا تو سرکاری کارندے اسے بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ بادشاہ ان سیاحوں سے مختلف سوالات کرتا۔ اور پھر سرکاری طور پر ان لوگوں کو مراعات فراہم کرتا تاکہ وہ آسانی کے ساتھ چین کی سیر کر سکیں۔

میں بھی بے خوف و خطر بادشاہ کے سامنے پیش ہو گیا۔ مگر حیرت انگیز طور پر چین کے بادشاہ نے مجھ سے سیر و سیاحت کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔ بس اتنا کہا کہ تمہارا سامان کہاں ہے؟

میں نے بادشاہ کو بتا دیا کہ میرا اسبابِ سفر سرکاری سرائے میں موجود ہے۔ بادشاہ نے فوری طور پر اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ میرا سامانِ سفر تلاشی کے لئے پیش کیا جائے۔

مجھے چین کے بادشاہ کے اس حکم پر شدید حیرت ہوئی کہ ایک ملک کا حکمران میرے سامان کی تلاشی لے گا...... جبکہ یہ کام معمولی کارندوں اور نوکروں کا تھا۔ ابھی میں حیران ہو ہی رہا تھا کہ سرکاری کارندے میرا سامانِ سفر اٹھا لائے اور بادشاہ کے سامنے رکھ دیا۔

میرا خیال تھا کہ بادشاہ اپنے خدمت گاروں کو تلاشی کا حکم دے گا۔ مگر اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب بادشاہ نے مجھے کہا کہ اس صندوق کا تالا کھولا جائے۔

میں نے اسی حیرت کے عالم میں صندوق کا تالا کھول دیا۔ پھر بادشاہ اپنے تخت سے اٹھا اور اس نے ایک ایک کر کے صندوق میں رکھے ہوئے سارے کپڑے نکال کر باہر ڈال دیئے۔ ایک میں ہی نہیں، سارے درباری، بادشاہ کے اس عمل کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آخر چین کے بادشاہ کو کس شے کی تلاش ہے۔ یہاں تک کہ پورا صندوق خالی ہو گیا۔

کچھ دیر کے لئے بادشاہ کے چہرے پر کسی قدر حیرت کے آثار نمایاں ہوئے۔ وہ کچھ دیر تک خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے ایک ایک کپڑے کو اٹھا کر اس طرح جھاڑنا شروع کیا جیسے اس کے اندر کوئی چیز چھپی ہوئی ہو۔ میری حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا کہ آخر بادشاہ کیا ڈھونڈ رہا ہے۔

تمام درباری، امیر، وزیر اور خدمت گار بھی پتھر کے مجسموں کی طرح ساکت یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ ایک ایک کر کے کپڑوں کو جھاڑتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا بخشا ہوا چغہ زمین پر گر پڑا۔ اسے دیکھتے ہی بادشاہ کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک آ گئی اور چہرے پر خوشی کا گہرا رنگ اُبھر آیا۔ پھر اس نے تیزی سے جھک کر وہ چغہ اُٹھا لیا۔

میں نے اس چغے کو لوگوں کی نظروں سے بچانے کے لئے غیر معمولی احتیاط برتی تھی۔ اسے سب کپڑوں کے

نیچے ایک لباس کے اندر چھپا کر رکھا تھا۔ بادشاہ پہلی کوشش میں ناکام رہا، پھر اس نے تمام کپڑوں کو جھاڑنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اُسے مطلوبہ شے حاصل ہو گئی۔ اس وقت مجھ پر جو کیفیت طاری ہو گئی، میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میرے دماغ میں خیالات کی آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اتنے بڑے بادشاہ کو اس چغے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

پھر یکایک میرے ذہن میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے الفاظ گونجنے لگے۔

''ایک کافر بادشاہ تجھ سے یہ چغہ چھین کر میرے بھائی تک پہنچا دے گا۔''

یہ حقیقت تھی کہ چین کا بادشاہ مسلمان نہیں تھا۔ اس طرح حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی ایک پیش گوئی درست ثابت ہو چکی تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بادشاہ کو اس چغے کے بارے میں کس نے بتایا تھا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس مخصوص لباس کو اس نے کس طرح پہچان لیا تھا؟...... ابھی میں اپنے خیالات کے گرداب میں چکرا رہا تھا کہ بادشاہ کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے درباریوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ ''ہمارے معزز مہمان کو قیمتی خلعتیں پیش کی جائیں اور بطورِ خاص اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے۔''

بادشاہ کی بات سن کر میں اپنے خیالات کی دنیا سے باہر نکل آیا اور اس سے درخواست کرنے لگا۔ ''میرے تمام کپڑے اور ساز و سامان لے لیں مگر یہ چغہ چھوڑ دیں کہ یہ کسی کا دیا ہوا تحفہ ہے۔''

''مگر اس پر تمہارا کوئی حق نہیں۔ یہ تحفہ کسی اور کے لئے ہے۔'' بادشاہ نے محبت آمیز لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ حقدار کو اس کا حق ملنا چاہئے اور میں یہ بات جانتا ہوں کہ تم اس لباس کے حق دار نہیں ہو۔''

ابنِ بطوطہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ میں نے چین کے بادشاہ کی بہت منت و سماجت کی مگر اس نے میری ایک نہیں سنی۔ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا دیا ہوا چغہ اپنے پاس رکھ لیا اور اس کے بدلے میں مجھے کئی قیمتی لباس، اعلیٰ نسل کا ایک گھوڑا اور نقد روپیہ دیا۔ مگر یہ تمام چیزیں میری محرومی کا علاج نہیں تھیں۔ میں اپنے سینے پر ایک عجیب سا بوجھ لئے ہوئے چین کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا اور اس ملک کی تہذیب و ثقافت کا جائزہ لیتا رہا۔

ابنِ بطوطہ لکھتا ہے۔ ''اس واقعے سے پہلے میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی یہ پیش گوئی کس طرح ظہور پذیر ہو گی؟ جب چین کے بادشاہ نے وہ چغہ مجھ سے چھین لیا تو پھر اندازہ ہوا کہ مردِ خدا کی بصیرت کیا ہوتی ہے اور اس کی آنکھیں مستقبل کی دیوار پر لکھی ہوئی تحریر کو کس طرح پڑھ لیتی ہیں۔ ابھی میں اس نعمت سے محروم ہو جانے پر افسوس ہی کر رہا تھا کہ ایک دن مجھے اسی شہر میں ایک اور درویش نظر آئے جو حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا وہی چغہ پہنے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے سکتہ سا ہو گیا۔

وہ درویش آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آئے اور پھر نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمانے لگے۔

''تمہارے لئے یہی اعزاز اور سعادت کافی ہے کہ تم نے کچھ دن تک اس مردِ حق کا دیدار کیا اور اس محترم ہستی کے مہمان رہے۔''

جب میں نے ان درویش سے ان کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت شیخ برہان الدینؒ تھے۔ پھر وہ مجھے اپنی خانقاہ میں لے گئے اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا وہ خط دکھایا جس میں تحریر تھا۔ ''برادرِ عزیز! تمہاری چیز عنقریب تم تک پہنچ جائے گی۔''

ابنِ بطوطہ لکھتا ہے کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا خط پڑھ کر بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''کارِ پاکاں برقیاسِ خودمگیر۔'' (پاکباز لوگوں کے کاموں پر اپنے ذہن سے قیاس آرائی نہ کر)
''پنڈوہ کے نومسلموں کی تعلیم وتربیت مکمل کرنے کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ بنگال کے دوسرے علاقے ''بندرگاہ دیوِمحل'' تشریف لے گئے۔ یہاں بھی اہلِ ہنود کا بہت بڑا بت خانہ تھا، جس پر مقامی بت پرست بہت ناز کرتے تھے۔ اس مندر کا بڑا پجاری ایک مالدار برہمن تھا۔
حضرت شیخ جلال الدین تبریزی، بندرگاہ دیومحل پہنچ کر بنگال کے اس عظیم الشان بت خانے میں تشریف لے گئے۔ مندر کے پہرے دار پجاریوں نے ایک بوڑھے مسلمان کو اپنی عبادت گاہ کی طرف آتے دیکھا تو ہوشیار ہو گئے اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سے پوچھنے لگے۔
''تم کون ہو اور یہاں کس لئے آئے ہو؟''
''میں تمہارے بڑے پجاری سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نرم لہجے میں فرمایا۔
''مجھے ان کے پاس لے چلو۔''
''تم ناپاک ہو، اس لئے مندر میں قدم نہیں رکھ سکتے۔'' ایک پجاری نے بڑی رعونت اور نفرت کے ساتھ جواب دیا۔
''تمہارے عقائد کے مطابق، میں ناپاک ہی سہی، مگر یہ ملاقات ہونا بہت ضروری ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ میں تمہارے مہاراج سے کس طرح مل سکتا ہوں؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔
''تم کچھ دیر ٹھہرو۔'' ایک پجاری نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں مندر سے باہر ایک سرائے سی بنی ہوئی تھی، جس میں دُور دراز کے علاقوں سے آنے والے یاتری (مسافر) قیام کیا کرتے تھے۔ ''ہم مہاراج کو جا کر اطلاع دیتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں گے تو تمہیں درشن دے دیں گے۔ ورنہ واپس چلے جانا۔'' یہ کہہ کر مندر کے پجاری واپس چلے گئے۔ اور حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ مندر سے ملحقہ سرائے میں ٹھہر کر بڑے پجاری کا انتظار کرنے لگے۔
تھوڑی دیر بعد وہ برہمن پجاری بڑی شان کے ساتھ سرائے میں داخل ہوا۔ اس کا لباس بہت قیمتی تھا۔ گلے میں سونے اور جواہر کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ پندرہ بیس پجاری خدمت گاروں اور غلاموں کی طرح اُس کے دائیں بائیں اور پیچھے چل رہے تھے۔
حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بڑے پجاری کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''تم اس مندر کے بڑے پجاری ہو یا کسی ریاست کے راجہ؟''
حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے اس سوال پر بڑا پجاری کچھ دیر کے لئے حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر ناگوار لہجے میں بولا۔ ''تمہیں میرے ذاتی معاملات سے کیا غرض؟ تم اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔''
حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے انتہائی باوقار لہجے میں فرمایا۔ ''میں تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تم نے اب تک ساری زندگی گمراہی میں بسر کی ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں تمہیں ازلی حقیقت سے باخبر کروں۔''
''کون سی حقیقت؟'' بڑے پجاری کے لہجے کی ناگواری اور تلخی برقرار تھی۔

''یہی کہ اللہ ایک ہے اور اُس کا کوئی شریک نہیں۔'' حضرت شیخ تبریزیؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ''یہ کیسا ظلم ہے کہ تم اس ذاتِ واحد کو چھوڑ کر ہزاروں خدا بنائے بیٹھے ہو۔ اور وہ بھی کیسے خدا؟ جو کسی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ۔ پتھر کے بے جان ٹکڑے، جنہیں تم اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور پھر انہی کو اپنا مشکل کشا قرار دیتے ہو۔ یہ بے چارے پتھر کے ٹکڑے تو خود بڑی مشکل میں ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ مالکِ حقیقی کی طرف لوٹ آؤ اور دونوں جہانوں کی سعادتیں حاصل کر لو۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ سے پہلے بھی کوئی مردِ مومن یہاں آیا ہو اور اُس نے بھی تمہیں یہی پیغامِ حق سنایا ہو۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی جرأتِ گفتار دیکھ کر بڑا پجاری سخت غضب ناک لہجے میں بولا۔ ''تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم میرے سامنے دیوتاؤں کی نفی کرو؟''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بے نیازانہ فرمایا۔ ''یہ پتھر کے مجسّمے نفی کرنے ہی کے لئے ہیں۔ میں نے پیغامِ حق تم تک پہنچا دیا۔ اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ اسے قبول کرتے ہو یا جھٹلاتے ہو؟''

جیسے ہی حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اپنی بات مکمل کی، بڑے پجاری کے چیلے آگ بگولا ہو گئے اور چیخنے لگے۔ ''اگر آپ حکم دیں تو ہم اس ملیچھ کے ٹکڑے کر دیں۔''

بڑے پجاری نے اپنے چیلوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے ایک موقع دو۔ اگر یہ آئندہ اِدھر آئے تو بے دریغ اس کے ٹکڑے کر دو۔''

نفرت و غضب کے اس مظاہرے کے جواب میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے سرائے کے در و دیوار پر نظر ڈالی اور بلند آواز میں فرمایا۔ ''اے در و دیوار! تم گواہ رہنا کہ میں نے خدائے واحد کا پیغام ''دیومحل'' کے پجاریوں تک پہنچا دیا ہے۔''

پھر آپؒ بڑے پجاری سے مخاطب ہوئے۔ ''تمہارے دن پورے ہو چکے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ چپ چاپ یہ جگہ خالی کر دو۔ میں یہاں آؤں گا...... اور ہمیشہ کے لئے آؤں گا۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ سرائے سے نکل کر چلے گئے۔

پھر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے ''پنڈوٗ'' کے ''دیومحل'' کے ایک باغ میں قیام فرمایا۔ اس باغ کا مالک ایک ہندو زمیندار کرشن مراری تھا۔ خدا نے اسے بہت دولت عطا کی تھی مگر اس کے ساتھ ایک ایسا روگ بھی لگا ہوا تھا جو اسے ایک لمحے کے لئے بھی سکون سے رہنے نہیں دیتا تھا۔ کرشن مراری کا ایک ہی بیٹا تھا جسے لڑکپن میں تپ دق کا جان لیوا مرض لگ چکا تھا۔ شروع میں کرشن مراری نے دیومحل کے بڑے بڑے ویدوں (حکیموں) کا علاج کیا مگر جب کوئی افاقہ نہیں ہوا تو اس نے اپنے پیسے کی طاقت پر پورے بنگال کے بڑے بڑے طبیبوں کو جمع کر لیا۔ ہر طبیب نے اپنے تجربے کے مطابق دوائیں تجویز کیں مگر بیماری بڑھتی ہی چلی گئی۔ اور اب کرشن مراری کے جواں سال بیٹے کا حال یہ تھا کہ صبح و شام خون تھوکا کرتا تھا اور اس کی جسمانی حالت یہ تھی کہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکا تھا۔ تپ دق کا مرض آخری مرحلے میں تھا۔ اس نوجوان کا چراغِ زندگی گُل ہونے ہی والا تھا۔ کرشن مراری، بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے غریبوں میں صدقہ و خیرات بھی کیا کرتا تھا کہ شاید کسی مسکین و محتاج کی دعا سے اس کا بیٹا شفایاب ہو جائے۔

اسی دوران حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ دیومحل پہنچے اور کرشن مراری کے باغ میں قیام فرمایا۔ ابھی یہاں دوسرا دن ہی گزرا تھا کہ باغ کے مالک کرشن مراری نے ایک نورانی صورت مسلمان درویش کو دیکھا۔ پھر وہ بڑی

بے قراری کے عالم میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے قریب پہنچا اور بڑے عاجزانہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''بابا! تم کوئی مسافر ہو؟''

''ایک میں ہی کیا، دنیا کے سب لوگ مسافر ہیں۔ انہیں عنقریب اپنی اپنی منزل کی طرف جانا ہے۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بے نیازانہ لہجے میں فرمایا۔

مسلمان درویش کا جواب سن کر زمیندار کرشن مراری حیران رہ گیا۔ ابھی اُس کی حیرت برقرار تھی کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے کرشن مراری کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''کیا تمہیں میرے قیام کرنے پر کوئی اعتراض ہے؟''

''یہ باغ میرا ہی ہے۔'' کرشن مراری نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔

''تو پھر ہم یہاں سے اُٹھ جاتے ہیں۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا۔

''نہیں، میرا یہ مقصد نہیں تھا۔'' کرشن مراری نے گھبرا کر کہا۔ ''میں تو اس خیال سے آیا تھا کہ اگر آپ کوئی مسافر ہیں تو میں آپ کی ضرورتوں کا خیال رکھوں۔ جہاں چاہے رہیں۔ میں مذہباً ہندو ہوں..... اگر آپ پسند کریں تو کھانے وغیرہ کا انتظام کروں؟''

''فقیر کا کھانا ہی کیا؟ درختوں کے پتوں سے بھی گزارہ ہوسکتا ہے۔'' حضرت جلال الدین تبریزیؒ کے لہجے میں وہی درویشانہ بے نیازی تھی۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ میرے مہمان ہو کر پیڑوں کے پتے کھائیں۔'' کرشن مراری نے نہایت ادب کے ساتھ کہا۔ ''یہ میری بڑی خوش نصیبی ہوگی کہ میں آپ کی خاطر تواضع کرسکوں۔''

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بہت غور سے کرشن مراری کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ ایک مالدار انسان تھا مگر اس کے چہرے پر گہری اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ''بے شک! تم ایک آسودہ حال انسان ہو، مگر تمہیں دلی سکون میسر نہیں۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''بے سکونی سی بے سکونی اور بے قراری سی بے قراری ہے۔ بس بھگوان ہی جانتا ہے کہ مجھے کیا دکھ ہے۔'' کرشن مراری کے لہجے میں شدید مایوسی اور محرومی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''جب تم مجھے اپنا مہمان بنانا چاہتے ہو تو پھر مہمان کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے میزبان کا حال پوچھے۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''بابا! میرا ایک ہی بیٹا ہے اور وہ بھی چند دنوں کا مہمان ہے۔'' ایک مسلمان درویش کا یہ اظہارِ ہمدردی دیکھ کر کرشن مراری رونے لگا۔

''کسی انسان کو کیا معلوم کہ وہ چند دنوں کا مہمان ہے؟...... یہ تو بس اس کا پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے کہ وہ اس دنیا میں کتنا وقت گزارے گا اور کیسے گزارے گا۔'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا۔

''اگر بھگوان کو اسے زیادہ دن اس دنیا میں رکھنا ہوتا تو پھر اتنی جان لیوا بیماری ہی کیوں دیتا؟'' کرشن مراری کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں کچھ اور تیزی آ گئی تھی۔

''تم نے اپنے بیٹے کا علاج کیا؟'' حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اس غم زدہ باپ سے پوچھا۔

''بیٹے کے علاج کے لئے تمام ہندوستان چھان مارا۔'' کرشن مراری نے روتے ہوئے کہا۔ ''کسی وید (حکیم) کے پاس کوئی نسخۂ شفا نہیں۔ اب تو موت ہی اُس کی دوا ہے۔''

"حکیموں سے مایوس ہونے کے بعد تم نے روحانی علاج پر توجہ دی؟" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے کرشن مراری سے ایک اور سوال کیا۔ "تمہارے یہاں تو بڑے بڑے پنڈت، مہاتما، سادھو اور جوگی ہیں۔"

"سب کہتے ہیں کہ بھگوان کی یہی مرضی ہے۔" کرشن مراری کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

"تم نے بھگوان سے کہا ہوتا۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے فرمایا۔ "تمہارے تو بہت سے دیوتا ہیں...... کوئی تو تمہارے دل کے درد کو سمجھتا۔"

"وہ خود پتھر کے ہیں...... کسی گوشت پوست کے انسان کے درد کو کس طرح سمجھیں گے؟" کرشن مراری کے چہرے سے یکایک بیزاری کا اظہار ہونے لگا تھا۔

اب وہ مرحلہ قریب آ گیا تھا کہ حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اس بت پرست زمیندار سے خدائے واحد کے بارے میں گفتگو کر سکتے تھے۔ "تمہاری بات نہیں سن سکتے...... تمہارا درد محسوس نہیں کر سکتے...... پھر تم اُن کی پوجا کیوں کرتے ہو؟"

"ہم تو مجبور ہیں۔" کرشن مراری کی اُداسی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ "پرکھوں (بزرگوں) کو یہی کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے ہم بھی ان کی رسمیں ادا کرتے رہتے ہیں۔"

"مگر تمہارا دل کیا کہتا ہے؟" حضرت جلال الدین تبریزیؒ نے ایک اور سوال کیا۔

"بیٹے کی بیماری کے بعد میرا دل ہر چیز سے اُٹھ گیا ہے۔" اب کرشن مراری کے لہجے سے ناگواری کا رنگ جھلکنے لگا تھا۔ "ہندوستان میں ایسا کون سا تیرتھ (مقامِ مقدس) ہے جہاں میں نہیں گیا؟ کس مندر میں حاضری نہیں دی؟ اور کس بھگوان کے آگے سر نہیں جھکایا...... مگر کسی نے ایک غم زدہ باپ کی نہیں سنی۔ میں ہر جگہ سے ناکام و نامراد لوٹا۔"

"تمہارے ہزاروں دیوتا اور خدا ہیں۔ پھر بھی کوئی نہیں سنتا...... لیکن ہمارا صرف ایک خدا ہے اور سب کی سنتا ہے۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے بڑے منطقی انداز میں اس بت پرست زمیندار کو سمجھایا۔ "اور ہمارے ایک خدا کی سب سے بڑی شان یہ ہے کہ وہ براہِ راست اپنے بندوں کی سنتا ہے۔ اس کے حضور میں نذرانوں اور چڑھاووں کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"تو آپ اپنے ایک خدا سے میرے بیٹے کا حال بیان کر دیں کہ وہ اُسے صحت دیدے۔" ایک بار پھر کرشن مراری کی آنکھوں سے آنسوؤں کا آبشار جاری ہو گیا تھا۔

"چلو...... تمہارے بیٹے کو دیکھتے ہیں۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر کچھ دیر بعد پورے محلے میں شور مچ گیا کہ ایک مسلمان سادھو، زمیندار کے لاعلاج بیٹے کو دیکھنے آیا ہے۔ آن کی آن میں سینکڑوں ہندو، کرشن مراری کے مکان کے باہر جمع ہو گئے۔

حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے زمیندار کرشن مراری کے جواں سال بیٹے کو دیکھا۔ اس کے خدوخال بتا رہے تھے کہ وہ اپنی صحت کے زمانے میں یقیناً انتہائی خوبصورت نوجوان ہوگا۔ مگر اب تو پلنگ پر رکھا ہوا ہڈیوں کا ایک نیم مُردہ ڈھانچہ نظر آتا تھا۔

"لڑکے! آنکھیں کھولو۔" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اسے آواز دی۔

لڑکے نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔

کرشن مراری کے نحیف و ناتواں بیٹے نے بولنے کی کوشش کی۔ مگر ضعف و نقاہت کے باعث اس کی آواز نہ نکل سکی۔ بس ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

''اب تو اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ کئی دن سے بول بھی نہیں سکتا۔'' لڑکے کی غم زدہ ماں نے روتے ہوئے کہا۔

''بحکم خدا بولے گا اور خوب بولے گا۔'' حضرت شیخ تبریزیؒ نے پُرجلال لہجے میں فرمایا اور آگے بڑھ کر لڑکے کو سہارا دیا۔ پھر دیکھنے والوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ لڑکا، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے دستِ مبارک کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

پھر آپؒ نے کرشن مراری سے ایک پیالہ پانی منگوایا اور کچھ آیاتِ قرآنی پڑھ کر اس پر دم کیا اور اپنے ہاتھ سے لڑکے کو ایک گھونٹ پانی پلایا۔ اس کے بعد حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ لڑکے کے ماں باپ کو یہ ہدایت دے کر واپس تشریف لے گئے۔

''اس پانی کو تھوڑا تھوڑا اس طرح استعمال کرنا کہ سات دن میں ختم ہو جائے۔''

جانے والا جا چکا تھا مگر کرشن مراری کے خاندان اور محلے میں ایک شور سا برپا تھا۔ وہ لڑکا جو قریب المرگ تھا، ایک مسلمان درویش کا دیا ہوا پانی پی کر نہ صرف اُٹھ کر بیٹھ سکتا تھا بلکہ اہلِ خاندان سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ اور کہنے والے کہہ رہے تھے۔

''جس پر گنگا جل'' نے اثر نہیں کیا، وہ ایک مسلمان سادھو کے دیئے ہوئے پانی سے کس طرح ٹھیک ہو گیا؟''

واضح رہے کہ اہلِ ہنود کے نزدیک گنگا کا پانی بہت معتبر اور مقدس سمجھا جاتا ہے۔ پتھر کے پجاری ''گنگا جل'' کو ہر بیماری کا علاج تصور کرتے ہیں۔ اور جب کوئی ہندو اپنی آخری سانسیں گن رہا ہوتا ہے تو یہی ''گنگا جل'' اس کے منہ میں ڈالا جاتا ہے تاکہ اس پر موت کی سختیاں آسان ہو جائیں اور وہ دوسری دنیا میں مکتی (نجات) حاصل کر سکے۔ کرشن مراری کے لڑکے کو بھی بہت دن سے ''گنگا جل'' دیا جا رہا تھا۔ مگر وہ صحت یاب ہونے کے بجائے روز بہ روز کمزور ہی ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ موت کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ پھر جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے دیئے ہوئے ایک گھونٹ پانی سے لڑکے کی طبیعت سنبھلنے لگی تو اس کے اہلِ خاندان اور محلے کے لوگ برملا کہنے لگے۔

''اس مسلمان سادھو کے پاس ''امرت جل'' (آبِ حیات) ہے۔''

پھر جب سات دن گزر گئے تو لڑکے کے چہرے پر بیماری کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ماں باپ جشنِ صحت منانے کے بجائے لڑکے کو لے کر حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کرشن مراری، اس کی بیوی اور بیٹا کلمہ طیبہ کا وِرد کر رہے تھے اور با آواز بلند کہہ رہے تھے۔

''ہمیں اپنے باپ دادا کے ہزاروں معبود درکار نہیں۔ ہمارے لئے بس ایک اللہ کافی ہے۔''

کرشن مراری اور اس کے اہلِ خانہ کے مسلمان ہوتے ہی ''دیو محل'' کے ہندوؤں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ بہت سے بیمار، حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی دعاؤں سے صحت یاب ہوئے۔ ان کی جسمانی بیماریاں بھی دور ہو گئیں اور دل کے امراض بھی جاتے رہے...... آپؒ کے آستانے سے جو ہندو بھی صحت یاب ہو کر اُٹھا، اُس نے اپنے آبائی مذہب سے توبہ کر لی اور حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

یہ بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔ بڑے بڑے پنڈتوں اور پجاریوں کی اجارہ داری ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اہلِ

ہنود اپنے ماتھوں سے تلک اور چھاپ کے نشانات کھرچ کر ایک اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو رہے تھے۔ دیومحل کے سب سے بڑے پجاری، پنڈت دیانند نے اپنے ہم مذہبوں کو اسلام کی طرف جانے سے روکنے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ ایک ہی جواب دیتے۔

''تم نے مندروں میں بیٹھ کر صدیوں ہم پر حکومت کی۔ خود کو مہاراج کہلوایا اور ہمیں اپنا داس (غلام) سمجھا۔ مگر ایک وہ ہے جو ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھاتا ہے اور پیتا ہے...... ہمارے دُکھوں میں شریک ہوتا ہے...... ہمارے لئے دعائیں کرتا ہے اور اس کی دعائیں قبول بھی ہوتی ہیں۔ اب ہم یہ راز جان گئے ہیں کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط؟ کل تک ہم اندھے تھے...... اب ہماری بینائی لوٹ آئی ہے...... اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری منزل کہاں ہے۔''

پنڈت دیانند اور دوسرے معزز ہندوؤں کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور چند ماہ کے مختصر سے عرصے میں دیومحل کے زیادہ تر ہندو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اس قدر وسیع و عریض علاقے میں بس چند ہی بت پرست باقی رہ گئے تھے۔

وہ بڑا ہی عجیب منظر تھا، جب دیومحل کے ہزاروں نومسلم اپنے ہاتھوں میں کدالیں اور ہتھوڑے لئے ہوئے سب سے بڑے مندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مندر کے چند محافظوں نے انسانی ہجوم کو دیکھا تو بدحواس ہو کر پنڈت دیانند کے کمرے میں پہنچے اور چیخنے لگے۔

''مہاراج! آنے والوں کو روکیں کہ ان کے ارادے بہت خطرناک نظر آتے ہیں۔''

جب پنڈت دیانند گھبرایا ہوا مندر کے دروازے پر آیا تو ہزاروں نومسلم وہاں موجود تھے۔ ''آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟'' پنڈت دیانند کی آواز سہمی ہوئی تھی۔

''مہاراج! تمہارے دن پورے ہو چکے ہیں۔ بس چپ چاپ یہاں سے نکل جاؤ۔'' دیومحل کے نومسلموں نے چیختے ہوئے کہا۔ ''اسی میں تمہاری سلامتی ہے۔''

''یہ میری عبادت گاہ ہے۔ تم اسے مسمار کرنے کا حق نہیں رکھتے۔'' پنڈت دیانند کے چہرے اور لہجے سے شدید خوف و ہراس جھلک رہا تھا۔

''اس مندر پر تمہارا کوئی حق نہیں۔'' نومسلموں کے ہجوم نے چیختے ہوئے کہا۔ ''اس عالی شان عمارت کے در دیوار میں ہمارا خون پسینہ شامل ہے۔ یہ ہماری ملکیت ہے۔ ہم چاہیں تو اسے برقرار رکھیں اور چاہیں تو مٹا ڈالیں آج ہمیں روکنے والا کوئی نہیں۔''

''آخر تم اس خوب صورت عمارت کو کیوں ڈھانا چاہتے ہو؟'' پنڈت دیانند کی آواز لرز رہی تھی۔

''کل ہم اندھے تھے، اس لئے یہ عمارت ہمیں دلکش نظر آتی تھی۔ مگر آج جب ہمیں بینائی ملی ہے تو ہمار آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ یہ بہت ہی بھونڈی اور بدصورت عمارت ہے۔ اس لئے اس کا ڈھا دینا ہی بہتر ہے۔ ا ہم اس کی جگہ ایک نئی عمارت تعمیر کریں گے، جس کا حُسن و جمال قابل دید ہوگا۔''

یہ کہہ کر نومسلم جوانوں نے پنڈت دیانند اور اس کے ساتھی پجاریوں کو مندر سے نکال دیا۔

جن ہاتھوں نے مندر تعمیر کیا تھا اور سینکڑوں بت تراشے تھے، اب وہی ہاتھ اپنی پرانی عبادت گاہ کو مسمار رہے تھے۔ پھر ایک ماہ کے اندر مندر کو ڈھا دیا گیا اور اس کی جگہ مسجد کی تعمیر شروع ہو گئی۔ یہ حضرت شیخ جل الدین تبریزیؒ کی عظیم الشان کرامت تھی، جو آج بھی ہندوستان کے سینے پر نقش ہے۔

سلسلۂ سہروردیہ کے اس عظیم بزرگ نے اپنی عمر مبارک کا آخری حصہ "بندرگاہ دیومحل" میں گزارا۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے 642ہجری میں وفات پائی۔ وصیت کے مطابق آپؒ کو اس کمرے میں دفن کیا گیا، جہاں کسی زمانے میں سب سے بڑا بت رکھا جاتا تھا۔

آٹھ صدیاں گزر چکی ہیں......اس طویل عرصے میں زائرین کے بے شمار قافلے "بندرگاہ دیومحل" آئے اور حضرت شیخ کے مزارِ مبارک پر حاضری دی۔ بے سماعت اور بے نظر لوگوں کی اور بات ہے.....مگر جن حضرات کو حق تعالیٰ نے نظر اور سماعت بخشی ہے، وہ آج بھی آپؒ کے روضۂ مبارک سے یہ صدا سنتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں ، لا الٰہ الاّ اللہ

❀❀❀

حضرت شیخ حسن شاہیؒ

اب ہم بدایوں کے ایک اور بزرگ کا ذکر کریں گے، جن کی ذاتِ گرامی سے پاکستانی حضرات اکثریت واقف نہیں۔ مگر اہلِ ہندوستان اس مردِ حق کو خوب پہچانتے ہیں۔

''ہاں! اللہ کے سوا سب کچھ بے نشان ہو جانے والا ہے۔ میں بھی بے نشان ہو جاؤں گا...... میرے وجود کی کوئی علامت باقی نہیں رہے گی۔''

فقیر عالمِ جذب میں اسرارِ حیات بیان کر رہا تھا اور اس کے مرید دم بخود بیٹھے اپنے پیر و مرشد کی زبان سے یہ الہامی باتیں سن رہے تھے۔ کسی نگاہ کو یہ تاب نہ تھی کہ وہ فقیر کے پُر جلال چہرے کی طرف دیکھ لے اور کسی زبان میں قوتِ گویائی نہ تھی کہ وہ گفتگو کے دوران کوئی سوال کر لے۔ خانقاہ پر سناٹا طاری تھا۔ بس فقیر کی آواز گونج رہی تھی۔

''سنو میرے رفیقو!...... سنو! میں بہت جلد بے نشان ہو جانے والا ہوں۔ میرا سفر تمام ہوا اور عنقریب مجھ پر ابدی نیند طاری ہو جانے والی ہے۔ ازل و ابد اُسی کا ہے، جس کے سوا کوئی حیی و قیوم نہیں...... بندے کی نجات اسی میں ہے کہ وہ بے نشان ہو جائے...... ہاں میرا بھی ہر نقش مٹ جائے گا اور پھر میں صدیوں تک بے نشان رہوں گا۔ لوگ میری قبر تلاش کریں گے مگر اُنہیں ایک مشتِ خاک کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس گردشِ ماہ و سال کا سلسلہ بہت طویل ہوگا۔ پھر میری مشتِ خاک جمع ہو گی...... اور میرا خدا مجھ بے نشان کو ایسی نشانی عطا کرے گا کہ اسے جھٹلانے کی جرأت کسی میں نہ ہو گی۔'' اسرارِ سربستہ کچھ اور کھول دیئے گئے تھے لیکن مریدوں کے حلقے پر اب بھی لرزہ طاری تھا۔ کسی زبان کو حضورِ شیخ میں لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکی۔ درویش کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر خشک لبوں سے کشف کے چشمے پھوٹنے لگے۔

''سن اے حاجت مند سن! جب میری مشتِ خاک جمع ہو کر قبر کی شکل اختیار کر لے تو اپنی ضرورتیں لے کر ادھر آ اور میرے حوالے سے اللہ سے دعا مانگ۔ خدا تیرے خالی دامن کو بھر دے گا۔''

اسرار و رموز کے بکھرے ہوئے نقطے اب ایک شکل اختیار کرنے لگے تھے۔ حاضرینِ مجلس کے وحشت زدہ چہروں پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے فقیر کے جلالِ معرفت سے محفل میں آگ سی لگ گئی۔ درویش کی زبان پر آتشیں الفاظ اُبھرے۔

''جب میری بے نشان ہستی قبر کی شکل میں ظاہر ہو جائے تو اہلِ ضرورت کو چاہئے کہ وہ میرے مزار پر آئیں۔ تین روز قیام کریں اور میرے وسیلے سے خدا کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ اگر کوئی نتیجہ ظاہر نہ ہو تو اپنی مدتِ قیام کو بڑھا کر پانچ روز کر دیں...... اگر پھر بھی پردۂ غیب سے کچھ ظاہر نہ ہو تو سات روز تک دعا مانگیں۔ اگر یہ عرصہ بھی یوں ہی گزر جائے تو میرا مزار کھود کر پھینک دیں۔'' گفتگو اس قدر جذب میں ڈوبی ہوئی تھی کہ خانقاہ کے در و دیوار پر لرزہ طاری تھا۔ حاضرین کے دل ایک مردِ خدا کی ہیبت سے کانپ رہے تھے۔

''مگر اے سننے والے!...... یاد رکھ! میرا خدا، مجھے تیرے سامنے شرمندہ نہیں کرے گا۔''

یہ کہہ کر فقیر خاموش ہو گیا۔ سفر ختم ہو چکا تھا۔ اُسے نیند آ گئی۔

ظاہر میں فقیر کو نیند آ گئی تھی، مگر اس کی روح بیدار تھی۔ مادی جسم کو قبر میں اُتار دیا گیا تھا اور ممکن ہے، کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق وہ جسم خاک بھی ہو گیا ہو۔ لیکن فقیر کی روحانی زندگی کا یہ عالم ہے کہ آج سارا ہندوستان اس کے حلقۂ اثر میں ہے۔

میں نے بھی فقیر کے کمالات کی شہرت سنی تھی۔ آخر ایک دن اپنی گناہ گار آنکھوں سے روحانیت کے اس نشان کو دیکھنے کے لئے بدایوں کی طرف روانہ ہوا، جس نے ایک چھوٹے سے شہر کے ایک گوشے میں رہ کر تمام ہندوستان کو اپنا اسیر بنا لیا ہے۔

وفورِ شوق میں میرے مضطرب قدم بدایوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ظاہر میں بدایوں، یو پی کا ایک چھوٹا سا شہر ہے..... مگر زمانۂ قدیم میں یہی چھوٹا سا شہر تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ مر گئی اس لئے بدایوں کی تاریخی حیثیت بھی فنا ہو گئی۔ مادہ پرست زمانے کی یہ دلیل تسلیم لیکن بدایوں کی ایک اور حیثیت بھی مشہور ہے......اور اس حیثیت کو گردشِ ماہ و سال بھی فنا نہ کر سکی۔ وقت جیسے جیسے بوڑھا ہوتا جا رہا ہے، بدایوں کی حیثیت جوان ہوتی رہی ہے۔ اہلِ علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ بدایوں کا ایک نام ''مدینہ ہندوستان'' بھی ہے۔ اس شہر کو ہندوستان کا مدینہ بننے کا شرف اس لئے حاصل ہوا کہ یہاں حق و باطل کی ایک جنگ میں اللہ کے بے شمار بندے شہید ہوئے ہیں، عام بندے نہیں۔ اللہ کے محبوب بندے جن کے خون کا ایک ایک قطرہ نگاہِ قدرت میں پسندیدہ تھا...... بدایوں میں شہیدوں کے زیرِ زمین مزارات کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ لوگ جس جگہ کھڑے ہیں، اُنہیں نہیں معلوم کہ ان کے قدموں کے نیچے کسی شہید کی قبر ہے۔ جہاں بزرگ ہستیوں کے اجتماع کی یہ صورتِ حال ہو، وہاں ایک مسلمان کی قلبی کیفیت کیا ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ گناہ گار سے گناہ گار مسلمان بھی کر سکتا ہے..... میں بھی لرزہ براندام سا اپنے دل کی دھڑکن سے ڈرتا ہوا بدایوں کی حدود میں داخل ہوا اور پھر میرے مضطرب قدم مجھے اس فقیر کے مزارِ مبارک پر لے گئے جس نے ایک بار جذب کے عالم میں کہا تھا۔

''میں صدیوں تک بے نشان رہوں گا۔''

میں نے اپنے ذہن میں فقیر کے اس جملے کی بازگشت سنی اور ایک بزرگ صورت شخص سے پوچھا جو ریاست رام پور سے بدایوں آ کر مستقل طور پر اقامت گزیں ہو گئے تھے اور مزارِ مبارک سے ملحقہ مسجد میں مؤذن کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

''فقیر نے تو کہا تھا کہ میں صدیوں تک بے نشان رہوں گا۔ مگر یہ کیسی بے نشانی ہے کہ قبرِ مبارک پر عقیدت مندوں کا میلہ لگا ہوا ہے؟''

وہ بزرگ میرے اس اضطراب اور جہالت پر مسکرائے اور پھر بڑے شیریں لہجے میں فرمانے لگے۔

''ہاں، فقیر نے صحیح کہا تھا۔ یہ قبر صدیوں تک بے نشان رہی ہے مگر وہ جو سب سے بڑی شان والا ہے، اس نے اپنے ایک بندے کو قیامت تک کے لئے ایسی نشانی بخش دی ہے جو کسی طوفان، کسی حادثے اور کسی انقلاب میں گم نہیں ہو گی۔''

ایک بے قرار دل کو سکون آ گیا اور میں نے لرزتے ہوئے دل کے ساتھ مزارِ مبارک پر حاضری دی۔ میرے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ دعا کے لئے گناہ گار ہاتھ اُٹھے اور پھر آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔

آخر جب ایک مردِ کامل کے حلقۂ اثر میں جا کر دل کو کچھ سکون ملا تو میں نے مزارِ مبارک کی لوح کو دیکھا۔ لوح پر تحریر تھا۔

"سلطان العارفین حضرت سیّد حسن شیخ شاہی روشن ضمیرؒ۔" ویسے آپؒ "موتے تاب" کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ کچھ لوگ آپؒ کو حضرت سلطان العارفین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کچھ لوگ شیخ شاہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن عوام میں آپؒ "بڑے سرکار" کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس نام کی شہرت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بدایوں ہی میں آپؒ کے چھوٹے بھائی حضرت سیّد بدرالدینؒ کا مزارِ مبارک بھی ہے اور آپؒ "چھوٹے سرکار" کے لقب سے پورے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ اس لئے برادرِ بزرگ کی حیثیت سے آپؒ بڑے سرکار کہلاتے ہیں۔

حضرت شیخ شاہیؒ 502 ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کی پیدائش مبارک سے پہلے آپؒ کی والدہ ماجدہ نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا تھا۔ حضرت شیخ شاہیؒ کی مادرِ گرامی نے نیند کے عالم میں دیکھا کہ ان کا کمرہ تاریک ہے، در و بام اس قدر گہری سیاہی میں لپٹے ہوئے ہیں کہ انہیں خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔ اچانک تیز روشنی کی ایک لکیر چھت سے گزر کر فرش تک آتی ہے اور پھر پورا کمرہ ایسی روشنی سے بھر جاتا ہے جس میں انسانی نگاہ کا ٹھہرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ آپؒ کی والدہ اس روشنی کو بڑی حیرت سے دیکھتی رہتی ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ روشنی کمرے سے نکل کر تاریک مکان کی طرف بڑھتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین کا یہ ٹکڑا بھی دن کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ یکایک آپؒ کی والدہ کے سامنے ایک اور منظر اُبھرتا ہے۔ تا حدِ نگاہ ایک طویل و عریض مندر جس میں بے شمار بت نصب ہیں...... عجیب مشرکانہ ماحول ہے...... ناگہاں روشنی کی وہ لکیر مندر میں داخل ہوتی ہے اور تمام بت "قل ھو اللہ احد" (اللہ ایک ہے) کہتے ہوئے زمین پر اوندھے گر جاتے ہیں۔ یہ منظر ہیبت و جلال سے اس قدر معمور تھا کہ خواب کے انجام پر گھبرا کر آپؒ کی آنکھ کھل گئی۔ پوری رات آپؒ کے دل و دماغ پر عجیب تاثر رہا اور پھر صبح ہوتے ہی آپؒ نے اپنے خاندان کے ایک بزرگ سے یہ خواب بیان کیا تو وہ بزرگ حیرت زدہ رہ گئے۔ چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد ان کے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم اُبھرا اور پھر اُنہوں نے بڑے شگفتہ لہجے میں اس عجیب و غریب خواب کی تعبیر بیان کی۔

"یہ آسمانی روشنی اس بات کی دلیل ہے کہ عنقریب خدا تجھے اولادِ نرینہ کی دولت سے نوازے گا...... اور اس کا مزید کرم یہ ہوگا کہ وہ بچہ اس قدر صاحبِ ایمان ہوگا کہ اس کے کردار کی ضیاء باریوں سے تاریک صنم خانے بھی روشن ہو جائیں گے...... اور نہ جانے کتنے بت پرست اس سے "دینِ حق" کا سبق پڑھیں گے۔"

اپنے خواب کی یہ تعبیر سن کر خدا رسیدہ عورت کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی...... یہ ایک عجیب خبر تھی جو عالمِ خواب سنائی گئی تھی۔ ایک صاحبِ کردار ماں کی اس سے بڑی خواہش اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا بیٹا نیک ہے۔ اب یہ اس برگزیدہ ماں کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بہت پہلے ایک عظیم المرتبت بیٹے کی پیدائش کا مژدہ سنا دیا گیا تھا۔ حضرت شیخ شاہیؒ کی مادرِ گرامی اس خوشخبری پر اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے ذکرِ نیم شبی میں کھو گئیں اور وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

آخر 502ھ میں حضرت شیخ شاہیؒ کی ولادت ہوئی۔ آپؒ صحیح النسب حسینی سیّد تھے۔ حضرت شیخ شاہیؒ کے والد، سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آپؒ کے باقی حالاتِ زندگی پر گردشِ ماہ و سال کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ شاید آپؒ نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اپنے بے نشان ہونے کی پیش گوئی کی ہو...... بہر نوع دوسرے اولیائے کرام کی طرح آپؒ کے بچپن اور جوانی کے حالات تصوف کی مستند کتابوں میں نہیں ملتے۔ (اگر میں پاکستان کے کچھ مصنفوں کی طرح ان بزرگانِ دین کو ہندو دیو مالائی کردار بنانے کا گناہِ عظیم کروں تو پھر حضرت شیخ شاہیؒ کے حالاتِ زندگی بھی قلم بند کئے جا سکتے ہیں...... مگر میں اس گناہ کی

جرأت نہیں کر سکتا...... جو کچھ معتبر تذکروں سے حاصل کیا ہے، وہی معلومات کاغذ پر منتقل کر رہا ہوں)

حضرت شیخ شاہیؒ کا بچپن کس عالم میں گزرا؟ والدین نے آپؒ کو کس طرح تربیت دی؟ اور آپ کی معاشی حیثیت کیا تھی؟ آپؒ کس طرح گزر اوقات کرتے تھے؟ غرض اسی قسم کے بے شمار سوالات ہیں جو ہنوز تشنہ جواب ہیں۔ بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ آپؒ نے حضرت قاضی حسام الدین سے علمِ ظاہری حاصل کیا۔ اگر قدرت آپؒ کو ولایت کے لئے منتخب نہ کر چکی ہوتی تو شاید شیخ شاہیؒ علمِ ظاہری کی دولت سے بہل جاتے مگر وہ تو جاں سوختۂ عشقِ الٰہی تھے۔ ازل سے تشنہ لب تھے۔ یوم الست ہی میں ان کا سینہ سوزِ دروں سے جل رہا تھا۔ پھر بھلا آپؒ کس طرح دنیا کی ظاہری آگ سے مطمئن ہو جاتے؟ آخر وہ وقت آ گیا، جب آپؒ نے دوسرے بزرگوں کی طرح یہ غیبی صدا سنی۔

''کیا اہلِ ایمان کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل خدا کے سامنے جھک جائیں۔''

جس کو سننے کے لئے حضرت شیخ شاہیؒ مدتوں سے ترس رہے تھے..... وہ آواز آپؒ کے کانوں میں آئی تو اس طرح کہ روح کی گہرائیوں تک اُترتی چلی گئی۔ سر تو پہلے بھی معبودِ حقیقی کے سامنے خم تھا، اس آواز کو سنتے ہی روح بھی خداوندِ ذوالجلال کے آگے سجدہ ریز ہو گئی۔

معرفت کی راہ بہت طویل اور دُشوار تھی۔ یہاں دُور دُور تک کوئی سایہ دار درخت نہیں ہوتا..... حضرت شیخ شاہیؒ بھی کسی بزرگ کی تلاش میں گھر سے نکلے۔ خدا کی زمین پر چلتے چلتے ایک عرصۂ دراز کے بعد آپؒ دہلی پہنچے۔ اس وقت دہلی اولیائے کرام کا مرکز تھا۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ جیسے بزرگ بھی خاکِ دہلی کو رشکِ آفتاب بنائے ہوئے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں حضرت قطب الدینؒ جیسا کوئی دوسرا بزرگ دہلی میں موجود نہیں تھا لیکن کاتبِ تقدیر نے حضرت شیخ شاہیؒ کی رہنمائی کے لئے حضرت حمید الدین ناگوریؒ کو ہی مقرر فرمایا۔ اس لئے آپؒ قاضی صاحب کی بارگاہِ ولایت میں عقیدت سے سر جھکائے داخل ہو گئے۔

حضرت شیخ شاہیؒ نے سہروردیہ اور چشتیہ دونوں سے فیض حاصل کیا۔ سہروردیہ اس لئے کہ آپؒ کے پیر و مرشد حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ تھے۔ اس لئے جب حضرت شیخ شاہیؒ، حضرت قاضی سے بیعت ہوئے تو آپؒ بھی خاندانِ سہروردیہ میں شامل ہو گئے اور چشتیہ کہلانے کا یہ سبب ہے کہ حضرت حمید الدین ناگوریؒ علوم ظاہریہ میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے استاد تھے۔ لیکن روحانیت میں حضرت قاضیؒ کا یہ عالم تھا کہ آپؒ حضرت قطب الدینؒ کا انتہائی ادب کرتے تھے۔ ''سیر الاقطاب'' میں تو یہاں تک لکھا ہے۔

''حضرت بختیار کاکیؒ قطب المشائخ ہیں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ سے ہزار درجہ بزرگ و برتر۔''

ہم اس بحث میں نہیں اُلجھتے کہ حضرت قطبؒ اور حضرت قاضیؒ میں کس بزرگ کا روحانی درجہ بلند تھا؟ برصغیر کے تمام لوگ جانتے ہیں کہ سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اولیائے ہند کے سردار تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ اپنے شیخ سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے باوجود حضرت قطبؒ کے سامنے خم نہ ہوتے۔ بہرنوع یہ بات مستند کتابوں سے ثابت ہے کہ حضرت قاضیؒ نے حضرت قطبؒ کے ہاتھ پر بھی بیعت کی تھی چونکہ حضرت قاضیؒ بھی سہروردی اور چشتی تھے۔ اس لئے حضرت شیخ شاہیؒ بھی سہروردی اور چشتی کہلائے۔

غرض حضرت سلطان العارفین سیّد حسن شیخ شاہیؒ طریقت کے دو مشہور سلسلوں میں فیضِ باطنی حاصل کرنے

کے بعد درجۂ خلافت تک پہنچے اور آپؒ کی زندگی میں وہ مبارک دن بھی آ گیا، جب حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے محبت بھری نظروں سے آپؒ کی طرف دیکھا اور بڑے عجیب سے لہجے میں فرمایا۔

''حسن! اِدھر آ۔ آج تجھ پر اپنی محبتیں تمام کر دوں۔''

حضرت شیخ شاہیؒ لرزتے ہوئے آگے بڑھے اور پیر و مرشد کے سامنے سرِ نیاز خم کر کے کھڑے ہو گئے۔

حضرت قاضیؒ بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھے اور حضرت شیخ شاہیؒ کو یہ کہتے ہوئے گلے لگا لیا۔

''اے بے قرارِ عشق! آ کہ آج تجھے سکونِ قلب عطا کروں۔''

حضرت شیخ شاہیؒ ایک عارفِ وقت کے سینے کی حرارت کو کس طرح برداشت کرتے؟ تھوڑی دیر تک آپؒ کو یہ محسوس ہوتا رہا جیسے آپ کا جسم آتشِ عشق میں جل کر خاک ہو جائے گا مگر پھر اچانک آپؒ کے قلب پر عجیب عالم گزرا اور پھر بے قراریوں کو قرار آتا چلا گیا۔ تشنہ لبی سیراب ہو گئی۔ اضطراب، سکون میں بدل گیا اور شیخ شاہیؒ کو دنیا و آخرت کی لازوال دولت مل گئی۔

الطاف و کرم کی بارش کے بعد حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے حضرت شیخ شاہیؒ کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور اپنے دوسرے خلیفہ محمد موئینہ دوزؒ کو کہلا بھیجا۔

''آج میں نے یہ کام کیا ہے کہ ایک بادشاہ کو گدڑی پہنا دی ہے۔''

حضرت قاضیؒ کے اس فرمان سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت شیخ شاہیؒ خاندانی اعتبار سے بہت امیر و کبیر انسان تھے۔ حضرت قاضیؒ نے انہیں درسِ قلندری دیا اور وہ دنیا کی دولت سے بے نیاز ہو گئے۔ اگر حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ کی یہی مراد تھی تو پھر آپؒ کے الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ شاہیؒ کا تعلق کسی دولت مند خاندان سے تھا مگر حضرت قاضیؒ کے فیض سے آپؒ نے قبائے زرکار کو اُتار پھینکا اور لباسِ فقیری پہن لیا۔ اور اگر حضرت قاضیؒ کی مراد خاندانی امارت سے نہیں تھی تو آپؒ کے الفاظ کا ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ حضرت شیخ شاہیؒ کو اس دنیا میں تونگری ملنے والی تھی مگر آپؒ نے اپنی قوتِ نگاہ سے بدایوں کے اس برگزیدہ انسان کا رخِ حیات دوسری طرف موڑ دیا۔ بہر حال حضرت قاضیؒ کے ارشادِ گرامی کا ظاہری یا باطنی مطلب کچھ بھی ہو مگر آپؒ کے الفاظ سے وہ ناز ضرور جھلکتا ہے جو ایک اعلیٰ ظرف استاد کو اپنے لائق شاگرد پر ہونا چاہئے۔ بے شک حضرت قاضیؒ کا سینۂ مبارک علم و روحانیت کا ایک سمندر تھا مگر جب آپؒ نے اپنے مرید کے سینے میں بھی معرفت کا ایک سمندر موجزن دیکھا تو آپؒ بے اختیار ہو کر بڑے فخریہ لہجے میں پکار اُٹھے۔

''آج میں نے یہ کام کیا ہے کہ ایک بادشاہ کو گدڑی پہنا دی ہے۔''

اپنے شیخ کے مقدس ہاتھوں سے فقیری کی گدڑی پہننے کے بعد حضرت شیخ شاہیؒ کا مزاج ہی بدل گیا۔ قلبی کیفیات ہی تبدیل ہو گئیں۔ حلقۂ نگاہ اس قدر وسیع ہوا کہ آنکھوں سے پردۂ حجاب اُٹھ گیا۔ نظامِ خیر و شر کے بہت سے گوشے آپؒ کو بے نقاب نظر آنے لگے۔ بلحاظِ شریعت اتنا کہ آدمی دیکھے تو حیران جائے..... پاسِ محبت اس قدر کہ دوستوں کے لئے اپنا خون تک بہا دیں۔ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ آپ کی زندگی کا ایک عجیب و غریب واقعہ تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ایک بار حضرت شیخ شاہیؒ اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ کہیں تشریف لے گئے۔ کھانے کے اہتمام کے سلسلے میں دودھ کی کھیر پکائی گئی۔ دو آدمی جو آپؒ کے حلقۂ احباب میں شامل تھے، کھانا پکانے کے نگران مقرر ہوئے۔ جب یہ لذیذ کھیر، حضرتؒ کے سامنے آئی تو آپؒ نے کھانے سے انکار کر دیا۔ تمام دوست سخت متعجب تھے اور

حضرت شیخ شاہیؒ کے انکار نے حلقۂ احباب کو آزردہ و غمگین بنا دیا تھا۔ آخر ایک دوست نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

''حضرت! آپ تو دودھ کی کھیر بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ آج یہ تبدیلی کیسی؟ کیا طبیعت کچھ ناساز ہے؟''

''میری طبیعت بھی ٹھیک ہے اور کھیر کھانے کی خواہش بھی کم نہیں ہوئی ہے۔'' حضرت شیخ شاہیؒ نے بدلے ہوئے لہجے میں فرمایا۔ ''میں کھیر اس لئے نہیں چکھوں گا کہ اس سے خیانت کی بُو آتی ہے۔''

آپؒ کی زبانِ مبارک سے یہ انکشاف سن کر تمام دوست حیران رہ گئے۔ وہ خیانت کا مفہوم تو نہیں سمجھ سکے لیکن اُنہیں یہ احساس ضرور ہو گیا کہ آج یقیناً کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے ورنہ حضرت اس طرح اپنی سادہ غذا سے انکار نہ فرماتے۔ ماحول پر سکوت طاری تھا۔ بگڑی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر تمام دوستوں کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔ کسی میں مزید سوال کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ آخر وہ دونوں اشخاص جنہوں نے کھیر پکائی تھی، اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور بصدِ ادب و احترام کہنے لگے۔

''یا شیخ! اہلِ نظر کی باتیں اہلِ نظر ہی جانیں۔ ہماری جہالت اس بات کو سمجھنے سے عاجز ہے کہ آپ نے ''خیانت'' کا لفظ کس مفہوم میں استعمال کیا ہے؟ البتہ ایک بات یہ ضرور ہوئی ہے کہ جب ہم لوگ کھیر پکا رہے تھے، اس وقت اچانک دودھ میں اُبال آیا اور اس قدر شدت سے کہ دودھ کا زمین پر گر جانا یقینی تھا۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ ضائع ہو جانے سے یہ بہتر ہے کہ اس دودھ کو ہم پی لیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔'' یہ کہہ کر دونوں دوست خاموش ہو گئے اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حضرت شیخ شاہیؒ کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

حضرت کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بڑے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ''یہی تو خیانت ہے۔ تم گرنے والے دودھ کو کسی اور برتن میں بھی رکھ سکتے تھے۔'' یہ کہہ کر حضرت نے حکم دیا۔ ''تم دونوں اس وقت تک دھوپ میں کھڑے رہو جب تک پیئے جانے والے دودھ کی مقدار کے برابر تمہارا پسینہ نہ بہہ جائے۔''

دونوں اشخاص اس بزرگانہ حکم کے آگے مجبور تھے۔ چہروں پر ناگواری کا تاثر لئے بغیر حضرت شیخ شاہیؒ کے دونوں دوست دھوپ میں کھڑے ہو گئے۔ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا رہا اور حضرت سیّد حسن شیخ شاہیؒ کے دوستوں کے جسم پسینے میں نہاتے رہے۔

آخر جب دودھ کے برابر پسینہ بہہ گیا تو حضرت نے اُنہیں سائے میں آنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ ''میں خوش ہوں کہ میرے دوست خیانت جیسے جرم سے بری ہو گئے۔''

اس کے بعد تمام دوستوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ حضرت شیخ شاہیؒ نے فسد کھولنے والے شخص کو بلوایا اور اپنے جسم سے اتنا ہی خون نکلوا دیا، جتنا ان کے دوستوں کے جسم سے پسینہ بہا تھا۔ تمام دوست حیرت زدہ سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ آخر جب حضرت خون نکلوا چکے تو آپؒ نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا اور وہ خون زمین پر گراتے ہوئے فرمایا۔

''زمین و آسمان گواہ رہیں کہ میں نے اپنے دوستوں کے پسینے کے برابر خون بہا دیا۔ میرے دوست تیز دھوپ میں جلے، اُنہیں تکلیف پہنچی۔ بھلا حسن کس طرح سکون سے رہ سکتا تھا؟ آخر اس نے بھی اپنا خون بہا دیا۔''

دوستوں کے جسموں پر لرزہ طاری تھا۔ آج انہیں پہلی بار اندازہ ہوا کہ حضرت شیخ شاہیؒ اپنے دوستوں سے اس قدر محبت کرتے ہیں۔

اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے آخر میں محبوبِ الٰہیؒ فرماتے ہیں۔

''حضرت شیخ شاہیؒ کو شریعت کا اس قدر خیال تھا کہ دوستوں سے عالمِ بے خبری میں سرزد ہونے والے گناہ کو بھی معاف نہیں کیا۔ اور دوستوں سے محبت کا یہ عالم تھا کہ جب تک دوستوں کے پسینے کے برابر اپنا خون نہیں بہا دیا، اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے۔''

آپؒ کی کرامات بے شمار ہیں۔ اگر ان کرامات کو یکجا کر دیا جائے تو اچھا خاصا ایک دفتر تیار ہو جائے۔ حضرت شیخ شاہیؒ جب عشق و مستی کی انتہا کو پہنچے تو آپؒ کے جسم مبارک سے کرامتیں اس طرح پھوٹنے لگیں جیسے آفتاب سے روشنی کی کرنیں۔ ہر چند کہ آپؒ اپنے کمالات کو ظاہر نہیں فرماتے تھے لیکن لوگ تو دیکھ رہے تھے کہ آپؒ نے جس کے لئے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے، وہ کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ بالکل اسی طرح کہ سورج اپنی زبان سے یہ کہے کہ میں سورج نہیں ہوں تو دنیا کا کوئی ذی ہوش انسان اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کیونکہ روشنی کی کرنیں سورج کی ہستی کی دلیل ہیں۔ اس طرح حضرت شیخ شاہیؒ بھی زبان سے اپنی کرامتوں کی نفی کرتے مگر آپؒ کے سراپا سے کمالات کا نور اس طرح ظاہر ہوتا کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو جاتیں۔

ایک بار محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ بیمار ہو گئے۔ مرض نے یہاں تک طول کھینچا کہ آپؒ نے حضرت شیخ شاہیؒ کو پیغام بھیجا اور دعا کے طالب ہوئے۔ حضرت شیخ شاہیؒ، محبوبِ الٰہیؒ سے بے حد شفقت فرماتے تھے۔ جیسے ہی آپؒ کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بیماری کی خبر ملی، آپؒ فوراً عیادت کو تشریف لے گئے۔ آپؒ کو دیکھ کر محبوبِ الٰہیؒ کے چہرے پر رونق آ گئی اور پھر سلطان المشائخ نے بڑے ادب سے عرض کیا۔

''حضرت! آپ دعا فرمائیں کہ میری بیماری صحت میں بدل جائے۔''

محبوبِ الٰہیؒ کی اس خواہش پر آپؒ نے کچھ دیر تک سکوت فرمایا اور پھر بڑے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''میاں نظام الدین! تم تو اہلِ کرم ہو۔ پھر کیوں مجھ گناہ گار سے یہ توقع رکھتے ہو؟ میں تو ایک بازاری آدمی ہوں۔ اگر مردِ خدا ہوتا تو یقیناً تمہارے لئے دعا کرتا۔''

''شیخ! آپ جو کچھ ہیں، اسے دنیا جانتی ہے۔ بس آپ تو میرے لئے دعا فرمائیں...... صحت دینا اُس طبیبِ حقیقی کا کام ہے جس کے حکم سے مُردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔'' محبوبِ الٰہیؒ کی اس ضد کے جواب میں حضرت شیخ شاہیؒ نے بہت عذر پیش کئے مگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے آپؒ کا کوئی عذر قبول نہیں کیا۔ آخر آپؒ مجبور ہو گئے اور پھر فرمایا۔ ''اگر آپ اصرار ہی کرتے ہیں تو دو آدمیوں کو بلوا دیجئے۔''

ان آدمیوں میں سے ایک کا نام اشرف تھا جو بہت نیک اور صالح تھے۔ دوسرا آدمی ایک درزی تھا۔ جب وہ دونوں اشخاص تشریف لے آئے تو حضرت شیخ شاہیؒ نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''شیخ نظام الدین اولیاء نے مجھے اس کام کا حکم دیا ہے۔ اس لئے جو کچھ بھی کہوں، تم اس سلسلے میں میری مدد کرو۔ شیخ کا جسم سر سے لے کر سینے کے نیچے تو میرے سپرد ہے..... باقی ایک ایک ٹانگ تم دونوں کے حوالے ہے۔''

چنانچہ تینوں آدمی ازالۂ مرض کے لئے مصروف کار ہو گئے۔ یہاں تک کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے غسل صحت فرمایا۔

ممکن ہے کچھ لوگوں نے اسے معمولی واقعہ سمجھ کر زیادہ اہمیت نہ دی ہو۔ مگر جن لوگوں کی تاریخ پر نظر ہے، وہ اس واقعہ میں کئی اہم پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت شیخ شاہیؒ نے جن دو غیر معروف آدمیوں کو بلا لیا

تھا، وہ بھی اپنے وقت کے باکمال بزرگ تھے۔ ایسے بزرگ جنہیں عام انسان پہچانتے تک نہ تھے۔

دوسرا اہم پہلو جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جس وقت آپؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی صحت یابی کے لئے دعا فرمائی، وہ آپؒ کی عمر کا آخری حصہ تھا۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور کتاب ''اخبارالاخیار'' میں حضرت شیخ شاہیؒ کی تاریخ پیدائش 502 ہجری تحریر فرمائی ہے۔ اسی کتاب میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی تاریخ پیدائش 631 ہجری درج ہے۔ اس اعتبار سے حضرت شیخ شاہیؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی پیدائش سے ایک سو اُنتیس (129) سال بڑے تھے۔ آپؒ نے 658 ہجری یعنی حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے عمر کے ستائیس (27) سال بعد وفات پائی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب آپؒ نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی صحت کے لئے دعا فرمائی تھی، اس وقت محبوبِ الٰہی کی عمر مشکل سے بیس یا بائیس سال ہو گی۔ اب آپ دونوں بزرگوں کی عمروں کو پیش نظر رکھ کر حضرت شیخ شاہیؒ کے اس جملے پر غور فرمایئے...... ''شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے مجھے اس کام کا حکم دیا ہے۔''

جو نوجوان، حضرت شیخ شاہیؒ سے عمر میں ایک سو اُنتیس سال چھوٹا تھا، آپؒ نے اُسے شیخ کے لقب سے یاد فرمایا۔ اور اس نوجوان کی گزارش کو آپ نے حکم قرار دیا۔ یہ تھی حضرت شیخ شاہیؒ کی عاجزی جو درویشی کی پہلی شرط ہے۔

اس کے علاوہ اس واقعہ سے حضرت شیخ شاہیؒ کی روشن ضمیری کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائے عمر کے باوجود آپؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے چہرے پر ''محبوبِ الٰہیؒ'' کا عکس دیکھ رہے تھے۔ حضرت شیخ کی نگاہِ معرفت کی اسی طاقت کو دیکھ کر اپنے پیر و مرشد حضرت حمید الدین ناگوریؒ نے اپنے اس مرید کو ''شاہِ روشن ضمیر'' کہہ کر پکارا تھا۔

حضرت شیخ شاہیؒ کی روشن ضمیری جس قدر پابندِ شریعت تھی، اس کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ حضرت، شریعت کی حدود سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپؒ کا قولِ مبارک ہے۔

''ضبطِ نفس کرو اور اعلیٰ ظرف بنو۔ عشق، سمندر ہے۔ پانی کا پیالہ نہیں۔ اگر کوہ آب بن کر چھلک گئے تو ہلاک ہو جاؤ گے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔''

آپؒ نے کئی بار فرمایا۔ ''خدا اگر تجھے کمال دے تو شب و روز جاگ کر اس کی حفاظت کر۔ ورنہ رہزن تیری گھات میں ہے۔ کرامت کو شعبدہ بازی نہ بنا۔ تجھے یہ صلاحیت اس لئے نہیں دی گئی ہے کہ تُو لوگوں کو تماشا دکھائے اور پھر خود بھی نگاہِ قدرت میں تماشا بن جائے۔''

ایک روز محفلِ سماع گرم تھی۔ بدایوں کے صاحبانِ نظر، شریکِ بزم تھے۔ حاضرین میں حضرت شیخ شاہیؒ کے حقیقی بھانجے، خواجہ منورؒ بھی موجود تھے اور کلام عارفانہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چونکہ آپؒ کا عالمِ شباب تھا اور معرفت کی ابتدائی منزلوں میں تھے، اس لئے کچھ دیر بعد ہی آپؒ پر جذب کا عالم طاری ہو گیا۔ محفل کے در و بام محوِ سماع تھے کہ خواجہ منور کو وجد آیا اور آپؒ جست کر کے تھوڑی دُور اڑے۔ حضرت شیخ شاہیؒ نے تیز نگاہ سے انہیں دیکھتے ہوئے فرمایا۔

''افسوس! سمندر نہ بنا، پیالے کی طرح چھلک گیا۔''

ابھی آپؒ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ خواجہ منور زمین پر گرے اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ آپؒ کی قبر بھی حضرت شیخ شاہیؒ کے قریب ہی ہے مگر بہت کم لوگ اس جواں مرگ ولی کے حالات سے

واقف ہیں۔
اور پھر ایک دن یہ روشن ضمیر بھی اپنی شعاعیں لٹاتا ہوا نقابِ خاک پہن کر 658ھ میں ابدی نیند سو گیا۔
حضرت شیخ شاہیؒ کی موت کا واقعہ بھی عجیب واقعہ ہے۔ ''فوائد الفواد'' اور ''خزینتہ الاصفیاء'' میں درج ہے کہ ایک دن ایک درویش، شیخ مسعود نخاسیؒ جو بدایوں میں رہتے تھے، آپؒ سے ملنے کے لئے آپؒ کی مسجد میں تشریف لائے اور جذب کے عالم میں فرمایا۔
''حسن! تم نے بہت ہنگامہ برپا کیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم اپنی ہی آگ میں نہ جل جاؤ۔''
یہ کہہ کر درویش چلا گیا۔ حضرت شیخ شاہیؒ جیسے ہی اپنے مکان میں تشریف لے گئے۔ اچانک گھر کے اندر آگ لگ گئی۔ آپؒ کے بہت سے مرید اس موقع پر موجود تھے۔ تمام لوگوں نے اندر جانے کی کوشش کی تا کہ حضرت کو آگ کے شعلوں سے بچایا جا سکے مگر ساری کوششیں ناکام گئیں۔ آگ اس قدر تیز تھی کہ ایک مرید بھی مکان کے اندر داخل نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ آگ کی سوزش سے آپؒ کا انتقال ہو گیا۔
آپؒ کی ناگہانی وفات کی خبر سن کر پورے بدایوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ عام عقیدت مندوں سے لے کر شہر کے امراء تک آپؒ کے مکان کی طرف دوڑ پڑے۔ کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ کل تک جس کی دعاؤں سے لاعلاج مریض صحت یاب ہوتے تھے، آج وہ خود نذرِ اجل ہو گیا تھا۔ ایک مرید جو شدتِ غم سے تقریباً دیوانہ سا ہو گیا تھا، بار بار چیخ رہا تھا۔
''خدا کی قسم! وہ آگ عجیب آگ تھی...... اسے تمام دنیا کے لوگ مل کر بھی نہیں بجھا سکتے تھے۔''
بہت دیر تک فضا ماتمی چادر اوڑھے رہی اور پھر حضرت شیخ شاہیؒ کو قدرت کے اس قانون کے تحت سپردِ خاک کر دیا گیا...... ''کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْت'' (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے)
آپؒ میں روشن ضمیریؒ کی یہ صلاحیت ریش دراز رکھنے اور رنگین قبا پہننے سے پیدا نہیں ہو گئی تھی۔ روشن ضمیری، ذکرِ الٰہی، نفس کشی اور گریۂ نیم شبی کے نتائج کا نام ہے۔ حضرت شیخ شاہیؒ نے جس طرح اپنے نفسِ امارہ کو قتل کیا، اس کا اندازہ آپ کو مندرجہ بالا مثالوں سے ہو چکا ہو گا۔ رہا ذکرِ الٰہی تو حضرت کی آنے جانے والی سانسوں کا دوسرا نام ہی ذکرِ الٰہی تھا۔ اور پھر یہ اسی ذکر کا صدقہ تھا کہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں بھی آپؒ کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک معروف شخص سلطان یمنی، دربارِ نبوی ﷺ میں حاضری دینے کے لئے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے۔ وہ چونکہ نابینا تھے، اس لئے وہیں اقامت گزیں ہو گئے۔ آپؒ روزانہ روضۂ اطہر پر حاضر ہوتے اور اپنی آنکھوں کی روشنی کے لئے دعا کرتے۔ دعاؤں کا یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ آخر ان نابینا بزرگ کو سرورِ کائنات ﷺ نے خواب میں بشارت دیتے ہوئے فرمایا۔
''تم حسن شاہی روشن ضمیر بدایوں کے مزار پر جاؤ...... اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل و کرم سے سرفراز فرمائے گا۔''
سلطان یمنی کی آنکھ کھلی تو اس خوشخبری پر بے حد مسرور ہوئے۔ مگر فوراً ہی اُداس ہو گئے۔ ذہن میں وسوسے اور اندیشے سر اُبھارنے لگے سلطان یمنی نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔ ''کہاں مدینہ منورہ اور کہاں ہندوستان؟ میں آنکھوں سے محروم ایک شخص اتنا طویل سفر کس طرح طے کروں گا؟'' کچھ دیر تک سلطان یمنی کے ذہن میں اسی طرح کے پریشان کن خیالات گردش کرتے رہے۔ پھر یکایک اُنہیں ہوش سا آ گیا اور وہ خود کو ملامت کرنے لگے۔
''جب سرکارِ دو عالم ﷺ نے مجھ محتاج و معذور پر اتنا کرم فرمایا ہے تو آپ ہی سامانِ سفر عطا فرمائیں گے۔''

یہ سوچ کر سلطان کا منتشر دماغ سکون پا گیا اور وہ اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ حق تعالیٰ پردۂ غیب سے کیا ظاہر فرماتا ہے۔

ابھی اس خواب کو دو تین دن ہی گزرے تھے کہ ایک ہندوستانی باشندہ اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں اور میری شدید خواہش تھی کہ میں حج بیت اللہ کی سعادت سے شرف یاب ہو جاؤں۔ حق تعالیٰ نے مجھ گناہ گار کی دعا قبول کی اور اس نعمتِ لازوال سے سرفراز فرمایا۔''

سلطان نے اس شخص کو دلی مراد بر آنے پر مبارکباد پیش کی۔

''میری خواہش ہے کہ آپ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔'' اُس شخص نے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''مجھ گناہ گار کی دعائیں ہی کیا؟'' یہ کہتے کہتے سلطان یمنی کی بے نور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں نابینا تو خود برسوں سے درِاقدس پر پڑا روشنی کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ اب آقا کا حکم ہے کہ بدایوں جا کر حضرت شیخ شاہی روشن ضمیرؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دوں۔''

یہ سنتے ہی وہ ہندوستانی شخص بڑے والہانہ انداز میں آگے بڑھا اور اس نے کئی بار سلطان یمنی کی آنکھوں کو بوسے دیئے۔

''مبارک ہیں یہ آنکھیں جنہیں سرورِ کونین ﷺ کا دیدار نصیب ہوا۔'' پھر جب وہ شخص اظہارِ عقیدت کر چکا تو نہایت محبت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

''بزرگ! آپ کا شمار تو ان مسافروں میں ہوتا ہے جو آسودۂ منزل کہلاتے ہیں۔ پھر آپ کو کیا پریشانی اور کیا شکایت ہے؟''

ہندوستانی شخص کی بات سن کر سلطان یمنی نے انتہائی پُرسوز لہجے میں کہا۔ ''جب سرکارِ دو عالم ﷺ کے درِاقدس پر آ گیا تو پھر کہاں کا غم اور کیسی پریشانی؟ بس اتنی سی خلش ہے کہ اپنے آقا ﷺ کے حکم کی تکمیل کیسے کروں گا؟ میں ایک نابینا شخص ...... اور ہندوستان کا اتنا طویل سفر؟'' یہ کہہ کر سلطان یمنی خاموش ہو گئے۔ چند لفظوں میں انہوں نے اپنی مشکل کا اظہار کر دیا تھا۔

''اگر آپ کی غیرت و خودداری مجروح نہ ہو تو ایک بات عرض کروں۔'' ہندوستانی شخص نے بصدِ احترام عرض کیا۔

''تم میرے دینی بھائی ہو۔'' سلطان یمنی نے جواباً کہا۔ ''یقیناً ایسی کوئی بات نہیں کہو گے جس سے میری دل آزاری ہو۔''

''اگر آپ پسند کریں تو اس طویل سفر میں، میں آپ کا ہم سفر بننے کے لئے تیار ہوں۔'' ہندوستانی کے لہجے میں جھجک کا اظہار ہو رہا تھا۔

یہ سن کر سلطان یمنی کے چہرے پر چند لمحوں کے لئے گہری خوشی کا رنگ اُبھر آیا۔ مگر فوراً ہی اس مسرت پر اُداسی حاوی ہو گئی۔ پھر سلطان یمنی نے کسی قدر بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بڑی بات ہے کہ اس طویل سفر میں تم نے ایک اندھے مسافر کی ذمہ داری قبول کی۔ مگر پھر بھی کچھ مجبوریاں ہیں جو میرے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکتی ہیں۔'' اور یہ مجبوری اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ سلطان یمنی زادِ سفر نہیں رکھتے تھے۔ اور آپؒ کی غیرت یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ ایک اجنبی کے سامنے اپنی اس مجبوری کا اظہار کریں۔

وہ ہندوستانی ایک ذہین انسان تھا۔ اس نے سلطان یمنی کے چہرے سے اس مجبوری کا اندازہ کرلیا۔ اور پھر درخواست گزاری کے انداز میں کہنے لگا۔ ''اگر آپ مجھے اپنا دینی بھائی سمجھتے ہیں تو براہِ کرم اس مجبوری کو ذہن سے نکال دیں...... اور میرے ساتھ ہندوستان تشریف لے چلیں۔''

آخر سلطان یمنی طویل سفر طے کر کے ہندوستان پہنچے اور پھر حضرت شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے۔ آپؒ کا ہم سفر شخص بدایوں کے قریبی علاقے کا رہنے والا تھا اور مالی اعتبار سے ایک آسودہ حال انسان تھا۔ وہ سلطان یمنی کے ساتھ مزارِ مبارک سے ملحقہ مسافر خانے میں ٹھہر گیا اور انتظار کرنے لگا کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

سلطان یمنی نے حضرت شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دی۔ آپؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کیا اور قبر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ شخص بڑے غور سے سلطان یمنی کے عمل کو دیکھ رہا تھا۔ سلطان یمنی نے مزارِ مبارک کی خاک اپنی دونوں آنکھوں پر ملی اور مسافر خانے میں آکر اپنے اوراد و وظائف میں مشغول ہو گئے۔

درگاہ کے منتظمین فجر کی نماز سے پہلے مزارِ مبارک کو غسل دیا کرتے تھے۔ اس موقع پر سلطان یمنی بھی وہاں موجود ہوتے تھے اور غسل کا پانی اپنی آنکھوں میں لگا لیا کرتے تھے۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ پھر جب ایک دن سلطان یمنی سو کر اُٹھے تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ برسوں کی زائل شدہ بینائی لوٹ آئی اور دنیا کی ہر چیز روشن نظر آ رہی تھی۔ سلطان یمنی کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ آپؒ نہایت وارفتگی کے عالم میں اپنی جگہ سے اُٹھے، وضو کیا اور دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی۔ پھر طویل سجدے میں یہ دعا مانگی۔

''اے ذاتِ پاک! تُو ہی ہر حال میں اپنے بندوں کا مشکل کشا اور دستگیر ہے۔ تمام روشنی اور ہدایت تیری ہی طرف سے ہے اور تُو ہی اپنے حبیب پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس پر بے شمار درود و سلام بھیج کہ ہماری ناپاک زبانیں تو سرکارِ دو عالم ﷺ کی تعریف و توصیف کرنے سے قاصر ہیں۔ اور میرے اس دینی بھائی کو بھی اجرِ عظیم عطا فرما کہ جس نے میری خاطر طویل سفر کی تکلیفیں برداشت کیں۔''

پھر سلطان یمنی نے دیگر لوگوں کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی۔ نماز کے بعد حاضرین کے سامنے ہندوستان آنے کا مقصد بیان کیا اور اپنی بینائی بحال ہونے کا واقعہ سنایا۔ آن کی آن میں یہ خبر پورے بدایوں میں پھیل گئی۔ پھر بدایوں کی حدود سے نکل کر دوسرے علاقوں تک پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ چند دنوں میں ہزاروں انسان، سلطان یمنی کو دیکھنے کے لئے حضرت شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک کے احاطے میں جمع ہونے لگے۔ وہ لوگ سلطان یمنی کو کوئی بہت خدا رسیدہ سا بزرگ سمجھ رہے تھے۔ اس لئے ان سے دعاؤں کی درخواست کرنے لگے۔ لوگوں کا یہ جوشِ عقیدت دیکھ کر سلطان یمنی نے مزارِ مبارک سے ملحقہ مسجد میں ایک نہایت اثر انگیز تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''لوگو! میں کوئی ولیٔ کامل نہیں۔ تمہاری ہی طرح ایک عام سا انسان ہوں..... اور حقیقت تو یہ ہے کہ کل رات تک میں تم سے بھی زیادہ مجبور انسان تھا کہ کسی سہارے کے بغیر چل بھی نہیں سکتا تھا..... اور اگر چلتا تھا تو نابینا ہونے کے باعث قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا تھا۔ تم لوگ خوش نصیب ہو کہ تمہارے شہر میں ایک ایسی محترم ہستی آرام فرما ہے کہ جس کی دعاؤں سے خود مجھے آنکھوں کی روشنی حاصل ہوئی۔ ذرا اندازہ کرو کہ حضرت شیخ شاہیؒ کا کیا مقام ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ مجھے آپ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہونے کا حکم دیتے ہیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ لوگوں کے گھروں کے سامنے نعمتوں کا چشمہ بہہ رہا ہے اور وہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے ایک ایسے کنوئیں کے پاس آئے ہیں جس کے اندر پانی کے چند قطرے بھی نہیں۔''

سلطان یمنی کی تقریر اس قدر پُراثر تھی کہ حاضرین مسجد رونے لگے۔ سلطان یمنی نے فرمایا۔ ''اللہ کے احسانِ عظیم کا شکر ادا کرو..... اور اِدھر اُدھر نہ بھٹکو..... تمہارے لئے حضرت شیخ شاہیؒ کا فیض روحانی کافی ہے۔''

اہلِ بدایوں کے سامنے اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے کے بعد سلطان یمنی دوبارہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہ شخص جو سلطان یمنی کو اپنے ساتھ لے کر ہندوستان آیا تھا، ایک معمولی درجے کا تاجر تھا۔ مگر اس واقعہ کے بعد خداوند ذوالجلال نے اس کے کاروبار میں اتنی برکت دی کہ وہ ہندوستان کا بڑا تاجر بن گیا۔ وہی شخص حضرت شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک پر پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا تھا اور درگاہ کے منتظمین کو رورو کر یہ واقعہ سنایا کرتا تھا۔

''حق تعالیٰ کسی کی نیکی کو برباد نہیں کرتا۔ میں نے سلطان یمنی کی خاطر ذرا سی تکلیف اٹھائی تھی کہ ربِ ذوالجلال نے مجھے اس قدر نواز دیا کہ میں جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ سلطان یمنی کی آمد کے بعد حضرت شیخ شاہیؒ کے فیض روحانی کا ذکر عام ہوا ہو۔ اور پھر ہندوستان کے گوشے گوشے طالبانِ دید یا ضرورت مند افراد بدایوں میں جمع ہوتے رہے ہوں۔ اور اس طرح حضرت شیخ شاہیؒ کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی ہو۔

''میں صدیوں بے نشان رہوں گا...... پھر وہ ذاتِ باری میری مشتِ خاک کو جمع کر کے ایک ایسا نشان بخشے گی، جسے جھٹلانے کی جرأت کسی میں نہ ہوگی۔''

حضرت شیخ شاہیؒ ''کشتگانِ خنجر تسلیم را'' کے گروہ میں ایک ممتاز شخصیت تھے۔ اس لئے مرنے کے بعد خدا نے آپؒ کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ ایسی زندگی، جس کا ادراک عام آدمی نہیں کر سکتا۔ انسانوں کی اکثریت یہی سمجھتی ہے کہ خاک میں دفن ہونے کے بعد خدا کا دوست بھی خاک ہو گیا۔ مادی نقطہ نظر سے اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو خدا کے دوست کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جب عقلِ انسانی اپنے مسائل کا حل سوچتے سوچتے تھک جاتی ہے تو پھر خدا اپنے ان دوستوں کو سرخرو کر دیتا ہے۔

1857ء کا پُرآشوب زمانہ تھا۔ غدر کی ہنگامہ خیزیوں کی آڑ لے کر فتنہ پرداز ہندو سر اٹھا رہے تھے۔ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ اسی انتشار کی فضا سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہندو کسانوں نے شیخ زادوں کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا۔

شیخ زادے، حضرت بابا فریدؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں حضرت شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک کا انتظام بھی تھا۔ آج ان ہی شیخ زادوں کو لوٹنے کے لئے قریبی دیہات کے ہندو کسان خوفناک ارادے لے کر جمع ہو رہے تھے۔ اگرچہ اس منصوبے کو خفیہ رکھا گیا تھا لیکن پھر بھی کسی نہ کسی طرح شیخ زادوں کو اس کا پتہ چل ہی گیا۔ ہندو کسانوں کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں تک پہنچتی تھی اور اس کے برعکس شیخ زادوں کے خاندان کے افراد بہت کم تھے۔ اس لئے بظاہر کسی میں حملہ آوروں کے مقابلے کی جرأت نہیں تھی۔ مجبوراً شیخ زادوں نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لئے اور چند نوجوانوں کو محلے کے خاص مورچوں پر لگا دیا۔ صرف یہ سوچ کر کہ اگر مزاحمت نہیں کی گئی تو حملہ آور شدید قتل و غارت کا بازار گرم کریں گے۔ شیخ زادوں کے خاندان کے کچھ نوجوان مقابلے کے لئے نکل آئے لیکن سب کے دل سہمے ہوئے اور چہرے زرد تھے۔ جو بوڑھے اور عورتیں اپنے اپنے گھروں میں محصور ہو گئے تھے، ان کے لئے ہر لمحہ قیامت سے کم نہ تھا۔ کسی وقت بھی کوئی بری خبر سننے میں آ سکتی تھی۔

آخر اپنے سینے میں ہلاکت و بربادی کا طوفان چھپائے ہوئے وہ نازک ترین وقت آ پہنچا۔ ہندو کسان اپنے

کافرانہ نعروں کے ساتھ شیخ زادوں کے محلے پر حملہ آور ہوئے۔ ایک شور اُٹھا اور فضا پر محیط ہو گیا۔ چاروں طرف دردناک انسانی چیخیں تھیں جو رات کے سناٹے کا دل چیر کر محصور شیخ زادوں پر لرزہ طاری کر رہی تھیں۔ بہت دیر تک کشت خون کی آندھیاں چلتی رہیں اور جب سیلابِ بلا ٹھہرا تو شیخ زادے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے کسی آدمی کے جسم پر ایک بھی زخم نہیں آیا ہے اور سامنے زمین پر سینکڑوں ہندو کسانوں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر عقلِ انسانی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ شیخ زادوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا۔

آخر صبح کے وقت اس عجیب و غریب جنگ کا معمہ حل ہوا۔ بدایوں کے ایک بزرگ شیخ زادوں کے محلے میں گئے اور پھر انہوں نے اپنا ایک خواب بیان کیا۔ جب ہندو کسان شیخ زادوں پر حملہ آور تھے، اس وقت ان بزرگ نے یہ خواب دیکھا تھا۔ بزرگ اپنا خواب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ شاہیؒ سبز عمامہ باندھے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ آپؒ انتہائی عجلت میں ہیں اور فرماتے ہیں کہ بابا فرید گنج شکرؒ کی اولاد پر ہندو گنواروں نے حملہ کر دیا ہے...... ہم ان کے دفاع کے لئے جا رہے ہیں۔

بعد میں جو کسان ہلاک ہونے سے بچ گئے تھے، وہ انتہائی خوف زدہ انداز میں اپنے ہم قوموں کی شکست کی روداد بتاتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ ہم شیخ زادوں کا مقابلہ تو کر لیتے اور شاید ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتے مگر ان سبز پوشوں کا مقابلہ کون کرتا جو گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی برہنہ تلواریں تھیں۔ ہمارا کوئی آدمی شیخ زادوں کے ہاتھ سے ہلاک نہیں ہوا۔ وہ سبز پوش ہی تھے، جنہوں نے ہمارے لئے فرار کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔

شیخ زادوں پر ظلم کا واقعہ نیا نہیں ہر دور میں ان کے ساتھ زیادتیاں کی گئی ہیں۔ مگر ہر مرتبہ حضرت شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک کی برکتوں سے یہ فتنے ٹل گئے اور شیخ زادے دشمنوں کے شر سے محفوظ رہے۔ تقسیم کے بعد حکومت ہندوستان نے بھی ان کے ساتھ ناانصافی کی تھی لیکن یہ لامذہب حکومت اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکی۔

حکومتِ ہندوستان کے غیر منصفانہ عمل کو قلم بند کرنے سے پہلے میں شیخ زادوں اور مزارِ مبارک کے منتظمین کے بارے میں آپ کو کچھ تفصیلات بتانا چاہتا ہوں۔ شروع میں شیخ زادوں کا ایک مختصر سا خاندان تھا اور یہی خاندان حضرت شیخ شاہیؒ اور آپ کے چھوٹے بھائی حضرت سیّد بدرالدین کے مزارات کی نگرانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے آنے والے لوگ عقیدت کے طور پر اپنی نذریں اسی خاندان کو پیش کیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ شاہیؒ کے انتقال کے ابتدائی زمانے میں یہ نذریں محدود تھیں۔ اس لئے شیخ زادوں کے خاندان کی گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ قناعت پسند اور سادہ مزاج ہونے کے سبب اس خاندان نے کسی نہ کسی طرح اپنا وقت گزار دیا۔ مگر جب خاندان کے افراد میں اضافہ ہونے لگا تو شیخ زادوں کو اقتصادی مسائل کا شکار ہونا پڑا۔

حضرت شیخ شاہیؒ سے نسبت کے سبب یہ خاندان کوئی ناجائز کام بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب ان کے لئے مسائل کم ہونے کے بجائے بڑھتے ہی چلے گئے۔

آخر ایک دن تمام خاندان حضرت کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوا اور گریہ و زاری کرنے لگا۔ اور پھر جب رات کو یہ لوگ سوئے تو خاندان کے سب سے زیادہ بزرگ شخص نے حضرت شیخ شاہیؒ کو خواب میں دیکھا۔ آپؒ فرما رہے تھے۔ ''اُداس نہ ہوں۔ صبح اُٹھ کر سب لوگوں سے کہہ دیں کہ صبر کریں۔ خدا کو صابر بندے بہت زیادہ پسند ہیں۔''

اس خاندان کے بزرگ نے صبح بیدار ہونے کے بعد سب لوگوں کو جمع کیا اور حضرت شیخ شاہیؒ کا یہ پیغام سنا

دیا۔لوگ مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس واقعہ کے بعد کئی ماہ گزر گئے مگر حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ایک بار پھر یہ خاندان اُداسیوں کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ابھی شیخ زادوں کی مایوسیاں بڑھتی جارہی تھیں کہ اچانک ایک روز ایک اجنبی شخص آیا اور مزار کے قریب اس طرح پڑ گیا جیسے اس کا آخری ٹھکانہ یہی ہو۔ وہ شخص چالیس دن تک عجیب حالت میں پڑا رہا۔ اس کا چہرہ دق کے مریض کی طرح زرد تھا۔ اگر دو تین دن میں اسے کبھی بھوک لگتی تو معمولی سا کھانا کھا لیتا ورنہ اسی طرح فاقے کی حالت میں دن گزار دیتا۔ ہر جمعرات کو جب مزار کو غسل دیا جاتا تو اس کی کیفیت قابل دید ہوتی۔ وہ دیوانوں کی طرح آگے بڑھتا اور غسل کا پانی اس طرح پینے لگتا جیسے وہ صدیوں سے پیاسا ہے۔ تمام حاضرین اس مدقوق شخص کو حیرت سے دیکھتے...... مگر وہ کسی سے کچھ نہ کہتا۔ جیسے وہ اس دنیا سے بے تعلق ہے۔

اجنبی کو اسی عالم میں بیس دن گزر گئے۔ اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ البتہ اس کے زرد چہرے پر اب پہلے جیسی بے رونقی نہیں تھی۔ جس کی رگوں میں خون دوڑنے کی ہلکی سی علامت بھی نظر نہیں آتی تھی، اب اس کے چہرے پر ہلکا ہلکا خون جھلکنے لگا تھا۔ اس تبدیلی کو مزار کے تمام منتظمین نے بڑے تعجب سے دیکھا مگر اجنبی سے کچھ دریافت نہیں کیا کیونکہ وہ کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔

آخر وقت گزرتا گیا اور چالیس دن پورے ہو گئے۔ اب وہ مدقوق شخص ایک صحت مند انسان تھا۔ اب اُس کے روّیے میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ اس نے مزار کے منتظم حضرات سے بڑے شگفتہ لہجے میں گفتگو کی اور بتایا۔

''میں دہلی کا ایک دولت مند انسان ہوں۔ مجھے خدا نے دنیا کی ہر آسائش سے نوازا تھا۔ مگر میں نے اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے اپنے سرمائے کو عورت اور شراب کی نذر کر دیا۔ یہاں تک کہ مجھے دق ہو گئی۔ میں دولت کی فراوانی کے نشہ میں غرق تھا۔ جب ڈاکٹروں نے مجھے رپورٹ پیش کی تو میں نے ان کی تشویش کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ دنیا میں دولت سب کچھ ہے۔ میرا سرمایہ مجھے صحت بخشے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور میرے فریب کا طلسم ٹوٹا جب دق کے مہلک جراثیم نے میرے پھیپھڑوں کو گلا کر رکھ دیا۔ اب میرا سرمایہ ایک مفلس کے وسائل سے بھی کم تھا۔ میں دولت کے انبار کی طرف دیکھتا تو آنسو بہانے لگتا۔ ڈاکٹروں نے مجھے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔

آخر میں نے عالم بے قراری میں طبیبِ حقیقی کو پکارنا شروع کر دیا۔ میری راتیں گریہ و زاری میں کٹیں۔ اور جب ایک روز مجھے نیند آئی تو میں نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ وہ نور کا پیکر، وہ مہربان بزرگ مجھے کہہ رہے تھے۔

''خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بدایوں آ کر میرے مزار پر چالیس دن گزار۔ تجھے قدرت ذوالجلال کا کرشمہ نظر آئے گا۔'' نیند سے بیدار ہوتے ہی میں بدایوں روانہ ہو گیا۔ یہاں آ کر مجھے محسوس ہوا کہ اس شہر کی ایک ایک گلی میری دیکھی ہوئی ہے۔ مجھے خواب میں سارا نقشہ دکھا دیا گیا تھا۔ میں چالیس دن تک مزارِ مبارک کا غسل کا پانی پیتا رہا۔ یہی میری دوا تھی۔ خدا نے حضرت شیخ کے آستانے کی خاک کے صدقے میں مجھے وہ شے بخش دی جو دنیا کا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی نہیں دے سکتا تھا۔''

یہ کہہ کر اس اجنبی نے مزار کے منتظمین کو کئی ہزار روپے بطور نذر پیش کئے۔

اہلِ خاندان کے پریشان چہروں پر رونق آگئی اور پھر یہ بات سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئی کہ حضرت شیخ شاہیؒ کی دعاؤں سے لاعلاج مریض بھی صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ اس شور کے ساتھ ہی بدایوں، ہند کے تمام مریضوں لئے دارالشفا بن گیا۔ ملک کے گوشے گوشے سے مایوس انسانوں کا ہجوم، حضرت شیخ شاہیؒ کے قدموں کی

طرف بڑھنے لگا۔

اور پھر گردشِ ماہ وسال کے بعد بدایوں کو ایک اور خصوصیت حاصل ہوگئی۔ وہ لوگ جو کسی حادثے کے سبب اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہوں۔ پھر تمام دنیا کے ڈاکٹر ان کے پاگل پن کو لاعلاج قرار دے دیتے، وہ مریض بھی حضرت شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دیتے۔ یہاں تک کہ ایک مخصوص چلّہ کشی کے بعد خدا اُنہیں صحت بخش دیتا۔ ان پاگل انسانوں کے ہجوم میں ان لوگوں کی اکثریت ہوتی جن کے بارے میں کہا جاتا کہ وہ کسی آسیب، جن یا ماورائی طاقت کے تشدد کا نشانہ بن گئے ہیں۔

مادہ پرست جو ہر قدم پر عقل کا سہارا لیتے ہیں، وہ اس زندہ حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ مزار پر جو پاگل لڑکیاں نظر آتی ہیں، وہ کسی آسیب کا شکار نہیں ہوتیں۔ ہسٹریا کا مرض شدت اختیار کر لیتا ہے یا پھر کوئی دوسرا جذباتی حادثہ اُنہیں ذہنی خلل میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ نوجوان لڑکوں کے پاگل پن کی توجیہہ بیان کرتے ہیں اور اپنے منطقی دلائل سے یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ماورائی طاقت موجود نہیں۔

اگر یہ بات صرف ماورائی طاقت کی ہوتی تو میں اس بحث میں ہرگز نہیں اُلجھتا مگر اس قسم کے تبصروں کے پیچھے مادہ پرستوں کی گمراہ ذہنیت کارفرما ہوتی ہے اور وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بزرگانِ دین کا روحانی فیض محض ایک فریب ہے۔

آپ بھی اپنے ذہن سے کسی آسیب یا جن کے تصور کو خارج کر دیجئے۔ لیکن مادہ پرست، حقیقت کو کس طرح جھٹلائیں گے کہ وہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جنہیں زنجیریں پہنا کر بدایوں لایا جاتا ہے اور پھر وہ کچھ عرصے بعد پاگل پن کے خوفناک مرض سے نجات پا کر مسکراتے ہوئے شاداب چہروں کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ وہ ہسٹریا کی مریض لڑکیاں ہوں یا جذباتی حادثے کے شکار لڑکے۔ میں ذیل میں اس عجیب وغریب طریقۂ علاج کی تفصیلات بیان کرتا ہوں۔

جب کوئی لڑکا یا لڑکی معمولی پاگل پن کا شکار ہوتا ہے تو اسے شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک پر نہیں لایا جاتا بلکہ پاگل نوجوانوں کے والدین کسی ڈاکٹر سے رجوع کرتے ہیں۔ مگر جب بے پناہ اخراجات کے بعد ڈاکٹر، مریضوں کو لاعلاج قرار دے دیتے ہیں تو پھر وہ غم زدہ ماں باپ آخری سہارے کے طور پر اپنی وحشت زدہ اولادوں کو پابہ زنجیر کر کے اس شہر کی طرف لے جاتے ہیں، جسے ہندوستان کا مدینہ کہا جاتا ہے مزارِ مبارک کے احاطے میں داخل ہوتے ہی مریض کے نگراں، مزارِ مبارک کے منتظمین سے ملتے ہیں اور اپنی پریشانیاں ان کے گوش گزار کرتے ہیں۔ منتظم حضرات نے اس قسم کے مریضوں کے لئے ایک اصول بنالیا ہے کہ جو پاگل بھی علاج کی غرض سے حضرت شیخ شاہیؒ کے مزار پر آئے گا، اسے ایک درخواست دینا ہوگی۔ یہ درخواست مزار کا کوئی منتظم تحریر کرے گا جس میں مریض کے تمام حالات درج ہوں گے اور آخر میں حضرت شیخ شاہیؒ سے گزارش کی جائے گی کہ آپ مریض کی صحت کے لئے بارگاہِ خداوند ذوالجلال میں دعا فرمائیں۔ یہ درخواست مکمل ہونے کے بعد مریض کے نگران سے چھ روپے طلب کئے جاتے ہیں۔ یہ درخواست کی فیس کہلاتی ہے۔ فیس کی ادائیگی کے بعد منتظم، مریض اور اس کے عزیزوں کو مزار کے احاطے یا ملحقہ باغ میں ٹھہرنے کی اجازت دے دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دیتا ہے کہ مریض کے ساتھ آنے والے رشتے داروں کو بہت جلد خواب میں بشارت ہو جائے گی کہ انہیں مزارِ مبارک کے زیر سایہ کتنے دن قیام کرنا ہے۔ اس قیام کا مطلب مدتِ علاج ہے کہ مریض کو اتنے عرصے تک روحانی دوا کرنی ہے۔ اگر مریض کے رشتے دار مقررہ مدت سے پہلے اسے یہاں سے لے جائیں گے تو ان کا

یہ فعل بد پرہیزی اور نامکمل علاج کے مترادف ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی آنے والوں کو سخت تنبیہہ کی جاتی ہے کہ اگر انہوں نے بشارت کے مطابق عمل نہیں کیا تو تمام تر نتائج کے ذمہ دار خود ہوں گے۔

اس ابتدائی کارروائی کے بعد سب سے پہلے سلطان العارفین حضرت شیخ شاہیؒ کے دربار میں مریض کی پیشی ہوتی ہے۔ پیشی اس لئے کہ مریض کے اعصاب پر جو غیر مرئی طاقت مسلط ہے، وہ مجرم ہے اور اس کا مقدمہ حضرت کی عدالت میں پیش کیا گیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ ہولناک منظر دیکھا ہے کہ جب اس قسم کے مریضوں کو کھینچ کر مزارِ مبارک پر لایا جاتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ وہ نوجوان جو برسوں کی بیماری اور نقاہت کے بعد اس قابل بھی نہیں رہتے کہ دو قدم اپنے پیروں کے سہارے چل سکیں، مزار کے قریب آ کر ان کا جوش و خروش اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ دو تین طاقتور مرد بھی اُنہیں نہیں روک سکتے۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ اور کیوں ہوتا ہے؟ نحیف و نزار انسانوں میں اتنی طاقت...... آخر یہ کیا راز ہے کہ جن لوگوں کی زندگی مُردوں کے مانند ہو، ان میں ناگہانی زندگی کا اس قدر جوش و خروش پیدا ہو جائے۔ پہلے تو ان کے ناتواں جسموں میں اچانک طاقت پیدا ہو جانے کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ زبردستی کوئی جواز پیدا کر بھی لیں تو اسے کیا کہیں گے کہ جو لوگ زنجیریں پہنے ہوئے، خاموش منہ چھپائے پڑے رہتے ہیں، جب انہیں مزار کی طرف لایا جاتا ہے تو یکایک دردناک آواز کے ساتھ کیوں چیخنے لگتے ہیں؟ مریضوں کے رشتہ دار اُنہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے۔ پھر یہ دل ہلانے والی گریہ و زاری کیوں ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب دنیا میں کسی کے پاس نہیں۔ ہر عقل حیران ہے اور ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔

حضرت شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دینے کے بعد مریضوں کو آپؒ کے چھوٹے بھائی، حضرت سیّد بدرالدینؒ کی درگاہ پر لے جایا جاتا ہے۔

انسانی چیخیں جو حضرت شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک پر بلند ہوتی تھیں، یہاں پہنچ کر اُن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت سیّد بدرالدینؒ انتہائی جلالی بزرگ تھے۔ اس کے برعکس حضرت سیّد شیخ شاہیؒ کی روحانیت میں جمال کا رنگ زیادہ ہے۔ حضرت بدرالدینؒ کے مزار پر جو آہ و بکا ہوتی ہے، وہ بڑے سے بڑے نڈر انسان کے جسم پر لرزہ طاری کر دینے کے لئے کافی ہے۔ میں نے بعض نوجوانوں کو مسلسل ایک گھنٹے تک اپنے سر کو پتھر سے ٹکراتے ہوئے دیکھا ہے۔ انسانی ہڈیوں اور سنگِ در کا یہ تصادم ایسا نہیں ہوتا کہ آپ اس عمل کو مصنوعی سمجھیں۔ جن لوگوں کو بدایوں کے مزارات اور مریضوں کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پتھر کے فرش اور ستونوں سے اس جارحانہ انداز میں سر ٹکرانے کے بعد کوئی انسان بھی شدید طور پر زخمی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر واقعتاً ایسا نہیں ہوتا۔ گھنٹوں سر ٹکرانے کے باوجود مریض ہر قسم کی چوٹ سے محفوظ رہتے ہیں۔

اور پھر مخصوص مدت تک یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے زرد چہروں پر سرخی چھانے لگتی ہے۔ اور ذہنی توازن اس طرح ٹھیک ہو جاتا ہے، جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہیں تھے۔

میری طرح پاک و ہند کے لاکھوں انسانوں نے اپنی آنکھوں سے یہ ہولناک مناظر دیکھے ہوں گے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ان واقعات کی توجیہہ کس طرح کی جائے؟ انہیں عقل اور منطق کی کون سی کسوٹی پر پرکھا جائے؟ یہ حضرت شیخ شاہیؒ کا فیض روحانی ہے یا نہیں؟ اب میں تمام باتوں کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

یہ تھا حضرت شیخ شاہیؒ اور آپؒ کے چھوٹے بھائی، حضرت سید بدرالدینؒ کے مزارات کا چشم دید احوال۔ اب میں حکومت ہندوستان کی اس ناانصافی کو دائرۂ تحریر میں لانا چاہتا ہوں، جو ایک عجیب پُراسرار واقعہ بن کر رہ گئی

ہے۔ تقسیم برصغیر کے بعد بھارتی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ اس کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ اس پالیسی کی وضاحت اس طرح کی گئی کہ ہندوستان میں بہت سے مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ جبکہ سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی ہے۔ باقی اقلیتوں میں سکھ، جینی اور بدھ نمایاں ہیں۔ آزادی کے بعد طویل عرصے تک ہندوستان پر کانگریس کی حکومت رہی۔ اور کانگریس کے سب سے مقتدر رہنما، پنڈت جواہر لعل نہرو تھے جو مرتے وقت تک وزارتِ عظمٰی کے عہدے پر فائز رہے۔

اگرچہ پنڈت نہرو، کشمیری برہمن تھے لیکن ظاہری طور پر اُنہیں ہندوستان میں سوشلزم کا بہت بڑا حامی سمجھا جاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وزیراعظم ہندوستان نے اپنے ملک کو سیکولر (لامذہب) ریاست قرار دیا تھا۔ پنڈت نہرو ہی کے زمانے میں محکمہ اوقاف قائم ہوا۔ اور اسی قانون کے تحت تمام مسلمان بزرگانِ دین کے مزاراتِ مبارکہ کو محکمہ اوقاف میں شامل کر دیا گیا۔ صدیوں پرانے نظام میں اس تبدیلی کے کئی مقاصد تھے۔ پہلا یہ کہ حکومت ہندوستان، اوقاف کے تحت اپنا پسندیدہ نمائندہ مزارات کی نگرانی کے لئے مقرر کر سکے۔ اس نمائندے کی ایک ہی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ مزارات کے سجادہ نشینوں کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھ سکے۔ ان سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے بھی کچھ اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان بھارت کی دوسری بڑی اقلیت ہیں اور بعض علاقوں میں ان کے ووٹ فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ عام مسلمان، بزرگانِ دین سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں اور یہ عقیدت اُنہیں سجادہ نشینوں تک لے جاتی ہے۔ سجادہ نشین اپنی مجبوری یا مصلحت کے تحت مسلمانوں کے قتل پر خاموش رہتے ہیں یا اُنہیں جبراً خاموش کر دیا جاتا ہے۔

گزشتہ پچاس سال سے ہندوستانی مسلمانوں کو یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ صرف کانگریس ہی ایک سیکولر جماعت ہے جو مسلمانوں کے جان و مال اور حقوق کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ تمام سیاسی جماعتیں فرقہ پرست ہیں۔ اور وہ مسلمانوں کے وجود تک کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کی سب سے بڑی فرقہ پرست جماعت ''ہندو مہا سبھا'' تھی۔ اس جماعت کا ایک ہی منشور تھا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے۔ مسلمان، عرب سے آئے ہیں اور وہ ڈاکو ہیں۔ اُنہوں نے شمشیر کے زور پر بھارت ماتا کے سپوتوں کا خون بہایا ہے۔ اور اس پاک دھرتی پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان اُنہی ڈاکوؤں کی اولاد ہیں۔ اس لئے ان کے گھروں کو آگ لگا دو اور اُنہیں جبراً ہندوستان کی سرحد سے نکال دو۔ اور اگر یہ جانے پر آمادہ نہ ہوں تو اُنہیں بے دریغ قتل کر دو۔ اگر یہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں تو اُنہیں ''شدھی'' کر دو۔ ''شدھی'' ایک خاص تحریک ہے۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جو ہندو اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گئے ہیں، اُنہیں جبراً دوسرے مذہب میں داخل کرو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ان کے ساتھ وہی سلوک کرو جو گئو ماتا (گائے) کے ساتھ کرتے ہیں۔ یعنی مسلمان، گائے کو ذبح کرتے ہیں اور بہت شوق و رغبت سے اس کا گوشت کھاتے ہیں۔

1947ء کے بعد ہندوستان میں پہلا الیکشن غالباً 1952ء میں ہوا۔ اس انتخاب میں ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ''ہندو مہا سبھا'' کو بدترین شکست ہوئی۔ آخر اس پارٹی کے رہنماؤں نے نیا چولا بدلا۔ اور ''جن سنگھ'' کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی۔ ''جن سنگھ'' کا مفہوم ہے ''لوگوں کی جماعت'' دوسرے معنوں میں اسے عوامی جماعت بھی کہا جا سکتا ہے۔ بظاہر ''مہا سبھا'' کا نام بدل گیا تھا لیکن اس کی روح ''جن سنگھ'' میں حلول کر گئی تھی۔ واضح رہے کہ ہندوستان کے سابق وزیراعظم، اٹل بہاری واجپائی ایک زمانے میں ''جن سنگھ'' کے بڑے سرگرم اور پُرجوش رہنما تھے۔ جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ اٹل بہاری واجپائی، ہندی زبان کے ایک شاعر بھی

ہیں۔ وہ ''جن سنگھ'' کے سیاسی جلسوں میں ہندوؤں کا خون گرمانے کے لئے بہت جوشیلی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ مگر ان تمام باتوں سے ''جن سنگھ'' کی مقبولیت میں برائے نام بھی اضافہ نہیں ہو سکا۔ بالآخر اس جماعت کے رہنماؤں نے ایک اور چولا بدلا اور مرار جی ڈیسائی کے سیاسی اتحاد میں شامل ہو گئی۔ مختصراً 1977ء کے عام انتخابات میں اس نئے سیاسی اتحاد نے مسز اندرا گاندھی جیسی طاقتور حکمران اور اُن کی جماعت کانگریس کو شکست دی۔ واضح رہے کہ مسز اندرا گاندھی ایک عام سیاست دان خاتون تھیں۔ اگر چہ وہ ایک سوشلسٹ نظریات رکھنے والے باپ، پنڈت جواہر لعل نہرو کی صاحبزادی تھیں، لیکن ان کی روح کے اندر ایک کٹر برہمن اُس وقت تک زندہ رہا، جب تک مسز اندرا گاندھی کے سکھ گارڈ نے ان کے پیٹ میں 32 گولیاں نہیں اُتار دیں۔ اور وہ برہمن، جسے وہ اپنی آتما (روح) میں چھپائے پھرتی تھیں، اُن کی چتا کے ساتھ بظاہر جل کر راکھ ہو گیا۔ مگر حقیقتاً اُس کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔

وہی برہمن آج بھی بے شمار شکلوں میں زندہ ہے۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی، مرار جی ڈیسائی کی حکومت میں وزیر خارجہ کے اہم ترین عہدے پر فائز رہے مگر یہ بادشاہی صرف ڈھائی سال کی تھی۔ کیونکہ مرار جی ڈیسائی کی اتحادی حکومت ناکام ہو چکی تھی۔ اس لئے درمیانی مدت کے انتخابات کرائے گئے۔ مسز اندرا گاندھی ایک بار پھر کامیاب ہوئیں۔ اس کامیابی کے بعد مسز اندرا گاندھی نے دوسرا کارنامہ انجام دیا کہ سکھوں کے مقدس مقام، گولڈن ٹیمپل میں فوجی دستے داخل کر دیئے اور کانگریسیوں کے بقول اندرا دیوی نے ''خالصتان تحریک'' کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

یہی اندرا دیوی 1971ء میں بھی ایک یادگار کارنامہ انجام دے چکی تھی۔ یعنی پاکستان کا ایک بازو کاٹ کر اُسے بنگلہ دیش بنا دیا تھا۔ ''سقوطِ ڈھاکہ'' کے موقع پر مسز اندرا گاندھی نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آج دو قومی نظریہ ختم ہو گیا۔''

مسز اندرا گاندھی کے اس بیان کے بعد کانگریس پارٹی کے اہم عہدے داروں نے ہندوستان کے تمام بڑے اخبارات میں یہ بیانات شائع کروائے۔ ''اندرا دیوی، ہندوستان کی عظیم ترین رہنما ہیں۔ جو کام پنڈت جواہر لعل نہرو نہ کر سکے، اسے ان کی بیٹی نے ممکن کر دکھایا۔'' یہ بیانات اسی فوجی یلغار کی طرف کھلا اشارہ تھے، جو 1971ء میں مشرقی پاکستان پر کی گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں سلطنتِ خداداد دو ٹکڑے ہو گئی تھی۔

فارسی زبان کا مشہور محاورہ ہے۔ ''اگر پسر نتواند پدر تمام کند۔'' (اگر کسی کام کو باپ انجام نہ دے سکے تو لائق بیٹا اسے تکمیل تک پہنچا دیتا ہے)

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کانگریس پارٹی کے کارکنوں نے اس فارسی محاورے کو یوں بدل دیا۔ ''جو کام باپ سے نہیں ہو سکتا، اُسے بیٹی انجام دے سکتی ہے۔''

اگر چہ بات موضوع سے ذرا ہٹ گئی۔ لیکن یہ وضاحت بھی ضروری تھی کہ ہندوستان میں محکمہ اوقاف کن اغراض و مقاصد کے تحت قائم کیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں مسز اندرا گاندھی کے حوالے سے بھی ایک واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

1977ء کے عام انتخابات قریب تھے۔ الیکشن سے چند ماہ پہلے صوبہ راجستھان میں شدید بارشیں ہوئیں جس کے باعث اجمیر شریف کے نواحی علاقوں کو نقصان پہنچا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزارِ مبارک کا احاطہ بھی لپیٹ میں آ گیا۔ وزیر اعظم ہندوستان، مسز اندرا گاندھی نے احاطے کی مرمت کے لئے فوری طور پر خصوصی

گرانٹ کا اعلان کیا۔ وقت زیادہ گزرنے کے باعث مجھے اس خصوصی گرانٹ کی رقم تو یاد نہیں رہی لیکن وہ مخصوص پوسٹر آج بھی میرے ذہن میں اپنے پورے خدوخال کے ساتھ محفوظ ہے۔ میں اُن دنوں اپنے عزیزوں سے ملنے ریاست ''رام پور'' گیا ہوا تھا۔ کانگریس کی انتخابی مہم عروج پر تھی۔ اور شہر کے تمام علاقوں کے در و دیوار پر چار رنگوں میں چھپا ہوا ایک خوب صورت پوسٹر چسپاں تھا۔ اس پوسٹر میں نمایاں بات یہ تھی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مزارِ مبارک نیچے تھا اور اوپر مسز اِندرا گاندھی کی تصویر تھی۔ اور تصویر کے ساتھ یہ عبارت درج تھی:

''حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے مزارِ مبارک کے لئے وزیراعظم ہندوستان کا عطیۂ خاص۔''

مجھے خوب یاد ہے کہ اس پوسٹر کو دیکھ کر ایک مردِ ہوش مند نے کہا تھا۔ ''جو عورت، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدموں میں بیٹھنے کے لائق تھی، اُس کی تصویر مزارِ خواجہؒ کے اوپر چھاپی گئی۔ اب اندرا گاندھی کے زوال کو کوئی نہیں روک سکتا۔ آنے والا وقت اسے ایسی پستیوں میں اُتار کر چھوڑے گا کہ لوگ عبرت حاصل کریں گے۔ اگر یہی تصویر مزار مبارک کے نیچے شائع کی جاتی تو عجب نہیں کہ اُسے نیا عروج حاصل ہو جاتا۔''

میں نے اس مردِ ہوش مند کے الفاظ کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ لیکن وہاں موجود دوسرے لوگوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ یہ کہہ کر اُس کا مذاق ہی اُڑایا۔ ''میاں! کیسی باتیں کرتے ہو؟ اندرا گاندھی کو شکست دینے والا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ وہ ہندوستان کی جان ہے۔ اس الیکشن میں ریکارڈ ساز کامیابی حاصل کرے گی۔''

آخر الیکشن ہوا۔ اور جب ریڈیو پر انتخابی نتائج کا اعلان کیا گیا تو سننے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ مسز اندرا گاندھی کو، جو سقوطِ ڈھاکہ کے بعد اندرا دیوی بن چکی تھی، بریلی کے غیر معروف سیاسی لیڈر، راج نارائن نے پچپن ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ اسی مسز اندرا گاندھی کا چھوٹا بیٹا، سنجے گاندھی ہیلی کاپٹر کے ایک حادثے میں اس طرح مارا گیا کہ اُس کی لاش بری طرح مسخ ہو گئی تھی۔ آخری رسوم کے وقت سنجے گاندھی کا چہرہ بھی نہیں دکھایا گیا۔ اس لئے کہ مرنے کے بعد وہ چہرہ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

سنجے گاندھی کی موت کے بعد بعض اخبارات میں ایسی خبریں بھی شائع ہوئیں کہ ہیلی کاپٹر کا وہ حادثہ دراصل حادثہ نہیں تھا بلکہ خود مسز اندرا گاندھی نے اپنے چھوٹے بیٹے کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی، جسے ایک اتفاقی حادثے کا نام دے دیا گیا۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ سنجے گاندھی ایک خودسر اور مغرور جوان تھا۔ کانگریس اور ہندوستان کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا تھا۔ وہ ماں کو سیاسی پیش منظر سے ہٹا کر خود بھارت کا پردھان منتری (وزیراعظم) بننا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ سنجے گاندھی اپنے منصوبے میں کامیاب ہوتا، ماں نے خود ہی بیٹے کو کھا لیا۔ اس موقع پر اپوزیشن کے اخبارات نے مسز اندرا گاندھی کے نام کے ساتھ بڑی عجیب سرخیاں لگائیں۔ مثال کے طور پر۔ ''خون آشام دیوی''...... ''ڈائن سیاست دان'' وغیرہ وغیرہ۔

پھر یہ دیوی اپنے ہی خون میں نہا گئی۔ ماں کی لاش پر بڑے بیٹے، راجیو گاندھی نے اپنی سیاست کا محل تعمیر کیا۔ اُس کے دورِ سیاست میں کانگریس پارٹی نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں جو ہندوستانی جمہوریت کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ پھر سری لنکا کے دورے میں ایک عورت نے خودکش حملے میں راجیو گاندھی کو بم سے اُڑا دیا۔ بڑی عجیب اور عبرت ناک مثال ہے کہ سنجے گاندھی کی طرح آخری دیدار کے طور پر راجیو گاندھی کا بھی چہرہ نہیں دکھایا گیا۔ اس لئے کہ بم پھٹنے سے راجیو کے چہرے کے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ تینوں ماں بیٹے اپنے بستروں پر سکون کی موت نہ مر سکے۔ بلکہ سیاست کی طویل تاریخ میں خوف و دہشت اور عبرت کی علامت بن کر رہ گئے۔ اور اُس مردِ ہوش مند کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی، جس نے پوسٹر دیکھ کر کہا تھا۔

"جو عورت، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے قدموں میں بیٹھنے کے لائق تھی، اُس کی تصویر مزارِ مبارک کے اوپر نظر آ رہی ہے۔ وقت اسے بہت جلد ایسی پستیوں میں اُتار دے گا کہ لوگ عبرت حاصل کریں گے۔"

اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ پوسٹر محکمہ اوقاف کے کس کارندے نے شائع کرایا تھا مگر یہ امر طے شدہ ہے کہ اکثر مزارات کے سجادہ نشین، حکومت وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حکمرانوں کے حق میں بیانات جاری کرتے رہتے ہیں۔ آئے دن ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مسلم کش فسادات ہوتے رہتے ہیں مگر کسی مزار کا کوئی مجاور اپنے ہم مذہبوں کے قتل عام پر احتجاج نہیں کرتا۔ گجرات میں بھی بڑے بڑے صوفیائے کرام کے مزارات ہیں۔ اور قارئین جانتے ہیں کہ یہ علاقہ ابھی تک بدترین فسادات کی لپیٹ میں ہے۔ مگر بزرگانِ دین کی قبروں کے نگرانوں میں سے کسی نے بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت سے یہ سوال نہیں کیا کہ خونِ مسلم کی ارزانی کیوں ہے؟

ہم جانتے ہیں کہ مزارات کے مجاورین کی آواز اس ہنگامۂ شور وشر میں مؤثر ثابت نہیں ہوسکتی۔ مگر ان سجادہ نشینوں کو یہ بھی زیب نہیں دیتا کہ وہ بدکار اور قاتل حکمرانوں کی دستار بندی کریں اور انہیں تبرکات پیش کریں۔ ماضی میں تو ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں کہ وہ سیاسی رہنما، جن کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے، مگر جب وہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ یا حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزارات پر حاضر ہوتے تھے تو یہاں کے مجاورین اُن کا پُرجوش استقبال کرتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے اُن کے سروں پر پگڑیاں باندھتے تھے اور کاندھوں پر چادریں ڈالتے تھے۔ کئی سال پہلے ہندوستان کا ایٹمی سائنس دان، عبدالکلام صدارتی انتخاب لڑنے سے پہلے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوا تھا۔ حسبِ سابق عبدالکلام کی بھی پذیرائی کی گئی اور اُس کی بھی دستار بندی ہوئی۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے مزارِ مبارک کے سجادہ نشین کے ساتھ بہت سی تصویریں کھینچی گئیں اور اُنہیں نمایاں طور پر اخبارات میں شائع کروایا گیا۔

ان تمام حوالوں اور مثالوں کو پیش کرنے سے ہمارا ایک ہی مقصد تھا کہ ہندوستان کے تمام مزارات، محکمہ اوقاف کے زیر انتظام ہیں۔ مگر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت شیخ شاہیؒ اور آپؒ کے بھائی، حضرت سیّد بدرالدینؒ کے مزارات، محکمہ اوقاف میں شامل نہیں۔ اس واقعے کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے ہم عرض کرتے چلیں کہ بزرگانِ دین کے مزارات کو محکمہ اوقاف میں شامل کرنے کے سیاسی مقاصد تھے۔ وہاں مزارات سے حاصل ہونے والی آمدنی کو بھی حکومتی کنٹرول میں رکھنا تھا۔ یہ آمدنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے آنے والے عقیدت مند مسلمان، بزرگوں کے مزارات پر حاضر ہوتے ہیں اور اپنی حیثیت کے مطابق سجادہ نشینوں کی خدمت میں نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض نذریں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کروڑ پتی شخص کا لاعلاج بیٹا، بزرگانِ دین کی دعاؤں سے شفایاب ہوا تو وہ مالدار باپ لاکھوں روپے کی صورت میں اپنی نذر، مجاوروں کو پیش کرتا ہے۔ اسی نذر و نیاز کو مزارات کی آمدنی کہا جاتا ہے۔ محکمہ اوقاف کے نمائندے باقاعدہ اس آمدنی کو آڈٹ کرتے ہیں۔ خود بھی رشوت لیتے ہیں اور حکومت ہندوستان کو بھی انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اور ایسی آمدنی سے سجادہ نشینوں کے خاندان کا بھی گزارہ ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ جن خانقاہوں سے تاریخ ساز درویش پیدا ہوتے تھے اور اپنی روحانی طاقت سے بے راہ معاشرے میں ایک انقلاب برپا کر دیتے تھے، اب وہی خانقاہیں روٹی پیدا کرنے کی فیکٹریاں بن کر رہ گئی ہیں۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلمان کا جامۂ احرام

الغرض محکمہ اوقاف کے قائم ہوتے ہی حکومت ہندوستان نے اپنے پسندیدہ افراد پر مشتمل ایک سروے بورڈ قائم کیا۔ جس کی بنیادی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ خفیہ طور پر مسلمان بزرگانِ دین کے تمام مزارات کا سروے کرے۔ اور پھر اپنی رپورٹ میں بتائے کہ فلاں مزار سے اُس کے سجادہ نشینوں کو ماہانہ کتنی آمدنی حاصل ہوتی ہے اور اس بزرگ کا حلقۂ عقیدت کتنا وسیع ہے۔

اس قانون کے تحت محکمہ اوقاف کے اسی بورڈ کا ایک نمائندہ، سروے کے لئے بدایوں میں بھی پہنچنے والا تھا۔ حضرت حسن شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک کے منتظمین کو یہ خبر ملی تو تمام متعلقہ افراد بدحواس ہو گئے کہ اُنہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ کچھ ایسی خبریں بھی گردش کر رہی تھیں کہ مزارات کی ساری آمدنی محکمہ اوقاف کے خزانے میں جمع ہو جائے گی۔ اور مزار کے مجاورین کو گزارے کے لئے ایک محدود رقم دی جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں مزار کے سجادہ نشینوں کی حیثیت بھی حکومت کے ملازموں جیسی ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت حسن شیخ شاہیؒ اور حضرت سیّد بدرالدینؒ (چھوٹے سرکار) کے مجاورین وحشت زدہ ہو گئے تھے۔ رات گئے تک تمام افراد مل کر آپس میں مشورے کرتے رہے۔ مگر اُنہیں نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر طے پایا کہ اس مشکل ترین مسئلے کو حضرت حسن شیخ شاہیؒ (بڑے سرکار) کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

پھر نصف شب کے سناٹے میں اہلِ محلّہ نے دیکھا کہ دونوں مزارات کے سجادہ نشین اور تمام اہلِ خاندان اپنے اپنے گھروں سے نکل کر حضرت حسن شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک کی طرف جا رہے تھے۔ ان لوگوں میں خاندان کے بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔

پھر سننے والوں نے گریہ وزاری کی آوازیں سنیں۔ مزاراتِ مبارکہ کے سجادہ نشین رو رو کر فریاد کر رہے تھے۔ ''بھارت سرکار ہمیں اپنا غلام اور پابند بنانا چاہتی ہے۔ مگر ہم اس پابندی اور غلامی کو قبول نہیں کرنا چاہتے۔ اگر ہماری قسمت میں یہ غلامی لکھ دی گئی ہے تو آپ حق تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے اور ہم اپنے گھروں میں سوتے کے سوتے رہ جائیں۔''

مجاورین اور اہلِ خاندان کی یہ گریہ وزاری اذانِ فجر تک جاری رہی۔ پھر تمام لوگ نمازِ فجر ادا کر کے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے اور محکمہ اوقاف کے اُس نمائندے کا انتظار کرنے لگے، جو مزارات کے سروے کے لئے بدایوں آنے والا تھا۔

سروے بورڈ کا نمائندہ اپنے پروگرام کے مطابق بدایوں آیا اور سرکاری کار میں بیٹھ کر مزارات کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ مطمئن تھا۔ مگر بدبختی سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ پھر جب سرکاری نمائندے کی کار، بدایوں کے مزار میں پہنچی تو سامنے سے آتا ہوا ایک ٹرک جو لوہے کے بھاری سامان سے لدا ہوا تھا، کار سے ٹکرا گیا۔ اور سروے بورڈ کے نمائندے کے ساتھ اُس کا ڈرائیور بھی ہلاک ہو گیا۔

کچھ دن بعد بورڈ کی طرف سے دوسرا نمائندہ بھیجا گیا۔ مگر اُس کا بھی یہی حشر ہوا۔ وہ بھی اپنی کار میں بدایوں کی طرف آ رہا تھا کہ اُسے بھی ایک بھاری ٹرک نے کچل ڈالا۔ یہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ بورڈ کے نمائندے اور ڈرائیور کی لاشیں، ٹرک کاٹ کر نکالی گئیں۔ لاشیں اس قدر مسخ ہو چکی تھیں کہ اُنہیں پہچاننا بھی دُشوار تھا۔ پھر سروے بورڈ کی طرف بھیجے جانے والے تیسرے، چوتھے اور پانچویں نمائندے کے ساتھ بھی اسی قسم کے حادثے

پیش آئے اور وہ حضرت حسن شیخ شاہیؒ کے مزارِ مبارک تک پہنچنے کے بجائے شمشان گھاٹوں اور قبرستانوں تک پہنچ گئے۔

واضح رہے کہ سروے بورڈ کے ان نمائندوں میں کچھ ہندو تھے اور کچھ مسلمان۔

پھر جب ان مسلسل حادثات کے بعد سروے بورڈ کے نئے کارندے کا انتخاب کیا گیا تو اُس نے یہ کہہ کر بدایوں جانے سے انکار کردیا۔

''میں اس کام کو انجام دینے سے قاصر ہوں کہ مجھے اپنی زندگی زیادہ عزیز ہے۔''

پھر جب اُس شخص پر یہ کہہ کر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اس ڈیپارٹمنٹ کا ملازم ہے اور اپنی سروس انجام دینے کا پابند تو اُس نے استعفیٰ پیش کردیا اور ساتھ ہی یہ خصوصی نوٹ بھی لکھ دیا۔

''ان حادثات کو محض اتفاق نہ سمجھا جائے۔حکومت کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ بدایوں کے ان دونوں مزارات سے لاتعلق ہو جائے۔''

اس رپورٹ اور استعفیٰ کے بعد یہ معاملہ سرد خانے میں چلا گیا اور محکمہ اوقاف نے پھر اپنا کوئی نمائندہ بدایوں نہیں بھیجا۔ میں 1968ء میں حضرت حسن شیخ شاہیؒ اور حضرت سیّد بدرالدینؒ کے مزاراتِ مبارکہ پر حاضر ہوا تھا۔ اُس وقت پورے ہندوستان میں یہی دو ایسے مزارات تھے، جن پر محکمہ اوقاف کی پابندی عائد نہیں ہوتی تھی۔

یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ اللہ ہی جانے کہ وہی عالم الغیب ہے۔ ہاں، جنہیں حضرت شیخ شاہیؒ کے فیضِ روحانی پر شک ہے، وہ خود بدایوں جا کر اپنی آنکھوں سے اس زندہ کرامت کو دیکھ لیں۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کا مشہور شعر ہے ؎

اولیاء را ہست قدرت ازالہ
تیر جستہ باز گرداند زراہ

(اولیاء کو اللہ کی طرف سے یہ قدرت بخشی گئی ہے کہ وہ کمان سے چھوڑے ہوئے تیر کو موڑ کر واپس لا سکتے ہیں)

❀❀❀

حضرت صدرالدین عارفؒ

اب ہم سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم بزرگ، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا ذکر کریں گے۔ ہم گزشتہ اوراق میں حضرت شہاب الدین عمر سہروردیؒ کا مختصر تعارف پیش کر چکے ہیں۔ آپؒ کا میلانِ طبع فلسفے کی طرف تھا۔ اس لئے حلب کے فقہاء نے حضرت شیخ کے خلاف قتل کا فتویٰ دیا۔ اور آپؒ، سلطان صلاح الدین ایوبی کے دور میں اس کے بیٹے سلطان الملک الظاہر کے حکم سے قتل کئے گئے۔ آپؒ کے دو نامور خلفاء حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ تھے۔ ان ہی دونوں بزرگوں کے فیض روحانی سے برصغیر پاک و ہند میں سلسلۂ سہروردیہ کو فروغ حاصل ہوا۔ خصوصاً حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی کوششیں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔

سلسلۂ چشتیہ کے پیروکار، حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے اس طرزِ عمل پر شدید اعتراض کرتے ہیں کہ آپؒ نے بادشاہانِ وقت سے مراسم رکھے اور بہت خوش حال زندگی بسر کی۔ اس کے برعکس سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں نے سلاطین اور شہنشاہوں کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس سلسلے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا یہ واقعہ شہرتِ عام رکھتا ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی جیسے باجبروت حکمران نے بارہا حضرت محبوب الٰہیؒ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مگر آپؒ نے ہر بار یہی فرمایا۔

''سلطان اپنے قصرِ ہزار ستون میں خوش رہیں...... اور اس فقیر کو اس کی جھونپڑی میں سکون سے رہنے دیں۔''

(واضح رہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی نے ایسا شاندار محل تعمیر کیا تھا، جس کے ایک ہزار ستون تھے)

مگر جب فرمانروائے ہندوستان نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ خود ملاقات کے لئے حاضر ہو جائے گا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے انتہائی سخت لہجے میں سرکاری کارندے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''سلطان سے جا کر کہہ دو کہ اس فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ اگر والیٔ ہندوستان ایک دروازے سے داخل ہوگا تو فقیر دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے گا۔ اور اگر مجھے زیادہ تنگ کیا گیا تو میں ہندوستان کی حدود ہی سے نکل جاؤں گا کہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔''

اسی طرح سلطان غیاث الدین تغلق نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شانِ بے نیازی دیکھ کر حکم دیا تھا۔ ''میں ایک جنگی مہم کے سلسلے میں لکھنوتی جا رہا ہوں..... میری واپسی تک تجھے لازم ہے کہ دہلی چھوڑ کر کسی دوسری جگہ گوشہ نشینی اختیار کر لے۔ اگر تُو نے میرے حکم پر عمل نہیں کیا تو میں تجھے ایسی عبرت ناک سزا دوں گا کہ آنے والے زمانے اسے یاد رکھیں گے۔''

حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے سلطان غیاث الدین تغلق کا حکم نامہ پڑھا۔ اور پلٹ کر اُس کی پشت پر یہ عبارت تحریر کر دی۔ ''ہنوز دِلّی دُور است۔'' (ابھی دِلّی دُور ہے)

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفۂ اکبر، حضرت شاہ نصیر الدین چراغِ دہلیؒ کا بھی یہی طرزِ عمل رہا۔ آپؒ نے سلطان محمد تغلق کے دربار میں حاضر ہونا گوارا نہیں کیا..... جس کے نتیجے میں حضرت چراغِ دہلیؒ کو شدید اذیتیں اور مصائب برداشت کرنا پڑے۔

حضرت سیّد نصیر الدین چراغِ دہلیؒ کے خلیفۂ اکبر، حضرت خواجہ گیسو درازؒ نے بھی سلاطینِ وقت سے کوئی رسم و

راہ نہیں رکھی۔ دکن کے حکمران فیروز شاہ بہمنی کا واقعہ تاریخ کے اوراق میں اب بھی محفوظ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں نے سلاطینِ زمانہ اور امرائے وقت کی محفلوں سے دُوری اختیار کی۔ کبھی اُن کا کوئی ہدیہ یا تحفہ قبول نہیں کیا۔ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی۔ اور کسی حکومتی تعاون کے بغیر اپنے روحانی مشن کو تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے برعکس حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریاؒ نے بادشاہانِ وقت سے مراسم بھی رکھے اور وقتاً فوقتاً ان کے دیئے ہوئے تحائف بھی قبول کئے۔ معتبر روایات کے مطابق جب حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کا انتقال ہوا تو آپؒ نے میراث میں بہت بڑی جائیداد اور نقد رقم چھوڑی۔ آپؒ کے سات فرزند تھے۔ جب ترکہ تقسیم ہوا تو ہر صاحبزادے کے حصے میں زمینوں کے علاوہ سات لاکھ تنکے (روپے) آئے۔ یہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے 758 سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قارئین اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس زمانے میں سات لاکھ روپے کی کیا حیثیت ہوگی؟

اس واقعہ کو بنیاد بنا کر سلسلۂ چشتیہ کے ماننے والے، حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی امارت پر اعتراض کرتے ہیں اور بڑی دریدہ دہنی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ "درویشی اور دولت" میں کوئی مناسبت نہیں۔ بلاشبہ بہت سے درویشوں نے غربت و افلاس کی زندگی بسر کی ہے...... مگر اس دلیل کے سہارے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ جو درویش آسودہ حال زندگی بسر کرتے ہیں، اُن کی روحانیت ختم ہوجاتی ہے یا وہ درویشی کے حلقے سے خارج ہوجاتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا اپنا ایک نظام ہے...... کبھی وہ انسان کو غربت و افلاس میں مبتلا کرکے آزماتا ہے۔ اور کبھی کثرتِ مال کے ذریعے امتحان لیتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ اللہ کے ایک برگزیدہ نبی حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے رب کی بارگاہِ کرم میں اس طرح درخواست پیش کی تھی۔

"اے میرے پروردگار! مجھے ایسی حکومت عطا کر، جو میرے بعد کسی کو نہ دی جائے۔"

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اس دعا کو قبولیت کا شرف بخشا گیا۔ قرآن کریم اور دیگر آسمانی کتابیں گواہ ہیں کہ حضرت سلیمانؑ کو ایسا اقتدار عطا کیا گیا جس کی کوئی دوسری مثال پوری تاریخ آدم میں نہیں ملتی۔ تمام جن و انسان آپؑ کے تابع تھے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے ہواؤں تک کو مسخر کردیا تھا۔

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کے حبیب ختم المرسلین، رحمتہ اللعالمین، سرکارِ دو عالم ﷺ نے نہایت مشقت و اذیت اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی۔ اور جب بھی اپنے پروردگار سے دعا مانگی، یہی دعا مانگی۔

"اے میرے پالنے والے! مجھے مسکین رکھ...... اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرما۔"

اللہ تعالیٰ نے ظاہری طور پر حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو عظیم الشان سلطنت عطا فرمائی تھی، وہ اپنے وقت مقررہ کے بعد ختم ہوگئی۔ مگر آپؑ کے منصبِ نبوت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی ایک ارب سے زیادہ مسلمان اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہیں تو کھلے الفاظ میں یہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ ہم تمام آسمانی کتابوں اور اللہ تعالیٰ کے تمام انبیائے کرام علیہم السلام پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اور ان انبیائے پاک میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔

اس کے برعکس پیغمبرِ اسلام، حضور اکرم ﷺ کو فقر و قناعت کی زندگی عطا کی گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جب ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کرا رہے تھے تو بڑے بڑے بھاری پتھر اُٹھانے کا کام جنات کی ایک جماعت کے سپرد کیا گیا تھا۔ مگر جب مسجد نبوی کی تعمیر کا وقت آتا ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خود بھی پتھر ڈھوتے تھے۔ پھر قدرت کے آفاقی اصول کے تحت حضور اکرم ﷺ کی یہ مادی

زندگی بھی ختم ہو گئی جو مزدوری اور جفاکشی سے بھری ہوئی تھی۔ مگر آپؒ کو جو عظیم الشان سلطنت عطا کی گئی، اس کا کسی مذہبی حکومت سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

اس مختصر سی بحث اور پیش کردہ چند مثالوں کا ایک ہی مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نظامِ تقسیم، انسانی عقل وفہم سے بالاتر ہے۔ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کو فقیری کے ساتھ تونگری، معرفتِ روحانی کے ساتھ دنیا کی سروسامانی بھی عطا کی گئی تھی۔

اس حوالے سے ایک معتبر روایت بھی موجود ہے جو اس تمام گفتگو کے سلسلے میں ایک مضبوط دلیل پیش کرتی ہے۔

ایک دن پیر و مرشد حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ نے حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کو خلوت میں طلب کیا۔ جب آپؒ پیر و مرشد کے حجرۂ مبارک میں داخل ہوئے تو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے دستِ مبارک میں ایک کٹا ہوا انار تھا۔ حضرت شیخ نے وہ انار اپنے خلیفۂ اکبر کی طرف بڑھایا۔

حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے بڑی عقیدت کے ساتھ پیر و مرشد کا بخشا ہوا تبرک لے لیا۔ اتفاق سے انار کا ایک دانہ زمین پر گر پڑا۔ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ نے فوراً ہی جھک کر وہ دانہ زمین سے اُٹھا لیا اور پھر اسے اپنے منہ میں رکھ لیا۔

شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اپنے مرید کے اس عمل کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ انار کا وہ دانہ کھا چکے تو پیر و مرشد نے آپؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''بہاؤالدین! تم نے زمین پر پڑی ہوئی چیز کو کیوں کھا لیا؟''

''حضرت شیخ کا عطیۂ خاص تھا۔ یہ خادم اسے کس طرح رائیگاں جانے دیتا؟'' حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے نہایت والہانہ انداز میں عرض کیا۔

''وہ انار کا دانہ دراصل دنیا تھی۔'' حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے خلیفۂ اکبر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں چاہتا تھا کہ تم دنیا کے جھمیلوں اور بکھیڑوں میں نہ پڑو۔ اس لئے میں نے جان بوجھ کر انار کا وہ دانہ زمین پر گرا دیا تھا۔ مگر تم نے اسے متبرک سمجھ کر کھا لیا۔''

پیر و مرشد کا ارشادِ گرامی سن کر حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کا رنگ متغیر ہو گیا اور چہرۂ مبارک سے ذہنی کشمکش کے آثار نظر آنے لگے جیسے آپؒ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

اپنے مرید کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ مسکراتے ہوئے فرمانے لگے۔ ''بہاؤالدین! پریشان نہ ہو۔ انشاء اللہ یہ دنیا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ اب دین بھی تمہارے قبضے میں ہے اور دنیا بھی۔''

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے ان فرمودات کی روشنی میں اہلِ نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریاؒ کی دولت کی فراوانی آپؒ کے ذاتی عیش وعشرت کے لئے نہیں تھی۔ اس حقیقت پر بے شمار واقعات گواہ ہیں کہ حضرت مخدومؒ کا مال وزر ہمیشہ غریبوں، محتاجوں اور دینی خدمت کے کاموں میں استعمال ہوا۔

اب رہا یہ سوال کہ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ اور آپؒ کے صاحبزادوں نے شاہانِ وقت سے قریبی مراسم کیوں رکھے؟ اس سلسلے میں سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ حکمرانوں سے دور ہو جاتے تو اصلاح وہدایت کی تحریک بھی کمزور پڑ جاتی۔ کسی بگڑے ہوئے انسان کو قریب رہ کر ہی نیکی کی تلقین کی جا سکتی ہے...... اور اگر اُسے اس کے حال پر تنہا چھوڑ دیا جائے تو وہ مزید بگڑتا ہی چلا جائے گا۔ سلسلۂ سہروردیہ کے

بزرگوں کی طرف سے اپنے طرزِ عمل کا یہی جواز پیش کیا جاتا تھا۔

اس کے برعکس سلسلۂ چشتیہ کے ہم نوا یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب کسی امیر یا بادشاہ کی طرف سے نذریں یا تحائف قبول کئے جائیں گے تو پھر کسی درویش میں اتنی اخلاقی جرأت ہی کہاں باقی رہے گی کہ وہ اس کی کج روی پر تنقید کرتے ہوئے صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرے۔ دوسرے الفاظ میں جب کوئی درویش، سلاطین اور امراء کے بخشے ہوئے تحائف کے انبار کے نیچے دب جائے گا تو پھر اپنی زبان کس طرح کھولے گا؟ شاید اسی حقیقت کے پیش نظر سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ اور جانباز صوفی، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ نے فرمایا تھا۔

''کسی درویش کے لئے سب سے زیادہ خطرناک صحبت امرائے وقت کی ہے۔''

اگر ہم حضرت بابا فریدؒ کے حوالے سے بات کریں تو ایسی بہت سی روایات تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں کہ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ اور حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے درمیان بہت گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ بالفرض اگر بہاؤالدین زکریاؒ کی روحانیت دنیا داری کی طرف مائل ہوتی تو دوستی کا یہ رشتہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہتا۔ جبکہ ہم کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ حضرت بابا فریدؒ نے کئی مواقع پر حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی رحانی عظمتوں کی تعریف کی ہے۔

اب ہم آخری مثال حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدینؒ کی پیش کرتے ہیں جو حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے ہیں۔ اور عوام میں شیخ رکن عالمؒ کے نام سے مشہور ہیں۔

آپؒ اکثر سلطان محمد تغلق کی دعوت پر دارالحکومت دہلی تشریف لاتے تھے اور مہمانِ خاص کی حیثیت سے قصرِ سلطان میں ٹھہرتے تھے۔ آپؒ کا قیام مختصر ہوتا یا طویل، حضرت شیخ رکن عالمؒ روزانہ پابندی کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوتے اور کچھ وقت حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے ساتھ گزارتے۔ اگرچہ خود سلطان محمد تغلق بھی کبھی کبھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب وہ ہندوستان کا ولی عہدِ سلطنت تھا...... مگر جب سلطان محمد تغلق ایک مطلق العنان حکمراں کی حیثیت سے تختِ ہندوستان پر بیٹھا تو اس کی عادات واطوار میں بڑی حد تک تبدیلی آ گئی...... اور وہ انتظار کرنے لگا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اُس کے سلام کے لئے دربارِ سلطانی میں حاضر ہوں۔ محمد تغلق کے خوشامدی مصاحبوں نے کئی بار حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سامنے سلطان کی اس خواہش کا اظہار کیا مگر حضرت محبوبِ الٰہیؒ ہر بار یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے۔

''یہ فقیر دن رات مالک حقیقی کے دربار میں حاضر رہتا ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہمہ وقت گریہ وزاری کرتا رہتا ہے۔ اس دربار کے آداب اتنے سخت ہیں کہ بندے کو اپنی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی...... پھر میں کسی اور کی طرف کس طرح دیکھ سکتا ہوں؟''

سلطان محمد تغلق اس بات سے تو ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گیا تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کبھی اس کے دربار میں تشریف لائیں گے۔ اس لئے وہ دوسرے علمائے ہند کو اپنے قریب رکھتا تھا۔ اور اسی مقصد کے پیش نظر حضرت شیخ رکن الدین عالمؒ کو بھی ملتان سے بلا کر مہمانِ خاص کی حیثیت سے قصرِ شاہی میں ٹھہرایا کرتا تھا۔ پھر جب حضرت شیخ رکن الدینؒ باقاعدگی کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں حاضری دیتے تو محمد تغلق کے خوشامدی مصاحب، سلطان کے کان بھرتے۔

''شیخ رکن الدینؒ، مہمان آپ کے ہیں..... مگر وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے یہاں زیادہ وقت گزرتے

ہیں۔"

والیٔ ہندوستان سلطان محمد تغلق کو حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ کی یہ روش گراں گزرتی تھی مگر وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک بار حضرت شیخ رکن عالمؒ دہلی تشریف لائے۔ اور پھر چند روزہ قیام کے بعد واپس ملتان جانے لگے تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا۔

"شیخ! کچھ دن اور اس فقیر کو اپنی زیارت کا شرف بخشیں۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ کی اس محبت آمیز گفتگو پر حضرت شیخ رکن الدین عالمؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بے اختیار فرمانے لگے۔ "شیخ! ہم تو آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر اپنی آنکھیں روشن کرتے ہیں۔"

مختصر یہ کہ حضرت شیخ رکن الدین عالمؒ اپنے ضروری کاموں کے باوجود سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہیؒ کی اس خواہش کو نہ ٹال سکے اور دہلی میں ٹھہر گئے۔ کچھ دن بعد آپؒ نے دوبارہ ملتان واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے اسی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"شیخ! ابھی دل نہیں بھرا...... کچھ دن اور۔"

یہاں تک کہ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ جب بھی ملتان واپس جانے کی بات کرتے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کسی نہ کسی بہانے سے آپؒ کو روک لیتے۔ بالآخر حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا وقت رخصت قریب آ گیا اور آپؒ نے وصال کے وقت وصیت فرمائی۔

"میری نمازِ جنازہ شیخ رکن الدین پڑھائیں گے۔"

پھر جب حضرت محبوب الٰہیؒ کو لحد میں اُتار دیا گیا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ زار و قطار روتے ہوئے جنازے کے شرکاء سے کہہ رہے تھے۔ "حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اندازِ کرم کو کون سمجھ سکتا ہے؟ مجھے ایک سال سے اس لئے روکا جا رہا تھا کہ میں حضرت شیخ کی نمازِ جنازہ پڑھا کر یہ عظیم سعادت حاصل کر سکوں۔"

ان دو تاریخی مثالوں کے بعد اہلِ نظر کو اندازہ ہو جانا چاہئے کہ سلسلۂ چشتیہ اور سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگوں میں کس قدر گہرے مراسم تھے اور ایک دوسرے کا کتنا احترام کرتے تھے۔

ہم جن شیخ صدرالدین عارفؒ کے تفصیلی حالات پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریاؒ کے فرزند تھے۔ اور حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ کے والد محترم تھے۔

حضرت شیخ صدرالدین 612ھ میں پیدا ہوئے۔ "اخبار الصالحین" کے مؤلف بھی 612ھ کو آپؒ کی تاریخ پیدائش قرار دیتے ہیں۔ سرزمین ملتان کو آپ کا مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت شیخ صدرالدینؒ نے اپنے والد محترم حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی نگرانی میں ملتان کے بڑے بڑے اساتذہ سے مروّجہ علوم حاصل کئے۔ نوعمری ہی کے زمانے سے آپؒ کی ایک خاص عادت نمایاں تھی کہ جب اللہ تعالیٰ کی آخری کتابِ مقدس کی تلاوت کرتے تو سارا دن یا ساری رات گزر جاتی۔ اس غیر معمولی غور و فکر کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ آپؒ پر قرآنِ حکیم کے نئے نئے اسرار و رموز ظاہر ہونے لگے۔ اسی وجہ سے اہلِ علم حضرات نے آپؒ کو "عارف" کے لقب سے پکارنا شروع کر دیا۔ اور پھر یہی لفظ ہمیشہ کے لئے آپؒ کے نام کا لازمی حصہ بن گیا۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اپنے والد محترم، حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی نگرانی میں سلوک کی کئی منازل طے کیں۔ آپؒ دن رات قرآن کریم کے مطالعے میں مصروف رہتے۔ پھر جب رات آتی تو کچھ

دیر آرام کرتے اور پھر نماز تہجد کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو جاتی۔ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے سات فرزند تھے اور ان سب میں بڑے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ تھے۔ باقی بیٹے بھی تحصیلِ علم میں مصروف رہتے تھے مگر ان کے ذوق و شوق میں وہ شدت نہیں تھی جو حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے کردار و عمل میں پائی جاتی تھی۔ آپؒ کے اس شغف کو دیکھ کر حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کبھی کبھی تنہائی میں اپنی شریکِ حیات سے فرمایا کرتے تھے۔

''اگر حق تعالیٰ مجھے صدرالدین جیسا بیٹا عطا نہ کرتا تو شاید میں بے نام و نشان ہو جاتا۔''

زوجہ محترمہ حیرت زدہ لہجے میں شوہر سے مخاطب ہوتیں۔ ''اللہ نے اپنی قدرت سے آپ کو چھ بیٹے اور بھی عطا کئے ہیں۔ پھر آپ بے نام و نشان ہونے کی بات کیوں کرتے ہیں؟''

''کثرتِ اولاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بچے اپنے بزرگوں کے نام پر کوئی حرف آنے نہیں دیں گے۔ حضرت نوحؑ کے بیٹے کی مثال ہمارے سامنے ہے۔'' حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے اپنی شریک حیات کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ ''بس صدرالدین ہی کے چہرے پر مجھے روحانیت کے وہ آثار نظر آتے ہیں جنہیں دیکھ کر میرے مضطرب جذبوں کو کسی قدر سکون حاصل ہو جاتا ہے۔''

اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ اپنے سب سے بڑے صاحبزادے، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کو کس قدر چاہتے تھے۔ بعض معتبر روایتوں کے مطابق حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے سلسلۂ روحانی کا سارا دارومدار ہی حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ پر تھا۔ والدین کی دعائیں اور خود شیخ صدرالدین عارفؒ کی شدید ریاضتیں آخر رنگ لائیں اور آپؒ دنیا کی رنگینی و دلکشی سے بے نیاز نظر آنے لگے۔

اب حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی عمر 35, 36 سال کے قریب تھی۔ حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ اور آپؒ کی شریکِ حیات چاہتی تھیں کہ شیخ صدرالدین عارفؒ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ پھر جب اس سلسلے میں والدہ محترمہ نے اپنے فرزندِ اکبر سے گفتگو کی تو شیخ صدرالدین عارفؒ نے عرض کیا۔

''میں دنیا کے ان بکھیڑوں میں اُلجھنا نہیں چاہتا۔''

''بیٹے! یہ دنیا کے بکھیڑے نہیں، قدرت کے اصول ہیں جنہیں توڑا نہیں جا سکتا۔'' والدہ محترمہ نے شیخ صدرالدین عارفؒ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اور یہی اصول شریعت و سنت کا حصہ ہیں۔''

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ والدہ محترمہ سے بحث کرنے کے بجائے ان کے احترام میں خاموش ہو گئے۔ مگر یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ آپؒ شادی کر کے دنیا داری میں اُلجھنا نہیں چاہتے تھے۔

پھر جب حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ تک یہ خبر پہنچی تو آپؒ نے اپنے فرزندِ اکبر کو تنہائی میں طلب کیا۔ اس وقت آپؒ کی والدہ ماجدہ بھی موجود تھیں۔

''شادی، انسانی زندگی کی تکمیل ہے۔'' حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہی شریعتِ الٰہی ہے اور یہی سنتِ رسول ﷺ ہے۔''

''میں اس حقیقت سے باخبر ہوں۔'' حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے سر جھکائے ہوئے عرض کیا۔

''پھر شادی سے انکار کیوں کر رہے ہو؟'' حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے سوال کیا۔

''مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں شادی کے بعد میری توجہ تقسیم نہ ہو جائے۔'' حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے جواباً عرض کیا۔

''مردانِ ہمت، طوفانی لہروں سے نہیں ڈرتے۔'' حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔ ''موجیں کتنی ہی بلاخیز ہوں، مگر مالکِ بحروبر، اہلِ یقین کو ساحل تک پہنچا ہی دیتا ہے۔''

''میں بفضلِ خدا، اہلِ یقین میں سے ہوں۔'' حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے پُرعزم لہجے میں عرض کیا۔

''پھر کس لئے شادی سے گریزاں ہو؟'' حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریاؒ نے پوچھا۔ ''والدین، بیوی اور بچوں کے حقوق ادا کرنا بھی عبادت میں شامل ہے۔''

والدِ محترم کی بات سن کر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کچھ دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے، پھر آپؒ نے بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا۔ ''سیّدی! دراصل بات یہ ہے کہ شادی کے لئے مرد و زن کے مزاج کی ہم آہنگی بہت ضروری ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس گھر میں آنے والی خاتون کا فطری رجحان کیا ہوگا؟ اگر وہ دین دار خاتون نہ ہوئیں تو پھر میری زندگی کیسے گزرے گی؟''

واقعتاً یہ ایک نازک ترین مسئلہ تھا۔ جس کا حل کسی انسان کے پاس نہیں تھا۔ تاہم حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے اپنے فرزند کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ہم اہلِ ایمان ہیں...... اور ایک مسلمان کا عقیدہ ہے کہ مقدرات کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ انسان بس ارادہ کرسکتا ہے...... تکمیل اس کے اختیار میں نہیں۔ پھر بھی ایک بندے کو اپنے خالق سے ہر حال میں حُسنِ ظن رکھنا چاہئے۔''

بالآخر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اپنی رضامندی ظاہر کردی۔ اور والدین آپؒ کے لئے کسی موزوں لڑکی کی تلاش کرنے لگے۔ ملتان میں ایسے کئی معزز گھرانے تھے جو حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے خاندان سے رشتہ جوڑنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مگر ان گھرانوں کا ماحول خالص جاگیردارانہ تھا۔ ایسی فضا میں تربیت پانے والی لڑکیاں، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ جیسے عالم و فاضل جوان کی ہم سفر کس طرح ہوسکتی تھیں؟ اس لئے حضرت مخدوم بہاؤالدین کریا ملتانیؒ نے خود ہی ان رشتوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔

ابھی حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی شادی کے سلسلے میں دوڑ دھوپ جاری تھی کہ حج کا زمانہ قریب آگیا اور آپؒ بیت اللہ کی زیارت کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اتفاق سے اسی سال ریاست فرغانہ کی شہزادی، بی بی راستی بھی حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے مکہ معظمہ حاضر ہوئی تھیں۔

بی بی راستی کا مختصر تعارف یہ ہے کہ آپؒ ایک صاحبِ کمال بزرگ، سلطان جمال الدین کی صاحبزادی تھیں۔ سلطان جمال الدین، فرغانہ (کابل) کے حاکم تھے۔ واضح رہے کہ یہ وہی فرغانہ ہے، جس پر کئی صدیوں کے بعد شیخ عمر نے قبضہ کرلیا تھا۔ اور یہ وہی شیخ عمر ہے، جس کے شجاع اور جانباز بیٹے ظہیرالدین بابر نے فرغانہ سے نکل کر ہندوستان کو پامال کرڈالا تھا اور مغل سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔

اگرچہ سلطان جمال الدین، ریاست فرغانہ کے حاکم تھے اور شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے ...... مگر فطرتاً نیک سیرت اور صوفی انسان تھے۔ اس لئے رقص و سرود، شراب نوشی اور دیگر لہو و لعب سے کوسوں دُور تھے۔ اتفاق سے بی بی راستی اُن کی اکلوتی اولاد تھیں۔ سلطان جمال الدین نے بہت دعائیں کیں...... مگر وہ بیٹے سے محروم رہے۔ اب بی بی راستی ہی فرغانہ کی ولی عہدِ سلطنت تھیں۔

سلطان جمال الدین جیسے نیک سیرت انسان کی آغوشِ محبت میں تربیت پانے کے سبب بی بی راستی بھی دوسری شہزادیوں سے بالکل مختلف تھیں۔ اگرچہ سلطان جمال الدین نے حفظ ماتقدم کے طور پر راستی کو فنونِ سپاہ گری بھی سکھائے تھے اور وہ اپنے وقت کی بہترین شہسوار، تیرانداز اور شمشیرزن تھیں...... لیکن سلطان جمال الدین کا زیادہ

زور مذہبی تعلیم پر تھا۔ والیٔ فرغانہ نے اپنی بیٹی کی دینی تربیت کے لئے بڑے بڑے علماء کی خدمات حاصل کی تھیں۔

بی بی راستی فطری طور پر نہایت ذہین تھیں۔ نتیجتاً چند سالوں کی تربیت کے بعد بی بی راستی ایک ''عالمہ'' بن گئی تھیں۔ وہ ہر ہفتے اپنے محل میں خواتین کے لئے ایک مجلس وعظ منعقد کرتیں۔ اس مجلس میں شاہی خاندان کی خواتین کے علاوہ فرغانہ کی عام عورتیں بھی شریک تھیں۔

بی بی راستی اس قدر اثر انگیز لہجے میں تقریر کرتیں کہ مجلس میں شریک خواتین رونے لگتیں۔ معتبر روایتوں کے مطابق بی بی راستی نے عورتوں کی اصلاح کے لئے اَن تھک کوششیں کیں۔ جس کے نتیجے میں فرغانہ کی خواتین دوسری ریاستوں میں رہنے والی مسلمان عورتوں سے بہت مختلف نظر آتی تھیں۔

بی بی راستی کا معمول یہ تھا کہ وہ دن بھر دربار میں بیٹھتیں...... سلطان جمال الدین نے اپنی صاحبزادی کے لئے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ دربار کا ایک حصہ بالکل الگ کر دیا گیا تھا، جہاں بی بی راستی اپنی سہیلیوں اور کنیزوں کے ساتھ پردے میں بیٹھ کر بغور سنتیں۔ اگر قاضیٔ عدالت سے کوئی بھول چوک ہو جاتی اور وہ کوئی غلط فیصلہ دے دیتا تو بی بی راستی اسے برسر دربار ٹوک دیتیں اور قاضی کی تاریخ سے کوئی مثال پیش کر کے قاضیٔ عدالت کو قائل کر دیتیں۔

ایسے مواقع پر سلطان جمال الدین، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتے۔ ''میں کیسا خوش نصیب باپ ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو میری بیٹی اسے درست کر دیتی ہے۔''

یہی وجہ تھی کہ بی بی راستی کی ذہانت و فراست کے چرچے دور دور تک ہونے لگے تھے۔ دنیا میں ایسی بہت کم خواتین گزری ہیں کہ جنہیں فہم و فراست کے ساتھ حُسنِ صورت و سیرت بھی عطا کیا گیا ہو۔ بی بی راستی کا شمار بھی ان ہی خوش نصیب خواتین میں ہوتا تھا۔ آپ دن بھر ریاست کے سیاسی معاملات میں گہری دلچسپی لیتیں، پھر رات کے وقت نمازِ عشاء کے بعد چند گھنٹے آرام کرتیں اور پھر تہجد کی نماز کے لئے اُٹھ جاتیں۔ یہاں تک کہ ذکر الٰہی کرتے کرتے فجر کی اذان ہو جاتی۔ نمازِ فجر کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کرتیں اور حسب معمول درباری کاموں میں مصروف ہو جاتیں۔

والیٔ فرغانہ سلطان جمال الدین، صاحبزادی کی یہ مشقت و ریاضت دیکھ کر کبھی کبھی سمجھانے کی کوشش کرتے۔ ''بیٹی! انسان کا اپنی جان پر بھی کچھ حق ہے۔''

بی بی راستی نہایت ادب و احترام کے ساتھ والد محترم کو جواب دیتیں۔ ''اللہ تعالیٰ نے انسانی جان پر جتنے حقوق رکھے ہیں، میں وہ سب ادا کر دیتی ہوں۔ خالق کائنات نے اولادِ آدم کو جوانی اس لئے بخشی ہے کہ وہ طاقت و توانائی کے اسی دور میں تمام حقوق و فرائض سے عہدہ برآ ہو جائے تا کہ اس کا بڑھاپا سکون سے گزر سکے اور کسی انسان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آنے والا لمحہ اس کے لئے کیا پیغام لے کر آئے گا؟ ہو سکتا ہے کہ ایک جواں سال اور صحت مند انسان یکایک معذور و مفلوج ہو جائے۔ اس لئے کسی ہوش مند شخص کو کل کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے، وہ لمحہ موجود ہے۔ ہمیں پوری ذہانت اور توانائی کے ساتھ اس لمحے کا انتظار کرنا چاہئے۔

نوعمری میں اپنی صاحبزادی کی اس قدر ہوش مندانہ باتیں سن کر سلطان جمال الدین حیرت زدہ ہو جاتے اور اپنے خالق حقیقی کا بے حد شکر ادا کرتے کہ اس ذاتِ پاک نے انہیں ایسی ذہین اور حوصلہ مند بیٹی عطا کی۔ اگر دینے والا انہیں لڑکی کی جگہ کوئی ایسا لڑکا عطا کر دیتا جو فطرتاً کم فہم اور عیش پسند ہوتا تو ساری نیک نامی خاک میں مل جاتی۔ اور جب تک وہ زندہ رہتا، والدین کے لئے ذلت و رسوائی کا سامان ہی کرتا رہتا۔

حُسنِ سیرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بی بی راستی کو مثالی حُسن و جمال بھی بخشا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ دوسری

ریاستوں کے شہزادے، بی بی راستی سے شادی کرنے کے بے حد خواہش مند تھے۔ ہر ریاست کا شہزادہ بی بی راستی سے شادی کرنے کو اپنی زندگی کی بڑی سعادت قرار دیتا اور برملا اپنے ان جذبات کا اظہار کر دیتا۔

چونکہ بی بی راستی کی عمر بائیس تیئس سال کے قریب ہو چکی تھی اور والیٔ فرغانہ سلطان جمال الدین تبریزی بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس لئے وہ جلد از جلد اپنی اس ذمے داری سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ آخر ایک دن سلطان جمال الدین نے شادی کے سارے پیغامات بیٹی کے سامنے رکھ دیئے اور اس سلسلے میں بی بی راستی کی رائے طلب کی۔

بی بی راستی نے اس اہم ترین کام کے بارے میں سوچنے کے لئے کچھ دنوں کی مہلت طلب کی تاکہ وہ ہر پہلو پر غور کر سکیں۔ آخر کئی دن تک غور و فکر کرنے کے بعد بی بی راستی اپنے والد محترم سے مخاطب ہوئیں۔ ''اگر خدانخواستہ میں کوئی بدصورت یا اپاہج دوشیزہ ہوتی تو کیا یہ شہزادے مجھ سے شادی کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے؟''

اگرچہ بی بی راستی شرم و حیا کے دائرے میں رو کر گفتگو کر رہی تھیں۔ لیکن آپ کے لہجے سے استقامت اور بے باکی جھلک رہی تھی۔

بیٹی کا سوال سن کر سلطان جمال الدین سناٹے میں آ گئے۔ پھر کسی قدر بجھے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''بیٹی! یہ دنیا کی سب سے زیادہ تلخ حقیقت ہے کہ کوئی صاحبِ اختیار مرد کسی اپاہج، معذور یا بدصورت لڑکی کو اپنی شریکِ حیات کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا۔''

''تو بابا محترم! ہمیں اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ ان شہزادون کا یہ اظہارِ عقیدت و محبت صرف میرے ظاہری حُسن و جمال کی وجہ سے ہے۔''

''بیٹی! ہمیں بدگمانی سے کام نہیں لینا چاہئے۔'' سلطان جمال الدین نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ تمہارے فہم و فراست اور زہد و تقویٰ کی خبریں بھی ان تک پہنچی ہو اور ان لوگوں نے تمہارے سیرت و کردار سے گہرا تاثر قبول کیا ہو۔''

والد محترم کی بات سن کر بی بی راستی سوچ میں پڑ گئیں اور پھر کچھ دیر بعد عرض کرنے لگیں۔ ''میں آپ کی رائے سے متفق ہوں مگر براہِ کرم ایک کام اور کیجئے تاکہ لوگوں کی نیتیں اور ارادے کسی حد تک ظاہر ہو جائیں۔''

''وہ کیا؟'' والیٔ فرغانہ، سلطان جمال الدین نے کسی قدر حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ اپنے معتبر جاسوسوں اور سراغ رسانوں کو بھیج کر ان تمام امیدواروں کے بارے میں خفیہ معلومات حاصل کریں کہ مجھ سے شادی کے یہ امیدوار خود کس سوچ اور کردار کے مالک ہیں؟'' بی بی راستی نے ادب و احترام کے ساتھ والد گرامی کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی۔

تجویز نہایت معقول تھی۔ اس لئے سلطان جمال الدین نے فوراً اس پر عمل کیا۔ پھر کچھ دن بعد والیٔ فرغانہ کے معتبر سراغ رسانوں اور جاسوسوں نے تمام شہزادگان کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس خفیہ رپورٹ کے مطابق بی بی راستی سے شادی کا امیدوار کوئی شہزادہ بھی نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور نہ صاحب کردار۔ عام شہزادوں کی طرح وہ سب کے سب دنیا کی آسائشوں اور عیش پرستیوں میں غرق تھے۔

پھر جب سلطان جمال الدین نے جاسوسوں کی یہ خفیہ رپورٹ پڑھ کر اپنی صاحبزادی کو سنائی تو بی بی راستی نے مسکراتے ہوئے عرض کیا۔

''میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ سب سیاسی تماشہ ہے۔ کیا آپ اس بات کو پسند فرمائیں گے کہ آپ کی بیٹی اپنے

عیش پرست اور دنیا دار شوہر کے ساتھ شدید اذیت ناک فضا میں اپنی پوری زندگی گزار دے؟"

"ہرگز نہیں۔" والئ فرغانہ سلطان جمال الدین نے پُرجوش اور پُرسوز لہجے میں کہا۔ "کوئی ہوش مند انسان جان بوجھ کر زہر نہیں پی سکتا۔"

"اس سیاسی تماشے کا ایک اور خطرناک پہلو بھی ہے کہ مجھ سے شادی کرنے والا شخص آپ کے انتقال کے بعد پوری ریاست فرغانہ کا مالک بن جائے گا۔ حقیقتاً یہ سود در سود کا کاروبار ہے اور میں اس کاروبار میں کسی طور بھی شریک نہیں ہوسکتی۔"

اور امر واقعہ بھی یہی تھا کہ تمام ریاستوں کے شہزادے، بی بی راستی سے شادی کے پردے میں ایک انتہائی منافع بخش تجارت کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ سلطان جمال الدین، بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ مشکل سے دس پندرہ سال اور زندہ رہیں گے۔ اولادِ نرینہ نہ ہونے کے بعد اُن کی لڑکی ہی ریاست کی مالکہ ہوگی۔ شادی ہو جانے کی صورت میں ایک حسین و جمیل بیوی بھی مل جائے گی اور اپنے ساتھ جہیز میں فرغانہ کی ریاست بھی لے کر آئے گی۔

صورتِ حال کی اس نزاکت نے سلطان جمال الدین کو شدید ذہنی اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ "لوگوں کی نیتیں اور ارادے اپنی جگہ اور ایک باپ کی ذمے داریاں اپنی جگہ...... میری دعا ہے کہ یہ آنکھیں اس وقت بند ہوں، جب میں تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔" سلطان جمال الدین کے لہجے سے شدید حسرت جھلک رہی تھی۔

باپ کو اُداس دیکھ کر بی بی راستی بھی بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگی تھیں۔ انتہائی محبت آمیز اور پُرسکون لہجے میں عرض کرنے لگیں۔ "بابا محترم! میں نے آپ ہی کی آغوشِ محبت میں تربیت پائی ہے۔ اس لئے مجھ سے زیادہ آپ کو کوئی نہیں پہچان سکتا۔"

"آخر تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" سلطان جمال الدین نے ایک بار پھر حیرت سے اپنی عابدہ و زاہدہ بیٹی کی طرف دیکھا۔

"آپ اہلِ ایمان میں سے بھی ہیں اور اہلِ یقین میں سے بھی۔" بی بی راستی نے عرض کیا۔ "ہمیں اس معاملے میں اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنا چاہئے۔ ابھی اس کام کا وقت نہیں آیا ہے۔ اور جب بھی وقت آئے گا تو یقیناً ہمارے حق میں بہتر ہی ہوگا۔"

والئ فرغانہ، سلطان جمال الدین اپنی صاحبزادی کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔

پھر اسی سال بی بی راستی اپنی کنیزوں کے ہمراہ حج بیت اللہ کے لئے چلی گئیں۔ یہ وہی سال تھا، جب حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے فرزندِ اکبر، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ بھی حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے۔

ایک دن شہزادی راستی، بیت اللہ کا طواف کر رہی تھیں کہ اتفاق سے ان کی نظر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ پر پڑی جو اُن سے چند قدم کے فاصلے پر طواف کر رہے تھے۔ اگرچہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی پشت، بی بی راستی کی طرف تھی۔ مگر شہزادی فرغانہ نے محسوس کیا کہ اس اجنبی شخص کے جسم سے ایک خاص نور پھوٹ رہا ہے۔

پھر جب طواف ہوا تو بی بی راستی نے اپنے خدمت گزاروں کو حکم دیا۔

"تم لوگ سراغ لگاؤ کہ یہ نوجوان کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟"

شہزادی فرغانہ کے خدمت گار فوراً ہی اس اجنبی شخص کی تحقیق و جستجو میں لگ گئے۔ پھر دو تین دن کے بعد

خدمت گزاروں نے بی بی راستی کے سامنے اپنی حاصل کردہ معلومات پیش کرتے ہوئے کہا۔
''اس نوجوان کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ نام شیخ صدرالدین عارف ہے۔ اور وہ سلسلۂ سہروردیہ کے مشہور بزرگ، حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے فرزندِ اکبر ہیں۔''
یہ سنتے ہی شہزادی راستی نے بے اختیار کہا۔ ''مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی عام نوجوان نہیں ہے۔''
حج بیت اللہ سے واپسی کے بعد شہزادی راستی نے اپنی ایک معتبر خادمہ کے ذریعے والد محترم سلطان جمال الدین تک اپنے جذبات پہنچا دیئے۔ بعض روایتوں کے مطابق بی بی راستی نے اپنے والد ماجد سے براہِ راست گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا۔
''اب آپ کوشش فرمائیے...... شاید اللہ کی طرف سے اس کام کا وقت آ گیا ہے۔''
سلطان جمال الدین، صاحبزادی کے انتخاب سے بہت خوش ہوئے اور کسی تاخیر کے بغیر اپنے امیروں اور خاص خاص خدمت گاروں کے ساتھ فرغانہ سے ملتان پہنچے۔ جب حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریاؒ نے آپؒ کی آمد کی خبر سنی تو اپنی خانقاہ سے نکل کر معزز مہمان کا استقبال کیا۔
پھر دوسرے دن والیٔ فرغانہ، سلطان جمال الدین نے کسی تکلف کے بغیر حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریاؒ سے کہا۔ ''شیخِ محترم! میری دلی خواہش ہے کہ دونوں خاندانوں کے درمیان قریبی رشتہ قائم ہو جائے۔''
حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریاؒ والیٔ فرغانہ، سلطان جمال الدین کی گفتگو کا مفہوم سمجھ چکے تھے۔ اس لئے آپؒ نے بھی بے تکلفانہ لہجے میں فرمایا۔ ''تجویز تو اچھی ہے۔ مگر آپ نے صورتِ حال کی نزاکتوں کو محسوس نہیں کیا۔''
سلطان جمال الدین نے بھی حیرت سے حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی طرف دیکھا۔ ''شیخ محترم! براہِ کرم اپنی بات کی وضاحت فرمائیے۔''
''ایک کھلی ہوئی حقیقت کی وضاحت ہی کیا؟'' حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریاؒ نے اندازِ بے نیازی کے ساتھ درویشانہ لہجے میں فرمایا۔ ''یہ آپ کی بڑائی ہے کہ آپ ایک درویش کے گھر اپنی صاحبزادی کا رشتہ لے کر آئے۔ مگر درویش اپنی حقیقت کو خوب پہچانتا ہے۔ شادی جیسے نازک اور اہم معاملات میں لڑکی اور لڑکے کی معاشی حیثیتوں میں توازن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر یہ توازن بگڑ جائے تو ہر رشتہ طے پا جانے کے باوجود درمیان ایک خلا باقی رہ جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اور آپ کے درمیان یہ خلا پہلے سے ہی موجود ہے۔ پھر یہ رشتہ کس طرح ہو سکتا ہے؟''
''میری سلطانی تو ایک آنی جانی شے ہے۔'' والیٔ فرغانہ جمال الدین نے نہایت عجز و انکسار کے لہجے میں کہا۔
''درحقیقت دین و دنیا کے سلطان تو آپ ہی ہیں۔''
یہ محبت و عقیدت کی انتہا تھی۔ اس کے جواب میں حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے فرمایا۔ ''تو پھر حکم دیجئے۔ مجھے ہر حال میں اپنا ہمنوا پائیں گے۔''
''میری شدید آرزو ہے کہ مخدوم زادہ، صدرالدین عارفؒ میری بیٹی شہزادی راستی کو اپنی غلامی میں قبول فرما لیں۔'' والیٔ فرغانہ، سلطان جمال الدین نے کھلے الفاظ میں اپنی دلی خواہش کا اظہار کر دیا۔
والیٔ فرغانہ کی بات سن کر حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''یہ خود صدرالدین کی بھی سعادت ہو گی۔''

پھر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ اور شہزادی راستی کی یہ تقریب نکاح ملتان میں منعقد ہوئی۔ فرغانہ، ملتان اور دیگر شہروں کے بڑے بڑے مشائخ اور معززین اس یادگار شادی میں شریک ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق جب نکاح کے بعد فرغانہ کی شہزادی راستی، اپنے خسر محترم حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے سلام کے لئے حاضر ہوئیں تو سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم بزرگ اپنی بہو کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔

واضح رہے کہ 9 رمضان المبارک 649ھ میں ان ہی عظیم خاتون کے بطن سے مشہور بزرگ حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتح رحمتہ اللہ علیہ پیدا ہوئے۔

❁❁❁

وہ ہندوستان بھر کے اہلِ ایمان کے لئے بڑا گراں وقت تھا، جب 666ھ میں حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریاؒ دنیا سے رخصت ہوئے۔ وصال کے بعد حضرت شیخ کا ترکہ آپؒ کے صاحبزادوں میں برابر تقسیم ہوا۔ ہم گزشتہ سطور میں واضح کر چکے ہیں کہ حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے سات فرزند تھے۔ جب آپؒ کی چھوڑی ہوئی جائیداد تمام بیٹوں میں برابر تقسیم کی گئی تو حضرت شیخ رکن الدین عارفؒ کے حصے میں سات لاکھ تنکے (روپے) آئے۔

اسی واقعے کو بنیاد بنا کر سلسلۂ چشتیہ کے کچھ لوگ سلسلۂ سہروردیہ کے بزرگوں پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ سلاطینِ وقت سے تعلق رکھتے تھے اور دولت کے انبار جمع کرتے تھے۔ مگر انہیں یہ واقعہ یاد نہیں رہا کہ جب حضرت مخدوم شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کی چھوڑی ہوئی دولت آپؒ کے فرزندوں میں تقسیم ہوئی تو حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اپنے حصے کے سات لاکھ تنکے (روپے) اسی روز ہی خانقاہ کے درویشوں اور دوسرے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیئے تھے۔

جود و سخا کا یہ مظاہرہ دیکھ کر خانقاہ کے ایک درویش نے حضرت صدرالدین عارفؒ سے عرض کیا۔

"شیخ! آپ کے والد محترم کی روش اور تھی اور آپ کا طرزِ عمل کچھ اور۔"

حضرت شیخ عارفؒ نے بڑی حیرت سے اس درویش کی طرف دیکھا اور پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بیٹا، باپ کی روش ترک کر دے اور وہ پھر بیٹا کہلانے کا مستحق رہے۔ رہا میرا سوال تو میں ایک عام بیٹا بھی نہیں ہوں۔ حضرت مخدوم بہاؤالدین زکریاؒ کا سجادہ نشین اور خلیفہ اکبر ہوں۔ اگر میں پیر و مرشد کی چھوڑی ہوئی روحانی میراث کی حفاظت و نگہبانی نہ کر سکوں تو پھر میں اس سجادے پر بیٹھنے کے قابل ہی کہاں ہوں؟"

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا یہ رنگِ جلال دیکھ کر وہ درویش گھبرا گیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں عرض کرنے لگا۔ "شیخ محترم! میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میری حیثیت ہی کیا کہ میں آپ کی روحانی عظمت پر گواہی دے سکوں۔ میں تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے والد محترم کا خزانہ رقم اور اسباب سے بھرا رہتا تھا۔ اور وہ اسے موقع محل کے لحاظ سے آہستہ آہستہ خرچ کیا کرتے تھے۔ مگر آپ نے تو آن کی آن میں اپنا سارا سرمایہ لٹا دیا اور ترک و تجرید کی روش اختیار کی۔ آخر اس میں کیا راز ہے؟"

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے درویش کے اس سوال کے جواب میں فرمایا۔ "میرے والد محترم ہمیشہ دنیا پر غالب رہتے تھے اور اسے مغلوب کر کے مال و اسباب خرچ کیا کرتے تھے۔ اگرچہ میں بیشتر اوقات دنیا پر غالب ہی رہتا ہوں...... لیکن کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنی اس کیفیت کو مساوی اور برابر پاتا ہوں (یعنی میں نہ غالب ہوتا ہوں اور نہ مغلوب) اس کیفیت کو دیکھ کر مجھے اندیشہ لاحق ہوتا ہے، کہیں دنیا میری ذات پر

غالب نہ آ جائے۔اس لئے میں نے اس مردم آزار اور ہلاکت خیز شے کو اپنے آپ سے جدا کر دیا ہے۔اب میرا دماغ بھی مطمئن ہے اور دل کو بھی طمانیت حاصل ہے۔"

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ ایک صاحبِ کشف بزرگ تھے۔اور آپؒ کی ذاتِ گرامی سے بے شمار کرامات منسوب ہیں۔مگر ایک کرامت، تاریخ تصوف کے سینے پر اس طرح نقش ہے کہ اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔احمد قندھاری اپنے زمانے میں گھوڑوں اور دیگر ساز و سامان کے بہت بڑے تاجر تھے۔مال و زر کی اس قدر فراوانی تھی کہ خود احمد قندھاری کو اپنی دولت کا اندازہ نہیں تھا۔قرآن کریم کی ایک آیت مقدسہ کے مطابق "مال و دولت اور اولاد، انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش ہیں۔انسان اولاد کی محبت میں بہت سے جائز اور ناجائز اور حرام کام کرنے لگتا ہے۔اسی طرح مال و زر کی کثرت، انسان کو یادِ خدا سے غافل کر دیتی ہے اور وہ صحیح راستے سے بھٹک کر فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔دنیا میں خال خال ہی ایسے مال بردار انسان نظر آئیں گے جو کثرتِ زر کے باوجود اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہیں اور ان کی زندگی میں توازن نظر آتا ہے۔ورنہ صاحبانِ زر کی اکثریت خون آشامی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔یہ دولت اور اقتدار کی فراوانی ہی تھی کہ جس کے زیرِ اثر ماضی میں بعض افراد نے خدائی کے دعوے کر ڈالے تھے۔تاجر احمد قندھاری، دولت پرستی کی اس منزل میں تو نہیں تھے، مگر بے راہ روی کی زندگی گزار رہے تھے۔ان کے یہاں روزانہ محفلِ کیف و نشاط آراستہ ہوتی تھی۔احمد قندھاری اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر شراب پیتے اور خوب صورت عورتوں کے رقص دیکھتے اور بدمستی کی حالت میں کہتے تھے۔

"بس یہی زندگی ہے۔اس کے سوا کچھ نہیں۔"

اگرچہ احمد قندھاری، مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر سے کئی صدی پہلے گزرے ہیں......مگر ان کا نقطہ نظر یہ حیات اس مشہور شعر کے مصداق تھا۔

نوروز و نوبہار و مئے دلربا خوشی است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

(ترجمہ: بہار ہو......اور شراب ہو......اور دلربا (محبوبہ) ہو کہ یہی خوشی کا ساز و سامان ہے......اس لئے بابر تجھے لازم ہے کہ عیش و عشرت تلاش کر۔اور یاد رکھ کہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی)

احمد قندھاری کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ ہر وقت شراب کے نشے میں مست رہتے تھے۔اتفاق سے وہ ایک بار تجارت کے سلسلے میں ملتان آئے۔ایک دن حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ ایصالِ ثواب کے لئے اپنے والد محترم، حضرت بہاؤالدینؒ کے مزارِ مبارک پر حاضر ہوئے۔پھر آپؒ واپسی میں اپنی خانقاہ کی طرف تشریف لا رہے تھے تو احمد قندھاری، ملتان کے بازار میں کھڑے کچھ تاجروں سے گفتگو کر رہے تھے۔

یکایک حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی نظر ان پر پڑی۔آپؒ نے احمد قندھاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک خادم سے فرمایا۔

"ان صاحب کو لے کر خانقاہ پہنچو۔آج وہ ہمارے مہمانِ خاص ہوں گے۔"

یہ کہہ کر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ اپنی خانقاہ کی طرف تشریف لے گئے اور خدمت گار، احمد قندھاری کے پاس پہنچا۔"ہمارے شیخ نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

احمد قندھاری نے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے خدمت گار کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔"میں تمہارے شیخ کو نہیں پہچانتا۔"

''سارا ملتان جانتا ہے۔ بس ایک تم ہی نہیں جانتے۔'' حضرت شیخ کے خادم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے تم اس شہر میں اجنبی ہو۔''

''یہ تو سچ ہے کہ میں اجنبی ہوں۔'' احمد قندھاری نے حضرت شیخ کے خادم سے کہا اور پھر تاجروں سے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

''بہت بڑے اور صاحبِ کمال بزرگ ہیں۔'' ایک مقامی تاجر نے احمد قندھاری کو بتایا۔ ''تم بڑے خوش نصیب ہو کہ حضرت شیخ نے تمہیں خود یاد فرمایا ہے۔ فوراً چلے جاؤ۔ اگر شیخ نے تمہیں اپنی دعاؤں سے نواز دیا تو تمہاری تجارت کو اس قدر فروغ حاصل ہوگا کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔''

تاجروں کے سمجھانے سے احمد قندھاری، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے خدمت گار کے ساتھ خانقاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ شیخ کی دعاؤں سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ میں تو پہلے ہی ایک بہت مالدار انسان ہوں۔ اگر شیخ کی دعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو ملتان کے تمام لوگ ہی آسودہ حال زندگی بسر کر رہے ہوتے۔ الغرض اپنے ذہن میں مختلف خیالات لئے ہوئے احمد قندھاری، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی خانقاہ پہنچا۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی مجلسِ روحانی آراستہ تھی۔ آپؒ ایک عام سی مسند پر جلوہ افروز تھے اور بہت سے طالبانِ معرفت، حضرت شیخ کے سامنے دست بستہ بیٹھے تھے۔ پھر جیسے ہی احمد قندھاری، خدمت گار کے ساتھ مجلس میں داخل ہوا تو حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم اُبھر آیا اور آپؒ یہ کہتے ہوئے اپنی مسند سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہم اپنے مہمانِ خاص کا استقبال کرتے ہیں۔''

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی تقلید میں تمام حاضرینِ مجلس بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس مہمانِ خاص کی طرف دیکھنے لگے جو نہایت قیمتی پوشاک پہنے ہوئے تھا۔ اس کی انگلیوں میں ہیرے کی قیمتی انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں سونے کا مرصع ہار۔ حاضرینِ مجلس کو احمد قندھاری کی شخصیت میں اس کے سوا کوئی خاص علامت نظر نہیں آئی کہ وہ اپنے ظاہری حلیے سے صرف ایک مالدار انسان نظر آتا تھا۔ حاضرینِ مجلس کے لئے یہ صورتِ حال بھی بڑی حیران کن تھی کہ آج تک حضرت شیخ نے بڑے سے بڑے وزیر یا امیر سلطنت کا اس طرح استقبال نہیں کیا تھا۔ پھر آنے والے شخص میں کیا خاص بات تھی؟

جب احمد قندھاری قریب پہنچا تو حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''ہمیں برسوں سے تمہارا انتظار تھا۔ تم بہت دیر سے آئے...... مگر خیر، آتو گئے۔''

یہ کہہ کر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے احمد قندھاری کا بازو پکڑ لیا اور اسے مسند پر اپنے قریب بٹھا لیا۔ اس دوران احمد قندھاری یہی سمجھ رہا تھا کہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ اس کی امارت سے متاثر ہو کر اس قدر والہانہ انداز میں استقبال کر رہے ہیں۔

کچھ دیر تک حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ، احمد قندھاری سے اس کا حال واحوال اس طرح پوچھتے رہے، جیسے دونوں کے درمیان برسوں کی شناسائی اور دوستی ہو۔ اب احمد قندھاری کو یقین ہو چلا تھا کہ شیخ کی اس محبت آمیز گفتگو کا کوئی خاص مقصد ہے۔ اور وہ مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ شیخ اس کی امارت سے متاثر ہیں اور مالی امداد کے خواہاں ہیں۔ احمد قندھاری کی اس سوچ کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ تجارت کے سلسلے میں بیشتر ممالک

اور شہروں کا دورہ کر چکا تھا۔ اور اس طویل سیر و سیاحت کے دوران اس کا واسطہ ایسے کئی درویشوں سے پڑا تھا جو ذی حیثیت اور مالدار انسانوں کی قربت کے خواہاں رہتے تھے۔ تاکہ ان لوگوں سے نذر و نیاز کے نام پر بڑی بڑی رقمیں حاصل کریں اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں۔ درویش نما لوگوں کی ان ہی حرکات کو دیکھ کر احمد قندھاری ان سے بدظن ہو گیا تھا اور اپنے دوستوں کے سامنے برملا کہا کرتا تھا۔

''یہ لمبی لمبی عباؤں اور اونچی اونچی دستاروں والے، جن کے ہاتھوں میں تسبیح ہوتی ہے اور ماتھے پر سجدوں کے گہرے نشانات، حقیقتاً مذہب کے نام پر تجارت کرتے ہیں اور سادہ لوح انسانوں پر اپنی عبادت و ریاضت کا رعب ڈال کر نذریں اور تحائف وصول کرتے ہیں۔ چٹائیاں زرنگار مسندوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ اور فقر و قناعت کی زندگی بسر کرنے والے عقیدت مندوں کی طرف سے پیش کی جانے والی مرغن غذاؤں سے پیٹ بھر رہے ہیں۔''

بے شک، درویشوں کے سلسلے میں یہ بڑے جارحانہ تبصرے تھے مگر اس میں احمد قندھاری کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ بدقسمتی سے اس نے آج تک جتنے درویشوں کو دیکھا تھا، ان کی زبانوں پر آیاتِ قرآنی جاری تھیں مگر دل و دماغ اور نیتوں پر دنیا اور اس کی لذتیں حاوی تھیں۔ احمد قندھاری جو درویشوں کو مذہبی تاجر کہہ کر پکارتا تھا، آج وہی گھوڑوں کا تاجر سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم بزرگ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے قریب مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مسند پر بیٹھا تھا۔

ان دنوں شدید گرمی کا موسم تھا۔ احمد قندھاری کو پیاس محسوس ہوئی تو اس نے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ سے عرض کیا۔ ''شیخ! مجھے تھوڑا سا پانی عنایت کیجئے۔''

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اپنے خدمت گاروں کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''ہمارے مہمانِ خاص کو شربت پیش کیا جائے۔''

تھوڑی دیر بعد جب خادم، شربت کا پیالہ لے کر آیا تو حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے وہ پیالہ اٹھا لیا اور چند گھونٹ لے کر پیالہ، احمد قندھاری کی طرف بڑھا دیا۔

احمد قندھاری نے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی طرف دیکھا اور کسی قدر ناگوار لہجے میں کہنے لگا۔ ''معاف کیجئے شیخ! میں نے آج تک ایسی میزبانی نہیں دیکھی کہ مہمان کو جھوٹا شربت پیش کیا جا رہا ہو۔''

تمام حاضرین مجلس بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے انتہائی پُرجلال لہجے میں احمد قندھاری کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اسے پی لو...... یہی جھوٹا شربت تمہاری پیاس کا علاج ہے۔''

احمد قندھاری وہ شربت پینا نہیں چاہتا تھا۔ مگر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا جلالِ روحانی دیکھ کر دم بخود سا ہو گیا۔ اور اس نے چپ چاپ شربت کا پیالہ اٹھا کر پی لیا۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ اور تمام حاضرین مجلس کی نظریں احمد قندھاری کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

یکایک احمد قندھاری کا رنگ متغیر ہو گیا اور اس نے شدید اضطراب کے لہجے میں حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ سے پوچھا۔ ''شیخ! آپ نے مجھے کیا پلا دیا؟''

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے مسکراتے ہوئے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''سب تمہاری نظروں کے سامنے ہے۔ جو میں نے خود پیا ہے، وہی تمہیں پلایا ہے۔''

احمد قندھاری نے سر جھکا لیا اور کچھ دیر تک سر جھکائے گہرے سکوت کے عالم میں بیٹھا رہا۔

''ہمارا مہمانِ خاص اب کیا محسوس کر رہا ہے؟'' حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اسی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

احمد قندھاری نے سر اٹھایا اور کھوئی کھوئی نظروں سے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شیخ! کیسا شربت تھا کہ جسے پینے کے بعد میں اپنے دل کی دنیا کو زیر و زبر پاتا ہوں۔'' احمد قندھاری کا لہجہ پُرسوز بھی تھا اور عاجزانہ بھی۔ ''اپنے ماضی کی معصیت آلود زندگی پر بے حد شرمندہ ہوں۔'' یہ کہتے کہتے احمد قندھاری رونے لگا۔ ''اب تو یہی دل چاہتا ہے کہ بقیہ زندگی حضور کے مبارک قدموں میں گزار دوں۔''

''تو پھر تمہیں کس نے روکا ہے؟'' حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے ایک دل آویز تبسم کے ساتھ فرمایا۔

احمد قندھاری کھڑا ہو گیا اور نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کرنے لگا۔ ''شیخ! مجھے کچھ بہت ضروری کام ہیں۔ انہیں انجام دے کر دوبارہ قدم بوسی کو حاضر ہوں گا۔ اس دوران مجھے اپنی دعاؤں سے محروم نہ کیجئے گا۔''

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے فرمایا۔ ''اگر تم ہماری دعاؤں میں شامل نہ ہوتے تو یہاں تک پہنچتے ہی نہیں۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ نے احمد قندھاری کو گلے لگایا اور اس دعا کے ساتھ رخصت فرمایا۔

''حق تعالیٰ تمہیں اس خارزارِ ہستی میں ہمیشہ ثابت قدم رکھے۔''

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی دعاؤں کے سائے میں احمد قندھاری اپنے وطن واپس چلا گیا۔ وہ ایک طویل عرصے کے بعد قندھار واپس آیا تھا، اس لئے دوستوں نے اس کا والہانہ استقبال کیا اور فرمائش کی کہ اس خوشی میں رقص و سرود کا جشنِ خاص منایا جائے۔ احمد قندھاری نے اپنے ان دوستوں کی بات سنی جو کیف و نشاط کے دلدادہ اور رقص و شراب کے رسیا تھے...... پھر وہ مسکراتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا۔

''آج رات تم لوگ ضرور آنا۔ میں ایسی دعوت کا اہتمام کروں گا کہ جسے قندھار والے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔''

تمام دوست خوشی خوشی اپنے گھروں کو چلے گئے اور بڑی بے چینی سے آنے والی رات کا انتظار کرنے لگے۔ پھر جب رات آئی اور تمام احباب، احمد قندھاری کی عالیشان نشست گاہ میں داخل ہوئے تو اُنہیں ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ احمد قندھاری کی پوری نشست گاہ بلور (بہترین شیشے) کی صراحیوں سے بھری ہوئی تھی۔ صراحیوں کے قریب سونے کے منقش پیالے رکھے ہوئے تھے۔

''احمد! یہ سب کچھ کیا ہے؟'' کئی دوستوں نے بیک زبان پوچھا۔

''یہ اسی جشنِ خاص کا اہتمام ہے، جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔'' احمد قندھاری نے مسکراتے ہوئے اپنے دوستوں کو جواب دیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم سب لوگ اپنی آخری سانس تک اس رات کو فراموش نہ کر سکو گے۔'' یہ کہہ کر احمد قندھاری اپنی جگہ سے اُٹھا اور نشست گاہ کے ایک گوشے میں رکھا ہوا لوہے کا ہتھوڑا لے کر واپس آیا۔

دوستوں کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

احمد قندھاری نے ایک صراحی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کے اندر 100 سال پرانی شراب ہے۔ یہ میرے ذاتی استعمال میں رہتی ہے۔ تم نے اس کی ایک بوند بھی نہیں چکھی ہوگی۔''

یہ سن کر دوستوں کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ''واقعتاً ہم اس کے ذائقے سے آشنا نہیں۔ آج تیری بدولت ہمیں مے نوشی کا یہ اعزاز بھی حاصل ہو جائے گا۔'' دوستوں نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

ابھی کمرے میں ان عیش پرستوں کے قہقہوں کی گونج باقی تھی کہ احمد قندھاری کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور دوسرے ہی لمحے بلور کی وہ قیمتی صراحی چور چور ہو چکی تھی۔ اور 100 سال پرانی شراب نے فرش پر بچھے ہوئے کاشانی قالین کو بھگو دیا تھا۔ احمد قندھاری کی اس حرکت سے دوستوں کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر اس نے ایک ایک کر کے تمام صراحیوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ دوست چیختے رہے۔ ''کیا تُو پاگل ہو گیا ہے؟''

غالباً اسی موقع کے لئے جگر مراد آبادی نے یہ شعر کہا تھا۔

اے محتسب نہ پھینک میرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

اپنا قیمتی شراب خانہ تباہ کرنے کے بعد احمد قندھاری نے اپنے دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم اس دعوتِ خاص کو ہمیشہ یاد رکھو گے۔''

دوستوں نے جواب میں خاموشی اختیار کی۔ ان کے خیال میں احمد قندھاری کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔ اگر وہ اس سلسلے میں کوئی بحث و مباحثہ کرتے تو بہت ممکن تھا کہ احمد قندھاری اپنے جنون و وحشت کی وجہ سے ان پر بھی ہاتھ اٹھا دیتا۔ اس لئے تمام دوستوں نے اس وقت چپ چاپ چلے جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

پھر دوسرے دن تمام دوست، قندھار کے سب سے بڑے طبیب کو لے کر احمد کے گھر پہنچے۔ ان لوگوں نے پہلے ہی طبیب کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ ان کا دوست اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے، اس لئے وہ بڑی احتیاط کے ساتھ گفتگو کرے۔ احمد قندھاری نے بڑی حیرت سے اپنے دوستوں کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب یہاں کس لئے آئے ہو؟ صراحیاں ٹوٹ چکیں، شراب بہہ کر زمین میں جذب ہو چکی اور مے خانہ اُجڑ چکا..... اب یہاں تمہارے کیف و نشاط کا کوئی سامان نہیں۔''

''ہم تو صرف دوستی کی خاطر تمہاری مزاج پرسی کے لئے آئے ہیں۔'' ایک دوست نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''کل رات تم اپنے ہوش میں نہیں تھے...... اس لئے ہم خاموشی کے ساتھ چلے گئے۔''

''ہوش میں تو میں اب بھی نہیں ہوں۔'' احمد قندھاری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر اضطراب و وحشت کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا۔ وہ حسب عادت بہت زیادہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''سچ پوچھو تو ہم تمہیں ہوش میں لانے ہی کے لئے آئے ہیں۔'' دوسرے دوست نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ اس طبیبِ خاص سے مخاطب ہوا، جو اپنی حکمت کی وجہ سے دُور دُور تک مشہور تھا۔ ''حکیم صاحب! آپ نے اس گفتگو سے کیا اندازہ کیا؟''

اس سے پہلے کہ وہ طبیب اپنی رائے کا اظہار کرتا، احمد قندھاری خود ہی بول اٹھا۔ ''یہ بے چارے تو خود ہی مریض ہیں۔ میری بیماری کے بارے میں کسی کو کیا بتائیں گے؟ ہو سکے تو ان کا علاج کر دیں۔''

بے چارہ طبیب پریشان تھا۔ کبھی وہ احمد قندھاری کی طرف دیکھتا اور کبھی اس کے دوستوں کی طرف جو بار بار احمد قندھاری کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ تمام دوستوں نے بیک زبان کہا۔ ''اگر تم نے ہماری بات نہیں مانی اور اپنا معائنہ نہیں کرایا تو پھر یہ دوستی ختم بھی ہو سکتی ہے۔''

اگرچہ بظاہر یہ بڑی مخلصانہ دھمکی تھی۔ مگر احمد قندھاری نے بہت تلخ لہجے میں کہا۔ ''میری دوستی شرابیوں اور ہوس پرستوں سے نہیں ہو سکتی۔ تم لوگ جاؤ اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔''

احمد قندھاری کی بات سن کر ایک دوست کو غصہ آ گیا۔ ''کل تک تو تم بھی وہی تھے جن کا طعنہ ہمیں دے رہے

ہو..... پہلے اپنے گریبان میں جھانکو۔"

"گریبان میں نہیں، میں نے اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھ لیا۔ میرا "کل" مر چکا..... صرف "آج" باقی ہے۔"

آخر تمام دوست، احمد قندھاری کی دیوانگی پر افسوس کرتے ہوئے چلے گئے اور طبیبِ خاص نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "اس شخص کی ذہنی رو اس حد تک بہک چکی ہے کہ شاید ہی کبھی اپنی صحیح حالت پر آسکے۔"

اس کے بعد احمد قندھاری نے جو کچھ کیا، وہ کوئی دیوانہ ہی کر سکتا تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے اپنا سارا مال و اسباب درویشوں، ضرورت مندوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر اس حالت میں ملتان پہنچا کہ اس کے جسم پر صرف ایک معمولی کپڑے کا لباس تھا۔

"اپنی تمام ذمے داریاں پوری کر آئے؟" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے مسکراتے ہوئے احمد قندھاری سے پوچھا۔ "کوئی باقی تو نہیں رہ گئی؟"

"شیخ کے صدقے میں تمام زنجیریں کاٹ دیں۔ اب میں آزاد ہوں۔" یہ کہتے کہتے احمد قندھاری رونے لگا۔

"ہم نے تمہاری آزادی کے لئے بہت دعائیں کی تھیں۔" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے احمد قندھاری کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھتے ہوئے فرمایا۔

"شیخ! غلامی سے نجات ممکن نہیں۔" احمد قندھاری کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں مزید تیزی آگئی تھی۔

"بفضلِ خدا اب تم آزاد ہو۔" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں احمد قندھاری کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "انشاء اللہ یہ دنیا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

"بے شک! میں نے اس مردار دنیا کو تین طلاقیں دے دیں۔ اور اپنے نفس کی غلامی سے نجات حاصل کر لی۔ مگر اب میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کی غلامی اختیار کر لوں۔" احمد قندھاری کے لہجے میں دل کا درد شامل تھا۔

احمد قندھاری کی بات سن کر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے کچھ دیر کے لئے سکوت اختیار فرمایا۔

حضرت شیخ کو خاموش پا کر احمد قندھاری گریہ وزاری کرنے لگا۔ "شیخ! مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹایئے۔ اگر آپ نے مجھے اپنی غلامی کی سند عطا نہ فرمائی تو یہ فریب کار دنیا مجھے دوبارہ زرنگار زنجیروں میں جکڑ لے گی۔"

بالآخر صدرالدین عارفؒ نے احمد قندھاری کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل فرما لیا۔ سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت ہونے کے بعد احمد قندھاری دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔ صدرالدین عارفؒ اپنے دوسرے مریدوں کے مقابلے میں ان پر زیادہ توجہ فرمایا کرتے تھے۔

پیر و مرشد کا یہ التفاتِ خاص دیکھ کر ایک دن ایک مرید نے شکایتاً عرض کیا۔ "سیدی! ہم برسوں سے آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ مگر خصوصی توجہ سے محروم ہیں۔"

"خصوصی توجہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟" صدرالدین عارفؒ نے اپنے مرید سے پوچھا۔

"خانقاہ کے تمام خدمت گار اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ ایک پردیسی پر آپ کی عنایتِ خاص ہے۔ جبکہ اسے یہاں آئے ہوئے چند ہی روز گزرے ہیں۔" مرید کا اشارہ احمد قندھاری کی طرف تھا۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اس مرید کی شکایت سنی اور نہایت پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ "اپنے دلوں کو حسد اور کدورت سے پاک رکھو۔ ورنہ یہ ریاضتیں تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی۔ یہ دنیا کا اصول ہے کہ ہر استاد اپنے سب سے ذہین اور لائق شاگرد پر زیادہ توجہ دیتا ہے تاکہ اسے علم کے اسرار و رموز سمجھائے جا سکیں۔ اور

قدرت کے اس نظام کو بھی یاد رکھو کہ سب انسانوں کی فطری صلاحیتیں برابر نہیں ہوتیں۔ ایک کم فہم انسان کو اس کی ذہنی سطح سے بالاتر بات کبھی نہیں سمجھائی جا سکتی۔"

خانقاہ کے در و بام پر سناٹا طاری تھا اور تمام خدمت گار و مرید، پیر و مرشد کی گفتگو سن رہے تھے۔ صدرالدین عارفؒ کی پُر جلال آواز دوبارہ گونجی۔ "جس شخص کے سینکڑوں ملازم تھے، وہ جھاڑو دے رہا ہے.... درویشوں کے لئے وضو کا پانی لا رہا ہے..... اور تم بتاؤ کہ تم نے اللہ کے راستے میں اپنی کون سی جائیداد لٹائی ہے؟"

پیر و مرشد کا سوال سن کر تمام مریدوں اور خدمت گاروں پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

"تمہیں خبر ہے کہ وہ کتنی قربانیوں کے بعد مجھ تک پہنچا ہے؟" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے ان خدام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا جو آج اپنی طویل خدمت کا حساب کرتے ہوئے احمد قندھاری کی چند روزہ قربت پر اعتراض کر رہے تھے۔ "اللہ تعالیٰ، انسان کی نیت کو دیکھتا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ احمد کی نیت کیا ہے؟"

اس واقعہ کے بعد تمام مریدوں اور خدمت گاروں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ اپنے اس نئے مرید پر اس قدر مہربان کیوں ہیں۔

اور احمد قندھاری کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی لباس میں کئی سال گزار دیتے۔ پھر جب وہ پھٹنے کے قریب ہو جاتا تو دوسرا استعمال کرتے۔ پابندی سے پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے اور حضرت شیخ کے بتائے ہوئے اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ نمازِ عشاء کے بعد پیر و مرشد کے حجرۂ مبارک میں داخل ہوتے اور حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے پاؤں دبانے کے لئے بیٹھ جاتے۔ شروع میں حضرت شیخ نے انکار کیا تو احمد قندھاری رونے لگے۔

"شیخ! مجھے اس سعادت سے محروم نہ فرمائیں۔"

آخر حضرت صدرالدین عارفؒ نے اجازت دے دی۔ احمد قندھاری کے سوا کسی دوسرے مرید کو یہ خصوصی اعزاز حاصل نہیں تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ احمد قندھاری طلوعِ آفتاب سے پہلے غسل کرنے کے لئے دریا میں اُترے۔ موسم اس قدر سرد تھا کہ پانی جمتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر بھی احمد قندھاری بہت دیر تک برف جیسے پانی میں کھڑے یہ مناجات پڑھتے رہے۔

"اے اللہ! تُو ہی اس کائنات کا بلاشرکت غیرے مالک ہے...... تُو ہی سلطان ہے اور تُو ہی بادشاہ ہے..... بے شمار فرشتے تیرے آگے سجدہ ریز رہتے ہیں اور ہمہ وقت تیری تسبیح کرتے ہیں۔ شجر و حجر، کوہسار و سمندر، نباتات و جمادات، شمس و قمر اور لیل و نہار اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ تُو "صمد" ہے...... اور تجھے اپنی مخلوق کی اطاعت کی قطعاً حاجت نہیں...... تُو ہر شے سے بے نیاز ہے...... یہ تو تیرا احسانِ عظیم ہے اور بے مثال شانِ کرم ہے کہ تُو اپنے بھٹکے ہوئے بندوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرتا ہے..... اور اُنہیں اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرماتا ہے...... مجھ پر بھی اپنی لازوال قدرت سے یہ راز فاش کر دے کہ میں تیری محبت میں کہاں تک پہنچا ہوں۔ اور مجھ گناہ گار کا اس کوچے میں کیا مقام ہے؟ جب تک تُو اپنے فضل سے میرا یہ سوال پورا نہیں کرے گا، اس وقت تک میں پانی سے باہر نہیں آؤں گا۔" یہ کہہ کر احمد قندھاری نے آنکھیں بند کر لیں اور انتظار کرنے لگے کہ غیب سے ان کے سوال کا کیا جواب آتا ہے۔ جب کچھ دیر تک کسی قسم کے آثار ظاہر نہیں ہوئے تو احمد قندھاری نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے جانگداز لہجے میں خالق کائنات کو پکارا۔

''اے مالک الملک! میں قسم کھا چکا ہوں......اور تجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کہ میری قسم کی آبرو رکھ لے۔ نمازِ فجر کا وقت گزرا جا رہا ہے......اگر تُو میرے سوال کا جواب نہیں دے گا تو میں پانی سے باہر کیسے آؤں گا اور نماز کس طرح ادا کروں گا؟''

ابھی جنگل کی فضاؤں میں احمد قندھاری کے الفاظ کی گونج باقی تھی کہ یکایک ایک صدائے غیبی سنائی دی۔

''ہماری بارگاہِ کرم میں تیرا مرتبہ یہ ہے کہ قیامت کے دن کئی گناہ گار لوگ تیرے طفیل دوزخ سے نکال کر جنت الفردوس میں داخل کئے جائیں گے۔''

احمد قندھاری نے دوبارہ عرض کیا۔ ''اے ارحم الراحمین! تیری رحمتوں کا کوئی شمار نہیں ہے۔ بے شک! تُو مجھ گناہ گار کی وجہ سے اپنے کئی بندوں کو بخش دے گا۔ مگر تیری یہ بخشش و عطا میرے لئے کافی نہیں ہے۔ اے ذاتِ بے نیاز! تُو میری کوتاہیٔ داماں کی طرف نہ دیکھ بلکہ اپنی شانِ کرم کا اندازہ کر۔''

دوسری بار صدائے غیب سنائی دی۔ ''یاد رکھ کہ تمام طالب ہمارے عاشق ہیں۔ مگر ہم نے کمالِ رحمت سے تجھے معشوق بنایا۔''

یہ سنتے ہی احمد قندھاری نے اللہ کا نعرہ بلند کیا اور دریا سے باہر آ کر نمازِ فجر ادا کی۔ پھر اس قدر طویل سجدۂ شکر ادا کیا کہ سورج نکل آیا۔ پھر جب کسان اپنی زمینوں پر جانے کے لئے ادھر سے گزرے تو انہوں نے ایک شخص کو اس طرح سجدہ ریز پایا کہ اس کا جسم بے حرکت تھا۔ کچھ لوگ تو یہ منظر دیکھ کر گزر گئے.....مگر بعد میں آنے والوں نے یہی سمجھا کہ اس شخص کی سجدے کی حالت میں موت واقع ہو گئی۔ پھر ایک راہ گیر، احمد قندھاری کے قریب آیا اور اس نے آواز دی۔

''میرے بھائی! تمہارا کیا حال ہے؟''

احمد قندھاری نے کوئی جواب نہیں دیا تو اُس راہ گیر کو یقین آ گیا کہ یہ شخص مر چکا ہے۔ پھر وہ اجنبی جھکا اور اس نے آہستہ سے احمد قندھاری کے جسم کو ہلایا۔ اگر وہ مردہ ہوتے تو ذرا سی حرکت سے زمین پر گر جاتے۔ مگر جب اپنی جگہ پر قائم رہے تو اجنبی نے کان لگا کر سنا۔

احمد قندھاری مسلسل ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کی گردان کر رہے تھے۔ مگر انہیں ہوش نہیں تھا۔ اجنبی شخص اُنہیں زندہ سمجھ کر اپنے راستے پر آگے بڑھ گیا۔

پھر جب احمد قندھاری طویل سجدۂ شکر ادا کر کے خانقاہ کی طرف لوٹے تو ہر شخص ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

''وہ دیکھو! شیخ احمد معشوق تشریف لا رہے ہیں۔''

اسی روز سے ''معشوق'' کا لفظ آپ کی ذاتِ گرامی کا حصہ بن گیا۔ تمام تذکرہ نگار، شیخ احمد معشوقؒ ہی کے نام سے آپ کی سوانح اور سیرت بیان کرتے ہیں۔ اس واقعے کے بعد شیخ احمدؒ کی ذات میں دوسری تبدیلی یہ نمایاں ہوئی کہ آپؒ پر اکثر اوقات جذب اور بے خودی کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ پھر یہ جذب اس قدر بڑھا کہ حضرت شیخ احمد معشوقؒ سے نماز بھی چھوٹ گئی۔

آپ کی یہ حالت دیکھ کر علمائے ملتان نے بیک قلم فتویٰ تحریر کیا کہ کسی مسلمان کے لئے ترکِ نماز جائز نہیں...... جب تک کہ وہ صحت مند بھی ہو اور ہوش و حواس بھی رکھتا ہو۔

پھر جب کسی شخص نے حضرت شیخ احمد معشوقؒ سے علمائے ملتان کے اس فتوے کا ذکر کیا تو آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''مفتیانِ وقت اپنا کام جاری رکھیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔ جب میں ان کے راستے میں

رکاوٹ نہیں بنتا تو وہ میری راہ میں کیوں حائل ہوتے ہیں؟''

حضرت شیخ احمد معشوقؒ کے ان الفاظ کی گونج پورے ملتان میں سنائی دی۔ یہاں تک کہ علماء کے حلقے میں ایک مجذوب کی باتوں پر شدید ردِعمل ظاہر ہوا۔ پھر کئی نامور علماء پر مشتمل ایک جماعت حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ایک مفتی نے نہایت تلخ لہجے میں حضرت شیخ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا جاہل مرید شہر میں ہنگامے برپا کرتا پھر رہا ہے۔''

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کو مفتی کا یہ اندازِ تکلم سخت گراں گزرا مگر آپؒ نے درویشانہ ضبط وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کون کتنا علم رکھتا ہے۔ مگر میرے مرید، شیخ احمد معشوق نے آپ کو کیا تکلیف پہنچائی ہے؟''

''آپ کا مرید، شیخ احمد معشوق تارکِ نماز ہے اور جب اسے نماز کی اہمیت سمجھائی جاتی ہے تو وہ برملا لوگوں سے کہتا ہے کہ مفتیانِ وقت اپنا کام کرتے رہیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔''

''شیخ احمد معشوق کی اس بات سے تو ایسا کوئی پہلو نہیں نکلتا جس سے علماء کی تحقیر کا اظہار ہوتا ہو'' حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے علماء کی جماعت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔

''شیخ احمد معشوق نے ہماری نہیں، اسلام کی تحقیر کی ہے۔'' دوسرے عالم نے اسی طرح تلخ اور ناگوار لہجے میں کہا۔ ''ایک بے نماز شخص درویش کس طرح ہو سکتا ہے؟ اپنے مرید کو روکیے۔ ورنہ لوگ اس کے طرزِ عمل کو اپنا لیں گے۔''

''جب دوسرا احمد معشوق ہے ہی نہیں تو پھر کوئی اس کی نقل کیسے کرے گا؟'' حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے علمائے ملتان کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی پُرجلال لہجے میں فرمایا۔

''حیرت ہے کہ آپ جیسا بزرگ اپنے مرید کا غلط دفاع کر رہا ہے۔'' ایک اور عالم نے شیخ احمد معشوقؒ کی آڑ میں حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی ذاتِ گرامی کو بھی تنقید کا ہدف بناتے ہوئے فرمایا۔

دراصل واقعہ یہ تھا کہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ صرف اہلِ ملتان ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام مسلمانانِ ہند کی نظروں میں محبوب ومحترم تھے۔ اور اسی عظمت ومحبوبیت کے باعث علمائے ظاہر، حضرت شیخ سے حسد رکھتے تھے۔ ملتان میں سینکڑوں بے نمازی تھے مگر علماء کی اس جماعت نے اتنی سختی کے ساتھ ان کی گرفت نہیں کی۔ شیخ احمد معشوقؒ کی ذات کو طنز وملامت کا نشانہ اس لئے بنایا گیا کہ وہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے مرید خاص تھے۔

''کسی غلط کام پر جھوٹی تاویل پیش کر کے میں تو خود اپنا دفاع بھی نہیں کرتا۔ کسی دوسرے کا کیا ذکر؟'' حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اسی باوقار لہجے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ''انسان کو سب سے زیادہ اپنی جان اور ذات عزیز ہوتی ہے۔ مگر میں شریعت کے معاملے میں اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کرتا۔ شیخ احمد معشوق تو پھر میرے مرید ہیں۔ میں ناجائز طور پر ان کا دفاع کیوں کروں گا؟''

''ایک مرشد کی حیثیت سے بڑی ذمے داری آپ پر عائد ہوتی ہے کہ اپنے مرید کو نماز کی تلقین کریں۔'' ایک اور عالم نے انتہائی طنز آمیز لہجے میں کہا اور حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''شیخ! احمد معشوق، نماز کی حقیقت کو خوب جانتے ہیں۔ اور انہوں نے برسوں بڑے ذوق وشوق کے ساتھ نماز باجماعت ادا کی ہے۔''

یہ کہتے کہتے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے چہرۂ مبارک پر ہلکا سا ناگواری کا رنگ اُبھر آیا۔ ''اور آپ

حضرات کو کیا معلوم کہ شیخ احمد معشوق کس طرح نماز ادا کرتے تھے۔ میں نے اور خانقاہ کے دوسرے لوگوں نے کھلی آنکھ سے دیکھا ہے کہ انہوں نے ایک سجدے میں پوری رات گزار دی ہے۔"

یہ سن کر چند لمحوں کے لئے علماء کے چہروں پر شدید حیرت کا رنگ اُبھر آیا۔ مگر فوراً ہی ان لوگوں نے جارحانہ روش اختیار کر لی۔ "پھر شیخ احمد معشوق نے نماز سے کیوں منہ موڑ لیا؟"

"شیخ احمد معشوق دنیا سے تو منہ موڑ سکتے ہیں مگر نماز سے نہیں۔" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ "بس وہ کچھ دنوں سے اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔"

"انہیں ہوش میں لانا چاہئے۔" علمائے ملتان نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیف و مستی بھی ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں۔"

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے جواباً فرمایا۔ "شیخ احمد معشوق نے جان بوجھ کر یہ روش اختیار نہیں کی ہے۔ وہ مدہوش کئے گئے ہیں مگر اس طرح جذب و مستی کی حالت میں بھی اپنے مالک کی یاد سے غافل نہیں ہیں۔"

شیخ احمد معشوقؒ کے سلسلے میں علمائے ملتان نے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا یہ عذر قبول نہیں کیا۔ "یہ سب بے عمل صوفیوں کا بہانہ ہے..... کیا تم غیب کی خبر رکھتے ہو کہ شیخ احمد معشوق کو مدہوش کیا گیا ہے؟" علمائے ملتان کے لہجے میں وہی جارحیت جھلک رہی تھی۔

"غیب کا علم تو صرف حق تعالیٰ کی ذاتِ مبارک کو ہے مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنے کرم سے آگہی بخش دیتا ہے۔" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اسی ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "آپ حضرات کوشش کر دیکھیں۔ شاید احمد معشوق اپنے ہوش میں آ جائیں۔ مگر جہاں تک میرا مشاہدہ ہے، ان کے لئے اسی حالت کو مقدر کر دیا گیا ہے۔"

آخر علماء کی یہ جماعت حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی خانقاہ سے نکل کر حضرت شیخ احمد معشوقؒ کی تلاش میں روانہ ہوئی۔ بہت دوڑ دھوپ اور جستجو کے بعد ملتان کے علمائے ظاہر کو اپنے وقت کا سب سے بڑا مجذوب نظر آیا۔ اس وقت حضرت شیخ احمد معشوقؒ دریا کے کنارے خاموش بیٹھے تھے۔ اور ان کی نظریں پانی کی موجوں پر مرکوز تھیں۔

"السلام علیکم!" ایک عالم نے حضرت شیخ احمد معشوقؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔" شیخ معشوق نے جواب دیا۔ اب علماء، حضرت شیخ احمد معشوقؒ سے مخاطب ہوئے۔ "کون کہتا ہے کہ تم اپنے ہوش میں نہیں ہو؟"

"میں نے تو کسی سے یہ بات نہیں کی۔" حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے جواباً کہا۔ مگر اُن کی نظریں مسلسل دریا کی لہروں پر مرکوز تھیں۔

"ساری دنیا کہتی ہے۔" ایک عالم نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"برسوں پہلے اس دنیا سے شناسائی تھی۔" حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے اسی بے نیازانہ لہجے میں فرمایا۔ "اب تو میں دنیا نام کی کسی شے کو جانتا تک نہیں۔"

"مگر تمہارے پیر و مرشد بھی یہی کہتے ہیں کہ تم ہوش میں نہیں ہو۔" ایک عالم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

پیر و مرشد کا نام سنتے ہی حضرت شیخ احمد معشوقؒ کھڑے ہو گئے اور پہلی بار علمائے ملتان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر حضرت شیخ فرماتے ہیں تو پھر سچ فرماتے ہیں۔ واقعتاً میں بے ہوش ہوں۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔"

حضرت شیخ احمد معشوقؒ کا جواب سن کر علمائے ملتان سخت برہم ہو گئے۔ "تم نے ہمارے ہر سوال کا درست جواب دیا۔ کیا کوئی بے ہوش انسان اس قدر ہوش کی باتیں کر سکتا ہے؟"

حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ "میں آپ حضرات سے اپنی دیوانگی یا ہوش مندی کی سند نہیں مانگ رہا ہوں۔"

"بے شک! تم کسی سے سند نہیں مانگ رہے ہو۔ لیکن آج تمہیں اپنی سند دینی پڑے گی۔" ملتان کے دوسرے عالم نے سخت لہجے میں کہا۔

"کس بات کی سند؟" حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے اسی بے نیازانہ لہجے میں کہا۔

"کیا تم مسلمان ہو؟" ایک اور عالم نے سوال کیا جو مفتی کے عہدے پر فائز تھے۔

"ماں باپ نے نام تو مسلمانوں جیسا رکھا ہے۔ مگر یہ راز جاننے والا ہی جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟" یہ کہتے کہتے حضرت شیخ احمد معشوقؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اس بہانہ سازی سے کام نہیں چلے گا۔" دوسرے عالم نے نہایت طنز آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر تم مسلمان ہو تو پھر کام بھی مسلمانوں جیسے کرنے ہوں گے۔"

"تم اپنا کام کرو اور مجھے میرا کام کرنے دو۔" اب کی بار حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے نہایت پُرجلال لہجے میں کہا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر "اللہ اکبر!" کا نعرہ بلند کیا اور ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

"فوائد الفواد" میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات ہیں جنہیں آپؒ کے مرید خاص، حضرت خواجہ حسن علائیؒ نے مرتب کیا ہے۔ "فوائد الفواد" کی روایت کے مطابق ایک دن حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی مجلس روحانی آراستہ تھی اور حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت شیخ احمد معشوقؒ کے واقعات اس طرح سنا رہے تھے کہ آپؒ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

پھر جب حضرت نظام الدینؒ خاموش ہوئے تو ایک مرید نے کھڑے ہو کر بصد احترام عرض کیا۔ "سیّدی! حضرت شیخ احمد معشوقؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ نماز نہیں پڑھتے تھے۔"

مرید کا سوال سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کچھ دیر خاموش رہے، پھر حاضرین مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے اس طرح نماز ادا کی ہے کہ بہت کم لوگ سجدے کی لذت سے واقف ہوں گے۔ واقعتاً ان کی نماز، نماز تھی۔ وہ قربت و حضوری کی منزل میں رہتے تھے۔

"پھر ایسے مردِ باصفا نے نماز کیوں ترک کر دی؟" اسی مرید نے دوبارہ عرض کیا۔

"وہ شیخ کی مجبوری تھی۔" یہ کہتے کہتے محبوبِ الٰہیؒ ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئے۔ حضرت احمد معشوقؒ کے جذب و کیف کی یہ حالت دیکھ کر علمائے ملتان ان کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ مفتیٔ شہر کا مطالبہ تھا کہ اگر وہ مسلمان ہیں تو انہیں ہر حال میں نماز ادا کرنی ہوگی۔ حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے کچھ دن تک بات کو ٹالنے کی کوشش کی اور علماء سے بھاگتے رہے۔ "تمہیں اپنی قبر میں جانا ہے اور مجھے اپنی قبر میں۔ پھر تم لوگ کیوں میرے پیچھے پڑے ہو؟"

علمائے ملتان کی ایک ہی ضد تھی۔ "ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ایک بے خبر انسان کو خبردار کریں۔ اور ایک بے راہ شخص کو سیدھا راستہ دکھائیں۔"

بالآخر جب علمائے ملتان کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو حضرت احمد معشوقؒ نماز پڑھنے پر آمادہ ہو گئے۔ "میں نماز پڑھوں گا مگر میری ایک شرط ہے۔" حضرت احمد معشوقؒ نے علماء کی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''کیسی شرط؟'' مفتیٔ شہر نے حضرت معشوقؒ سے سوال کیا۔
''میں نماز پڑھوں گا مگر سورۃ فاتحہ کی تلاوت نہیں کروں گا۔'' حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے جواباً فرمایا۔
''سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بغیر نماز ادا نہیں کی جاسکتی۔'' ایک عالم نے کسی قدر ناگوار لہجے میں کہا۔
''چلو میں سورۃ فاتحہ کی تلاوت کرلوں گا مگر اپنی زبان سے ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' نہیں کہوں گا۔'' حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے فرمایا۔

یہ سنتے ہی مفتیٔ شہر غضب ناک لہجے میں کہنے لگا۔ ''کبھی یہ شرط رکھتے ہو کہ سورۃ فاتحہ نہیں پڑھوں گا اور کبھی کہتے ہو کہ ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' نہیں پڑھوں گا۔ کیا تم ارکانِ نماز میں تحریف کرنا چاہتے ہو؟''

یہ سنتے ہی حضرت شیخ احمد معشوق پر لرزہ طاری ہوگیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''معاذ اللہ! مجھ جیسا گناہ گار، اللہ کے دین میں ترمیم یا تحریف کرے گا؟ اگر ذہن میں یہ خیال آ جائے تو اسی وقت میری موت واقع ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ آپؒ نے با آواز بلند سورۃ فاتحہ کی تلاوت شروع کی۔ پھر ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' کہا تو حضرت احمد معشوقؒ کے جسم کے تمام مسامات سے خون جاری ہوگیا اور چند لمحوں میں پورا لباس لہو سے تر ہو گیا۔

نماز کے سلسلے میں یہ شرعی نکتہ ہے کہ جسم سے خون نکلنے پر وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس حالت میں نماز جاری نہیں رکھی جاسکتی۔

حضرت شیخ احمد معشوقؒ نے نیت توڑ دی اور علمائے ملتان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''صاحبو! میری حالت ایک حائضہ عورت کی طرح ہے۔ اس صورت میں نماز کس طرح جائز ہوسکتی ہے؟''

یہ تھے حضرت شیخ احمد معشوقؒ، جو حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے فیضانِ نظر سے اس منزل کو پہنچے۔

اب ہم حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ایک ایسے واقعہ کا ذکر کریں گے جو سلسلۂ سہروردیہ کے عقیدت مندوں میں بہت زیادہ شہرت رکھتا ہے۔

''سیر العارفین'' میں حامد بن فضل اللہ جمالی کی روایت ہے کہ جب سلطان غیاث الدلن بلبن نے اپنے بڑے لڑکے، قدر خان کو ملتان کا علاقہ عنایت کیا تو اس وقت حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی بزرگی کا شہرہ دُور دُور تک تھا۔ نتیجتاً قدر خان بھی حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعاؤں کا طالب ہوا۔ شہزادہ قدر خان نہایت خوش طبع اور لطیف مزاج نوجوان تھا۔ اگرچہ وہ خود تو شعر نہیں کہتا تھا لیکن اس کے دربار میں اہلِ کمال جمع رہتے تھے اور موقع بہ موقع گراں قدر انعامات پاتے تھے۔ شہزادہ قدر خان، صاحبانِ علم و فضل کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس کی ایک بیوی نہایت حسین و جمیل تھی۔ شہزادہ قدر خان اپنی شریکِ حیات سے بے حد محبت کرتا تھا مگر تمام خوبیوں کے باوجود اُسے شراب نوشی کی لت پڑ گئی تھی۔ قدر خان کی بیوی خود بھی شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ سلطان شمس الدین التمش کے بیٹے سلطان رکن الدین کی لڑکی تھی۔ اور شوہر کی کثرتِ بادہ خواری سے ہمیشہ نالاں رہتی تھی۔ اس نے کئی بار قدر خان سے کہا تھا کہ وہ شراب نوشی ترک کردے مگر شہزادے نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ آخر ایک دن بات بگڑ گئی۔ شہزادہ قدر خان، تنک مزاج اور زود رنج نوجوان تھا۔ بیوی کی یہ بات سن کر برہم ہو گیا اور اس نے کھڑے کھڑے شہزادی کو تین طلاقیں دے دیں۔

شہزادہ قدر خان دو تین دن تک تو بیوی کی جدائی برداشت کرتا رہا۔ مگر جب دل کے ہاتھوں مجبور ہوگیا تو اس نے علمائے ملتان کو خلوت میں طلب کر کے عرض کیا۔ ''میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ مجھے اس اذیت ناک صورت

حال سے نجات دلائی جائے۔ میں شہزادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

علمائے ملتان نے بیک زبان کہا۔ "شہزادہ معظم! طلاق تو واقع ہو چکی.....اب حلالے کے بغیر شہزادی سے آپ کا ازدواجی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔"

فقہ کی اصطلاح میں "حلالہ" وہ شکل ہے کہ طلاق شدہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور پھر دوسرا شوہر اسے طلاق دیدے۔ اس کے بعد وہ اپنے پہلے شوہر سے نکاح کر لے اور اُس کے حلقہ زوجیت میں داخل ہو جائے۔"

شہزادہ قدر خان نے علمائے ملتان کی دلیل سنی تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ کسی صورت میں یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بیوی کسی دوسرے کی زوجیت میں چلی جائے۔ "آپ حضرات کا بہت بہت شکریہ!" یہ کہہ کر شہزادہ قدر خان نے قاضی امیرالدین خوارزمی کو خلوت میں طلب کیا۔ یہ مرد بزرگ، شہزادہ قدر خان کے ہم دم، ہم راز تھے۔

"قاضی صاحب! اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" شہزادہ قدر خان نے امیرالدین خوارزمی سے پوچھا۔

"شہزادے! میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟" قاضی امیرالدین نے کہا۔ "جو علماء کی رائے ہے، وہی میری رائے ہے۔ طلاق تو واقع ہو چکی۔ اب رفاقت وصحبت کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے، جو صاحبانِ علم آپ کے سامنے بیان کر چکے ہیں۔"

"اگر میں شہزادی کو اسی حالت میں بلا لوں تو قیامت کے دن گناہ گار اُٹھوں گا۔" شہزادے قدر خان نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "اور اگر اپنی بیوی کو چھوڑ دوں تو مجھ میں جدائی کی طاقت نہیں ہے۔"

قاضی امیرالدین خوارزمی بہت دیر تک غور وفکر میں ڈوبے رہے۔ آخر انہوں نے ایک مناسب راستہ تلاش کر لیا۔

"یہاں ملتان میں حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ جیسے فرشتہ صفت انسان موجود ہیں۔ ہم شہزادی کا نکاح ان سے کرائے دیتے ہیں۔ پھر وہ کچھ دن بعد طلاق دیدیں گے۔ اور اس طرح آپ شہزادی کے ساتھ دوبارہ رشتہ قائم کر سکیں گے۔"

شہزادہ قدر خان کو یہ بات پسند نہ تھی مگر شیخ صدرالدین عارفؒ کی ذاتِ گرامی کو دیکھتے ہوئے چار و ناچار رضامند ہو گیا۔ قاضی امیرالدین خوارزمی، حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر بڑی رازداری کے ساتھ یہ مرحلہ انجام پذیر ہو گیا۔

کچھ دن بعد شہزادہ قدر خان نے قاضی امیرالدین خوارزمی سے کہا۔ "حضرت شیخ کی خدمت میں جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ شہزادی کو طلاق دے دیں۔"

قاضی امیرالدین خوارزمی، شہزادے کے حکم کے مطابق حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قدر خان کا پیغام سنایا۔ حضرت شیخ نے قاضی امیرالدین کی بات سن کر تامل فرمایا۔

"کیا آپ شہزادی کو طلاق دینا نہیں چاہتے؟" قاضی امیرالدین خوارزمی نے گھبرا کے پوچھا۔

"میں تو حسبِ وعدہ طلاق دینا چاہتا ہوں مگر شہزادی اس بات پر آمادہ نہیں ہیں۔" حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے فرمایا۔ "تاہم میں ان سے دوبارہ دریافت کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ خلوت میں تشریف لے گئے اور شہزادی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ "شہزادہ قدر خان کا قاصد یہ پیغام لے کر آیا ہے کہ میں

تمہیں طلاق دے دوں۔"

یہ سنتے ہی شہزادی، حضرت شیخ عارفؒ کے قدموں سے لپٹ گئی اور رو رو کر عرض کرنے لگی۔ "اس کنیز کو اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو میں روزِ حشر اپنے اللہ سے انصاف کی طالب ہوں گی۔"

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے فرمایا۔ "اب میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا اور شہزادہ قدر خان کے قاصد کو ناکام و نامراد واپس لوٹا دوں گا۔" یہ کہہ کر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ مردانے میں تشریف لائے اور قاضی امیرالدین خوارزمی سے صاف صاف کہہ دیا۔ "شہزادی کو یہ بات پسند نہیں کہ میں اُنہیں طلاق دے دوں۔"

یہ سن کر قاضی امیرالدین بدحواس ہو گئے اور پھر اسی حالت میں شہزادہ قدر خان کے پاس پہنچے۔ شہزادے نے ان کا زرد چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ لیا کہ صورتِ حال بگڑ گئی ہے۔ تاہم اس نے اتمام حجت کے لئے قاضی صاحب سے پوچھا۔ "کیا حضرت شیخ نے انکار کر دیا ہے؟"

قاضی امیرالدین خوارزمیؒ نے کانپتی ہوئی آواز کے ساتھ پورا واقعہ سنا دیا۔

پھر جیسے ہی قاضی صاحب خاموش ہوئے، شہزادہ قدر خان نے اپنی شمشیر کھینچ لی اور غضب ناک لہجے میں کہا۔ "تُو ہی اس فتنے کی بنیاد ہے۔ اس سے پہلے تیرا ہی کام تمام کر ڈالوں۔"

قاضی امیرالدین خوارزمی، موت کے خوف سے لرزنے لگے اور انہوں نے آگے بڑھ کر شہزادہ قدر خان کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ "حضور! میں نے تو یہ آپ ہی کی بھلائی کے لئے کیا تھا۔ اگر شیخ عارف اپنے وعدے سے منکر ہو گئے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

قاضی صاحب کی گریہ وزاری رنگ لائی۔ شہزادہ قدر خان نے اپنی شمشیر بے نیام کر لی۔ پھر غضب ناک لہجے میں کہنے لگا۔ "تجھ جیسے آدمی کا خون بہانے سے کیا فائدہ؟ اگر شیخ کے خون سے ان کے گھر کو نہ رنگ دیا تو پھر میں اس عورت سے بھی کم ہوں جو اس وقت ان کے گھر میں بیٹھی ہے۔"

شہزادہ قدر خان نے حضرت شیخ عارفؒ کے قتل کی قسم کھا لی تھی۔ پھر اس نے اپنے دس ہزار سواروں کو اس حکم کے ساتھ طلب کیا کہ اگر کوئی سپاہی وقت مقررہ پر حاضر نہ ہوا تو وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

شہزادے کا فرمان سنتے ہی فوج میں ہلچل مچ گئی۔ اس روز قدر خان نے نہ کھانا کھایا اور نہ شراب پی۔ پھر یہ خبر پورے شہر میں عام ہو گئی کہ ولی عہد سلطنت، حضرت شیخ عارفؒ کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے والا ہے۔ حضرت شیخ کے مریدوں اور عقیدت مندوں پر لرزہ طاری تھا مگر حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے فرزندِ اکبر انتہائی طمانیت و آسودگی کے ساتھ وعظ بیان کرنے میں مشغول تھے۔

اس سے پہلے کہ شہزادہ قدر خان اپنی قسم پوری کرتا، اچانک اسے خبر ملی کہ بیس ہزار مغل فوج نے ملتان پر حملہ کر دیا ہے۔ اس وقت مغلوں کی قیادت سالار تیمور خان کر رہا تھا۔ شہزادہ قدر خان نے اس سے پہلے بھی بڑے بڑے مغل سرداروں کو قتل کیا تھا۔ اب تیمور خان ان ہی سرداروں کا بدلہ لینے کے لئے ملتان پر حملہ آور ہوا تھا۔ تیمور خان دریا عبور کر کے شہزادہ قدر خان کے ساتھ مصروفِ جنگ ہو گیا۔ شہزادے کے جانباز سپاہیوں نے شمشیر زنی اور تیر اندازی کے ایسے جوہر دکھائے کہ نامی گرامی مغل سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تیمور خان اپنا لشکر لے کر فرار ہو گیا۔ شہزادہ قدر خان کے سپاہیوں نے اس موقع پر عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مغلوں کا تعاقب کیا اور بہت دُور نکل گئے۔ شہزادہ قدر خان نے نمازِ ظہر ادا کرنے کے لئے دریا کے کنارے جانماز بچھائی اور اپنے پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ عبادت میں مشغول ہو گیا۔ اسی اثناء میں دو ہزار مغل فوجی سپاہیوں کا ایک دستہ جو کمین

گاہ میں چھپا ہوا تھا، موقع پا کر باہر نکلا اور اس نے شہزادے پر حملہ کر دیا۔ مختصر سے فوجی دستے نے بڑی جانبازی کے ساتھ مغلوں کا مقابلہ کیا۔ وہ وقت قریب تھا کہ مغل، میدانِ جنگ سے فرار ہو جاتے مگر اس سے پہلے ایک دشمن سپاہی کا زہر آلود تیر، شہزادے قدر خان کی گردن میں پیوست ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی روح قفس سے پرواز کر گئی۔ امیرِ لشکر کے مرتے ہی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ مغلوں نے شہزادہ قدر خان کے سپاہیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں نابغہ روزگار شاعر اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید خاص، امیر خسروؒ بھی شامل تھے۔ پھر یہ خبر حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے مریدوں اور عقیدت مندوں تک پہنچی تو سب لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت شیخ کی تاریخ ساز کرامت سے تعبیر کیا۔ اس کے بعد شہزادی نے حضرت شیخ عارفؒ کی محبت میں رہ کر سلوک کی منازل طے کیں اور معرفت میں مقام حاصل کیا۔

جب ہم تاریخ کے حوالے سے اس واقعے کا جائزہ لیں گے تو یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے سب سے بڑے بیٹے کا نام، شہزادہ محمد سلطان تھا اور وہ تاریخ ہند میں ''خان شہید'' کے نام سے مشہور ہے۔ حامد بن فضل اللہ جمالیؒ نے شہزادہ محمد سلطان کی جگہ قدر خان کا ذکر کیا ہے جو سند کے اعتبار سے غلط ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مشہور مؤرخ، قاسم فرشتہ نے بھی حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ اسی واقعے کو بیان کیا ہے۔ فرشتہ کے بقول وہ شہزادہ قدر خان نہیں تھا بلکہ شہزادہ محمد سلطان (خان شہید) تھا جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ بعد میں جو واقعات پیش آئے، وہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کئے جا چکے ہیں۔ ایک طرف شہزادہ محمد سلطان کی درشتی کا یہ حال ہے کہ وہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ جیسے بزرگ کے خون سے ان کے گھر کو رنگین کرنے کی قسم کھاتا ہے اور شہزادے کی بلند کرداری کا یہ عالم ہے کہ وہ بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں کا ممدوح تھا۔ خود قاسم فرشتہ کے الفاظ ہیں۔

''شہزادہ محمد سلطان (خان شہید) سلطان غیاث الدین بلبن کا محبوب ترین فرزند تھا۔ شہزادہ خان شہید بہترین اوصاف اور عمدہ اخلاق کا مالک تھا۔ عقل و خرد اور ہنر پروری میں بلاشبہ وہ اپنے زمانے کا بہترین انسان تھا۔ اس کی محفلوں میں ہمیشہ نامی گرامی علماء، فضلاء اور مایہ ناز شعراء کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں کے ساتھ نہایت لطف و کرم سے پیش آتا تھا۔ شہزادہ خان شہید، ہنرمندوں اور مستحقین کی جی کھول کر مدد کرتا تھا۔ وہ اس قدر مہذب اور سلیقہ مند تھا کہ اگر دن رات کسی محفل میں بیٹھتا، تب بھی اپنا زانو بلند نہ کرتا۔ شہزادہ خان شہید کی تہذیب و شائستگی کا یہ عالم تھا کہ نشے کی حالت میں بھی اس کی زبان سے کوئی غیر مہذب کلمہ ادا نہ ہوتا تھا۔ اگر کبھی کوئی شخص، خان شہید کی مجلس میں کوئی نصیحت آمیز شعر پڑھتا تو وہ دنیا کے غلاف کو دل سے نکال کر بڑی توجہ کے ساتھ شعر کو سنتا اور شعر کے مضمون سے متاثر ہو کر زار و قطار روتا۔ اس نے حضرت شیخ سعدیؒ کے لئے دو بار قیمتی تحائف ارسال کئے اور بزرگ شاعر کو ملتان آنے کی دعوت دی۔ مگر حضرت شیخ مصلح الدین سعدیؒ نے اپنی ضعیفی کی وجہ سے معذرت کر لی۔ تاہم انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے اشعار اور غزلیات لکھ کر بطور تحفہ شہزادے کی خدمت میں روانہ کیں۔ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت خواجہ حسن سنجریؒ، شہزادہ کے مصاحبینِ خاص میں شامل تھے۔

جس زمانے میں شہزادہ خان شہید، ملتان میں مقیم تھا، مشہور بزرگ حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ ملتان تشریف لائے۔ خان شہید نے ان کی بہت تعظیم کی۔ قیمتی نذریں پیش کیں اور اس کے ساتھ ہی درخواست کرتے ہوئے کہا۔

''اگر شیخ یہاں قیام کرنا پسند فرمائیں تو حکومت کے خرچ سے خانقاہ تعمیر کرا دی جائے گی۔''

مگر حضرت شیخ عثمان ترمذیؒ نے ملتان میں رہنا پسند نہیں کیا اور واپس چلے گئے۔ مؤرخ قاسم فرشتہ ہی کی

روایت ہے کہ ایک روز حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ اور حضرت شیخ عثمان ترمذی، شہزادہ خان شہید کی مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ کسی خوش الحان شخص نے عربی کے کچھ اشعار پڑھے جنہیں سن کر دونوں بزرگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ شہزادہ خان شہید، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ اور حضرت شیخ عثمانؒ کے سامنے بہت دیر تک دست بستہ کھڑا رہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔

جس شہزادے کی بلند کرداری پر حضرت شیخ سعدیؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت خواجہ حسن سنجریؒ اور ہزاروں عالم و فاضل انسان گواہی دیتے ہوں، اس پر یہ الزام عائد کرنا کہ وہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا خون بہانا چاہتا تھا، ایک سفاکانہ تہمت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے ساتھ بھی بڑا ظالمانہ سلوک ہے کہ ایک بے سروپا روایت کو آپؒ کی ذاتِ گرامی سے منسوب کیا گیا اور اس پر فخر کرنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ خدا ہم سب کی زبان و قلم کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔

کم فہم عقیدت مندوں نے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے حوالے سے ایک جھوٹی روایت ثابت کر دی کہ اسے ایک تاریخی کرامت سے تعبیر کیا جائے۔ حالانکہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کا روحانی درجہ ان بے بنیاد قصوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔

حضرت شیخ مولانا حسام الدینؒ، حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ کے ایک باکمال مرید تھے۔ حضرت خواجہ حسن سنجریؒ نے اپنی تالیف ''فوائد الفواد'' میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حوالے سے مولانا حسام الدینؒ کے کئی واقعات بیان کئے ہیں۔ ایک بار مولانا حسام الدینؒ ہندوستان کے تاریخی شہر بدایوں میں مقیم تھے۔ ایک دن مولانا محترم نے سرورِ کونین حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ پیغمبرِ اسلام ﷺ ایک مقام پر بیٹھے وضو فرما رہے تھے۔ صبح آپؒ کی آنکھ کھلی تو شدید اضطراب کے عالم میں اس مقام پر پہنچے۔ حیرت انگیز طور پر وہاں کی زمین پانی سے گیلی تھی۔ یہ دیکھ کر مولانا حسام الدینؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپؒ نے بے قرار ہو کر اس جگہ کو بوسہ دیا اور پھر اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

''اگر دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو اسی جگہ میری قبر تعمیر کرنا۔''

پھر کچھ دن بعد مولانا حسام الدینؒ ملتان پہنچے۔ خود ان کا ہی ایک بیان ہے کہ ایک دن پیر و مرشد حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ، حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کی روح کو ایصالِ ثواب کرنے کے بعد مزارِ مبارک سے باہر تشریف لائے تو میرے دل میں خیال آیا کہ حضرت شیخ کی پائینتی ایک قبر کی زمین کے لئے درخواست کروں۔ شاید اللہ کے ولی کی قربت کے باعث مجھے نجات حاصل ہو جائے ابھی میرے دل میں یہ خیال گزرا ہی تھا کہ حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ میری طرف متوجہ ہوئے اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

''مولانا حسام الدین! میری طرف سے تمہاری قبر کی زمین کے لئے کوئی عذر نہیں ہے۔ لیکن حضرت رسالت پناہ ﷺ نے تمہارے مزار کے لئے زمین شہر بدایوں میں تجویز فرمائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری مٹی وہیں کی ہوگی۔''

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ فرمایا کرتے تھے۔ ''حدیث قدسی میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہے ''لا الٰہ الا اللہ'' میرا قلعہ ہے۔ جو کوئی اس کے اندر داخل ہوا، میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔''

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے اس حدیث قدسی کی تشریح اس طرح فرمائی ہے۔ ''قلعے کی تین قسمیں ہیں۔ ظاہر، باطن اور حقیقت۔ قلعہ ظاہر ہے کہ بندہ، حق تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف زدہ نہ ہو اور کسی سے کوئی اُمید نہ رکھے۔ اگر تمام دنیا کے لوگ بھی اس کے دشمن ہو جائیں تو اس بات سے خائف نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ حق

تعالیٰ کے حکم کے بغیر نفع وضرر اور خیر وشر کا ظہور نہیں ہوتا۔ قلعہ باطن یہ ہے کہ بندے کو یقین ہونا چاہئے کہ موت سے پہلے جو کچھ پیش آتا ہے، وہ باطل، عارضی اور فانی ہے۔ دنیا کی کسی شے کو ثبات نہیں۔ اس لئے اس کی موجودہ ہستی یا نیستی قابلِ التفات نہیں۔ قلعہ حقیقت یہ ہے کہ دل میں نہ بہشت کی آرزو ہو اور نہ دوزخ کا خوف۔ صرف اللہ ہی اللہ ہو۔ جب دل میں سچائی راسخ ہو جاتی ہے تو بہشت خود بخود پیچھے چلی آتی ہے۔"

ایک موقع پر اپنے مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے فرمایا۔

"رسول اکرم ﷺ کی پیروی کی شرط یہ ہے، جب بندہ ایمان لائے تو اس پر آخری سانس تک قائم رہے اور شک وشبہ کے بجائے رغبت، محبت اور معرفت کے ساتھ دل میں یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی ذات میں اکیلا ہے اور اپنی صفات میں یگانہ ہے۔ وہ تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے۔ اسمائے صفات اور افعال کے لحاظ سے قدیم ہے۔ اس کی ذات وصفا میں چون و چرا کرنا جائز نہیں۔ نہ وہ خود کسی سے مشابہ ہے اور نہ کوئی اس سے۔ تمام پیغمبر اس کے بھیجے ہوئے ہیں اور محمد ﷺ تمام انبیاء میں افضل ہیں۔ جو کچھ آپ ﷺ نے فرمایا، صحیح اور درست ہے اور اس میں کوئی تفاوت نہیں۔ خواہ یہ باتیں عقل میں آئیں یا نہ آئیں۔ اگر کوئی بات انسانی حلقہ فہم سے بعید ہو، تب بھی اسے تسلیم کر لینا چاہئے تا کہ اعتقاد درست رہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے اللہ کے حکم کو جانا...... اس کی کیفیت اور اسباب معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر حق تعالیٰ کے حکم کی تاویل آیاتِ قرآنی اور احادیث مبارکہ کے مطابق ہو تو تاویل کرنا جائز ہے۔ ایمان کی صحت کی علامت یہ ہے کہ اگر بندہ کوئی نیک کام کرے تو اسے خوشی محسوس ہو۔ اور اگر کوئی برائی سرزد ہو تو اسے برائی، برائی معلوم ہو۔ بندے کے ایمان کی استقامت یہ ہے کہ وہ علم کے بجائے ذوق وحال کی بنا پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب رکھے۔"

ایک اور موقع پر حضرت صدرالدین عارفؒ نے اپنے مریدوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔ "بندے کی کوئی سانس ذکر سے باہر نہیں نکلنی چاہئے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو انسان ذکر کے بغیر سانس لیتا ہے، اپنا حاصل ضائع کرتا ہے۔"

حضرت شیخ نے ایک اور موقع پر فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ جس کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس بندے کو "بندۂ سعید" لکھ دیتا ہے۔ اور اسے زبان کے ذکر سے قلب کے ذکر کی جانب ترقی دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر زبان ذکر سے خاموش رہتی ہے تو قلب خاموش نہیں ہوتا۔"

حضرت شیخ صدرالدینؒ عارف کی تعلیمات کا یہی خلاصہ ہے۔ اس سے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپؒ کتنے بڑے عامل شریعت وسنت تھے۔

حضرت شیخ صدرالدین عارفؒ نے 69 سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپؒ کی تاریخ وصال میں شدید اختلاف ہے۔ پھر بھی مؤرخین کی اکثریت نے 684ھ کو حضرت شیخ کا سالِ وفات قرار دیا ہے۔ آپ کا مرقد مبارک آپؒ کے والد محترم حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے پہلو میں ہے۔

آپؒ کے فرزندِ اکبر حضرت شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ کا شمار بھی سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم بزرگوں میں ہوتا ہے۔ تاریخ تصوف میں ایسی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں کہ باپ، بیٹا اور پوتا تینوں ولایت کے بلند درجے پر فائز ہوں۔ اور یہ فضیلت، حضرت شیخ بہاؤالدین زکریاؒ کے گھرانے کو حاصل ہے۔

❀❀❀

حضرت عبدالواحد بن زیدؒ

اب ہم سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا ذکر کریں گے۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے اپنے پانچ مریدوں کو خرقہ خلافت عطا فرمایا۔ تصوف میں خرقہ خلافت مخصوص اصطلاح ہے۔ جب کوئی مرید اپنی روحانی تعلیم و تربیت مکمل کر لیتا ہے تو اسے پیر و مرشد کی طرف سے ایک سند عطا کی جاتی ہے۔ اسی کا نام خرقہ خلافت ہے۔ خرقہ اس خصوصی لباس کو کہتے ہیں جو پیرانِ طریقت پہنتے ہیں۔ یہ لباس کسی امیر شخص کی طرح قیمتی نہیں ہوتا بلکہ اتنے معمولی کپڑے کا ہوتا ہے کہ دنیا کے غریب ترین لوگ ہی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر اہلِ تصوف کے نزدیک یہ خرقہ نہایت متبرک ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے کہ اس لباس میں ایک صاحبِ ایمان کی خوشبو بسی ہوتی ہے۔ وہ خوشبو جو اسے اس کے زہد و تقویٰ کے سبب حاصل ہوتی ہے۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے پانچ خلفاء کے نام اس طرح ہیں۔ حضرت ابن زرین۔ حضرت عتبہ بن غلام۔ حضرت شیخ واسع۔ حضرت حبیب عجمی اور حضرت شیخ عبدالواحد بن زید۔ حضرت ابن زرین، حضرت عتبہ بن غلام اور حضرت شیخ واسع کو تصوف کی دنیا میں زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔ مگر حضرت حبیب عجمی اور حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو صوفیائے کرام کی طویل فہرست میں بلند مقام کے ساتھ شہرتِ دوام بھی حاصل ہے۔

حضرت حبیب عجمیؒ کا ذکر ہم اگلے اوراق میں کریں گے۔ فی الوقت حضرت شیخ عبدالواحد بن زید کی عظیم شخصیت زیر بحث ہے کہ آپؒ کی روحانی تعلیمات کے ذریعے سلسلۂ چشتیہ کو فروغ حاصل ہوا۔ بعض دیگر بزرگوں کی طرح حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے حالاتِ زندگی پر بھی گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔

مشہور تصنیف ''سیر الاقطاب'' کے مصنف، شیخ الہدیہ تحریر کرتے ہیں۔ ''حضرت خواجہ حسن بصری کے مرید ہونے سے پہلے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ 40 سال تک عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ اس کے ساتھ ہی آپؒ نے سارے مذہبی علوم حضرت علیؓ سے حاصل کئے۔'' حضرت شیخ الہدیہ نے واضح طور پر لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے شاگردوں میں شامل تھے۔ اب ذرا اس روایت کی کمزوری ملاحظہ کیجئے۔ سیر الاقطاب کے مصنف کے بقول حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا انتقال 7 صفر 177 ہجری کو ہوا تھا۔ اور حضرت علیؓ کی شہادت کا واقعہ 40 ھ میں پیش آیا۔ ان دونوں واقعات کے درمیان 137 سال کا فاصلہ ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے 137 سال کی عمر پائی تھی، تب بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے وقت حضرت شیخ عبدالواحد بن زید پیدا ہوئے ہوں گے۔ پھر استادی اور شاگردی کا یہ رشتہ کس طرح قائم ہو گیا؟

قارئین پر واضح ہونا چاہئے کہ بزرگانِ دین کے اکثر تذکروں میں تاریخی حوالوں کے ساتھ تحقیق کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ جو اردو زبان کا ایک مشہور مصرع ہے...... بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے...... یا وہ فارسی زبان کا مشہور محاورہ...... پیراں نمی پرند، مریداں می پرانند...... یعنی پیر نہیں اُڑتے بلکہ اُن کے مرید اُنہیں اُڑاتے ہیں۔ جوشِ عقیدت میں اُنہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور اس کی روایت کی سند کیا ہے۔ بہر حال تحقیق کی روشنی میں حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ براہِ راست حضرت علیؓ کی تعلیمات اور روحانیت

سے فیض یاب نہیں ہوئے۔ کسی تاریخ سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ آپؒ کہاں پیدا ہوئے اور آپؒ کا خاندانی سلسلہ کیا ہے۔ بعض روایتوں کے مطابق آپؒ موروثی طور پر ایک امیر و کبیر انسان تھے۔ جب کوچہ معرفت میں قدم رکھا تو آپؒ نے سارا مال و زر، اللہ کے راستے میں لٹا دیا۔

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو دنیاوی جاہ و حشم اور مال و دولت سے نفرت کیوں ہوئی؟ اس سلسلے میں بھی کوئی روایت موجود نہیں۔ بعض تذکروں میں بس اتنا ہی تحریر ہے کہ جب آپؒ نے حضرت امام حسن بصریؒ کے روحانی کمالات کی شہرت سنی تو ایک دن اس عظیم بزرگ کی خانقاہ میں داخل ہوئے اور پھر اسی در کے غلام ہو کر رہ گئے۔

حضرت امام حسن بصریؒ نے بارہا فرمایا۔ ''عبدالواحد! تمہاری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہے۔ حسن وہ نہیں ہے جو تمہیں نظر آتا ہے۔''

جواب میں حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے عرض کیا۔ ''میں مانتا ہوں کہ میری نظر بہت کمزور ہے۔ مگر بصرہ میں لاکھوں نظر والے اور بھی تو ہیں۔ وہ آپ کو امام کیوں مانتے ہیں؟''

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا۔ ''یہ اُن کا حُسنِ ظن ہے۔ ورنہ حسن اپنی حقیقت خوب جانتا ہے۔''

امامؒ کا جواب سن کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے عرض کیا۔ ''تو پھر مجھے حُسنِ ظن پر قائم رہنے دیجئے۔'' شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کی گفتگو سن کر حضرت امام حسن بصری نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ طالبِ معرفت آسانی سے ٹلنے والا نہیں۔ مجبوراً آپؒ نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

''تم اپنے لباس سے تو ایک امیر و کبیر انسان نظر آتے ہو۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے نہایت عاجزی سے عرض کیا۔ ''اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس ذاتِ کریم نے مجھے اپنی تمام نعمتوں سے نوازا ہے۔'' شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا جواب سن کر حضرت امام حسن بصریؒ نے فرمایا۔

''تمہارے لئے بس یہی کافی ہے کہ پُرسکون زندگی گزارو اور مالکِ حقیقی کا شکر ادا کرتے رہو۔'' حضرت امام حسن بصریؒ نے ٹالنے کے لئے کہا۔

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے عرض کیا۔ ''زر و جواہر کے انبار اور غلاموں کے ہجوم میں سکون نہیں ملتا۔ اور اسی سکون کی تلاش میں آپ کے دروازے پر آیا ہوں۔''

حضرت امام حسن بصریؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''میرے عزیز! دنیا والے کہتے ہیں کہ سکون تو قبر میں ہی ملتا ہے۔ مگر میں عاجز کہتا ہوں کہ قبر میں سکون تو ان خاص بندوں کو ملتا ہے، جنہیں حق تعالیٰ اپنے کرم سے معاف فرما دے۔ تمہارے سکون کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ احکامِ الٰہی پر پابندی سے عمل کرو۔ نہایت ذوق و شوق سے نماز پڑھو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرو۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے عرض کیا۔ ''نمازیں بھی پڑھتا ہوں۔ حتی المقدور ذکرِ الٰہی بھی کرتا ہوں مگر سکون نہیں ملتا۔''

حضرت امام حسن بصریؒ نے فرمایا۔ ''سکون دنیا کی سب سے قیمتی شے ہے۔ اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بس شب و روز جستجو میں لگے رہو۔ طلب سچی ہے تو سکون مل ہی جائے گا۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حضرت امام حسن بصریؒ اُنہیں ٹالنا چاہتے ہیں۔ آخر آپؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں عرض کیا۔ ''امام! میں آپ کے دروازے پر ایک سوالی بن کے آیا ہوں۔ اور سوالی کو وہی

شے عطا کیجئے جس کا وہ طلب گار ہے۔ میں آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ میری گردن پر اپنی مہر لگا دیجئے کہ یہ امام حسن بصریؒ کا غلام ہے۔"

کچھ دیر کے لئے حضرت امام حسن بصریؒ خاموش ہو گئے اور شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے چہرے کو بہت غور سے دیکھنے لگے۔ امام نے محسوس کیا کہ سائل کے لہجے میں تڑپ بھی ہے اور سچائی کا نور بھی۔ مختصر سے سکوت کے بعد حضرت امام حسن بصریؒ دوبارہ شیخ عبدالواحد بن زیدؒ سے مخاطب ہوئے۔

"تم اس خانقاہ کے در و دیوار دیکھ رہے ہو، جیسے کسی غریب کے گھر کے در و دیوار۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے بہت مدھم لہجے میں عرض کیا۔ "دیکھ رہا ہوں۔"

حضرت امام حسن بصریؒ نے فرمایا۔ "اب تصور میں اپنے عالی شان مکان پر نظر ڈالو۔ کیا دونوں میں کوئی مماثلت ہے؟"

بڑا عجیب سوال تھا۔ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے جھجکتے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

آپ کے لہجے میں شرمساری کا رنگ جھلک رہا تھا۔ "دونوں میں کوئی مماثلت نہیں۔"

اس کے بعد حضرت امام حسن بصریؒ نے اپنے فقیرانہ پیرہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "اب تم میرے اور اپنے کپڑوں کا موازنہ کرو۔ یقیناً دونوں میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اس سوال پر کچھ شرمندہ اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ آپؒ نے کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکا لیا۔ حضرت امام حسن بصریؒ کی پُرجلال آواز گونجی۔

"جس شخص کی غربت کا یہ حال ہو، وہ کوئی غلام کس طرح خرید سکتا ہے؟ اُس کی گردن پر مہر لگانا تو دُور کی بات ہے۔ میرے عزیز! یہ اس دنیا کا قانون ہے کہ ایک امیر کسی غریب کو سلام بھی نہیں کرتا۔ پھر دونوں میں دوستی کا رشتہ کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟"

یہ سن کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے بڑے جذباتی لہجے میں عرض کیا۔ "آپ حکم دیں۔ میں اس فرق کو ابھی مٹائے دیتا ہوں۔"

حضرت امام حسن بصریؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "یہ کیسی خود غرضی ہو گی کہ میں تمہیں عیش و آسائش کی زندگی چھوڑ کر فقیری کی طرف بلاؤں۔ میرے بھائی! آخر میں نے کون سا گناہ کیا ہے جو تم مجھے اس کی سزا دینا چاہتے ہو؟"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے انتہائی والہانہ لہجے میں عرض کیا۔ "میں خود اپنی خوشی سے ساری آسائشیں ترک کر دوں گا۔ تاکہ آپ کی قربت حاصل کر سکوں۔"

اب حضرت امام حسن بصریؒ کو یقین آ گیا کہ یہ مال دار سوالی ان کے دروازے سے خالی ہاتھ جانے والا نہیں۔ انجام کار آپؒ نے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو آخری نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ مگر میری آخری نصیحت یہ ہے کہ ساری کشتیاں جلا کر ہی دریائے معرفت میں کودنا پڑتا ہے۔ اور یہ دشوار گزار سفر صرف اللہ کی رحمت کے سہارے ہی طے کرنا ہوتا ہے۔ سلامتی کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے ہزاروں طوفان آتے ہیں۔ دریا کی ہر موج سالک کو نگلنے کے لئے تڑپتی رہتی ہے۔ اگر تم بلا خیز اور سرکش موجوں سے گھبرا گئے اور تمہیں بیچ دریا میں یہ خیال آیا کہ کاش کوئی کشتی ہوتی، تو غرق ہو جاؤ گے۔ نہ دنیا تمہارے ہاتھ آئے گی اور نہ آخرت۔"

علامہ اقبال نے اسی مفہوم کو اپنے ایک شعر میں اس طرح پیش کیا ہے ۔

یہ شہادت گہہ ہستی میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ ترکِ دنیا کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ کہتے ہوئے آپؒ حضرت امام حسن بصریؒ کی خانقاہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ''شیخ محترم! میں اس دیوار کو گرانے جا رہا ہوں جو میرے اور آپ کے درمیان حائل ہے۔ دعا فرمائیں کہ اس دیوار کو گراتے ہوئے مجھے کوئی اذیت محسوس نہ ہو اور ہاتھوں میں کوئی لرزش پیدا نہ ہو کہ دولت کی یہ دیوار میرے بزرگوں نے اٹھائی تھی۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ چلے گئے۔

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور بڑے رقت آمیز لہجے میں دعا فرمائی۔

''اے ذاتِ واحد! تُو عبدالواحد کی مدد فرما کہ وہ تیری طرف آ رہا ہے۔ اس کے قدموں کو استقامت عطا کر۔ اس کے دل سے دنیا کی محبت نکال دے اور اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لے۔ اور اپنے گناہگار بندے حسن کا بھی پردہ رکھ کہ اہلِ بصریٰ اسے امام سمجھتے ہیں۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اپنے گھر پہنچے۔ تمام غلاموں کو طلب کیا اور اُنہیں کھڑے کھڑے آزاد کر دیا۔ بعض غلام جدا ہوتے وقت رونے لگے۔ ''ہمیں دوبارہ آپ جیسا آقا نہیں ملے گا۔''

یہ سن کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اپنے خدمت گاروں کو مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ ''آقا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ہم اب تک اپنے نفس کے فریب میں مبتلا تھے کہ خود آقا بن بیٹھے۔ اور اپنے ہی جیسے کلمہ گو بھائیوں کو غلام بنا لیا۔ تم کہیں بھی جاؤ، میرے حق میں دعائے خیر کرنا۔ میں نہیں جانتا کہ اس دوران میں نے تم پر کتنی زیادتیاں کیں اور کتنے مظالم ڈھائے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے اپنے تمام غلاموں کو اتنی رقم دے دی کہ وہ ایک سال تک کسی محنت مزدوری کے بغیر اپنی زندگی گزار سکیں۔''

یہ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کی عین جوانی کا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ جب انسانی نفس کی طلب اور سرکشی عروج پر ہوتی ہے۔ آپؒ نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی تھی اس لئے اہل و عیال کی قید سے آزاد تھے۔ تمام غلاموں کو رخصت کرنے کے بعد حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اپنے کمرے میں تشریف لے گئے اور ایک کاغذ پر سوچ سوچ کر اپنے تمام رشتے داروں کے نام لکھنے لگے۔ ان میں بہت دور کے عزیز و اقارب بھی شامل تھے۔ یہ طویل فہرست تیار کرنے کے بعد حضرت شیخ عبدالواحدؒ نے اپنے تمام رشتے داروں کو گھر پر بلایا اور انتہائی پُرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آپؒ نے ایک ایک عزیز کو اپنے کمرے میں بلایا اور قرابت داری کے لحاظ سے سب کو ایک ایک تھیلی دی۔ جس میں چاندی اور سونے کے سکے بھرے ہوئے تھے۔

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے تمام رشتے دار آپؒ کے اس طرزِ عمل پر حیران تھے۔ ایک بوڑھے عزیز نے سوال کیا۔ ''عبدالواحد! تمہارے والد تو بڑے کنجوس انسان تھے۔ کبھی اپنے رشتے داروں کو منہ نہیں لگایا اور نہ کبھی ان کا حال پوچھا۔ پھر تمہارے اندر سخاوت کی یہ عادت کہاں سے آ گئی؟''

اگرچہ بات بہت کڑوی تھی لیکن حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''جو کام باپ سے نہ ہو سکا، ممکن ہے کہ بیٹا اسے انجام دے سکے۔ آپ میرے والد کو معاف فرما دیں اور میرے حق میں دعائے خیر فرمائیں۔''

رشتے داروں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے اپنے پڑوسیوں پر نظر ڈالی۔ جو لوگ

مالی امداد کے مستحق تھے، انہیں خاموشی سے بلا کر ایک مخصوص رقم دی اور ان سے بھی دعا کی درخواست کی۔ پھر آپؒ نے محلے اور قرب و جوار میں ان ماں باپ کو تلاش کیا، جن کی بیٹیاں شادی کے قابل ہو گئی تھیں مگر مالی وسائل نہ ہونے کے باعث وہ اس فرض کی ادائیگی سے معذور تھے۔ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے ان غریب لڑکیوں کی شادی کے لئے ایک کثیر رقم دی۔

الغرض اپنا سارا مال و دولت تقسیم کرنے کے بعد حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور پھر بہت دیر تک گریہ وزاری کے ساتھ یہ دعا کرتے رہے۔

''اے اللہ! تیری ذات حاضر و ناظر ہے۔ تُو دیکھ رہا ہے کہ تیرے بندوں کے جس قدر بھی حقوق مجھ پر تھے، میں نے اُنہیں ادا کرنے کی ایک ناکام کوشش کی ہے۔ مگر تُو بے حد قبول کرنے والا ہے۔ اگر اس سلسلے میں مجھ سے کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو اپنی شانِ کرم کے صدقے میں مجھے معاف فرما دے اور میرے والدین کی مغفرت کر دے کہ تیرے سوا عذابِ آخرت سے نجات دینے والا کوئی نہیں ہے۔'' بعض روایتوں کے مطابق حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ تمام رات توبہ و استغفار کرتے رہے۔ پھر اپنے گھر میں نماز فجر ادا کرنے کے بعد حضرت امام حسن بصریؒ کی درس گاہ کی طرف اس طرح روانہ ہوئے کہ خالی ہاتھ تھے۔

پھر جب حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ، حضرت امام حسن بصریؒ کی خانقاہ میں اس وقت سینکڑوں شاگرد اور اہلِ ذوق موجود تھے۔ آپؒ آخری صف میں سر جھکا کر بیٹھ گئے اور امامؒ کا درس سننے لگے۔ پھر جب درس ختم ہوا اور حاضرینِ مجلس اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ آگے بڑھے۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ مسکراتے ہوئے اپنی مسند سے اُٹھے اور بڑے والہانہ انداز میں آپؒ کو گلے لگاتے ہوئے فرمایا۔

''عبدالواحد! اب تم سے دوستی کی جا سکتی ہے۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے بڑے عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔ ''امام! میں کچھ بھی کر گزروں، مگر آپ کی دوستی کے لائق نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو صرف غلامی کا سوال کیا تھا۔ اب آپ توجہ فرمائیے کہ میں غلامی کے قابل ہوں یا نہیں؟''

حضرت امام حسن بصریؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''میرے عزیز! ایک مسلمان، دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ بھائی کا رشتہ پہلے بھی تھا اور اب تم میرے محبوب بھائی ہو گئے ہو۔ ہمارے درمیان بس یہی رشتہ کافی ہے۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے بڑے جذباتی لہجے میں عرض کیا۔ ''امام! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اور میں غلامی سے کم کسی رشتے پر راضی نہیں ہوں گا۔''

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''عبدالواحد! تم بھول رہے ہو، میں نے تم سے اتنا وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ فرق مٹ جائے تو تم میرے شاگردوں میں شامل ہو سکتے ہو۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے اسی جذباتی لہجے میں عرض کیا۔ ''آپ کے شاگرد تو بے شمار ہیں۔ اور ان میں بڑے بڑے فقیہہ و محدث بھی شامل ہیں۔ ایسے عالم و فاضل انسانوں کے درمیان پھر میری کیا پہچان ہو گی؟ میں تو اپنی الگ ہی شناخت چاہتا ہوں۔ جب کسی راستے سے گزروں تو لوگ پکار کے کہیں کہ وہ جا رہا ہے، حضرت امام حسن بصریؒ کا غلام، عبدالواحد بن زیدؒ۔''

بڑی عجیب درخواست تھی۔ حضرت امام حسن بصریؒ بہت دیر تک سمجھانے کی کوشش کرتے رہے مگر شیخ

عبدالواحد بن زیدؒ اپنی ضد پر قائم رہے۔
بالآخر حضرت امام حسن بصریؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور نہایت پُرسوز لہجے میں کہا۔ "اے دیکھنے والے! تُو بھی دیکھ رہا ہے اور اے سننے والے! تُو سن بھی رہا ہے کہ میں تیرے کسی بندے کو غلام بنانا نہیں چاہتا۔ میں تو خود غلام رہ چکا ہوں۔ مگر تُو نے اپنے بے مثال فضل و کرم سے میری زنجیرِ غلامی کاٹ دی اور مجھ ناچیز کو مسندِ علم پر بٹھایا۔ پھر میں تیرے کسی بندے کو وہ زنجیر کیسے پہناؤں؟" یہ کہتے کہتے حضرت امام حسن بصریؒ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
یہ منظر دیکھ کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اس قدر متاثر ہوئے کہ آپؒ خود بھی رونے لگے پھر انتہائی رقت آمیز لہجے میں عرض کیا۔ "امام! آپ اپنی زبان مبارک سے کہیں نہ کہیں، میں نے خود ہی وہ زنجیرِ غلامی پہن لی ہے۔ بس آخری التجا یہ ہے کہ میں آدابِ غلامی سے واقف نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کوتاہی یا لغزش سے خفا ہو کر آپ مجھے آزاد کر دیں۔"
یہ سنتے ہی حضرت امام حسن بصریؒ نے شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو دوبارہ گلے سے لگا لیا۔ ہم اپنے مضمون میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ عہدِ جاہلیت کی رسم کے مطابق حضرت امام حسن بصریؒ بھی غلام زادے تھے۔ مگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے فیضِ محبت نے آپؒ کو ایسی شہنشاہیت عطا کی ہے کہ جسے حشر تک اندیشۂ زوال نہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اسی غلامی اور شہنشاہیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

حضرت امام حسن بصریؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کے بعد حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے شدید ریاضت و عبادت کی۔ رات کے ایک حصے میں چند گھنٹے آرام کرتے، پھر نمازِ تہجد کے ساتھ نوافل ادا کرتے اور رات کے آخری حصے میں ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ پیر و مرشد کے درس کے دوران حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ روتے ہی رہتے تھے۔ پھر جب درس ختم ہوتا اور لوگ گھروں کو چلے جاتے تو آپؒ حضرت امام حسن بصریؒ سے عرض کرتے۔ "شیخ! آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے؟"
امام حسن بصریؒ مسکراتے ہوئے فرماتے۔ "کون سا وعدہ؟"
حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اس طرح روتے ہوئے عرض کرتے۔ "مجھے غلامی کے آداب نہیں آتے۔ ہر وقت ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں آپ میرے ناکارہ پن سے عاجز آ کر مجھے اپنی قیدِ غلامی سے آزاد نہ کر دیں۔"
حضرت امام حسن بصریؒ اپنے مخصوص تبسمِ دلنواز کے ساتھ فرماتے۔ "عبدالواحد! تم اس دنیا میں بھی میرے ہو اور انشاء اللہ حشر میں بھی میرے ہی کہلاؤ گے۔" یہ سن کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اس قدر وارفتہ ہوئے کہ پیر و مرشد کے قدموں سے لپٹ گئے اور انتہائی جذب و کیف کے عالم میں عرض کرنے لگے۔
"امام! مجھے یقین آ گیا کہ تواضع اور مدارت آپ پر ختم ہے۔ آپ بڑے ہی غلام نواز ہیں۔ اگر حق تعالیٰ بروزِ حشر مجھ سے سوال کرے گا کہ عبدالواحد! تُو دنیا سے ہمارے لئے کیا لایا؟ تو میں کیا عرض کروں گا؟ اے مالک الملک! سب کچھ تیرا ہی تو ہے۔ تجھے کس شے کی حاجت ہے؟ تُو تو بے نیاز ہے، پھر بھی تیری بارگاہِ کرم میں نذر کے لئے دو چیزیں لایا ہوں۔ ایک تیری واحدانیت کا اقرار، دوسرا ان لوگوں کی خدمت جن سے تُو محبت کرتا ہے۔"
یہ سن کر حضرت امام بصریؒ نے بارگاہِ رب العزت میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ "اے ذاتِ واحد! حسن

بھی تجھ سے یہی التجا کرتا ہے کہ عبدالواحد کی اس نذر کو قبول فرما لینا۔"

حضرت امام حسن بصریؒ کی روحانی تربیت اور 40 سال کی شدید ریاضت و عبادت نے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو معرفت کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ آپؒ کا شمار مستجاب الدعوات بزرگوں میں ہونے لگا۔ تصوف کی اصطلاح میں "مستجاب الدعوات" اس صوفی کو کہا جاتا ہے، جس کی دعائیں اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ وہ گناہ گار سے گناہ گار انسان کی دعا بھی سن لیتا ہے۔ مگر وہ اپنے مقرب بندوں کی زیادہ سنتا ہے اور وہ مقرب بندے کون ہیں؟ خود باری تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرح ان کی نشاندہی فرمائی ہے:

"وہ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ جب عام مسلمان اپنے ریشمی اور نرم بستروں میں محوخواب ہوتے ہیں، اس وقت ان مقرب بندوں کی پشت بستروں سے الگ ہوتی ہیں اور وہ حق تعالیٰ کی بارگاہِ جلال میں گریہ وزاری کر رہے ہوتے ہیں اور ان کے دل خوفِ الٰہی سے موم کی طرح قطرہ قطرہ پگھل رہے ہوتے ہیں۔"

ساری دنیا جانتی ہے کہ یہ ساری نشانیاں اولیائے کرام ہی میں پائی جاتی ہیں۔ خواہ وہ لوگوں کے سامنے ظاہر ہو چکے ہوں یا خود انہوں نے اپنی ذات پر پردہ ڈال لیا ہو۔ یہی وہ بندگانِ خاص ہیں جنہیں مستجاب الدعوات کہا جاتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کی ذاتِ گرامی سے بے شمار کرامات کا ظہور ہوا۔ اگر ان سب کو تحریر کیا جائے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے گا۔ ایک دن آپؒ کسی راستے سے گزر رہے تھے۔ شدید گرمی کا موسم تھا اور ایک بوڑھا شخص راستے میں بے حال پڑا ہوا تھا۔ لوگ ادھر سے جا رہے تھے مگر کوئی بھی اس بوڑھے شخص کا پرسانِ حال نہیں تھا۔ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے مسلمانوں کی اس بے حسی پر دل ہی دل میں افسوس کیا اور بوڑھے کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ "کیا حال ہے؟"

بوڑھے نے انتہائی سخت لہجے میں جواب دیا۔ "تم بھی دوسروں کی طرح گزر جاؤ۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے نہایت شیریں لہجے میں فرمایا۔ "میں اپنے بھائی کی تکلیف دیکھ کر گزر جانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے اپنا دکھ بتاؤ۔"

بوڑھا آپؒ کا اخلاقِ کریمانہ دیکھ کر رونے لگا۔ "میں ایک بیمار شخص ہوں۔ دوا کے لئے پیسے نہیں۔ اب راستے میں تھک کر گر گیا ہوں تو کوئی اٹھانے والا نہیں۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے بوڑھے شخص سے پوچھا۔ "تمہارا کوئی گھر یا آل اولاد نہیں؟"

بوڑھے شخص نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "میرا گھر ہے مگر بے گھر ہوں۔ میرے تین جوان بیٹے ہیں لیکن لاولد ہوں۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے کسی قدر حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص کے تین جواں سال بیٹے ہوں اور وہ خود کو لاوارث قرار دیدے۔"

یکایک بوڑھا شخص رونے لگا۔ "میرے تینوں بیٹے اپنی بیویوں کے غلام ہیں۔ ان ہی بدذات عورتوں کے کہنے پر میرے بیٹوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔"

یہ سن کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ "بڑے صاحب! آج تم کس منہ سے بیٹوں کی

شکایت کر رہے ہو؟ کبھی تم بھی تو کسی کے بیٹے تھے۔ تم نے جو کچھ بویا ہے، وہی کاٹ رہے ہو۔ تمہارے بھی تو ماں باپ تھے۔ کیا تم نے انہیں نوکروں کی طرح گھر کے ایک کونے میں نہیں ڈال دیا تھا؟ کیا تمہاری بیوی ان بزرگوں کے ساتھ بے رحمی کا سلوک نہیں کرتی تھی؟ کیا تم اپنی بیوی کی ناز برداری کے لئے یہ سب کچھ برداشت نہیں کرتے تھے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو پورا پورا انصاف ہے۔ یہ اس کے انصاف کی پہلی قسط ہے۔ آخری قسط تمہیں حشر کے میدان میں ادا کی جائے گی۔"

یہ سنتے ہی بوڑھا شخص بے اختیار چیخ اُٹھا۔ "یقیناً تم اللہ کے ولی ہو۔ ورنہ میرے ماضی کے پوشیدہ رازوں سے کس طرح باخبر ہوتے؟"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں جواب دیا۔ "میں اس کی دوستی کے قابل کہاں؟ بس یہی اس کا سب سے بڑا کرم ہوگا کہ وہ مجھ گناہ گار کو معاف فرما دے۔"

یہ کہہ کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ چلنے لگے تو اس بوڑھے شخص نے فریادی لہجے میں پکار کر کہا۔ "تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔ مجھے اس حال میں چھوڑ کر نہ جاؤ۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ واپس لوٹ آئے اور ناگوار لہجے میں فرمایا۔ "تمہیں بھی تو تمہارے ماں باپ نے ہزار بار اللہ کا واسطہ دیا۔ مگر تم نے اس واسطے کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی۔ کوئی قدر نہیں کی۔ پھر تم کس طرح کسی کو اللہ کا واسطہ دے سکتے ہو؟"

بوڑھا شخص زار و قطار رونے لگا۔ "میں تو نادان و بے خبر تھا اس لئے اللہ کو نہیں جانتا تھا۔ مگر تم اللہ کو خوب جانتے ہو اس لئے اسی کی خاطر مجھ پر رحم کرو۔ ورنہ میں اسی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے زیرِ لب کچھ پڑھا اور بوڑھے شخص پر دم کر دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جس بیماری نے اسے تھکا ڈالا تھا، اب اس کے آثار تک نہیں تھے۔ بوڑھا جوشِ عقیدت میں حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے قدموں سے لپٹ گیا۔

"بس اتنا اور بتا دیں کہ میرے وہ گناہ کس طرح معاف ہوں گے جو والدین کے سلسلے میں مجھ سے سرزد ہوئے ہیں؟"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے فرمایا۔ "پابندی سے نماز پڑھو اور ہر نماز کے بعد اپنے والدین کے لئے دعائے استغفار کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمانِ مقدس ہے۔ "اگر کسی شخص کو کسی وجہ سے اپنے والدین کی خدمت کا موقع نہ ملے تو اسے لازم ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے ماں باپ کے لئے اللہ سے مغفرت طلب کرے۔ والدین کے قریبی عزیزوں کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آئے اور بوڑھے لوگوں کی خدمت کرے۔"

یہ کہہ کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اپنی اگلی منزل کی طرف چلے گئے۔

بوڑھا شخص صحت یاب ہو گیا مگر وہ اس کشمکش میں مبتلا تھا کہ اپنے گھر کس طرح جائے کہ وہاں اس کی کوئی عزت نہیں تھی۔ اچانک اس نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ اس کے تینوں بیٹے شدید بے قراری کے عالم میں اپنے باپ کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر اپنے باپ پر پڑی، وہ دیوانہ وار آگے بڑھ کر بوڑھے سے لپٹ گئے۔

"اللہ کا شکر ہے بابا! کہ آپ مل گئے۔"

بوڑھے شخص نے انتہائی ناگوار لہجے میں کہا۔ "تمہیں میری کیا پروا؟ میں تو تمہارے گھر کا بیکار سامان تھا جسے تم

نے اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔"

تینوں لڑکے رو رو کر کہنے لگے۔ "نہیں بابا! کچھ دیر پہلے تک ہم شدید گمراہی میں مبتلا تھے اور اندھیرے میں بھٹک رہے تھے۔ مگر اب ہمیں روشنی مل گئی اور ہم پہچان گئے ہیں کہ آپ ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔"

بوڑھے نے شدید حیرت کے لہجے میں اپنے بیٹوں سے سوال کیا۔ "اچانک تمہیں یہ روشنی کس طرح مل گئی؟"

"کچھ دیر پہلے ہمارے گھر کے دروازے پر تیز دستک ہوئی۔" ایک بیٹے نے کسی قدر سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "پھر جب میں گھر سے باہر نکلا تو باہر ایک بہت ہی نورانی صورت بزرگ کھڑے تھے۔ میں ان بزرگ کو دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ ان کے چہرے پر ایسا جلال تھا کہ میں اُنہیں آنکھ بھر کے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے نظریں نیچی کئے ہوئے بزرگ سے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟" میری بات سنتے ہی بزرگ کا جلال کچھ اور بڑھ گیا اور وہ انتہائی بارعب آواز میں کہنے لگے۔ "جب تین جوان بیٹے مل کر اپنے حقیقی باپ کو کچھ نہیں دے سکتے تو وہ ایک غیر آدمی کو کیا دیں گے؟ میں تم سے کچھ مانگنے نہیں، تمہیں دینے آیا ہوں۔ تمہارا بوڑھا اور بیمار باپ ایک کھلے میدان میں بے سہارا پڑا ہے۔ جاؤ، اسے منا کر عزت و احترام کے ساتھ اپنے گھر لے آؤ اور اتنی خدمت کرو کہ وہ تم سے راضی ہو جائے۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پھر عذابِ الٰہی کا انتظار کرو، جو بہت جلد اس پورے گھر کو تباہ و برباد کر دے گا۔" یہ کہہ کر وہ بزرگ چند قدم آگے بڑھے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ ہمیں معاف کر دیں بابا! کہ ہم بڑی غلطی پر تھے۔"

تینوں بیٹے، باپ کے قدموں سے لپٹے ہوئے معافی مانگ رہے تھے اور وہ بوڑھا شخص، حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے تصور میں گم تھا۔

ایک بار حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ دریائے دجلہ کے کنارے سے گزر رہے تھے۔ وہاں کچھ غریب لوگ کشتی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فوراً ہی کشتی آ گئی۔ غریب لوگ کشتی میں چڑھنے لگے تو ملاح نے اُنہیں سخت لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس کرایہ دینے کے لئے پیسے ہیں؟"

یہ سن کر غریبوں کے چہرے اُتر گئے۔ وہ سب کے سب خالی جیب تھے۔ اس علاقے میں مزدوری کرنے آئے تھے۔ لیکن جب مزدوری نہیں ملی اور شام سر پر آ گئی تو اپنے گھروں کو واپس جانے لگے۔ "ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ بس اللہ کے نام پر دریا کے پار اُتار دو۔"

ملاح نے منہ بنا کر کہا۔ "اگر میں اللہ کے نام پر مسافروں کو دریا پار کرانے لگا تو پھر کھاؤں گا کہاں سے؟ کوئی اور کشتی ڈھونڈو۔ شاید وہ تمہیں اللہ کے نام پر لے جائے۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ قریب ہی کھڑے ملاح اور غریبوں کی گفتگو سن رہے تھے جس سے آپؒ کو شدید اذیت پہنچ رہی تھی۔ آخر جن لوگوں کے پاس کرایہ دینے کے لئے پیسے تھے، وہ کشتی میں سوار ہو گئے اور ملاح اپنا مخصوص خوشی کا گیت گاتا ہوا کشتی لے کر آگے بڑھ گیا۔

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ ان غریبوں کے پاس آئے۔ وہ سب کے سب اُداس بیٹھے تھے۔ آپؒ نے اُنہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "ایک کشتی چلی گئی تو کیا غم ہے؟ دوسری آ جائے گی۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے تسکین آمیز کلمات سن کر ایک غریب مسافر نے کہا۔ "کشتیاں تو بہت ہیں مگر ان کے مالک بھی پیسے مانگیں گے۔"

"چلو! تم اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، جس کا مالک کرایہ نہیں مانگتا۔" حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے محبت

آمیز لہجے میں فرمایا۔ آپؒ کی بات سن کر سارے مسافر خوشی میں کھڑے ہو گئے اور پوچھنے لگے۔

''اس کشتی کا مالک کہاں رہتا ہے؟ ہمیں اس کا پتہ بتا دو۔ ہمارا روز کا آنا جانا ہے۔ اس طرح ہمارا کرایہ ہی بچ جائے گا۔'' حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے انتہائی جذب وسوز کے عالم میں فرمایا۔ ''وہ مالک ہر جگہ رہتا ہے مگر لوگوں کو نظر نہیں آتا۔'' یہ کہہ کر آپؒ مڑے اور دریائے دجلہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اے دجلہ! ان غریب مسافروں کو اللہ کے نام پر راستہ دیدے۔''

تمام مسافر بڑی حیرت سے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے ان کی نظروں کے سامنے ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ دریائے دجلہ جو کچھ دیر پہلے موجیں مار رہا تھا، اچانک سمٹنے لگا۔ پھر اس قدر سمٹا کہ اس میں ٹخنے ٹخنے پانی رہ گیا۔ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے غریب مسافروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اب تم بے خوف وخطر دریا کے پار اُتر جاؤ۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ آگے تشریف لے گئے۔

تمام مسافر شدید حیرت وسکوت کے عالم میں اس مردِ خدا کو جاتے دیکھتے رہے جس کی زبانِ مبارک سے ادا ہونے والے چند الفاظ نے دریائے دجلہ کی ظاہری حالت بدل ڈالی تھی۔ پھر جب حضرت شیخ عبدالواحدؒ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ مسافر دریا میں اُتر گئے اور کسی دُشواری کے بغیر دجلہ کے پار چلے گئے۔ پھر جیسے ہی آخری مسافر دریا سے باہر آیا، دریا کا پانی بڑھنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں موجیں مارنے لگا۔

پھر اس سے زیادہ حیرت انگیز منظر وہ تھا کہ جب یہ غریب لوگ اپنے گھروں کو پہنچے تو ان کی بیویاں طرح طرح کے کھانے پکا رہی تھیں۔ حالانکہ آج کسی کو بھی مزدوری نہیں ملی تھی اور ہر شخص اپنی جگہ سوچ رہا تھا کہ آج تو سوکھی روٹی ہی کھانی پڑے گی یا پھر فاقہ ہو جائے گا۔ مگر ان کی توقع کے خلاف گھر سے ایسے لذیذ کھانوں کی خوشبو اُٹھ رہی تھی کہ آج تک ان افلاس زدہ لوگوں کی زبانوں نے ایسے کھانوں کا ذائقہ بھی نہیں چکھا تھا۔ ان تمام لوگوں نے اپنی بیویوں سے ایک ہی سوال کیا۔

''تمہارے پاس ان لذیذ غذاؤں کے پکانے کا سامان کہاں سے آیا؟''

بیویوں نے جواب دیا۔ ''ہم نے کسی کی چوری نہیں کی ہے، بلکہ اپنے پیسوں سے سارا سامان خریدا ہے۔''

شوہروں نے دوسرا سوال کیا۔ ''اور تمہارے پاس سامان خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے آئے؟''

تمام بیویوں نے اپنے شوہروں کے اس سوال کا ایک ہی جواب دیا۔

''اچانک دروازے پر دستک ہوئی، دروازہ کھولا تو ایک بزرگ صورت انسان کھڑا تھا۔ میں نے اُسے سوالی سمجھ کر کہا۔ ''بابا! معاف کرو۔ میرے شوہر مزدوری کرنے گئے ہیں۔ اس وقت تو تمہیں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔'' اس شخص نے میری طرف ایک تھیلی بڑھائی اور آہستہ سے بولا۔ ''میں کچھ لینے نہیں، دینے آیا ہوں۔ اسے رکھ لو۔ جب تمہارا شوہر آئے اور تم سے اس کے بارے میں پوچھے تو بتا دینا کہ حضرت شیخ عبدالواحدؒ کے دوستوں میں سے ایک فقیر آیا تھا، وہ یہ تھیلی دے گیا ہے۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ آئندہ اللہ کے نام پر اللہ ہی سے مانگنا۔ کسی بندے سے سوال نہ کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا۔ پھر میں نے تھیلی کھول کر دیکھی تو اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔''

یہ سن کر سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور انہوں نے اپنی بیویوں کو پورا واقعہ سنا دیا۔ اس کے بعد ان لوگوں کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ خوش حال بھی ہو گئے اور احکام شریعت کی پابندی بھی کرنے لگے۔

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ آپؒ نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر

کی نماز ادا کی۔ امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ اور دوسرے بزرگانِ دین کے بارے میں بھی ایسی ہی روایات مشہور ہیں۔ ظاہر پرست لوگ ان روایتوں کو خوش عقیدگی اور قصے کہانیوں سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے مگر ہمارے نزدیک یہ ساری روایات درجۂ اعتبار کو پہنچتی ہیں۔ ان حضرات کو جان لینا چاہئے کہ زہد و تقویٰ تو حاصل ہی نماز تہجد اور شب بیداری سے ہوتا ہے۔ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرنے کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ اس دوران کسی مردِ مومن کو دوبارہ وضو کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ الفاظ محض علامتی طور پر استعمال کئے جاتے ہیں کہ فلاں بزرگ شب زندہ دار تھے جو عشاء کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوتے تھے اور پھر نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد خانۂ خدا سے باہر آتے تھے۔ سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ، حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ بھی ان ہی شب زدہ دار بزرگوں کی فہرست میں شامل تھے اور آپؒ کی کثرتِ ریاضت و عبادت پر بے شمار گواہیاں موجود ہیں۔

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا مشہور قول ہے کہ خالی جیب، خالی ہاتھ اور خالی پیٹ رہنے والا ہی حقیقی صوفی اور درویش ہے۔ اگر اس میں یہ صفات موجود نہیں تو وہ ایک کم ہمت انسان ہے جس نے اہلِ دنیا کو متاثر کرنے کے لئے درویشی کا لباس پہن لیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کسی امیر و کبیر انسان کی پیش کردہ نذر قبول نہیں کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اس کے مال میں کھوٹ ہے اور یہ کھوٹ درویشوں کو بھی تباہ کر ڈالے گا۔ اگر حلال کی روزی کمانے والا کوئی شخص نذر پیش کرتا تو اسے قبول فرما لیتے اور خدمت گاروں کو حکم دیتے کہ اپنی ضرورت کے مطابق رقم رکھ لیں اور باقی پیسہ محتاجوں میں تقسیم کر دیں۔

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کی خاص عادت تھی کہ آپؒ روپے پیسے کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ اگر اتفاق سے کبھی کوئی سوالی آ گیا اور خانقاہ میں اس وقت کوئی خادم موجود نہ ہوا تو آپؒ مجبوراً اپنی جگہ سے اُٹھتے اور خانقاہ کے منتظم کے کمرے میں رکھی ہوئی صندوقچی سے کچھ رقم نکال کر اس سوالی کو دے دیتے۔ پھر فوراً ہی اپنے ہاتھوں کو تین بار اس طرح دھوتے کہ جیسے وہ ناپاک ہو گئے ہوں۔ اس حوالے سے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اکثر اپنے وعظ میں فرمایا کرتے تھے۔

"اللہ تعالیٰ وہ وقت نہ لائے کہ کوئی درویش دینار و درہم کو ہاتھ لگائے اور اپنے ہم جنسوں کی نظروں میں ذلیل و رسوا ہو جائے۔"

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ ممنوعہ ایام کے علاوہ ہمیشہ روزے سے رہتے تھے۔ اکثر جو کی روٹی اور نمک کے پانی سے روزہ افطار کرتے تھے۔ عید یا بقر عید کے دن مرید اور خدمت گار کسی قدر لذیذ کھانے کا اہتمام کرتے اور جب کھانے کا خوان لے کر پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ مسکراتے ہوئے فرماتے۔ "خیر تو ہے، آج یہ اہتمام کس لئے؟"

خدمت گار عرض کرتے۔ "سیّدی! آج عید کا دن ہے۔"

مریدوں کا دل رکھنے کے لئے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اس لذیذ غذا کے چند لقمے کھا لیتے اور پھر نہایت پُرسوز لہجے میں فرماتے۔ "اگر وہ راضی ہے تو ہم فقیروں کے لئے ہر روز، روزِ عید ہے۔ اور اگر وہ ناراض ہے تو ہر روز، روزِ قیامت۔"

عظیم محدث و فقیہہ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ "اے طالبانِ حق! صرف روٹی اور نمک کھایا کرو کہ اس سے گردے کی چربی دُور ہوتی ہے اور ایمان و یقین زیادہ ہوتا ہے۔"

اہلِ نظر، حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے اس قولِ مبارک سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپؒ نے معرفت کی راہ

میں کیسی کیسی مشقتیں برداشت کی ہیں۔ اگرچہ اپنے بندوں کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں۔ عام مسلمان، حلال کی ہوئی ہر چیز کھا سکتے ہیں مگر اہلِ تقویٰ کی غذا کچھ اور ہے۔ علامہ اقبال کے بقول۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور ، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے ، شاہیں کا جہاں اور

بعض تنگ نظر علماء خود کو عامل شریعت وسنت قرار دیتے ہیں اور صوفیائے کرام پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ان بے خبر لوگوں کو شریعت وسنت سے کیا کام؟ بس وہ تو ''ہاؤ ہو'' کے شور میں گم رہتے ہیں۔ ''ہاؤ ہو'' سے مراد وہ محفل سماع ہے جس میں صوفیائے کرام پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ علمائے ظاہر کے اسی اعتراض کا جواب دیتے ہوئے سلسلہ سہروردیہ کے عظیم بزرگ حضرت شیخ عمر شہاب الدین سہروردیؒ اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''عوارف المعارف'' میں تحریر کرتے ہیں۔

''تصوف نام ہے قولاً، فعلاً، حالاً اور ہر حیثیت سے اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔''

واضح رہے کہ تصوف کے حوالے سے جن کتابوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان میں حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی تصنیف ''عوارف المعارف'' نمایاں مقام رکھتی ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے تصوف کی تعریف کرتے ہوئے سلسلہ چشتیہ کے عظیم بزرگ، حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا یہ قولِ مبارک نقل کیا ہے۔

''جو اپنی عقل کو سنت رسول ﷺ پر صرف کرتے ہیں اور اپنے دلوں کو اس پر متوجہ کرتے ہیں اور اپنے نفس کی خباثتوں سے اپنے سردار کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، ان ہی لوگوں پر صوفی کا اطلاق ہوتا ہے۔''

ایک موقع پر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے فرمایا۔ ''بندے کی سب سے عمدہ حالت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ موافق کرے اور راضی بہ رضا رہے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ اسے اطاعت کے لئے دنیا میں باقی رکھنا چاہے تو وہ اسی پر راضی رہے گا۔ اور اگر دنیا سے اُٹھا لے، تب بھی خوش رہے گا۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا مشہور قول ہے:

''جس بندے کو دنیا سے کچھ عطا ہو، پھر وہ کسی اور شے کی خواہش کرے تو اللہ اس سے اپنے ذکر کی لذت کو چھین لیتا ہے۔ پھر قربت کو دوری اور انس کو وحشت میں بدل دیتا ہے۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ بہت زیادہ گریہ وزاری کرتے تھے۔ پوری زندگی میں بہت کم لوگوں نے آپؒ کو مسکراتے دیکھا۔ ورنہ اکثر روتے ہی رہتے تھے۔ خشیت الٰہی سے رونا انبیائے کرامؑ کی سنت ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام، جن کا سر مبارک کاٹ کر دمشق کی ملکہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اس قدر روتے تھے کہ آپؑ کے رخسار مبارک پر زخموں کے نشانات بن گئے تھے۔ کچھ یہی حال اولیاء میں سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کا تھا۔ آپؒ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اتنے آنسو بہائے کہ دونوں آنکھوں کے نیچے زخموں کے ایسے نشانات بن گئے تھے کہ جنہیں دیکھ کر ناسور کا گمان ہوتا تھا۔ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا کوئی مرید اس گریہ وزاری کا سبب پوچھتا تو بے اختیار فرماتے۔

''اللہ تعالیٰ کو دو قطرے بہت زیادہ پسند ہیں۔ ایک مجاہد کے جسم سے بہنے والا خون۔ اور دوسرا خوف الٰہی سے

بہنے والا آنسو۔ آپؒ نے درویشی اختیار کرنے کے بعد دنیا سے اس طرح قطع تعلق کر لیا تھا کہ کسی سے ملاقات نہیں کرتے تھے۔ ہاں اگر کبھی کوئی عقیدت مند زبردستی آپؒ کا دیدار کرنے کے لئے خانقاہ میں داخل ہو جاتا تو آپؒ اس کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے اور پھر اسے رخصت کرتے ہوئے فرماتے۔

''میرے بھائی! تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ عبدالواحد بھی تمہاری ہی طرح اللہ کا ایک گناہ گار بندہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تم مجھ سے بہتر ہو اس لئے آئندہ اپنا وقت برباد نہ کرنا کہ میں تو خود اپنے گناہوں کے سبب دنیا والوں سے منہ چھپائے ایک گوشے میں پڑا رہتا ہوں۔''

حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کے عجز و انکسار کا یہ عالم تھا کہ خود کو دنیا کے ہر انسان سے کم تر سمجھتے۔ سلام میں ہمیشہ سبقت کرتے۔ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ یہ مخصوص دعا فرمایا کرتے تھے۔

''یا اللہ! مجھے اپنی عبادت کے لئے ایسا دل عطا کر جو بہت قوی ہو اور ایسے اعضاء دے جو تیری اطاعت کی طرف میری مدد کریں۔ اور مجھے ایسی ہمت عطا کر جو صرف تیری محبت سے متعلق ہو۔''

آخر وقت معلوم آ پہنچا۔ حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ طویل بیماری کے سبب بہت زیادہ کمزور ہو گئے تھے کہ سہارے کے بغیر اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ اتفاق سے اس روز کوئی خدمت گار بھی موجود نہیں تھا اور نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اپنی اس مجبوری پر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر آپؒ نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں دعا فرمائی۔ ''اے ارحم الراحمین! مجھے اتنی ہمت عطا فرما دے کہ میں وضو کے ساتھ نماز ادا کر لوں۔ اس کے بعد تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔''

ابھی کمرے میں ان الفاظ کی بازگشت باقی تھی کہ یکایک حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو اپنے نحیف و ناتواں جسم میں طاقت کی ایک لہر سی محسوس ہوئی۔ پھر آپؒ اپنے بستر سے اُٹھے، وضو کیا۔ اور اس طرح نماز ادا کی جیسے کوئی توانا شخص عبادت کرتا ہے۔ نماز کے بعد حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ دوبارہ بستر پر دراز ہو گئے اور رو رو کر عرض کرنے لگے۔ ''اے ذات وحدہٗ لاشریک! تُو نے اپنے گناہ گار عاجز بندے کی دنیا میں خوب لاج رکھی۔ میرے اعمال تو اس قابل نہیں کہ بخشا جا سکوں۔ مگر مجھے تیرے نام سے ایک خاص نسبت ہے کہ میں عبدالواحد ہوں...... اسی نسبت کے ساتھ زندہ رہا...... اور اسی نسبت کے ساتھ دنیا سے جا رہا ہوں۔ محشر کے دن بھی مجھے اسی نسبت کے صدقے بخش دینا۔''

پھر اسی رات حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کا انتقال ہو گیا۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے 177ھ کو آپؒ کا سالِ وفات قرار دیا ہے۔ یعنی حضرت امام حسن بصریؒ کے انتقال کے 67 سال بعد آپؒ دنیا سے رخصت ہوئے۔ اگر یہ روایت درست ہے تو حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ نے 100 سال سے زیادہ عمر پائی۔ آپؒ کا مزار پُرانوار بصرہ میں ہے۔ ''سیر الاقطاب'' کے مصنف، شیخ الہدیہ کے بقول حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو سماع کا بہت شوق تھا۔ مگر ہمارے نزدیک یہ روایت درست نہیں۔ حضرت امام حسن بصریؒ سماع سے کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ اس طرح آپؒ اپنے شاگردوں کو بھی سماع سے دُور رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔ پھر حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اپنے استاد کے حکم کی خلاف ورزی کس طرح کر سکتے تھے؟...... صوفیاء میں سماع کا رواج بہت بعد میں ہوا۔

❀❀❀

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ

اب ہم حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے دوسرے نامور خلیفہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا ذکر کریں گے۔

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کو صوفیائے کرام میں خاص شہرت اور مقام حاصل ہے۔ مگر کچھ دوسرے بزرگانِ دین کی طرح آپؒ کے حالاتِ زندگی پر بھی گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کچھ روایتوں سے بس اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ آپؒ فارس کے رہنے والے تھے۔ آپؒ کا خاندانی نام حبیب تھا اور کنیت ابو محمد تھی۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا شمار اپنے علاقے کے مالدار ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔ مگر آپؒ کی یہ خوشحالی، حرام کی کمائی ہوئی دولت کی بنیاد پر تھی۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ سُود کا کاروبار کرتے تھے۔ اسلام نقطۂ نظر سے سُود خوری اس معاشرے کی بدترین لعنت ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 275 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''جو لوگ سُود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص جیسا ہوتا ہے جسے شیطان نے لپٹ کر جنون سے دیوانہ بنا دیا ہو۔ اور یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں، سودا بیچنا یعنی تجارت بھی تو آخر سُود ہی جیسی چیز ہے...... حالانکہ اللہ نے سودے یعنی تجارت کو حلال کیا ہے اور سُود کو حرام۔ لہٰذا جس شخص کے پاس اللہ کی طرف سے یہ نصیحت پہنچی اور وہ آئندہ کے لئے سُود لینے سے باز آ گیا تو جو کچھ پہلے سُود وہ کھا چکا، سو کھا چکا...... اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔''

اور اس حکم کے بعد پھر آیت نمبر 278 اور 279 میں حق تعالیٰ سُود کے حوالے سے اپنے بندوں کو اس طرح تنبیہ کرتا ہے۔

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو۔ اور جو کچھ تمہارا سُود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو۔ اگر تم واقعی اللہ پر یقین رکھتے ہو...... لیکن اگر تم نے اس پر عمل نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اور اگر تم توبہ کر لو یعنی سُود چھوڑ دو تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے حق دار ہو...... نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔''

اگرچہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ مسلمان تھے مگر ان احکامِ الٰہی سے بے خبر دن رات اپنے سُودی کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ آپؒ کی سُود خوری کا انداز بھی بڑا عجیب تھا۔ روزانہ قرض داروں کے گھر تقاضا کرنے جاتے تھے۔ اور جس سے جو لینا ہوتا، جب تک مل نہ جاتا اس کا پیچھا نہ چھوڑتے۔ اپنی آمد و رفت کا خرچ بھی قرض دار ہی سے وصول کرتے۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے شب و روز اسی بے خبری اور بدمستی میں گزر رہے تھے کہ ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے آپؒ کے دل کی دنیا زیر و زبر کر کے رکھ دی۔ اور ایک سُود خور کی زندگی میں وہ انقلاب برپا ہوا کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس واقعے کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ایک دن حضرت شیخ عجمیؒ کسی مقروض کے یہاں اپنی رقم کی ادائیگی کا تقاضا کرنے گئے۔ اتفاق سے وہ مقروض شخص گھر پر موجود نہیں تھا۔

پردے کی آڑ سے اُس شخص کی بیوی نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''اس وقت میرے شوہر مکان میں موجود نہیں ہیں۔ آپ پھر کبھی تشریف لائیے گا۔''

مقروض کی بیوی کا جواب سن کر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے بڑے جابرانہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس سے کوئی

غرض نہیں کہ تیرا شوہر گھر پر موجود ہے یا نہیں۔ میں اپنا سُود لینے آیا ہوں۔ اور ہر حال میں لے کر جاؤں گا۔"

مقروض کی بیوی نے ڈرے سہمے لہجے میں کہا۔ "آپ کا سُود دینے کے لئے میرے پاس نہ ایک پیسہ ہے اور نہ کوئی چیز۔ بس بکرے کا تھوڑا سا گوشت ہے جو شام کا سالن پکانے کے لئے رکھا ہے۔"

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے نہایت تند و تیز لہجے میں کہا۔ "وہ گوشت ہی میرے حوالے کر دے کہ قرض دار کے مکان سے خالی ہاتھ جانا میرے مسلک میں حرام ہے۔"

چار و ناچار اُس غریب عورت نے بکرے کا وہ گوشت، حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے حوالے کر دیا جو بچوں کے رات کے کھانے کے لئے رکھا گیا تھا۔ پھر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ سُود میں وصول کیا ہوا بکرے کا گوشت لے کر اپنے گھر پہنچے تو بیوی نے کہا۔ "آٹا اور لکڑیاں ختم ہو گئی ہیں۔"

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے کہا۔ "ذرا صبر کرو۔ آٹا اور لکڑیاں بھی سُود میں لے کر آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر فوراً ہی گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ واضح رہے کہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ بہت بڑے سُود خور تو تھے ہی مگر انتہائی درجے کے کنجوس بھی تھے۔ آپؒ کی فولادی تجوریوں میں لاکھوں دینار اور درہم جمع تھے مگر روزانہ کے چھوٹے چھوٹے اخراجات بھی سُود کی وصولی سے کیا کرتے تھے۔

الغرض تھوڑی دیر بعد حضرت شیخ حبیب عجمیؒ سُود کی وصول شدہ رقم سے آٹا اور لکڑیاں لے کر گھر پہنچے تاکہ رات کا کھانا پکایا جا سکے۔ پھر جب کھانا پک کر تیار ہو گیا تو اسی وقت کسی سائل نے دروازے پر صدا لگائی۔

"بابا! کچھ کھانے کو دے۔ دو وقت کے فاقے سے ہوں۔"

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے انتہائی غضب ناک لہجے میں کہا۔ "بدبختو! تمہیں شرم نہیں آتی۔ ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے ہو۔ جاؤ، کوئی اور دروازہ دیکھو۔"

اگر چہ وہ فقیر ایک بوڑھا اور ناتواں شخص تھا، مگر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے اسے بری طرح دھتکار دیا۔ اس کے بعد آپؒ نے اپنی بیوی کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ پھر جب خاتونِ خانہ نے سالن نکالنے کے لئے دیگچی کھولی تو وہ سالن کے بجائے خون سے بھری ہوئی تھی۔ ایسا تازہ تازہ خون، جیسے اُسی وقت دیگچی میں ڈالا گیا ہو۔ یہ منظر دیکھتے ہی حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور پھر خود کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ "حبیب! کیا تُو انسانوں کا خون پیتا ہے؟"

اس کے بعد آپؒ نے اپنا تمام سُودی کاروبار ختم کر دیا اور بارگاہِ رب العزت میں دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

"یا ارحم الراحمین! تُو اپنے اس ذلیل ترین بندے کو معاف فرما دے کہ تیرے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں۔ بے شک! میں بہت بڑا گناہ گار ہوں، مگر میں نے تیرے بندوں سے یہ بھی سنا ہے کہ تیرے رحم و کرم کی بھی کوئی حد نہیں۔ تُو اپنے در سے کسی مانگنے والے کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔ پس تُو حبیب سُود خور کے خالی دامن کو اپنی رحمت سے بھر دے۔"

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی توبہ اور سُودی کاروبار ترک کرنے کے حوالے سے دوسری مشہور روایت اس طرح ہے کہ ایک دن حضرت شیخ حبیب عجمیؒ بازار جانے کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں محلے کے بچے کھیل رہے تھے۔ آپؒ کو دیکھتے ہی زور زور سے چیخنے لگے۔

"دُور ہٹ جاؤ...... بہت دُور ہٹ جاؤ۔ حبیب سُود خور آ رہا ہے۔ اگر ہم پر اُس کی گرد پڑ گئی تو ہم بھی اسی جیسے ہو جائیں گے۔"

بچوں کے ہذیانی شور نے دوسرے راہ گیروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ پھر راستہ چلتے ہوئے تمام لوگ شدید نفرت و حقارت کے ساتھ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی طرف دیکھنے لگے۔ ویسے تو شہر کے بیشتر افراد اس راز سے باخبر تھے کہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ سُود کا کاروبار کرتے ہیں۔ مگر بچوں کے شور و غل اور طعنہ زنی نے آپؒ کو شدید اذیت پہنچائی۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''حبیب! تُو اتنا برا آدمی ہے کہ یہ معصوم بچے بھی تجھ سے نفرت کرتے ہیں۔''

پھر جیسے جیسے حضرت شیخ عجمیؒ اس واقعے کے بارے میں سوچتے رہے، آپؒ کے دل کی خلش بڑھتی ہی چلی گئی۔ پھر اس خلش نے وحشت و اضطراب کا رنگ اختیار کر لیا۔

انجام کار حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے قدم بازار کی طرف جانے کے بجائے حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی خانقاہ کی جانب بڑھنے لگے۔ پھر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ خانقاہ میں داخل ہوئے تو حضرت شیخ حسن بصریؒ کی درس گاہ بڑے بڑے علماء اور معززین شہر سے بھری ہوئی تھی۔ جو لوگ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ سے واقف تھے، انہوں نے آپؒ کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیا۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ بہت غور سے اس صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ آپؒ نے شیخ حبیب عجمیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''تم یہاں آؤ۔ تمہاری جگہ میرے قریب ہے۔''

حاضرین مجلس کے اس ذلت آمیز سلوک کی وجہ سے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ ندامت کے پسینے میں نہا گئے تھے۔ آپؒ نے لرزتی ہوئی آواز میں عرض کیا۔ ''نہیں شیخ! میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میری جگہ حاضرین مجلس کے جوتوں میں ہے۔''

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا۔ ''مہمانِ خاص کی جگہ جوتوں میں نہیں، میزبان کے دل میں ہوتی ہے۔ میرے قریب آؤ۔''

صاحبِ مجلس کے اصرار پر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھے اور حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی مسند کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ درویش کی مسند ہی کیا تھی، لکڑی کا ایک تخت تھا، جس پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ پھر مختصر سے سکوت کے بعد حضرت خواجہ حسن بصریؒ حاضرین مجلس سے مخاطب ہوئے۔

''یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون، کس حال میں ہے۔ اور کس نیت سے آیا ہے۔ اگر کسی شرابی کو مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھو تو اپنے چہروں اور آنکھوں سے کراہت اور نفرت کا اظہار نہ کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو وہ شرابی ندامت و شرمندگی کے باعث دوبارہ مسجد میں داخل نہیں ہوگا۔ اس طرح تم ایک بندے کو اللہ سے دُور کر دو گے۔ حالانکہ تمہیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تم خود بھی اللہ کی عبادت کرو اور دوسرے بندوں کو بھی ذاتِ وحدہٗ لاشریک کے آگے سر جھکانے کی ترغیب دو۔

بالفرض اُس شرابی نے سچے دل سے توبہ کر لی تو ارحم الراحمین اس کے سارے گناہ معاف کر دے گا۔ مگر جن لوگوں نے اسے حقارت سے دیکھا تھا، ہو سکتا ہے کہ اللہ اُنہیں اُن کے غرور و تکبر کی وجہ سے شراب نوشی کے گناہ میں مبتلا کر دے۔ میرے عزیزو! اپنے بھائیوں کی پردہ پوشی کرو۔''

پھر حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے سورۃ بقرہ کی یہ آیت تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ ہے:

''وہ جسے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے۔ بے شک اللہ ہر شے پر قادر ہے۔''

اس کے بعد حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے حسب معمول اپنا وعظ مکمل کیا۔

پھر جب حاضرین مجلس اُٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو حضرت امام حسن بصریؒ، حضرت شیخ حبیب عجمیؒ سے مخاطب ہوئے۔ ''میرے عزیز! کیسے آنا ہوا؟ سب خیریت تو ہے؟''

واضح رہے کہ ''میرے عزیز!'' حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا مخصوص طرزِ کلام تھا۔ ''آپ ہر غریب و مفلس انسان کو اسی محبت آمیز لہجے میں مخاطب کرتے تھے۔ اس کے برعکس اگر خلیفہ وقت یا کسی امیر سے گفتگو کرتے تو آپؒ کے لہجے سے جلالِ روحانی کا اظہار ہوتا تھا۔

وہ شخص جو اپنا سُود اور قرض وصول کرتے وقت ایک ظالم و جابر انسان کی شکل اختیار کر لیتا تھا، آج اُس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ اگر اس وقت کوئی قرض دار، حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کو اس حالت میں دیکھ لیتا تو بے اختیار پکار اُٹھتا۔ کیا پتھر بھی رو سکتے ہیں؟

''میرے عزیز! تمہیں کیا دکھ ہے؟'' حضرت امام حسن بصریؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں شیخ حبیب عجمیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اگر تم مجھے اپنا سمجھتے ہو تو کہہ ڈالو۔ تمہیں دینے کے لئے اس فقیر کے پاس اور کچھ تو نہیں، بس دُعائیں ہی دے سکتا ہوں۔''

شیخ حبیب عجمیؒ نے روتے ہوئے عرض کیا۔ ''مجھے آپ کی دعاؤں کی ہی ضرورت ہے۔ میں اتنا گناہ گار ہوں کہ محلے کے بچے بھی میرے سائے سے بھاگتے ہیں۔ اور سرِ راہ مجھے ذلیل و رُسوا کرتے ہیں۔''

حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ''کسی انسان کی کیا مجال کہ وہ کسی کو ذلیل کر سکے یا اُسے عزت و توقیر دے سکے۔ عزت و ذلت دینے والا بس وہی ایک ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ تم دن رات خون پی رہے ہو اور آگ کھا رہے ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے پینے کے لئے میٹھا پانی بنایا ہے اور کھانے کے لئے انواع و اقسام کی غذائیں بخشی ہیں۔ تم خود ہی انصاف سے کہہ دو کہ آخر اس سرکشی اور بغاوت کا انجام کیا ہوگا؟'' یہ کہتے کہتے حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا چہرۂ مبارک زرد ہو گیا۔ اور پورا جسم کانپنے لگا۔

حضرت امام حسن بصریؒ کی یہ حالت دیکھ کر شیخ حبیب عجمیؒ پر وحشت طاری ہو گئی اور آپؒ ہذیانی انداز میں چیخنے لگے۔ ''شیخ! میں کیا کروں؟...... شیخ! میں کیا کروں؟''

حضرت امام حسن بصریؒ نے انتہائی پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''توبہ...... بس توبہ۔ کہ توبہ ہی ہر بیماری کا علاج ہے۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے روتے ہوئے فرمایا۔ ''شیخ! میں اتنا گناہ گار اور سیاہ کار ہوں کہ حق تعالیٰ میری توبہ بھی قبول نہیں فرمائیں گے۔''

حضرت امام حسن بصریؒ نے نہایت پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''اُس ذات ارحم الراحمین کے بارے میں بدگمانی سے بچو کہ یہ بدگمانی بذاتِ خود گناہِ عظیم ہے۔ باری تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہو۔ مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار سنوں گا۔ مجھ سے مانگو۔ میں تمہیں عطا کروں گا۔ اگر تمہارے گناہ پہاڑ کے برابر بھی ہوں، تب بھی میں انہیں معاف کر دوں گا۔''

حضرت امام حسن بصریؒ بڑے والہانہ انداز میں حق تعالیٰ کی شانِ کرم بیان کر رہے تھے۔ مگر شیخ حبیب عجمیؒ کے چہرے پر وہی مایوسی اور نا اُمیدی کے گہرے سائے چھائے ہوئے تھے۔

آپؒ نے اسی گریہ و زاری کے لہجے میں عرض کیا۔ ''بے شک! اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بھی برتر و بالا ہے۔ مگر میں اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے قابل نہیں ہوں۔ آپ میرا ہاتھ پکڑ کر ارحم الراحمین کے دربار میں لے

چلیں اور بس اتنا فرمادیں کہ یہ حبیب سُود خور ہے، جو اپنی جہالت اور نادانی کے سبب اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کر رہا تھا۔ آپ اپنے اس بدترین بندے کو معاف فرمادیں۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی درخواست سن کر حضرت امام حسن بصریؒ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر آپؒ نے کسی قدر پُرجلال لہجے میں فرمایا۔ ''میں اسی وقت تمہارے لئے دعا کروں گا، جب تم عملی طور پر سُودی کاروبار ختم کر دو گے اور جن لوگوں سے تم نے سُود کھایا ہے، ان کی رقم واپس لوٹا دو گے۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے دل کی گہرائیوں سے اقرار کیا کہ وہ آئندہ گناہوں کی اس وادی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔

یہ سن کر حضرت امام حسن بصریؒ نے فرمایا۔ ''اب میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔ مگر قبولیت کا انحصار صرف اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر ہے۔ مگر مانگنا بندے کا حق ہے۔ اور میں اپنے بھائی کے لئے اُس کی بارگاہِ کرم میں دامن ضرور پھیلاؤں گا۔''

بالآخر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے حضرت امام حسن بصریؒ کے دستِ حق پرست پر توبہ کی اور آپؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد شیخ حبیب عجمیؒ ہر اُس شخص کے گھر تشریف لے گئے، جو آپؒ کا قرض دار تھا۔ بعض قرض داروں نے اس خوف سے اپنے گھر کے دروازے نہیں کھولے کہ آپؒ سُود کا مطالبہ کریں گے۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے باہر سے پکار کر کہا۔

''میرے بھائی! میں تم سے اپنا قرض وصول کرنے نہیں آیا، آخری ملاقات کرنے کے لئے آیا ہوں۔''

یہ سنتے ہی قرض دار اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ کل تک جس شخص کے چہرے پر ظلم کی آگ بھڑکتی اور آنکھوں سے خون کی سرخی جھلکتی نظر آتی تھی، آج اُس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں بھی بجھی بجھی نظر آرہی تھیں۔ ہاتھ میں وہی کتاب تھی، جس میں تمام قرض داروں کا حساب درج تھا۔

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کتاب کھولتے اور اس شخص کا نام کاٹتے ہوئے فرماتے۔ ''اب تم میرے قرض دار نہیں ہو۔'' اس کے بعد قرض دار کی طرف ایک تھیلی بڑھاتے ہوئے فرماتے۔ ''اس میں وہ ساری رقم موجود ہے جو آج تک میں نے سُود میں وصول کی ہے۔''

جب وہ قرض دار، تھیلی لے لیتا تو حضرت شیخ حبیب عجمیؒ اُسے دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے فرماتے۔ ''میں نے اپنی اصل رقم اللہ کے نام پر معاف کر دی ہے۔ اب تمہارے ذمے میرا کوئی حساب نہیں ہے۔ اگر ہو سکے تو تم بھی اللہ تعالیٰ سے میری مغفرت کی دعا کرنا۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے اپنی کتاب سے تمام قرض داروں کے نام کاٹ دیئے۔ اور ان سے سُود میں حاصل کی ہوئی رقمیں واپس کر دیں۔

ان قرض داروں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل تھے، جو اس دوران انتقال کر چکے تھے اور ان کی کوئی اولاد موجود نہیں تھی۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ ایک ایک کر کے تمام مرحوم قرض داروں کی قبر پر گئے اور انتہائی رقت آمیز لہجے میں اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

''اے دنیا سے جانے والو! یہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی شے باقی رہنے والی نہیں۔ میں بھی تمہارے پیچھے بس آنے ہی والا ہوں۔ میں نے تمہارا سارا قرض معاف کر دیا۔ اور سُود میں حاصل کی ہوئی رقم تمہارے نام پر خیرات کر دی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے میرے قرض کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرے گا۔ میں نے تمہیں دنیا میں جس قدر اذیتیں پہنچائی ہیں، اس کے بدلے میں تمہارے لئے دعائے خیر کرتا رہوں گا۔''

پھر کچھ دیر بعد حضرت شیخ حبیب عجمیؒ اُسی محلے سے گزرے، جہاں کچھ دیر پہلے آپؒ کو دیکھ کر بچوں نے شور مچایا تھا۔ ''بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ۔ حبیب سُودخور آرہا ہے۔ کہیں اس کا سایہ ہم پر نہ پڑ جائے۔ اور ہم بھی اس جیسے ہو جائیں گے۔'' مگر آج وہی بچے اپنا کھیل چھوڑ کر باادب کھڑے ہو گئے۔

ایک بچہ اب بھی اپنی شرارتوں میں مصروف تھا۔ اُس کے ساتھیوں نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''خاموش ہو جا! دیکھتا نہیں کہ اتنے بڑے بزرگ آرہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور خود کلامی کے انداز میں کہنے لگے۔

''بے شک! تُو اپنے بندوں کے وہم وگمان سے بھی بڑھ کر رحمٰن ورحیم ہے۔ حبیب سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تُو اسے اتنی جلد معاف فرما دے گا۔''

پھر جب آپؒ بچوں کے قریب پہنچے تو وہ سب کے سب سر جھکائے کھڑے تھے اور بڑے معصومانہ لہجے میں درخواست کر رہے تھے۔ ''ہمارے سر پر ہاتھ رکھ دیں کہ آپ بہت بڑے بزرگ ہیں۔''

حضرت امام حسن بصریؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کے بعد حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے دریائے فرات کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا تھا، جس میں آپؒ اپنی بیوی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ بے اولاد تھے۔ سُودخوری کے زمانے میں آپؒ نے اس وقت کے مشہور طبیبوں سے اپنی شریکِ حیات کا علاج کرایا مگر اولاد سے محروم رہے۔ آخر تمام طبیبوں نے بیک زبان کہہ دیا کہ بے کار اتنا پیسہ خرچ کر رہے ہیں۔ آپ کی بیوی قدرتی طور پر بانجھ ہے۔ اور اس کا علاج کسی دوا سے ممکن نہیں۔

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ اولاد کے سلسلے میں بہت زیادہ فکرمند اور پریشان رہا کرتے تھے۔ اولاد کی تمنا تو ہر انسان کو ہوتی ہے۔ مگر مال دار لوگوں کی خواہش شدید تر ہوتی ہے کہ اگر ان کا وارث اس دنیا میں نہیں آیا تو اتنی بڑی جائیداد، جاگیر اور دولت کو دوسرے عزیز کھا جائیں گے۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے سامنے بھی بار بار یہ سوالیہ نشان اُبھرتا تھا کہ ان کے بعد اس دولت کا مالک کون ہوگا؟ مگر جب آپؒ نے سودخوری کے کاروبار سے توبہ کی تو آپؒ کے دل سے اولاد کی آرزو اس طرح نکل گئی کہ جیسے یہ جذبہ آپؒ کے سینے میں موجود ہی نہیں تھا۔ آپؒ نے اپنی ذاتی دولت، اللہ کے راستے میں لٹا دی۔ اور ان کنیزوں اور غلاموں کو بھی آزاد کر دیا جو دن رات آپؒ کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔

اب حضرت شیخ عجمیؒ دریائے فرات کے کنارے اپنی بیوی کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ آپؒ فجر کی نماز ادا کر کے حضرت امام حسن بصریؒ کی درس گاہ میں حاضر ہوتے اور آنکھیں بند کر کے پیر و مرشد کا درس سنتے رہتے۔ پھر نمازِ مغرب کے بعد گھر تشریف لاتے اور جو کچھ رُوکھی سوکھی روٹی ملتی، اسے کھا کر اس طرح شکر ادا کرتے۔

''اے رزاقِ عالم! میں اس قابل نہیں تھا کہ مجھے یہ سُوکھے ٹکڑے عطا کئے جاتے۔ مگر تُو نے اپنی شانِ کرم سے مجھے بھوکا بھی نہیں رکھا اور کسی کا محتاج بھی نہیں بنایا۔ بس تُو مجھے اپنی اس آیت مقدسہ پر عمل کی توفیق عطا فرما دے۔ ''ایاک نعبد وایاک نستعین۔'' (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں)''

نمازِ عشاء کے بعد حضرت شیخ حبیب عجمیؒ دو تین گھنٹے آرام کرتے، پھر ساری رات نوافل اور ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو جاتی اور آپؒ کے قدم مسجد کی طرف اُٹھ جاتے۔

اپنی ساری دولت، اللہ کے راستے میں لٹانے کے بعد حضرت شیخ حبیبؒ نے تھوڑی سی رقم اپنی بیوی کے حوالے

کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''اب تمہیں اسی میں گھر کا خرچ چلانا ہے۔ پیسے ختم ہو جائیں تو مجھے بتا دینا۔''

بیوی نے شوہر کی ہدایت پر پورا پورا عمل کیا۔ مگر ایک مختصر سی رقم کتنے دن چلتی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ گوشت اور ترکاری خریدنے کے لئے ایک پیسہ بھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ بس تھوڑا بہت آٹا تھا، جس سے بمشکل دو تین دن گزارے جا سکتے تھے۔ آخر بیوی نے شوہر کو اس صورتِ حال سے باخبر کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی روزگار ڈھونڈ و یا محنت مزدوری کرو۔ ورنہ فاقوں کی نوبت آنے والی ہے۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے فرمایا۔ ''میں غریب و مفلس انسان، اپنا روزگار کیسے کر سکتا ہوں؟..... ہاں، مزدوری میرے اختیار میں ہے۔ کل صبح ہی تلاش شروع کر دوں گا۔''

پھر جب صبح ہوئی تو حضرت شیخ حبیب عجمیؒ، حضرت امام حسن بصریؒ کی خانقاہ میں جانے کے بجائے بصرہ کی ایک مسجد میں چلے گئے اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ پھر آپؒ نے یہ گریہ وزاری کرتے ہوئے اس طرح دعا کی۔

''اے مالک الملک! جب تُو نے حبیب سُود خور کو توبہ کی توفیق عطا فرمائی تو پھر اسے غیروں کے ٹکڑوں پر نہ ڈال کہ سارے خزانے تیرے ہی ہیں۔ اب مجھ سے تیرے سوا کسی کی مزدوری نہیں ہو گی۔''

اس دعا کے بعد حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے مغرب کی نماز ادا کی اور گھر تشریف لے آئے۔

شوہر کو دیکھتے ہی بیوی نے سوال کیا۔ ''کوئی کام ملا؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے مجھے فوراً ہی کام پر لگا دیا۔ دن بھر مزدوری کی۔''

یہ سن کر بیوی کے چہرے پر خوشی کا رنگ اُبھر آیا۔ ''مزدوری کی رقم میرے حوالے کریں تاکہ میں سالن کا انتظام کروں۔ کہیں دکان بند نہ ہو جائے اور آج رات بھی رُوکھی سُوکھی روٹی کھانی پڑے۔''

حضرت شیخ عجمیؒ نے اسی طرح مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''کام تو کیا مگر مزدوری نہیں ملی۔''

شوہر کا جواب سن کر بیوی نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔ ''وہ کیسا مالک ہے جس نے اپنا کام تو کرایا، مگر مزدور کو اس کی مزدوری نہیں دی۔ اور وہ کیسا مزدور ہے جس نے دن بھر محنت مشقت کی مگر اپنی مزدوری کا مطالبہ نہیں کیا۔''

حضرت شیخ عجمیؒ نے اسی خوشگوار لہجے میں فرمایا۔ ''میں نے اپنے مالک سے رقم کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر وہ دوسرے مالکوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے ہر کام کرنے والے کو دسویں دن مزدوری دیتا ہے۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا جواب سن کر آپؒ کی شریکِ حیات نے کسی قدر ناگوار لہجے میں کہا۔ ''میں نے تو آج تک ایسے کسی مالک کے بارے میں نہیں سنا جو دسویں دن اپنے مزدوروں کو اُجرت دیتا ہے..... کیا آپ نے اس بات پر یقین کر لیا؟''

حضرت شیخ عجمیؒ نے انتہائی جذب و کیف کے لہجے میں فرمایا۔ ''بے یقینی کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں نے اس جیسا سچا مالک نہیں دیکھا۔ وہ ہر حال میں اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔''

شوہر کا جواب سن کر بیوی نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ اسے پہلے سے جانتے ہیں؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے ایک خاص سرشاری کے لہجے میں فرمایا۔ ''اس کا نام تو بہت سنا تھا مگر کچھ دنوں سے اسے پہچان بھی گیا ہوں۔ وہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی بیوی، شوہر کا عذر قبول کرنے پر مجبور تھیں۔ مجبوراً خاموش ہو گئیں۔ حضرت شیخ عجمیؒ

دوسرے دن بھی نمازِ فجر ادا کر کے بصرہ کی اسی مسجد میں چلے گئے اور گزشتہ روز کی طرح ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں ادا کیں اور دن بھر ذکرِ الٰہی کرتے رہے۔ پھر مسجد سے رخصت ہوتے وقت آپؒ نے وہی مخصوص دعا کی۔

''اے اللہ! مجھے دوسروں کے ٹکڑوں پر نہ ڈال۔ اور اب مجھ سے کسی غیر کی مزدوری نہیں ہو گی۔''

اس کے بعد حضرت شیخ حبیب عجمیؒ اپنے گھر تشریف لائے تو آپؒ کے ہاتھ بھی خالی تھے اور جیب بھی۔ بیوی نے ایک اچٹتی سی نظر شوہر پر ڈالی اور پھر آدھی روٹی، حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے سامنے لا کر رکھ دی۔ حضرت شیخ نے بسم اللہ کہہ کر کھانی شروع کر دی۔ شوہر کی یہ بے نیازی دیکھ کر بیوی خود ہی بول اُٹھیں۔

''تمہارا مالک دس دن بعد مزدوری دے گا...... اس کے بعد ہی پیٹ بھر کے روٹی ملے گی۔ دس دن تک اسی آدھی روٹی پر گزارہ کرنا ہو گا۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے فرمایا۔ ''آدھی روٹی بھی بہت ہے۔'' یہ کہہ کر آپؒ سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ چہرے پر اس قدر خوشی کا رنگ نمایاں تھا، جیسے آپؒ انتہائی لذیذ کھانا کھا رہے ہوں۔ پھر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

''الحمد للہ رب العالمین...... واللہ خیر الرزاقین...... ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو عالموں کا پالنے والا ہے...... اور اللہ تمام روزی دینے والوں میں سب سے بہتر رازق ہے۔''

اسی طرح حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کو روزانہ مسجد میں جاتے اور دعا کرتے ہوئے 9 دن گزر گئے۔ پھر جب دسویں دن آپؒ دعا کر کے گھر جانے لگے تو راستے بھر یہی سوچتے رہے کہ آج وہ اپنی بیوی سے کیا بہانہ کریں گے؟ پھر یہ کہہ کر اپنے ذہن سے سارے خیالات کو جھٹک دیا۔

''بندے کا کام تو مانگنا ہے...... باقی دینے والے جانیں۔''

پھر جب آپؒ گھر میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آپؒ کی شریکِ حیات، طرح طرح کے کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے بڑے تعجب کے ساتھ اپنی بیوی سے پوچھا۔

''یہ کیا ماجرا ہے؟''

بیوی نے انتہائی مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ ساری چیزیں تمہارا وہی مالک لے کر آیا تھا، جس کی تم مزدوری کرتے ہو۔ بڑا ہی نیک دل اور سخی انسان ہے وہ۔ اس سارے ساز و سامان کے ساتھ وہ شخص تین ہزار درہم نقدی بھی دے گیا ہے۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کو شدید حیرت ہوئی۔ پھر آپؒ نے اپنی شریکِ حیات کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''وہ درہم کہاں ہیں؟''

بیوی دوڑ کر گئیں اور صندوق میں رکھی ہوئی تھیلی لا کر شوہر کے حوالے کر دی۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کچھ دیر تک سکوت کے عالم میں کھڑے رہے۔ پھر عجیب سے لہجے میں اپنی بیوی سے سوال کیا۔ ''آپ نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا؟''

بیوی نے جواباً عرض کیا۔ ''میں ایک نامحرم کا چہرہ کس طرح دیکھ سکتی تھی؟...... ہاں...... جب اُس نے میری طرف تھیلی بڑھائی تو مجبوراً میری نظر اُس کے ہاتھ پر پڑ گئی۔ وہ ہاتھ اس قدر روشن تھا کہ اس سے شعاعیں پھوٹ رہی تھیں...... میں نے آج تک کسی انسان کا ایسا ہاتھ نہیں دیکھا...... جو شخص دس دن کی مزدوری کی اتنی بڑی اُجرت دے، اُس مردِ سخی کا ہاتھ اتنا ہی روشن ہونا چاہئے۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے اپنی شریکِ حیات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''آپ درست کہتی ہیں۔ اُس مردِ سخی کے ہاتھ کو اتنا ہی روشن ہونا چاہئے۔'' یہ کہہ کر آپؒ نے درہم کی تھیلی بیوی کی طرف بڑھا دی۔ ''بہت کفایت شعاری اور احتیاط کے ساتھ اس رقم کو خرچ کرو۔ ہوسکتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے...... اور وہ مردِ سخی اس قدر مہربانی سے پیش نہ آئے...... اور ہوسکتا ہے کہ وہ مالک میرے ناکارہ پن کی وجہ سے کام ہی نہ کرائے۔''

یہ سن کر بیوی نے انتہائی پُر جوش لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گئی تھی...... جاتے وقت وہ شخص یہ بھی کہہ گیا تھا کہ اگر تمہارا شوہر دل لگا کر کام کرے گا تو میں آئندہ اس سے بھی زیادہ اُجرت دوں گا۔''

بیوی کی بات سن کر حضرت حبیب عجمیؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؒ اپنے عبادت کے حجرے کی طرف جانے لگے۔

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا معمول تھا کہ اپنے حجرے میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کر لیا کرتے تھے اور پھر اذانِ فجر کے وقت دروازہ کھولتے تھے۔ اس دوران بیوی کو بھی ہدایت تھی کہ کسی خاص مجبوری یا ضرورت کے علاوہ آپؒ کی تنہائی میں خلل انداز نہ ہوں۔

شوہر کو حجرے کی طرف جاتے دیکھ کر بیوی نے بڑی حیرت سے سوال کیا۔ ''کھانا نہیں کھائیں گے؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے بجھے ہوئے لہجے میں فرمایا۔ ''آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ گرانی سی محسوس ہو رہی ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت شیخ اپنے حجرے میں داخل ہو گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ پھر ساری رات سجدے کی حالت میں رو رو کر دعا کرتے رہے۔

''اے میرے عیبوں کو چھپانے والے! تُو نے میری بیوی کے سامنے خوب پردہ رکھا اور اس نکمے، ناکارہ کو اتنی مزدوری عطا کر دی، جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اب مجھے بتا کہ میں تیری اس بخشش و عطا کا شکر کس طرح ادا کروں گا؟''

قارئین کرام! حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے اس واقعے میں ایک خاص نکتہ بھی پوشیدہ ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشادِ مقدس ہے کہ اگر کوئی بندہ میرے راستے میں ایک قدم بڑھاتا ہے تو میں اُس کی طرف دس قدم بڑھاتا ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی بندہ ایک نیکی کرتا ہے تو اُسے دس گنا اجر و ثواب عطا کیا جاتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے اسی وجہ سے اپنی بیوی سے کہہ دیا ہو کہ وہ مالک دسویں دن مجھے مزدوری دے گا۔ بہرحال اسی دن سے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کو دستِ غیب حاصل ہو گیا۔ دیگر اصطلاحات کی طرح ''دستِ غیب'' بھی تصوف کی مخصوص اصطلاح ہے۔

''دستِ غیب'' کے لغوی معنی ہیں، غیبی ہاتھ۔ مگر صوفیائے کرام کے حوالے سے دستِ غیب کا مفہوم یہ ہے کہ ایک صوفی، روحانیت کی ارتقائی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے، جہاں اس کے ہر کام میں غیبی مدد شامل ہوتی ہے۔ بظاہر وہ کوئی کام یا تجارت نہیں کرتا مگر اس کے سارے اخراجات پورے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی خانقاہ کے دروازے پر ہزاروں انسان پڑے رہتے ہیں اور صبح و شام کھانا کھاتے رہتے ہیں۔ اور یہ سارے انتظامات غیب سے ہوتے رہتے ہیں۔

بہت سے دنیا دار لوگ ''دستِ غیب'' کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ مذاق اُڑاتے ہیں کہ یہ بھی صوفیاء کا ایک ڈھونگ ہے۔ اس قسم کے قصے اس لئے تراشے جاتے ہیں کہ لوگ انہیں سن کر متاثر ہوں۔ اور پھر صوفیاء کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہو سکے۔ ہم دستِ غیب کی زیادہ وضاحت تو نہیں کر سکتے۔ بس سرکارِ دو عالم ﷺ کی

ذاتِ اقدس کے حوالے سے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔
ایک دن حضور اکرم ﷺ اپنی مجلس نور میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ جلوہ افروز تھے کہ ایک دن پریشان حال شخص حاضر ہوا اور رو رو کر عرض کرنے لگا۔
''میرے آقا! یہ گردشِ ماہ و سال کا اثر ہے یا میرے گناہوں کی سزا کہ نوبت فاقہ کشی تک آ گئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جنہوں نے کئی دن سے پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا ہے۔ دعائے خیر فرمائیے کہ بھوک کا یہ عذاب میرے گھر سے نکل جائے۔''
سرورِ کونین ﷺ نے فرمایا۔ ''تیرے پاس جتنا بھی اناج ہے، اسے ایک بار چکی میں ڈال کر پیس۔ پھر اپنی ضرورت کے مطابق آٹا حاصل کر لے۔ حق تعالیٰ تجھے بھوک سے نجات عطا کرے گا۔''
وہ شخص خوشی خوشی گھر چلا گیا۔ پھر جب اس نے بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ اناج موجود ہے تو بیوی نے انتہائی مایوسانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''مٹھی بھر گیہوں موجود ہوں گے۔ ان کے آٹے سے ایک روٹی بمشکل تیار ہو گی۔'' اس شخص نے کہا کہ وہ گیہوں، چکی میں ڈال کر پیس لو اور حسب ضرورت آٹا نکال لو۔
بیوی نے شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''
اس شخص نے انتہائی جوشِ عقیدت سے کہا۔ ''جب میرے آقا ﷺ نے فرمایا ہے تو ہر بات ممکن ہے۔ چاہے ہماری عقل میں آئے نہ آئے۔''
عورت نے دو مٹھی گیہوں، چکی میں ڈال لئے اور انہیں پیسنے لگی۔ کچھ دیر بعد دونوں میاں بیوی کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ دو تین چھٹانک گیہوں ڈھائی تین سیر آٹے میں تبدیل ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان دونوں نے اپنے بچوں کے ساتھ پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔
پھر صبح ہوئی تو عورت نے چکی چلانی شروع کی اور حیرت انگیز طور پر آٹا نکلنے لگا۔ اب عورت کو اطمینان ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ کے صدقے میں ان لوگوں کو بھوک سے نجات مل گئی ہے۔
شوہر محنت مزدوری کر کے تھوڑی بہت رقم کماتا، اس سے گوشت اور تیل وغیرہ خرید لیا جاتا۔
اس طرح کئی ماہ گزر گئے۔ آخر ایک دن میاں بیوی آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ''آخر یہ آٹا کہاں سے آتا ہے؟ ہمیں اس کی تلاش تو کرنی چاہئے۔''
شوہر نے بیوی کو ٹالنے کی کوشش کی۔ ''ہمیں اس کی جستجو کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بس یوں سمجھ لو کہ ہمیں سرکارِ دو عالم ﷺ کی دعا کے صدقے میں کسی مشقت کے بغیر کھانے کو مل جاتا ہے۔''
بیوی، شوہر کے اس جواب سے خاموش تو ہو گئی مگر پھر بھی اس کا تجسس برقرار رہا، کہنے لگی۔
''بندے کو اپنی آنکھ سے اللہ کی قدرت کا نظارا کرنا چاہئے کہ یہ سلسلہ کس طرح جاری ہے؟''
آخر شوہر بھی بیوی کی باتوں میں آ گیا اور دونوں نے چکی کا پاٹ ہٹا کر دیکھا۔ وہاں گیہوں کا ایک دانہ بھی موجود نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس چکی سے کبھی آٹا پیسا ہی نہ گیا ہو۔ کچھ دیر تک دونوں شدید حیرت کے عالم میں کھڑے رہے۔ پھر عورت نے چکی کا پاٹ اسی جگہ رکھ کر دوبارہ چکی چلانی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ عورت کے بازو شل ہو گئے مگر چکی سے آٹے کی ایک چٹکی بھی برآمد نہیں ہوئی۔
یہ منظر دیکھ کر دونوں میاں بیوی بدحواس ہو گئے اور انہیں یوں محسوس ہوا جیسے گھر آئی ہوئی دولت اچانک کوئی لوٹ کر لے گیا ہو۔ کچھ دیر تک ان دونوں پر شدید غم اور سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر بیوی نے انتہائی اُداس

لہجے میں شوہر سے کہا۔ "تم دوبارہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر درخواست کرو کہ ہماری یہ گم شدہ نعمت ہمیں واپس مل جائے۔"

شوہر فوراً ہی اپنے گھر سے نکلا اور سرورِ کونین ﷺ کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہو گیا۔ پھر سارا ماجرا بیان کرنے کے بعد درخواست گزار ہوا کہ آپ ﷺ دُعا فرما دیں تو اللہ کی نعمت کا وہ چشمہ پھر سے جاری ہو جائے۔

اُس شخص کی التجا سن کر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ "اگر تم یہ جاننے کی کوشش نہ کرتے کہ وہ آٹا کہاں سے آ رہا ہے تو زندگی بھر اسی غیبی امداد سے فیض یاب ہوتے رہتے۔ مگر افسوس! تمہاری بے صبری اور تجسس نے وہ سلسلہ ختم کر دیا۔ بس اللہ ہی اپنے رازوں سے باخبر ہے کہ وہ بندوں کو کس طرح اور کہاں کہاں سے رزق پہنچاتا ہے۔"

اسی طرح بعض صوفیائے کرام کو بھی دستِ غیب حاصل تھا۔

ایک بار بصرہ میں شدید قحط پڑا جس کے سبب کھانے پینے کی چیزیں بہت مہنگی ہو گئیں اور غریب لوگوں پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ ایسی سنگین صورتِ حال میں کسی شخص نے ان افلاس زدہ انسانوں سے کہا کہ اگر وہ حضرت حبیب عجمیؒ کے پاس چلے جائیں اور شیخ اُن کے حق میں دعائے خیر فرما دیں تو انشاء اللہ، فاقہ کشی کا یہ عذاب ٹل جائے گا۔ پھر جب فاقہ زدہ لوگوں کا یہ ہجوم حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوا تو آپؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔

"بازار جاؤ اور میرے نام سے ضرورت کی تمام چیزیں قرض لے لو۔ اور سب دکان داروں سے کہہ دو، حبیب عجمی تمہاری ساری رقم بہت جلد ادا کر دے گا۔"

تمام ضرورت مند لوگ خوشی خوشی بازار پہنچ اور حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا نام لے کر سامانِ خورونوش طلب کیا۔

ان غریب لوگوں کی بات سن کر تمام دکان دار بہت زور سے ہنسے۔

"کس فقیر کی بات کر رہے ہو؟ اُس کے پاس تو خود کھانے کو نہیں ہے۔ پھر وہ ہماری رقم کس طرح ادا کرے گا؟"

غریب لوگ شدید مایوسی کے عالم میں دوبارہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ ان لوگوں نے دکان داروں کی طنزیہ اور مذاق اُڑانے والی گفتگو کا حوالہ تو نہیں دیا مگر اتنا ضرور کہا۔ "شیخ! آپ کے نام پر کوئی دکان دار بھی قرض دینے کو تیار نہیں۔"

یہ سن کر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "دکان دار ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جس فقیر کے پاس خود کھانے کے لئے روٹی نہ ہو، وہ اتنی بڑی رقم کہاں سے ادا کرے گا؟" یہ کہتے ہوئے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان فاقہ زدہ انسانوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ پھر انسانی ہجوم کے ساتھ آپؒ بازار پہنچے اور دکان داروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"حق تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ انسان کے پاس اناج اور دولت کے بڑے بڑے ذخیرے موجود ہوں مگر وہ انہیں استعمال کرنے کے قابل نہ رہے۔ تمہیں ایسے نازک وقت میں اپنے بھائیوں کی مدد کرنی چاہئے تھی۔"

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی بات سن کر سب دکان داروں نے ایک جیسا جواب دیا کہ ہم اس دکان پر تجارت کی غرض سے بیٹھے ہیں، کسی کا وعظ سننے کے لئے نہیں۔"

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے انتہائی نرم و شیریں لہجے میں فرمایا۔ "میں اپنا فرض ادا کر چکا۔ تم تجارت کے لئے بیٹھے ہو۔ اس لئے ان لوگوں کو ضرورت کی تمام اشیاء فراہم کر دو۔"

حضرت شیخ حبیبؒ کی بات سن کر دکان داروں نے تمسخر کے انداز میں کہا۔ ''ہم سامان تو دے دیں گے مگر ان کی قیمت کون ادا کرے گا؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے کسی قدر پُر جلال لہجے میں فرمایا۔ ''ساری رقم یہ فقیر ادا کرے گا جس کے پاس خود کھانے کے لئے نہیں ہے؟''

ایک دکاندار نے ازراہِ مذاق دکان پر کھڑے ہوئے ایک شخص کو اُسؐ کی مطلوبہ چیزیں فراہم کر دیں۔ پھر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اتنی رقم ہوئی۔ ادا کیجئے۔''

اس وقت حضرت شیخ حبیب عجمیؒ ایک بوسیدہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ آپؒ نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور مطلوبہ رقم نکال کر دکان دار کے حوالے کر دی۔ یہ منظر تمام دکان داروں اور ضرورت مند انسانوں کے لئے بڑا ہی حیران کن تھا۔ پھر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے تمام ضرورت مند انسانوں کو سامانِ خور و نوش دلایا اور اپنی جیب سے رقم نکال نکال کر ادا کرتے رہے۔ سب لوگ اس بات پر حیرت زدہ تھے کہ بظاہر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی جیب خالی تھی مگر اس میں سے یہ ہزاروں سکے کس طرح نکل رہے تھے؟ جب لوگوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی یہ کرامت دیکھی تو ایک دکان دار نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں عرض کیا۔

''شیخ! مجھے اس رقم کی نہیں، آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

قارئین! ہم نے گزشتہ سطور میں مشہور بزرگ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی چند کرامات کا ذکر کیا تھا۔ کرامت دراصل عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں عظمت، بزرگی، نوازش۔ مگر تصوف کی اصطلاح میں کرامت اس فعل کو کہتے ہیں جو عام انسانی فطرت کے خلاف ہو۔ مثال کے طور پر کسی کام کے ایک فیصد آثار بھی نظر نہ آتے ہوں مگر وہ کام حیرت انگیز طور پر انجام پا جائے۔ یا پھر وہ کام ناممکن ہو، مگر پھر بھی ممکن ہو جائے، اسی کو کرامت کہتے ہیں۔ اہلِ علم نے کرامت کے لئے ''خرقِ عادت'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو حقیقتاً سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ خرق عادت کے معنی ہیں، وہ کام جو انسانی عقل کے خلاف ہو۔ مثال کے طور پر فطرت کا قانون ہے کہ ایک شخص مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ مگر مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ شخص ایک مقررہ وقت پر یعنی قیامت کے دن زندہ کیا جائے گا۔

قیامت کے دن انسانوں کا دوبارہ اُٹھایا جانا ایک الگ مسئلہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ساری دنیا کے سامنے قم باذن اللہ کہتے تھے۔ یعنی کھڑا ہو جا اللہ کے حکم سے۔ اور مردہ انسان اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ جو روح اس کے جسم سے ایک بار نکل گئی تھی، وہی روح دوبارہ داخل ہو جاتی تھی۔ اسی عمل کو خرق عادت یعنی عقل کے خلاف کہا جاتا ہے۔ اہلِ علم نے خلافِ عقل کام انجام دینے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ اگر یہ کام کوئی نبی یا رسول انجام دے تو اسے معجزہ کہا جاتا ہے۔ اگر اولیاء اللہ کی ذات سے یہ نشانیاں ظاہر ہوں تو اُنہیں کرامت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور اگر کسی منکرِ خدا سے یہ انہونی بات ظاہر ہو جائے تو وہ جادو کہلائے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں مشہور جادوگر سامری تھا، جس نے اپنی جادوئی طاقت سے بہت خوف ناک سانپ پیدا کر دیئے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنا عصائے مبارک زمین پر ڈال دیا اور اس نے اژدھے کی شکل اختیار کر کے سامری کے تمام سانپوں کو نگل لیا۔

ایک دن حضرت شیخ حبیب عجمیؒ اپنی خانقاہ میں مریدوں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اچانک ایک غم زدہ عورت روتی ہوئی داخل ہوئی اور حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''خاتون! تمہیں کیا غم ہے؟'' حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے انتہائی محبت آمیز لہجے میں اس اجنبی خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''شیخ! میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ ایک دن وہ گھر سے نوکری کی تلاش میں نکلا تھا، پھر واپس لوٹ کر نہیں آیا۔ میں نے اُسے بہت ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ اسے مجھ سے بچھڑے ہوئے ایک سال ہو گیا۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بیٹے کی جدائی میں ایک ماں کا کیا حال ہوگا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ اگر اس کے مرنے کی خبر ہی مل جاتی تو میں کچھ دن رو پیٹ کر صبر کر لیتی۔''

غم زدہ ماں کی فریاد سن کر حاضرین مجلس بھی اُداس نظر آنے لگے۔ اس دوران حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی آنکھیں بند تھیں۔ پھر جب وہ دل شکستہ ماں خاموش ہو گئی تو حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے آنکھیں کھولیں اور خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''بفضلِ تعالیٰ تمہارا بیٹا زندہ ہے اور پُر سکون زندگی گزار رہا ہے۔''

یہ سن کر چند لمحوں کے لئے اس عورت کے چہرے پر بے پناہ خوشی کا رنگ اُبھر آیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی وہ دوبارہ زار و قطار رونے لگی۔ ''اللہ اسے ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ مگر ایک ماں تو بہت بے قرار ہے۔ اللہ کے سوا اس کی بے قراریوں کو کوئی نہیں جانتا۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے دوبارہ اس عورت سے سوال کیا۔ ''اب تم کیا چاہتی ہو؟''

عورت نے اسی فریادی لہجے میں کہا۔ ''شیخ! میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ آپ کی دعاؤں میں بہت اثر ہے۔ بس میرے لئے اتنی دعا کر دیجئے کہ میرا بیٹا میرے پاس آجائے۔ پھر میں زندگی بھر آپ کے لئے دعا کرتی رہوں گی۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے فرمایا۔ ''خاتون! تمہارا بیٹا بصرہ سے بہت دُور ہے۔ اتنا لمبا سفر طے کرنے میں سفر خرچ بھی درکار ہوگا۔ کیا تمہارے پاس کرایہ ادا کرنے کے لئے کچھ رقم ہے؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی بات سن کر غم زدہ عورت کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے اور وہ بڑی حیرت سے بزرگ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ''شیخ! میں بہت غریب عورت ہوں۔ محنت مزدوری کر کے بڑی مشکل سے پیٹ بھرتی ہوں۔ اس وقت میرے پاس صرف دو درہم ہیں۔''

حضرت شیخ عجمیؒ نے فرمایا۔ ''دو درہم ہی کافی ہیں۔ انشاء اللہ ان سے سفر کا خرچ نکل آئے گا۔''

عورت نے خوشی خوشی وہ دو درہم حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے حوالے کر دیئے۔ حضرت شیخ نے وہ دونوں درہم اپنے ایک خدمت گار کو دیتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ کسی غریب شخص کو دے دو۔''

خدمت گار کے جانے کے بعد عورت نے حضرت حبیب عجمیؒ سے عرض کیا۔ ''شیخ! میرا بیٹا گھر واپس تو آجائے گا نا؟'' عورت کے لہجے سے ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہے۔

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے شفقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''اللہ کی ذات پاک پر بھروسہ رکھو۔ اور اپنے گھر جاؤ۔ حق تعالیٰ کے کرم سے تمہاری جدائی کے دن ختم ہو گئے۔''

''شیخ! اللہ آپ کو اور عزت دے۔'' عورت یہ کہتی ہوئی خانقاہ سے نکل کر اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ اُس نے یہ راستہ بڑی سرشاری کے عالم میں طے کیا۔ اُسے اس بات کا یقین تھا کہ شیخ حبیب عجمیؒ کی دعا سے اُس کا بیٹا واپس تو آجائے گا۔ لیکن شیخ کے بقول سفر بہت لمبا ہے۔ عورت نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ سفر کتنے دن میں طے ہوگا؟ انتظار کی کیفیت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ چند لمحے بھی گزارنے مشکل ہو جاتے ہیں۔ پھر اتنے دن

کیسے گزریں گے؟ غم زدہ ماں شدید جذباتی کیفیت سے دوچار تھی۔ کبھی اُداس ہو جاتی اور کبھی یہ سوچ کر مسکرانے لگتی کہ جہاں جدائی کا ایک سال گزارا ہے، وہاں کچھ دن اور سہی۔ الغرض اسی ذہنی کشمکش میں مبتلا وہ عورت گھر میں داخل ہوئی تو اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ وہ بیٹا جس کی ایک سال سے کوئی خبر تک نہ تھی، وہ اپنے گھر میں موجود تھا۔ حیرت اور خوشی کی زیادتی سے عورت کو سکتہ سا ہو گیا تھا۔

بیٹے کا خیال تھا کہ ماں خوشی سے وارفتہ ہو جائے گی اور آگے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لے گی۔ مگر جب عورت کی طرف سے کسی جذبے کا اظہار نہیں ہوا اور وہ پتھر کے مجسمے کی طرح ساکت کھڑی رہی تو بیٹا گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور ماں کے قریب پہنچ کر کہنے لگا۔

''ماں! آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں آپ کا بیٹا ہوں۔''

لڑکے نے تین چار بار یہ الفاظ دہرائے تو عورت کی حیرت وسکوت کی شدید کیفیت زائل ہوئی۔ پھر اُس نے بے اختیار بیٹے کو گلے لگا لیا اور اُسے پیار کرنے لگی۔ بار بار اُس کی زبان سے یہی الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

''میں تیرے سوا کسی کو پہچانتی ہی کب ہوں؟ تیری جدائی میں تو میں خود کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔''

پھر جب اُس کی جذباتی کیفیت میں اعتدال پیدا ہوا تو بیٹے سے پوچھنے لگی کہ وہ اچانک کہاں چلا گیا تھا؟ اور اتنے دن کہاں رہا؟

بیٹے نے بتایا کہ وہ روزگار کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ مکران جانے والے قافلے کے ایک شخص سے ملاقات ہو گئی۔

''اُس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے مکران میں ملازمت دلا دے گا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ آپ کو اطلاع دیتا۔ پھر بصرہ آنے والا ایسا کوئی مسافر ہی نہیں تھا، جس کے ذریعے میں آپ کو اپنی خیریت کی خبر پہنچاتا۔ بس یہی میری مجبوری تھی۔ میں اس لئے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔''

''مگر تُو بصرہ تک کیسے پہنچا؟ کیا کوئی قافلہ اِدھر آ رہا تھا؟'' ماں نے بیٹے سے دوسرا سوال کیا جسے سن کر لڑکے کے چہرے پر خوف کا رنگ اُبھر آیا اور اُس نے دہشت زدہ ہو کر اس طرح اپنے دونوں کان پکڑ لئے جیسے وہ توبہ کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔

''میں اپنی زندگی کے اس واقعے کو کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ اپنے مالک کا سودا لینے بازار جا رہا تھا کہ اچانک تیز ہوا چلنے لگی، جیسے آندھی آنے والی ہو۔ اس خوف ناک ہوا نے میرے قدم زمین سے اُکھاڑ دیئے اور پھر وہ مجھے بہت بلندی پر اُڑا لے گئی۔ میں خوف کی شدت سے چیختا رہا، اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس میری آنکھوں کے سامنے دُور تک غبار چھایا ہوا تھا۔ میری ہر چیخ کے جواب میں ایک بارُعب انسانی آواز سنائی دیتی تھی۔ ''اے ہوا! تُو اللہ کے حکم سے اس لڑکے کو سلامتی کے ساتھ اس کے گھر پہنچا دے۔'' پھر مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میرے قدم، زمین سے ٹک گئے۔ آنکھوں کے سامنے سے سارا گرد و غبار چھٹ گیا اور میں اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔''

قارئین! آپ کو اس واقعے پر حیران نہیں ہونا چاہئے۔ جس مسلمان نے بھی قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس راز سے باخبر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج، چاند، ستاروں اور ہواؤں کو انسانوں کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ ''مسخر'' کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مصنوعات کو ایک خاص نظام کے تحت اولادِ آدم کے کاموں پر مامور فرما دیا ہے۔ ''مسخر'' کا وہ مفہوم ہرگز نہیں جو یہ مادہ پرست اور گمراہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ انسان نے ہر شے کو مسخر کر

لیا ہے۔ بے شک! سائنسی ٹیکنالوجی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے، مگر بہت سے امور میں آج کا انسان اتنا ہی مجبور ہے، جتنا کہ غاروں میں رہنے والا آدم زادہ تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ بارش برسانا نہ چاہے تو تمام انسان مل کر بھی آسمان سے پانی کا ایک قطرہ نہیں برسا سکتے۔ اگر وہ قادرِ مطلق، ہوا اور پانی کا طوفان لے آئے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ اہلِ ایمان خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے معجزے کے طور پر ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا۔ اس طرح آپؑ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر لیا کرتے تھے۔ اب اگر اس ذاتِ باری تعالیٰ نے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی دعا سے ہوا کو اُس لڑکے کے لئے برق رفتار بنا دیا تو لوگوں کو حیرت کیوں؟

پھر وہی عورت دوسرے دن اپنے بچے کو لے کر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئی اور بڑے عاجزانہ لہجے میں آپؒ کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

''شیخ! یہ آپ کی دعا کا صدقہ ہے کہ میرا کھویا ہوا بیٹا مجھے دوبارہ مل گیا۔ اگر آپ دعا نہ فرماتے، ایک مجبور ماں، بیٹے کی جدائی کے غم میں تڑپ تڑپ کر مر جاتی۔''

عورت کے اظہارِ تشکر کا یہ انداز دیکھ کر حضرت حبیب عجمیؒ نے فرمایا۔ ''اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میری دعاؤں سے تیرا بیٹا واپس آیا۔''

اس عورت نے شدید حیرت سے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پھر میرا بیٹا کس طرح گھر آ گیا؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے عورت کے اس سوال کے جواب میں فرمایا۔ ''یہ تیرے اُن دو درہم کا صدقہ ہے جو تُو نے اللہ کے راستے میں خرچ کئے تھے۔''

یہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا صوفیانہ انکسار تھا کہ آپؒ نے حاضرین مجلس کے سامنے اپنی ذات کی مکمل نفی کر دی تھی۔

لڑکا بہت غور سے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی گفتگو سن رہا تھا۔ پھر اچانک اُس نے انتہائی خوشی کے لہجے میں اپنی ماں سے کہا۔ ''یہ وہی آواز ہے جو میں نے ہوا کے شور میں سنی تھی۔''

حضرت شیخ حبیب عجمی نے فوراً ہی پُر جلال لہجے میں اُس لڑکے کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''لڑکے! تم نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا، اسے بھول جاؤ۔ آئندہ کسی کے سامنے اس بات کو اپنی زبان پر بھی نہ لانا۔ ماں کی نظروں کے سامنے رہو اور اس کی خدمت کرو۔ بس اسی میں تمہاری نجات ہے۔''

ایک دن بصرہ کے ایک بہت بڑے عالم، حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے گھر تشریف لائے اور تصوف کے موضوع پر گفتگو کرنے لگے۔ واضح رہے کہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کوئی فقیہہ و محدث یا مذہبی اسکالر نہیں تھے۔ آپؒ نے بس اتنی تعلیم حاصل کی تھی کہ پڑھے لکھے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ مزید یہ کہ آپؒ عربی النسل نہیں تھے۔ اس لئے عجمی کہلاتے تھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ عربوں کو اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز تھا۔ اس لئے ساری دنیا کے لوگوں کو عجمی یعنی گونگا کہہ کر پکارتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ غیر عرب ہونے کی وجہ سے لوگوں نے مذاقاً آپؒ کے نام کے ساتھ عجمی کا اضافہ کر دیا ہو۔ پھر یہی لفظ آپؒ کے نام کا لازمی حصہ بن گیا۔ بصرہ کے وہ عالم جو حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے گھر تشریف لائے ہوئے تھے، دراصل حضرت شیخ کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ حبیب عجمی، علم و فضل کے کس درجے پر فائز ہیں۔ بصرہ کے وہ عالم جان بوجھ کر ''فقہ'' کے مشکل ترین سوالات کرتے رہے تاکہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ جواب دینے سے عاجز رہیں۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ بڑے انکسار کے

ساتھ جواب دیتے رہے۔

"میرے بھائی! نہ میں عالم ہوں، نہ دانشور۔ نہ میرا کوئی منبر ہے، نہ میرے سر پر دستارِ فضیلت۔ میں تو اللہ کا ایک حقیر و گناہگار بندہ ہوں اور دنیا کی ہنگامہ خیزیوں سے بہت دُور دریائے فرات کے کنارے لوگوں سے منہ چھپائے ایک گوشے میں پڑا ہوں۔"

عالم بصرہ نے کسی قدر تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "جب تم مذہب اسلام کے اسرار و رموز نہیں جانتے تھے، پھر تم نے اپنے گرد اللہ کے بندوں کی بھیڑ کیوں لگا رکھی ہے؟ اس طرح تو گمراہی بھی پھیل سکتی ہے۔"

بات بہت ہی تلخ اور ناگوار تھی۔ مگر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا، جو صوفیائے کرام کا مخصوص اندازِ گفتگو ہوتا ہے۔

"حضرت! اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانوں کو مختلف کاموں کے لئے پیدا کیا ہے۔ جب مذہب کے اسرار و رموز سمجھانے کے لئے بصرہ میں آپ جیسے عالم و فاضل انسان موجود ہیں تو پھر میری کیا ضرورت؟"

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا جواب سن کر بصرہ کے عالم نے اسی ناگوار لہجے میں کہا۔ "پھر تمہاری یہ خانقاہ لوگوں سے کیوں بھری رہتی ہے؟ اور تم اپنی کم علمی کے باوجود یہاں آنے والے لوگوں کو کیا تعلیم دیتے ہو؟"

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ "میں کسی کے گھر جا کر نہیں کہتا کہ وہ میری خانقاہ میں حاضری دے۔ یہ ان لوگوں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ مجھ گناہگار سے عقیدت رکھتے ہیں۔ رہا سوال یہ کہ میں یہاں آنے والوں کو کیا تعلیم دیتا ہوں تو بس یہ سمجھ لیجئے کہ میں اللہ کو اپنا معبود اور لاشریک سمجھتا ہوں۔ میرے آقا محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، اللہ کے آخری رسول ہیں۔ اب نہ کوئی کتاب نازل ہوگی اور نہ کوئی رسول اس دنیا میں جلوہ افروز ہوگا۔ بس یہی میرا ایمان ہے اور یہی میرا عقیدہ ہے۔ اور میں اپنے اس عقیدے پر ہزار بار جان دینے کو تیار ہوں۔ اللہ کے جو بندے میرے یہاں آتے ہیں، میں اُنہیں بھی یہی تعلیم دیتا ہوں۔"

علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں انہی دنیا دار فقیروں اور اللہ کے راستے میں سر بکف رہنے والے قلندروں کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہرِ قاروں ہے ، لغت ہائے حجازی کا

گزشتہ سطور میں ہم نے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی ایک ایسی کرامت کا ذکر کیا تھا کہ آپؒ کی دعا سے ایک تیز آندھی آئی تھی جو ایک لڑکے کو مکران سے اُڑا کر بصرہ لے آئی تھی۔ اور اُسے اس کی بچھڑی ہوئی ماں سے ملا دیا تھا۔ جو لوگ اولیائے کرام کی کرامت کے منکر ہیں، اُن کے خیال میں عملی طور پر یہ واقعہ ممکن نہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں ہم قرآن کریم سے اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی، حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ پیش کر سکتے ہیں۔ معجزانہ طور پر آپؑ کو سب سے زیادہ مضبوط سلطنت عطا کی گئی تھی۔ آپؑ چرندوں پرندوں یہاں تک کہ چیونٹیوں تک کی زبان بھی سمجھتے تھے۔ تمام انسانوں اور جنات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا مطیع اور فرماں بردار بنا دیا گیا تھا۔ بڑے سے بڑا سرکش اور طاقت ور جن بھی اللہ کے نبی کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔ ان تمام نوازشات اور کرم فرمائیوں کے علاوہ حق تعالیٰ نے ایک خصوصی کرم یہ بھی فرمایا تھا کہ آپؑ کے لئے ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا۔ نتیجتاً حضرت سلیمان علیہ السلام ان ہواؤں کے ذریعے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر لیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی دعا سے قادرِ مطلق نے اسی ہوا کو اُس لڑکے کے لئے برق رفتار سواری بنا کر مختصر سے وقت میں اس

کے گھر پہنچا دیا تھا۔ پھر ظاہر پرستوں کو اس واقعے پر حیرت کیوں؟
اگر ہم دنیاوی اعتبار سے بھی آمد و رفت کا جائزہ لیں تو ڈیڑھ دو سو سال پہلے انسان پیدل یا اونٹوں اور گھوڑوں پر سفر کرتا تھا۔ پھر ریل ایجاد ہوئی اور سفر کی رفتار تیز ہو گئی۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ جنگی طیارے ہزاروں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتے ہیں۔ اگر یہ بات پس ماندہ علاقوں میں رہنے والے لوگوں سے کہی جائے تو وہ اس حقیقت کو جھٹلا دیں گے اور بے ساختہ پکار اُٹھیں گے کہ ایک انسان، ہوا میں کیسے اُڑ سکتا ہے؟ یہ تو انسانی ٹیکنالوجی کا حال ہے۔

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اب ایک لمحے کے لئے ذاتِ پاک کی ٹیکنالوجی کے بارے میں سوچئے جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔ تمام طاقتیں اور قدرتیں جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتیں، وہ سب کی سب تنہا اس ذات پاک میں نہ صرف جمع ہیں بلکہ اس کی محتاج بھی ہیں۔ کوئی پتا اس کے حکم کے بغیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔ اور کوئی ذی روح اس کے حکم کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ وہ ایسا بے نیاز ہے کہ اسے کسی شے کی حاجت نہیں۔ وہ ایسا قادرِ مطلق ہے کہ اگر "کُن" کہہ دے تو ایک سیکنڈ میں سارے اسباب جمع ہو جائیں۔ اور وہ ایسی ٹیکنالوجی کا مالک ہے جو کبھی فیل نہیں ہوتی۔ اللہ کی بے مثال اور عظیم الشان ٹیکنالوجی کو تھوڑا بہت اس کے دوست ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اور دوستوں ہی سے کچھ راز کی باتیں کی جاسکتی ہیں۔

بے شک! حضرت حبیب عجمیؒ اللہ کے دوستوں میں شامل تھے اور آپؒ کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ اللہ کے ہزاروں بندے آپؒ کے آستانۂ عالیہ پر کھڑے رہتے تھے۔ علمائے ظاہر کو یہ بات سخت گراں گزرتی تھی کہ ایک کم پڑھے لکھے شخص کے دروازے پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا اور ان کی مجلسوں میں چند شاگردوں کے علاوہ بہت کم لوگ آیا کرتے تھے۔ ایک دن بصرہ کے ایک اور عالم، حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی خانقاہ پہنچے۔ دراصل وہ یہ راز جاننا چاہتے تھے کہ آخر ایک صوفی میں ایسی کون سی خاص بات ہے جس کی وجہ سے اس کے دروازے پر انسانوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ایک دن جب وہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے آستانے کے قریب پہنچے تو حسب دستور عقیدت مندوں کی بھیڑ جمع تھی۔ عالم نے ایک شخص سے دریافت کیا۔ "تم یہاں کیوں آتے ہو؟"

اس شخص نے انتہائی عقیدت مندانہ لہجے میں جواب دیا۔ "حضرت شیخ کا دیدار کرنے۔"

بصرہ کے عالم نے اس شخص سے دوسرا سوال کیا۔ "تمہیں شیخ کے دیدار سے کیا حاصل ہوتا ہے؟"

اس شخص نے اسی وارفتگی کے عالم میں کہا۔ "ہمارے کاموں میں برکت ہو جاتی ہے۔ بہت سی مشکلات دُور ہو جاتی ہیں۔"

بصرہ کے عالم نے سخت ناگوار لہجے میں کہا۔ "تم لوگ شدید گمراہی میں مبتلا ہو۔ تمہیں خبر ہی نہیں کہ تم انجانے میں شرک کر رہے ہو۔ کسی انسان کے دیدار سے کچھ نہیں ہوتا۔ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔" بصرہ کے عالم کا جواب سن کر اس شخص نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا۔ "معاذ اللہ...... میں نے یہ کب کہا کہ حضرت شیخ کارساز اور مشکل کشا ہیں؟ مگر وہ یقیناً مستجاب الدعوات ہیں۔"

"اگر تم کسی مذہبی عالم کی صحبت میں بیٹھتے تو تمہیں پتہ چلتا کہ اللہ سب کی سنتا ہے۔ افسوس! ان صوفیوں نے مذہب کے نام پر دکانیں کھول رکھی ہیں۔" بصرہ کے عالم کی بات سے بہت سے چہروں پر غصے کا رنگ اُبھر آیا۔

اس سے پہلے کہ وہ لوگ اس عالم کو کوئی سخت جواب دیتے، اچانک شیخ حبیب عجمیؒ خانقاہ کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ انسانی ہجوم سے بیک وقت بہت سی آوازیں اُبھریں۔

''السلام علیکم یا شیخ محترم!''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے نہایت محبت آمیز لہجے میں سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ ''تم سب لوگوں پر اللہ کی سلامتی ہو کہ تم نے اس گناہ گار و نا کارہ سے حُسنِ ظن رکھا۔''

یہ کہہ کر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے چند قدم آگے بڑھ کر بصرہ کے عالم کو سلام کیا اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ پھر آپؒ اُنہیں لے کر اپنی خانقاہ میں آ گئے۔

دوپہر کا وقت ہو چکا تھا۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے ان عالم کی مزاج پرسی کی اور اپنے عقیدت مندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''وہ میری طرح بہت ہی کم پڑھے لکھے ہیں۔ اس لئے ان کی نادانیوں کو معاف کر دیجئے گا۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی بات سن کر بصرہ کے عالم کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ ساری گفتگو تو ان کی عدم موجودگی میں ہوئی تھی، پھر انہیں ان باتوں کی کس طرح خبر ہو گئی؟ ابھی وہ عالم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ خدمت گار، کھانا لے کر آ گیا۔

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے بصرہ کے عالم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''پہلے مہمان کی تواضع، بعد میں دوسری باتیں۔''

کھانا کیا تھا؟ چار جو کی روٹیاں اور معمولی سالن۔ بصرہ کے عالم نے بہت غور سے اُس درویش کی غذا کو دیکھا، جس کے دروازے پر بڑے بڑے اُمراء ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اسی وقت کسی سائل نے صدا لگائی۔ ''اللہ کے نام پر کچھ دو...... بہت بھوکا ہوں۔''

سائل کی صدا سن کر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے اپنے خادم کو آواز دی۔ پھر جب خدمت گار حاضر ہوا تو آپؒ نے فرمایا۔ ''دروازے پر ایک بھوکا شخص کھڑا ہے...... اس کی ضرورت پوری کرو۔''

حضرت شیخ کی بات سن کر خادم نے سر جھکا لیا۔ ''گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

حضرت حبیب عجمیؒ نے مہمان کے سامنے رکھے ہوئے کھانے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔ ''یہ اٹھا کر سائل کو دے دو کہ اس کی بھوک ہم سے زیادہ ہے۔''

شیخ کا حکم سن کر خدمت گار نے کھانا اُٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

بصرہ کے عالم جو پہلے ہی حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی طرف سے اپنے دل میں غبار رکھتے تھے، شیخ کا یہ انداز دیکھ کر شدید طنزیہ انداز میں مسکرائے۔ ''آپ نے مہمان کی خوب تواضع کی۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے فرمایا۔ ''مجھ غریب کے گھر میں جو کچھ تھا، وہ اپنے مہمان کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کھانا آپ کے قابل نہیں تھا۔ مگر اللہ نے اپنے اِس فقیر کی خوب لاج رکھی کہ دوسرے مہمان کو بھیج دیا۔'' حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی بات سن کر بصرہ کے ان عالم کو ایک بار پھر شدید حیرت ہوئی۔

واقعہ یہ تھا کہ جب خدمت گار نے بصرہ کے عالم کے سامنے کھانا لا کر رکھا تھا تو انہیں وہ معمولی غذا پسند نہیں آئی تھی اور دل ہی دل میں سوچا تھا کہ اگر حبیب عجمیؒ کھانے کی دعوت ہی نہیں دیتے تو اچھا تھا۔ انکار اس لئے نہیں

کر سکتے تھے کہ ایک عالم کی شخصیت پر حرف آتا۔ مگر جب ان کی نیت اپنے میزبان پر ظاہر ہو گئی تو حیرت زدہ رہ گئے اور حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا امتحان لینے کی غرض سے ایک عجیب سوال کر ڈالا۔

''آج کل جاہل لوگوں کے حلقے میں صوفیاء کی کشف و کرامت کا بہت شور ہے۔ آخر یہ کشف و کرامت ہے کیا؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''ایک جاہل، آپ کے سوال کا کیا جواب دے گا؟ کسی عالم و فاضل انسان سے دریافت کریں۔'' واضح رہے کہ بصرہ کے عالم، حضرت شیخ عجمیؒ ہی کو نہیں، تمام صوفیاء کو جاہل سمجھتے تھے۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے اسی طرف اشارہ کیا تھا۔ ''اور میں صوفی بھی نہیں ہوں کہ آپ کے سامنے کشف و کرامت کی تشریح کر سکوں۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا جواب سن کر عالم بصرہ نے پوچھا۔ ''پھر آپ کیا ہیں؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے فرمایا۔ ''میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ جس روز اُس ذاتِ وحدہٗ لاشریک کی کبریائی کا اقرار کیا تھا، اسی دن تمام موجودات کے ساتھ اپنی ذات کی بھی نفی کر دی تھی۔ اللہ کے سوا یہاں کچھ نہیں۔''

اس سے پہلے کہ عالم بصرہ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ سے دوسرا سوال کرتے، خدمت گار اپنے ہاتھوں میں ایک بہت بڑا خوان اُٹھائے دوبارہ حاضر ہوا۔ خوان میں طرح طرح کے لذیذ کھانے موجود تھے۔ خادم نے وہ خوان مہمان کے سامنے رکھ دیا اور ایک تھیلی حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی طرف بڑھائی جس میں پانچ سو درہم موجود تھے۔ آپؒ نے خدمت گار کو حکم دیا کہ یہ ساری رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائے۔ پھر اپنے مہمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''بسم اللہ...... رزّاقِ عالم نے آپ کی پسند کا کھانا بھیج دیا۔'' اس کے ساتھ ہی آپؒ بھی کھانے میں شریک ہو گئے اور کھانے کے دوران کئی بار فرمایا۔ ''یہ غذا میرے معدے کو راس نہیں آتی۔ مگر مہمان کا ساتھ نہ دینا بھی بدتہذیبی ہے۔''

کھانے کے بعد حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے عالم بصرہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''کشف و کرامت، اللہ کے فضل و کرم کا نام ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت۔ اُسے کوئی روکنے والا نہیں۔ جس کا سینہ کھول دیا، اُسے کشف ہو گیا۔ جس کی عقل پر پردے ڈال دیئے، وہ کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا ہے۔ مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ حق تعالیٰ چاہے تو ایک غریب دکاندار کا کھوٹا مال بھی بک جاتا ہے۔ اور اگر نہ چاہے تو کھرے مال والوں کا سارا سامان گوداموں میں پڑے پڑے سڑ جاتا ہے۔''

عالم بصرہ کو سکتہ سا ہو گیا۔ یہ وہی الفاظ تھے جو انہوں نے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کی خانقاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر صوفیاء کے بارے میں کہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب عامل عراق، حجاج بن یوسف کے جاسوس، حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی تلاش میں تھے۔ اور یہ عظیم محدث و فقیہہ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک دن حضرت حسن بصریؒ چھپتے چھپاتے اپنے مرید حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے گھر تشریف لے گئے۔ اگرچہ آپؒ نے بہت احتیاط سے کام لیا تھا لیکن پھر بھی حجاج بن یوسف کے ایک جاسوس نے حضرت امام حسن بصریؒ کو شیخ حبیب عجمیؒ کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ پیر و مرشد کو اپنے حجرۂ خاص میں بٹھایا۔

اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی اور کسی نے چیخ کر کہا۔ ''دروازہ کھولو!'' آواز کی کرختگی سے اندازہ ہو رہا

تھا کہ آنے والا کوئی عقیدت مند نہیں ہے۔

حضرت امام حسن بصریؒ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ آنے والا کہیں حکومت کا کوئی جاسوس نہ ہو۔ اس لئے آپؒ نے حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کو حالات سے باخبر کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اس کا خیال رکھنا کہ حجاج بن یوسف کے جاسوس میری تلاش میں ہیں۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے عرض کیا۔ ''استادِ گرامی! آپ مطمئن رہیں۔ اللہ بہترین چال چلنے والا ہے۔''

حضرت حبیب عجمیؒ جیسے ہی باہر تشریف لائے، دروازے پر ایک دراز قامت شخص کھڑا تھا، جس کے ہاتھ میں شمشیرِ بے نیام تھی۔ اس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

''میں نے کچھ دیر پہلے امام حسن بصری کو تمہارے گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہیں؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے فرمایا۔ ''امام تشریف تو لائے تھے مگر میں نہیں جانتا کہ آرام کر رہے ہیں یا واپس چلے گئے۔''

حجاج بن یوسف کے جاسوس نے اسی قہر ناک لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں۔ میں مکان کی تلاشی لوں گا۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے انتہائی مطمئن لہجے میں فرمایا۔ ''تم جس طرح چاہو، اپنی تسلی کرلو۔''

یہ کہہ کر آپؒ گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ حجاج بن یوسف کا جاسوس آپؒ کے پیچھے پیچھے تھا۔

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے مکان میں صرف دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ایک میں آپؒ کی شریکِ حیات رہتی تھیں اور دوسرا کمرہ آپؒ کی عبادت و ریاضت کے لئے مخصوص تھا۔ ایک طویل صحن تھا، جس پر چھت پڑی ہوئی تھی۔ یہاں آپؒ کے چند خدمت گار رہتے تھے۔ اور یہی آپؒ کی خانقاہ تھی۔ جہاں مریدوں کو درس دیا کرتے تھے۔

حجاج بن یوسف کے جاسوس نے سب سے پہلے خانقاہ کی تلاشی لی۔ ایک ایک خدمت گار کو بہت غور سے دیکھا، پھر حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے مکان میں داخل ہو گیا۔ اور اس کمرے کی تلاشی لی، جس میں آپؒ کی شریکِ حیات رہتی تھیں۔ پھر وہ جاسوس، حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے حجرے کی طرف بڑھا۔ آپؒ نے باہر جاتے وقت اپنے کمرے کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ جاسوس نے ٹھوکر مار کر دروازہ کھولا۔ اس وقت حضرت شیخ حبیب عجمیؒ زیرِ لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ وہ بڑا ہی عجیب منظر تھا۔ حضرت امام حسن بصری سامنے موجود تھے۔ مگر حجاج بن یوسف کے جاسوس کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ آخر اُس نے شدید طیش کے عالم میں جھنجلا کر کہا۔ ''کیا تمہارے مکان کا دوسرا دروازہ بھی ہے؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے انتہائی پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ ''اس فقیر کے گھر کا تو ایک ہی دروازہ ہے...... مگر اللہ کی رحمت اور پناہ کے بے شمار دروازے ہیں۔''

حجاج کا جاسوس ایک مردِ مومن کی اس بات کا مفہوم تو کیا سمجھتا، بس شدید غیظ و غضب میں یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ ''آخر امام حسن بصری کہاں تک بھاگیں گے؟ اُنہیں ایک دن عاملِ عراق کی خدمت میں حاضر ہونا ہی ہے۔''

جاسوس کے جانے کے بعد حضرت امام حسن بصری نے سکون کا سانس لیا اور اپنے مرید سے فرمایا۔ ''تم نے یہ کہہ کر اس شخص کو باہر سے کیوں ٹال نہیں دیا کہ میں یہاں آیا ہی نہیں؟''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے نہایت عاجزی اور ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔ ''امام! میں جھوٹ کس طرح

بولتا؟''

حضرت امام حسن بصریؒ نے بڑی حیرت سے اپنے مرید کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''پھر تم نے ایسا کون سا عمل کیا تھا کہ وہ بار بار میری طرف دیکھتا تھا مگر میں اُسے نظر نہیں آتا تھا؟''

جواب میں حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے عرض کیا۔ ''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ بس دس بار آیت الکرسی، دس بار آمن الرسول اور دس بار قل ھو اللہ احد پڑھ کر دعا مانگی تھی۔ اے اللہ! میں اپنے پیر و مرشد کو تیرے سپرد کرتا ہوں۔ بس تُو ہی حافظ و حفیظ ہے۔''

یہ سن کر حضرت امام حسن بصری کے چہرۂ مبارک پر محبت کا ایک خاص رنگ اُبھر آیا۔ پھر آپؒ نے انتہائی جذب و کیف کے عالم میں فرمایا۔ ''واقعی، تم حبیب ہو۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ ''اے اللہ! جو تجھ سے خوش نہیں، اسے دنیا کی کوئی خوش نصیبی نہ ہو۔ اور جسے تجھ سے محبت نہیں، اسے کسی سے بھی محبت نہ ہو۔''

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کا تعلق ایران کے کسی علاقے سے تھا۔ اس لئے ''عجمی'' کہلاتے تھے۔ جب آپؒ کے سامنے قرآن کریم پڑھا جاتا تو مسلسل روتے رہتے تھے۔ ایک بار عربی زبان کے کسی ماہر عالم نے طنزیہ لہجے میں آپؒ سے کہا۔ ''تم سمجھتے تو کچھ بھی نہیں۔ پھر روتے کیوں ہو؟''

حضرت شیخ حبیب عجمی نے انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ''میری زبان عجمی سہی مگر دل تو عربی ہے۔''

علامہ اقبال نے بھی اسی مفہوم کو بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے میری

آخر 156ھ میں حضرت شیخ حبیب عجمیؒ نے وفات پائی۔ آپؒ کا مزارِ مبارک بصرہ میں ہے۔ حق تعالیٰ نے آپؒ کے سلسلۂ تصوف کو بہت مقبولیت عطا فرمائی۔ عظیم صوفی بزرگ حضرت جنید بغدادیؒ، آپؒ ہی کے سلسلے میں شامل ہیں۔

❀❀❀

حضرت فضیل بن عیاضؒ

حضرت شیخ حبیب عجمیؒ کے بعد ہم سلسلۂ چشتیہ کے ایک اور عظیم بزرگ حضرت فضیل بن عیاضؒ کا ذکر کریں گے۔

گزشتہ مضامین میں اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ اکثر روایتوں کے مطابق سلسلہ چشتیہ کی ابتدا عظیم محدث وفقیہہ، حضرت امام حسن بصریؒ سے ہوتی ہے۔ حضرت امام حسن بصریؒ نے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کو خرقہ خلافت عطا کیا تھا۔ پھر جب حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے تو یہ امانت حضرت فضیل بن عیاض کے سپرد کر دی۔ بعض اولیائے کرام کی طرح حضرت فضیل بن عیاض کے حالاتِ زندگی پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے۔ کسی مستند تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپؒ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟ کس خاندان اور علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔

اولیائے کرام کے حوالے سے تین کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں، جنہیں تصوف کی دنیا میں بہت شہرت حاصل ہے۔

مشہور صوفی حضرت فرید الدین عطارؒ کی تصنیف ''تذکرۃ الاولیاء'' ...... سیّد امیر خورد کی ''سیرالاولیاء'' اور شیخ الہدیہ کی ''سیّد الاقطاب'' ...... ان تینوں تذکروں میں یہ بات مشترک ہے کہ حضرت فضیل بن عیاض اپنی جوانی میں راہزنی کرتے تھے اور ڈاکوؤں کے سردار تھے۔

تذکرۃ الاولیاء کی روایت کے مطابق حضرت فضیل بن عیاضؒ ایک خوبصورت انسان تھے۔ سرخ و سپید چہرہ، گھنی سیاہ داڑھی تھی۔ اُون کی ٹوپی اور ٹاٹ کا لباس پہنتے تھے۔ گلے میں تسبیح پڑی رہتی تھی۔ انجان شخص پہلی نظر میں آپؒ کی ظاہری شخصیت سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ اور حضرت فضیل بن عیاضؒ کو کوئی خدارسیدہ بزرگ سمجھتا تھا۔ مگر یہی درویش نما نوجوان شہر بہ شہر اور صحرا بہ صحرا ڈاکے ڈالتا پھرتا تھا۔ پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھتا تھا اور لوگوں کا مال بھی لوٹتا تھا۔ اس کے گروہ میں بہت سے ڈاکو شامل تھے۔ اگر کوئی ڈاکو نماز نہیں پڑھتا تھا تو سردار کے حکم پر اُسے راہ زنوں کی جماعت سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ کی خاص عادت تھی کہ لوٹے ہوئے مال میں سے پسندیدہ چیز اپنے لئے رکھ لیتے تھے اور باقی سامان اپنے ساتھیوں میں برابر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔

ایک بار حضرت فضیل بن عیاض کو اطلاع ملی کہ ایک قافلہ گزرنے والا ہے اور جس میں کچھ امیر لوگ بھی شامل ہیں۔ آپؒ نے اپنے ڈاکوؤں کو ہدایات جاری کر دیں کہ ان مالدار لوگوں پر نظر رکھی جاتے۔ مختصر یہ کہ حضرت فضیل بن عیاض نے اپنی منصوبہ بندی مکمل کی اور خود دریا کے کنارے جا بیٹھے۔ مصلّٰی بچھایا اور تسبیح پڑھنے لگے۔ پھر جب وہ قافلہ ادھر سے گزرا تو ڈاکوؤں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ ایک شخص جس کے پاس بہت زیادہ رقم تھی، وہ پہلے ہی ہوشیار ہو گیا تھا۔ پھر اس نے راستہ کاٹا اور دریا کی طرف نکل گیا۔ وہ اپنی رقم کسی محفوظ جگہ پر زیرِ زمین چھپا دینا چاہتا تھا۔ جب اس کی نظر دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک نوجوان پر پڑی تو دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔

تیزی سے حضرت فضیل بن عیاض کے قریب پہنچا اور درخواست کرنے لگا۔

''بزرگ! میں بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے اس وقت آپ کی مدد کی شدید ضرورت ہے۔''
حضرت فضیل بن عیاضؒ اس وقت آنکھیں بند کئے تسبیح پڑھنے میں مشغول تھے۔ ایک اجنبی کی آواز سن کر آپؒ نے آنکھیں کھولیں اور اس شخص کی طرف دیکھا جو اپنے ہاتھوں میں کئی تھیلیاں لئے کھڑا تھا۔
آپؒ نے اجنبی سے پوچھا۔ ''تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟''
مالدار تاجر نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''میں جس قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا، وہ اس وقت ڈاکوؤں کی زد میں ہے۔ میرا باقی سامان وہیں پڑا ہے۔ بڑی مشکل سے نقد رقم لے کر یہاں آیا ہوں۔ آپ اسے امانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لیں تاکہ میرا سرمایہ، ڈاکوؤں کی دراز دستی سے محفوظ رہے۔''
حضرت فضیل بن عیاض نے اس مالدار تاجر سے سوال کیا۔ ''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمہاری یہ رقم میرے پاس محفوظ رہے گی؟''
مالدار تاجر نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''جو شخص اپنی نوجوانی میں اس قدر عبادت گزار ہو، اس کی امانت داری پر کون شک کر سکتا ہے؟ مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔''
مالدار تاجر کی بات سن کر حضرت فضیل بن عیاض نے اسے بہت غور سے دیکھا اور پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم پتھروں کے اس ڈھیر میں اپنی رقم چھپا دو۔''
تاجر نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور جب وہ قافلے میں واپس پہنچا تو سارے مسافروں کے ساتھ اس کا ساز و سامان بھی لٹ چکا تھا۔ تاجر کو اپنا اسبابِ سفر لٹ جانے پر افسوس تو ہوا، مگر دل ہی دل میں اظہارِ مسرت بھی کیا کہ اس کی عقل مندی کی وجہ سے نقد رقم بچ گئی۔ الغرض وہ مال دار، لٹ جانے والے اپنے دوسرے ہم سفروں کو روتا چھوڑ کر دریا کی طرف چلا گیا، جہاں وہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کے کہنے پر اپنی رقم پتھروں کے نیچے چھپا کر رکھ آیا تھا۔ مگر جیسے ہی وہ شخص وہاں پہنچا، اُسے سکتہ ہو گیا۔ تمام ڈاکو، حضرت فضیل بن عیاضؒ کے قریب جمع تھے اور لوٹا ہوا مال تقسیم کیا جا رہا تھا۔
یہ منظر دیکھ کر اس مالدار شخص کے دل سے ہائے نکلی اور وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔ ''افسوس...... مجھ پر ہزار بار افسوس...... میں نے جسے درویش سمجھا، وہ قزاقوں اور لٹیروں کا ساتھی نکلا...... کیا دنیا میں میری طرح بھی کوئی نادان ہوگا کہ جس نے اپنے ہاتھ سے اپنا سرمایہ ایک ڈاکو کے حوالے کر دیا ہو؟''
ابھی وہ شخص دل ہی دل میں اپنے لٹ جانے کا ماتم کر رہا تھا کہ حضرت فضیل بن عیاض کی نظر اُس پر پڑی۔
آپؒ نے با آواز بلند اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''
وہ شخص ڈرا سہما قریب آیا اور کہنے لگا۔ ''آپ مجھے پہچانتے نہیں؟''
یہ سن کر حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ میری تمہاری کوئی رسم و راہ نہیں...... اس لئے کیسے پہچان سکتا ہوں؟''
حضرت فضیل بن عیاضؒ کے اس سوال سے وہ شخص یہی سمجھا کہ آپؒ بہانہ بازی سے کام لے رہے ہیں۔ ایک ڈاکو اسے کیسے پہچان سکتا ہے، جسے لوٹا گیا ہو...... پھر اپنے دل کا غبار ہلکا کرنے کے لئے وہ شخص انتہائی تلخ لہجے میں بولا۔ ''کچھ دیر پہلے ہی تو میں آیا تھا اور اپنی امانت آپ کے سپرد کر گیا تھا۔''
حضرت فضیل بن عیاضؒ نے معذرت خواہانہ لہجے میں فرمایا۔ ''معاف کرنا میرے بھائی! تم بھی جلدی میں تھے اور میں نے بھی تمہاری طرف غور سے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے نہ پہچان سکا۔ تمہاری امانت جہاں رکھی ہے،

وہاں سے اٹھا لو۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ کا جواب سن کر اس شخص کے غم زدہ چہرے پر مسرت کا گہرا رنگ اُبھر آیا اور وہ بھاگتا ہوا پتھروں کے ڈھیر تک پہنچا۔ واقعتاً اُس کی تمام تھیلیاں اسی حالت میں موجود تھیں، جس طرح چھوڑ کر گیا تھا۔ ایک بار پھر اس شخص پر حیرت کی شدید کیفیت طاری ہوئی اور وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔

'یہ کیسا ڈاکو ہے کہ قافلے والوں کا عام سامان تو لوٹ لیا اور اتنی بڑی رقم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا'
چند لمحوں تک وہ شخص اسی حیرت و بے یقینی کی کیفیت سے دوچار رہا۔ اور پھر اپنی تھیلیاں اٹھا کر حضرت فضیل بن عیاضؒ کے پاس آیا، پھر بڑے عاجزانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "اس کرم نوازی کا بہت شکریہ کہ آپ نے میری امانت کی حفاظت کی۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ کے ساتھی ڈاکوؤں نے یہ عجیب منظر دیکھا تو سب کے سب پکار اُٹھے۔ "سردار! اس مال میں تو ہمارا حصہ ہے۔ پھر آپ اسے واپس کیوں کر رہے ہیں؟"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اپنے ساتھیوں کا سوال سن کر فرمایا۔ "اس مال میں نہ تمہارا حصہ ہے نہ میرا۔ یہ رقم میرے پاس امانت کے طور پر رکھی تھی، سو میں نے لوٹا دی۔"

دوسرے ساتھی نے بڑے تعجب کے ساتھ پوچھا۔ "سردار! آخر آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے بڑے پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ "اس شخص نے مجھ پر بھروسہ کیا تھا...... اور میں اپنے اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں۔"

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ اپنے راستے سے بھٹک ضرور گئے تھے لیکن دل کی گہرائی میں ایمان کی ایک دبی ہوئی چنگاری موجود تھی۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت فضیل بن عیاضؒ بہت باہمت اور بامروّت انسان تھے۔ کسی تذکرہ نگار نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کی شخصیت میں یہ تضاد کیوں تھا؟ تضاد سے ہماری مراد یہ ہے کہ ایک طرف آپؒ نماز بھی پڑھتے تھے، روزے بھی رکھتے تھے۔ اور دوسری طرف ڈاکے بھی ڈالتے تھے۔ آخر آپ کے کردار میں یہ دورنگی کیوں تھی؟

ایک روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کو آغازِ شباب میں کسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ آپؒ اُس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر معاشی حالات اچھے نہیں تھے۔ لڑکی کے ماں باپ نے اس کی شادی کسی اچھی جگہ کر دی۔ نتیجتاً حضرت فضیل بن عیاضؒ پر شدید ردِعمل ہوا اور آپؒ اپنی غربت دُور کرنے کے لئے ڈاکے ڈالنے لگے۔ یہ بھی محض قیاس آرائی ہے۔ ورنہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آپؒ اس سنگ دلانہ فعل پر کس طرح آمادہ ہوئے۔

تذکرۃ الاولیاء کے مصنف حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ کی روایت کے مطابق فضیل بن عیاض کے ڈاکہ ڈالنے کے بھی کچھ اصول تھے۔ آپؒ نے اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اس قافلے کو ہرگز نہ لوٹا جائے جس میں کوئی عورت شامل ہو۔ اسی طرح اس شخص کو بھی نہ لوٹا جائے جس کے پاس تھوڑا بہت مال ہو۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ کا حکم تھا کہ صرف مالدار لوگوں کو لوٹا جائے۔ مگر ان کے پاس اتنا مال چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ ایک بار کسی جگہ رات کے وقت ایک قافلہ آ کر ٹھہرا۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ اس سے پہلے کہ آپؒ قافلے کو لوٹنے کا حکم دیتے کہ اچانک ایک خوش الحان قاری کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑے کیف و جذب کے عالم میں سورۃ حدید کی آیت نمبر 16 کی تلاوت کر رہا تھا۔

''کیا اہلِ ایمان کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے خوف سے لرز جائیں۔''

یہ آیت مقدسہ سن کر حضرت فضیل بن عیاضؒ کو سکتہ سا ہو گیا۔ ساتھی ڈاکو کچھ دیر خاموش رہے۔ انہوں نے اپنے سردار کو گم سم دیکھا تو کہنے لگے۔

''اس قافلے کے لئے کیا حکم ہے؟''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے شکستہ لہجے میں فرمایا۔ ''اسے جانے دو...... سلامتی کے ساتھ جانے دو...... اس قافلے کے گزر جانے ہی میں ہم سب کی سلامتی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے حضرت فضیل بن عیاضؒ اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹے۔ تمام ساتھی ڈاکو بھی آپؒ کے پیچھے پیچھے چپ چاپ چل رہے تھے۔ اور ہر شخص اپنی جگہ یہ سوچ کر حیران و پریشان ہو رہا تھا کہ آخر کس بات نے سردار کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ آج تک تو ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی قافلہ ادھر سے سلامتی کے ساتھ گزر گیا ہو۔ راستے میں اندھیرا تھا، اس لئے کوئی ڈاکو اپنے سردار کے چہرے سے اس کی دلی کیفیات کا اندازہ نہ کر سکا۔ مگر جب حضرت فضیل بن عیاضؒ اپنے خیمے میں پہنچے اور ساتھیوں نے چراغ کی روشنی میں آپؒ کی طرف دیکھا تو سب کے سب پریشان نظر آنے لگے۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ کا چہرہ مبارک زرد تھا۔ داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ اور پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ساتھی ڈاکوؤں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''سردار! کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ ''ہاں! میری طبیعت بہت خراب ہے۔ تم لوگ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

سردار کا حکم سن کر تمام ڈاکو خیمے سے باہر نکل گئے۔ اپنے ساتھیوں کے جانے کے بعد حضرت فضیل بن عیاضؒ نے خیمے کا پردہ گرا دیا۔ اس وقت بھی آپؒ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور آپؒ کا جسم کانپ رہا تھا۔ بار بار اس قاری کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔

''کیا اہلِ ایمان کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل اللہ کے خوف سے لرز جائیں۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو کچھ اور تیز ہو گئے تھے۔ پھر آپؒ نے لرزتی ہوئی آواز میں خود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''فضیل! آخر تُو لوٹ مار کا یہ کھیل کب تک کھیلے گا؟ قزاقِ اجل بھی تو تیری تاک میں ہے۔ پتہ نہیں کب اور کہاں تجھے مار گرائے۔ واپس لوٹ جانے میں جلدی کر۔ کوئی نہیں جانتا کہ توبہ کا دروازہ کب بند ہو جائے۔'' یہ کہتے کہتے حضرت فضیل بن عیاضؒ بے اختیار سجدے میں چلے گئے اور رات بھر اسی حالت میں یہ دعا مانگتے رہے۔ ''مرے مالک الملک! وہ وقت آ ہی گیا ہے کہ تیرا یہ بدترین بندہ، فضیل تیرے خوف سے لرز اُٹھے۔ مگر یہ وقت بھی تو تیرے ہی اختیار میں ہے۔ مجھ اکیلے کی وجہ سے یہ وقت ٹھہر نہیں سکتا۔ مگر تُو قادرِ مطلق ہے۔ مجھ ناکارہ اور ناتواں کو وقت کے ساتھ چلنے کی توفیق و ہمت عطا فرما۔''

پھر جب نئی صبح کا سورج طلوع ہوا تو سارے اندھیرے چھٹ چکے تھے۔ ظاہری بھی اور باطنی بھی۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ اپنے خیمے سے باہر آئے۔ تمام ساتھی ڈاکو اپنے سردار کی مزاج پرسی کے لئے بے چین تھے۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' بیک وقت کئی آوازیں اُبھریں۔

جواب میں حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ ''میری بیماری تو لاعلاج تھی۔ مگر اس شافی مطلق کو میری حالت زار پر رحم آ گیا۔'' حضرت فضیل بن عیاضؒ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور روتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو ایسی قدرت والا ہے کہ مُردوں میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔ فضیل کئی سال پہلے مر گیا تھا۔ مگر حیی و قیوم نے اسے دوسری زندگی بخش دی۔''

تمام ڈاکو حیرت سے اپنے سردار کا منہ دیکھ رہے تھے۔ پھر ان سب لوگوں نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ ''اللہ ہمارے سروں پر سردار کا سایہ تا دیر قائم رکھے۔ آخر آپ کو کیا بیماری تھی؟ کچھ ہمیں بھی تو بتائیں۔'' ڈاکو، حضرت فضیل بن عیاضؒ کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔

''جو مرض مجھے لاحق تھا، تم بھی اسی بیماری میں مبتلا ہو۔'' حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تمہارا سردار، ڈاکو فضیل بن عیاض کل رات مر گیا۔ اس وقت جو شخص تمہارے سامنے کھڑا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا گناہ گار اور عاجز بندہ فضیل ہے۔ جو اپنے رب کی رحمت اور مغفرت کی تلاش میں انجان راستے پر جا رہا ہے۔ ہو سکے تو تم بھی اپنے اندر چھپے ہوئے اس وحشی انسان کو مار ڈالو، جس نے اللہ کے بندوں کو بہت ستایا ہے۔ پرانی رفاقت اور دوستی کا یہی تقاضا تھا کہ میں تمہیں بھی خبردار کر دوں...... اس گمان میں نہ رہنا کہ ابھی تمہاری جوانی کے دن ہیں..... اور شام ہونے میں بہت دیر ہے...... کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کڑیل جوان اُٹھا لئے جاتے ہیں۔ اور عین دوپہر کے وقت سیاہ بادل سورج کو ڈھانپ لیتے ہیں..... یا اسے گرہن لگ جاتا ہے...... جلدی کرو...... بلکہ اپنے اللہ کی رحمت کی طرف دوڑو اور اس کے قہر و غضب سے مرتے دم تک پناہ مانگتے رہو۔''

اپنے ساتھیوں کو نصیحت کرنے کے بعد حضرت فضیل بن عیاضؒ ان ڈاکوؤں سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے۔ لوٹا ہوا سارا مال، غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ محتاج اور ضرورت مند لوگ اس بخشش و عطا پر دعائیں دینے لگے۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو اور دولت مند بنا دے کہ آپ نے ہم پریشان حالوں اور بھوکوں کا اتنا خیال کیا۔''

یہ سن کر حضرت فضیل بن عیاضؒ رونے لگے۔ اور ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ میرا مال نہیں ہے...... میں تو دوسرے لوگوں کی ملکیت تم تک پہنچا رہا ہوں۔ ان کے لئے دعا کرو۔''

غریبوں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا تم ان سخی لوگوں کے نوکر ہو؟''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں...... میں ان کا ملازم ہوں۔ اگر ہو سکے تو میرے لئے اتنی دعا ضرور کرنا کہ اللہ اس گناہ گار کے گناہ معاف فرما دے، جس کا نام فضیل بن عیاض ہے۔''

اس کے بعد حضرت فضیل بن عیاضؒ اُس یہودی کے گھر پہنچے جسے آپؒ نے کسی زمانے میں بہت ستایا تھا۔ اپنے دروازے پر دستک سن کر وہ یہودی باہر آیا اور آپؒ کو دیکھتے ہی فریادی لہجے میں کہنے لگا۔

''آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو اور مجھے معاف کر دو۔''

یہ کہہ کر اس یہودی نے دروازہ بند کرنا چاہا تو حضرت فضیل بن عیاضؒ نے بڑے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''آج میں تمہیں ستانے نہیں، اپنے گناہوں کی معافی مانگنے آیا ہوں۔''

یہودی نے انتہائی نفرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو۔ مجھے تم پر ذرا بھی اعتبار نہیں۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ ''میں مسلمان ہوں۔ میری بات کا یقین کرو۔''

یہودی نے شدید طنز اور مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہاری صورت تو مسلمانوں کی طرح ہے.... مگر اعمال ایسے ہیں کہ اسلام جیسے سچے مذہب کو بھی بدنام کر رہے ہو۔''

اس یہودی کی تیر و نشتر جیسی باتوں نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کے دل پر ایسے چرکے لگائے کہ آپؒ تکلیف کی شدت سے تڑپ اُٹھے اور نہایت غم زدہ لہجے میں بولے۔

''کچھ دنوں کے لئے بھٹک ضرور گیا تھا۔ مگر میں اوّل و آخر مسلمان ہی ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تمہیں میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ اس لئے پچھلی خطائیں معاف کر دو۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔''

یہودی نے اسی غضب ناک انداز میں کہا۔ ''ایسے کیسے معاف کر دوں؟ جتنی تکلیف تم نے مجھے دی ہے، اتنی تکلیف میں بھی تمہیں پہنچاؤں گا...... تب کہیں جا کر حساب برابر ہوگا۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے انتہائی خوش دلی کے ساتھ فرمایا۔ ''میں تمہاری طرف سے تجویز کردہ ہر سزا کے لئے تیار ہوں کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔''

یہودی، حضرت فضیل بن عیاضؒ کا جواب سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ کہاں وہ ڈاکو فضیل کہ جس کا نام سن کر ہی لوگ لرز اُٹھتے تھے۔ اور کہاں یہ تھکا ماندہ فضیل کہ شرمندگی کے بوجھ سے جس کا سر اور کاندھے جھکے ہوئے تھے۔

یہودی کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر سخت لہجے میں حضرت فضیل بن عیاضؒ سے مخاطب ہوا۔ ''میں تمہیں صرف ایک شرط پر معاف کر سکتا ہوں۔''

ابھی یہودی نے معافی کے لئے اپنی شرط بھی پیش نہیں کی تھی کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ بے اختیار بول اُٹھے۔ ''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔''

یہودی کے گھر کے سامنے مٹی کا بہت اُونچا ٹیلہ تھا، جیسے کوئی چھوٹی سی پہاڑی۔ اگر سو دو سو مزدور مسلسل کام کرتے تو مٹی کا وہ ٹیلہ کئی مہینوں میں صاف ہوتا۔ یہودی نے اس ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اس ٹیلے کو صاف کر دو تو میرے دل کا غبار بھی صاف ہو جائے گا اور میں تمہیں معاف کر دوں گا۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اس پہاڑی نما ٹیلے کی طرف دیکھا اور انتہائی پُر جوش لہجے میں فرمایا۔ ''انشاء اللہ میں اسے صاف کر دوں گا۔''

یہودی نے بڑی حیرت کے ساتھ فضیل بن عیاضؒ کی طرف دیکھا اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنے وعدے پر قائم رہو گے؟ اگر درمیان میں چھوڑ کر بھاگ گئے تو پھر میں معاف نہیں کروں گا۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اس یہودی کی بات سنی اور نہایت پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''گناہ گار سہی، مگر مسلمان ہوں۔ مسلمان نہ وعدہ شکن ہوتا ہے اور نہ میدان میں پیٹھ دکھاتا ہے۔''

یہودی نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کا تمسخر اُڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں زبانی دعوے کا قائل نہیں۔ اپنے عمل سے ثابت کرو کہ تم مسلمان ہو یا کوئی اور۔'' یہودی اپنی طنزیہ باتوں سے حضرت فضیل بن عیاضؒ کو جوش دلاتا رہا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ایک تنہا مزدور مسلسل محنت کرے تب کہیں جا کر وہ مٹی کے اس ٹیلے کو کئی سالوں میں صاف کر سکے گا۔ اس کے خیال میں حضرت فضیل بن عیاضؒ سے بدلہ لینے کا یہی بہترین طریقہ تھا۔ الغرض یہودی نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کو تیشہ اور کدال فراہم کر دیئے۔ آپؒ نے ایک لمحے کی تاخیر کئے بغیر اپنا کام شروع کر دیا۔

شام ہوئی تو وہ یہودی چند روٹیاں اور سالن لے کر حضرت فضیل بن عیاضؒ کے پاس پہنچا۔ آپؒ نے انکار کرتے ہوئے فرمایا۔ ''میں تمہارا کھانا کس طرح کھا سکتا ہوں؟''

یہودی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''جب تم کھانا نہیں کھاؤ گے تو اتنی محنت و مشقت کا کام کس طرح کرو گے؟ یہ تم پر قرض یا احسان نہیں، بلکہ اسے اپنے کام کی مزدوری سمجھو۔''

یہودی کا یہ طرزِ عمل بے سبب نہیں تھا۔ وہ تو محض تماشا دیکھنا چاہتا تھا کہ کب تک ایک مسلمان اپنا پسینہ بہاتا ہے اور پھر تنگ آ کر کس طرح بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ تین چار دن تک پوری جانفشانی کے ساتھ اس ٹیلے کو کھودتے رہے اور مٹی لے جا کر دور پھینکتے رہے۔ یہودی دن میں کئی بار اپنے گھر کی

چھت پر کھڑے ہو کر تماشا دیکھتا۔ دھوپ نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کے سرخ و سفید چہرے کو کسی قدر سیاہی مائل کر دیا تھا۔ اگر کچھ دن اور آپؒ اسی طرح کام کرتے رہتے تو آپؒ کا دلکش چہرہ کسی حبشی کے مانند ہو جاتا۔

پھر ایک روز خوفناک ترین آندھی آئی۔ پورا علاقہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ ہوا کا طوفان اس قدر شدید تھا کہ بدترین گناہ گاروں کو بھی اللہ یاد آ گیا۔ ہر گھر میں ایک کہرام برپا تھا اور لوگ دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔

''اے ارض و سما کے مالک! تُو اس آفت ناگہانی کو ہمارے سروں سے ٹال سکتا ہے کہ تیرے سوا کوئی مددگار نہیں۔''

بہت دیر تک فضا میں یہ ماتمی آوازیں گونجتی رہیں۔ آخر ہوا کا زور ٹوٹنا شروع ہوا اور کچھ دیر بعد وہ کالی آندھی تھم گئی اور سورج نکل آیا۔ علاقے کے لوگوں نے اس طرح سکون کی سانس لی کہ جیسے وہ موت کی وادی سے نکل کر دوبارہ اپنی دنیا کی طرف واپس آئے ہوں۔ طوفان تھم جانے کے بعد وہ یہودی بھی اپنے گھر سے باہر نکلا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ناقابل یقین منظر تھا۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ سجدے کی حالت میں تھے۔ اور وہ مٹی کا پہاڑی نما ٹیلہ غائب تھا۔ کچھ دیر کے لئے وہ یہودی خود پتھر کا ایک ستون بن کر رہ گیا۔

چند لمحوں بعد یہودی کی یہ کیفیت زائل ہوئی تو وہ تیزی کے ساتھ دوبارہ اپنے گھر میں داخل ہوا، ایک تھیلی اُٹھائی اور پھر وہ تھیلی اپنے سرہانے رکھ کر دوبارہ اسی جگہ آیا، جہاں حضرت فضیل بن عیاضؒ سجدے کی حالت میں دعا مانگ رہے تھے۔

''فضیل! اُٹھو...... تم نے اپنا کام مکمل کر دیا۔'' یہودی نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے سجدے کی حالت سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ریت کے اس پہاڑی نما ٹیلے کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے شدید حیرت و سکوت کے لہجے میں اس یہودی سے سوال کیا۔

''ریت کا پہاڑ کہاں گیا؟''

یہودی نے کسی قدر سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کچھ دیر پہلے ایک سیاہ آندھی آئی تھی، جو ریت کے ٹیلے کو اُڑا کر لے گئی۔''

یہ سنتے ہی حضرت فضیل بن عیاضؒ دوبارہ سجدے میں چلے گئے اور بلند آواز سے گریہ و زاری کرنے لگے۔

''اے ذاتِ وحدہٗ لاشریک! تیرے سوا فضیل کا کوئی پرسان حال نہیں۔ تیری عزت و جلال کی قسم! تُو اپنے نام لیواؤں کو دوسروں کے آگے کبھی ذلیل نہیں کرتا۔ بہت ہی دشوار گزار راستہ ہے۔ میرا ہاتھ نہ چھوڑنا...... ورنہ میں آگ کے گڑھے میں گر جاؤں گا۔''

یہ دعا مانگ کر حضرت فضیل بن عیاضؒ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے عاجزانہ لہجے میں یہودی سے مخاطب ہوئے۔ ''حق تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے مجھے تمہارے قرض سے سبکدوش کیا۔ اب اجازت دو کہ بہت دور جانا ہے۔''

''فضیل! ابھی تم سبکدوش نہیں ہوئے۔'' یہودی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ایک شرط باقی ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد ہی تم یہاں سے جا سکتے ہو۔''

''یہ نئی شرط کہاں سے آ گئی؟'' حضرت فضیل بن عیاضؒ نے کسی قدر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ ''بس میرے اور تمہارے درمیان ٹیلہ صاف کرنے کی شرط تھی...... قادرِ مطلق نے غیب سے اس کا بندوبست کر دیا۔ اب

میرے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ موجود نہیں۔ میں اخلاقی طور پر بھی آزاد ہوں اور دنیاوی قانون کے مطابق بھی مجھ پر کوئی پابندی نہیں۔"

یہودی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یاد کرو فضیل! ایک بار تم نے میری کچھ اشرفیاں بھی لوٹی تھیں۔ جب تک تم میرا وہ لوٹا ہوا مال واپس نہیں کرو گے، اس وقت تک شرط کی قید سے آزاد نہیں ہو گے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے کسی قدر ناگوار لہجے میں فرمایا۔ "میں تم سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں نے تمہاری وہ اشرفیاں اور دوسرے لوگوں کا لوٹا ہوا مال، غریبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اب میں وہ تمہیں کس طرح واپس کر سکتا ہوں؟ یہ سراسر بدعہدی ہے۔ اور میں اس بدعہدی میں تمہارا شریک نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر حضرت فضیل بن عیاضؒ جانے لگے۔

"اس شرط کے پورا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔" یہودی نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" حضرت فضیل بن عیاضؒ نے یہودی سے پوچھا۔

"میرے بستر کے سرہانے اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی رکھی ہے۔ تم اسے اٹھا کر میرے حوالے کر دو۔ اس طرح میری قسم بھی پوری ہو جائے گی اور تم بھی فرض سے سبکدوش ہو جاؤ گے۔" یہودی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ ہر حال میں اس یہودی سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ مجبوراً یہودی کے ساتھ اس کے گھر تشریف لے گئے اور اس کے سرہانے رکھی ہوئی تھیلی اٹھا کر اس کے حوالے کر دی۔

یہودی نے بڑی بے تابی کے ساتھ اس تھیلی کو کھولا اور ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟...... پتھر کے ٹکڑے، سونے میں کیسے تبدیل ہو سکتے ہیں؟"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے بڑی حیرت سے اس یہودی پر نظر ڈالی جو بار بار اپنی تھیلی کو دیکھ رہا تھا اور ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ پتھر کے ٹکڑے، ٹکسال میں ڈھل کر اشرفیاں بن جائیں؟" یکایک اس یہودی نے چیخ کر اپنے ملازم کو آواز دی۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آپؒ یہودی کے چہرے کی طرف دیکھتے اور کبھی تھیلی کی طرف جو اس کے ہاتھ میں تھی۔ چند لمحوں بعد یہودی کا ملازم دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے بدحواسی جھلک رہی تھی۔

"کیا ہوا میرے آقا؟" ملازم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

یہودی نے تھیلی اُلٹ دی اور ساری اشرفیاں زمین پر بکھر گئیں۔ ان اشرفیوں کی آب و تاب ایسی تھی کہ جیسے وہ ابھی ٹکسال سے ڈھل کر آئی ہوں۔ یہودی نے اشرفیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ملازم سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

ملازم نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر کہا۔ "آقا! یہ اشرفیاں ہیں..... بالکل اچھوتی...... جیسے کسی انسان نے انہیں چھوا ہی نہ ہو۔"

یہودی نے نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "تو جھوٹ بولتا ہے۔ میری نظر میں تو یہ پتھر کے ٹکڑے ہیں۔"

ملازم سخت پریشان نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنے مالک کی بات کو کس طرح جھٹلائے۔ پھر بھی اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آقا! اگر آپ کہتے ہیں تو پھر یہ پتھر کے ٹکڑے ہی ہوں گے۔ ذرا اس شخص سے بھی پوچھیں کہ اسے کیا دکھائی دیتا ہے؟"

ملازم نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کی طرف اشارہ کیا، جو قریب ہی کھڑے تھے۔ اور گرد و غبار میں اٹ جانے کی وجہ سے کوئی مزدور نظر آ رہے تھے۔

یہودی نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''فضیل! تم کیا کہتے ہو؟''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ ''جو تمہارا ملازم کہتا ہے۔ میرا کام ختم ہو گیا۔ اب مجھے اجازت دو۔''

یکایک یہودی کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس نے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ ''پہلے مجھے مسلمان کرتے جاؤ۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ ''دادا، پردادا کا پرانا مذہب چھوڑ رہے ہو۔ آخر اس انقلاب کی وجہ؟''

یہودی نے اپنے ذہنی انقلاب کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں ایسے مشکل کام پر لگا دیا تھا کہ جس سے برسوں تمہاری جان نہ چھوٹتی۔ مگر اس کا کیا علاج ہے کہ تمہارے اللہ نے میری تدبیر کو اُلٹ دیا۔ اور اس نے تمہاری خاطر ایسی خوفناک ہوا چلائی کہ وہ چند لمحوں میں مٹی کی اس پہاڑی کو اُڑا کر لے گئی۔ میں نے یہ منظر دیکھا تو خوف زدہ ہو کر سوچنے لگا کہ اب تم ڈاکو فضیل نہیں رہے ہو بلکہ اندر سے کچھ اور ہو گئے ہو۔ میں نے اپنی کتاب، مقدس تورات میں پڑھا ہے کہ سچے دل سے توبہ کرنے والا، اگر مٹی کو بھی ہاتھ لگا دے تو وہ سونا بن جاتی ہے اس حقیقت کو سمجھنے اور تمہیں آزمانے کے لئے میں نے تھیلی میں پتھر کے ٹکڑے بھر دیئے اور تم سے کہا کہ یہ اشرفیوں کی تھیلی اٹھا کر مجھے دے دو۔ پھر تمہارا ہاتھ لگتے ہی وہ پتھر، سونے کے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گئے، جیسے انہیں ابھی ابھی تراشا گیا ہو۔ اس صورتِ حال نے میرے دل و دماغ کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ پھر میں سوچنے لگا کہ جس مذہب کا ماننے والا ڈاکو اس قدر سچا ہے تو باکردار مسلمان کتنے سچے ہوں گے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کی سچائی کا کیا عالم ہو گا۔''

یہودی کی جذباتی گفتگو سن کر حضرت فضیل بن عیاضؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور پھر آپؒ نے انتہائی وارفتگی کے لہجے میں کہا۔ ''تم میرے آقا، حضرت محمد ﷺ کی سچائی کو کیا سمجھو گے؟ آپؐ کو جھٹلانے والے بھی صادق اور امین کہا کرتے تھے۔ میرے آقا ﷺ صادقِ اعظم تھے...... امینِ اعظم تھے۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ کی یہ کیفیت دیکھ کر یہودی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور وہ رقت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔

''اسی لئے تو تم سے التجا کر رہا ہوں کہ مجھے بھی صادقِ اعظم کی اُمت میں شامل کر لو۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ کو اس یہودی کے لفظوں میں حقیقت اور صداقت کی تڑپ محسوس ہوئی۔ نتیجتاً آپؒ نے اسے کلمہ شہادت کی تلقین فرمائی۔ پھر جب وہ یہودی، اللہ تعالیٰ کی واحدانیت اور سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر گواہی دے کر حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا تو حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ ''اب تو تم نے مجھے معاف کر دیا؟''

یہودی نے کسی غلام کی طرح آگے بڑھ کر آپؒ کا دامن پکڑ لیا اور روتے ہوئے کہنے لگا۔

''کل تک تم میرے قرض دار تھے۔ اور آج میں تمہارا مقروض ہو۔ ایسا قرض جو اُتارا ہی نہیں جا سکتا۔''

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے نہایت عاجزانہ لہجے میں فرمایا۔ ''اب تم میرے دینی بھائی ہو۔ اللہ ہم دونوں کے گناہوں کو معاف فرمائے۔''

یہودی نے بڑی عقیدت و محبت کے ساتھ درخواست کی۔ ''تو پھر اپنے بھائی کے ساتھ کچھ دن یہاں مہمان

رہ جاؤ۔" حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ "میں نے دل سے تمہاری میزبانی قبول کی۔ مگر میں ایک رات بھی نہیں ٹھہر سکتا کہ مجھے بہت دور جانا ہے۔" اس کے بعد آپؒ نومسلم یہودی سے گلے ملے اور بصرہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے حضرت امام حسن بصریؒ کی پرہیزگاری اور علم کا بہت شہرہ سنا تھا۔ اس لئے آپؒ کی شدید خواہش تھی کہ عظیم و جلیل محدث و فقیہہ کی صحبت سے فیض یاب ہو سکیں۔ جب حضرت فضیل بن عیاضؒ بصرہ پہنچے تو مقامی لوگوں نے بتایا کہ ایک سال پہلے حضرت امام حسن بصریؒ کا انتقال ہو گیا۔

یہ الم ناک خبر سنتے ہی حضرت فضیل بن عیاضؒ نے ایک سرد آہ کھینچی اور روتے ہوئے کہا۔ "ہائے بدنصیبی...... ہائے محرومی۔"

آپؒ کی یہ حالت دیکھ کر ایک شخص نے کہا۔ "بے شک..... حضرت امام حسن بصری تو اس دارِ فانی سے تشریف لے گئے مگر اس دنیا میں اپنا روحانی وارث چھوڑ گئے ہیں۔ اور وہ ہیں امام کے خلیفہ اکبر، حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ۔ پھر حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کی خانقاہ میں حاضر ہوئے اور آپؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر کے سلسلۂ چشتیہ میں داخل ہو گئے۔

روحانی تربیت کے دوران ہی فضیل بن عیاضؒ نے سنت نبوی ﷺ کے مطابق ایک غریب مگر انتہائی شریف لڑکی سے شادی کی۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ بس اتنی مزدوری کیا کرتے تھے جس سے دو وقت کی روٹی حاصل ہو سکے۔ باقی وقت اپنے پیر و مرشد کی صحبت اور ذکرِ الٰہی میں گزارتے تھے۔ چند سال بعد وہ بصرہ سے کوفہ تشریف لے گئے۔ کسی تاریخی حوالے سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کی زندگی میں بصرہ کو خیرباد کہا تھا یا پیر و مرشد کے انتقال کے بعد۔

کوفہ پہنچ کر آپؒ امامِ اعظم حضرت ابوحنیفہ کی بارگاہِ عالیہ میں حاضر ہوئے۔ معتبر روایت کے مطابق حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فقہ کی تعلیم امامِ اعظم سے حاصل کی۔ اس طرح آپؒ کو سب سے بڑے فقیہہ حضرت ابو حنیفہؒ اور قطبِ دوراں حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ کی شاگردی کا اعزاز حاصل ہے۔ زہد و تقویٰ کے باعث حضرت امامِ اعظم بھی حضرت فضیل بن عیاضؒ کا بہت احترام کرتے تھے۔ پھر جب 150ھ میں امامِ اعظم حضرت ابوحنیفہؒ کا انتقال ہو گیا تو حضرت فضیل بن عیاضؒ کوفہ چھوڑ کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ اس مقدس سرزمین پر آپؒ کے صاحبزادے، حضرت عبداللہ اور دو صاحبزادیاں پیدا ہوئیں۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت فضیل بن عیاضؒ نے خانہ کعبہ کی مجاوری اختیار کر لی تھی۔

آپؒ اس قدر جذب و کیف کے عالم میں وعظ فرماتے کہ اکثر حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ آپؒ کی مجلس میں بڑے بڑے امراء شریک ہوتے مگر آپؒ ان میں سے کسی کو بھی توجہ اور التفات کے قابل نہیں سمجھتے۔

اگر کوئی صاحبِ ثروت انسان، حضرت فضیل بن عیاضؒ کی قربت حاصل کرنے کے لئے ضد کرتا تو آپؒ انتہائی تلخ لہجے میں فرماتے۔ "اگر تم اپنی نمود و نمائش کے لئے اس امید پر میرے پاس آتے ہو کہ میں تمہارے احترام میں کھڑا ہوں گا یا تمہیں اپنے برابر بٹھاؤں گا تو یہ خواہش اپنے دل سے نکال پھینکو۔ یہ سمجھ لو کہ میں ایک اپاہج انسان ہوں۔ اس لئے تمہارے احترام میں کھڑا نہیں ہو سکتا اور تمہیں اپنے قریب اس لئے نہیں بٹھا سکتا کہ میں بہت ہی حقیر و غریب انسان ہوں۔ اور تم اس معاشرے میں معزز و محترم بھی ہو اور امیر و کبیر بھی۔ پھر ہم

دونوں ایک ساتھ کس طرح بیٹھ سکتے ہیں؟"

حضرت فضیل بن عیاضؒ کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر اُمرائے وقت کا چہرہ اُتر جاتا۔ کبھی آپؒ مکہ معظمہ کے رئیسوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے۔ "اگر تم آخرت کی طلب میں عبرت اور نصیحت حاصل کرنے کے لئے میرے پاس آتے ہو تو سب سے پچھلی قطار میں جا کر بیٹھ جاؤ، جہاں غرباء اور مساکین بیٹھے ہیں۔ پھر میں تم سے وہ باتیں کہہ دوں گا، جو میں نے اپنے پیرِ طریقت، حضرت شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اور استادِ گرامی امامِ اعظم حضرت ابوحنیفہؒ سے سنی ہیں۔ پھر تم ان باتوں پر عمل نہ کرو، یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔"

مکہ معظمہ کے ذی اثر اور بااقتدار لوگ ایک مردِ قلندر کی یہ بے باکانہ گفتگو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے امیر و کبیر لوگوں نے آپؒ کی خدمت میں حاضر ہونا ترک کر دیا تھا۔ بعض عقیدت مند آپؒ کی خدمت میں قیمتی نذر پیش کرتے تو انتہائی پُرجلال لہجے میں فرماتے۔

"کیا تم نے مجھے غریب و مفلس سمجھ رکھا ہے؟ اللہ تعالیٰ بے نیاز بھی ہے اور غنی بھی۔ اس نے اپنی ان ہی صفاتِ کریمانہ کے صدقے مجھے اتنا دیا کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔"

حالانکہ اس وقت حضرت فضیل بن عیاضؒ فاقے سے ہوتے تھے مگر شانِ خودداری آپؒ کے چہرے سے بھوک اور ضرورت کو ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔ ہاں اگر رزقِ حلال کمانے والا کوئی شخص نذر پیش کرتا تو اسے قبول فرما لیتے تاکہ بیوی بچوں کا پیٹ پال سکیں۔ پھر جب وہ شخص چلا جاتا تو رازقِ عالم کی بارگاہ میں اس طرح رو رو کر عرض کرتے۔

"اے دیکھنے والے! تُو دیکھ رہا ہے کہ میں دن رات تیرے بندوں کی خدمت میں لگا رہتا ہوں۔ مجھے اپنی روزی کمانے کے لئے وقت نہیں ملتا۔ تُو میری اس کم ہمتی اور ناکارہ پن کو معاف فرما دے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ یہ معمولی نذریں بھی اس لئے قبول کرتے تھے کہ دو وقت کی روٹی کھا سکیں اور اپنا سارا وقت خدمتِ خلق میں گزار سکیں۔ ایک خدمتِ خلق وہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص کسی بیمار کی تیمارداری کرتا ہے، بھوکے کو کھانا کھلاتا ہے...... مفلس کو اپنی حیثیت کے مطابق کچھ رقم دے دیتا ہے...... مختصر یہ کہ خدمتِ خلق کے بہت سے طریقے ہیں مگر حضرت فضیل بن عیاضؒ جس قسم کی خدمت انجام دے رہے تھے، وہ ان تمام خدمات سے یکسر مختلف تھی۔ بے خبر لوگوں کو آگہی دینا...... غبار آلود ذہنوں کو صاف کرنا...... نفسانی خواہشوں میں گھرے ہوئے دلوں سے گناہوں کی کثافت دُور کرنا...... اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف بلانا۔ یہ اعلیٰ ترین خدمت ہے۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ دن رات مخلوقِ خدا کی یہی خدمت انجام دے رہے تھے۔ یہ آپؒ ہی کا روحانی تصرف تھا کہ مکہ معظمہ کے بہت سے لوگوں نے حضرت فضیل بن عیاضؒ کے دستِ حق پرست پر توجہ کی اور ہمیشہ کے لئے گناہوں کی وادی سے نکل کر تلاشِ حق میں مصروف ہو گئے۔

دینِ اسلام کے ان ہی خدمت گاروں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 273 میں ارشاد فرمایا۔ "جو مال تم خرچ کرو گے، اصل میں یہ حق ان تنگ دست اور حاجت مند لوگوں کا ہے جو اللہ کے کام یعنی دین کی خدمت میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی ذاتی روٹی کمانے کے لئے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی خیال کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے پھرتے...... اور تم جو کچھ مال ان پر خرچ کرو گے، وہ اللہ سے پوشیدہ نہیں رہے گا۔"

اس حکم الٰہی کے مطابق حضرت فضیل بن عیاضؒ بس اتنی ہی نذر قبول کرتے تھے کہ دو وقت کی روٹی کھا سکیں اور جسم ڈھانپنے کے لئے بہت ہی معمولی کپڑا خرید سکیں۔ جو آپؒ کا ظاہری حال تھا، وہ اہلِ خانہ کا بھی۔ واضح رہے کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کے ایک صاحبزادے، عبداللہ تھے۔ اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ اگر کبھی یہ تینوں بچے اور بیوی کسی آسائش کی طلب کرتے تو آپؒ بڑی محبت اور خوش دلی سے فرماتے۔ ''تمہارے پالنے والے نے تمہارے لئے بس یہی مقدر کیا ہے۔ اس پر راضی رہو گے اس میں انسان کی نجات ہے۔''

اگر فضیل بن عیاضؒ چاہتے تو خلیفہ وقت اور دوسرے امراء آپؒ کے قدموں میں دولت کے انبار لگا دیتے۔ لیکن حضرت فضیل بن عیاضؒ کے صبر وقناعت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ آپؒ صاحبانِ اقتدار کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ تمام معتبر تاریخیں اس واقعہ کی گواہ ہیں کہ ایک بار عباسی خلیفہ ہارون رشید نے اپنے وزیر، فضل برمکی سے کہا۔

''میں اپنی سلطنت میں رہنے والے کسی ایسے شخص سے ملنا چاہتا ہوں جو حقیقی عالم بھی ہو...... اور درویش بھی ہو...... اور اسی دنیا میں رہتا ہو...... اور دنیا کی پروا نہ کرتا ہو۔''

وزیر فضل برمکی، رات کے اندھیرے میں خلیفہ ہارون رشید کو ایک عالم کے مکان پر لے گیا اور اس نے دروازے کے باہر سے پکار کر کہا۔ ''امیر المومنین تم سے ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔''

اس درویش نما عالم نے بڑے عاجزانہ لہجے میں اندر ہی سے جواب دیا۔ ''یہ میری خوش نصیبی ہے کہ امیر المومنین نے اس غریب خانے پر تشریف لانے کی زحمت گوارا کی۔ کاش! مجھے پہلے سے علم ہوتا تو میں خود خلیفۃ المسلمین کے استقبال کے لئے حاضر ہوتا۔''

اس عالم کا جواب سن کر عباسی خلیفہ ہارون رشید نے غصے سے اپنے وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تُو مجھے یہ کہاں لے آیا؟ جو شخص مجھ سے ملنے کی شدید خواہش رکھتا ہو، وہ حقیقی عالم اور درویش کس طرح ہو سکتا ہے؟'' یہ کہہ کر ہارون رشید واپس چلا گیا۔

پھر کچھ دیر بعد وہ درویش نما عالم اپنا جبہ اور دستار پہن کر باہر آیا تو دروازے پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے بدحواسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر پڑوسیوں سے پوچھنے لگا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے امیر المومنین میرے گھر تشریف لائے تھے۔ وہ کہاں چلے گئے؟''

یہ سن کر پڑوسیوں نے اس درویش نما عالم کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

''آخر امیر المومنین کو ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی کہ وہ رات کے اندھیرے میں آپ کے گھر تشریف لاتے؟ کچھ دیر پہلے ہم نے دو اجنبی انسانوں کو آپ کے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھا تھا اور وہ دونوں اپنے لباسوں سے عام آدمی نظر آتے تھے۔ وہ کسی بھی حال میں امیر المومنین نہیں ہو سکتے۔ کسی شخص نے آپ سے مذاق کیا ہوگا یا پھر آپ نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔''

پڑوسیوں کی یہ طنزیہ گفتگو سن کر وہ عالم شرمندہ ہو کر گھر واپس چلا گیا۔ وزیر برمکی نے اسی طرح عباسی خلیفہ ہارون رشید کو کئی علماء سے ملایا جو عوام میں درویشوں کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ مگر وہ لوگ بھی خلیفہ وقت سے ملنے کے آرزومند تھے۔ خلیفہ ہارون رشید نے ان لوگوں سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے وزیر خاص، فضل برمکی سے تند وتیز لہجے میں کہا۔

''تم میرا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟ یہ لوگ عالم ضرور ہیں مگر ان پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ اور یہ لوگ

دنیا کی طلب رکھتے ہیں۔ میں تو اس عالم سے ملنا چاہتا ہوں، جو سینے میں علم کی روح رکھتا ہو۔ اور اس درویش کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں جو اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیا کو ٹھوکر مار چکا ہو۔"

عباسی خلیفہ ہارون رشید کی بات سن کر اس کے وزیر خاص، فضل برمکی نے عرض کیا۔ "امیر المومنین! آپ جس عالم درویش سے ملنے کی خواہش رکھتے ہیں، وہ تو بس فضیل بن عیاضؒ ہیں جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں اور خانہ کعبہ کی مجاوری کرتے ہیں۔"

واضح رہے کہ اس وقت اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ بغداد تھا۔ مگر حضرت فضیل بن عیاضؒ کے شوقِ دیدار میں خلیفہ ہارون رشید طویل سفر کر کے مکہ معظمہ پہنچا۔

پھر اسی طرح رات کے وقت عباسی خلیفہ اپنے وزیر فضل برمکی کے ساتھ فضیل بن عیاض کے مکان پر پہنچا۔ مکان کیا تھا، کسی مفلس کا گھر نظر آتا تھا۔ اس وقت حضرت فضیل بن عیاضؒ قرآنِ کریم کی یہ آیت مقدسہ کی تلاوت کر رہے تھے جس کا ترجمہ ہے "کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جنہوں نے برے کام کئے...... ہم انہیں نیک کام کرنے والوں کے برابر کر دیں گے۔"

خلیفہ ہارون رشید نے اپنے وزیر کو مخاطب کر کے کہا۔ "میرے لئے تو بس یہی نصیحت کافی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں آنے کا مقصد پورا ہو جائے گا۔"

فضل برمکی نے دروازے پر دستک دی۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اندر ہی سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

جواب میں وزیر نے کہا۔ "امیر المومنین تشریف لائے ہیں۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ "امیر المومنین غلط دروازے پر آ گئے ہیں۔ نہ انہیں مجھ جیسے فقیر سے کوئی کام ہو سکتا ہے اور نہ میں ان سے کوئی غرض رکھتا ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ میرے کام میں خلل نہ ڈالیں۔"

وزیر فضل برمکی نے بلند آواز میں کہا۔ "آپ عالم و فاضل انسان ہیں۔ اس لئے خوب جانتے ہیں کہ "اولی الامر" کی اطاعت فرض ہے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ "اللہ کے واسطے آپ لوگ واپس چلے جائیں۔ اور مجھے اذیت نہ پہنچائیں۔"

فضل برمکی نے کہا۔ "اگر آپ اجازت نہیں دیں گے تو امیر المومنین بغیر اجازت اندر داخل ہو جائیں گے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ "میں اجازت نہیں دوں گا۔ امیر المومنین مختار ہیں۔ جو چاہیں کریں۔"

خلیفہ ہارون رشید ہر حال میں آپؒ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس لئے اجازت کے بغیر ہی اندر داخل ہو گیا۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے کسی تاخیر کے بغیر چراغ بجھا دیا۔ خلیفہ وقت نے سلام کیا اور قریب ہی بیٹھ گیا۔ پھر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اِسلامی رسم کے مطابق ہارون رشید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پھر انتہائی پُرسوز لہجے میں فرمایا۔

"کیسا نرم و نازک ہاتھ ہے..... کاش دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے۔"

یہ سن کر ہارون رشید کے جسم پر ہلکا سا لرزہ طاری ہو گیا۔ پھر اس نے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔ "شیخ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔"

کچھ دیر تک حضرت فضیل بن عیاضؒ کے کمرے کے در و دیوار پر گہرا سکوت طاری رہا۔ پھر آپؒ نے عباسی خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں نے سنا ہے کہ تم بہت پڑھے لکھے انسان ہو۔ تمہارے سامنے قرآنِ حکیم

کی بہت سی تفسیریں موجود ہیں...... تمہیں ایسے علماء کی صحبت بھی حاصل ہے جو میرے آقا ﷺ کی احادیث مبارکہ مجھ سے بہتر انداز میں بیان کر سکتے ہیں۔ کیا ان حقائق کے باوجود تمہیں میری نصیحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟"

حضرت فضیل بن عیاضؒ کا یہ انکسار دیکھ کر چند لمحے کے لئے خلیفہ ہارون رشید حیران رہ گیا۔ پھر اس نے بڑے عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔ "شیخ! میں نے کتابیں بھی پڑھی ہیں...... علماء کی قربت بھی رہی ہے...... مگر میں آپ کی زبان مبارک سے کچھ سننا چاہتا ہوں۔"

ہارون رشید کی اس درخواست کے جواب میں حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ "امیرالمومنین! میری بات بہت غور سے سنو۔ ایک بار حضور اکرم ﷺ کے حقیقی چچا حضرت عباسؓ نے سرورِ کونین ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں عرض کیا۔

"یارسول اللہ ﷺ! مجھے بھی کسی علاقے کا حاکم بنا دیجئے۔"

حضرت عباسؓ کی اس درخواست کے جواب میں سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔ "میرے محترم چچا! میں کسی علاقے کے بجائے آپ کو آپ کے نفس کا حاکم بناتا ہوں۔ زمین کی حکومت تو خطرات سے خالی نہیں۔ حشر کے دن بہت سے لوگوں کے لئے یہی حکومت شرمندگی اور محرومی کا سبب بن جائے گی۔ اس لئے اپنے نفس پر قرآن و سنت کے مطابق حکومت کیجئے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ کی زبانی یہ حدیث سن کر خلیفہ ہارون رشید ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ اُسے اس انداز میں نصیحت کریں گے۔ ہارون رشید، حضور اکرم ﷺ کے حقیقی چچا، حضرت عباس بن عبدالمطلب کی نسل سے تھا۔ اسی لئے عباسی کہلاتا تھا۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے چند الفاظ میں سب کچھ بیان کر دیا تھا۔ مگر خلیفہ ہارون رشید نے دوبارہ عرض کیا۔

"شیخ! کچھ اور فرمائیے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اسی بے نیازانہ لہجے میں کہا۔ "کیا تمہارے لئے یہ نصیحت کافی نہیں؟ اگر تم سمجھنے کی کوشش کرو تو اس میں سب کچھ ہے۔ دنیا ہے اور آخرت بھی۔"

عباسی خلیفہ نے بصد نیاز عرض کیا۔ "اتنی مشکل سے تو آپ کا دیدار ہوا ہے۔ اور وہ بھی اندھیرے میں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ دوبارہ یہ سعادت مجھے بخشیں گے یا نہیں۔ اس لئے جتنی دیر بھی ممکن ہے، آپ مجھ سے ہم کلام رہیں۔" ہارون رشید کے لہجے سے اسی عاجزی کا اظہار ہو رہا تھا۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے عباسی خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو یہ عظیم الشان سلطنت حاصل ہوئی تھی تو آپؒ نے اس وقت کے بڑے بڑے محدثین، فقہائے کرام اور اہلِ دانش کو طلب کر کے فرمایا:

"آپ حضرات کو معلوم ہے کہ مجھ پر ایک ایسا بارِ گراں ڈال دیا گیا ہے جسے اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں۔ اگر انکار کرتا ہوں تو حق تعالیٰ سے ڈر لگتا ہے...... کہیں قیامت کے دن مجھ سے یہ سوال نہ کیا جائے کہ ہم نے تجھے اپنے بندوں کی خدمت پر مامور کیا تھا...... پھر تُو نے اپنا دامن کیوں بچایا؟ اب آپ لوگ ہی اس مشکل ترین مرحلے میں میری رہنمائی کیجئے۔"

ایک بزرگ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "امیرالمومنین! آپ ہر بوڑھے شخص کو

اپنے باپ کے برابر سمجھیں۔ ہر عورت کو اپنی ماں یا بیٹی تصور کریں اور ہر نوجوان کو باپ کی آنکھ سے دیکھیں۔ پھر ان ہی رشتوں کے مطابق ان کے حقوق ادا کریں۔ انشاء اللہ آپ سلامتی کے ساتھ اس آزمائش سے گزر جائیں گے۔"

اس بار حضرت فضیل بن عیاضؒ نے خلیفہ ہارون رشید کو عجیب انداز سے نصیحت کی تھی۔ قارئین پر واضح رہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تعلق قبیلہ بنو اُمیہ سے تھا۔ اور ہارون رشید کے دادا، سفاح نے ایک خونریز جنگ کے بعد بنو اُمیہ سے اقتدار چھین لیا تھا اور خلافت عباسیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اسی جنگ و جدل اور مسلمانوں کے خون کی ارزانی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پھر آپؒ نے عباسی خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ ان بزرگوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے جنہوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو یہ مشورہ دیا۔ میں گناہ گار بھی امیر المومنین کو یہی مشورہ دیتا ہوں۔ قیامت کے دن کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ اس روز ہر شخص کے کاندھے پر صرف اس کے اپنے اعمال کا بوجھ ہوگا۔ مگر آپ کے کاندھوں پر بے شمار انسانوں کا بارِ گراں ہوگا۔ اگر آپ کی حدودِ سلطنت میں ایک غریب بڑھیا بھی بھوکی سو گئی تو قیامت کے دن اس کا ہاتھ ہوگا اور آپ کا گریبان۔"

یہ سنتے ہی ہارون رشید کے جسم پر شدید لرزہ طاری ہو گیا اور وہ ہیجانی انداز میں چیخنے لگا۔ "اے مالک...... یوم الدین..... تیری پناہ۔"

عباسی خلیفہ کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر وزیر خاص، فضل برمکی نے کسی قدر تیز لہجے میں حضرت فضیل بن عیاضؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "شیخ! بس کیجئے......آپ نے تو امیر المومنین کا برا حال کر دیا۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ ابھی تک نہایت نرم و شیریں لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ مگر خلیفہ کے خوشامدی وزیر کی بات سن کر آپؒ نے انتہائی پُرجلال لہجے میں با آواز بلند کہا۔ "تُو چپ ہو جا، ہامان! میں نے نہیں، بلکہ تُو نے اور تجھ جیسے بے ضمیروں نے امیر المومنین کو زندہ درگور کر دیا ہے۔"

واضح رہے کہ ہامان، فرعونِ مصر کا وزیر تھا۔ عباسی خلیفہ ہارون رشید نے فوراً ہی حضرت فضیل بن عیاضؒ کے اس اشارے کو سمجھ لیا اور اپنے وزیر خاص، فضل برمکی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "خاموش ہو جا۔ تیری ہی وجہ سے شیخ نے مجھے فرعون کہا ہے۔" اس کے بعد خلیفہ ہارون رشید نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں عرض کیا۔ "شیخ! آپ کسی کے مقروض تو نہیں ہیں؟"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے انتہائی پُرسوز لہجے میں فرمایا۔ "صرف اللہ کا قرض دار ہوں۔ اور وہ قرض اتنا زیادہ ہے کہ اگر ہزار بار مروں اور ہزار بار زندہ کیا جاؤں، تب بھی وہ قرض ادا نہ ہو سکے گا۔"

یہ سن کر عباسی خلیفہ نے عرض کیا۔ "کیا شیخ اپنے ارشادِ عالیہ کی وضاحت پسند کریں گے؟"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے رقت آمیز لہجے میں فرمایا۔ "میدانِ حشر میں مجھ سے بے شمار سوالات کئے جائیں گے۔ مگر میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں ہوگا۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ وہ قرض کس طرح اُترے گا؟"

اگر چراغ کا اُجالا ہوتا تو ہارون رشید یہ منظر دیکھ لیتا کہ حضرت فضیل بن عیاضؒ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور چہرہ مبارک، آخرت کے خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ عباسی خلیفہ نے دوبارہ عرض کیا۔

"شیخ! میری مراد دنیاوی قرض سے تھی۔"

یکایک حضرت فضیل بن عیاض کا رنگ جلال اُبھر آیا اور آپؒ نے بے نیازانہ لہجے میں فرمایا۔ "ارحم الراحمین نے اپنے عاجز و گناہ گار بندے فضیل پر یہی تو خاص کرم فرمایا ہے کہ اس کے وہ ہاتھ ہی کاٹ دیئے جو غیر کے

آگے پھیلیں۔ اپنے درِغیب سے اتنی نعمتیں عطا کیں کہ کبھی کسی سے قرض لینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔"

خلیفہ ہارون الرشید، حضرت فضیل بن عیاضؒ کی بات کی گہرائی کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ اس نے ایک تھیلی آپ کی طرف بڑھائی، جس میں ایک ہزار دینار تھے۔ جب وہ تھیلی، حضرت فضیل بن عیاضؒ کے ہاتھ سے ٹکرائی تو آپؒ نے گھبرا کر عباسی خلیفہ سے سوال کیا۔

"یہ کیا ہے؟"

ہارون رشید نے بڑے عاجزانہ لہجے میں عرض کیا۔ "یہ رقم مجھے اپنی والدہ محترمہ کی طرف سے ورثے میں ملی ہے۔ میری نظر میں یہ جائز اور حلال ہے۔ اسے قبول کر کے مجھ حقیر کو خدمت کی سعادت عطا فرمایئے۔"

خلیفۃ المسلمین کی درخواست سن کر حضرت فضیل بن عیاضؒ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور انتہائی شکستہ لہجے میں فرمایا۔ "افسوس...... صد افسوس! میری نصیحت نے تم پر ذرّہ برابر بھی اثر نہیں کیا۔ میں تمہیں نجات کے راستے کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے ہلاکت و بربادی کی جانب جھونک دینا چاہتے ہو۔"

"امیر المومنین! آپ نے میری میزبانی کا خوب صلہ دیا۔ میرے ہی گھر بیٹھ کر مجھے ہی ذلیل و رُسوا کر رہے ہیں۔" ایک مردِ مومن کا یہ اندازِ گفتگو دیکھ کر ہارون رشید پر ایک بار پھر لرزہ سا طاری ہو گیا۔

"شیخ! میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" عباسی خلیفہ کا لہجہ انتہائی عاجزانہ تھا۔ "مگر میری آخری التجا قبول کر لیجئے اور مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹایئے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا۔ "اس فقیر کے پاس تھا ہی کیا جو کسی کو کچھ دیتا۔ خالق کائنات نے بس چند الفاظ مجھے بخشے تھے، سو میں نے وہ تمہاری نذر کر دیئے۔ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

حضرت فضیل بن عیاضؒ کے لہجے سے شدید بیزاری کا اظہار ہو رہا تھا۔ خلیفہ ہارون رشید نے عرض کیا۔ "بس تھوڑی دیر کے لئے چراغ روشن کر دیجئے۔ تاکہ میں آپ کا دیدار کر سکوں۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ نے اسی ناگواری کے انداز میں فرمایا۔ "پھر وہی نادانی کی باتیں؟ مجھ بدصورت انسان کی شکل دیکھ کر کیا کرو گے؟ اُس ذات پاک کا جمال دیکھو، جو دنیا کی ہر شے سے جھلک رہا ہے اور اُس کے جلال سے ڈرتے بھی رہو۔ وہ رحمٰن و غفار بھی ہے اور قہار و جبار بھی۔ بس اب مجھے زیادہ اذیت نہ پہنچاؤ۔ اندھیرے میں آئے تھے، اندھیرے ہی میں چلے جاؤ۔"

مجبوراً عباسی خلیفہ اُٹھا، سلام کیا اور اُس درویش کے حجرے سے نکل کر چلا گیا، جس کی نظر میں تاج و تخت کی قیمت اُس مٹی کے برتن کی قیمت سے زیادہ نہیں تھی جو فقیر کی چٹائی یا حجرے کے کسی گوشے میں رکھا رہتا تھا۔

(تمت بالخیر)

صاحب طرز ادیب
خان آصف کی بہترین تصانیف

- اللہ کے ولی
- اللہ کے سفیر
- دِلوں کے مسیحا
- سفیرانِ حرم
- شمشیر کا قرض
- شعلوں کا کفن
- ٹیپو سلطان
- خاموش وفا
- فاتح اعظم صلاح الدین ایوبی

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور۔ فون: 042-37652546, 37668958
ISBN 9 789696 022060
Website: www.alquraish.com E-mail: info@alquraish.com